

قیمت ایک روپیہ عہ

قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جن پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں
۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیے
۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد اشاعت	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ
تین مرتبہ	۳۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین بار سے زیادہ اشتہار دینگے ان کو حسب قاعدہ کمیشن دیا جائیگا (۳) صاحب اشتہار کو دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان
(دوسرا ایڈیشن) حضرت نیاز کے ادبی مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت عہ

گہوارۂ تمدن
(دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس سے تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس زبان کی اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون و اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس میں مطالعہ سے ایک شخص کی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، دولت و افلاس، صحت، بیماری، شہرت، شکست وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام شیرینیاں اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱۰/

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک نہایت عجیب نسبت کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی تشریح کی ہے کہ دل پھڑک جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

صحابیات
جس میں عہد رسالت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات لکھے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص طور سے لکھا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۴۰ سے زیادہ فارسی کے ظریف شعراء کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت علاوہ محصول ۶/

مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں

تمہید عہد قبل تاریخ کا تو علم نہیں کہ انسان پر ہر وقت کس قسم کا جذبہ طاری رہتا تھا، لیکن جب سے دنیا کی تاریخ مدون ہوئی ہے، اس وقت سے لیکر اس وقت تک کوئی زمانہ، کوئی قوم، اور کوئی ملک ایسا نہیں، جو مزاح و تفنن کے ذوق سے خالی پایا جاتا ہو۔ علی الخصوص شعراء کا طبقہ کہ ان میں سے اکثر کا مدار شہرت یہی ذوق رہا ہے۔ چنانچہ اردو فارسی جاننے والے حضرات واقف ہوں گے۔ کہ قاآنی۔ نعمت خان عالی۔ سعدی۔ سوزنی۔ جعفر زٹلی۔ ضاحک۔ انشا۔ اکبر وغیرہ کے کلام میں یہ عنصر کس حد تک پایا جاتا ہے۔ غالب کو فلسفی اور دقیق گو شاعر ہونے کی حیثیت سے تو سب نے دیکھا لیکن اسکے بذلہ سنج اور شوخ نگار ہونے پر کسی نے نگاہ نہیں ڈالی جو اصل راز اس کی کامیابی کا تھا۔ چنانچہ اس مضمون میں ہم اس پر اس حیثیت سے گفتگو کریں گے اور بتائیں گے۔ کہ اس کی ظرافت کسقدر بلند تھی۔ ظرافت نہایت وسیع المعنی لفظ ہے۔ جو ہزل، پھکڑ، ضلع جگت۔ فقرے۔ پھبتیاں۔ اور لطائف وغیرہ سب سے پر مشتمل ہے۔ اس لئے پہلے مختصراً ان سب کے فرق کو بھی معلوم کر لیجئے

ہزل ظرافت کے اُس آخری درجہ کلام ہے۔ جہاں کلام کا سلسلہ بیہودگی اور مسخرگی سے جا ملتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی فواحش کا بھی شمول ہوتا ہے۔ ہم نظم میں سعدی و انوری وغیرہ کی ہزلیات کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں انوری کہتا ہے:

روزے از بہر تماشا سوے دشت — چند زن بیروں شدند از مہتراں
چوں بہ صحرا ساعتے ماندند دیر — چند خر دیدند در صحرا چراں
نرخرے برماده خر رغبت نمود — بر مثال عاشقاں با دلبراں
باعمودے یک گز و نیم آبنوس — گادنی میکرد بر رسم خراں
گہ فرومے برد و گہ برمے کشید — تیز مے افگند و میکرد عاں وعاں

بقیہ جو

زاں زناں یکے ز پیراں گاؤں بدید   بر کشید آہے و گفت اے خواہراں
گر چراغ نیست کس را غم مخور   برکس ما مے رسیند ایں شوہراں

حکیم شفائی بھی اپنے زمانے کے مشہور ہزال گزرے ہیں ایک رباعی کہتے ہیں۔

حلاب مرا چو فلاں تو الی ندہد   گر سام نریمانی و گر رستم گرد
یا قیمت آنچہ خوردہ باید داد   یا در عوضش آنچہ ریدہ باید خورد

سعدی کہتے ہیں۔

زن جامہ و کسے دہد بہ گز راست   کہ نہ داند تیر لیت زر د اشت
ہر کجا سرو قامتے بینی   چشم در روے کن و فیود رشت
چوں نہ کوشش باری ورنہ شلوار   بے گناہت کسے نخواہد کشت

اُردو میں بھی اس قسم کے بہت سے کہنے والے موجود ہیں جن کے کلام میں ہزالی اور ہزالی کے ساتھ فواحش بھی موجود ہیں۔ اور جن کے پڑھنے سے ایک خاص قسم کا تکدر اور تنفر پیدا ہوتا ہے۔

پھکڑ بھی قریب قریب ہزل کے مشابہ ہے۔ جو بالکل بازاری چیز ہے۔ اور جس میں گالی گلوج کی نوبت آتی ہے اور ہاتھا پائی کی بھی عام طور پر شہدے۔ اور بازاری لوگ اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات مہذب لوگوں کے خاص جلسوں میں بھی پھکڑ بکا جاتا ہے۔ نظم میں پھکڑ کا وجود زیادہ نہیں ہے مگر صاحبقراں۔ جانصاحب۔ انشا وغیرہ کے یہاں اس قسم کے شعر بھی پائے جاتے ہیں۔

ضلع جگت۔ نام ہے۔ صنعت مراعات النظیر اور تناسب الفاظ کا۔ اس میں ظرافت صرف اتنی ہے۔ کہ سامع اور قائل جو الفاظ سوال و جواب میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مناسب اور موزوں ہوتے ہیں گو اکثر حیا سوز اور فحش بھی ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو کسی وقت مبحث خاص قرار پا جائے ضلع قرار دی جاتی ہے۔ اور جگت نام ہے۔ صرف ایک چیز کے دوسرے سے متعلق ہونے اور ایک سے تک لگانے کا۔ پس جب یہ دونوں چیزیں مکمل ہو کر گفتگو کی صورت اختیار کر لیں گی اوسی کو عرف میں ضلع جگت سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ گفتگو اکثر بازاریوں میں ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی خواص بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اوسی کا نام تناسب الفاظ رکھ لیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ظرافت [illegible] کچھ [illegible] بلکہ سامع کو بالایک لطف اور انبساطی کیفیت اس کے سننے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ وہ صرف ظرفین کی قیمت

حاضر جوابی کے نتیجہ پر مبنی ہوتی ہے۔

فقرہ چست کرنا یا آوازہ کسنا فقرہ نام ہے اوس بات کا جس سے فریب دینا مقصود ہو۔ فقرہ بنانا۔ فریب دینا۔ فقرہ چلنا۔ فریب کی بات کا ۔ گر ہونا۔ فقرہ کرنا۔ کوئی بات فریب کی لمکر کسی کو فریب میں مبتلا کرنا۔ مگر فقرہ چست کرنا۔ اکثر آوازہ کسنے کے معنی پر بھی مستعمل ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی طنز آمیز ظرافت ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص مریل اور دبلے گھوڑے پر سوار جا رہا ہے۔ گھوڑا اپنی نقاہت اور ضعف کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے۔ دیکھنے والے سوار اور گھوڑے پر آوازے کستے ہیں۔

ایک کہتا ہے۔ خر شیطے نے دوسرا جنم لیا ہے۔

دوسرا کہتا ہے۔ بھئی واہ رے کمہار کیا گھوڑا بنا دیا ہے۔ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا کہتا ہے۔ حضرت پٹ لگوائے پیٹے

یا مثلاً ایک بہت لمبا آدمی ایک انار والے کی دوکان پر پہونچا جو مٹھے دار ٹوکرے میں انار رکھے آواز لگا رہا تھا۔ یہ صاحب وہاں پہونچے پہلے کھڑے ہوئے کچھ سوچتے اور دیکھتے رہے۔ پھر انار والے سے کہا کہ تمھارے انار بہت چھوٹے ہیں۔ انار والے نے جواب دیا حضرت بیٹھ کر دیکھئے۔ یہ گویا اس کی درازی قد پر ایک تعریض تھی۔

پھبتی یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے جس میں قائل مشبہ کے لئے ایسا مشبہ بہ تجویز کرتا ہے۔ جو درجہ میں مشبہ سے بہت پست ۔ بہت زیادہ بدنما۔ بہت زیادہ بھونڈا ہوتا ہے۔ اور یا مشبہ بہ اسقدر بلند اور ذی رتبہ ہوتا ہے۔ جس کا مشبہ سے کوئی تقابل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں سامع کی ہنسی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے یا تو وہ اُس پست چیز کے جس کو مشبہ بہ ٹھہرایا گیا ہے۔ نظر میں پھر جانے سے ہنستا ہے۔ یا اُس بلند رتبہ کے مقابل ایسی بدتر چیز کو دیکھ کر ہنستا ہے پھبتی کبھی وضع قطع اور حال پہ کہی جاتی ہے۔ اور کبھی ذات پر۔ کبھی ایک خاص جز دیر۔ کبھی ایک جزو مشترک و متصل بالذات پر۔ اور کبھی منفصل من الذات پر۔ کبھی ایک صفت پر۔ کبھی ذی روح پر۔ کبھی غیر ذی روح پر۔ اسی طرح مشبہ بہ کے ذوی الارواح یا ذوی العقول یا ہم جنس یا غیر جنس ہونے کی کوئی قید نہیں ہے۔

پھبتی ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ اہل عرب میں اکثر یہی پھبتی ناموں اور کنیتوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ مگر انہوں نے اس کو زیادہ تر تشبیہ کی حدود میں رکھا ہے۔ اور مدح و ذم میں برابر سمجھا ہے اس کی پروا نہیں کی کہ مشبہ بہ مشبہ سے زیادہ تر پست یا زیادہ تر بلند ہو۔ بلکہ زیادہ تر اون کی پھبتیوں میں یا کسی حالت خاص کی تشبیہ ہے۔ یا تشبیہ پہلو ہے۔ پھر بھی مشبہ اور مشبہ بہ کے غیر متناسب ہونے کی وجہ سے نقاد نظر میں اون کو پھبتیوں ہی حدود میں رکھتی ہیں۔

اسی طرح زبان فارسی میں بھی پھبتی کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے مگر اون کے یہاں بالکل وہی طریقہ ہے جو

ہندوستان میں ہے۔ چنانچہ ایک شاعر پر جس کا تخلص تنگی تھا۔ حکیم ابوالفتح نے پھبتی کہی (تنگی مادر زاد)

محمد رضائے کاشی کی عادت تھی کہ جب کوئی بات کہتا تو نہایت قرأت کے ساتھ کہتا تھا۔ اوس پر لوگوں نے پھبتی کہی (قاری مذمرہ)

زبان اردو میں بھی پھبتیوں کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ مندرجہ بالا زبانوں کی پھبتیاں دیکھنے کے بعد یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ یہ چیز ہندوستان کی پیداوار ہے بلکہ اس کو بھی اتباع ہی کہا جائے گا۔

نصیر علی دانا جو میر کے ایک معاصر شاعر تھے۔ ایک مرتبہ میر صاحب کی محفل مشاعرہ میں جو ہر مہینہ کی پندرہ تاریخ کو دتی میں منعقد ہوتی تھی آ گئے۔ دانا کی قطع یہ تھی کہ نہایت سیاہ فام تھے۔ اور داڑھی بھی جو معمول سے زیادہ بڑھی ہوئی پیٹ پر پڑی تھی۔ بہت سیاہ تھی۔ اوس روز اتفاق سے کرتہ بھی سیاہ پہنے ہوئے تھے۔ سودا نے جو شاعرہ میں موجود تھے یہ قطع دیکھ کر پھبتی کہی۔ لو ہولی کا ریچھ آیا۔

محمد امان اللہ غریب میر تقی کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ذرا ہکلا کر بولتے تھے۔ اسی سبب سے کبھی کبھی الکن بھی تخلص کرتے تھے۔ جی بہلانے کے لئے اکثر مغل پورہ کے باغوں کی طرف چلے جاتے تھے اور دن دن بھر وہیں گزار دیتے تھے۔ میر صاحب نے اون پر پھبتی کی۔ ارنڈ باغاتی۔

میر تقی میر نے جب تذکرہ نکات الشعرا لکھا تو ایک شاعر محمد یار متخلص بہ خاکسار نے بھی ان کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا۔ جس کا نام اپنے دوست محمد معشوق کنبوہ کے نام پر تذکرۂ معشوق رکھا۔ محمد معشوق کی عمر اوس وقت چالیس برس کی تھی۔ میر صاحب نے ان پر پھبتی کہی معشوق چہل سالہ

محمد یار خاکسار کا عرف کلو تھا۔ محمد معشوق نے پھبتی کہکر ایک مصرع موزوں کیا۔ اور خاکسار کو سنایا۔ ع

کتا ہے دربار کا کلو اس کا نام

اشرف علی خاں فغاں نے ناگرمل پر جو احمد شاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ اور دوہرے بدن کا موٹا تازہ آدمی تھا۔ پھبتی کہی (رنڈی کی منڈی کا سانڈ)

ایسے ہی حکیم معصوم گجراتی پر۔ (جو گجرات کے رہنے والے سیدھے سادے بھولے آدمی تھے) (آگاؤ گجراتی) کی پھبتی کہی۔

شیخ شرف الدین مضمون کے دانت گر گئے تھے۔ اور پوپلا منہ کچھ عجب طرح کا معلوم ہوتا تھا۔ ویسے سرخ سفید آدمی تھے۔ ایک دن ان کو دیکھ کر ان کے استاد خان آرزو نے شاعر بیدانہ کی پھبتی کہی۔

شیخ ناجی ایک پہلوان اور اکال شاعر تھے۔ فربہ جسم طویل القامة۔ تہمد باندھے ہوئے سر گھٹا ہوا۔ لوگوں نے ان کو دیکھ کر دم کٹے بھینسے کی پھبتی کہی۔

ایک پستہ قد شاعر پر مرزا فخر اللہ بیگ صاحب صابر نے پھبتی کہی ۔ چنیا بیگم

ایک نہایت مشہور و معروف شاعر جو اب بوجہ طول العمر ہونے کے سفید ہو گئے ہیں ۔ داڑھی لمبی بھی ہے سفید بھی ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ ضعف کی وجہ سے کہیں آنا جانا دشوار ہو گیا ہے ۔ بالکل گوشہ نشین و عزلت گزیں ہیں ۔ لوگوں نے ان پر بنارسی سڑے انگور کی پھبتی کہی ۔

ایک کریہ المنظر سیہ فام شاعر اپنے ایک دوست کے بچے کو کھلا رہے تھے ۔ خود لیٹے ہوئے تھے ۔ اور بچہ کو چھاتی پر بٹھا رکھا تھا ۔ ان کے دوست نے دیکھا تو پھبتی کہی ۔ آپ کے نور و شعور پر دار ہے ۔

پھبتی بہترین وہ ہے جس میں کنایہ کے ساتھ کوئی بات کہی جائے ۔ مثلاً ایک کاسہ برد بد قطع شخص سانگ لیے رہتے تھے ۔ لوگوں نے کچھ چھیڑنا چاہا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت نہ بولنا ۔ کاٹ لے گا ۔ غصہ میں اپنی دُم چبا رہا ہے ۔

پھبتی کا وجود جس طرح فارسی نظم میں پایا جاتا ہے اسی طرح اُردو میں بھی ہے ۔ چنانچہ منتکار خاں ایک صاحب پر آرد کے مستفنے منقطع کی پھبتی کہی ۔

یار و خدا منتکار خاں خوبوں کے بیچ   ہے تو مستفنے و لیکن منقطع

میر تقی میر شیخ جلد نشین پر پھبتی کہتے ہیں ۔

تو بہ زاہد کی تو بہ تلی ہے   بیٹھ بیٹھے تو شیخ جلی ہے

شیخ امام بخش ناسخ ایک زاہد کے سر اور عمامہ پر پھبتی کہتے ہیں ۔

دیکھنا ناسخ سر شیخ معمم کی طرف   کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

نسیم ایک دیوی کے ہر عضو پر پھبتی کہتے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے ۔

نور سیاہ تھال اُس کے   برگد کی جٹا ہیں بال اُس کے

ایک ایسی ہی جگہ اور کہتے ہیں ۔

دانت اُسکے تھے گورکن قضا کے   دو تھے رہ عدم کے ناکے

آخر میں ایک ظریف شاعر اپنے معشوق کی مانگ پر پھبتی کہتے ہیں ۔

یہ اُن کی مانگ پہ پھبتی کہی ہے یاروں نے   کہ کالے سانپ دو ہیں فنا سا کھنکھجورا ہے

اسی طرح مسی لگے ہوئے دانتوں پر ایک عجیب انداز سے پھبتی کہتے ہیں ۔

ان نازک نازک دانتوں پر کیوں بار مسی کا ڈالا ہے   میں خوب سمجھتا ہوں اسکو کیدال میں کالا کالا ہے

غرضکہ پھبتی کو صرف تشبیہ سے علاقہ نہیں ۔ بلکہ پھبتی وہ ہے جو تشبیہ سے گزر کر استعارہ کی صورت اختیار کرے

اور اس میں ہر قسم کی وہ پھبتی ہے جس میں صرف استعارہ رہ جائے اور مستعار لہ اور مستعار منہ کا ذکر ہی نہ رہے۔

ہجو وہ گفتگو ہے جس میں طنز، طعنہ، ملامت، غصہ، رمز و کنایہ، استہزا، پھبتی وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس گفتگو سے ہمیشہ اپنے مخالف کی دل آزاری مقصود ہوتی ہے۔ اس کو ظرافت سے اسی واسطے تعلق ہوتا ہے کہ اس میں رمز و کنایہ، استہزا، پھبتیوں، فقروں، طنز وغیرہ کا بھی شمول ہوتا ہے۔ جیسا کہ انوری ایک طویل القامت آدمی کی ہجو کرتا ہے۔

اے خواجہ درازیت سیدہ است بجائے کز اہل سماوات بگوشت برسد صوت
گر عمر تو چوں قد تو بودے بدرازی تو زندہ بماندے دم بُرّے ملک الموت

وہ شخص جس کی ہجو کی گئی ہے۔ اس کو تو یقیناً برہم اور متالم ہوگا۔ گر ایک غیر متعلق شخص کے لئے یہ خالص ظرافت ہوگی۔ اور وہ اس سے بوجہ احسن لطف اندوز ہوسکے گا۔ اور درازی پر وہ طعن آمیز تمسخر جو اس میں موجود ہے۔ اوس کے لئے ایک سامان تفریح ہوگا۔

سعدی ایک داڑھی منڈانے والے نوجوان کی ہجو اس طرح کرتے ہیں۔ اور ہجو میں ایک طنز و طعنہ شامل کرتے ہیں۔

گر دست بجان داشتے ہمچو تو بر ریش نگذاشتمے تا بہ قیامت کہ بر آید

یعنی جس طرح تو داڑھی پر ہاتھ رکھتا ہے اس طرح اگر میں جان پر ہاتھ رکھتا تو قیامت تک اُس کو اپنے جسم سے نہ نکلنے دیتا

میر تقی میر اوباش اور بازاری لڑکوں کی ہجو کرتے ہیں۔

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل و خوابہ

تشبیہ شامل کرکے اس میں ایک ظرافت پیدا کردی گئی ہے۔

میر صاحب ایک پُرخور شخص کی ہجو کرتے ہیں۔

صد منی دیگ ہے شکم اوس کا نفس اژدہا ہے دم اُس کا

اس ہجو میں پیٹ پر صد منی دیگ۔ اور دم پر نفس اژدھا کی پھبتی کہکر ظرافت پیدا کی گئی ہے۔

سودا اپنے حریف ظریف میر ضاحک کی ہجو اس طرح کرتے ہیں۔

ریم سوزاک بدر ہے تو شریر رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

اس ہجو میں ریم کو اُلٹ کر میر کہا۔ اور اُسی سے ہجو کے ساتھ ظرافت پیدا ہوگئی۔ اسی طرح میر ضاحک کی ایک دوسری ہجو میں صرف تمسخر کے ساتھ ظرافت پیدا کی ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا بیوجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھے بڈھے چونڈے کو جب ہلایا تب شیخ سدو اُس پر غصہ کو کھا کے آیا

بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

یہ ہجو کا ایک بند ہے جو نمونتاً لکھا گیا ہے۔ ورنہ اول سے لے کر آخر تک اس میں وہی تمسخر اور ہجو کی شان ہے اور اسی سے ظریفانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ایک شخص نے مسجد کا بیعنامہ کر دیا۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اوس کے حق میں فرماتے ہیں۔

کیا کہتے ہیں اس میں مفتیان اسلام　　جب بیع مساجد سے نہیں جائز کام
تو وجہ کفاف کے لئے مومن کو　　جائز بھی ہے انہیں خدا کا نیلام

اس ہجو میں طنز بطریق رمز و کنایہ شامل کر کے اور استفہام کے طریق پر استفسار کر کے ظرافت پیدا کی گئی ہے۔ اسی طرح رمز و کنایہ شامل کر کے مولانا حالی مولویان زمانہ حال کی خبر لیتے ہیں۔

کہنا فقہا کا مومنوں کو ہے دین　　سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقین
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال　　تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

غرض کہ ہجو میں بھی وہ تمام چیزیں شامل کی جاتی ہیں جنھیں اجزائے ظرافت میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ظرافت کا جب ذکر کیا جائے گا۔ ہجو بھی اوس کے اقسام میں سے شمار کی جائے گی۔ اگرچہ اوس کا مقصد ظرافت سے جدا اور اس کا مفہوم مذاق سے علیحدہ ہے۔

ریختی شعر کی ایک قسم ہے۔ جس میں عورتوں کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اور انھیں کے رسوم۔ محاورات ضرب الامثال لکھے جاتے ہیں۔ دراصل ریختی غزل ہی کی بگڑی ہوئی ایک صورت ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب زمانہ اپنی رنگینیوں اور عیاشیوں میں شرابور ہو رہا تھا۔ تفنن طبع کے طریق پر لوگوں نے اس عہد کی رسم کو تازہ کرنا چاہا۔ جب ہندوستان کی بھاشا شاعری میں عورت کی طرف سے اظہار محبت کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی شاعری کی مثال زمانہ اوائل عہد اردو میں ملتی ضرور ہے۔ مگر شاذ و نادر ولی اور رحمان کا معاصر ایک شاعر دکھنی رحیم کہتا ہے۔

اری نادان تین اپنے سجن کو کیوں رُٹھایا ہے　　رُٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے
بہت پچھتائیگی میری نصیحت مان کہتی ہوں　　سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ یہ صنف شاعری امیر خسرو کے وقت سے رائج ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ اس کا عروج رنگین اور انشا کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے اس صنف کو نہ صرف تازہ کیا۔ بلکہ لطف بڑھانے کے لئے اون کے محاورات اور روزمرہ کا اس میں اضافہ کیا۔ پھر بقدر ضرورت اس میں ہزالی اور فواحشات کو دخل دیا۔

لطیفہ نام ہے اُس ظرافت کا جس میں کسی چھوٹے سے واقعے کو ظرافت کی چاشنی دیکر اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اس میں کوئی خاص چیز ایسی نہیں ہوتی جیسے لطیفے کے مخصوصات میں شمار کیا جائے۔ البتہ حسن بیان اور طرز

اونکی فید بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر لطیفہ معمولی گفتگو سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس میں بھی دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک کسی واقعہ کا بذاتہ اتنا دلچسپ ہونا۔ جس میں حسن پیدا ہو جائے دوسرے کسی واقعہ میں انداز بیان سے کوئی خاص ندرت پیدا کر دینا۔ چنانچہ ذیل میں اس قسم کے کچھ لطائف درج کئے جاتے ہیں۔

حکیم سولن کا ایک لڑکا مر گیا۔ اور وہ اس کے غم میں رویا۔ لوگوں نے کہا کہ رونے سے کیا فائدہ۔ حکیم نے جواب دیا کہ بس اسی لئے میں روتا ہوں کہ رونا بیکار ہو گیا۔

سعدی ایک مکان کی خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ وہاں ایک یہودی رہتا تھا۔ اُس نے شیخ کو ترغیب دی کہ خرید لیجئے میں اس کا ہمسایہ ہوں اس مکان میں کوئی عیب نہیں ہے۔ سعدی نے جواب دیا۔ بس یہی عیب ہے کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔

سقراط کی بیوی بہت بد خو تھی ایک مرتبہ لڑ کر پانی کی بھری ہوئی پتیلی چیخ کر پھینک دی۔ سقراط بولا کہ پہلے گرجا اور پھر برسا۔

ایک یونانی پہلوانی کرتا تھا لیکن ہر دنگل کے موقع پر ہمیشہ پچھاڑا جاتا تھا۔ آخر کار اُس نے پہلوانی چھوڑ کر طبابت شروع کی۔ سقراط نے اوس کو اس فن میں مصروف دیکھ کر کہا کہ اب تم لوگوں کو پچھاڑا کرو گے۔

سقراط کی بیوی اُس وقت بہت رو رہی تھی۔ جب سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا تھا۔ سقراط نے پوچھا کہ تو کیوں روتی ہے۔ کہا اس لئے کہ تو بے گناہ مارا جاتا ہے۔ سقراط نے کہا۔ ارے کمبخت کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کسی گناہ پر مارا جاؤں۔

یہ لطائف جو لکھے گئے ہیں۔ ان میں وہ ظرافت ہے جو صرف مشاق اور ظرافت آگاہ لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہے عوام کے لطائف قصداً نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ظرافت بالقصد اکثر نہیں پائی جاتی۔ دوسرے اس قسم کے لطائف اس قدر مشہور ہیں یہاں اون کا لکھنا بیکار ہے۔

کہیں نہ لطیفہ ہوتا ہے۔ نہ ہزل۔ نہ پھبتی۔ نہ پھکڑ بلحاظ ظرافت کا دار و مدار دوسری چیزوں پر رکھا جاتا ہے۔ کہیں اپنی اصلی وضع یا اپنی اصلی گفتگو کو چھوڑ کر کسی دوسرے فرقہ کی گفتگو اختیار کی جاتی ہے۔ کہیں بالکل بےمعنی بات کہی جاتی ہے۔ اور اس کو سنکر سننے والے کو ہنسی آتی ہے۔ کہیں ایک زبان میں دوسری زبانوں کی آمیزش کر کے اور گفتگو کو معجون مرکب بنا کر ظرافت پیدا کی جاتی ہے۔ کہیں واقعات مضحک کا بطریق تلمیح ذکر کیا جاتا ہے۔ کہیں کسی شعر کی غیر موزونی ہی ظرافت اور ہنسی کا سبب ہوتی ہے۔

ان سب باتوں کے بعد یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی ہنسی کی فلسفہ یہ ہے۔ کہ اُس کے سامنے

کوئی ایسی بات کہی جائے جو معمول سے ہٹی ہوئی ہو۔ یا ایسا کام کیا جائے جو مروج نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایک کمزور مریض کو چلتے اور ڈگمگا کر گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ بلکہ اس کی بجائے افسوس ہوتا ہے۔ اور جب ایک جوان۔ طاقت ور کو کہیں پھسلتے گرتے دیکھتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی غیر متوقع اور غیر معمولی بات سے ہنسی نہ آئے۔ مگر یہ مسلم ہے کہ ہنسی جب آئے گی وہ غیر معمولی بات یا غیر متوقع واقعہ ہی سے آئے گی۔

اسی سلسلہ میں جب ہم مرزا غالب کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لیے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں۔ نہ لطائف پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں۔ نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں۔ خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لاتے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں۔ مگر ان کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اوسی سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ [illegible] میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔

کس قدر حیرت خیز۔ اور کتنا تعجب انگیز ہے یہ امر کہ وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں اور بہت ناراض ہوتے ہیں۔ لہجہ ان کے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں کانپتے نظر آتے ہیں۔ چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار ہیں۔ ماتھے پر شکنیں پڑی ہیں۔ غصہ سے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ زیر لب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر سننے والا سمجھتا ہے کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور دل میں انبساط پیدا ہو رہا ہے۔ ان کی ظرافت اگر صرف ظرافت ہو تو خیر کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر ان کے یہاں تو اوسی میں اخلاق ہے۔ اوسی میں رنج و ملال کا اظہار ہے۔ اوسی میں ان کی عادات فطری کے تذکرے ہیں۔ اسی میں جذبات محبت ہیں۔ اوسی میں درد کا بیان ہے۔ اوسی میں تاریخی واقعات ہیں۔ اوسی میں شہر دہلی کے حالات ہیں۔ اوسی میں تعلیم ہے۔ اوسی میں تلقین ہے۔ اوسی میں شفقت بزرگانہ کا اظہار ہے۔ اوسی میں محبت دوستانہ کا ظہور ہے۔ وہیں فخر و مباہات کے دریا بہتے ہیں۔ اور وہیں سر عجز و نیاز جھکا رہتا ہے۔ غرض کہ ان کے چند فقرے نہ صرف تفنن کا کام دیتے ہیں۔ بلکہ ایک وسیع فضا پیش کر دیتے ہیں جہاں لطف و تفریح کے ساتھ عبرت و بصیرت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اور لوگ بھی جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اس رنگ کے لکھنے والے ہیں مگر وہ ظرافت حقیقی جس سے روح کو لطف حاصل ہو۔ وہ صرف مرزا کا حصہ ہے۔ عالمگیری تحریر میں بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ مگر ان کی ظرافت میں ایک جاہ و جلال۔ اور ایک نوع کا غصہ بھی شامل ہے۔ مثلاً وہ محمد معظم شاہ کو لکھتے ہیں۔

"اعلیحضرت فردوس منزلت بہ گرفتن ولایت بلخ و بدخشاں و خراسان و ہرات ملک قدیم موروثی توجہ مفرط داشتند و مرزا نو ارجمند بادشاہی بسر کردگی مراد بخش بآن سو فرستادہ شد چنانچہ اکثر آں ولایت فتح و تملک شد لیکن بہ سبب کم حوصلگی آں نامراد کہ بے ملاحظہ مصلحت بر خاستہ آمد و اصلاً بہ اہالی و اکابر آں دیار نپرداخت ملک مفتوح و مقبوضہ از دست رفت و کلیات زر ضائع گشت ....."

کہ گفتہ اند از پسر ناخلف دختر بہتر۔ نظر بایں توجیہ کہ ہیچ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ ایں فانی را آرزو باقی است و تدبیرش جز اینکہ نبیرۂ آنحضرت را با فوجی شائستہ و سامانی بایستہ بایں سمت بفرستیم دیگر از ما چہ می آید۔ باوجود تاکیدات حضور شما قدرت رہانہ گرفتہ آید۔ تا بایں مہم چہ رسد۔ ظاہرا کار بار از شما نیست۔ عارف بخود نیز عارف است۔ ایں نمود بے بود نمود آفتاب بر کوہ است بدست آمد چہ باید چہ شما فکر خود کنید کہ در بتاں پریشاں چہ رو خواہید نمود۔ و در انجا بحضرت حق سبحانہ تعالیٰ و حضرت اعلیٰ،،

ضائع گشت تک مندرجہ بالا عبارت میں بہت خشکی ہے۔ از ینجاست سے عبارت میں رنگینی شروع ہوتی ہے۔ نظر بایں توجیہ سے عبارت میں ایک حسن کے ساتھ ظرافت کا بہت ہلکا رنگ شروع ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر حسن تنبیہ ظریفانہ انداز میں ہے۔ گو ہر فقرہ سے غصہ۔ طنز۔ طعن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نبیرۂ آنحضرت۔ دیگر از ما چہ می آید۔ تا بایں مہم چہ رسد۔ ظاہرا کار بار از شما نیست۔ عارف بخود نیز عارف است۔ شما فکر خود الخ یہ سب فقرے حسن عبارت کے ساتھ بہت ہلکی ظرافت اپنے ذیل میں لئے ہوئے ہیں۔ مگر کمی اتنی ہے کہ رنگ طنز غالب ہے اور ظرافت مغلوب۔

حکیم سوزنی۔ انوری۔ جعفر زٹلی وغیرہ ہزل تک پہونچ کر رہ گئے اس کے سوا اور کچھ ان کے یہاں نہیں ملتا۔ البتہ سعدی کے ظریفانہ رنگ میں ہر جگہ ظرافت محض کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اور بہار کا کام دیتا ہے

اردو میں بہت سے ظریف ہیں۔ مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کو ایک خاص ملکہ ہے مگر دو باتیں ہیں ایک تو صرف نظم پر ان کی ظرافت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام میں کوئی خاص ظرافت نہیں بلکہ اوس کا انحصار محض ایک خاص فرقہ کا خاکہ اڑانے اور ہر ایک خاص جماعت کی ہجو تلمیح کرنے پر ہے۔ جس سے ایک تصویر دیکھنے والے کی نظر میں پھر جاتی ہے اور اسی پر تمام لطف کا انحصار ہوتا ہے

برعکس اس کے مرزا نظم اور نثر دونوں میں ظرافت کے بادشاہ ہیں۔ اون کا کوئی خط ایسا نہ ملے گا جس میں ظرافت نہو۔ مگر نہ اورنگ زیب کی طرح وہ یبوست کو مزاحی رنگ پر غلبہ دیتے ہیں۔ اور نہ نعمت خان عالی کی طرح الفاظ کے گورکھ دھندے کو ہر جگہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ انوری۔ سوزنی۔ جعفر زٹلی کی طرح فواحش پر اتر آتے ہیں۔ نہ اکبر کی طرح کسی خاص طبقہ اور فرقہ کی طرف سے اظہار تنفر کرتے ہیں۔ اور ان سب عیوب ظرافت سے بچے رہنے کی خاص وجہیں ہیں۔ یبوست سے بچنے کا سبب یہ ہے کہ وہ دراصل فطری ظریف ہیں۔ شاد و خرم ہشاش بشاش دل اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔ تصنع اور آورد کا اُن کے یہاں نام بھی نہیں۔ جو لب پر ہے وہ دل میں بھی ہے۔ جو دل میں ہے وہ لب پر بھی ہے۔ برعکس اس کے عالمگیر کے مزاج میں خشکی بھی ہے۔ ظرافت بھی ہے۔ شاہی تمکنت بھی ہے۔ ہر جگہ شان ملوکیت کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ تقویٰ و طہارت بھی دامنگیر رہتی ہے خلق زندہ دلی بھی ان سب میں تھوڑی بہت شامل ہو جاتی ہے۔

نعمت خاں عالی کی طرح الفاظ کے پھیر میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ مراعات النظیر۔ یا رعایت الفاظ سے انھیں

پر ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت صاف کہتے ہیں۔ مُراسلت یا مکاتبت کو جب تک کہ مکالمہ نہیں بنا دیتے انہیں چین ہی نہیں آتا۔ چنانچہ مفتخرانہ انداز سے جا بجا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

انوری ستوزنی کی طرح پھکڑ نہیں بکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اون کی سوسائٹی بہت بلند ہے۔ سوائے ایک دو جگہوں کے اون کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی کے مرتبہ سے کم ہو۔ عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت۔ بہی عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اعلےٰ تعلیم حاصل کی۔ ذوق سلیم۔ و صحیح مذاق لائے۔ پھر اُن کو ان باتوں سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اُن کے رقعات کو دیکھئے اور ان کے مکتوب الیہم کو جانئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ وہ کس قدر مزاج داں۔ و نبض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں۔ رضا و غضب کی حالت ہو۔ کیف و سرور ہو۔ مزاج کا غلبہ ہو۔ غم ہو۔ رنج ہو۔ خوشی ہو۔ مصیبت ہو۔ غرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے قلم سے کوئی لفظ مکتوب الیہ کی شان کے خلاف نکل جائے۔ اور وہ اپنے درجہ و مزاج شناسی سے ہٹ جائیں۔ صرف یہی نہیں کہ اس کو ملحوظ رکھیں۔ صرف یہی نہیں کہ کوئی لفظ نامناسب یا خلاف محل استعمال نہ ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ مکتوب الیہم کی شان مرتبہ اور افتاد طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے۔ اور ان کا رنگ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے۔ اب ہم غالب کی شوخی و شوخ نگاری کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمدنی و معاشرتی زندگی میں

منشی ہرگوپال تفتہ مرزا کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ مرزا کو اُن سے کمال محبت اور اُنس تھا۔ اور وہ بھی ان کے جان نثار تھے۔ اگر خط بھیجنے میں کبھی دیر ہوتی تو مرزا کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اور منتظر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ یہی اتفاق پیش آیا مرزا نے لکھا کہ

"بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو،،

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں مرزا کے محبوب دوست تھے۔ اون کے خط میں دیر ہوئی تو خدا نام کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نجات کا طالب ہے اور تم سے اس رقعہ کے جواب کا طالب غالب،،

حکیم ظہیر الدین احمد خاں غلام نجف خاں کے بیٹے تھے۔ مرزا ان سے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مرزا رام پور گئے تو شاید گھر کا کوئی خط اور مختار کی کوئی چٹھی نہ پہونچی۔ تو ظہیر الدین احمد خاں سے ان الفاظ

ساتھ گھر کا دالان لوٹیا۔

"کیدار ناتھ ڈیوڑھی پر آکر بیٹھا کہ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر علی الصباح مجھ کو لکھیو اور ضرور لکھیو۔ خط کے جواب کا طالب فقیر غالب"

آخر عمر میں مرزا املاک و نفوس سے ... دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ کر متانت اور ظرافت کا اظہار اسی انداز سے کرتے تھے۔ چنانچہ علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

"تمہارے والد ماجد سے اور تمہارے بڑے چچا اور تمہارے عم عالیمقدار سے کہہ چکا ہوں خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو یہ تمہارے ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ میں اب اس بوجھ کا تحمل نہیں ہو سکتا میرا قصد یہ ہے کہ پنشن اگر مل گیا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی چاہا وہاں رہ گیا یہاں سے دل اکھڑا چل دیا"

مرزا علاء الدین خاں کے دلی آنے کی خبر سنی تو خود انہیں کو لکھتے ہیں۔

"یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز مخدوش۔ انجام مغشوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ۔ شرط جزا سے محروم سنا اور متواتر سنا کہ قصہ ٹھٹ ہو گیا۔ اب علاء الدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج کے دیکھوں گا۔"

کسی بات کے پوچھنے میں بھی مرزا کا ایک جداگانہ انداز ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے ایک مرتبہ کوئی بات لکھی اور ساتھ ہی عدم یقین کی وجہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ "راست و دروغ بہ گردن راوی" مرزا کو اس بات سے کوئی تعلق تھا۔ تفتہ سے تفصیل چاہی تو وہی تفتہ کا فقرہ لکھ کر عبارت میں تفنن اور ظرافت کا رنگ پیدا کر دیا۔ لکھتے ہیں کہ

"میاں وہ راست و دروغ بہ گردن راوی نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو"

میر مہدی مجروح مرزا کے مایہ ناز اور مشہور شاگرد ہیں۔ غدر کے آشوب ناک زمانے میں دہلی سے نکل کر پانی پت میں جا رہے تھے۔ مگر باہم مکاتبت و مراسلت دلی والوں اور خصوصاً مرزا سے برابر جاری تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے آنے کو لکھا تو مرزا صاحب نے جواب میں یہ اشتیاقیہ ظرافت آمیز فقرہ لکھا۔ جو القاب۔ ظرافت۔ تخاطب سب ہی کچھ ہے۔

"کیوں یار کیا کہتے ہو۔ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں۔ تمہارا خط پڑھ کر دس بارہ یہ شعر پڑھا ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔

غلام نجف خاں نے آنے کے لئے لکھا تو ان کو اشتیاقیہ خط لکھتے ہیں۔

"کہو اب خیر سے کب آؤ گے۔ کتنے برس، کتنے مہینے، کتنے دن راہ دکھاؤ گے"

نہ کوئی تشبیہ نہ پھبتی ہے۔ نہ پھکڑ ہے۔ صرف انداز بیان نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

نواب سعد الدین خاں شفق رئیس کابلی مرزا کے غائبانہ دوست تھے۔ ایک مرتبہ ان کا خط آیا تو لکھتے ہیں

"پیر و مرشد تمہارا خط جس وقت پہنچا میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو ننگا تھا، کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا۔"

علاء الدین احمد خاں بہت دنوں سے آنا آنا کر رہے تھے۔ روز لکھتے تھے کہ اب آتا ہوں اور اب آتا ہوں۔ مگر یہ وعدے سب نقش بر آب ہوتے تھے۔ آج آتے ہیں کل۔ ایک مرتبہ لکھا کہ عید کے مہینے میں آؤں گا تو مرزا نے جواب میں لکھا۔

"رجب بیگ۔ شعبان بیگ۔ رمضان بیگ۔ یہ نام رکھے ہیں سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس اب عید ہے۔ اور روز سعید ہے تو کیا عجب ہے کہ بخلاف شہور ثلاثہ ماضیہ اس مہینہ میں تم آسکو۔ یہ ہے میں تو کہتا ہوں نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا ہنگامہ گرم ہو کر پارسیوں کی کوسہ برنشین کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی دولہنڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلی۔ حسن اتفاق یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا موسم لایا ہے۔ پھر یہ چند روز اور ستم کش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منائے۔ اور خرسوار کو بضرب تازیانہ دوڑائے۔ علاء الدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں تو مولوی ہے۔ ارے ظالم اس کوسہ برنشین کی داد دے۔ عقل ہے۔ کرامت ہے۔ الہام ہے۔ لطف طبع ہے۔ کیا ہے۔ یہ اسم کس قدر مناسب مقام ہے"

غدر کا ہنگامہ برپا ہے۔ گلی گلی نوحہ و ماتم ہے۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ ہر کوئی اپنی بلا میں گرفتار ہے۔ مجرموں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ مرزا بھی حال اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اور لطف سے کہتے ہیں

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دُکھ مجھکو ہے اُس کا بیان تو معلوم مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اُس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا۔ اور کوئی میرا شفیق۔ کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز۔ کچھ دوست۔ کچھ شاگرد کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"

مندرجہ بالا عبارت میں انتہائی افسوس کا اظہار ہے لیکن شوخی بیان بدستور قائم ہے۔

ہنگامہ غدر کے بعد مرزا اس لئے معتوب ہوئے تھے کہ وہ بھی دلی کے آخری تاجدار کے مصاحب تھے۔ چونکہ اُس زمانہ میں ظفر کے کلام پر مرزا ہی اصلاح کرتے تھے۔ اِس لئے ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ تم نے بادشاہ کے لئے سکہ کہہ دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ سکہ ظفر کے پہلے اُستاد ذوق مرحوم نے کہا تھا۔ اور مطبع مولوی محمد باقر دہلوی میں دہلی اردو اخبار میں چھپا تھا۔ مرزا کو یہ بات یاد تھی۔ انہوں نے اپنی بریت کے لئے ادھر اُدھر اپنے دوستوں کو خط لکھے کہ کہیں وہ اخبار مل جائے تو بھیجدو۔ چودھری عبد الغفور مارہروی کو بھی یہی لکھا تھا۔ اُنہوں نے بہت ڈھونڈا نہیں نہ ملا۔ اُنہوں نے مرزا کو لکھا کہ اخبار نہیں ملتا۔ اپنے جواب میں اُس افسوس کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ ذرا دیکھئے کس قدر شگفتگی برستی ہے۔

"آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دل نشین اور خاطر نشان ہے . . . .
وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا نہ آئے گا۔"

میر سرفراز حسین کو ایک خط لکھتے ہوئے گذشتہ صحبتوں کو یاد کرتے ہیں۔ اور اپنے احباب خاص کا نام گنا کر کہتے ہیں۔

"مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا ہوں بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتمدار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھکو کون روئیگا۔ سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔"

میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"خلاصہ میرے فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے سُنی الگ شیعہ الگ۔ نیک جُدا بد جُدا۔"

سیّد احمد حسین پرودودی کو لکھتے ہیں۔

"خداوند نعمت کیا نام دلی کو آباد۔ اور قلعہ کو معمور۔ اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو۔ جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا حال پوچھتے ہو۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ وگاؤ را قصاب برد۔ وقصاب در راہ مُرد۔"

مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔

"ہائے میرجان جا کو ب کیا جوان مارا گیا ہے۔ یہ بھی اُنھیں میں ہے۔ کہ جنکا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں۔ اور کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں۔"

یوسف مرزا کو دلی کی ویرانی پر افسوس کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔

"جب اہل شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو لیکے کیا چولھے میں ڈالوں"

منشی شیو نرائن نے مرزا کو لکھا کہ میرے اخبار کے کچھ خریدار پیدا کیجئے۔ مرزا نے دلی کی تباہی پر آنسو بہائے ہوں گے مگر ظاہرا ہنستے ہوئے ایک ایسا ظرافت آمیز جواب لکھ بھیجا کہ شیو نرائن کی تسلی کو کافی ہو گیا لکھتے ہیں۔

"یہاں آدمی کہاں کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔"

مرزا شراب کے عادی تھے۔ مگر دیسی شراب سے اُن کو نفرت تھی۔ ہمیشہ اولڈ ٹام پیتے تھے۔ جس کی بوتلیں چوبیس روپیہ درجن کے حساب سے اُس زمانہ میں ملتی تھیں۔ ۱۸۵۸ء میں غدر کے بعد اس کی قیمت بڑھ کر پچاس اور ساٹھ روپیہ درجن ہو گئی۔ مرزا بہت گھبرائے اور اپنے ایک عزیز یا دوست کانپور کے رہنے والے کو لکھا۔ کہ وہاں کچھ سستی ہو تو بھیجو۔ اونہوں نے لکھا کہ وہی نرخ یہاں ہے۔ مرزا صاحب نے گھبرا کر لکھا۔

"جب وہاں بھی اس قیمت کو ملتی ہے تو میرا مقدور نہیں میں سمجھا تھا کہ شاید وہاں ارزاں ہو خیر اس کو جانے دو۔ روٹی ہی ملے جائے تو غنیمت ہے۔ مہینہ بھر کی روٹی کا مول ایک درجن کی قیمت ہے۔"

مرزا نے بعض جگہ چند الفاظ کے اجتماع سے عبارت میں تفنن اور شوخی پیدا کی ہے۔ ہرچند کہ وہ الفاظ کے اجتماع سے گھبراتے تھے۔ مگر پھر بھی کسی جگہ خاص خاص طریقہ سے الفاظ کا اجتماع کیا ہے۔ اور اُن سے ایک خاص بات پیدا ہو گئی ہے۔ مگر یہ نہیں ہے کہ انکو کہیں مراعات النظیر وغیرہ کی فکر ہوئی ہو۔

میاں داد خاں سیاح جو مرزا کے نہایت راسخ العقیدہ شاگرد تھے۔ سیر و سفر کے عادی تھے۔ جب وہ ایک مرتبہ سورت اپنے مکان پر پہونچے تو مرزا نے لکھا۔

"سورت کا پہونچنا بہ صورت مبارک ۔"

ایک مرتبہ تفتہ کو لکھا کہ "بندہ [illegible] ...... میں جب جیتا تھا تو تم اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا" پھر لکھتے ہیں

"اور [illegible] میں جو آپ نے مجھ کو مردہ لکھا ہے وہ باعتبار ترک اصلاح نظم لکھا ہے ورنہ زندہ ہوں مردہ نہیں بیمار بھی نہیں ..."

مرزا کا دیوان اُردو جب پہلی مرتبہ چھپا تو میر مہدی ۔ اور دوسرے لوگوں نے ایک ایک جلد مانگی اور لکھا کہ تینوں آدمیوں کے لئے ایک ایک جلد بھیج دیجئے۔ مرزا نے الفاظ میں ظرافت کی۔

"اگر خدا چاہے تو اسی ہفتہ میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہونچ جائیں۔"

نصیر الدین میر مہدی کے دوستوں میں تھے۔ اور اسی توسط سے مرزا بھی اُن پر مہربان تھے۔ ایک مرتبہ میر مہدی کو خط لکھا تو یہ فقرہ لکھ بھیجا۔

"نصیر الدین چراغ دہلی کو اور میر [illegible] صاحب کو دعا کہنا ۔"

ایک جگہ حکیم ظہیر الدین [illegible] کی طرف سے نجم الدین حیدر اور ان کے چچا کو خط لکھا۔ اس میں وہ الفاظ کی تکرار کی اور انشاء اللہ سے کام لیا۔ کہ [illegible] وغیرہ کو مات کر دیا ہے

"سبحان اللہ کیا خوب حسین کی آنکھ [illegible] کا دم بند۔ اور [illegible] نے بجلی کو [illegible] ۔ گو [illegible] اس کا خط اک [illegible] ۔ [illegible] آخر [illegible] استغفر اللہ کیا باتیں کرتا ہوں [illegible] ۔ کیسا [illegible] [illegible]"

"[illegible] مہینے میں [illegible] اچھا ہو گیا۔ [illegible] قالب میں آ گئی۔ اجل نے [illegible] خدمت [illegible] کی رسم اٹھائی ۔"

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کو ایک قصیدہ بھیجا۔ انہوں نے نہ جواب دیا۔ نہ رسید بھیجی۔ مرزا نے جب دوسرا خط لکھا تو [illegible] لکھ دیا۔ انہوں نے لطیفہ کو سمجھ لیا۔ اور جواب میں پوچھا کہ مرزا صاحب یہ کیا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ

"یہ دو شعر [illegible] لکھا تو کیا گناہ ۔ نہ خط کا جواب ۔ نہ قصیدے کی رسید سے

در [illegible] بود شاید خستہ گستاخ گوے"

انہیں شفیق کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"احترام الدولہ بہادر میرے ہمزبان اور آپ کے ثنا خواں ہو گئے۔ گویا اس امر خاص میں ہم شریک غالب ہیں۔ ہم بطریق کسرۂ اضافی و ہم بطریق کسرۂ توصیفی"

نواب صاحب نے ایک مرتبہ اپنے اعزہ کی کچھ شکایت لکھی۔ مرزا کو خط ملا تو جواب میں لکھا۔

"قبلہ و کعبہ کیا لکھوں امور دنیا میں اضداد کا جمع ہونا محالات عادیہ میں سے ہے۔ کیونکر ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب انشراح کا بھی ہو اور باعث انقباض کا بھی ہو یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی"

میر احمد علی واقف لکھنوی کا ایک مرتبہ نواب صاحب سے ان الفاظ کے ساتھ حال پوچھا۔

"میر احمد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اون کے تفحص نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔"

نواب ذوالفقار الدین حیدر خاں کو خبر دیتے ہیں۔

"مرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے انہوں نے ضد پکڑی ہے۔ دیکھئے یہ حکم اٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں"

تذکرہ نویسوں نے لطیفہ کیا۔ اس کی جب علاء الدین احمد خاں کو خبر ہوئی تو انہوں نے دبتے دبتے مرزا سے شکایت کی کہ فدایان میں بھی ہوں۔ مرزا نے جواب لکھا اور الفاظ کے پھیر میں خدا جانے کیا کہہ گئے۔

"مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفہ اول ہے تو تم خلیفہ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تمیز تقدم زمانی ہے۔ ایک اول ہے۔ ایک ثانی ہے۔"

دسمبر ۱۸۶۵ء میں رام پور میں کوئی بڑا جشن ہوا جس میں اکثر معزز انگریز بھی مدعو تھے۔ اور بہت اہتمام اور تزک و احتشام عمل میں لائے جا رہے تھے۔ مرزا اُس زمانے میں رام پور ہی میں تھے۔ چنانچہ علاء الدین احمد خاں کو یہاں کا حال لکھتے ہیں۔ اور ایک فقرہ سے عبارت میں ظرافت کی روح پھونک دیتے ہیں۔

"آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی آتش بازی کی وہ افزا کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم۔ شام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہئے۔"

میر ... حسین ... کسی تقریب میں خربزے تقسیم ہوئے آپ نے لکھا۔

"میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ تازے خربزے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے۔ تازہ شے بہتر، بارہ سے بہتر۔"

دیکھئے اس تاریخ میں سابنیس سے دبان ڈال دی ہے۔
جس زمانے میں عود ہندی چھپنے کو تھی۔ اور منشی غلام غوث بیخبر اس کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ تو مرزا صاحب نے لکھا۔

"اور ہاں حضرت، مجموعہ چھپے گا (بالفتح) یا چُھپے گا (بالضم)۔"

اسی بارہ میں ایک اور رقعہ نواب غلام غوث صاحب کو لکھتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ نواب صاحب مرزا پر زور دیتے تھے کہ دیباچہ آپ لکھیے۔ مرزا صاحب نے لکھا۔

"مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اس مجموعہ کا چَھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چُھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

رسم است کہ مالکان تحریر آزاد کنند بندہ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔"

مالکان تحریر سے مراد ہے کہ جو لوگ غلاموں کے مالک ہیں وہ بڈھے غلاموں کو آزاد کر دیتے ہیں۔ تو مالک تحریر آپ بھی ہیں یعنی آپ میرے مالک بھی ہیں اور صاحب تحریر یعنی مصنف بھی ہیں۔

مرزا القاب و آداب کی پرانی اور فرسودہ رسم کے سخت خلاف تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ مراسلہ مکالمہ کی صورت میں آجائے اور اس میں آورد کے تکلفات نہ پائے جائیں۔ اسی واسطے انہوں نے نئی نئی طرح کے القاب نکالے جن میں بعض تو ایسے ہیں جو براعت الاستہلال کا کام دیتے ہیں یعنی القاب سے مکتوب الیہ کے حالات موجودہ اور اخلاق پر روشنی پڑجاتی ہے۔ اور بعض وہ ہیں جو طنز آمیز ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو باہمی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اکثر القابوں میں وہ خیال رکھتے ہیں کہ ظرافت کا رنگ باقی رہے۔ سیاح سے اُن کو ایک خاص تعلق تھا۔ بعض رسالے بھی اُن کے نام سے لکھے۔ اور سیف الحق اُن کو خطاب بھی دیا۔ ایک مرتبہ جب وہ ادھر اُدھر کرکے سورت پہونچے۔ اور مرزا کو خط لکھا۔ تو مرزا نے جواب میں لکھا کہ

"آبیٹے مولانا سیاح۔ سلام علیکم۔"

مرزا تفتہ کے خط پہونچنے میں دیر ہوئی۔ مرزا نے اُن کو خط لکھا۔ اور صرف اس القاب سے خط شروع کر دیا۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہوگے۔ یا کبھی منوگے بھی۔ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔"

مجروح کو لکھتے ہیں۔

"برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی اُردو بازار کے مولوی صاحب لوائے ولائے مرتضوی یعنی علم عباس ابن علی کا سایہ"

ایک جگہ انھیں کو لکھتے ہیں۔

"میری جان مسعود داستان"

دوسرے غلام غوث کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولانا بندگی۔"

نواب سعد الدین خاں شفق نے ایک مرتبہ خطوں کا جواب اور قصیدہ کی رسید نہیں بھیجی انہوں نے خط بھیجا۔ اور القاب میں اُستاد کے بجائے امیدگاہ لکھ دیا تھا اب عرضی۔

مرزا حشمت علی بیگ رضواں کو لکھتے ہیں۔

"فرزند دلبند حشمت علی بیگ کو اگر خفا نہوں تو دعا۔ اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی۔"

حالت خوشی میں دعا۔ اور حالت آزردگی میں بندگی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ الفاظ کی اندازہ شناسی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

یوسف مرزا کی عادت تھی کہ پورا خط نہیں لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے اصلاح کے لئے ایک مثنوی مرزا کے پاس بھیجی۔ مگر مثنوی ناتمام تھی۔ اور مرزا کی عادت یہ تھی کہ وہ ناتمام کلام پر کبھی اصلاح نہ دیتے تھے۔ انہوں نے مثنوی احتیاطاً رکھ لیا۔ اب یوسف مرزا کے خط پر خط تقاضہ کے آ رہے ہیں۔ سب کچھ لکھتے ہیں۔ مگر مرزا نام نہیں لیتے۔ ایک خط کا جواب لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

"میری جان خدا تیرا نگہبان۔ میں نے گردہ بنگ کو دام میں پھنسایا۔ یہ قصہ میں نے کرکے یہ خط لکھوایا۔ . . . . مثنوی کبھی اصلاح نہ پائے گی جب تک سب نہ آئے گی۔ لاؤ۔ باتیں بناؤ۔ مجھ کو غیرت دلاؤ۔ غزل جب تک پوری نہ ہو۔ قصیدہ جب تک تمام نہ ہو۔ مثنوی جب تک سب نہ لکھی ہو کیونکر اصلاح دی جائے۔"

ایک جگہ علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں اور اپنے رنج و غم کا ثبوت دیتے ہیں۔

"جان غالب۔ رگ جسم سے نکلی ہوئی جان۔ قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے۔"

ایک جگہ صاحب عالم کو خط لکھتے ہیں۔ اور اسی فقرے سے خط کو شروع کر دیتے ہیں

"میکنم عرض گو کمر زباش"

مرزا رحیم بیگ مرزا کے ایک حریف تھے۔ اور قاطع برہان کے چھپنے پر مرزا کی بعض نکتہ چینیوں پر انہوں نے بھی اعتراضات کئے تھے۔ چنانچہ آبدوست کے معنی میں بھی اختلاف کیا تھا۔ مرزا انھیں کو ایک خط لکھتے ہیں اور خط کے القاب میں ان پر طنز کرتے ہیں۔

"بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہ بالاسرار و عینہ بالانوار۔"

دیکھئے مرزا رحیم بیگ کا جاہل مزاج ہونا۔ اور اندھا ہونا۔ سب ایک اسی القاب سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا کی زندگی بھی دنیاداری کی زندگی تھی۔ اس لئے اون کو بھی آئے دن وہی ضرورتیں اور وہی مناظر پیش آتے تھے۔ جو سب کو آتے رہتے ہیں۔ وہ خفا بھی ہوتے ہیں۔ ڈانٹتے بھی ہیں۔ تنبیہ بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں بھی ان کا شیوہ سب سے نرالا اور سب سے جدا ہے۔ اون کی فطری خوش طبعی اور ظرافت یہاں بھی اسی طرح باقی رہتی ہے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو بجائے رنج و غم کے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ایک خاص لطف آتا ہے۔ ایک خاص لذت کا احساس ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور دلی میں قدیم سے ایک ادبی چشمک چلی آتی ہے۔ دلی والے اہل لکھنؤ کو اور اہل لکھنؤ اہل دلی کو حسد اور رشک سے دیکھتے ہیں۔ انھیں میں سے میر مہدی مجروح بھی تھے۔ چنانچہ اکثر خطوط میں اس قسم کے دل آزار فقرے لکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب نے لکھا۔

"آؤ میاں سید زادے آزادے۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔"

جس صورت سے تنبیہ کی گئی ہے۔ شاید اس کا جواب اخلاق و ادب کی بڑی سے بڑی کتابوں میں بھی نہ ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص پر ایک وقت میں دو حالتیں طاری ہیں۔ غصہ بھی اور ناصحانہ جذبہ بھی۔ محبت بھی اور خوش طبعی بھی۔ وہ سمجھاتا ہے۔ مگر تلخ نوائی سے دور رہنا چاہتا ہے۔ محبت کرتا ہے۔ مگر دیوانوں کی طرح نہیں۔ بلکہ ایک ذی ہوش کی طرح۔

مرزا کی نثر کا اون کی زندگی ہی میں کافی شہرہ ہو چکا تھا۔ اور لوگ اس کی نقلیں اتار اتار کر اپنے طرز بیان کو چمکانا چاہتے تھے۔ انھیں لوگوں میں میر مہدی بھی تھے۔ خط لکھتے تو عبارت کا بناؤ چناؤ بہت کرتے تھے۔ مرزا عبارت کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے یا مبتدیانہ انداز پر ہنستے تھے۔ ایک مرتبہ میرن صاحب۔ (جو ایک خوبصورت نوجوان تھے۔

(میر مہدی مجروح کے بڑے محبوب دوست تھے۔ اور خود مرزا بھی اُن سے محبت کرتے تھے۔) کے چہرے پر مہاسا نکل آیا۔ میر مہدی نے اس واقعہ کو خوب نمک مرچ لگا کر مرزا کو لکھا۔ مرزا نے جواباً لکھا۔

"سید صاحب کی پناہ۔ عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ آ گیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے۔ اگر میر سید کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے۔ تم کو سرمایۂ آرائش گفتار ہم پہونچا ہے۔ میری جان کو وہم نہ پہنچاؤ"

اور ایک خط میں لکھا کہ

"سید صاحب اچھا جھگڑا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ و شکایت درج کر دینا۔ اور میرن صاحب کو پیغام زبانی کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کہاں کی محبت کہاں کی محبت اور دوست ہوں۔ عاشق نہیں۔ بندہ بے درم نہیں ہوں۔ گرفتار نہیں۔"

میر مہدی مرزا کے اُن سعادتمند اور عقیدت شعار شاگردوں میں تھے جو استاد سے باتیں کر کے انھیں چھیڑا کرتے اور جواب دینے ہیں۔ اس لئے جب یہ مرزا کو خط لکھتے تو خوب طول دیتے۔ چنانچہ ایک خط لکھا جو بہت طویل تھا۔ مرزا نے جواب میں لکھتے ہیں۔

"واہ حضرت کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ۔ بات اتنی ہے کہ میرا انگرکھا مجھ کو ملا۔ میرا جوتا مجھ کو ملا۔ میرا حجام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ نوشیدنی آیا۔ وہ فرد ہو گیا۔ میری جان مجھ کو ملی۔ میرے آدمی کی بات بنی۔ ع

اکنوں شب من شب است و روز من روز است"

جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں۔ میر مہدی کو دلی کی زبان پر بڑا ناز تھا۔ ایک مرتبہ ایک غزل کے مقطع میں لکھا

ع میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے

یہ غزل مرزا صاحب کے پاس اصلاح کے لئے آئی۔ مرزا نے لکھا۔

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی ع میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے ہاں صاحب اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔"

ایک مرتبہ میر مہدی نے لکھا کہ آپ کا خط میرے ایک ہمنام کے پاس پہونچ گیا۔ مرزا نے جواب میں لکھا۔

"صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا۔ نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا۔ نہ اپنا ہم تخلص

بہم پہونچایا۔ ،،

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب مرحوم کو لکھا۔

"بڑی شرم کی بات ہے۔ ہر دم آزردگی غیر سبب، راچہ علاج۔ اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ وا غیر سبب یہ کہاں کی بولی ہے۔ ع

از خواندن قرآن تو قاری چہ فائدہ

عیاذاً باللہ۔ امیر خسرو قرآن کو کہ بسکون رائے قرشت و الف ممدودہ ہے۔ قران بروزن پُران لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دوگدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔ ،،

مرزا کے مزاج میں رکھ رکھاؤ بہت تھا۔ اور ہمیشہ دوسروں کی عزت کرتے تھے۔ اسی حالت میں خود بھی اتنا جھکتے تھے اور احباب کے ساتھ اسقدر عجز و نیاز کے ساتھ پیش آتے تھے کہ اس سے زیادہ متصور نہیں ہے۔ مگر اس صورت میں بھی اپنا خاص طرز بیان اور انداز ظریفانہ قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ اون کے بعض انکساریہ جملے نقل کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے۔

"غذا مفقود ہے صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے۔ ع

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　　القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

منشی ہرگوپال تفتہ مرزا کے شاگرد رشید اور بہت محبوب دوست تھے۔ مرزا کو اُن کی خاطر عزیز تھی۔ مگر باایں ہمہ وہ کلام بھیجتے تو مرزا سے پہلے اجازت مانگا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے لکھا۔

"تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جزو ہوں تو ۲۰ جزو ہوں تو بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتلانے کی گون ہوں بناوٹ نہ سمجھنا۔ ،،

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی نے دلی کی حالت اور ہنگامۂ غدر کی حالت دریافت کرتے ہوئے مرزا کی خیریت پوچھی اور کچھ شعر و شاعری کا ذکر کیا تو مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"میں اموات میں ہوں مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل

کی روشن ضمیر میں آئے ،،

میر مہدی نے کچھ تصوف کا ذکر کیا۔ اور کچھ ایسی ہی باتیں کیں جن سے نصیحت معلوم ہوتی تھی۔ مرزا نے میر مہدی کو اپنے خاص طرز میں انتباہ کرتے ہوئے چند انکسار یہ جملے لکھے۔ ملاحظہ ہو۔

" میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بنئے سے سیانا سو دیوانہ۔ صبر و توکل شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔ جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو۔ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش کرتا ہوں ۔ استغفر اللہ۔ لاموثر فی الوجود الا اللہ۔ یا تم یہ سمجھے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا۔ اور اوس کے انڈے بچے بیچ کر بکری خرید وں گا۔ ،،

میر مہدی مجروح کو کوئی قطعہ بھیجا۔ جو رواروی میں کہا گیا تھا۔ اور فکر تمام نہ تھی بھیج کر خط لکھتے ہیں۔

" قطعہ تم نے دیکھا۔ بیچ بیچ میرا حلیہ ہے۔ واہ کیا شاعری رہ گئی ہے ،،

مولوی احمد حسین قنوجی کو لکھتے ہیں۔

" ۶۵ برس کی عمر ہوئی اضمحلال قوٰی۔ ضعف دماغ۔ فکر مرگ۔ غم عقبےٰ۔ جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں۔ میں اب وہ نہیں ہوں۔ نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے۔ ورنہ جوہر فکر کی رخشندگی کہاں۔ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے۔ زور نہیں دلوا سکتا۔ ،،

حکیم سید احمد حسن نے غزلوں کی اصلاح کے لئے لکھا۔ آپ نے جواب دیا۔ اور جواب میں ظرافت آمیز لہجہ میں وہ انکسار اور ناتوانی کا اظہار کیا کہ اگر لاکھ بار لیے متین لہجے میں سمجھاتے تو وہ بات پیدا نہ ہوتی لکھتے ہیں۔

" مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں اوس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔ ،،

نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق نے پوچھا کہ دنبالہ دار ستارہ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ نہ رصد ہے نہ کتاب ہے لکھوں کیا۔ اور صائب کا شعر ؎

زخال گوشہ ابروے یار می ترسم ازیں ستارۂ دنبالہ دار می ترسم

لکھ کر فرمایا کہ

" کیا آپ مجھکو بے ہنری اور بیچمیرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے۔ پیش ملا طبیب۔ و پیش طبیب ملا۔ و پیش ہیچ ہر دو۔ و پیش ہر دو ہیچ۔ شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونی طبع یہاں اور کیا رکھا ہے ،،

ایک جگہ شفق کو یوں لکھتے ہیں۔

"دیکھو تم کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب نہ اداب۔ نہ بندگی۔ نہ تسلیم۔ حسن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ بن۔ ایاز حد خود بہ شناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نوبت غزل کی لکھی ہے۔ اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے۔ پہلے القاب لکھ پھر بندگی عرض کر پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ۔"

مولوی عبدالغفور کو لکھتے ہیں۔

"خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے۔ تفقد نامہ سامی میں صورت عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق طے لسان زبان پہ آئی ہے۔ ورنہ قدر دانی کیسی یہ قدر افزائی ہے۔ نظیری علیہ الرحمہ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجئے۔ روزمرہ شعرائے مجھکو نکال دیجئے۔ شعر یہ ہے ؎

دو ہر بینش من در تہ زنگار بماند آنکہ آئینہ من ساخت نپرداخت دریغ"

مرزا کی پیشین گوئی منجموں یا رمالوں کی پیشین گوئی سے بالکل جدا ہے۔ وہ ظرافت کے طریق پہ کبھی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اور کبھی اندیشہ کے طریق پر۔ مگر کہیں اصل رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو خط لکھا۔ اس خط کے لکھنے سے پہلے یہ غزل بھیج چکے تھے "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے" جب خط لکھا تو پیشین گوئی کے طریق پر یہ فقرہ بھی لکھ دیا۔

"اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہونچ گئی ہوگی۔ رہا سلام وہ آپ پہونچا دیں گے۔"

منشی غلام غوث صاحب بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند وطالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال مرد غالب بگو کہ غالب مُرد

اب بارہ سو پچھتر ہیں۔ اور غالب مُرد کے بارہ سو ستتر ہیں اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہونچتی ہو۔ پہونچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔،،

ہم لکھ چکے ہیں کہ ظرافت نگاری کے ساتھ درد پیدا کرنا مرزا کا حصّہ خاص ہے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی عبارت میں دیکھئے۔ حزن وملال بھی ٹپک رہا ہے۔ اور ظرافت کے بھی دریا بہہ رہے ہیں۔

بعض ضروری خطوں کے ضایع ہونے پر مرزا کو بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اسی بنا پر خواجہ غلام غوث کو لکھتے ہیں۔

"آپ کارپردازان ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں۔ اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو باحتیاط پہونچائیں۔،،

ڈاک کی مناسبت سے ڈاکو کا لفظ لکھ کر لُطف ظرافت پیدا کر دیا۔

ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا سے اپنی موت کی پیشین گوئی ان لطیف الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"حال قصیدے اور نخس کا معلوم ہوا۔ قبلہ و کعبہ وہ کر رہے ہیں۔ جو آبا و اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ اون کو منظور رہے کہ دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں ؎

کار ساز ما بہ فکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

لیکن میری جان انصاف تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بیہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک۔ سات مہینے یہ۔ اور بارہ مہینہ سال آئندہ کے اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس۔ نہ جاڑے کی شدت۔ نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف۔ نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں۔ نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور۔ اور سراسر سرور۔ ؎

یارب ایں آرزوی من چہ خوش است تو بدیں آرزو مرا برساں،،

تاریخ گوئی کو مرزا دون مرتبت اور ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی وہ اس میں نہ محنت کرتے ہیں۔ اور نہ اس مشغلے میں اون کا جی لگتا ہے۔ پھر بھی ضرورت اور احباب کے تقاضے اونھیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں۔ اور تاریخیں لکھنی پڑتی ہیں۔ مگر ان میں وہ وہ جدتیں اور اختراع کرتے ہیں کہ سبحان اللہ انہیں

ظرافت کے خاص جوہر سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ کافی دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ تاریخ کا ذکر نظم کے حصہ میں کرنا چاہئے۔ مگر چونکہ یہ تاریخیں نثر کے سلسلہ میں پائی گئیں لہذا نثر ہی میں لکھتا ہوں۔

مجتہد العصر لکھنؤ کے چھوٹے بھائی میرن صاحب نے انتقال کیا۔ جنکا نام سید حسین اور خطاب سید العلما تھا۔ جو نقش نگیں بھی تھا۔ مرزا نے خود ہی یا کسی کے تقاضے سے تاریخ نکالی۔ مگر اس میں اتفاق سے پانچ عدد بڑھتے تھے۔ یعنی اون کا انتقال ۳، ۱۲ میں ہوا۔ اور مادۂ تاریخ میں ۸، ۱۲ نکلتے تھے۔ مرزا نے ایک نئی صورت سے تخرجہ کیا تاریخ یہ ہے۔

حسین ابن علی آبروے علم و عمل — کہ سید العلما نقش خاتمش بودے
نماند و ماندے اگر زندہ پنج سال دگر — غم حسین علی سال ماتمش بودے

ظاہر ا تاریخ صاف ہے۔ مگر ظرافت یہاں بھی کام کر رہی ہے۔ کہتے ہیں۔ کیا کیجئے وہ زندہ ہی نہ رہے۔ اور اگر کہیں پانچ سال اور زندہ رہتے تو اچھی تاریخ غم حسین علی اون کی تاریخ وفات ہو جاتی۔

تشبیہ کی اصناف اور صفات سے یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ مرزا تشبیہ سے کام لیتے ہیں تو اس کو کس درجہ بلند کر دیتے ہیں۔ اور پھر بھی اپنے رنگ طبعی کو نہیں چھوڑتے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہ بذاتہ ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے ذریعہ سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اوس میں اور بھی حسن پیدا کیا جائے تو وہ خوب سے خوب تر ہو جاتی ہے۔ تشبیہ میں مشبہ بہ کی ندرت اس کی کفیل ہوتی ہے۔ اور اکثر وجہ شبہ بھی اوس میں جان ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ مرزا کی بعض بلکہ اکثر تشبیہیں انھیں دونوں چیزوں کی وجہ سے نہایت اعلےٰ درجہ پر واقع ہوئی ہیں۔

منشی حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں۔

"کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارہ دنبالہ دار آیا"

خط کو ستارہ۔ اور رجسٹری کو دنبالہ ٹھہرایا۔ وجہ شبہ یہ ہے کہ جیسے ستارہ دنبالہ دار میں ایک دُم لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس میں ایک رسید کا دُم چھلہ لگا ہوا تھا۔

دس گیارہ برس سے مرزا جس مکان میں رہتے تھے اتفاق سے اُس مکان دار نے مکان بیچ دیا۔ اب دوسرے مکان دار نے مرزا پر تقاضہ کیا کہ جناب مکان خالی کر دیجئے۔ اور اس بارہ میں اتنا مُصر ہوا کہ مرزا عاجز ہو گئے۔ برابر یہی جواب دیتے رہے کہ اچھا بھائی مجھے اچھا سا مکان مل جائے تو خالی کر دوں۔ اُس نے انتظار نہ کیا اور مکان کی مرمت شروع کر دی۔ اوس حالت کا مرزا اپنے الفاظ خاص میں نقشہ کھینچتے ہیں اور ایک تشبیہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"بیدردتے مجھکو عاجز کیا اور مدد لگادی۔ وہ صحن بالاخانہ کا۔ جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول اوس میں پاڑ بندہ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت۔ پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرہ اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔"

۱۸۶۲ء میں دلی میں اس زور کی برسات ہوئی کہ لوگ عاجز ہوگئے۔ سیکڑوں مکانات منہدم ہوگئے۔ اور جو رہے وہ بھی بارش کی وجہ سے خراب و خستہ تھے چھتیں ٹپکنے لگیں سامان برباد ہوگئے۔ اسی عالم کا مرزا نقشہ کھینچتے ہیں۔

"جولائی سے مینھ شروع ہوا۔ اور مینھ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے۔ اور ہر بار اس زور سے کہ ندی۔ نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانہ کا جو دالان۔ میرے بیٹھنے اوٹھنے۔ سونے جاگنے۔ جینے مرنے کا محل ہے۔ اگرچہ گرا نہیں۔ لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن۔ کہیں چلمچی۔ کہیں اوگالدان۔ رکھدیا کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔"

ٹپکتی ہوئی چھت کی چھلنی سے تشبیہ تو خیر ایک پرانی تشبیہ ہے۔ مگر گھر کو کشتی نوح سے تشبیہ دینا صرف غالب کا حصہ تھا۔

مرزا ایک مدت تک رام پور رہنے کے بعد اپنے گھر آئے۔ تو مرزا تفتہ کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اور اسی اطلاع میں اپنے گھر پہونچنے کی تشبیہ بھی دی۔ لکھتے ہیں۔

"لو صاحب گھوڑی کی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔ ۸ر جنوری ماہ وسال حال غضب الہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔"

منشی شیو نرائن نے پنج آہنگ کی جلدیں بنواکر مرزا کے پاس بھیجیں۔ بہت پسند کیں۔ چونکہ یہ کتابیں ہدیہ کے طور پر حکام کو بھیجنا تھیں۔ اس واسطے ان پر طلائی نقش و نگار کی بھی ضرورت تھی۔ مگر یہ کام ابھی باقی تھا۔ اسی کی بابت مرزا تفتہ کو ایک خیالی تشبیہ دے کر لکھتے ہیں۔

"طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بنجائیں گی۔ حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔"

مرزا نے اپنی جتنی کتابیں چھپوائیں وہ اس طرح کہ حق تصنیف کسی سے کچھ بھی نہیں لیا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو جلدیں لیتے رہے۔ بلکہ یہ طریقہ تھا کہ جب کتاب چھپ جاتی تو خود بھی دوستوں میں تقسیم کرنے کے لئے دس بیس جلدیں خرید لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب قاطع برہان طبع ہوئی تو ارادہ کیا کہ پچاس جلدیں خرید لوں۔ مگر افلاس اور پریشانی کے ہاتھوں مجبور۔ اسی کی بابت مرزا تفتہ کو اطلاع دیتے ہیں کہ

"برہان قاطع کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست

پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپیہ بھیجوں تو انچاس جلد یں منگاؤں۔ دیکھئے نومن تیل کب ہو اور رادھا کب ناچے۔''

مہاراجہ الور کو اختیارات ملنے کی خبر ملی تو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

''سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہو گا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا۔''

میر مہدی مجروح نے پنشن کے بارہ میں کچھ دریافت کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بعد غدر بعض معتوبین بعد تحقیقات بے گناہ ثابت ہوے اور اُن کے اعزاز کو بحال کر دیا گیا تھا۔ مرزا نے جواب دیا۔

''چند اشخاص کو اس بائیس مہینہ میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپیہ کے باب میں اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اب اپنے سوال کو یاد کرو اس واقعہ سے اُس کو کچھ نسبت ہے۔ یا نہیں۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے جو چیل بسولا لیکئی تو کا ہے سے ٹیکوں راب۔''

سید احمد حسن صاحب سورتی نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی۔ مرزا نے شکریہ ادا کیا اور لکھا۔

''امسال فقیر نے اپنی خاکساری کا خاکہ (یعنی تصویر) منشی میاں داد خاں کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے کہ وہ پہونچی ہوگی۔''

مرزا علاء الدین احمد خاں کی اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے کچھ صفائی نہ تھی۔ اسی وجہ سے بارہا تکلیفوں اور غموں کا بھی سامنا ہوتا تھا۔ مرزا کو یہ بات دل سے ناگوار تھی۔ اور بہ نسبت نواب امین الدین احمد خاں کی تکلیف بھی اُن کو کافی صدمہ پہونچاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ علاء الدین احمد کو لکھتے ہیں۔

''تمہارے حال میں غور کی۔ اور چاہا کہ اُس کا نظیر بہم پہونچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمہارا حال اوس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے۔ جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں''

صاحب عالم مارہروی نے مرزا سے حاشا۔ اور حاش للہ پر بحث کی اور کچھ دلائل اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے مرزا نے لکھا۔

''آپ کی اس نظر لکھنے سے اس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ لو کشف الغطا ما ازددت یقیناً۔ اس جواب میں محض حضرت علی کرم اللہ وجہ کا یہ قول ہی نقل کرنا۔ ایک خاص ظرافت ہے۔ کیونکہ جس سائل سے

آپ نے یہ کہا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا خاصہ لطیفہ ہے

چودھری عبدالغفور سرور نے ایطار کے باب میں مرزا سے کچھ دریافت کیا۔ مرزا نے جواب دیا۔

"آئمۂ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر قابل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو ساور ہ جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شباہت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اوس کا نام میر بادشاہ رکھدیا ہے۔"

مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط کے جواب میں دیر ہو گئی تو لکھتے ہیں۔

"قبلہ اس عنایت نامہ کا جو مارچ گزشتہ میں پایا ہے۔ آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں گویا نماز صبح قضا پڑھتا ہوں۔"

اسقدر تشبیہیں دیکھنے کے بعد ہر شخص آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ تشبیہ میں مرزا کا کیا مرتبہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ بالطبع ان چیزوں کے عادی نہیں ہیں۔ اور ہر جگہ یہ کوشش نہیں کرتے کہ اس کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کریں۔ امراض جسمانی کی تشبیہیں بھی اس خوبی سے دیتے ہیں کہ دیکھنے والا۔ اور سننے والا حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ کوئی مریض ایسی تشبیہیں دے سکتا ہے تو کیا اس کو مریض کہا جا سکتا ہے۔

میر غلام بابا کو لکھتے ہیں۔

"ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں۔ جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دل آتا ہے۔"

ایک مرتبہ عوارض فساد خون میں مبتلا تھے۔ پھوڑے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اوسی حالت کی منشی سیف الحق سیاح کو اطلاع دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

"بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے"

قد کی تشبیہ سرو سے۔ اور اس پر لال لال پھوڑے یا زخم کی تشبیہ چراغاں سے کس قدر عجیب و غریب ہے۔

منشی حبیب اللہ ذکا کو مرض کا حال لکھتے ہیں۔

"تم میری بات پوچھتے ہو مگر میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں رعشہ انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کوئی دوست آتا ہے تو اس سے خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے۔ مرنے کی روح کو اس کی بو پہونچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔"

انھیں کو ایک جگہ ناتوانی کی تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بنکر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔"

شاہزادہ بشیرالدین کو ناتوانی اور لاغری کا حال لکھتے ہیں۔

"حضرت پیر و مرشد برحق روز افزونی کاہش اب اس حد کو پہونچی ہے کہ ع

تقسیم جزو لا یتجزی محال ہے

آگے بادِ مہر یزنے لہو خشک کر دیا تھا۔ اب دوزخ نے جلا دیا ہے۔"

آخری فقرہ بھی ایک تشبیہ ہے۔ وہ یہ کہ شاہزادہ صاحب نے مدتوں تک خط نہ بھیجا۔ سرد مہری برتی اور اب خط بھیجا تو عتاب نامہ بھیجا۔ فراموش کاری اور سرد مہری کو بادِ مہر یر سے اور غصہ اور عتاب کو آتش دوزخ سے تشبیہ دے کر مضمون خط میں جان ڈال دی۔

مرزا اگر کسی بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو وہ طریقہ بھی جدا اور دنیا بھر سے نرالا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب غدر ۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو گیا۔ اور کارگزاروں کو انعام اور مجرموں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ تو مرزا بھی ناکردہ گناہ معتوبین میں قرار پائے۔ اور ایک سکہ جو ذوق مرحوم نے بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر کہا تھا غالب کا کہا ہوا ٹھہرایا گیا۔ مرزا نے بہت عذر کئے مگر پذیرائی نہیں ہوئی۔ انھوں نے اُردو اخبار تلاش کیا۔ جس میں وہ سکہ ذوق کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مگر وہ بھی ہاتھ نہ آیا۔ مجبوراً خاموش ہو گئے۔ اور زبردستی کے مجرم قرار پائے۔ اسی بارہ میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"میں نے سکہ کہا نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا۔ اور توپیں لگانی۔ اور بنک گھر اور میگزین لوٹنا معاف ہو جائے۔ اور شاعر کے دو مصرع معاف نہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے۔ اور شاعر کا سالا بھی مددگار نہیں۔"

کون نہیں جانتا کہ تعزیت اور عیادت کے لئے وہ جملے جو عام طریقہ سے رائج ہیں اون میں اظہار رنج۔ اور تلقین صبر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور ان کی قدامت اور فرسودگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جس شخص کے پاس تعزیت کے لئے جاتے یا خط لکھتے ہیں۔ وہ تعزیت کرنے والے کے منھ سے ایک جملہ سنے بغیر۔ یا ایسے خط سے ایک فقرہ پڑھے بغیر کہنے والے یا لکھنے والے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے یہ افسوس آمیز جملے اور

شنی آمیز فقرے اوس پر ذرا بھی اثر نہیں کرتے۔ بلکہ برعکس اس کے اوس کا زخم اور تازہ ہوجاتا ہے۔ اور گھڑی بھر کے لئے ان غمخواروں کی خاطر بھی اوس کو رونا پڑتا ہے۔ مگر اس کہنگی مضمون اور پامالی خیال کے نتیجے مرزا کے ذہن نشین ہوچکے تھے۔ اس واسطے انہوں نے اظہار تعزیت میں بھی۔ اپنے ظریفانہ انداز بیان اور شگفتگی طبع کو قائم رکھا۔ اور اس خوبی سے اس جانگداز فرض کو انجام دیا۔ کہ جا بجا جانفزا بنا دیا۔

امراؤ سنگھ مرزا تفتہ کے دوست یا عزیز تھے۔ اون کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا۔ تفتہ نے مرزا کو بھی یہ حال لکھا مرزا صاحب نے ان الفاظ میں تعزیت کی۔ اور تعزیت کے ساتھ ہی ایک لطیفہ شامل کردیا۔ جس کو پڑھ کر کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے رنج و غم ضرور دور ہوجاتا ہے۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اوس کے واسطے مجھکو رحم۔ اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اوس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔ وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے۔ وہ حکیم سنائی کا ہے۔ اور وہ قطعہ حدیقہ میں مرقوم ہے۔

پسرے با پدر بزاری گفت — کہ مرا یار شو بہمرہ جفت
گفت بابا زنا کن وزن نہ — پند از خلق گیر و از من نہ
ورزنا گر بگیرد ت عسسے — بہ بلد گو گرفت چو تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نہ کند — ورتو بگزارئش جہانہ کند

میر مہدی نے میر اشرف علی کو لکھا کہ تمھاری بھانجی کا انتقال ہوگیا۔ مگر نام نہ لکھا۔ مرزا نے اون کی طرف سے میر مہدی کو لکھا۔ اور اُس میں بھی وہی رنگ ظرافت قائم رکھا۔

"اس غریب کا یہ قول ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اوس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کونسی بھانجی مری ہے اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی ایک محبوبہ کا گل حیات پژمردہ ہوا۔ مرزا کو خبر ہوئی تو ان الفاظ میں تعزیتی خط لکھا۔

"سنو صاحب شعرا میں فردوسی۔ اور فقرا میں حسن بصری۔ اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہوجائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ

حسن بصری سے لگ کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرح نصیب ہو۔ لیلیٰ اوس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ تم اُس سے بڑھ کر ہوے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اوس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوے ہیں۔ مغفرت کرے چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں ۔۔۔۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں۔

”میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو بیٹ چکا۔ اب چچا کو بھی رو۔ مجھکو خدا اختیار رکھے۔ اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج دولت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا۔ کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے۔ اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اون سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا بے غیرت کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سونچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔“

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔ اور ان کے باپ کی تعزیت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں۔ کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہ ہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے، اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں بتائی نہیں جاتی۔ دعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا

پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ سرو پاکس کو کہتے ہیں۔ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا اگر یہ سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں سے چھوٹ گیا نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ"

یوسف مرزا کا بچہ مرا تو ان الفاظ میں تشفی دی۔

"اے میری جان اسے میری آنکھیں سے

زہجران طفلے کہ درخاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو۔ اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرتے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔"

ایسے ہی موقع پر سقراط نے اپنے مرنے کے وقت اپنی بیوی کو روتا دیکھ کر اوس سے پوچھا کہ تو کیوں روتی ہے۔ اوس نے جواب دیا کہ اس واسطے روتی ہوں کہ یہ لوگ تجھ کو بے گناہ مارے ڈالتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اے بیوقوف کیا تو یہ چاہتی ہے۔ کہ میں کسی گناہ کی پاداش میں مارا جاؤں"

نواب امین الدین احمد خاں کی والدہ کا انتقال ہوا۔ مرزا صاحب نے تعزیتی خط لکھا۔

"بھائی صاحب۔ آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم۔ تلقین صبر۔ دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے۔ ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بیدردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت میں کیا۔ اور میری دعا کیا۔"

نواب علاء الدین احمد خاں کو اون کے ایک نوزائیدہ بچہ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ میں نے اوس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔"

بعض جگہ تفنن طبع کے طریقہ پر مرزا بعض اشعار یا کسی عبارت کے الفاظ میں تصرف و تغیر کر کے وہ لطف پیدا کرتے ہیں کہ خود ان کی طبعی ظرافت معلوم ہوتی ہے۔

میر حسن نے اوس وقت جبکہ بے نظیر قید ہو گیا ہے۔ اوس کی زبان سے یہ شعر بدر منیر کے فراق میں کہلایا

ہے ؎

میں بھولا نہیں تجھکو اے میرے جاں　　کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قید گراں"

مرزا برسات کی مصیبت میں یہ شعر میر مہدی کو بہ تبدیل الفاظ یوں لکھتے ہیں ؎

" میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان　　کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں"

میر تقی میر کا یہ مشہور شعر ہے جو ان کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں　　اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

مرزا نے اس کو میرن صاحب کی تعریف میں یوں بنا دیا ؎

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں　　دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

جیسا کہ ایک جگہ ذکر کیا جا چکا ہے - نواب علاء الدین احمد خاں کی اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں سے کچھ صفائی نہ تھی - ایک مرتبہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کسی طرح یہ شکر رنجی دفع ہو گئی تو مرزا صاحب نے علائی کو حافظ کے یہ شعر یوں لکھے :-

شکر ایزد کہ میان من و او صلح افتاد　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

بہ تغیر الفاظ :-

شکر ایزد کہ ترا با پدر است صلح افتاد　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

قدسیاں بہر دعائے تو و والد پدرت　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

قائم چاند پوری کا ایک شعر ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　　روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

اسکو بتغیر الفاظ خواجہ غلام غوث کے پاس یوں لکھ کر بھیجا :-

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اسپر پیار آئے　　روٹھا جو بیگناہ تو بے عذر من گیا"

تمسخر کی تعریف یہ ہے کہ وہ پھکڑ اور فواحش کی حدود سے جا ملے - مگر علی الرغم اس تعریف کے مرزا نے تمسخر میں ایک قسم کی متانت کو جگہ دی ہے - میر کاظم علی کو سب ہمسن فضلو فضلو کہتے تھے - مرزا صاحب پاس ادب تو اتنا مرعی رکھتے تھے کہ فضلو کے پہلے بھائی ضرور کہتے - مگر از راہ تمسخر اون کو احتلام الدولہ کا خطاب بھی دیا تھا - اور ہمیشہ ان کو بنایا کرتے تھے - ایک مرتبہ شاید انہوں نے کوئی کتاب مرزا سے مانگی - مرزا صاحب نے یوسف مرزا

کو جواب میں لکھا۔

"احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کے ہتھیار کا نام اور سکندر شاہ کون سے درخت کا پھل ہے۔ میرا اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لیگئے۔ مصطفٰے خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں رسید اوس کی آگئی۔ نہ برہان قاطع نہ قاطع برہان"

مرزا علاؤالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"پیرجی سے جب پوچھتا ہوں تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں کیا کہنا ہے۔ اور میں پوچھتا ہوں کس کا تو وہ فرماتے ہیں مرزا غالب کا۔ ایں۔ اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے۔ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہیرا سنگھ موجود ہے۔ واہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب۔ غائب کی تعریف کرنا کیا عیب ہے۔ ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں اس میں کیا عیب ہے۔"

ارمان و تمنا خاصہ انسانی ہے۔ مرزا بھی اس سے خالی نہیں۔ ذوالفقار الدین حیدر عرف حسین مرزا کو لکھتے ہیں۔

"ابراہیم علی خاں الور میں مستحق ہوکر مر گئے۔ خدا ان کو بخشے اور مجھکو بھی یہ دن نصیب کرے۔"

مرزا نے واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا۔ اوس کی بابت حسین مرزا کو لکھتے ہیں۔

"مرتضٰے علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودھ سے ہاتھ آئے حصہ برادر نصف ازروں نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد۔ نصف میں۔ مفلسوں کا مدار حیات خیالات پر ہے۔ مگر اوسی خیالات سے جس طبیعت معلوم ہو جاتا ہے۔"

صاحب عالم مارہروی ہمیشہ مرزا کے ملنے کی امید لگائے رہتے تھے۔ اور مرزا یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کیوں لیا اتفاق ہوگا۔ اور کیوں ملاقات ہوگی اسی باب میں چودھری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں۔

"مخدوم مکرم و مطاع معظم قبلۂ دیدہ و دل کہ جو میرے اور اپنے ملنے کو از قسم فرض محال نہیں جانتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ جیسا وہ جانتے ہیں۔ تقصیر معاف ہو۔ اگر دنیا میں ظہور ہر امر موجب مساعدت اسباب ہے تو اس تمنا کا حصول مانند اعادۂ شباب ہے۔ کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیز امکان سے باہر نہیں۔ مگر وقوع میں تامل ہے۔"

مرزا جب کسی بات کی توجیہ کرتے ہیں تو حد درجہ ظرافت آمیز متانت کے ساتھ۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے رنگین عبارت میں مرزا کو لکھا کہ شاید میرا کلام دیکھنے سے آپ کو زحمت ہوتی ہے۔ اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ مرزا نے جواباً لکھا۔

" یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اور اب اُس کے دونوں بچے کہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آ رہے ہیں اور مجھ کو ستا رہے ہیں۔ اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھ کو کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھے دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لنڈھاتے ہیں۔ کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ اون میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ کیوں گھبراؤں گا۔ "

مرزا تفتہ کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" تمہارا کلام پختگی کو پہونچ گیا ہے۔ اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ "

۱۸۶۵ء میں دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروح اوس وقت تک پانی پت ہی میں تھے۔ مرزا سے انہوں نے وبا کا حال دریافت کیا۔ مرزا نے جواب دیا کہ وبا یہاں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی۔

" وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے۔ یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا۔ تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی تف برین وبا۔ "

میر مہدی نے آشوب چشم کی شکایت لکھی۔ مرزا نے جواب میں یہ توجیہ کی۔

" تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے۔ اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اوڑی۔ اُس کو آپ نے از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔ "

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ مرزا نے اپنے مرنے کی تاریخ اپنی زندگی ہی میں کہہ لی تھی۔ جس کی رو سے ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں دہلی میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ میر مہدی مجروح نے مرزا کو لکھا کہ کہئے اب تو یہ سال بخیر گزر گیا۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں لکھا کہ

" میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عالم میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔ "

چونکہ مرزا کی اس تاریخ وفات کی شہرت ہو چکی تھی اور آپ نے سب احباب کو اس سے مطلع کر دیا تھا اس لئے

قاضی عبدالجمیل صاحب نے بھی دریافت کیا۔ آپ نے ادن کو جواب میں یہ لکھا۔

"۱۲۷۷ھ میں میرا مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے۔ جیسے طائر قفس میں کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ خرم آنروز کزیں منزل ویراں بروم"

جس زمانے میں مرزا نے برہان قاطع کا جواب دیا اور قاطع برہان لکھی تو بعض ادا ناشناسوں نے برہان قاطع کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ یہ ترکیب صحیح نہیں ہے۔ مرزا نے جواب دیا۔

"برہان قاطع و قاطع برہان کی ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا تمہا نینونین سکمہ قطع کیا ہے۔ جو آپ نے اُس کو قاطع لقب دیا ہے۔"

عضدالدولہ حکیم غلام نجف کے صاحبزادے ظہیرالدین عوارض فساد خون وغیرہ میں مبتلا ہوئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو لکھا۔ کہ

"یہ جو تم پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مجھ میں تمہارا لہو ملتا ہے۔ اور میں احتراق خون کا مبتلا ہوں"

مولوی احمد حسن قنوجی کو مفتی صدرالدین خاں آزردہ کا حال لکھتے ہیں۔

"لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جاداد واگذاشت کی۔ اب نصف جاداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ آمد ان کے گزارے بھر کی نہیں ہے۔ کسواسطے کہ ایک آپ ایک بی بی۔ تیس چالیس روپیہ مہینہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بال سے نہیں گزرتی۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے دلی کا حال پوچھا۔ اور مرزا سے وہاں کی لوٹ مار کی کیفیت دریافت کی۔ مرزا نے جواباً لکھا۔

"جناب مرزا صاحب دلی کا حال تو یہ ہے ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے۔ جو کوئی لوٹیگا۔ یہ خبر محض غلط ہے۔"

مرزا نے مسہل لیا۔ نواب انورالدولہ شفق نے خط بھیج کر دریافت کیا کہ کیا حال ہے۔ مرزا نے جواب میں لکھا۔

"آپ کا بندۂ بے درم خرید اچھی طرح ہے۔ ایک فصد ۲۲ منفضج ۴ مسہل کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کریں۔ بارے آفتاب عقرب میں آگیا۔ پانی برفاب ہوگیا۔ کابل و کشمیر کا میوہ بکنے

لگا۔ یہ ضعف قسمت تو نہیں کہ ایسے ایسے امور اوس کو زائل نہ کر سکیں۔،،

مرزا نے ایک قصیدہ بادشاہ اودھ امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا۔ ہنوز یہ قصیدہ نظر سے نہ گزرا تھا کہ شاہ موصوف نے رحلت کی اور ان کے بجائے واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ مرزا نے اوس قصیدے رد و بدل کر کے واجد علی شاہ کا نام ڈال دیا۔ یہی واقعہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرانہ تھا۔ میں نے اسی قصیدہ میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے۔،،

تہنیت یا مبارکباد دونوں ایسی چیزیں ہیں۔ جنکے ادا کرنے میں ہر شخص جوش مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ مگر جب اُس کے ساتھ خوش طبعی۔ مذاق۔ اور ظرافت کے پہلو شامل ہوجاتے ہیں تو پھر وہ بہت ہی بلند چیز ہوجاتی ہے۔ مرزا کے یہاں تمام مبارکباد اور تہنیتوں میں یہ رنگ غالب ہے اور کثرت سے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو عہدۂ وکالت کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صاحب میرے عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجئے پریوں کو تسخیر کیا کیجئے،،

نواب علاء الدین احمد خاں کے لڑکا پیدا ہوا۔ مرزا اوس کی مبارکباد دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"میری جان نئے مہمان کا قدم تم پر مُبارک ہو۔ اللہ تعالے تمہاری اور اس کی اور اُس کے بھائیوں کی عمر میں برکت دے۔ تمہاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اوس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو کہ احتمال رفع ہو۔،،

انہیں نواب علاء الدین احمد خاں نے شاید پنشن کے دوبارہ ہونے یا اور کسی بات پر مرزا کو مبارکباد دی تو مرزا نے جواباً انہیں لکھا۔ اور دو نیچے تلے فقروں میں شکریہ بھی ادا کر دیا اور اُلٹی انھیں کو مُبارکباد دیدی۔

"یہ خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مُبارک اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب للہ الحمد۔ للہ الشکر۔،،

کہیں مرزا صاحب نے نواب علاء الدین احمد خاں کا نیستی تخلص رکھا تھا۔ اور اسی تخلص سے اکثر ان کو نظم میں مخاطب کرتے تھے۔ مثلاً

ہاں نیستی زمن چہ میخواہی

یا غم مدیح نیستی

نواب صاحب نے پہلے یہ تخلص منظور کر لیا۔ مگر پھر نہ معلوم کسی نے کان بھر دیے یا خود خیال آیا کیا ہوا کہ یہ تخلص نواب موصوف کو برا معلوم ہوا۔ مرزا کو لکھا کہ تخلص دوسرا تجویز فرمائیے۔ نسیمی کی تصحیف تو نشیمی ہو سکتی ہے۔ مرزا کب بند رہنے والے تھے۔ خط پڑھا۔ اور جواب لکھا۔ ایک ایک کی دس دس سنائیں۔

"میری جان تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میری پسند ہے۔ نشیمی کو بہ تکلف اوس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ۔ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدائی خے کو جیم فارسی سے بدل دو۔ بنی کو بہ تقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وسواس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا تخلص ہے۔ رہزن اس کی تصحیف موجود ہے۔ شیون ایک اچھا تخلص ہے۔ ستون اُس کی تصحیف ہے۔ تمھارے واسطے بہ مناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں نامی سامی یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا فایق کی پیروی کرو۔ مولانا لایق کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس کی ترکیب سے لفظ نالایق پیدا ہوتا ہے۔ شایق بنجاؤ۔ ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ نسیمی تخلص خماسی۔ بروزن ظہوری و نظیری اگر بدلنا منظور ہے تو نامی۔ سامی۔ رہرو۔ شیون۔ یہ تخلص بروزن عرفی و غالب اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ فخری تخلص بہتر ہے۔ مگر کہو گے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے۔"

مرزا کا حساب بھی دنیا سے ریاضی سے الگ ہو کر مرکز ادب میں آ ٹھہرا ہے۔ اور اسی واسطے وہ حساب حساب نہیں ہے۔ بلکہ ظرافت کا سرمایہ دار اور خوش طبعی کا حق گزار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ علم ریاضی انتہا درجے کا خشک ہے۔ اور غالباً یہ صحیح بھی ہے۔ مگر مرزا کے یہاں یہ کلیہ باطل اور یہ دعوے لاطایل ہو جاتا ہے مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"بندہ پرور بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھکو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں۔ سو سو روپیہ کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں۔ اور ایک اپنی طرف سے مجھکو بطریق نذر شاگردی بعد اس کے دو دو ہنڈیاں سو سو روپیہ کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے روپیوں کی چار سو اور اس سے علاوہ تین سو۔ کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالہ ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں۔ اور اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔"

پنشن ملنے کے بعد میر مہدی کو لکھتے ہیں۔ اور حساب بتاتے ہیں۔

"مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اوس کا قرضدار ہوں۔ روپیہ اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا۔ سُود مول سات کم پندرہ سو ہوئے۔ میں نے کہا میرے قرضہ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو بانٹ دے۔ نو سو بچے آدھے تو لے آدھے مجھے۔ وہ کہتا ہے سات کم پندرہ سو مجھے دو۔ پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئیگا۔ خوانہ سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہوگئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ یداللہی ہے۔"

حکیم سید احمد حسین مودودی کو لکھتے ہیں۔ کہ

"نوٹ عطیۂ سید صاحب آپ کے خط میں پہنچا روپیہ وصول ہوا معاً خرچ ہوا"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو بارہ روپیہ بھیجے کہ دستنبو یا پنج آہنگ کی دو لوحیں زریں اور پانچ لوحیں سیاہ قلم کی بنوا کر بھیجدیجئے۔ اونھوں نے نہایت تکلف سے جلدیں بنوا کر بھیجیں۔ مرزا کو بڑا تعجب ہوا کہ بارہ روپیہ تو اجرت جلد بندی کے لئے کافی ہوئے نہوں گے۔ پھر یہ کیا ہوا اسی تعجب کی بنا پر مرزا صاحب کو لکھا۔

"حیران ہوں کہ آیا شمار آکمہ نے اُن بارہ روپیوں میں برکت دی یا کچھ تمھارا روپیہ صرف ہوا"

حُسن طلب شاعروں ادیبوں اور ظریفوں کا حصّہ ہے۔ پھر آپ خود ہی خیال کرسکتے ہیں۔ کہ جس شخص میں یہ تینوں صفات جمع ہوں۔ اوس کے حُسن طلب کا کیا درجہ ہوگا۔

مرزا کے یہاں حسن طلب کے مختلف پہلو ہیں۔ یہی نہیں ہے کہ وہ ضرورت دنیوی کے لئے امرا اور روسا کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ یا اپنی ضرورت کے موافق لطایف وظرایف تراشتے ہیں۔ بلکہ ادنےٰ ادنےٰ باتوں کے لئے مثلاً جواب خط کے لئے یا اور ایسی ہی باتوں کے لئے بھی وہ کہیں کہیں اوسی نشتر سے کام لیتے ہیں جس کی کسی بڑی جگہ ضرورت ہوتی۔ ۱۸۶۶ء میں نواب میر غلام بابا خاں سورتی کے یہاں کوئی تقریب تھی سیف الحق سیّاح نے جو نواب صاحب کے مصاحب اور مرزا کے شاگرد تھے۔ مرزا کو اطلاع دی۔ اور جشن کی کیفیت لکھی۔ مرزا صاحب نے نواب صاحب کو لکھا۔

"میاں سیف الحق کا خط پہنچا۔ خط کیا تھا۔ خوان دعوت تھا۔ میں نے کھانے بھی کھائے۔ میوے بھی کھائے۔ ناچ بھی دیکھا۔ گانا بھی سُنا۔ خدا تم کو سلامت رکھے کہ اس نالائق درویش گوشہ نشین پر اتنی عنایت کرتے ہو۔"

انھیں کو یوں لکھتے ہیں۔

" سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں۔ مبارک ہو اور مبارک ہو۔ نظارۂ بزم جمشیدی سے محروم رہوں گا۔ مگر میرا حصہ مجھ کو بھیج رہے گا خاطر جمع ہے۔"

پہلے خط کی بابت شاید نواب صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ یہ ناچ دیکھنا گانا سننا۔ مرزا صاحب کا حسن طلب کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سیف الحق سے ذکر کیا۔ سیف الحق نے مرزا کو لکھا کہ نواب صاحب کا یہ خیال ہے۔ مرزا صاحب نے سیف الحق کو جواب دیا۔

"اجی وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی کی ایک بات لکھی تھی۔ دوستانہ اختلاط تھا بھلا بہرا ہوں گا نا کیسا سنوں گا۔ بوڑھا ہوں ناچ کیا دیکھوں گا۔ غذا جو ماشہ آٹا کہ ان کو کھاؤں۔ بھلی صورت میں شرابیں اچھی ہوتی ہیں۔ اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"بھائی یہ تمہارا او عا گو اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔"

اور ایک جگہ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"حسن اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے جو میں نے ایک ولائتی جبہ اور ایک شال ڈھائی گز دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لیکر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔"

مرزا تفتہ ۱۸۵۵ء میں آگرے میں مقیم تھے۔ اور وہیں منشی شیو نرائن کے اہتمام سے مرزا صاحب کی کتاب پنج آہنگ چھپ رہی تھی۔ مرزا صاحب نے صحافی کا کام مرزا مہر کی سپرد کر دیا تھا۔ انھوں نے جلدیں بندھوائیں اور مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ کتابیں تیار ہیں۔ مرزا صاحب نے تفتہ کو لکھا کہ

"جناب مرزا صاحب کو میرا اسلام کہئے اور یہ پیام کہئے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آگیا مگر آنکھوں کو رشک ہے۔ کانوں کا اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں۔ آنکھوں پر یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب ملے گا۔"

. . . .

. . . .

مرزا حاتم علی مہر آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ مگر مرزا سے دید وا دید نہیں ہے۔ نہ راہ و رسم ہے۔ مرزا رسم دوستی کے آغاز کے واسطے یوں پرواز ڈالتے ہیں۔ اور غالباً پہلا خط لکھتے ہیں۔

"علاقۂ محبت ازلی کو پرحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں

کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے۔ مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اُس کے اجارے میں آئی ہے یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہولے اپنے کو بیگانہ یک دیگر سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے۔ کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے۔ اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ اوس پنشن کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ شوان کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ دیر دیتے ہیں نہ جواب مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔"

مرزا شمشاد علی بیگ رضوان پر جواب خط کے لئے ان الفاظ میں تقاضہ کرتے ہیں

"خط کی آمد دستد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا دسویں دن اگر تمہارا خط نہ آیا تو میں تمہارا رافضی بن جاؤں گا۔"

منشی شیو نرائن سے کتابوں کے لئے مصر ہوتے ہیں

"صاحب کتابیں کب روانہ ہوں گی۔ دو دلی بھی ہولی۔ اگر گنگا جانے کا قصد ہے تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا۔"

نواب مرزا علاؤ الدین خاں کو شوخی بعض کی راہ سے لکھتے ہیں۔

"جو قاطع برہان تمہارے پاس پہونچی ہے۔ اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اوس کو میری تالیف نہ سمجھو۔ بلکہ مجھکو مول لے لو۔"

میر احمد حسین میکش کو لکھتے ہیں۔

"بھائی میکش آفریں ہزار آفریں تاریخ نے مزا دیا خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے جنکی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ تاریخ دیکھی اوس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے۔ اوس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب ہے۔ کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرمے لیکر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرض محال تم یونہی عمل میں لاؤ گے۔ اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے۔ تو ہم کہیں گے۔ تازہ نئے بہتر بارہ سے بہتر۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ اور ان کی زبانی دوسرے کو ایک پیام پہنچاتے ہیں۔

"چھ جلدوں کی آرائشگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کو کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا ابو دعا اور مفلس بچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں۔ تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیے سنتا ہوں کہ چھاپنے کے حرفوں پر سیاہی کے قلم پھیر دیتے ہیں۔ تاکہ حروف روشن ہو جائیں سیاہ جلد بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی صناعی اور ہوشیاری چچا میرے کس دن کام آئے گی۔"

حزن و مسرت خاصہ مخلوق ہیں۔ کبھی اوس کو ایک بات شگفتہ کر دیتی ہے اور کبھی وہ مرجھائی ہوئی کلیوں کی طرح دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ خوشی ایک ایسی چیز ہے جو ظرافت کی تلوار کا جوہر ہے بلکہ اور اُس کو معمول سے زیادہ چمکاتی ہے۔ خصوصیت سے اوس ظریف کے یہاں جس کی عام باتیں بھی ظرافت کی گل افشانیوں سے خالی نہوں۔ پھر مرزا کی خوشی کے الفاظ کا کیا پوچھنا ہے میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی۔ اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ؎

کسے کیں مُرادش میسر بود اگر جم نباشد سکندر بود

ایک گنہگار جب خدا کے غضب سے ڈرتا ہے۔ ایک عاصی بدکردار جب اپنے کئے پر کھتا ہے تو رحمت اُس کے لئے آمادہ اور مغفرت کے دروازے اُس کے لئے کشادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ کہ مجرم کا ضمیر اُس کو ملامت نہ کرے۔ اور کسی تباہ کار عصیاں کا دل کبھی ایک لحظہ کے لئے خوف خدا سے لرز نہ جائے۔ مرزا کا یہی بڑا کمال ہے۔ کہ وہ اس عالم بیم میں بھی رجا کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اور روتے ہوئے بھی ان کے لبوں سے تبسم کی صورت عیاں ہوتی ہے۔

"رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے۔ اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاویدی اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔ نجات کا طالب غالب۔"

آلام واسقام کے ہاتھوں اتنے پریشان تھے۔ کہ زندگی ہی میں اپنے آپ کو مُردہ تصور کرتے تھے۔ اوسی ں کا بارہا اعادہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا"

اب تو خیر مگر پہلے زمانہ میں یہ رسم تھی کہ کاتب القاب لکھتا۔ القاب کے بعد آداب۔ اسی آداب میں سلام ہوتا تھا۔ ب خط کو ختم کرتا تو چھوٹے بڑوں کو دعا وسلام سے یاد کرتا۔ مرزا بھی اسی زمانہ کے لوگوں میں سے تھے۔ وہ بھی آخر خط میں ں کے ساتھ اس رسم کی پابندی کرتے تھے اور اپنے ملاقاتیوں کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ سلام و دعا ایران کے خطوں میں لی ۔ مگر سلام میں طرح طرح کی ندرتیں اور نزاکتیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سلام کے مراتب اون کے یہاں اس طریقہ سے تھے۔ کہ اوس شخص کے رتبہ سے جسکو سلام لکھنا ہوتا۔ سرمو نہ تجاوز کرتے تھے۔ اور نہ کمی۔ ہر کام قرینے سے ہر بات انے کی ہوتی تھی

زا تفتہ کے ایک خط میں منشی بھگوان پرشاد کو یوں سلام لکھتے ہیں۔

"وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں۔ یعنی منشی بھگوان پرشاد مثل خوان میرا سلام قبول کریں۔"

اہ عالم کے خط میں اون کے والد کو سلام لکھتے ہیں۔

"اور اپنے والد ماجد یعنی میرے مرشد ہم عمر و ہم فن کو وہ سلام جس سے محبت ٹپکے اور اشتیاق برسے۔"

سف مرزا کے خط میں اون کے ماموں کو سلام لکھا ہے۔

"اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میرا سلام باعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سیادت کے۔"

باقر علی اور حسین علی اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس قطب گئے ہوے ہیں۔ ایاز اور بناز علی اون کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں۔ اور ایک دعا۔ اور دو آداب ملتوی۔ دوا اور کلو اور کلسان کی بندگیاں پہونچیں۔"

مرزا علاء الدین احمد خاں کے خط میں لکھتے ہیں۔

"استاد میرجان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اون کی چچی تھیں اور مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی۔ اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود۔ اور موافق اس مصرع کے سلام علی اللہ والسلام الوجود بجود"

مرزا علاء الدین احمد خاں کے خط میں انہیں میر جان کی نسبت لکھتے ہیں

" استاد میر جان صاحب کو قدمبوس کہکر مجکو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام بلکہ دعا اون کو کہہ دینا۔"

انہیں نواب علاء الدین خاں کے خط میں نواب امین الدین خاں کو سلام لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

" بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی دتاب گویائی سلام"

اگر مرزا کے بیان کو بے کم و کاست صحیح مان لیا جائے تو پھر اس میں کوئی شک ہی نہیں رہتا کہ وہ بڑے بدنصیب تھے مگر اون کے بیان میں شاعری۔ مبالغہ۔ بلکہ غلو۔ اور ظرافت اس طرح مل گئے ہیں کسی کو تہ تک پہونچنا آسان نہیں ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اوائل عمر ہی سے وہ مصائب کا شکار ضرور رہے۔ اور بڑھاپے میں خصوصاً غدر کے بعد وہ مصائب جو ایک وقت میں وہ بطریق تفنن طبع لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے آخر میں ان کے حال پر صادق آنے لگے۔ باقی ابتدائی قصوں میں کچھ نہ کچھ مبالغہ اور شاعری ضرور شامل ہے۔ جب وہ اس داستان سوختہ بختی کو بیان کرتے ہیں تو سننے والے کو وہ لطف آتا ہے کہ محو حیرت ہو جاتا ہے

صاحب عالم مارہروی نے لکھا تھا کہ حیدرآباد کے نظام کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھیے کچھ نہ کچھ نفع ہوگا اوسکے جواب میں فرماتے ہیں۔

" میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اوسکی جائداد کی عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اونہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ اون میں خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال تھا میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوگئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک مدت کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مقرر کیا۔ اون کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلہ مدح گستری پانچسو روپیہ مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنے اگرچہ ابتک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجکو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش

اُسکی ضائع جائے گی۔ اور والی شہر اسکو کچھ نہ دے گا۔ اور اگر راجا نے اس سے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائیگی ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

نواب علاء الدین احمد خاں نے دوسرے لڑکے کے پیدا ہونے پر مرزا سے تاریخ پیدائش نظم کرنے کی درخواست کی مرزا نے عذر بھی کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی سوختہ اختری کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمایا

"علاء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہونگا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالےٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے۔"

انہیں کے ایک خط کے القاب میں یہ قصہ چھیڑ دیتے ہیں

"میری جان ناسازی روزگار۔ بیربطی اطوار و بطریق داغ بالائے داغ آرزوے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریاے ناپیدا کنار۔ وقنا ربنا عذاب النار۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں

"جو تم بابو صاحب سے منگوائے تھے وہ صرف بابو صاحب کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مذہب مشرب میں حلال ہے سو وہ دے گئے۔"

میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا قوام پتلا دیکھو اس لغت کے معنے کسی فرہنگ میں نپاؤ گے ہاں فرہنگ سرور میں ہوں تو ہوں۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔ اور کس حسرت سے لکھتے ہیں۔

"جناب عالی آج دو شنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۸ء ہے پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے ترشح ہو رہا ہے ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے ؎

افق ہا پر از ابر بہمن مہی سفالینہ جام من از مے تہی"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے

رکھتا تھا اب میسر نہیں"

مرزا علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں

"التوائے شرب شراب ۲۲ جون۔ شروع شراب ۱۰ جولائی"

مولوی عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں

"بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جزو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے۔ کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں۔"

مرزا جو کہ تہذیب و متانت مجسم تھے اس واسطے وہ تمام محاسن جنکی وجہ سے اخلاق کا نام اخلاق ہے اون میں بدرجۂ موجود تھے۔ خدا کے کفران نعمت سے تو ڈرتے ہی تھے اپنے دوستوں کا بھی وہ تہ دل سے شکریہ ادا کرکے احسان کا بدلہ دیتے تھے۔ م بالکل نئے انداز سے۔

نواب میر غلام بابا جان نے کچھ بھیجا۔ اون کو جواب میں لکھا

"عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہونچا۔ اور میں نے اوس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضے علیہ التحیۃ والثنا آپ کا دادا میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے میں احسانمند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"تیسری تاریخ فروری کی ڈیڑھ پہر باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط معہ رجسٹری لایا۔ خط کھولا سو روپیہ کی ہنڈوی بل جو پچھ گئے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لیکر محل کے کٹرے چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی نے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے گئے۔ پچاس روپیہ محل میں بھیج دیئے گئے۔ چھبیس روپیہ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لئے۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اور اجر دے۔ بھائی بڑی آبنی ہے انجام اچھا نظر نہیں آتا۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔ اور ان کے خط میں میر سرفراز حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"شام ہوئی چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان یقین سید نصیر الدین ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ میں۔ اوس کے سر پر ایک ٹوکرا اوپر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا اہا ہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے شراب نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے۔ بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سر بمہر گلاس سمجھا بادۂ انگوری سے بھرا ہوا مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہے مگر میں تمہاری تکلیف اور تحف

سے خوش نہیں ہوا۔ تمہارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے۔ خانہ آباد دولت زیاد "
صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں شکر خدا اور شکریہ صاحب موصوف بجالاتے ہیں۔
"پیر و مرشد اس مطلع حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیونکر بجالاؤں خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان درگاہ سے بھلا کہواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی۔ کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ رہا اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا ورنہ بندہ دعوے خدائی کرنے میں بجا یا نہ کرے گا۔"
منشی شیو نرائن نے مرزا کے لئے تحفتاً لفافے بھیجنے کو لکھا کہ جلد بھیجوں گا۔ مرزا نے جواباً لکھا
"صاحب خط پہونچا۔ لفافہ پہونچا۔ لفافوں کی خبر پہونچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہونچ جائیں گے۔ ہم آپ کا شکر بجا لائینگے۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست"

مرزا کا شکوہ ملاحظہ ہو:-
سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں۔ اور ان کے شکوہ بیجا کا اپنے تہدید و شوخی آمیز شکوے سے جواب دیتے ہیں۔ وہ برابر خط نہ پہونچنے کی شکایتیں لکھا کرتے تھے۔ اور مرزا کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ کسی کے خط کا جواب رد کرتے لکھتے ہیں
"صاحب یہ پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمہارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا۔ اور میرا کوئی خط تم کو نہیں پہونچتا"
سیف الحق سیاح نے ایک مرتبہ کسی کتاب کی قیمت کے لئے پانچ روپیہ کے ٹکٹ بھیجد یئے۔ مرزا نے خفا ہو کر لکھا
"صاحب یہ تم نے پانچ روپیہ کے ٹکٹ کیوں بھیجے میں نہ کتاب فروش نہ دلال یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔"
ایک مرتبہ مرزا تفتہ کا خط پہونچنے میں دیر ہوئی۔ مرزا نے لکھا
"کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا اگر یہ حکم ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا۔ کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے بہرحال کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم۔"
ایکمرتبہ مرزا نے ایک خط جوابی مرزا تفتہ کو لکھا۔ شاید تفتہ نے یہ شکایت کی کہ آپ نے جوابی خط کیوں لکھا۔ مرزا نے جواب دیا۔
"کیوں صاحب یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا۔ اور وہ بھی دلی سے سکندرآباد کو آیا تھا تم کے اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا۔ کیا ہنسی آتی ہے تمہاری باتوں پر۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے "
ایک مرتبہ تفتہ کو لکھا۔

"منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم تو آپ کو سکندرآباد قانونگویوں کے محلے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مداریہ کا حقہ پی رہے ہیں اور منشی نولکشور سے باتیں کر رہے ہیں"

ایک مرتبہ مرزا تفتہ کو لکھا

"کیوں مہاراج کول (ضلع علیگڈھ) میں آنا اور جناب منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا۔ کہ تم کو مجھ کو بھول گئے کول میں آئے اور مجھکو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا کہ میں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر جو میں نے بیحیائی کرکے تم کو خط لکھا ہے لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو۔ اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔"

شاہزادہ بشیر الدین نے خط کا جواب نہ دیا تو لکھا

"حضرت پیر و مرشد برحق سلامت۔ تقصیر معاف۔ میں مُدعی۔ اور آپ مدعا علیہ بھی۔ اور حاکم بھی۔ وجہ استغاثہ یہ کہ آپ نے مجھے حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا عرایض جواب طلب کا جواب نہیں دیا۔"

صاحب عالم مارہروی کا خط کچھ ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ مرزا اس کے پڑھنے سے عاجز تھے اسی لئے لکھ دیا تھا کہ جب آپ مجھکو خط لکھئے چودھری عبدالغفور صاحب سے لکھوا لیئے۔ مگر انہوں نے خود ہی خط لکھا مرزا نے چودھری صاحب کو لکھا۔

"آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو کچھ لکھیں بقلم چودھری صاحب لکھا جائے حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بہ دستخط خاص لکھی۔"

میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مرزا کو خط لکھا ہے اور خط میں تمام میرن صاحب کا جھگڑا بھر دیا ہے۔ مرزا اس پر ستم ظریفی کرتے اور لکھتے ہیں

"سنو میاں سرفراز حسین۔ ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا وہ بھی اس طرح کا کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے ع بہ غیر در شکر آب است و رو بہ ما دارد۔ پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے مجھکو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تحریر میں القاب میرا۔ پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سیر ہے۔ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں۔ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لئے سلام تک نہ ہوگا تو میں اُس کا جواب آنکھوں سے لکھونگا"

ایک مرتبہ صاحب عالم اور چودھری صاحب مارہروی کے خط میں دیر ہوئی۔ مرزا نے شاہ عالم صاحب کو شکایتاً لکھا "ہمارے حضرت ہمکو بھول گئے۔ ہاں سچ ہے اون کا لُطف چودھری عبدالغفور صاحب کے جوہر محبت کا عوض تھا

جب جوہر نہ رہا تو عرض کہاں "

ایکمرتبہ صاحب عالم کے خط میں چودہری عبدالغفور صاحب کی بابت لکھا

"خورشید عالم کو سلام۔ چودہری صاحب کو نہ سلام نہ نیاز۔ صرف یہ پیام کہ ہم تمہارے خط کو مفرح روح سمجھتے تھے وہ وظیفۂ روحانی منقطع کیوں ہوا "

ظہیر الدین کو ان کے باپ حکیم غلام نجف خاں کے خط میں لکھتے ہیں۔

"کیوں ظہیر الدین کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھکو الگ لکھتا۔ یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا۔ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے تیری بندگی لکھدی تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی "

ایک خط میں حکیم نجف خاں کو میاں فضل حسین کی شکایت اس طرح لکھتے ہیں

"ہائے قسمت اس قسمت پر لعنت میاں فضل حسین میرے مربی و محسن بنیں اور پھر وائے محرومی کہ مطلب بر آری نہ ہو خدا کرے نہ ہو لونڈوں کا احسان زہر قاتل ہے "

مرزا چونکہ اپنا کلام خود جمع نہ کرتے تھے بلکہ اون کے بعض شاگرد مثلاً ضیاء الدین احمد خاں وغیرہ لکھ لیتے تھے اس لئے جب دیوان کے چھپنے کی نوبت آئی تو ادھر اُدھر سے مانگنا پڑا۔ مگر بعض جگہ سے انکار ہوگیا تو مرزا صاحب کو سخت کوششیں کرنی پڑیں چنانچہ اسی بارہ میں تفضل حسین کو لکھتے ہیں

"کیوں صاحب یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار یا سو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو تم کو مبارک رہے۔ مجھکو مستعار دو۔ میں اُس کو دیکھ لوں۔ جو میرے پاس نہیں ہے اوس کی نقل کرلوں پھر تم کو واپس بھیجدوں اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل ہے اس کی کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو میرا اعتبار نہیں۔ یا یہ کہ میرا ستانا اور مجھکو آزار دینا بدل منظور ہے وہ کتاب اس میرے آدمی کو دیدو "

مرزا حاتم علی مہر کے خط پہونچنے میں دیر ہونے کا یوں شکوہ کرتے ہیں

" یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں نیم مہینہ بعد برس دن بعد اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں میں بھی شاطر ہوں اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے بھی خیال میں آجاتا کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابل سماعت ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو "

مرزا مہر کو شکوہ کی تعریف لکھتے ہیں اور شکوہ کا طریقہ بتاتے ہیں

"خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است۔ آید بزباں ہر انچہ از دل برود" بندہ پرور فقیر شکوہ سے برا نہیں مانتا مگر

شکوہ کے فن کو میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منھ نہ موڑے معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے "

مرزا سے کسی نے کہا کہ خواجہ غلام غوث بے خبر آپ کی قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ یوں تو بیسیوں آدمیوں نے جواب لکھا تھا۔ مگر چونکہ خواجہ صاحب مرزا کے دوست تھے اس واسطے رنج ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ انہوں نے شکوہ کیا۔ خواجہ صاحب وضعدار آدمی تھے اون کو بڑا صدمہ ہوا اور مرزا سے اس بدگمانی کی شکایت کی۔ مرزا نے جواب میں لکھا کہ

" میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

پیرومرشد خفا نہیں ہوا کرتے یوں سنا مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا منعی جواب یہ ہے محل استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیاء کا یہ حال ہے۔ وائے بر حال ہم اشقیاء کے۔ یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیاداری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں۔ لیکن فقیر آزاد ہوں۔ نہ شیاد کیاد .... میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں

نگہم نقب ہمی زد بہ نہانخانۂ دل مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم "

نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں

" حضرت کیوں آپ نے مراسلے اور میرے مکتوب کا حال پوچھا۔ بس ہر کہ جواب نہ نویسد جواب است۔ سمجھ لو اور چپ ہو رہو "

منشی شیو نرائن کو کئی خط لکھے جواب نہ آیا تو یہ لکھا

" کیوں میری جان تم نے خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔ یا لکھنا ہی بھول گئے ہو۔ شہر میں ہو یا نہیں "

نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں

" میری جان کیا کہتے ہو کیا چاہتے ہو۔ ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سبحہ و سجادہ کا یہاں پتہ نہیں ورنہ وہ بھی عزیز مند رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہونچ گئے۔ آخر اکتوبر میں نیر رخشاں کو بھی دیں لو پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر۔ آبان ماہ و آذر سے کیا غرض ؎

بسے تیر و آبان و اردی بہشت برآید کہ ما خاک باشیم و خشت

خط نہ بھیجنے کا شکوہ کرتے ہیں

" مرزا علائی مولائی نہ لاہور سے خط لکھا۔ نہ لوہارو سے۔ بلقد رسادۂ حمق محو انتظار۔ بلکہ امیدوار رہا۔ اب

جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک شکوہ کے دفع میں طوطی نامہ کے برابر ایک رسالہ لکھو گے۔ (ور ہزار وجہیں) وجہ بیان کرو گے میں اس تصویر کا منتظر ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو،،

لاہور اور لوہارو کی تجنیس۔ بقدر مادۂ حمق استفادہ۔ شکوہ کا موقع ہاتھ آنا۔ طوطی نامہ کی برابر رسالہ تصویر میں مرزا اٹھانا۔ سب ظریفانہ جملے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں

"میری جان شکوہ کرنا سیکھو۔ یہ باب میں نے ابھی تم کو پڑھایا نہیں کوئی خط تمہارا نہیں آیا کہ میں نے اسی دن یا دوسرے دن جواب نہ لکھا ہو،،

نثر مسجع اور نثر مرجز کی بحث بھی مرزا کچھ اور گفتہ تھے اور صاحب عالم علی الرغم مرزا کے قتیل کے قواعد اور غیاث سے دلائل پیش کرتے تھے مرزا نے جواب میں لکھا

"اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم۔ نہ یارائے کلام۔ قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتبر سمجھے،،

شوخی کلام مرزا کا خاص حصہ ہے۔ اس کے لئے کچھ لکھنا بیکار ہے۔ صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ شوخی کلام اگر دل آزاری کے قریب پہونچ گئی۔ یا اس میں پھکڑ اور ہجو کا شمول ہوا تو شوخی کی اصلی غرض و غایت فوت ہو جاتی ہے اور پھر وہ شوخی شوخی نہیں رہتی کچھ اور ہی چیز ہو جاتی ہے۔ مرزا کو اس بارہ میں ید طولے حاصل ہے۔ اور یقیناً اردو میں تو کیا شاید فارسی میں بھی ان کا جواب مشکل سے ملے۔

نواب میر غلام بابا خان نے تصویر بھیجی۔ مگر مرزا... فوٹو کو پسند نہ کرتے تھے اسی بارہ میں سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں۔ اور اپنی فطری شوخیوں سے کام لیتے ہیں

"حال تصویر کا یہ کہ میں نے اوسے سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا۔ گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا۔ لیکن اسکا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسر ہوا۔ گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سن لینگے دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پہنچے اور پنجہ کا پتہ نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔،،

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اوسی زمانہ میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش اون کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اوس کا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اوس کا نام بھی دلی اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔"

ایک خط کو ختم کرتے ہوئے میر مہدی کو لکھتے ہیں

"لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو چاہو جاؤ اپنے گھر۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علیخاں یہ ہم دونوں روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں جسکا روز مرہ ہے۔ کھلونے منگا دو میں بھی بجار جاؤں گا"

ایک خط میں شفق کو وسیم الدین و ظہیر الدین کی بابت تحریر کرتے ہیں

"وسیم الدین و ظہیر الدین کو منشی میر شیخ خواجہ کیا کر کے [illegible] دل"

میران صاحب کو لکھتے ہیں

"خط پہونچا۔ اگرچہ میں نے صرف پڑھا۔ میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔ تمہارا خط پہونچا آنکھوں سے لگایا۔ آنکھوں میں نور آیا۔ دل پر رکھا، [illegible] پایا۔ کل تک اوس کو سنکر شرماتے تھے اور آپ ہی کھلے جاتے تھے۔ اب بن بن کر باتیں بناتے ہو۔ اور ہم کو کڑھاں سناتے ہو کاشکے تم یہاں آجاؤ تب اس تحریر کا مزہ پاؤ"

مرزا نے احتشام الدولہ بہادر کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اور جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے وہ ہم سن بڈھے باہمی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں مصروف و مشغول ہیں۔ ان کی روانگی الور کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔ اور یوسف مرزا کو مخاطب فرماتے ہیں

"آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یکشنبہ کا دن ہے ساتویں تاریخ رمضان کی اور تیسویں اپریل کی صبح کو بھائی فضلو جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتشام الدولہ خطاب دیا ہے وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا۔ اور دو سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہوکر الور کو روانہ ہوے"

مرزا کو اپنے کلام کی علی حسب مراتب داد نہ ملنے کا صدمہ عمر بھر رہا۔ اور اس صدمہ سے وہ کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ ایک بند پھر ایسے ہی دل شکن حالات کو ظریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ علائی نے اپنے داد نہ پانے کی فریاد مرزا سے کی مرزا کہتے ہیں۔

"بھائی اس معرض میں میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں اگرچہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ بایستہ پائی نہیں۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں۔ اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف میں جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی۔ جس شہر میں رہوں۔ اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

نواب علاء الدین احمد خاں نے آنے کو لکھا اور نہ آئے۔ تو مرزا نے لکھا کہ شاید تم عید میں آسکو۔ یہیں سے ظرافت کی طرف قلم کو دوڑ دیا۔ کہتے ہیں

"ہے ہے میں تو کہتا ہوں نہ آسکو اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشین کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی کی دلہنڈی کا سماں لہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑے دھوم سے نکلے۔ حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور ستمکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے۔ اور خرسوار کو بضرب تازیانہ دوڑالے۔ علاء الدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ ارے ظالم اس کوسہ برنشین کی داد دے۔ عقل کرامت ہے۔ الہام ہے۔ لطف طبع ہے۔ کیا ہے۔ یہ رسم کس قدر مناسب ہے!!"

علائی نے مرزا کو لکھا کہ غزل بعد اصلاح جلد بھیج دیجئے۔ مرزا ہمیشہ کے عوارض سے تنگ آگئے تھے لکھتے ہیں

"میاں تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیائے مرسوم و معمول ہیں خیر تمہارا حکم بجا لایا۔ غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے۔"

غالباً علاء الدین خاں نے ایک مرتبہ مرزا کو اپنے یہاں بلانے کے لئے لکھا اور درمیان میں کچھ اچھے اچھے کھانوں کا بھی لالچ دلایا۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں۔

"خصی بکروں کے گوشت کے قلئے دوپیازے پلاؤ کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو۔ مجھکو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ جب کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر نے ایک مرتبہ خط میں کچھ اپنے بڑھاپے کا حال لکھا۔ مرزا نے جواب میں تحریر کیا۔

" پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔ فقرہ۔ کیا جانئے بڑھاپے میں کہاں کی حرارت مزاج میں آگئی ہے فقط۔ کیوں صاحب تم نے بڈھوں میں اپنا نام لکھوایا تو مجھکو لازم ہے کہ میں اپنے کو اموات میں گنوں۔"

مرزا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ سیدھے سیدھے ہنسنے ہنسانے والے لفظوں میں بلا کی چٹکیاں لیتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔

" اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں۔"

میر مہدی کی عادت تھی کہ جب مرزا کو خط لکھتے تو عبارت میں اچھا خاصا بناؤ چناؤ کیا کرتے تھے۔ اور تفنن عبارت کے طرح طرح کے الفاظ لکھتے۔ ایک مرتبہ مرزا نے مدح کو طنز کے ساتھ سمو کر یہ فقرے لکھے

" تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو۔"

میرن صاحب کو خرچ بھیجنے میں دیر ہوئی۔ اون کی اہلیہ نے مرزا صاحب سے شکایت کی مرزا نے میر مہدی کو لکھا۔ اور باتوں باتوں میں کھوٹی کھری بھی سنا دیں اور پھر کچھ نہیں۔ لکھتے ہیں

" اجی وہ یوسف ہند نہ سہی یوسف دہر سہی یوسف عصر سہی یوسف کشور سہی اون کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپیہ مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اون کا تقاضہ ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپا جان کو لکھو کہ پھوپی جان بھوکی مرتی ہیں خرچ جلد بھیجو ورنہ نالش کی جائے گی۔ اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔"

اسی خط میں لکھتے ہیں اور میر مہدی پر طنز کرتے ہیں

" میر نصاحب کے خط کے لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضہ کیوں نہیں کرتے۔ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے تم اُن سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔"

میر مہدی کو یہ دُھن تھی کہ مرزا صاحب کو جلد جلد خط لکھا کریں۔ ادھر مرزا صاحب کو عدیم الفرصتی، بیماری۔ آرام و افکار غرضکہ ایک بار لکھتے ہیں۔

" میری جان۔ تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے اگر خط پہونچا ہے تو جواب ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے سر منڈوا ڈالا ہے۔ محلقین و مسلم

پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔"

میر مہدی آشوب چشم میں مبتلا ہوئے۔ مرزا صاحب کو حال لکھا۔ ان کو دل لگی کا ایک مسالہ ہاتھ لگا جواب میں لکھا۔

"میاں کیوں ناسپاسی وحق نشناسی کرتے ہو۔ چشم بیمار ایسی چیز ہے جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمھارا منھ چشم بیمار کے لائق کہاں۔ چشم بیمار میرزا صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں۔ جس کو آپ چھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو۔ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی"

میر مہدی نے ایک مرتبہ اپنی غزل میں ایک مقطع لکھا جس کا مصرع آخر یہ تھا "میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے"۔ مرزا صاحب نے پہلے تو اسی مصرع پر لکھا کہ میر مہدی تجھ کو شرم نہیں۔ پھر شہر کی حالت لکھتے ہوئے لکھتے ہیں

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار۔"

میر مہدی کی عبارت کے متعلق ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ چاہے امر واقعہ سمجھئے۔ خواہ مذاق جانئے۔ خواہ مدح سمجھئے۔ خواہ طنز کیسے جامع فقرے ہیں سب رنگ جھلک رہے ہیں

"میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا۔ سنو دلی کے تمام مال ومتاع وزر وگوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں

"میری جان خدا تجھکو ایک سو بیس برس کی عمر دے بوڑھا ہوئے آیا داڑھی میں بال سفید آگئے مگر بات سمجھنی نہ آئی۔ پنشن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بیجا اُلجھے ہو۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر سے مرزا کے ہم وطنانہ دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔ اگر اُدھر سے تھوڑی سی بے توجہی یا استغنا دیکھتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے شکوے اور گلے کرتے ہیں۔ جس میں محبت طنز، شکوہ سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں

"اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعات عالمگیری۔ انشاء خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو جو عبارت

اوس میں سے پسند آیا کرے وہ خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا۔ اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا۔ اوس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا ہے

برات عاشقاں بر شاخ آہو

واقعی جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھکو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دوکانوں میں فرنج اور شامپین کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر جواہر اور روپیہ بھرے ہوئے ہیں۔ میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا۔ اور وہ مال کیونکر اٹھاؤں گا۔ بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے اور قصیدہ مجھ کو بھیجا ئیے،،

نواب انور الدولہ شفق کا خط ذرا دیر میں آیا تو لکھتے ہیں

"حضرت پیر و مرشد اگر آج میرے سب دوست و عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے۔ تو میں کہتا کہ آؤ رسم تہنیت بجا لاؤ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انور الدولہ کا خط لایا ع

اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

منہ پیٹتا ہوں۔ اور سر پٹکتا ہوں۔ کہ جو کچھ لکھا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ الہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا۔ پہلے انور الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں پھر اس کے بعد مر رہوں۔،،

نواب علاء الدین خاں مرحوم کی اپنے والد سے کچھ شکر رنجی تھی اسی وجہ سے اکثر اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں جو نہ ہونا چاہئے تھیں۔ چنانچہ مرزا اسی بارہ میں علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں کہ تمھارے والد یہاں آئے تھے اون سے ملاقات ہوئی یہ باتیں ہوئیں

"میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے تو بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اوس کو چاہتے تھے۔ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اون کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔،،

ایک جگہ انھیں کو کسی بات پر لکھتے ہیں۔ اور غصہ کے ساتھ نصیحت اور نصیحت کے ساتھ ظرافت کو ملا کر ایک خوشنما الفاظ کا گلدستہ بنا دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں

"برخوردار علی حسین خاں آیا۔ مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اُس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالےٰ اپنا فضل کرے۔ الولد سر لابیہ تم اس کے مصداق کیوں بنے۔ خفقان اور مراق اگرچہ تمھارا خاندانی موروثی ہے۔ لیکن آج تک تمھاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ اب کیوں آیا۔ اگر آیا تو ہرگز ہرگز اوس کو ٹھہرنے نہ دو۔ ہانک دو۔ خبردار اوس کو اپنے پاس رہنے نہ دینا۔،،

انھیں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی۔ اور تم پر باایں ہمہ بُعد آشکار۔ دوران باخبر در حضور۔ و نزد مکان بے بصر در۔ روپیہ آگیا۔ دل سے نکلا۔ مخزن سے نکلا۔ ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گند کٹ جائیگا۔ تب ترساں ترساں پیشگاہ نادری میں تمھارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں مردود بھی ہوں۔"

اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مرزا کے خاص دوست صاحب عالم مارہروی کا خط نہایت الجھا ہوتا تھا۔ مرزا بار بار لکھتے تھے کہ کسی اور سے لکھوایا کرو۔ وہ سنتے نہ تھے۔ محبّت کے مارے آپ ہی لکھنے بیٹھ جاتے۔ مرزا نے عاجز ہو کر ایک دفعہ لکھا۔

"حضرت کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اس کا جواب لکھتا ہوں۔ اور جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذ بازو کر رکھتا ہوں۔ اگر بفرض محال کبھی ملاقات ہوگی تو آپ سے دریافت کر کے بانیج گزار ہوں گا۔"

بعض باتوں یا کاموں کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو عذر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو عذر کرنا نہیں جانتے وہ اس فن کو بھی بدنام کرتے ہیں انھیں حضرات کی بدولت عذر لنگ، اور عذر بارد کے الفاظ کا وجود دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ مرزا کے عذر و معذرت ایسے پُر زور ہیں کہ کہنے والا کبھی یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اوس میں تصنع اور تکلف یا بناوٹ کو بھی کوئی دخل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ عذر میں جھوٹ اور مبالغہ کو دخل ہی نہیں دیتے۔ اور اگر ضرورتاً کہیں ایسا کرتے ہیں تو ظرافت کا عنصر اتنا غالب کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن اس طرف سے منتقل ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ذیل میں آپ دیکھیں گے کہ بیسیوں جگہ میں سے ایک جگہ بھی اُن کے عذر آمیز الفاظ میں کمزوری نہیں معلوم ہوتی۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میاں داد خاں سیّاح مُصر ہیں کہ جس طرح ممکن ہو تصویر کھنچوا کر بھجوائیے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں

"تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھی پر سے اتروں پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹے دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں"

نواب مرزا علاء الدین خاں فرط محبّت میں مرزا کو لوہارو بُلاتے ہیں۔ مرزا ٹالتے عذر کرنے اور یہ جواب دیتے ہیں

"لوہارو ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھر دوں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں دو ساتھ لوں۔ چلدوں۔ رامپور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہونچ سکتے ہیں، طاقت کہاں سے لاؤں، روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں محلسرا سے کہ وہ بہت قریب ہے۔ جب جاتا ہوں، تو

ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے، اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔"

جس طرح مرزا، صاحب عالم مارہروی کو عزیز رکھتے تھے اسی طرح وہ بھی مرزا سے عقیدت و خلوص رکھتے تھے۔ دل سے متمنی تھے کہ غالب مارہرہ آئیں۔ ہنگامۂ صحبت گرم ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے ذکر کیا کہ مرزا صاحب کا مارہرے آنے کا ارادہ تھا مگر بے تاب ہوگئے، اور فوراً مرزا کو خط لکھا۔ ارادہ یاد دلایا۔ کہ اب آئیے آموں کا زمانہ ہے۔ مرزا نے جواب میں لکھا

"خداوند مجھے مارہرے بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا۔ کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منھ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں۔ بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا کہ عہد جوانی گزشت جوانی مگو زندگانی گزشت

اب اُس کے واسطے کیا سفر کروں۔ مگر حضرت کا دیکھنا۔ اِس کے واسطے متحمل رنج سفر ہوں تو جاڑے میں نہ برسات میں۔ اے وائے زنحرومی دیدار دگر ہیچ"،

چودھری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں، اور صاحب عالم کے خطوں کے جواب نہ دینے کا یوں عذر کرتے ہیں

"دو خط حضرت صاحب کے آئے۔ جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مردہ بنایا جب یہ عبارت لکھی"۔

میر مہدی مجروح کو میرن صاحب کی بابت لکھتے ہیں۔ اور کیا خوب لکھتے ہیں۔ کہیں میر مہدی صاحب نے لکھا ہوگا۔ کہ میرن صاحب کو جب تک کہ میں نہ کہوں دلی نہ بلائیے۔ مگر مرزا صاحب کا خود ہی یہ ارادہ نہ تھا۔ کہ بلائیں۔ اس لئے انہوں نے جواب میں لکھا اور ایک خاص طریقہ سے عذر کیا

"میرن صاحب کو جب تک تم نہ کہو میں دلی نہ بلاؤں۔ گویا اُن کے عاشق تمہیں ہو میں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ۔ اور غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہو تو تیس روپیہ مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو۔ اور اگر دو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔"

میر سرفراز حسین مرزا کے ایما یا ان کی خواہش کے مطابق الور بغرض تلاش روزگار گئے۔ مگر وہاں کچھ کار براری نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کو یہ اطلاع ہوئی تو انہوں نے میر مہدی کو لکھا۔

"وہ سورو پیہ کی زیر باری ہوئی۔ اور چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک سہی"

آخری فقروں سے جو درد و حسرت اور دلی رنج کے ساتھ عذر کے پہلو ظاہر ہو رہے ہیں۔ وہ غالب کا حصہ ہے۔

ایک مرتبہ میر مہدی نے کسی کتاب کے لئے مرزا کو لکھا کہ وہ اب تک چھپی یا نہیں چھپی یا مرزا نے جواباً لکھا۔

"میاں کیا باتیں کرتے ہو۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے کتابیں کیا چھپواؤں گا۔"

قاضی عبد الجمیل صاحب جنون نے غزل بھیجی۔ اتفاق سے گم ہوگئی۔ اُنہوں نے اصلاح کے لئے تقاضہ کیا۔ مرزا کہاں سے اصلاح دیتے۔ غزل کہاں سے لاتے۔ یوں عذر کیا۔

"وہ غزل جو کمار لایا تھا۔ وہاں پہونچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنے عدم مدعا یہ کہ گم ہوگئی۔"

قاضی عبد الجمیل جانتے تھے کہ مرزا آم کے عاشق زار ہیں۔ لہذا ہر سال آم بھیجتے تھے ایک سال آم پیدا نہ ہوئے بھیج نہ سکے تو عذر کیا۔ مرزا نے لکھا

"آموں کے باب میں جو کچھ لکھا یہ کیوں لکھا۔ اہا تو دوام کیا ضرور ہے۔ خصوصاً جبکہ بنات خود حادث ہو۔ حضرت اب کے سال ہر جگہ آم کم ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ خشک اور بے مزہ ہے۔ آم کہاں سے ہو۔ نہ حادث نہ برسات دریا پایاب ہوگئے۔ کنوئیں سوکھ گئے۔ اثمار میں طراوت کہاں سے ہو۔ جناب اس کا خیال نہ فرمادیں۔ اپنے کشف کو غلط کر دوں گا، بر شگال آئندہ تک جیوں گا"

ایک مرتبہ مولوی احمد حسن قنوجی نے خط لکھا۔ مرزا ان کو بھول گئے تھے۔ سرسری ملاقات ہوئی ہوئی۔ اس کے بعد ذہن سے اتر گئے ہوں گے۔ اس کے بعد ان کا خط آیا۔ مرزا سوچتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔ کسی طرح یاد نہیں آتا کہ بھیجنے والے سے کب کی ملاقات ہے۔ آخر جواب میں یوں عذر کرتے ہیں

"یارب یہ ایک خط جو مجھکو بڑودہ گجرات سے آیا ہے۔ کاتب نے اپنے کو احمد حسن قنوجی بتایا ہے۔ ادھر سے اظہار آشنائی ہے میری طرف سے یہ بے حیائی ہے کہ مجھکو اپنی اور ان کی ملاقات یاد نہیں آتی۔ سوچتا ہوں کوئی بات یاد نہیں آتی۔ خانۂ نسیاں خراب عشرۂ قتالہ کے مرحلہ کا رہ پیما ہوں۔ اگر جیوں گا تو اس کا بھی مجھکو علم نہ رہیگا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ خدایا کیا اس عمر میں سب ایسے ہی خرف ہو جاتے ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ کو سید لکھوں۔ مولوی لکھوں۔ خان لکھوں۔ خط میں تو کچھ لکھ دوں گا۔ خط کا کیا عنوان لکھوں۔ بندہ پرور فقتہ معاف رہے۔ حضرت کا دل غبار کدورت سے صاف رہے۔"

سید احمد حسین مودودی کے شکایتی خط آئے اور انھوں نے لکھا کہ خط پر خط بھیج رہا ہوں جواب نہیں ملتا۔ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"پیرو مرشد تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی آپ کے خطوط آئے ہوں گے۔ کوئی خط پڑھ لیا ہوگا۔ کوئی سر بمہر ناکشادہ پڑا رہا ہوگا۔ البتہ حاجی مصطفےٰ خاں کا آنا مجھکو یاد ہے یقین کرتا ہوں کہ انھوں نے از روئے مشاہدہ میری خستگی تن کا حال حضرت کو لکھا ہوگا۔ اب میں اپنی زبان سے یہ کیونکر کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا بہرا۔ اپاہج۔ بدحواس۔ ناتوان۔ فلک زدہ آدمی ہوں عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا اوس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی اوس کو دیکھ کر بھیجوں گا۔ مگر حضرت کے مسکن کا پتہ بھول گیا ہوں۔"

تمام باتیں لکھکر آخر میں یہ کہنا کہ آپ کے مسکن کا پتہ بھول گیا۔ ایک عجیب پُرلطف بات ہے۔

ایک مرتبہ اور انھوں نے غزلوں کی اصلاح کی دیر کی شکایت کی مرزا صاحب نے عجیب لطف سے جواب دیا فرماتے ہیں

"پیرو مرشد آپ کو میرے حال کی خبر بھی ہے۔ ضعف نہایت کو پہونچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے۔ جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا۔ اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے۔ نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی میں متوقع ہوں کہ میرے احباب و دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کروں گا۔"

اور ایک جگہ اسی بارہ میں انہیں کو لکھتے ہیں

"حضرت یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مر لیا۔ کثرت احکام۔ تواتر ورود اشعار۔ پھر یہ مجبار۔ کہ سورہ پیہ کے لوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔

غزلیں آپ کی برستی ہیں۔ کہاں تک دیکھوں آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔ بہتر برس کا آدمی پھر رنجور دائمی۔ غذا ایک قلم مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی۔ نہ بوٹی۔ نہ پلاؤ نہ خشکا۔ آنکھ کی بینائی میں فرق۔ ہات کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم جہاں جو کا عذر رہا۔ وہیں رہا۔ میر عالم علی کی دو غزلیں آئی ہوئی کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔"

بیرنگ خط بھیجنے کا مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے یہ عذر فرماتے ہیں

"آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام۔ معاف رکھنا زیادہ والسلام"

منشی شیو نراین صاحب کی فرمایش تھی کہ آپ اردو میں کوئی عمدہ قصہ لکھئے۔ بار بار مرزا صاحب کو مجبور کرتے تھے۔ تنگ آگئے تو ایک مرتبہ یہ لکھ کر عذر کیا۔

" میاں اُردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے۔ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصّے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں مٹیاں زیادہ زیادہ۔"

نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے صاحبزادہ مرزا علاء الدین احمد خاں مرزا کے بڑے پیارے عزیز اور شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے مرزا صاحب سے وعدہ کیا کہ علاء الدین احمد خاں کو دہلی بھیجئے۔ وہ بھول گئے اور یا کچھ ادا ایسے ہی امور مانع ہوئے مرزا صاحب نے ان الفاظ میں یاد دلایا جس میں علائی کے عذر کو ایک دلکش انداز سے یوں بیان فرمایا

" لو صاحب وعدہ کب وفا کروگے۔ علائی کو کب بھیجوگے۔ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا میں رہرو چالاک ہوں تیراک نہیں۔ لوہارو سے دلی تک کشتی بغیر کیونکر جاؤں ؎ اے زفرصت بیخبر در ہرچہ باشی زود باش "

نواب علاء الدین احمد خاں نے اپنے بیٹے کی تاریخ لکھنے کی فرمایش کی تو مرزا صاحب نے عذر کرکے ٹال دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تاریخ سے ہمیشہ گھبراتے اور دور بھاگتے تھے۔ اور تاریخ گوئی کو دون مرتبت شعر و شاعری سمجھتے تھے۔ اسی واسطے نہایت دلچسپ معذرت کی ہے۔ کہتے ہیں

" شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہوگئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ نام تاریخی کیوں نہ نکال لو۔ کہ مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی ایک ایک قصیدہ میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدہ کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا۔ نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

ایک جگہ علائی کو لکھتے ہیں

" علی حسین خاں آئے دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آسکتے ہیں اور نہ میں جا سکتا ہوں۔ وہ لنگڑے میں لولا۔"

ایک مرتبہ علاء الدین احمد خاں نے کوئی کتاب مانگی مرزا نے جواب میں یہ عذر کیا۔

" سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا۔ نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ ہم سے کتاب مستعار مانگتے ہو یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ دساتیر اور برہان قاطع کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ از انجملہ برہان قاطع تم کو

دے چکا ہوں۔ دستانیر میرا ایمان وحرز جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے مجھکو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹئی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف بھٹئی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔"

انھیں کو کسی اور بات پر لکھتے ہیں۔ عُذر کے ساتھ کچھ خفیف سی برہمی بھی شامل ہے۔

"میاں میں تمھارے باپ کا تابع تمھارا مطیع فرخ مرزا کا فرماں بردار مگر ابھی اٹھا ہوں۔ اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔"

میکش کو بیمار پُرسی کے لئے نہ آسکنے کا عذر لکھتے ہیں

"میاں عجیب اتفاق ہے۔ نہ میں تمھارے دیکھنے کو آسکتا ہوں، نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرماسکتے ہو۔ وہ قدم رنجہ کہاں سے کرو سراپا رنجہ ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔"

ایک خط میں چودھری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں

"جب آپ لالہ قتیل کے گزشتے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھکو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔"

مہر نیمروز کا ایک نسخہ چودھری عبدالغفور سرور کو بھیجتے ہیں۔ مگر چونکہ اون کو دینا منظور نہیں ہے۔ لہذا اس طرح عذر فرماتے ہیں۔

"ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ وکعبہ حضرت صاحب عالم کی اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں۔ جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی نذر کروں ادھر میں اون کو مشترک لکھوں نذر اُن کی ہے اور فیض یابی آپ کے مطالعہ سے۔"

بڑھاپے کا اقتضا ہے کہ وہ رنگین مزاجوں کے مزاج میں بھی غصہ پیدا کر دیتا ہے۔ بڑے مرد ہیں وہ لوگ جو ان اثرات سے متاثر نہیں ہوتے۔ مرزا بھی اُنھیں لوگوں میں سے ہیں۔ حلیم المزاج متحمل دور اندیش ہیں مگر بیماریوں کی کثرت۔ اور آلام و افکار کے ہجوم نے انھیں چڑچڑا بنادیا ہے۔ گو وہ تند مزاج نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں جھلا اُٹھتے ہیں۔ مگر اس جھلاہٹ کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔ جو بات لب تک آئی ہے وہ لب تک ہی رہتی ہے۔ دل پر اثر تو کیسا۔ دل کے قریب بھی نہیں پہونچتی۔ مگر اون کے اعجاز کلام اور تاثیر بیان کو دیکھئے کہ غصہ کی آتش فشانی میں بھی اون کے منھ سے ظرافت کے رنگین وخوشنما پھول جھڑتے جاتے ہیں، اور حقیقتاً یہی وہ کمال ہے جو سوائے بڑے بڑے معدودے چند باکمالوں کے اور کہیں نہیں پایا جاتا منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ اور اس بارہ میں تاکید کرتے ہیں کہ میرا عرف مرزا نوشہ کتاب پر نہ لکھا جائے۔

" صاحب مطبع نے خط کے لفافہ پر لکھا ہے۔ مرزا نوشہ صاحب غالب۔ للہ غور کرو یہ کتاب جو رجلد ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اردو یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز چھاپے کی یہ کوئی کتاب اوس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام لکھ دیتے تم نے بھی اون کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی قدرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلی کے حاکم کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالایق عرف کو نہیں جانتا پس اگر صاحب مطبع نے مرزا نوشہ صاحب غالب لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا کھویا گیا۔ میری محنت رائگاں گئی گویا کتاب کسی اور کی ہو گی۔ "

کسی قاضی کی طرف اشارہ کر کے نواب شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

" میاں قاضی تو چوتیا مسخرہ ہے۔ اون کا خط دیکھ لیا خیر ہاں علاء الدین خاں کا خط گھنٹہ بھر بھانڈ کے طایفہ کا تماشا ہے۔ "

ایک جگہ نواب شہاب الدین خاں کو لکھتے ہیں اور غصہ کو نرمی اور رنج کے ساتھ ملا کر کہتے ہیں

" رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے　　ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکے بیوجہ جواب　　غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے "

غدر کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔ اور انتہائی رنج کے غصہ کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں

" ارتضےٰ خاں ابن مرتضےٰ خاں کی پوری دو سو روپیہ کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپیہ مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہو گا میں خود موجود ہوں۔ اور حکام صدر کا کوئی پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ "

نواب علاء الدین خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں اور نہایت خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں مگر غصہ میں ایک تمثیلیہ جملہ مذاق کا شامل کر کے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں

" سنو صاحب حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے۔ لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اوس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و متحقق ہے۔ اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اوس سے قطع نظر نہ کرو۔ اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو۔ تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا

نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت سے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہ سہی اہل حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے خط کے پہونچنے کا میں ضامن۔"

ایک مرتبہ مرزا نے کوئی اصلاح دی جس کے خلاف صاحب عالم نے عبدالواسع ہانسوی کے رسالہ اور غیاث کے حوالے سے استناد کیا۔ مرزا نے جواب میں لکھا

" نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچہ سے اور اس علم سے مجھکو کتہ نہ جانو عربی کا عرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ مجھ یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ۔ غور کرو۔ اور مجھو عبدالواسع پیغمبر نہ تھا۔ قتیل برہمانہ تھا۔ واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں۔ شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو۔ نہ مانو۔ تم جانو "

اسی طرح نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ایک مرتبہ اپنا دیوان اس لئے مانگا کہ اہل مطابع کا تقاضہ تھا اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد مرزا صاحب کا کلام چھپ جائے۔ مرزا نے نواب ضیاء الدین خاں سے کہا۔ انھوں نے بڑی محنت سے دیوان جمع کیا تھا۔ اور اب وہ لخت جگر کا حکم رکھتا تھا۔ آسانی کے ساتھ اس کو جدا کرنا مشکل تھا۔ مگر مرزا صاحب کے سامنے انکار بھی آسان کام نہیں تھا۔ لہذا ٹالنا شروع کیا۔ مرزا کو غصہ آیا۔ ایک رقعہ لکھا۔

" جناب قبلہ و کعبہ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اوس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ ایک جلد ایکہزار جلد بنجائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو جائے۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی۔ تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا۔ اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔"

مرزا کے دیوان میں کسی نے کچھ رد و بدل کی اور وہ دیوان مرزا کی نظر سے گزرا۔ مرزا نے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھا۔

" بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا

ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دئے ہیں خلاصہ یہ کہ جس مفسد نے یہ شعر ہیں اوس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ مفسد پشت تک ولدالحرام اس کے سوا اور کیا لکھوں ایک تو لڑکے میاں غلام نجف دوسرے تم۔ میری کمبختی بڑا پی میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا"

قسم ایک طریقہ ہے حریف یا مخاطب کو یقین دلانے کا۔ مرزا اس میں بھی اپنے اصلی مذاق مطائبت و فنون طبعی کو شامل رکھتے ہیں۔ اور کبھی پروا نہیں کرتے کہ قسم کے ساتھ جب ظرافت شامل ہو جاتی ہے تو اس کا کیا اثر ہو جاتا ہے اور کس درجہ پر آ جاتی ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں نے دو تین مرتبہ کسی قصیدے اور رباعیوں کے لئے تقاضہ کیا۔ مرزا نے جواب دیا۔ کہ بسبب افکار و علایق کے کچھ کہا ہی نہیں ہے بھیجوں کیا۔ انھوں نے نہ مانا۔ اور پھر لکھا۔ مرزا کو غصہ آگیا۔ جواب میں برس پڑے۔ اور ایسے برسے کہ توبہ ہی توبہ ہے۔ ایک جگہ اسی جوش و خروش کے عالم میں قسم بھی کھا بیٹھے۔ لکھتے ہیں۔

" بدست مرگ دلے بد ترا زگمان تونیست - مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدہ کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیاں مانگتے ہو پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج قصیدہ بھیج۔ معنی اسکے یہ ہیں کہ تو جھوٹا ہے اسکے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم۔ انجیل کی قسم۔ توریت کی قسم۔ زبور کی قسم ہنود کے چار بید کی قسم۔ دساتیر کی قسم۔ ژند کی قسم۔ پاژند کی قسم۔ استا کی قسم۔ گرد گرنتھ کی قسم۔ نہ میرے پاس وہ قصیدہ ہے نہ مجھے وہ رباعیاں یاد"

قیاس کہیں صحیح ہوتا ہے اور کہیں غلط۔ یہ تعریف منطقیوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہو تو ہو۔ مرزا کو اپنے قیاس سے بھی صرف مطائبۃ اور ظرافت کا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ منشی شیو نراین نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال لکھتے ہوئے قے اور دستوں کے آنے کا حال بیان کیا۔ مرزا نے خط کے جواب میں لکھا۔

" قے کا ہونا اور دستوں کا آنا یہ چاہتا ہے کہ تم نے رات کو بری قسم کی شراب مقدار میں زیادہ پی ہوگی۔ کچھ تبرید کرو اور شراب زیادہ نہ پیا کرو"

ایک مرتبہ چودھری عبدالغفور سرور نے عرفی کا ایک شعر لکھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔ ع

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

مدرغالب! یہ شعر بطور استناد پیش کیا تھا۔ دیکھتے ہی مرزا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصہ میں جواب لکھا۔

"ہیہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں گویا مسخ کر دیتے ہیں۔ ان سے بعید نہیں۔ لیکن تم سے اور حضرت صاحب سے بعید ہے۔ کہ سہو کاتب کا نہ سمجھ لیا" من آں دریاے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت" دو کانوں کا علی التواتر آنا۔ دوسری بات ہے۔ دریاے آشوب کیا ٹکسال باہر لفظ ہے استعارہ بالکنایہ صحیح مگر یہ محل نہیں ہے۔ یہاں تو دریا چاہیئے بے شائبہ استعارہ وکنایہ۔ عیاذاً باللہ۔ عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پئے ہوئے ہوتا تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اس غریب کا مصرع یوں ہے۔ من آں دریا پر آشوبم کہ الخ "

اگرچہ مرزا کی عبارت اور ان کی تمام تر گفتگو لطیفہ ہوتی ہے۔ اور ان کے حرف حرف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لطیفۂ قدرت ہیں۔ مگر کہیں کہیں تفنن عبارت کے طور پر وہ متقدمین کے لطایف بھی بیان کرتے اور اپنی ظرافت کی شراب کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے ہی واقعات کو لطایف کی صورت میں پیش کرتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مرزا پر ایام غدر میں یہ جرم بھی لگایا گیا تھا کہ انہوں نے بادشاہ دہلی کا سکہ کہا۔ اور مرزا یہ کہتے تھے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ وہ سکہ ذوق مرحوم نے کہا تھا۔ اور اردو اخبار میں چھپا تھا اسی بنا پر وہ اردو اخبار جس میں یہ سکہ نکلا تھا تلاش کر رہے تھے۔ مگر نہ ملتا تھا۔ چودھری عبدالغفور سے پوچھا کہ تمہارے پاس اوس اخبار کا فائل تو نہیں ہے اونھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ مرزا نے انھیں کو ایک خط میں اسی زمانہ میں لکھا۔

"ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر، پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضاے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔ چون جنبش سپہر بفرمان داور است۔ بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد۔ یہ تحریر بطریق حکایت ہے نہ بسبیل شکایت۔ از ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری۔ فرمود کدام حال خواہد بود کسی را کہ خدا از وے فرض طلبد۔ و پیمبر سنت۔ و زن نان خواہد و ملک الموت جان "

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

"بھائی ہوش میں آؤ میں نے تم کو کب خط بھیجا اور رقعہ میں کب لکھا کہ میں شیر زماں کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی وہی بندگی لکھی ہوئی گویا لپٹی ہوئی تھی۔ سو حضرت کو پہونچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے "

نواب میر ابراہیم علی خاں وفا کو ایک لطیف واقعہ لکھتے ہیں۔

"دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں پہنچیں۔ مزا یہ ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا۔ کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے۔ اور کہاں کا ہے۔ شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی"

انورالدولہ شفق کو ایک واقعہ سناتے ہیں۔ اور اس کو ایک لطیفہ کرکے بیان کرتے ہیں۔

"ایک لطیفہ نشاط انگیز سنئے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان دنوں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھنک داس ہے۔ میں بالاخانہ پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا۔ اور اس نے دیکر مجھ سے کہا۔ کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو۔ جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشاں لکھا تھا۔ اوس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے کیشاں کو کپتان پڑھا"

نواب علاءالدین خاں کو لکھتے ہیں اور غدر کا ایک واقعہ سناتے ہیں

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بیگناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون۔ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممو بھی تم۔ سارا جہان بھی تم جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کسے دیں مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے"

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب صحت یاب ہوئے تو نواب علاءالدین خاں کو لکھا

"میر شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی۔ زحیر۔ تپ۔ صداع بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جاتے جائیگا۔ آگے کون سے قوی تھے کہ اب اُن کو ضعف کہا جائے"

"ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا ہائے بڑھاپا۔ ادھر ادھر دیکھا جب جانا کوئی نہیں ہے۔ کہتا ہوا بڑھا کہ جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے۔"

انھیں کو ایک خط میں فارسی کے ایک محاورہ کے متعلق لطیفہ سناتے ہیں

"نشستن استعارہ ہے ریدن کا۔ چنانچہ ایک تذکرہ میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعراء کی

دعوت اپنے باغ میں کی۔ مرزا صائب اور اس عصر کے کئی شعرا جمع ہوئے۔ ایک شاعر کے تذکرہ میں اُس کا نام مندرج ہے۔ اور میں بھول گیا ہوں۔ اکول تھا۔ مگر معدہ اس کا ضعیف تھا حرص وسرہ کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا ہضم نہ کرسکتا تھا۔ کھانا کھاکر شراب پی پی کر دروازہ باغ کا مقفل کرکے سب سو رہے۔ اس مرد اکول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔ نہ ایک جگہ بلکہ کبھی اس کیاری میں کبھی اُس روش پر کبھی اس درخت کے تلے کبھی اس دیوار کی جڑ میں قصہ مختصر غائت خرم وحیا سے دو چار گھڑی رات رہے دیوار سے کود کر چلا گیا۔ صبح کو جب سب جاگے اُس کو ادھر اُدھر ڈھونڈا کہیں نہ پایا۔ مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا۔ ایں شمارا چہ افتادہ است کہ میگوئید فلانے در باغ نیست مے بینم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جا نشستہ است "

چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں۔

" جلالائے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا۔ عبارت اس وقت یاد نہیں سی مگر یہ مضمون اوس کا ہے کہ ایک دن مولانا عرفی علیہ الرحمۃ اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ ہم نے تحقیق کو بہ سرحد افراط پہونچا دیا۔ اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔ عرفی نے کہا کہ اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گھر کے بڈھوں اور بڑھیوں سے جو بات سنی فارسی ہیں سُنی۔ شیخ گفت ما فارسی از انوری و خاقانی فرا گرفتہ ایم۔ شما از پیر زالاں آموختہ آید۔ عرفی فرمود انوری و خاقانی از پیر زالاں آموختہ باشند "

خواجہ غلام غوث بیخبر کو ایک لطیفہ سناتے ہیں۔

" حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغاں لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے ؎

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں　　قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائی نہیں

مرزا اپنے خلوص ومحبت کے جوش میں کہیں کہیں اپنے احباب کی مدح بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں مبالغہ بالکل نہیں ہوتا انھیں مدح سے اپنے ممدوح کو وہ حقیقی مسرت پہونچانی مقصود ہوتی ہے جس سے دل کو خوشی اور روح کو بالیدگی نصیب ہو۔ وہ کسی ممدوح کے شرمندۂ احسان ہوکر اس کی مدح نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں حقیقتاً وہی انکی بے لاگ رائے ہوتی ہے۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

" صاحب تم تو اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں۔ تمھارا خط کل شام کو آیا آج جواب لکھا گیا "

دیکھئے مدح ہے۔ مگر اس طرح کی مدح کہ مدح کا شائبہ بھی نہیں بات یہ ہوگی کہ تفتہ کے خط میں لکھا ہوگا۔ کہ آپ میرے عریضہ کے منتظر ہوں گے۔ جس کا جواب مرزا صاحب نے یہ دیا۔

مرزا تفتہ کو نواب یوسف علی خاں کی مدح میں چند کلمات لکھتے ہیں۔ اور کیا خوب لکھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً نواب موصوف مرزا کی ممدوح اور محسن تھے۔ مگر اُن کا انداز خاص کہاں جائے۔ لکھتے ہیں۔

"نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور بہ اعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اُس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی"

چودھری عبدالغفور سرور ایام غدر میں دہلی آرہے تھے۔ چونکہ نہایت ہی آشوب ناک زمانہ تھا۔ اس لئے اُن کے چچا نے اُن کو دلی جانے سے روکا۔ انھوں نے یہ حال مرزا صاحب کو تحریر کیا۔ مرزا نے جواب میں اُن کے چچا کی تعریف کی۔ اور اُن کی ذہانت کی ان الفاظ میں داد دی۔

"آپ کے خواب کا ماجرا۔ اور صبح کو ادھر کا قصد۔ اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تا بلستان پر اس عزم کا ملتوی رکھنا۔ معلوم ہوا۔ آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی جو آپ کو منع کیا۔ سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اور اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجئے گا"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"صاحب دو خط تمھارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے داڑھی منڈے بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے تمھارا خط دیا"

بات یہ تھی کہ مجروح مرزا کے بے تکلف منہ لگے گستاخ شاگرد تھے اس قسم کا مذاق اُن سے ہوتا تھا۔ میرن صاحب پر ڈھال ڈھال کر ایسے فقرے اکثر اُن کو سنایا کرتے تھے انھیں کے ہنسانے کے لئے نامہ بر کا حلیہ درج کر دیا۔ اور ضمناً اس مدح سے مجروح کو بھی خوش کر دیا۔ اسی طرح مرزا حاتم علی مہر نے مرزا صاحب کی فرمائش کی بموجب بعض طلائی کام جلدیں تیار کرائیں تو مرزا نے شکریہ میں یہ مدحیہ فقرے لکھے۔

"بھائی صاحب آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوح طلائی کا آوازہ یہاں تک پہونچایا بلکہ مجلد ان کی لوحوں کا خط طلائی مانند شعاع آفتاب نظر آیا۔ کیا پوچھنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ مجکو تو بموجب اس مصرع کے خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ دل میں خوش ہو کر چپ رہنا ہے۔ حضرت مدح کو ایک موقع ضرور ہے مجھ کو آپ کے حکم کا بجالانا منظور ہے۔ اس نذر کے پہنچنے کے بعد جب کوئی ان کا عنایت نامہ آئیگا۔ تو بندۂ درگاہ مدح گستری کا جوہر دکھائے گا۔ وس نظم میں آپ کا ذکر خیر بھی آجائے گا"

بجائے اس کے کہ مدح کرتے مدح کا وعدہ کر کے اک قسم کی مدح کر دی۔ اور پھر کچھ نہیں خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد یہ خط ہے یا کرامت ہے صاف صفائی ضمیر و کشف حجت کی علامت ہے۔ مدعائے ضروری التحریر اور نشان مسکن دامنگیر اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیونکر لکھا جاتا۔ سبحان اللہ یہاں جس دن مجھ کو وہ مطلب خطیر در پیش آیا ہے اُسی دن آپ نے وہاں خط لکھنے کو قلم اٹھایا ہے۔ آپ کو عارف کامل کیونکر نہ کہوں اور کیا کہوں ولی اگر نہ کہوں مدعا بیان کرتا ہوں مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط نہ پہنچ پائیگا کہ وہ راز سربستہ آپ پر کھل جائے گا"

ایک روز منشی نول کشور صاحب مرزا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نواب نے شہاب الدین خاں کو مخاطب کر کے منشی جی کی ان الفاظ میں تعریف کی

"اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا وظیفہ دار ہوں ساڑھے باسٹھ روپیہ یعنے ۷۵۰ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال امیور سے اور چوبیس روپیہ سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینہ میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں قیمت نہیں لیتے۔ ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہونچا دیا کرتا ہوں"

ملا نور الدین ظہوری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی اُس کا اسم نور الدین اور تخلص ظہوری تھا"

منشی ممتاز علی خاں کو لکھتے ہیں اور چودھری عبدالغفور کو مخاطب کرتے ہیں

"اہاہا جناب منشی ممتاز علی خانصاحب مارہرہ پہونچے صاحب یہ تو سیاح گیتی نوردثانی مخدوم جہانیاں جہانگرد ہیں"

لوگوں نے شعر میں محاکات پر ناز کیا ہے اور حقیقتاً شعر میں اگر مکمل طریقہ سے محاکات ہو تو اس کو بہترین شعر کہیں گے۔ مگر مرزا نے اسی فن میں نثر میں وہ وہ کمال دکھایا ہے کہ دیکھ کر بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے میر مہدی مجروح کو خط لکھ رہے ہیں اور اپنی تصویر کھینچ کر دکھاتے ہیں۔

"میری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا باتیں کر لیں"

میر مہدی ایام غدر میں وطن مالوف کو چھوڑ چھاڑ کر پانی پت انصاریوں کے محلے میں جا رہے تھے۔ مگر محبت وطن دل سے جاتی کہاں۔ آتے جاتے سے احباب سے دوستوں سے اپنوں سے بیگانوں سے ہر وقت پوچھتے رہتے۔ کیوں بھئی کہو

اب دلی کا کیا حال ہے مرزا کو بھی جب خط لکھتے اکثر باتوں باتوں میں اُس اُجڑے دیار کی کیفیت پوچھ ضرور لیتے تھے۔ مرزا بھی جواب دیتے رہتے۔ ایک مرتبہ لکھتے ہیں اور اُجڑی ہوئی دلی کے پھر بسنے کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

"جویائے حال دہلی سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی طرف کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش مولوی صدر الدین فضل حسین خاں تین برسات اور ۷ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کوزی انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

دھوپ میں بیٹھا ہوں یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا۔ اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے اوس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منھ دھوؤں گا ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا کیا صحبت ہوگی"

میر مہدی نے شاید محرم میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر آشوبناک زمانہ تھا۔ کچھ طبیعت بھی لاابالی سی تھی آنہ سکے۔ مرزا نے پہلے انتظار کیا انتظار سے کام نہ چلا تو خط میں شکایت لکھی۔

"محرم تمام ہوا آج سہ شنبہ غرہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہر ابرسات نے آنے نہ دیا۔ برسات کا نام آگیا۔ سو پہلے تو مجملاً سنو ایک آشوب غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کی ایک آفت وبا کی ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جیسے بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکانات گر گئے سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ منھ نہ برسا آناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے"

برسات کا حال دوبارہ میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے۔ جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ....

ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشے خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔"

حکیم غلام نجف خاں کو سردی کا حال لکھتے ہیں۔ اور کچھ حال بیان فرماتے ہیں

"جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ تونگر عزیز سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بند و بست جدید نے مار اعرق نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مرزا حاتم علی مہر کو مخاطب کر کے ان کے نقشے کے ساتھ اپنی تصویر کھینچتے ہیں اور دو ہوا یہ حسن ایک صفحۂ کاغذ پر اس طرح دکھا دیتے ہیں

"بھائی تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی۔ اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا۔ تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھکو دکھائے۔ بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں۔　　تا دسترسم بود زدم چاک گریباں　　شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اوسی دن سر منڈایا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں۔"

برسات کی شدت کا حال ایک دو جگہ آپ دیکھ چکے ہیں اب اُسی مصیبت کو نواب علاء الدین خاں سے یوں بیان کرتے ہیں۔

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں تمہاری پھوپی کہتی ہیں ہائے دبی۔ ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے......

اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھکو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان پایان عمر میں اور بھی سہی۔،،

لوگ اس پھیر میں پڑے ہوئے ہیں کہ مرزا سنی تھے یا شیعہ۔ ایک فریق کہتا ہے وہ یقینی اہل تسنن میں سے تھے۔ دوسرا کہتا ہے وہ اثنا عشری تھے کیونکہ ان کا یہ شعر صاف بتاتا ہے

منصور فرقۂ علی اللہیاں منم　　آوازۂ انا اسد اللہ برافگنم

تیسرا گروہ تفضلیہ بتا کر ہنگامہ برپا کرتا ہے۔ مگر میں ان کا یہ شعر پڑھتا ہوں

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور　　میں اور یار اور مرا کاروبار اور

میں خیال کرتا ہوں کہ مختلف اوقات میں اُن کی طبیعت میں مختلف جذبات جوش زن ہوتے ہیں اور ان میں مذہب کا خیال بھی آتا ہے۔ شیعہ سنی کے جھگڑے سے تو وہ خیال بالاتر ہوتا ہے۔ مگر حلقۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ایک تعزیت کے خط میں نصیحت کرتے اور اس کے بعد لکھتے ہیں

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے۔ اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور۔ وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زن نو کن اے دوست در ہر بہار　　کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار،،

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو نصیحت کرتے ہوئے کچھ اپنا بھی حال لکھتے ہیں

"خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے سنتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر مطلق ہو گیا موافق عقیدۂ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو۔ اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ ان مع العسر یسرا کو اپنا نصب العین رکھو۔،،

ایک جگہ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔ اور اپنے عقاید بیان کرتے ہوئے یہ فقرے بھی لکھتے ہیں

"اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو

میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا کہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اوس میں جلیں۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اور اپنی روزہ داری کا ثبوت دیتے ہیں

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

آخر عمر میں امراض و آلام کی کثرت۔ عوارض کے ہجوم نے مرزا کی زندگی کو بے لطف کر کے زندہ در گور کرد[یا]
آخر میں اُن کی دلچسپی کا مشغلہ اگر کوئی تھا تو یہی تھا کہ احباب کے خطوط اطراف و جوانب سے آجائیں۔ وہ پڑے پڑے [پڑھ]
لیں۔ اور کوئی آجائے تو اُس کا جواب لکھوا دیں۔ مگر یہ حالت صرف چند روز رہی۔ جب تک کہ وہ بالکل مجبور نہ ہو گ[ئے]
اس وقت تک اس خوشگوار فرض کو وہ خود ہی انجام دیتے رہے۔ اُن کے امراض مزمن ہی بڑھتے بڑھتے امراض شدی[د کی]
صورت اختیار کر گئے پہلے یہ حالت رہی کہ دو برس کو اچھے برس دن کو صاحب فراش۔ پھر ایک طرف حالت ب[گڑتی]
رہی ایک طرف کم ہوتی رہی تا اینکہ یہ کہنے کا وقت آگیا کہ

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

انھیں امراض کے حالات بیماری کے واقعات کو وہ اپنے احباب سے بیان کرتے ہیں۔ مگر اُن کی وہ خونناب[ہ]
دوسروں کے لئے رنگیں نوائی بنجاتی ہے۔ مرزا نے طرح طرح سے امراض و آلام کا بیان کیا ہے اپنی حالت سے ا[حباب]
کو باخبر کیا ہے مگر ایک جگہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ پڑھنے والا اُسے پڑھ کر متاثر نہ ہو۔ یا ایک جگہ بھی اس کو لطف نہ آیا ہو
نواب میر غلام بابا خاں نے کسی جشن مسرت میں بلایا تو مرزا نے اس طرح امراض و اسقام کا بیان کر کے عذر خواہی [کی]
اور ... نواب صاحب کو خوش کر دیا فرماتے ہیں

"رقعہ گلگوں نے بہار کی سیر دکھائی۔ بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج
کانوں سے بہرا ضعف بصارت۔ ضعف دماغ۔ ضعف دل۔ سب ضعفوں پر ضعف طالع کیونکر قصد
سفر کروں۔ جسم میں حالت جان میں جان نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیز امکان میں نہیں"

انھیں کو ایک جگہ مصائب امراض کا حال لکھتے ہوئے سنتے ہیں۔

"ایک اور نئی مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۱۲ھ کی میری ولادت ہے۔ اب کہ رجب کے مہینے سے سترواں سا[ل]

شروع ہوگا۔ ستّر ابہتر ا بہرا بوڑھا اپاہج آدمی ہوں۔"

میاں دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں۔

" ناتوانی زور پر ہے بڑھاپے نے۔ نکما کردیا ہے۔ ضعف سستی کاہلی گرانجانی گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔"

ایسے ہی خیالات کا نظم میں بھی اعادہ کیا ہے ؎

ضعف نے غالب نکما کردیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دوسری جگہ میاں دادخاں سیاح کو یوں لکھتے ہیں اور ضعف بینائی کو عجب لطف سے تحریر فرماتے ہیں۔

" اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار اصلاحوں کے لئے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا اپاہج پورا بہرا۔ آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔"

یہی حال منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں۔ اور اس پر دوسرے الفاظ کا رنگ دیتے ہیں۔

" میرے محب۔ میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں"

دوسری جگہ انھیں سے کہتے ہیں۔

" غذا بالکل مفقود۔ اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"

مرزا تفتہ کو حال سناتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

" گمان زیست بود بر منت ز بیدردی بداست مرگ و لے بدتر از گمان تو نیست

سامعہ مرگیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی"

ایک جگہ انھیں سے خط لکھنے کا حال کہتے ہیں کہ

" اتنی سطریں مجھ سے بہزار جرِ ثقیل لکھی گئی ہیں"

دوسری جگہ

" میرا حال بدستور ہے ؎ ہماں بستر ہماں پہلو ہماں درد"

ایک جگہ انھیں کو کھانے کا حال لکھتے ہیں

" دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا

پیتا۔ اور آلو بخارے کا افشردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے۔ اور صورت زیست کی نظر آئی ہے"

دوسری جگہ۔

"میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اس سے زیادہ میرا حال مجھکو بھی معلوم نہیں"

"میرا حال اب اس فن میں یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے کلام ہندی میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

چودھری عبد الغفور سے آلام زمانہ کا یوں حال بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے کہیں کہا تھا کہ بوستان خیال دیکھا کیجئے انھوں نے جواب دیا۔

"حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت سچ تو یوں ہے ۔ کہ غمہائے روزگار نے مجھکو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی روتا رہوں گا۔ دوسرے یہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغرے وکبرے دلنشین ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے"

میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔

"اب تھوڑے دنوں تک شاید میں خط نہ لکھ سکوں تفصیل اُس کی یہ کہ رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔ پھنسی پھوڑا ہو گئی۔ پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔ زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مُردار ہو گیا"

میر مہدی مجروح کو ایک جگہ بیماری کی یوں خبر دیتے ہیں اور آخر میں ایک دلچسپ پیشین گوئی کرتے ہیں

"جان غالب اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا۔ کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ اب اچھا ہوں تندرست ہوں ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے"

قاضی عبدالحمید کو حال لکھتے ہیں

"میں نہ تندرست ہوں نہ رنجور۔ زندہ بدستور ہوں۔ دیکھئے کب بلاتے ہیں اور جب تک جیتا ہوں کیا دکھاتے ہیں"

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں

"قبلہ پیری و صد عیب۔ ساتویں دہائی کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا اب دائمی ہو گیا ہے مہینہ بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی منشا حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ ہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا کتنا پانی پی جاتا ہوں"

نواب سعد الدولہ شفق کو لکھتے ہیں

"سال گذشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا ۱۲-۱۲ مہینے صاحب فراش رہا۔ اوٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا۔ نہ تپ۔ نہ کھانسی نہ اسہال۔ نہ فالج۔ نہ لقوہ ان سب سے بدتر ایک صورت پر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک ۱۲ پھوڑے ہر پھوڑا ایک زخم۔ ہر زخم ایک غار، سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گذرے پھر تخفیف ہونے لگی لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی، اب اگرچہ تندرست ہوں۔ مگر ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کی تحریر کی تقریر۔ اور مثلہ میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ درصورت مرگ نیم مردہ و در حالت حیات نیم زندہ ہوں"

یوسف مرزا کو اپنے حالات سے مطلع کرتے ہیں

"فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا۔ ضعف قویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا وہ عرق جو بقدر طاقت بنا رکھا تھا اب میسر نہیں"

نواب علاء الدین احمد خاں کو حال لکھتے ہیں

"علی حسین خاں آئے دو تین بار مجھ سے مل گئے اب نہ وہ آسکتے ہیں نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمناں وہ لنگڑے۔ میں لولا"، آغاز فتق مزید علیہ۔ یا مستزاد"

مرزا کی مسرت بھی اور ہی طرح کی ہے۔ جس میں واقعیت کی بہ نسبت ہنسی اور مذاق کا پہلو زیادہ ہے اول تو ان کے ہر خط کا منشا رہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ہنسائیں۔ آلام کے بیان میں بھی وہ اس کا خیال رکھتے ہیں پھر بھلا مسرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

شاہزادہ بشیرالدین کو اپنی تصویر کھینچی۔ شاید اس کی رسید آئی تو آپ نے جواب میں لکھا

"عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا۔ اور کیونکر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھینچوا کر بصورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا"

تفتہ سے اپنی خوشی اور فائز المرامی کا حال بیان کرتے ہیں

"بھائی جس دن تم کو خط بھیجا۔ تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور ۵۰ کی رسید اور ۵۰ کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے بابو صاحب نے ۵۰ ہردیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لئے۔ بہرحال ہنڈوی ۱۲ دن کی میعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے ۶ دن باقی تھے مجھ کو صبر کہاں میتی کاٹ کر روپے لے لئے قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس معلوم نقد بکس ہیں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں الحمد للہ علی احسانہ"

میر مہدی سے اپنی خوشی اور مسرت کا حال بیان کرتے ہیں۔

"مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب "امیر حمزہ" کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد "بوستان خیال" کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں

کسے کہ بہرہ ادش میسر بود اگر جم نباشد سکندر بود

جس طرح مرزا دوسروں کو مختلف ناموں مختلف القابوں سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مخاطب و مکتوب الیہ کو اپنے بھی طرح طرح کے نام بتاتے ہیں۔

میاں دادخان کو ایک جگہ غالب علی شاہ لکھا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں

"نام میرا جس طرح چاہو لکھو وسے بنام آنکہ آں نامے ندارد بہر نامے کہ خواہی سر برآرد۔"

مکتوب الیہ کے نام میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

"از غالب جان و جاناں وار جان و جاناں عزیز تر حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالے۔"

نواب مرزا علاء الدین احمد خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں

"تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب لکھ لیا ہے"

ایک جگہ لکھتے ہیں

"کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے"

ایک جگہ بابو ہر گوبند سہائے کو ولایتی شراب کی فرمائش کے بعد "غالب جاں بلب" لکھتے ہیں۔
ایک جگہ نواب مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں

"بوڑھا ناتوان مفلس قرضدار۔ کانوں کا بہرا قسمت کا بے بہرا زیست سے بیزار مرگ کا امیدوار غالب"

مرزا کبھی کبھی ناصح مشفق بنکر اپنے دوست احباب کو نصیحتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جو تلخ ہوتی ہیں ــــ مرزا تفتہ کو شعر و شاعری کے ساتھ وہ شغف تھا کہ سب کام دھندے چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور رات دن بس اسی فکر میں مستغرق رہتے تھے۔ گھر کا اندوختہ سب اٹھا چکے تھے۔ نہ کہیں آنا تھا نہ جانا۔ شعر و سخن یا اُستاد کی خدمت بس یہی دو چیزیں ان کی دلچسپی کی تھیں۔ اور بس۔ اسی بارہ میں مرزا اُن کو ایک جگہ لکھتے ہیں

"بس اب تم سکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے۔ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے۔ نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک خرخچ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبت جاہ چہ ونفرت اسباب کدام زیں ہوسہا بگزر یا مگزر ے گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مُردہ ہوں نہ زندہ جئے جاتا ہوں۔ باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے"

دوسری جگہ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ اور دنیا کی بے مائگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔

"اچھی گزری ہے اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصاید کی شہرت سے عرفی کے کیا ہاتھ آیا جو میرے قصاید کے اشتہار سے مجھکو نفع ہوگا۔ سعدی نے بوستاں سے کیا پھل پایا۔ جو تم سنبلستاں سے پاؤ گے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخنور ہے نہ قصیدہ ہے نہ قصدہ"

تفتہ پر ایک زمانہ میں ایسا اثر پڑا کہ قصد مصمم کر لیا کہ اب لباس نہ پہنوں گا۔ مرزا کو بھی یہ ارادہ معلوم ہوا فوراً نصیحت آمیز

جلے لکھے - اور ایسے جلے لکھے جیسے کسی روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے کوئی شخص بلا ارادہ استعمال کرتا ہے کہتے ہیں

" کیوں ترک لباس کرتے ہو پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا - جس کو اُتار کر پھینکو گے - ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی بغیر کھائے پیئے گزارا نہو گا - سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار کر دو "

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی معشوقہ مر گئی جس کی وجہ سے اون کو بڑا سخت صدمہ پہنچا مرزا کو خبر ہوئی - بہت خفا ہو کر دوستانہ نصیحت پر اتر آئے -

" مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی - ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں - ہم مانع فسق و فجور نہیں - پیو کھاؤ - مزے اوڑاؤ - مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو - سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے - کیسی اشک فشانی - کہاں کی مرثیہ خوانی - آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی ----- میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا - اور ایک حور ملی - اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے - اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے - ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی - طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی - وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبےٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ - کہیں اور دل لگاؤ ؎

دن نو کن اید دوست در ہر بہار   کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

اور ایک جگہ انھیں کو اسی قسم کی نصیحت فرماتے ہیں -

" پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے - پس اگر کسی بیدرد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجایش ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں در خور افزایش ہے بقول غالب علیہ الرحمۃ ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو   نہ جب دل ہی پہلو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

اور اگر خدا نخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو - ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو "

نواب انور الدولہ شفق کا کوئی نقصان ہوا - مرزا کو خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا - فوراً ایک دلچسپ نصیحت نامہ تحریر فرمایا -

" روپیہ کا نقصان اگرچہ جانکاہ و جانگزا ہے - پر بموجب تلف المال خلف العمر غم فزا ہے - جو روپیہ ہاتھ سے گیا ہے اوس کو عمر کی قیمت جانئے - اور ثبات ذات و بقائے عرض ناموس کو غنیمت جانئے " -

ذوالفقارالدین حیدر کو ایک نصیحت کی نقل کس مزے سے سناتے ہیں:

" تمہارا قرضخواہ آیا تھا تمہارا حال پوچھتا تھا کچھ سچ کچھ جھوٹ کہکر اوس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپیہ تم کو بھیجدے۔ بنیوں کی طرح کی تقریر اوس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ تو اُس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کھیت ہیں پانی دو تو اناج پیدا ہو "

نواب مرزا علاءالدین احمد خاں کو کسی بارے خاص میں لکھتے ہیں۔

" اس امر فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بیجا صلحت ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر کوئی اور کہے مانع نہ آؤ۔ نہ اشتہار نہ استتار "

واقعات کے بیان میں مرزا کو وہ یدطولےٰ حاصل ہے۔ کہ بڑے بڑے مورخ اور اچھے اچھے داستان گویوں کو شرماد یتے ہیں۔ کوئی واقعہ ہو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا نقش حیرت اور محوسکوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اکثر واقعات میں محاکات کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اکثر کو سادہ چھوڑتے ہیں۔ اکثر میں اپنی طبیعت کے جوہر خاص یعنی ظرافت کو بھر دیتے ہیں۔ اکثر میں درد و اثر پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ خصوصیت کسی خاص بیان میں نہیں ہوتی بلکہ اون کی بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کا ماتم ہو۔ یا غدر کی پریشانی کا افسانہ ہو۔ شور انگیزی۔ جوانی کی حکایت ہو۔ دوست کا شکریہ ہو یا دشمن کی شکایت ہو۔ تندرستی کا بیان بیماری کا حال۔ سب کا ایک رنگ ہے

منشی سیف الحق میاں داد خاں سیاح نے اپنی غزلوں کا تقاضا لکھا۔ مرزا نے اپنے واقعات بیان کرنا شروع کردئے۔

" بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ میں اب خط نہیں لکھ سکتا آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا جب یہ حال ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیونکر دوں۔ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اُس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اُس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں "

تفتہ کو غدر کے بعد کے واقعات اور اپنے حالات سناتے ہیں۔

" حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبایل اُن مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں سو

تو بیکسی و غریبی ترا کرے پرسد　　نہ جزا نہ سزا نہ نفرین نہ آفرین۔ نہ عدل نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر

نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم یہ لکھ بھیجو کہ تم نے میری خبر کیا سنی۔ مجھے اس کے معلوم ہونے سے مزہ ملے گا "

۱۸۶۲ء میں برسات نہایت ہی شدت سے ہوئی تھی گلی کوچے ندی نہریں بنگئے تھے۔ جب وہ موسم گزر گیا تو تفتہ کو اطلاع دیتے ہیں کہ

" برسات کی مصیبت گزر گئی۔ لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی "

ہنگامۂ غدر کا حال لکھتے ہیں

" ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں یا حافظ یا حفیظ ورد زبان ہے "

چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں۔

" یہاں شہر ڈھہ رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار۔ خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر باجرہ بارہ سیر گیہوں ۱۳ سیر چنے سولہ سیر گھی ڈیڑھ سیر ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینہ جسے جاڑے کا دوا کہتے ہیں۔ پانی گرم۔ دھوپ تیز۔ روز لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے "

" یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے یہ خلاف واقعہ کسی نے آپ سے کہا ہے۔ میں معہ زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا۔ نہ نکالا گیا۔ نہ قید ہوا نہ مارا گیا "

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

" شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ یوں تو ٹوٹی کوئی چیز ہے۔ وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں۔ حویلیاں۔ ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی رہے نام اللہ کا "

میر مہدی کو اپنے حالات لکھتے ہیں۔

" میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے۔ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے۔ اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر میں بھائی ایسے انداز سے چلا کہ چاندرات کے دن یہاں آ پہونچا۔ یکشنبہ کو

غرض ماہ مقدس ہوا۔ ادھی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتی ہے۔ تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں واہ واہ کیا اچھی عمر بسر ہوتی ہے "

غدر کے بعد دلی میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ میر مہدی نے پوچھا کہ کیا حال ہے مرزا نے جواب میں کہا۔

" وبا کو کیا پوچھتے ہو قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے "

غدر کی لوٹ مار اور گیر و دار سے اکثر قدیمی خاندان بھی دلی چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے۔ انھیں میں حکیم غلام نجف خاں تھے کہ اپنے وطن مالوف میں جا رہے تھے۔ مگر دلی اور دلی کے حالات سے غافل نہ تھے برابر احباب سے دریافت حال کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مرزا سے حالات دریافت کئے تو انھوں نے جواب دیا

" میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں کسی محکمہ میں ابھی تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے "

مرزا نے اپنی بیوی کے بھانجے اور اپنے عزیز نسبتی اور شاگرد جوانمرگ عارف مرحوم کے دونوں بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اسی کے متعلق حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

" خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے یہ قید جاودانی ہے "

" میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچے گا۔ اس سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں۔ بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو "

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

" تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا۔ کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ اب ان کو خیال ہوگا۔ کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لئے جاؤ اور حرف بحرف پڑھ کو سناؤ۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں۔ کبوتر

بخیر ہیں۔ بغل، کنگھا، اسپ، سامان درست ہے "

مرزا حاتم علی بیگ مہر صاحب کو اپنے حالات موجودہ تحریر فرماتے ہیں۔

" اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ دو سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے "

مرزا رام پور کا سفر کر رہے ہیں دونوں صاحبزادے ساتھ ہیں۔ اس سفر کے دلچسپ حالات ہیں سے کچھ فقرے سنئے جو نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو مع برخورداران ایک قافلہ سمجھتے ہیں۔

" قصد یہ تھا کہ پلکھوے۱؎ رہوں۔ وہاں قافلہ کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دئے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ پہر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اُس میں ڈال دئے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی لی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں "

نواب انوار الدولہ سعد الدین شفق کو حال لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

" پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اُس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اُس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا اُس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اُس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی "

علائی کو لکھتے ہیں

" کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں "

۱؎ ضلع میرٹھ میں ایک قصبہ کا نام ہے جو اس سڑک پر پڑتا ہے جو دلی سے الہ آباد جاتی ہے

"منہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھکو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ دریا دالان تھا۔ جب تمھارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محلسرا بنایا تھا۔ کہ گاڑی ڈولی۔ لونڈی۔ اصیل۔ کا چھن تیلن تنبولن کہاری پسنہاری ان فرقوں کا مردہ دروازہ رہے گا۔ میرے اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوانخانہ سے رہیگی۔ عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانے میں سے آئیں جائیں اپنے بیگانے کو ہر وقت چلیا پایا نظر آئیں۔ بی وفادار جنکو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمھاری پھپی نے انھیں وفادار بیگ بنادیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو کیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں جب وہ محل سے نکلیں گی۔ ممکن نہیں کہ اطراف محل کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لیجا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں۔ کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کمائی کے ہیں۔ شہر میں تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔ ہے ہے ایسے عالیشان دیوانخانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت "

اگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا صاحب کو ہجو سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا سودا کو کسی کی خالص تعریف سے مگر ضرورت کے لئے جیسے سودا نے بجا مختلف اصناف سخن میں تعریف و توصیف کرتے ہیں ایسے ہی مرزا رمز و کنایہ یا باتوں باتوں میں ہجو کر جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی بڑا فرق ہے۔ سودا کا مقصود یہ ہوتا ہے۔ اُس کی فضیحت کی جائے اس کی بوٹیاں نوچ کر چیل کوؤں کو کھلا دی جائیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دل سے اس قسم کی باتوں کا اثر لیتے ہیں اور دل ہی پر اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مرزا اس سے کوسوں دور ہیں۔ اول تو ہجو اُن کا شیوہ ہی نہیں اور اگر کہیں ضرورت پڑتی ہے تو اس میں سب سے پہلے اون کا خیال یہی ہوتا ہے کہ سننے والا برا نہ مانے لیکن یہ ضرور ہے کہ دلی کے رہنے والے ہیں۔ کہتے کہتے کہیں بڑھ جاتے ہیں تو زبان چٹخارے دو بھر ہو جاتی ہے۔ پھکڑ تک کی خبر لاتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وہ اس قسم کی گفتگو کے عادی ہیں یا ان کو کسی کی دل آزاری منظور ہوتی ہے۔ یا وہ ذاتیات پر حملے کرتے ہیں بعض فقرے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

ایک شخص مسمی عظیم الدین خاں نے مرزا سے ان کا دیوان چھپوانے کے لئے لیا۔ اور اس میں لیت و لعل شروع کی۔ نہ دیوان چھپوایا نہ واپس بھیجا۔ مرزا سے میاں دادخاں سیاح نے پوچھا کہ کیسے دیوان چھپا یا نہیں تو مرزا نے جواب دیا۔

" دیوان کا چھاپا کیا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس سے تب مجھ سے دیوان منگا بھیجا۔ آدمی نہیں ہے بھوت ہے پلید ہے۔ اور غول ہے قصہ مختصر سخت نامعقول ہے "

مرزا نے برہان قاطع کے رد میں جب قاطع برہان لکھی تو چاروں طرف سے اعتراضات کی بھرمار ہوئی۔ مخالفت کا طوفان امنڈ آیا۔ بہت سے لوگوں نے جواب لکھے۔ منجملہ اُن کے حافظ رحیم بیگ ساکن سردھنہ نے بھی ساطع برہان اُس کے جواب میں لکھی۔ شائع ہوئی تو میاں داد خاں سیاح کو بھی معلوم ہوا انھوں نے مرزا صاحب کو لکھا۔ مرزا نے جواب دیا۔

" وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اوس کا نام میرٹھ کا رہنے والا۔ کئی برس سے اندھا ہو گیا۔ باوجود نابینائی احمق بھی ہے"

اسی کتاب کے متعلق سیاح کو لکھتے ہیں۔

" طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اوس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبد الکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے "

مرزا دلی کی کتابت اور وہاں کے چھاپے خانے سے بہت ناراض اور کشیدہ خاطر تھے اور جا بجا اس کی مذمت کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" دیوان اُردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اوس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے "

قاضی عبد الجمیل صاحب کو لکھتے ہیں اور مطلع کرتے ہیں کہ اکثر لوگ بیکار غزل کے مقطع میں میرا نام ڈال دیتے ہیں۔

" سنئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل لوگ میرے نام پر پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں میں ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجئے سہ

اسد اور لینے کے دینے پڑے

میں نے کہا لاحول ولا قوۃ اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانہ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا سہ

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سنکر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اس کے رحمت خدا کی۔ اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت "

مرزا کسی ایسے مکان میں رہتے تھے جو حکیم غلام نجف خاں کو پسند نہ تھا اسی وجہ سے وہ مرزا سے برابر خواہش کرتے

رہتے تھے کہ یہ مکان چھوڑ دیجئے۔ ایک مرتبہ یوں مذاق کیا۔

"حضرت عذر کی جگہ ہے ایک مکان دلکشا۔ کوچہ کی سیر۔ بازار کا تماشا۔ دو کمرے۔ دو کوٹھریاں آگے دالان صحن دسیع کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے۔ دروازے پر وہ تاریکی کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے۔ اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع۔ گوہ کے ڈھیر۔ کہیں حلال خور کا بچہ ہگ رہا ہے کہیں بیل بندھا ہوا ہے کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ۔ خدا نہ لیجائے ایسے مکان میں"

نواب انور الدولہ شفق کو۔ ملا غیاث الدین رام پوری اور اُن کی تصنیف کی بابت لکھتے ہیں

"غیاث اللغات ایک نام موقر ومعزز جیسے الغر بہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا۔ فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف ونحو میں ناتمام ہانشائے خلیفہ اور منشآت مادہو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادہو رام۔ و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے شعر کہتے تھے"

اور ایک جگہ نواب انور الدولہ کو دلی کی ہجو میں لکھتے ہیں

"ایک قاعدہ کلیہ دلی کا سمجھ لو۔ خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہوا مرد یا عورت خفقان و مراق اس کی فطرت میں ہو۔ آٹھ دس برس سے بعد ساون کے اخیر مینہ خوب برسا۔ لیکن نہ دریا جاری ہوئے۔ نہ طوفان آیا۔ ہاں شہر کے باہر ایک دن بجلی گری۔ دو ایک آدمی۔ کچھ جانور تلف ہوئے مکان گرے۔ دس بیس آدمی دبکر مرے۔ دو تین شخص کوٹھے پر سے گر کر مرے۔ مراقیوں نے غل مچانا شروع کیا۔ اپنے اپنے عزیزان بسفر رفتہ کو لکھا۔ جابجا اخبار نویسوں نے اون سے سنکر درج اخبار کیا۔ نواب دس بارہ دن سے مینہ کا نام نہیں۔ دہوپ آگ سے زیادہ تر تیز ہے۔ وہی خفقانی صاحب روتے پھرتے ہیں کہ کھیتیاں جلی جاتی ہیں"

نواب علاء الدین خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں

"تمسخر سمجھیے یا ہجو۔ یا دلی میں رہنے کا اثر۔ سنتا ہوں کہ عمرو خاں کو ان دنوں علت مشائخ کا زور ہے اور سعدی کی اس بات پر عمل کرتے ہیں ؎

کسانے کہ یزداں پرستی کنند　　برآواز دولاب مستی کنند

خدا مبارک کرے"

مرزا نے نواب علاء الدین احمد خاں کا تخلص نسیمی تجویز کیا۔ وہ نواب نازک مزاج تو تھے ہی اوس کی تصحیف کا وہم

کر کے بدگمان ہوئے کہ ایسا نہو نسیمی کو کوئی لیشمی پڑھے۔ مرزا کو لکھا مرزا نے اول اول میں تو نہایت ٹھنڈے دل سے نصیحت کی آخر بڑھے اور بڑھتے ہی اس حد پر پہونچ گئے کہ آپ پھر اس خطاسے اندازہ کریں گے لکھتے ہیں

" میری جان تمہارا تخلص بہت پاکیزہ اور میری پسند ہے۔ نسیمی کو بہ تکلف اوس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بتقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وسواس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا تخلص ہے۔ رہرو اس کی تجنیس موجود ہے۔ شیون ایک اچھا تخلص ہے سقون اُس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بہ مناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں نامی سامی یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ تمہارے واسطے خاص فخری تخلص بہتر ہے۔ کہوگے کہ آزادپور کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے۔ "

ایک جگہ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

" آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور میاں شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھدیا ہے ...... مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور اُن کے ہوا خواہوں کی رائے میں قصد اس استعلاج کا مذبذب ہے نسخہ کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں استاد میر جان بھی تھے نیم نامعقول مرزا اسد بیگ تھے۔ "

ایک جگہ لکھتے ہیں اور عجیب طریقہ سے اہل زمانہ کی ہجو کرتے ہیں

" پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے

پلادے اوک سے ساقی جو ہمسے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے　　اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اُسنے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا عجب الخ "

نواب علاء الدین خاں کے معرفت حمزہ خاں کے کسی طنز کا جواب دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

" حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا۔ کہ اے خبر ز لذت شرب مدام ما۔ دیکھا ہم کو یوں جلاتے ہیں بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے مارنا اور

ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ ...... تم نے کسی خاتون میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے ؎

چوں پیر شدی حافظا از میکدہ بیروں شو   رندی و خراباتی در عہد شباب اولٰے

اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اوس کی نظم کا دفتر حافظ سے دو چند سہ چند ہے۔ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔"

دیکھئے تعریض کے جواب میں تعریض اور جواب الزامی اسی کا نام ہے۔ سب کچھ کہہ گئے۔ سب کچھ اعتراض کر گئے اور پھر کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کوئی واعظ جلال کے ساتھ منبر پہ وعظ کہہ رہا ہے کبھی کبھی ہنسی کی بات آتی ہے تو ہنس بھی دیتا ہے۔

—— نواب امین الدین احمد خاں کچھ بیمار ہوئے۔ دوران علاج میں کہیں کسی مولوی .... نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سحر کیا ہے۔ نوابی دربار امیرانہ کاروبار۔ اسے بیچے سب کو یہی خیال پختہ ہو گیا۔ بیماری آزاری کو بھول بھال کر سب جادو ٹونے کے پھیر میں پڑ گئے۔ نواب علاء الدین خاں نے مرزا سے بھی اس خیال کا اظہار کیا۔ مرزا نے جواب لکھا اور ضمناً ایک دو لفظوں سے ملانوں کی بھی خبر لے لی۔ ذرا دیکھئے فرماتے ہیں۔

" اسماء و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفع بلا اُن کے ذریعہ سے مقصود ہے۔ لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے نہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بگھانتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا۔ بیچارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک کوئی وہاں کا قصد نہ کرے۔ کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث۔"

حروف فارسی اور بعض قواعد مقررہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم کو لکھتے ہیں۔ اور ملا عبدالواسع ہانسوی کا خاکہ اڑاتے ہیں۔

" وہ میاں ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے۔ بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ نامراد وہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو بر نہ آوے بے مراد وہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو از قسم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب"

ایک جگہ فرہنگ نویسوں کی خبر لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" رہے فرہنگ لکھنے والے خدا ان کے پیچ سے نکالے اشعار قدما آگے دھر لئے اور اپنے قیاس کی مطابق چل دئے۔ وہ بھی نہ کوئی ہمقدم نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ۔ رہنا ہو تو راہ بتائے استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی۔ نہ استاد رمضانی۔ نرے رگ گردن و خم دعوئ زباں دانی میرا یہ

قول خاص ہے نہ عام ہے۔ مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشائے برتری ہے۔ تو بیچارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے۔ ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو۔ اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جسقدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو ورق ہی نظر آئیں گے معنی موہوم۔ ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دلنشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ہے البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔ خصوصاً دکھنی تو عجیب جانانہ ہے۔ لغو ہے پوچ ہے پاگل ہے دیوانہ ہے۔"

ایک حکیم کا مقولہ ہے اور بالکل صحیح ہے کہ انسان زمانہ حال پر کبھی قانع نہیں رہتا۔ ہمیشہ ماضی کو یاد کرنا اور مستقبل کی امیدیں رکھنا اوس کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور یہ جذبہ ایسا بے اختیاری ہے کہ .... بڑے بڑے صابر و شاکر بھی اس میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں مرزا کے قلم سے ایسے ہی جملے نکلے ہیں جن میں بعض صرف گزشتہ زندگی کے واپس آنے کی تمنا میں ہیں۔ اور بعض شباب کے پلٹ آنے کی تمنا میں گو ان الفاظ ان جملوں ان فقروں کو درد میں ڈوبا ہوا۔ زہر میں بجھا ہوا نشتر ہونا چاہیئے۔ مگر مرزا کی ظرافت اون میں وہ شگفتگی پیدا کر دیتی ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا"

مرزا تفتہ کو عجیب طرح سے ایام گزشتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اور تعلقات باہمی کو قدیم ثابت کرتے ہیں۔

"صاحب تم جانتے ہو۔ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔

اُسی زمانہ میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش نام تھا۔ اور حقیر تخلص تھا۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ اور چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا"

میر مہدی نے لکھا . . . . کہ میر سرفراز حسین کو جو کوئی قبلہ و کعبہ لکھتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں

مرزا نے جواب دیا کہ

" خوش کیوں نہوں خوشی کی بات ہے۔ تمہارے سر کی قسم میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کرنا۔ اور مسکرانا۔

نواب علاء الدین خاں کو ایک زمانہ یاد دلا کر کہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرزا کثرت افکار و آلام کے ہجوم سے پریشان ہیں فرماتے ہیں۔

" بھائی کو سلام کہنا۔ اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادہر متھرا داس سے قرض لیا۔ اُدہر دربار مل کو مارا ادہر خوب چند سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ چاٹو۔ نہ مول نہ سود اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپی کے سر۔ باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپیہ رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اوس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بیبی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجایش نکالوں قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے۔ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے۔ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے بارے مہینا پورا گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آ گیا۔ قرض متفرق ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی اون کو یہ عبارت پڑھا دینا۔"

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

" پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس ڈاک منشی کرنال باآنکہ مجھ سے اُس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا بعد اپنے مرنے کے میں نے

اُس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیجدیا کرو۔"

چودہری عبدالغفور سرور کو لوگوں کی ماہ نیم ماہ کی پرسش پر یہ جواب دیتے ہیں۔

"اس کتاب کا نام پرتوستاں ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے حصہ میں اکبر سے بہادر شاہ کی سلطنت تک کا بیان۔ پہلے حصہ کا نام مہر نیم روز دوسرے حصہ کا نام ماہ نیم ماہ۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا چھاپا گیا۔ جا بجا بھیجا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تیمور تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ وگاؤ را قصاب برد وقصاب در راہ مُرد۔

صاحب عالم نے یاد دلایا کہ آپ نے مارہرہ کا ارادہ کیا تھا۔ اوسی کے جواب میں انھوں نے چودھری عبدالغفور کو یہ لکھا جوانی کی یاد ایک ایک حرف سے ٹپک رہی ہے۔

"شیخ محی الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرے جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منھ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔ ۔ ع

دریغا کہ عہد جوانی گزشت جوانی مگو زندگانی گزشت"

حسرت و ارمان کی روزانہ ناکامی کا انجام یاس ہوتا ہے۔ مرزا نے بھی وہ وہ غم والم۔ اور پیہم ناکامیاں جھیلی ہیں کہ آزادروی کے باوجود بھی وہ کہیں کہیں اس جذبۂ بے اختیار سے چیخ اٹھے ہیں۔ مگر نہ اس طرح کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ بلکہ اس طرح کہ سننے والے کے دل پر جتنا اس فریاد و فغاں کا اثر ہوتا ہے اتنا ہی وہ اُس ظرافت مضمر سے ہنسنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ مختلف جذبوں میں ملا جلا یہ جذبہ بہت زیادہ میرزا کے یہاں موجود ہے۔

لوگ کہتے تھے کہ راجۂ الور کی تعریف میں کوئی قصیدہ کہئے۔ کچھ تعریف کیجئے فلاح کی امید یقینی ہے۔ مگر مرزا اپنے نصیب و تقدیر کو خوب پہچانتے تھے اور ان کا عقیدہ ہو گیا تھا کہ مجھے کسی سے کچھ لینا نہیں ہے۔ اگر اتفاقاً میں کسی دامن سے وابستہ ہوا بھی تو وہ دامن ہی نہ رہے گا۔ جیسا کہ بعض بعض جگہ اس خیال کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے ۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

"غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے — خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو"

حکیم غلام نجف خاں کو اور کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

"صاحب تم سچ کہتے ہو بھائی فضل اللہ خاں کی غمخواری کا کیا کہنا ہے۔ مگر الور سے مجھ کو لہنا نہیں یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بفرض محال اگر ملا تو ڈھائی سو روپیہ سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں کا دینا ہے۔ ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدہ کے پانچسو روپیہ کا حکم ہوا۔ اور وہ آجائیں تو تم بعد اطلاع ڈھائی سو میاں فضل کو دے کر مجھ کو لکھنا باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں اوس طرح کرنا۔ لو صاحب شیخ چلی نے نیا خیالی پلاؤ پکایا۔"

نواب امین الدین خاں کی تعریف کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں میری زوجہ تمھاری بہن۔ میرے بچے تمھارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے وہ بھی تمھاری ہی اولاد ہے۔ نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمھارا دعاگو ہوں۔ اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشا اللہ تعالے ایسا ہی ہوگا۔ کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مرجاؤں۔ تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دوگے بیمے تو دوگے۔ اور اگر چنے بھی نہ دوگے اور بات بھی نہ پوچھوگے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

جب آدمی انتہائی مایوس ہو جاتا ہے تو یاس کے کلمہ اُس کی زبان و قلم سے نکلا کرتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس مضبوطی اور استقلال کے ساتھ کہ یاس میں بھی مزاحیہ رنگ نمودار ہے۔

نواب انورالدولہ سعدالدین خاں شفق نے کچھ اپنے عزیزوں کے جور وجفا کے حالات لکھے۔ مرزا پہلے ہی اُن کے ظلم اٹھائے ہوئے تھے۔ تڑپ اُٹھے اور جواب میں یہ یاس انگیز فقرے لکھے۔

"سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی میرا مقسوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں سمرقند میں دوچار یادشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر اقربای سببی ہیں سو پانچ برس کی عمر سے اون کے دام میں اسیر ہوں اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں ؎

گرد ہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب — رسم امید ہما نا زجہاں برخیزد

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو۔ نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ اللہ دریا سارا اتر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے۔ دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔"

مرزا قربان علی بیگ سالک الور میں تھے۔ کوشش کر رہے تھے کہ مرزا کو ریاست سے کچھ نفع پہونچے مرزا کو علوم ہوا تو یہ یاس انگیز فقرے لکھے۔

" مجکو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات اور احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔"

غالباً آخری یاس انگیز فقرے ایسے ہیں جو تمام رنج و غم کو دریا بُرد کر دیتے ہیں

حقوق خسروانہ یا تعلقات دوستانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جی چاہتا ہے تو مرزا کہیں کہیں دعائیہ فقرے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس رنگ میں کہیں بزرگ بنجاتے ہیں۔ کہیں پہونچے ہوئے فقیر نظر آتے ہیں۔ کہیں رندلا ابالی یا... قلندر منش چار ابرو صاف رکھنے والوں کی طرح کچھ اس قسم کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ سننے والا دعا سنتا ہے اور یقیناً اگر اس کو غالب کے مستجاب الدعوات ہونے اور دعا کے باب اجابت تک پہونچنے کا یقین بھی نہیں آتا پھر بھی تھوڑی دیر کے لئے وہ اتنا خوش ہوجاتا ہے کہ درویشی و شاہی میں فرق نہیں کر سکتا۔

میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں۔

" سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہونچے "

حکیم غلام نجف خاں نے ہنگامۂ غدر کے اختتام کے بعد جب بالکل امن و امان ہوگیا۔ اور وہ بے گناہ قیدی چھوٹنے لگے جو دراصل ناکردہ گناہ تھے۔ غالباً جنوری ۱۸۶۰ء میں غلام فخر الدین خاں کی برئت اور رہائی کی مرزا کو خبر دی۔ مرزا نے جواب میں اور تو خیر جو کچھ لکھا ہے وہ ہے ہی مگر دو دعائیہ فقرے بہت مزے دار ہیں۔ ایک یہ

" بھائی ہاں غلام فخر الدین کی رہائی زندگی دوبارہ ہے خدا تم کو مبارک کرے سنتا ہے تو ہارو بھی اُن دونوں صاحبوں کو مل گیا یہ بھی ایک تہنیت ہے خدا سب کا بھلا کرے "

معلوم ہوتا ہے بڑے کامل پہونچے ہوئے درویش ہیں جن کی بھوؤں سے آنکھیں تک ڈھکنی ہوئی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے سے .... بالوں کی چلمن اٹھا کر فرما رہے ہیں۔

حکیم ظہیر الدین حکیم غلام نجف خاں کے فرزند تھے۔ مرزا اُن کو بچوں کی طرح چاہتے تھے۔ اگر کبھی خط میں دیر ہوتی یا اُن کا حال نہ معلوم ہوتا تو حکیم غلام نجف خاں سے شکایتیں کرتے۔ اور خیریت وغیرہ دریافت کرکے چھوڑتے۔ غرضکہ مرزا کو ان سے دلی تعلق تھا۔ ایک مرتبہ ظہیر الدین نے خط لکھا مرزا نے جواب بھیجا اسی دوران میں حکیم غلام نجف کو بھی خط لکھنے کا اتفاق ہوا۔ معمول کے موافق دعا کا لکھنا ضروری تھا۔ اور کچھ دلجوئی کے فقرے بھی۔ . حسب العادہ لکھنا تھے۔ اور حال یہ تھا کہ تھک گئے تھے شام ہوگئی تھی لہذا یہ لکھا۔

"حکیم ظہیر الدین کو دعا۔ بیٹا اب اسوقت مجھ میں دم نہیں دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیساکہ اور لکھ آیا ہوں بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت۔ تو بھی کہہ بیش باد"

ایک مرتبہ غلام نجف خاں ہی کے خط میں ظہیر الدین کو لکھا۔

"ظہیر الدین دعا سے خفا ہوگا اس کو میری بندگی کہنا"

میر سرفراز حسین سے ہمیشہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ اور میر مہدی کے خط اسی کے لئے وقف تھے ایک مرتبہ اُن کو خط میں لکھتے ہیں۔

"مجتہد العصر کو دعا لکھوں بندگی لکھوں کیا لکھوں۔ بھئی وہ مجتہد ہیں ہوا کریں۔ میرے تو فرزند ہیں میں دعا ہی لکھوں گا۔ اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو کہ وہ اُن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپیہ کو لے گئے میری دعا کہدینا۔"

دیکھئے یوں تو ایک معمولی دعا ہے۔ مگر ایک جملہ معترضہ لکھ کر کس قدر لطف پیدا کر دیا ہے۔

(۲)

غالب کی شوخیاں اُردو نظم میں

جیسے داد دینے والوں کے دو جملے مشہور و معروف ہیں 'واہ اور آہ' اسی طرح بہ لحاظ تاثیر شعر کی بھی دو قسمیں ہیں انبساطی۔ و انقباضی۔ انبساطی سے یہ مراد ہے کہ اوس میں کچھ مضمون ایسے نظم کئے جائیں۔ جنکا ماحصل اور مآل شگفتگی ہو۔ اور جن کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ایک بے حس سے بے حس بھی انھیں جذبات طرب سے متاثر ہو جائے جنکا ذکر اکثر شاعر نے کیا ہے۔ اس قسم کے شعروں میں کچھ وصل کا بیان کچھ اپنے حوصلے اور ارادے۔ کچھ معشوقوں کی... شوخیوں ستم ظریفیوں کا رونا۔ کچھ ساقی کی کرامات کا ذکر کچھ پیر مغاں کی دریا دلی کے حالات۔ کچھ پینے پلانے کا ذکر۔ کچھ اپنے حسن کی تعریف وغیرہ سب شگفتہ زبان کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ طعن۔ طنز۔ تشنیع پھبتی۔ آوازے وغیرہ بھی اسمیں شامل ہوتے ہیں۔ واعظوں پر چوٹیں بھی اسی میں کی جاتی ہیں۔ وصل کی دعائیں بھی اسی میں مانگی جاتی ہیں۔ غم کے غم چڑھا کر ہمسر کے آنے کا بھی یہیں مذکور ہوتا ہے۔ مگر یہ سب بہت ہلکی ظرافت اور معمولی سی شوخی کے ساتھ۔

انقباضی اشعار میں ہجر کے سوز و ساز۔ جدائی کی تکلیفوں۔ شب غم کی مصیبتوں تنہائی کی جانستاں اذیتوں معشوق کی بیوفائیوں کج ادائیوں۔ ستم آشنائیوں۔ رقیبوں کی کارفرمائیوں۔ آسمان کی کجروی بدنصیبی کے جور و الم۔ صیاد و گلچیں کے

ظلم کی داستان۔ آشیاں کے عین موسم بہار میں اُجڑتے ،... وصل کی رات کے چھوٹے ہونے اور ہجر کی رات کے بڑھ جانے کا بیان ہوتا ہے یا اسی قسم کے دوسرے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔ ان شعروں کے کہنے میں شاعر اپنے آپ کو ان مصیبت زدوں میں فرض کر لیتا ہے۔ جن کا دین و دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں اور جنھیں کہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایسے شعروں کا کامل تاثیر و تاثر، سوز و گداز پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور بیشتر انھیں شعروں کو غلط طریقہ پر نشتر قرار دیا جاتا ہے۔

قدمائے یہاں یہ دونوں رنگ ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ جتنا کسی کے یہاں سوز ہے۔ اتنا ہی ساز ہے اور جس قدر [illegible] ہے اسی قدر گداز ہے۔ دلی سے لے کر داغ و شیفتہ و حالی تک اور ناسخ و آتش سے صبا و وزیر وغیرہ تک برابر [illegible] کا رنگ ملتا ہے۔ صرف طرز بیان۔ اور انداز نظم کا فرق ہے۔ لکھنؤ والے جوبات الفاظ۔ استعارات۔ تشبیہوں [illegible] معاملات کے ساتھ کہتے ہیں۔ دلی والے اس کو جذبات و کیفیات انسانی سے مطابق کرکے لکھتے ہیں۔

دلی والوں کے یہاں چونکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ جذبات سے منطبق کرتے ہوئے کہا گیا ہے اس واسطے ذرا تعجب بھی نہیں [illegible] کے یہاں اُن سا طی رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اُن لوگوں نے رسماً۔ اتباعاً۔ مجبوراً اس [illegible] کو نہیں کہا ہے بلکہ جو کچھ کہا ہے دل سے اور دل کی خواہش سے۔ وہ اصل میں یہ چاہتے تھے کہ غزل کا دیکھنے والا [illegible] جگہ جذبات حزن و یاس سے متاثر ہو کر آہ کرے ایسی حالت میں کچھ نہیں تو پانچ جگہ تو اسے واہ کا موقع اور ہنسنے کی دعوت دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو پوری غزلوں میں دو دو اور چار چار شعر اس قسم کے ملیں گے۔ جو اس [illegible] کہے گئے ہیں اور دانستہ کہے گئے ہیں۔

سودا کو جانے دیجئے۔ وہ ہجو گو تھے۔ شوخ تھے۔ بیباک تھے۔ لاابالی تھے میر تقی میر کو لے لیجئے۔ ان کو دیکھئے ان کے وقار۔ ان کے مرتبہ۔ اُن کی بلند خیالی کو دیکھئے۔ اُن کے انداز بیان ان کی غزل کو دیکھئے۔ اس شعر کو دیکھئے

وے دن گئے کہ آنکھیں ندیاں سی بہتیاں تھیں۔ سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا۔ اور پھر اس کے بعد یہ شعر ملاحظہ فرمائیے

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دوخوابہ

نہیں آئے کسو کی آنکھوں میں ہوکے عاشق بہت حقیر ہوئے

اسی غزل کا مقطع ہے سہ

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

اسی طرح سیکڑوں غزلوں میں ایسے شعر ملیں گے جن کا مقصد اس کے سوائے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہنسنے اور ہنسانے کے لئے کہے گئے ہیں۔ اور زہر میں چٹکی بھر شکر بھی ملادی ہے۔

میر سوز کو دیکھئے اور ان شعروں کو دیکھئے بس ہنسی آتی ہے اور کچھ نہیں سہ

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — ارے لے رے لے اٹے رے رے اٹے لے

میں تو کہتا ہوں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ کہے کہ برجستہ مصرع بنا کہہ دیا۔ اس میں انبساط کو دخل نہیں اسی طرح زینہ بہ زینہ حالی تک چلے آئیے تو ان کے یہاں بھی یہ شعر نظر آئے گا

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

متقدمین لکھنؤ پر نظر ڈالئے تو سب سے پہلے ناسخ کو دیکھئے جنھوں نے شیخ پر پھبتی کہکر بالکل جوکر بنا دیا ہے ؎

دیکھنا ناسخ یہ ہے شیخ معظم کی طرف — کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

آتش کہتے ہیں ؎
ہوتا ہے خوشنوائی بلبل سے آشکار — یہ مشت پر بھی شاعروں کا احتلام ہے

"
بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو — منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

خلیل
وصل کی شب پلنگ کے اوپر — مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

فلق
ٹٹی کے نیچے بیٹھا رہا رات بھر فلق — سوئے وہ اینڈا اینڈ کے سارے پلنگ پر

ناسخ
تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں — رخسار یار ہے کہ جزیرہ فرنگ کا

الغرض متقدمین میں وہ دلی کے ہوں یا لکھنؤ کے کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہیں جس کا کلام اس قسم کی ظریفانہ آمیزش سے پاک ہو۔ ہاں اس میں کلام نہیں کہ افراط و تفریط نے اس رنگ کو بعض جگہ نہایت بدنما بنا دیا ہے

مگر غالب کی منظوم شوخیاں سب سے علیحدہ ہیں اور حد درجہ لطیف۔ وہ گہرے سے گہرے خیال میں بھی اپنے انداز بیان سے ایک بات ایسی پیدا کر جاتے ہیں کہ اگر کوئی چاہے تو بہت لطف لے سکتا ہے۔ ذیل کے شعروں سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے:—

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاشکے تم مرے لئے ہوتے

اس شعر میں جو شوخی انداز بیان سے پیدا کی گئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ؎

منھ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب — کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

ایک شاعر کو ایک عاشق کو استدعا کی سو سو جگہ ضرورتیں پڑتی ہیں اور جابجا وہ اس رنگ سے کام لیتا ہے انھیں میں مرزا بھی ہیں۔ مگر ادائے خاص کے ساتھ وہ اس جذبہ کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ اور اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو خواہش رہتی ہے کہ ابھی اور کچھ کہتے۔

دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

استہزا کے معنی لغت میں تمسخر کرنے کے ہیں۔ اور عوام کا یہ دستور ہے کہ دوسروں پر اکثر استہزا کرتے ہیں۔ مگر مرزا کہیں کہیں اس حربہ کو اپنے خلاف بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس وقت وہ اپنے آپ کو اپنا دشمن خیال فرماتے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اسد یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون توام ہے جسے تو بندگی کہتا ہے دعوے ہے خدائی کا

بندگی و خدائی کا ذکر جس شوخی سے اس شعر میں ہوا ہے وہ غالب ہی کا حصہ ہے ؎

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پہلے مصرع میں ۴ گرہ کا لفظ رکھکر شوخی کی روح پھونک دی ہے ؎

جاتا ہوں جدھر اُٹھتی ہے سبکی ادھر انگشت یکدست جہاں مجھسے پھرا ہو مگر انگشت

میں جہاں جاتا ہوں سب کی ادھر ہی انگلی اٹھتی ہے گویا سارا جہاں مجھسے پھر گیا ہے بس انگلی ہی میرے ساتھ رہ گئی ہے کسقدر لطیف ظرافت ہے

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

دوسرا مصرعہ بالکل ظرافت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے

مرزا کے آزادانہ جذبات میں بھی ایک ہلکا سا شوخ رنگ نہاں ہے جو دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا ملاحظہ فرمائیے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس طرح اپنی آزادی کو اسی انداز کی متین شوخی کے ساتھ فرماتے ہیں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہمسے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذرِ مستی ایکدن

اس میں رنگ خاص بہت واضح ہے مندرجہ ذیل شعر کے شوخ ارادے کو دیکھئے ؎

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے اگر حوریں یہی واں ہوگئیں

یا یہ:—

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ شعر ملاحظہ ہو:—

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے　　لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

عشق کی شان دیکھئے اور پھر یہ طنزیہ اطمینان

ظرافت اور افسوس دو مختلف النوع جذبوں کا جمع کرنا آسان نہیں مرزا ان دونوں کو ایک جگہ جمع کر کے فرماتے ہیں ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا　　اے دریغا وہ رند شاہد باز

مندرجۂ ذیل شعروں کی شوخی کو دیکھئے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ　　وائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں　　آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ میرا ایمان ہے لیکن غالب　　خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

اس میں شک نہیں کہ مرزا کی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کو معانی سے خالی سمجھ کر کہیں لفظ کا پابند بتانا بُرا ہے اور حقیقتاً ان کے کلام پر ایک تہمت تراشنا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہنا ہی پڑتا ہے کہ دریا ہے وہ جدھر بہہ نکلا بہہ نکلا پھر کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔ یہاں یہی غور کرنا چاہئے کہ ظرافت فی المعنی سے جدا ہو کر الفاظ میں کیونکر لطافت اور ظرافت کی روح پھونک دیتے ہیں۔ جیسے

لٹے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب　　جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے

اسی طرح کا یہ شعر بھی ہے:—

اسد قربان لطف جور بیدل　　خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

دوسری جگہ فرماتے ہیں:—

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے — وحشت کدۂ تلاش کرنے کے لئے
مغرور وفا نہو کہ جوں کاغذ باد — ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

ایک جگہ بادشاہ کو دعا دیتے ہیں۔ مگر گڑگڑا گڑگڑا اور رو رو کر نہیں بلکہ ہنس کر۔ بات سیدھی سی کہتے ہیں مگر معنی آفرینی کی حد کر دیتے ہیں ؎

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

کسی کو دل دے کر مجبوراً لوگوں سے دل کا درد بھی کہنا پڑتا ہے۔ حالات معشوق سے بھی اطلاع دینی پڑتی ہے۔ مرزا بھی اس آئین عشق سے مجبور ہو گئے ہیں۔ جا بجا شکایات و حکایات کا دفتر کھولنا پڑتا ہے۔ لیکن اس طرح ؎

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے کہ ہو — مال آتی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سر کھجاتا ہی جہاں زخم سر اچھا ہو جائے — لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی — وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور — تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں
اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے — فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی
چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل بنے تو طالب اہل کرم ہوئے

کہیں نواب علاء الدین خاں نے ایک غزل کی فرمائش کی آپ اظہار حال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی — ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

مندرجہ ذیل شعروں کو افلاس میں سمجھئے یا بیان حال ؎

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اسی طرح اس قطعہ میں افلاس اور بیان حال دونوں شامل ہیں مگر حد درجہ شوخی کے ساتھ ایک قصیدہ سے یہ شعر ملاحظہ ہوں

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں　　دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی　　وقنا ربنا عذاب النار
مری تنخواہ جو مقرر ہے　　اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات　　اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض　　اور رہتی ہے سود کی تکرار
مری تنخواہ میں تہائی کا　　ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

مرزا کی بعض پھبتیاں ملاحظہ ہوں۔

معشوق کے دل لینے پر پھبتی ؎　شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
زاہد کی سیہ کاری پر پھبتی ؎　بسکہ ہیں وسپردہ صرف سیہ کاری تمام　　استر ہے خرقۂ زاہد کا صوف مداد
خیالی پلاؤ پکانے والوں پر پھبتی ؎　تو پست فطرت اور خیال بسا بلند　　ای طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

مرزا کہیں کہیں کسی کے خیال کو جھٹلاتے ہیں تو عجب پرلطف اور نازک اور لطیف ظرافت کے ساتھ جھٹلاتے مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھئے۔

تکذیب چارہ گر یا عوام ؎　پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
تکذیب بیان معشوق ؎　کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناسپاس ہیں　　مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
تکذیب نامہ بر ؎　طرف سخن نہیں ہے مجھ سے خدا نکردہ　　ہے نامہ بر کو اس سے دعوائے ہمکلامی
تکذیب معشوق ؎　کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

مرزا کہیں کہیں تنبیہ سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً مرزا زین العابدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرزا اپنے تخیل میں اُن کو مخاطب کرکے کہہ رہے ہیں اور نوحہ کے ساتھ اپنے رنگ خاص کو شامل کرتے ہیں کہتے ہیں۔

؎　تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
دوسری جگہ ؎　ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب　　قسمت میں ہے مرنیکی تمنا کوئی دن اور

معشوق کو ذکر غیر پر تنبیہ ــ ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ | ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو
دل کو امید حصول تمنا پر تنبیہ ــ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی | دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

ــــ مرزا کی توجیہوں کا رنگ آپ نثر کے حصہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اب نظم میں دیکھئے :-

توجیہ کثرت مینوشی ــ کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں | یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
توجیہ تخفیف عذاب ــ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے | آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
توجیہ تیرہ بختی ــ ہمیشہ مجھکو طفلی میں بھی مشق تیرہ روزی تھی | سیاہی ہے مرے ایام میں لوح دبستاں کی
توجیہ بطلان قول معشوق ــ مدعا در پردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ | وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
توجیہ رندی ــ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے | بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
توجیہ ہیچمدانی ــ دہن اوس کا جو نہ معلوم ہوا | کھل گئی ہیچ مدانی میری
توجیہ ناآشنائی ــ کانوں پہ ہاتھ دہرتے ہیں کرتے ہوئے سلام | ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بعض اوقات آدمی اپنی حد سے گزر کر تمسخر پر بھی آجاتا ہے تب بھی وہ اپنی شان کو ملحوظ رکھتا ہے کیسا ہی کچھ کہے پھر بھی تہذیب و متانت اس میں ہوتی ضرور ہے۔ مرزا بھی کہیں کہیں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں ملاحظہ ہو

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز | دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

مدتوں دعا مانگی۔ قبول نہیں ہوئی تو اب یہ تمسخر اپنی سوجھا ہے کہ وہ دعا مانگ رہے ہیں جو قبول ہو چکی۔ شیخ سے تمسخر کرتے ہیں۔

شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم | آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

اپنے اوپر بھی کبھی کبھی ہنس لیا کرتے ہیں۔ اور غیروں کی طرح خوب بناتے ہیں ــ

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد | آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

رندانہ عاشقانہ۔ شاعرانہ چالاکیوں کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ اُن سے فی الواقع بہت بڑے اہم نتائج پیدا ہوں بلکہ برعکس اس کے شاعر کے فلسفہ کی طرح اون کا مقصد اصلی اکثر جگہ صرف دل خوش کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ مرزا کی بیان کی ہوئی چالاکیوں کو بھی ایک نظر دیکھ جائیے ــ

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر | جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
لوگوں کو ہے خورشید جہانتاب کا دھوکا | ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
مگر لکھوائے اسکو کوئی خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

بیان حال اور حال کو قریب قریب ہی سمجھئے۔ مگر دونوں کو ایک نہ جانئے:

حال اضطراب سے — اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں — کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا
حال خانمان عاشق سے — خانمان عاشقاں دکان آتش باز ہے — شعلہ رویاں جب ہوئے گرم تماشا جل گیا
حال و ارادہ سے — کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
حال دولت خانہ سے — اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

حسن طلب اُس طلب کا نام ہے جس میں کچھ شوخی ہو۔ کچھ ندرت بیاں ہو۔ کچھ ظرافت ہو۔ کچھ جدت ہو۔ ان باتوں کی ضرورت ہر طلبگار کو ضرورت ہے اور خصوصیت سے ہر شاعر کو۔ اور مخصوصانہ طریق پر اوس کو جس کی طبیعت میں ظرافت خلقی مرزا کا ایک قطعہ بیان حال میں لکھا جا چکا اوس میں طلب جس شوخی اور حسن سے کی گئی ہے اُسی کے لگ بھگ یہ شعر بھی ہیں مگر جذبات مختلف ہیں۔

حسن طلب توجہ سے — بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
" سے — غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر
" سے — غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
" سے — سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
" سے — تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے
حسن صفت سے — ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مرزا کہیں کہیں عاشقانہ حماقتوں کا بیان کرتے ہیں تو لطف آجاتا ہے۔ اول تو کسی کی حماقت یوں ہی ہنسنے ہنسانے والی چیز ہوتی ہے۔ مگر اوس وقت خصوصیت سے یہ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے جب اس میں ظرافت کا چھینٹا دیا جاتا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ آسمان کو غارت گر سمجھ کے کہا ہے۔ مگر مرزا اُسے اپنی اسامی یا اپنا قرضدار کہکر اور فنی رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

؎ فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

جیسا کہ نثر کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں اسی صورت سے یہاں بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ بمقتضائے بشریت کہیں کہیں مرزا کو خوشی بھی ہوتی ہے۔ مگر نظم میں فرق اتنا ہے کہ یہاں جس قدر جذبات ہیں انھیں محکِ عاشقی پر کسنا ضروری ہے اور وہاں سب جذبات صرف مرزا صاحب کی ذات سے مخصوص ہیں۔ پھر بھی رنگ ظریفانہ موجود ہے اور کچھ عجیب طرح کی خوشی ہے

فراغت کی خوشی ؎ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
غیرت کی خوشی ؎ میں اونھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پئے ہوتے
اضطرابی خوشی ؎ اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
مجبورانہ خوشی ؎ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

عاشق کو خوف کا ہر وقت سامنا ہوتا ہے اور ہر وقت آفتِ تازہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ مرزا اس سے کیونکر بچتے مگر اس جذبہ کے اظہار میں بھی وہی رنگ ہے ایک آدھ شعر نمونتاً دیکھئے ؎

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

دریافتِ حال تعجب کے انداز سے ؎ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

شوخی ہر حال میں شوخی ہے۔ اس کے متعلق چند شعر درج کئے جاتے ہیں

شوخیِ معشوقانہ ؎ کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا — خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
" ؎ میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
شوخیِ عاشقانہ ؎ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
شوخیِ معشوقانہ ؎ میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
شوخی ؎ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

طعن طنز رشک وغیرہ کے مضامین غالب سے بہتر شاید کسی نے مشکل سے کہے ہوں گے ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دل پر طنز ؎	درس تپش ہے برق کو اب جس کے نام سے	وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا
عاشقانہ طنز ؎	آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
زاہد پر طنز ؎	ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا	وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
اپنے اوپر طنز ؎	یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب	تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
" "	نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب	ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو
معشوق سے طنز ؎	بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ	جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
واعظ پر طنز ؎	کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ	پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
خضر پر طنز ؎	وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
واعظ پر طنز ؎	کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ	خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

غصہ کی حالت میں مرزا کی شوخی دیکھئے :-

؎ شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا | آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

؎ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں | عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ایک جگہ تقدیر پر غصہ ہو کر کہتے ہیں

لگد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی | مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

عشق کا قانون و آئین - اور مرزا صاحب کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے | قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ | شہیدان وفا کا خوں بہا کیا

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے | تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر | وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلا

بد قسمتی سے جیسے ہر شاعر میں تھوڑا بہت فلسفہ کا ذوق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی واعظ بھی ہو جاتا ہے

غالب نے اس رنگ کو جس شوخی کے ساتھ اختیار کیا ہے ملاحظہ ہو:-

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد ‏ ‏ دوستی نادان کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا
نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں ‏ ‏ اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ
بسمل اس تیغ دو دستی کا نہیں بچتا اسد ‏ ‏ عافیت بیزار شغل کعبتین اچھا نہیں
سرپائے خم پہ چاہئے ہنگام بیخودی ‏ ‏ منہ سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے
کیوں رد قدح کرے ہے زاہد ‏ ‏ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب ‏ ‏ آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب ‏ ‏ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

مرزا کے انبساطی فقرے فارسی نثر میں

شوخی طبیعت نہ کسی زبان کی پابند ہوتی ہے نہ کسی آئین و مذہب کی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا کے جس رنگ کو دیکھنا ہو اُسے فارسی میں دیکھو کہ یہی چیز اُن کی مایۂ ناز تھی۔ اور اسی پر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر توجہ دلاتے تھے کہ ع

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ۔

مرزا اڑتیس اونتالیس برس کی عمر میں کلکتہ گئے۔ اون کے بعض دوست پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ مگر ان سے ملنے پر اور بھی نئے دوست پیدا ہوگئے۔ اور جس وقت کہ دلی میں واپس آئے تو ایک اچھی خاصی تعداد اون کے دوستوں کی کلکتے میں موجود تھی۔ اونھیں میں سید علی اکبر خاں تھے جو ہوگلی بندر کے امام باڑہ کے متولی تھے۔ مرزا سے اور ان سے نہایت بے تکلفانہ دوستی ہوگئی تھی۔ انھیں کے نام ایک خط میں آموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ اندازِ بیان کی ظرافت آمیز ندرت دیکھئے۔ حسنِ طلب دیکھئے۔

"قبلۂ خدا پرستاں سلامت۔

ممدوح از ستایش مستغنی۔ و مادح در بیان نارسا۔ چہ گویم تا آبروئے خموشی نریزد و چہ گویم تا داغ کوتہ قلمی برخیزد این عبودیت نامہ را قماش سلام روستائی است۔ و دائرہ ہر حرفش را پرواز کاسۂ گدائی۔ شکم بندہ ام۔ و قدرے ناتواں۔ ہم آسایش خوان جویم۔ و ہم آسایش جاں۔ خردوراں دانند کہ ایں ہر دو صفت با نبہا اندر است۔ و اہل کلکتہ برانند کہ قلم و ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی۔ و گل از گلشن۔ ایثار از جناب۔ و سپاس از من شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایانِ فصل دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گزشت۔

وآزمی نالد۔ کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت۔"

پہلے تو وہ اپنی شوخی القاب سے ظاہر کرتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو ان القاب آداب و مزاج پرسی ظاہری تعریف سے قطع نظر کر کے کہتے ہیں۔ کہ بھئی نہ تمہیں تعریف سننے کا شوق۔ نہ مجھ میں تعریف کرنے کا دم۔ خط کو خط نہیں بتاتے بلکہ سلام روستائی کہتے ہیں یا کاسۂ گدائی پھر حسن طلب ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں۔ کچھ تو میں پیٹ کا بندہ ہوں اور کچھ ناتوان۔ لہٰذا اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ آرائش خوان۔ اور آسائش جاں۔ اب ایسی چیز کہاں ہے جس میں یہ دونوں صفات موجود ہوں۔ مگر لوگوں کی رائے میں یہ دونوں تعریفیں آم میں ہیں۔ اور کلکتہ والوں کا خیال ہے کہ آم ہگلی بندر میں ہوتا ہے۔ سچ ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ چار چیزیں چار جگہ ہیں۔ آم ہگلی میں۔ پھول باغ میں۔ ایثار جناب میں اور شکر خاکسار میں مگر ایک عجیب بات سنئے مجھ میں دو چیزیں ہیں۔ شوق اور حرص۔ دونوں مختلف الخیال۔ شوق تو کہہ رہا ہے کہ فصل بھر میں کم سے کم میرے آقائے نعمت دو تین بار مجھے یاد کریں گے۔ اور حرص کہتی ہے۔ کہ واہ۔ دو تین بار میں میرا کیا بھلا ہوگا۔

منشی محمد حسن مرزا کے کوئی خاص دوست تھے۔ اُن کے صاحبزادہ احمد حسن کی شادی ہوئی۔ مرزا کو قصیدہ نہیں تو کم از کم کوئی سہرا ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ مگر خدا جانے عدیم الفرصت تھے۔ یا فکر مند تھے۔ موقع نہ تھا۔ یا اور کوئی بات تھی کچھ بھی نہ کر سکے۔ آخر عذر میں ایک خط لکھا۔ جس میں سب کچھ لکھ گئے۔ کہتے ہیں کہ مجھ میں تصنع کی عادت نہیں میری زبان میں ایک دل ہے اور دل میں ایک زبان ہے۔ ورنہ اس موقع پر میں بھی کچھ کہتا۔

"ہم در و دیوار را بسر جوش بہار اندودمے۔ و ہم گوشہ و کنار گیتی را بفروغ نیر بخت چراغاں نمودمے
تار از طرۂ حور۔ و پود از بال پری آوردمے۔ و لو آلیں نمطے در ہم بافتہ بداں ہمایوں انجمن گستردمے بر بساط
محفل میوہ و گل از طوبےٰ فشاندمے۔ و زہرہ را برامشگری و رضواں را بہ مہمانی خواندمے الخ"

مرزا کو اپنی جاگیر کے معاملہ اور مقررہ رقم کے لئے فیروز پور جانا پڑا۔ وہاں نواب نے کچھ اُمیدیں دلائیں اور معاملہ کے انفصال کا اطمینان دلایا۔ ادھر مرزا صرف اسی وعدہ ..... پر مطمئن ہو کر دہلی چلے آئے۔ مدتیں ہو گئیں مگر کچھ انفصال معاملہ نہ ہو سکا۔ ناچار ہو کر مرزا علی بخش خاں کو جنھیں مرزا بھائی کہتے تھے۔ اور اپنا معین و مددگار سمجھتے تھے۔ ایک خط لکھا جس کا ہر فقرہ اُن کی دل برگشتگی اور انتظار کا پتہ دیتا ہے۔ دو تین فقرے غصہ اور انتظار کی انتہا کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اون کو اپنے خاص رنگ میں رنگا گیا ہے۔ جس سے اثر کم ہوا ہو یا زیادہ مگر لطف پیدا ہو گیا ہے فرماتے ہیں

"یکچند بامید نواب صاحب ساختم۔ و از تاب آتش انتظار گداختم۔ نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بزنداں
نشیند۔ و می بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند"

ایک مرتبہ دوپہر کو ظہر کے وقت مرزا صاحب مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں پہونچے کنڈی ہلائی۔ اندر سے نوکر نکلا۔

جواب دے گیا کہ مفتی صاحب موجود نہیں ہیں۔ مرزا واپس آئے۔ اور آکر اسی روز مفتی صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں نوکر کے باہر نکلنے اور اپنے پلٹنے کو عجب دلکش انداز سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں۔

"ہمانا آں پرستار دراں برآمدن کام دل دشمن بود۔ و من دریں برگشتن بخت خولیشتن"

شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کا دیوان طبع ہوا تو انہوں نے ایک جلد موسیٰ جان کی معرفت مرزا کے پاس بھی روانہ کی۔ مرزا نے جواب میں شکریہ لکھا۔ اور ایک نہایت لاجواب فقرہ بھی تحریر فرمایا۔

"بخت را برسائی ستایم۔ و پندارم۔ کہ بہ طور معنی رسیدہ ام۔ خود را بہ کویا نمائی آفریں گویم والگرام کہ موسیٰ را ید بیضا دیدہ ام"

مرزا کے ایک دوست لالہ ہیرالال ایک مرتبہ مولوی فضل حق خیر آبادی سے ملنے گئے۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا کے مکان کے قریب آگ لگی۔ مگر اتفاق سے مولانا کا نقصان بالکل نہ ہوا۔ یا ہوا تو اتنا کہ نہونے کے برابر تھا۔ جب واپس آئے اور مرزا سے ملاقات ہوئی تو اس حادثہ کی بھی خبر دی۔ مرزا نے فوراً مولانا کو ایک شکایتی خط لکھا۔ اور اس بات پر افسوس کیا کہ آپ نے اتنے بڑے جانکاہ حادثہ کی مجھے اطلاع بھی نہ دی۔ اور اسی ضمن میں چند فقرے دریافت خیریت کے لئے بھی لکھے۔

"ہائے اے وفا دشمن۔ بیگانگاں کامیاب پیام و نامہ۔ و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ ؎

وائے بر من کہ رقیب از تو مرا بنماید نامۂ واشدۂ مہر بعنواں زدۂ"

ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا خط آیا۔ خط میں شعر و شاعری کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ مرزا نے پڑھ کر جواب دیا اور جواب میں دو ظرافت آمیز تشبیہیں بھی استعمال کر گئے اس زمانہ میں شانہ میں درد تھا فرماتے ہیں۔

"سحر گاہے کہ۔۔۔ دلم از درد شانہ چنانکہ مومن۔۔۔ مہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد بیقرار بود۔ سرشتے از در در آمد۔ و بہ سپردن بہار ساماں نامۂ گل بجیب تمنا ریخت۔

قدسی مفاوضہ از شعر و غزل چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکرے و شاہد سادہ بود۔"

دونوں جگہ تشبیہیں اسقدر نادر واقع ہوئی ہیں کہ خواہ مخواہ انبساطی رنگ میں آگئی ہیں۔ ایک جگہ دل کو مومن مہر پیشہ اور درد شانہ کو رنج ہمسایہ کہنا تو لطیف تھا ہی۔ خط میں جو شعر و شاعری کا ذکر نہ تھا اوس کو نامۂ اعمال زاہد کی طرح سادہ بنا کر قیامت کر دی۔

ایک مرتبہ شیفتہ مرحوم کا مدت تک خط نہ آیا۔ مرزا نے اپنے رنگ میں یہ شکوہ کیا۔

مے رنجد از تحمل بار جفائے خویش ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

اگر بے پروائیست نمی بالیست۔ و اگر شکیب آزمائی است۔ نہ بدیں اندازہ روا بود۔ اگر از ناکسی بالتفات

بزم۔ ناکساں را بسخن دلیر کردن و ننگ شکوہ بے شکوہاں بخود پذیرفتن از چیست۔ واگر ایں تغافلہائے بے محابا و فراموشیہائے جانگزا از عالم مکافات پیش آمدست مرا کہ بزہ مندم بہ گلہ نواختن وسازِ پوزش مرا بہ نوا نیاوردن گناہ کیست ،،

الفاظ ایسے نہیں کہ اُن سے خندہ یا ضحک پیدا ہو۔ مگر پھر بھی یہ منطقی استدلال کسقدر لطیف...... ہے کہ اگر بے پروائی ہو تو اتنی نہ چاہئے تھی۔ اور اگر ... ہو تو اتنی صبر آزمائی کی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر نالائقی کی وجہ سے میں التفات کے قابل نہیں۔ تو پہلے مجھے دلیر نامہ و پیام کیوں کیا۔ اور اگر بدلہ لیا گیا ہے۔ اور میری غفلت کا جواب پا گیا تو پھر مجھے شکوہ سے کیوں محروم کیا گیا کیونکہ میں گنا ہگار تھا۔ مجھے متنبہ کیا جاتا۔

مفتی صدر الدین آزردہ سے ایک سفارش چاہتے ہیں اور عجیب طرح سے اپنا حق ثابت کرتے ہیں۔

"قبلۂ حاجات۔ اگر ایں بندۂ اندک سخنو بسیار گوے۔ زود گستاخ۔ پریشاں راحق بندگی نیست۔ از کجا کہ بریں بے بضاعتی نواں بخشود ؎

گیرم وفا ندار داثر ہم بما گرائے زیں سادگی کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما

سخن کوتاہ ہرگونہ عنایت کہ دراں کارسازی بکار رفتہ باقی درحق کرمی مرزا فاضل بیگ صرف گردد۔ اگرچہ آں صرف از اسراف بجائے رسد کہ بہرہ از بہر من نماند ،،

کسقدر عجیب استدلال ہے یہ کہ اگر میرا کوئی حق نہیں ہے تو میری بے بضاعتی پر رحم کیجئے۔ اس سے پہلے جو سفارش آپ کر چکے ہیں جو کچھ اس میں سے باقی بچی ہو وہ مرزا فاضل بیگ کے حق میں صرف کر دیجئے۔ چاہے یہ صرف اسراف کی حد میں آکر یہاں تک پہونچ جائے کہ میرے لئے کچھ باقی نہ رہے۔

حکیم مومن خاں ہر سال تقویم بنایا کرتے تھے۔ اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ مرزا کو اگرچہ نجوم میں بہت کم دخل تھا پھر بھی ایکمرتبہ حکیم صاحب کو لکھا کہ اگر اس سال کی تقویم تیار ہو تو ذرا بھیجدیجئے میں بھی نوروز کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک مشہور و معروف لطیفہ اپنے انداز خاص میں بیان کر کے مزاحیہ رنگ پیدا کر دیا فرماتے ہیں

"زہے ناداں ہوس پیشہ کہ من باشم۔ و بہ شرف نور شید خورسند گردم حقا کہ دل نہادن من بہ آثار نوروزی بچشم داشت فرخی و فیروزی از روے مثال لہا گویہ آں کنیزکم خرد سال ماند۔ کہ چوں شب عید شن لغلطی تاشدہ اگرفت و بزمزمہ عید آمد و عید آمد نواے شادی برگرفت خاتون گفت تن زن۔ اگر عید است د رمضان تو دُہماں نیم سوختہ نان ،،

یعنے بھلا میں نوروز دیکھ کر کیا کروں گا۔ میری بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی لونڈی نے عید کا چاند دیکھ کر خوشی کے جوش میں کہا کہ بیوی۔ بیوی۔ کل عید ہے۔ بیوی نے جھڑک کے کہا بیٹھ مردار عید ہو یا رمضان تجھے اپنی ٹکیہ ہی سے کام۔

مسٹر اسٹرلینگ نے مرزا کی کار برآری کا وعدہ کر لیا تھا اور حتی الوسع وہ ان کے معاملہ میں کوشاں تھے اتفاقاً جوان.... مرگئے جس کا مرزا کو بیحد صدمہ ہوا۔ اسی زمانہ میں مولوی سراج الدین احمد کو جو غالباً لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں ملازم تھے ایک خط لکھا جس میں اس جواں مرگ کی موت پر افسوس بھی ہے۔ اپنی بدقسمتی کا رونا بھی ہے۔ مگر باینہمہ جس رنگ سے اس کا اظہار کیا ہے۔ اس میں وہی خاص رنگ پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حیرتے داشتم کہ بمرگ ناگاہ در گزشتن امیرچوں دولت جواں سال یعنی مسٹر اندر واسٹرلنگ ستودہ خصال برائے چیست۔ وکار پردازاں والا کدۂ قضا ازیں سانحہ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند۔ حالیا حالے شد کہ بہ سیلاب فنا دادن بنائے امید واری غالب رسیدہ بخت منجوا مشند۔ وآں صورت نمی بست الا بظہور ایں طوفاں ہوشربا"

ذرا اس استدلال پر نظر ڈالئے۔ اور اس کے مختلف اثرات کو دیکھئے۔ کہ میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر اسٹرلنگ کیوں مرے اور اس جوان موت سے کارکنان قضا و قدر کا مطلب کیا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ اسٹرلنگ کے مار ڈالنے سے صرف میری امیدوں کو برباد کرنا منظور تھا۔ کیونکہ وہ امیدیں جو قایم ہو چکی تھیں اس کے بغیر فنا ہو ہی نہ سکتی تھیں۔

مولوی سراج الدین احمد کو ایک جگہ القاب کے طریقہ پر یہ لطیف فقرے لکھتے ہیں۔

"جانیکہ الطف اجزائے آں بہ تحلیل رفتہ وکدورتے چوں درد از بادہ و خاکستر از آتش وا ماندہ است اگر بپائے دوست افشانم ترسم کہ پائے نازنینش رنجہ گردد"

یعنے میرے پاس جان تو ہے مگر ایسی جان ہے کہ اوس کے تمام لطیف اجزا تو تحلیل ہو چکے۔ اب ایسی جان باقی رہ گئی ہے جیسے شراب میں سے دُرد۔ یا آگ میں سے خاکستر باقی رہ جاتی ہے۔ اوسے اگر آپ کے قدموں پر نثار بھی کروں تو اور یہ اندیشہ ہے کہ آپ کے قدموں کو بھی رنج پہونچے۔

مولوی سراج الدین احمد نے ایک مرتبہ مدت دراز کے بعد خط لکھا۔ اور خط میں یہ تحریر کیا کہ میں سمجھا تھا آپ مجھے بھول گئے ہوں گے اور وہ جوش و خروش محبت باقی نہ رہا ہوگا۔ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"نارسیدن نامہ ام را با افسردگی شوقم حمل کردید چرا بمرگ من حمل نکردید تا از اداشناسیہائے شما خورسند بودمے۔ وشمارا اہل دل و دانشور شمردمے"

فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میرا خط نہ لکھنا افسردگی شوق کی وجہ سے ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا کہ میں مرگیا ہوں۔ تاکہ تمھاری اداشناسیوں سے ذرا جی بھی خوش ہوتا اور تمھیں اہل دل سمجھتا"

مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ ابھی مرزا صاحب کلکتہ جانے کا ارادہ ہی ارادہ رکھتے تھے۔ جا نہ سکتے تھے۔ سخت رنج ہوا اور جواب خط میں تعزیت کے طریق پر یہ دلچسپ فقرے لکھے۔ اتفاق

بالائے اتفاق یہ ہوا کہ مرزا احمد اپنے اور آخر ایام حیات میں دلی آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مرزا سے وعدہ بھی کرچکے تھے۔ کہ انتقال ہوگیا۔ اسی وعدہ سے متاثر ہوکر مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بیمروت راہ گرداند۔ وناقہ بسر منزل دیگر راند گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت چرا بہ حال خورد سالاں خود نپرداخت۔ . . . ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نبود چرا آنقدر صبر نکرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے۔ وروے نظارہ فروزش وگرباره دیدمے۔ چرا آنمایہ درنگ نورزید کہ . . حامد علی جواں گشتے"

ایک مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے مرزا کو لکھا کہ جو کچھ اس زمانہ میں کہا ہو وہ سب خط میں لکھ کر بھیجدیجئے مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"نفس در بادبیمائی درنگ ندارد۔ فراواں خون خوردہ وجہاں جہاں پارۂ دل بدامن شمردہ می شود۔ اگر خواہم کہ ہمہ آں را بورق اندر آرم نامہ از درازی بہ کلکتہ رسد و رقم انجام گرائے نگردد"

فرماتے ہیں کہ کیا پوچھتے ہو بہت خون جگر کھایا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے۔ اگر سب کو لکھنے کا ارادہ کروں تو کاغذ اتنا لمبا ہوجائے گا کہ دلی سے کلکتہ تک پہونچ جائے گا۔ اور پھر بھی سب نہ لکھ سکوں گا۔

ایک جگہ مولوی سراج الدین احمد صاحب کو خط نہ بھیجنے اور پہونچانے کا شکوہ لکھتے ہیں۔ اور یوں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں میدان حشر کا نقشہ کھنچ جاتا ہے فرماتے ہیں

"زنہار صد زنہار اے مولوی سراج الدین بترس از خدائے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قایم گردد۔ وآفریدگار بداد بہ نشیند۔ من گریاں وموبہ کناں دراں ہنگامہ آیم ود. تو آویزم۔ وگویم کہ ایں آنکس است کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت ودلم برد۔ من از سادگی بروفا تکیہ کردم۔ وایں را از دوستاں برگزیدم۔ بنفس کم باخت۔ دہمن بیوفائی کرد۔ خدارا بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد۔ وچہ عذر پیش خواہی آورد۔ وائے برمن کہ روزگار ہا گزرد وخبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست وچہ حال دارد۔ اگر جفا پاداش وفاست۔ بسم اللہ۔ ہر قدر توانی بیفزائے۔ کہ اینجا مہر ووفا فراواں است۔ لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ واگر خود ایں تغافل بیاد افراہ جرمے دیگر است نخست گناہ مرا خاطر نشاں من باید کرد وآنگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ درمیان نگنجد۔

دیکھئے باوجود اس سوز وگداز کے بھی اپنے مذاق کو اس طرح نباہا ہے۔ کہ غور کرنے پر وہ مذاق ہی مذاق رہ جاتا ہے۔ باقی کچھ نہیں۔

جب قاضی محمد صادق خاں اختر نے تذکرہ آفتاب عالمتاب لکھا تو مولوی سراج الدین احمد کی معرفت مرزا کو

بھی لکھا کہ کچھ انتخاب کرکے کلام بھیجیے۔ کچھ خاندانی حالات لکھیے۔ مرزا صاحب نے بہت سے عذر و معذرت کے بعد لکھا کہ جو کچھ بُرا بھلا کلام ہے وہ سب ایک دیوان میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اوس سے انتخاب فرمایئے جب آپ خود صاحب ذوق ہیں تو یہ کام آپ ہی کیجئے۔ رہا حالات لکھنا۔ سو میرے نزدیک تو یہ لکھ دیجئے تو مجھ پہ احسان ہوگا۔ اب ذرا اُن فقروں کو دیکھیے جو اپنی نسبت بتلاتے ہیں۔

" از ناکساں روزگار۔ و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا۔ دگرے است مسلمان نما۔
کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند "

مرزا اپنی پنشن وغیرہ کے معاملہ کے لئے جب فیروز پور پہونچے تو اتفاق سے نواب احمد بخش خاں صاحب تشریف فرما نہ تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مرزا انتظار ٹھہرے۔ مگر پڑے پڑے زمانہ گزر گیا نواب صاحب نہ آج تشریف لاتے ہیں نہ کل۔ عاجز آ گئے۔ بیقرار دل اور ضرورت نے مجبور کیا۔ فرزانہ مجمل کھتری کو جو نواب صاحب کے معتمد خاص تھے ایک خط لکھا۔ اور دریافت کیا کہ خدا کے لئے سچ سچ اور جلد سے جلد لکھیے کہ نواب صاحب کب تک آئیں گے۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہی لکھتے لکھتے چند فقرے لکھ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت کا گیت گاتے گاتے ظرافت کا مادہ ہیجان میں آ گیا فرماتے ہیں۔

ہویدا است کہ از قفس جستہ بدام افتادن را چہ حال خواہد بود۔ و از دست نے بناخن فرو رفتہ کدام عقدہ خواہد کشود۔ جلائے وطن۔ و عزم سفر۔ و احرام غربت۔ مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد وائے بر نگوں طالعیہا۔ ورمیدہ سختیہائے کسے کہ اینہارا بار زد خواہد۔ ہر چند در وطن نیم المقرب نیز قیامت است۔ ہنوز با اہل کاشانہ راہ نامہ و پیام است۔ ہر چہ دیدہ میشد آشوب چشم بود۔ ہر چہ شنیدہ میشود زحمت گوش است۔ نیم جانے کہ از آں دو رطہ بیروں آوردہ ام مگر دلیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرا اینہمہ اقامت اضطراری اتفاق افتاد۔ و مرگے کہ نقش نبرار آرزو از خدائے خواہم مگر ہمدریں سرزمین موعود است۔ کہ اینقدر درنگ افتاد گیہا رو داد "

نواب مصطفےٰ خاں کو ایک مشاعرہ کی بابت حال لکھتے ہیں۔ اور اس میں اپنے مشاعرے کی زبردستی شرکت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ کل جمعہ کا دن گزرنے کے بعد رات کو ایک مشاعرہ تھا۔ چونکہ میں نے غزل وزل کچھ نہیں کہی تھی۔ اسی تہی دستی کی شرمندگی کی وجہ سے بہت حیران تھا۔ اور مشاعرہ میں جانے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہٗ نے دو فرشتے میرے اوپر مقرر کر دیئے۔ زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو۔ یہاں تک تو سیدھی سیدھی طرح حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنا وہی رنگ شروع کر دیا ہے فرماتے ہیں کہ

" ایں ہر دو ابرام پیشہ شام گاہ بخلوت من آمدند و فیل آوردند۔ و بد انسان کہ شیر را چوں

شکار کنند بر فیل بار کنند مرا اکمن بردند "

نواب علی بہادر رسند تعین باندہ جو مرزا کے نادیدہ دوست اور شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ منشی نادر حسین خاں آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں مرزا نے جواب میں یہ فقرہ لکھا۔

" بخدمت مشفقی شفیقی منشی نادر حسین خاں صاحب سپاس سے گزارم و سلام عرضہ میدارم دانستم کہ دیدن غالب را طالب اند حاشا کہ ایں داعیہ تنہا از انسو باشد۔ اگر بسیار فروتنی کنم گویم کہ شریک غالب "

ایک مرتبہ مولوی رجب علی خاں کو مارچ ۱۸۶۱ء میں ایک خط لکھا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں مولانا کا ایک خط آیا۔ جس میں انھوں نے ارقام فرمایا کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ فکر ہے۔ مرزا صاحب نے جواب میں وہ فقرے لکھے کہ حقیقتاً قیامت ہی کر دی فرماتے ہیں۔

" یارب آں نیایش نامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و پنجاہ و یک عیسوی رواں داشتہ ام تا مارچ سال دیگر رواں۔ نہ نامہ ہرزہ عنواں۔ و نہ فرستادہ عبارت از مولانا محمد باقر است نا پر داہماناآں نامہ خود از فراوانی بار مضامین شوق بر برندگان آں مایہ گرانی کرد کہ آں بہ سبکروی گرانمایگان یعنی بریدان ڈاک انگریزی راہے بطول دو صد کروہ جز بعرض یک سال نتوانستند برید "

یعنی یا اللہ جو خط مارچ ۱۸۶۱ء میں بھیجا گیا ہے۔ وہ مارچ ۱۸۶۲ء تک رواں ہے۔ یہ بات کیا ہے نہ خود خط بیہودہ نہ خط لکھنے والا۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نامہ مضامین شوق سے وزنی ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ خط لے جانے والوں کو اتنا بوجھل معلوم ہوا کہ دو سو کوس کا راستہ ایک سال کے بغیر طے نہیں کر سکتے۔

مرزا کی فارسی نظم میں ظرافت

فرماتے ہیں:۔

زانچہ دل زہم پاشد دل چہ طرف بر بندد یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن

ایسی چیز جو دل کے ٹکڑے اڑائے دیتی ہے۔ بھلا دل اس کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہذا یا تو آپ اس کے کہنے کی مجھے اجازت دیجئے یا بغیر کہے یقین کر لیجئے۔

بخون من اگر ننگ ست دست و خنجر آلودن نوید وعدۂ کن تا ز انتظارم میتواں کشتن

اگر میرے خون میں دست و خنجر کو آلودہ کرنا باعث ننگ ہے تو اس کی آسان ترکیب ہے۔ ایک وعدہ کر لیجئے انتظار کرتے کرتے آپ مر جاؤں گا

طاقت شد طاقت ز شفقت بر کران خواہم شدن مہرباں شو ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن

سنئے حضرت مجھ میں اب آپ کے ناز اٹھانے کی تاب وطاقت بالکل نہیں ہے۔ یا تو مجھ پر آپ مہربان ہو جائیے۔ ورنہ میں اب اپنے اوپر مہربانی کرتا ہوں ؎

جان او بہ غم غالب خوشنودی روحش را در بزم عزا یکش در نوحہ غزلخواں شد

غالب کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی روح پر فتوح کو یوں ثواب پہونچائیے۔ کہ مجلس عزا میں بیٹھ کر شراب پیجئے اور نوحہ میں غزل خوانی کیجئے۔

سہایہ کرامت کن و انگاہ بہ غارت بر برخرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

اگر لوٹنے کا ارادہ ہے تو پہلے سرمایہ عنایت فرمائیے۔ خرمن پر آپ برق بنے ہیں تو کھیت پر باران رحمت بنئے۔

یارب بجہانیاں دل خرم دہ در دعوی جنت آشتی باہم دہ

شداد پسر نداشت باغش از تست آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

اللہ تعالے سے استدعا کر رہے ہیں کہ اے خدا یہ دنیا والے جو جنت کے دعویدار ہیں۔ ان کو صلح کر لینے کی توفیق عنایت فرما۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شداد کا کوئی وارث نہیں تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کا باغ ضبط کر لیا گیا مگر جنت کا باغ ہمارے دادا آدم کا تھا۔ آدم کا مسکن بنی آدم کو مل جانا چاہئے۔ ادن کی تو اولاد موجود ہے۔ شداد کی طرح وہ لاولد نہیں تھے۔

خروش حلقۂ رندان ز نازنین پسر است کہ سر بزانوے زاہد بہ بوریا خفت است

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد کہ دزد مرحلہ بیدار و یار ساخفت است

صہبا حلال زاہد شب زندہ دار را اما بہ شرط آنکہ ہماں صبحدم کشد

آخری شعر میں فرماتے ہیں کہ صہبا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حلال نہ ہو حلال تو زاہد کے لئے بھی ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ رات کو نہ پئے بلکہ..... صبحدم پئے۔ اس شرط میں جو ایک ہلکا سا تبسم ہے غالب اوس کا اعادہ اور اظہار بیکار ہو گا سمجھنے والے خود ہی جتنا غور کریں گے لطف اٹھائیں گے یعنی رات کو تو سبھی پیتے ہیں۔

نازد مومن و کافر بر چہ دستگاہ آخر سبحہ و مسواکے قشقہ و زنارے

فرماتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر اتنے کس چیز پر اتراتے اور اینڈتے پھرتے ہیں ان کے پاس رکھا کیا ہے۔ ان کو مقدر کیا ہے مومن کے پاس ایک تسبیح اور مسواک ہے۔ کافر کے پاس ایک قشقہ اور زنار۔ لاحول ولاقوۃ یہ مایۂ بساط اور اس پر یہ جوش و خروش۔

بسکہ دیدار دو دازدو دلم گشت سیاہ   کلبۂ من بہ سیہ خانۂ لیلےٰ ماند

نگھ پر بھی کہتے ہیں کہ میرے دود آہ سے سیاہ ہو کر خیمہ لیلےٰ بن گیا ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گذشت   رشتۂ عمر خضر مدحساب بہ بیش نیست

اتے ہیں کہ خضر کا رشتۂ عمر۔ مد حساب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہنگامے سے علیحدہ مرے سے بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں

موئے کہ بروں نامدہ باشد چہ نماید   بیہودہ در اندام تو جستیم میاں را

نوق کی کمر کو ایک ایسا بال بتایا ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نداشت   خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

نت کو کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے رنگ فراہم ہو گئے تھے۔ اور مصرف کوئی تھا نہیں لہذا

سنے اس کو اپنے طاق نسیاں کی زیب و زینت بنا دیا ہے

آخر عمر میں مرزا کو دنیا سے حقیقی نفرت سی ہو گئی تھی اور وہ ہر وقت چاہتے تھے کہ زمانہ کی آشوبناکی سے علیحدہ

ربرطرف رہ کر زندگی بسر کریں۔ جا بجا اسی خواہش اور تمنا کا ذکر کیا ہے کہ الگ ایک گوشۂ فراغت میں زندگی بسر

یں کوئی نہ ستانے والا ہو اور کوئی جی خوش کرنے والا ہو۔ اس کو فارسی نظم میں یوں ظاہر کرتے ہیں

غالب روش مردم آزاد جدا است   رفتار اسیران رہ و زاد جدا است

ماترک مراد را آرام میسد انیم   وال بائچہ ضبطی شد اد جدا است

عظ سفید پوش کی ایک تشبیہ ملاحظہ فرمائیے جو سنگ رخام کی لوح مزار سے دی گئی ہے فرماتے ہیں۔

گر واعظ دل مردہ سفید است ردائش   خود لوح مزارے است کہ از سنگ رخام است

ید کا منظر دکھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج زاہد بھی حجرے سے نکل آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانور پنجرے سے چھوٹا ہے۔

زاہد بہ نشاطے زدہ از حجرہ بدر گام   کز کنج قفس مرغ گرفتار بر آمد

ے جگہ کہتے ہیں۔ کہ زاہد لوگ جو محلے بالطبع جنت کے درختوں کی شاخوں سے میوہ کھاتے پھرتے ہیں یہ ایسے

لوم ہوتے ہیں جیسے کسی بڑے سبزہ زار یا بڑی چراگاہ میں چند چوپائے حسب منشا گھاس چرتے ہوئے پھرتے ہیں

گرویدن زاہداں بجنت گستاخ   ویں دست درازی بثمر شاخ بہ شاخ

چوں نیک نظر کنی زروئے تشبیہ   ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

ے جگہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جس کو دیکھئے جاہل ہی نظر آتا ہے اگر تھوڑا تھوڑا فرق ہے بھی تو ایسا ہے جیسے خر عیسیٰ اور

خرد جال ہیں۔

ہر چند زمانہ مجمع جہال است درجہل نہ جہال شاں بہ کمال است
کو دن ہمہ لیک از یکے تا دگرے فرق خر عیسیٰ و خر دجال است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی مصیبت میں ہیں ہماری تمنا اور خواہش بہشت سے آگے بڑھ گئی ہے یعنی جنت ہماری نگاہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اُدھر حالت یہ ہے کہ جنت سے بڑھ کر کوئی جگہ پیدا نہیں ہوئی

با تمنائے من از خلد بریں نگزشتے یا خود اُمید گہے در خور آں میبایست

ایک جگہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش آسمان گر پڑے۔ اور اس شوق میں یہ بھی پروا نہیں ہے کہ ہم دب جائیں گے۔ کہتے ہیں کہ آسمان گرے ضرور چاہے ہمارے ہی سر پر گرے۔

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں جو میں اُس سے کہنا چاہتا ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ نازک مزاج ہے۔ بھلا یہ سب خرافات کاہے کو سنے گا کوئی ایسی ترکیب ہونا چاہیئے کہ یہ سوکی سو ایک ہو جائیں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اُس کے لب پر لب رکھ کر مر جانا چاہیئے۔

لب بر لب دلبر نہم و جاں بہ سپارم ترکیب یکے کردن صد ملتمس است ایں

ایک جگہ کہتے ہیں۔ میاں غالب ہم نے یہ مانا کہ آپ بڑے سخن گو ہیں۔ اور اس وقت کوئی آپ کا مد مقابل نہیں ہے۔ مگر جناب کے دماغ میں شے لطیف کی ہوس بہت ہے۔ آپ کی خواہش یہ ہے کہ شراب مفت بھی ملے۔ نادر اور نایاب بھی ہو اور بہت سی بھی ہو۔ سو حضرت یہ تو ممکن نہیں ہے بادہ فروش کوئی ساقی کوثر تو ہے نہیں کہ یہ سب باتیں آسانی سے آپ کو میسر ہو سکیں۔

غالب بہ سخن گرچہ بکس ہمسر نیست از نشہ ہوش ریحست اندر سر نیست
می خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

غالب میدان قیامت میں ہیں۔ اور تمام عمر کے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ آپ گناہ بخشنے والے سے کہتے ہیں۔ کہ ذرا میری بے مائگی پر رحم فرمائیے۔ کہ آپ کے دست کرم نے عمر بھر کے گناہوں کو ایک اشارہ میں برباد کر دیا۔ میں بھی کسقدر تنک مایہ اور کم حیثیت آدمی نکلا۔

بر تنک مائیگیم رحم کہ یک عمر گناہ ہم بتاراج سبکدستی بخشودن رفت

کسی شاعر سے کہتے ہیں کہ اگر آپکی غزل میری غزل سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے اور اس پر چیخ پکار زیادہ ہوتی ہے تو تعجب کیا ہے۔ چنگ سے ہمیشہ ڈھول کی آواز زیادہ ہوتی ہے۔ حالانکہ چنگ چنگ ہے اور ڈھول ڈھول۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ کے بہ برگوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طنز کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بڑے بیوقوف ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں حسینوں میں وفا نہیں ہوتی۔ وضعداری نہیں ہوتی یہ جھوٹ ہے۔ اور بالکل جھوٹ ہے۔ ہمارا تجربہ ہے ہمارے معشوق نے جب سے جفا کرنا شروع کی ہے آجتک برابر جفا کرتا چلا جاتا ہے۔ عمر گذر گئی اور اس نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا۔

عمرے سپری گشت وہماں بر سر جور است گویند بتاں راکہ وفا نیست چرا نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ چاہتا تو میرا محبوب بھی یہی ہے کہ میں مر جاؤں۔ مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہتا۔ کہ ایسا نہو یہ سن کے میں خوشی سے جان دیدوں۔ کیونکہ اس کو میرا مرنا گوارا ہے مگر خوشی سے مرنا گوارا نہیں۔

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی نگوید ار چہ بمرگ من آرزومند است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب اگر میں التفات کے قابل نہیں ہوں تو نہ سہی۔ آرزو اور تمنا تو کرنے دیجئے۔ آپ تو جانتے ہیں غریب مفلس آدمی کی خوشی کیمیا سازی پر مبنی ہوتی ہے ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ سونا بنائیں۔ مگر عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں بنا سکتا۔ ایسے ہی میری آرزوئیں ہیں۔

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس بات کا بالکل اطمینان ہے کہ جہنم کو ہمارے جلانے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ غم ہمکو روز گھلاتا جا رہا ہے۔ لہٰذا آخر عمر تک گھل جائیں گے۔ اور جہنم تک جانے کا قصہ ہی نہ رہے گا۔

نیست وقتی کہ بما کاہشے از غم نرسد نوبت سوختن ما بہ جہنم نرسد

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کیا تم اس بات سے ڈرے جاتے ہو کہ میں حشر کے دن داور حشر کے سامنے شکایت کرنے بیٹھوں گا۔ یہ سب تمہارا خیال ہے۔ ہجوم نالہ کی وجہ سے اتنی بھیڑ ہوگی کہ میرے لب سے ایک نالہ بھی نہ نکل سکیگا۔

زمن مترس کہ ناگہ بہ پیش داور حشر ہجوم نالہ لبم را ز نالہ وا دارد

ایک جگہ زاہد یا اپنے کسی دوسرے ہم نشین سے کہتے ہیں کہ بھائی صاحب شیطان سے آپ ڈرئیے۔ آپ کے پاس دین و ایمان ہے۔ ہمارے پاس نہ دین ہے نہ ایمان ہمیں خوف و فکر کی کیا ضرورت۔

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو رہزن چو نبود توشۂ راہے چہ باک از رہزنم باشد

ایک جگہ ناصح سے کہتے ہیں کہ بابا کیوں تو میرے سر ہو گیا ہے۔ میں کافر ہو گیا ہوں تو کیوں برا سمجھتا ہے۔ ذرا ابراہیم کو دیکھ

انھوں نے بھی تو دین آذری کو ٹھکرا کر ملت ابراہیمی جاری کر دی تھی۔ بات یہ ہے کہ جو اہل نظر ہیں وہ پرانی لکیر کے فقیر نہیں رہتے ہیں۔

بامن میاویز ای پدر فرزند آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ایک جگہ بتاتے ہیں کہ یہ جو صحرا میں ہم ہر خار پر اپنا خون دل چھڑک رہے ہیں یہ بیکار نہیں ہے۔ ہم فن باغبانی صحرا کی ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

ایک جگہ منصور کے دار پر چڑھنے کے واقعہ کو اس شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ جو واحد کو واحد ہی کہتے اوس کا انجام تو یہ ہوتا ہے جو منصور کا ہوا۔ اور جو دو کہتے ہیں ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے

منصور فرقۂ علی اللہ‌یاں چہ بود در داست خطر ز ہمنشیناں چہ بود
چوں عاقبت یگانہ بیناں دار است دریاب کہ انجام دو بیناں چہ بود

آپ کے ایک دوست مرزا الف بیگ کی پیرانہ سالی میں لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے ہمزہ بیگ اوس کا نام رکھا۔ مرزا نے مبارکباد کا یہ قطعہ لکھکر بھیجا۔ جس میں توجیہ کی ایک ایسی ظرافت کی گئی ہے کہ شاید مرزا کے سوا اور کہیں جگہ نہ ملے۔ عربی میں الف کو بھی ہمزہ ہی کہتے ہیں۔ اسی کو مد نظر رکھ کر مرزا کہتے ہیں کہ الف بیگ کے لڑکے کا نام ہمزہ بیگ کیوں نہ ہوتا۔ الف جب متحنی ہوتا ہے تو ہمزہ کہلاتا ہے۔ الف کا منحنی ہونا الف بیگ کے بڑھاپے کی اولاد پر بہترین روشنی ڈال رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ باپ کے خصوصیات بیٹے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

چوں الف بیگ در کہن سالے پسرے یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے الف منحنی بود ہمزہ

ولیعہد رام پور کی جب شادی ہوئی تو نواب یوسف علی خاں کے حضور میں مرزا نے بھی ایک تہنیت کا قطعہ لکھکر گزرانا۔ جس میں سے یہ دو شوخ شعر قابل انتخاب ہیں۔ جن میں فرماتے ہیں کہ خدا کرے ہر ضرورتمند کو اُس کی ضرورت کے موافق ملے۔ اور مجھے دو چار شراب کی بھری بوتلیں مبارک ہوں

بطالبان زر و سیم و زر فرخ بسائلاں تہی کاسہ ناں مبارکباد
بمن کہ تشنہ لب بادہ ہائے پر زورم از انمیاں دو سہ رطل گراں مبارکباد

کسی سے کوئی سوال کرنا۔ کچھ مانگنا۔ اپنی حاجت کا اظہار کرنا عیب ہے۔ مگر نہ اس طرح جیسے کہ مرزا کوئی سوال

کرتے ہیں۔ مگر مرزا یوں سوال کر رہے ہیں۔ کہ ساقی تجھے معلوم ہے میں پشنگ اور افراسیاب کی اولاد سے ہوں اور اس طریقہ سے تو نے سمجھ ہی لیا ہوگا کہ میں جمشید کی اولاد میں ہوں۔ لہذا مجھے میراث جمشید ملنا چاہیے۔ شراب جو جم کی طرف سے وراثتاً مجھ کو پہونچتی ہے وہ اب دے دے۔ اس کے بعد بہشت تو مل ہی جائے گی۔ کیونکہ میں آدم کی اولاد ہوں اور بہشت آدم کی میراث ہے۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است

میراث جم کہ میست الکنوں بمن سپار
زاں پس بہشت کہ میراث آدم است

پنشن کے بند ہوتے پر مرزا نے جتنی جتنی کوششیں کی ہیں اوس کا حال اون کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں لیا۔ ہر دوست آشنا کو لکھا۔ جب حکام بالا تک۔۔۔۔ یہ معاملہ گیا تو لندن میں اپنے کسی انگریز دوست کو اس معاملہ کی طرف یہ لکھکر توجہ دلائی کہ جہاں تک جلد ممکن ہو میرا یہ کام کر دیجئے۔ اسی عرضداشت میں ممدوح یا مکتوب الیہ کی مدح۔ اپنی بدنصیبی کا نہایت خوش اسلوبی سے یہ لکھکر بیان کر دیا ہے۔ کہ جناب جو کچھ کرنا ہے جلد کیجئے۔ اور کہیں میرے اس کہنے سے بدگمان نہ ہو جائے کہ مجھپر بھروسہ نہیں کیا ہے۔

بالتفات تو صد گونہ اعتمادم ہست
ولے شتاب کہ بر عمر اعتمادم نیست

نواب یوسف علی خاں مرحوم سابق والی رامپور کو جب گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ریاست عطا ہوئی تو مرزا نے مبارکباد کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ کچھ دے ڈالئے، میرا مطلب خلعت ریشمی نہیں حریر نہیں ایک کمبل ہی سہی۔

مقصود از لباس ہماں پوشش تن است
پوشش گر از حریر نباشد گلیم باد

معشوق سے آنے کی التجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا اگر تو میرے انتظار کا یقین نہیں کرتا تو نہ کر لڑنے کے لئے چلا آ۔ بہانے نہ کر ؎

زمن گرت نبود باور انتظار بیا
بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

ایک جگہ معشوق کو بلانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ کہتے ہیں ہاں صاحب ٹھیک ہے میں کہتا ہوں کہ پھول گلشن میں بہت عمدہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں بحث کیا ہے۔ آپ غصہ میں باہر چلے آئیے اور آکر مجھ سے لڑئیے۔

بے پردہ شور غصہ و الزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش است بہ گلشن دریں چہ بحث

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمھیں آنا چاہیئے۔ غیر کے گھر کی طرف سے نہ آؤ تو دوسرے رستہ سے آؤ۔ مگر آؤ ضرور۔ تم نے کہا تھا کہ تجھے بلاتا نہیں۔ میں تمھاری موت ہوں۔ اچھا اب اپنے قول پر قائم رہو۔ میں نہیں بلاتا ہوں موت کی طرح بے بلائے چلے آؤ۔

اے دوست بسوے ایں فرو ماندہ بیا | ز انکو بہ غیر راہ گردانندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام | برگفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

شعرا کی دعا سراپا مبالغہ اور سراسر اغلاق و غلو میں ڈوبی ہوئی ہوا کرتی ہے۔ مگر مرزا نے کہیں کہیں اس روش کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور نہایت سادگی کی کوشش کی ہے۔ اس میں اگر ان کی کوئی کاوش ہے تو یہ... کہ اُن کی ظرافت اور ہلکی ہلکی شوخی سنبھلنے پائے۔ نواب یوسف علی خاں کی مدح میں جو ایک قطعہ کہا ہے اوس میں دعائیہ شعر یہ لکھا ہے ؎

ہر دم ترا بخلوت راز و بہ بزم انس | روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

مرزا کی سوگوارانہ زندگی پر نظر دوڑانے والے پہلی ہی نظر میں اُن کی برگشتہ بختی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کے مصائب حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مگر اس انداز کمال کو دیکھئے کہ مرزا جہاں کوئی اس قسم کا واقعہ بیان کرتے ہیں اسکو اس طرح رنگ دیتے ہیں کہ اس میں حزن و ملال...... کے پہلو ہی میں ایک نشاط آمیز تصویر بھی بنا دیتے ہیں۔

ایک قطعہ میں اپنی بدنصیبی کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں۔ کہ میاں غالب آخر یہ بات کیا ہے کہ تم آج کل اسقدر مفلس و محتاج ہو رہے ہو۔ نہ کھانے کا سامان ہے نہ پینے کا۔ نہ کہیں سے پیسہ ملتا ہے نہ ٹکا نہ کوئی اپنوں سے نفع پہونچتا ہے نہ بیگانوں سے۔ جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا رزاق ہے اور بندوں کے رزق کا کفیل ہے پھر آخر تمھیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نہ تو خدا بخیل ہے۔ اور نہ آپ ابھی مر ہی گئے ہیں۔ تو یہ کیا قصہ ہے۔ کہ تم قوت لایموت کے لئے بھی محتاج ہو۔ کچھ نہیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عرصے تمھارا آب و دانہ اٹھا لیا جا چکا ہے اور تمھارے مار ڈالنے کا حکم اللہ میاں کے یہاں سے جاری ہو چکا ہے۔ فرشتۂ رزق بالکل بے خطا ہے اگر تمھارا رزق ہوتا تو ضرور تم کو پہونچتا۔ مگر فرشتۂ موت حضرت عزرائیل۔ خدا انھیں زندہ رکھے کچھ ڈھیل ڈال رہے ہیں۔ اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ مکمل قطعہ ملاحظہ فرمائیے

آیا زیاں زدہ غالب کہ از جدا لعنت | نمی رسد بتو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم است کہ پروردگار تا دم مرگ | بود برزق ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری تو رازسیاہ و سپید | چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل
فتادہ در سر ایں رشتہ عقدۂ در نہ | نمردۂ تو و نے رازق العباد بخیل
زچند سال بمرگ تو و تباہی رزق | شد است حکم خود از پیشگاہ رب جلیل
فرشتۂ کہ وکیل است بر خزائن رزق | نکرد ہیچ توقف برزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد | روا نداشت درا ہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفۂ کنم از قول شاعرے تضمین — کہ در لطیفہ مراد از کسے نبود عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز — ہزار مشت زند بردہان عزرائیل

ایک جگہ اپنی بیکسی اور تنہائی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے دربان اور چوکیدار

ماندہ ام تنہا کنج از دو رباش اہل صبح — خانہ دارم کہ پندار زند دربانش منم

ایک جگہ اپنی بہشت کا حال بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ہمارے بہشت میں اگر کوئی پھلنے پھولنے اور بڑھنے والا درخت ہے تو دوزخ کا زقوم ہے۔

نو رخیز دراں کہ خواہش تن پدید کرد — صرف زقوم دوزخ است نخلیہ در بہشت ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے غم و رنج نے ہمیں ہر طرح سے تباہ کیا۔ ایک طرف تو خاص لوگوں کے عیش و عشرت نے تباہ کیا دوسری طرف عوام کی آزادی اور فارغ البالی نے

غالب غم روزگار نا کام کشت — از تنگی دل بحلقۂ دوام کشت
ہم غیرت سرہ رزگی خاصم سوخت — ہم رشک نشاط مندی عامم کشت

اسی طرح کی یہ رباعی ہے اور اس میں بھی وہی شوخی بیان موجود ہے کہتے ہیں۔ کہ ساقی روز ازل نے میری قسمت کے پیمانہ میں زہر ہی زہر بھرا ہے کسی طرح چین نہیں ہے تو سعادت و نحوست کو لئے پھرتا ہے۔ یہ سب فضول ہے مجھے سعادت نے بھی مارا اور نحوست نے بھی۔

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر — ریزد ہمہ دُرد دور و تلخابۂ زہر
بگزر ز سعادت و نحوست کہ مرا — ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

جن لوگوں نے مرزا کا یہ شعر پڑھا ہوگا ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ یقینی واقف ہوں گے کہ شکوہ و شکایت میں مرزا کا کیا درجہ ہے۔ اور کس پایہ کے خیالات اون کی شکایتوں میں مخفی ہیں۔

مثنوی "ابر گہر بار" میں ان کے مناجات کا وہ حصہ جہاں خدا سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔ غالب کا شاہکار شوخ بیانی ہے

قیامت قائم ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ نہ کوئی کسی کا یار ہے نہ غمگسار ہے۔ میزان عدل قایم ہے لوگوں سے

نامۂ اعمال وزن کئے جا رہے ہیں۔ کسی کا نیکی کا پلہ بھاری ہے۔ کسی غریب کی بدیاں نیکیوں پر غالب ہیں۔ مآل کار پر نظر تصویر حیرت بنا ہوا کھڑا ہے۔ غرض کہ یہ ہنگامہ ہے اور اسی ہنگامۂ دار و گیر میں مرزا صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ بارگاہ کبریائی سے حکم ہوتا ہے۔ کہ اس بندے کے بھی اعمال تو لو۔ مرزا سنتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں۔ کہ نامۂ اعمال میں بجز بدی کے کیا رکھا ہے۔ اور اس سے رسوائی کے سوا کیا نتیجہ ہے۔ بڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بار خدایا مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہو یہ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے مولا۔ میں تیرا ایک بے بضاعت نالائق بندہ ہوں۔ میری خطائیں معاف کر۔ اور اعمال کے تولنے کی زحمت نہ فرما۔ اس کے تولنے میں کیا رکھا ہے۔ اور خواہ مخواہ میرے داغ ہرے ہوں گے۔ اگر ایسا ہی ضرور ہے تو میرے رنج و غم کو تول لے۔ میرا سرمایۂ عمر تو سوائے رنج و غم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور اب اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ وہ تو جو کچھ کیا دھرا ہے تیرا ہی ہے۔ جو رنج دئے ہیں تو نے ہی دئے ہیں۔ حسرت سے تو نے مجھے پیدا کیا اور اوسی سے میرا خمیر کیا۔ میرے لئے خود میرا دم سرد زمہریر کی برابر ہے تو پھر کیا اب مجھے دوزخ میں ڈالنے اور عذاب دینے کی فکر کررہا ہے۔ اور اگر ایسا ہی عذاب دینا منظور ہے۔ تو پھر اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تو سمجھ لے حساب کتاب ہوگیا۔ اور مجھے دوزخ میں بھیجدیا۔ اور اگر تو یہ نہیں مانتا ہے۔ اور میرا حساب وکتاب ہونا ہی ضروری ہے تو پھر مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ معاف کیجئے۔ میں بہت عاجز ہو چکا ہوں۔ اور جب آپ کو بغیر کہے ہی سب خبر ہے تو پھر نہ کہنے کے کیا معنی۔

سنئے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کافر نہیں ہوں۔ آتش پرست نہیں ہوں۔ سورج کو میں نے کبھی نہیں پوجا۔ کسی کو مار انہیں کہیں ڈاکہ نہیں ڈالا۔ البتہ اس سے مجھے انکار نہیں کہ شراب پی اور ضرور پی۔ لیکن اس طرح کہ خود مجھے اس پر شرم آتی ہے۔ اگر شراب ہی کا حساب وکتاب کرنا ہے تو جمشید۔ بہرام۔ پرویز وغیرہ سے حساب کیجئے کہ پیتے تھے اور مزا کرتے تھے۔

میں کیا اور میری مے نوشی کیا۔ یہ بھی کمبخت مستقل عذاب تھا۔ جب پی بھیک مانگ کر پی۔ چہرہ پر کالک لگائی اور پڑ رہے۔ نہ کوئی باغ۔ نہ شراب خانہ۔ نہ کوئی گانیوالا موجود۔ نہ کوئی معشوق۔ نہ ناچ نہ رنگ۔ نہ گوئیے نہ ساز نہ نے۔ یہ بھی کوئی مے نوشی تھی۔

میں نے زندگی تو گزار ہی دی۔ مگر کیا بتاؤں کہ کیسی کیسی مصیبت سے گزاری۔ مہینے کے مہینے عشق و محبت میں کاٹے اور سال کے سال بے پئے گزارے۔ ہائے کوئی مجھی سے پوچھے جب ساون بھادوں کی گھٹائیں جھوم کر آتی تھیں۔ اور میرا پیالہ شراب سے خالی ہوتا تھا۔ دنیا بھر سبزۂ خودرو کی بہار سے مست کیف عشرت تھی۔ اور میں اپنے گھر کا دروازہ بند کئے پڑا رہتا تھا۔ زمانہ بھر میں پھول کھلے ہوتے تھے۔ دنیا راگ رنگ میں سرشار رہتی تھی۔ اور میں غم زدہ اپنے حجرہ میں پڑا رہتا تھا۔

اگر اتفاقیہ طور پر کبھی شراب ملی تو پیالہ نہ ملا۔ اور پیالہ ملا تو شراب نہ ملی۔ کیا اس سے آلودہ گردش کی گردش کو دیکھتا ہے۔ میرے جسم کو دیکھ کہ خمار کے مارے انگڑائیاں لیتے لیتے کمان بن کے رہ گیا ہے۔

ہمسایوں نے میرے ساتھ بدسلوکیاں کیں۔ تیمارداروں نے مجھے فریب دیئے۔ بے مایہ اور کم حیثیت لوگوں سے مجھے سوال کرنا پڑے۔ عمر بھر بینوا مجھے رہنا پڑا۔ نہ میرے زمانے میں کوئی ایسا بادشاہ بنایا کہ ظہوری کی طرح مجھے انعام دیتا۔ اور میں اس کو فقیروں اور مسکینوں کو تقسیم کر دیتا۔ نہ تو نے مجھے کوئی ایسا معشوق دیا کہ میں اس کے ناز اٹھاتا اور خوش ہوتا۔

اب کیا کہوں کہ کیا کیا مصیبتیں میں نے اٹھائی ہیں اور کیا کیا آفتیں مجھ پر پڑی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بہشت میں بھی میرا جی نہ لگے گا۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ جو شخص بہشت کو بھی کچھ نہ سمجھے اسے دوزخ میں بھیجنا کہاں تک جائز ہے۔

فرض کیجئے آپ نے مجھے جنت بخش دی۔ مگر جنت سے ہوتا کیا ہے۔ اور جنت میں وہ باتیں کہاں مان لیجئے کہ صبوحی کے طور پر صبح کے وقت شراب طہور پی۔ تو بلوریں جام اور زہرۂ صبح کہاں۔

معشوق کے بدلے حور ہے۔ مگر نہ اس نے غم ہجر کا لطف آ سکتا ہے نہ ذوق وصل پورا ہو سکتا ہے۔ وہ جو دنیاوی معشوق ہمارے اور پر ایک بوسہ کے بدلے ہزاروں احسان لاد دیتے تھے وہ جن کے وصل کے انتظار میں برسوں ہم کو گزارنا پڑتے تھے۔ وہ جو ہم میں اور ہمارے معشوق میں کشاکش ہوتی تھی۔ ہم کھینچتے تھے اور وہ بھاگتا تھا۔ وہ جو ہم کو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر فریب دیا جاتا وہ سب اس نیک بخت حور میں باتیں کہاں ہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے جو بات کہی مان لی اور کچھ تلخ بات نہیں کہی۔ جو حکم دیا بجا لائی۔ یہ بھی کوئی حسن کا انداز ہے۔ جنت نام کی جنت ہے۔ یہاں نظربازی کا لپکا کہاں۔ یہاں ذوق دیدار کہاں۔ یہاں دیوار میں روزن کہاں کہ جھانک جھانک کر نظارۂ جمال سے شادکام ہوں۔ نہ یہاں کوئی دلالہ کہ پیغام سلام لے جائے۔ نہ یہاں کسی راہ پر کالہ کی آرزو۔

اے میرے خدا یہی ساری باتیں تھیں جن کو ہمیشہ دل چاہتا تھا اور کبھی پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اب تو میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو میں ہر گناہ کے مقابلہ میں ایک حسرت پیش کروں گا۔ پھر بھلا تو ہی بتا کہ جب گناہوں سے زیادہ میری حسرتیں ہوں گی تو کیونکر کام چلے گا۔ اور اس کا کیونکر حساب ہوگا۔ فارسی میں ان کے اشعار اس مضمون کے ملاحظہ ہوں۔

بدوش تر ازو منہ بار من ؛ نسنجیدہ بگزار کردار من
اگر دیگراں را بود گفت و کرد ؛ مرا مایۂ عمر رنج است و درد

مرا نیز یارائے گفتار دہ چو گویم براں گفتہ زنہار دہ

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی نبردم کسے مایہ در رہزنی
گرے کہ آتش بگورم ازوست بہنگامہ پرواز مورم ازدست
حساب مے و رامش و رنگ و بوے زجمشید و پرویز و بہرام جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستانسرائے نہ میخانہ نہ دستانسرائے نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط نہ غوغائے رامشگراں در رباط
شبانگہ بمی رہنمونم نشدے سحرگہ طلبگار خونم شدے
تمنائے معشوقہ و بادہ نوش تقاضائے بیہودہ مے فروش

چہ گویم چو ہنگام گفتن گزشت زغم گرا تمایہ بر من گزشت
بسا روزگاران بدلدادگی بسا نو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باران و شبہائے ماہ کہ بود ست بے مے بچشمم سیاہ
افقہا پُر از ابر بہمن مہی سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں و من در غم برگ و ساز در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بو و رنگ من و حجرہ و دامنے زیر سنگ
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست وگر یافتم بادہ ساغر شکست
چہ خواہی ز دلق مے آلود من ببیں جسم خمیازہ فرسود من

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد بہر بار زربیل بارم دہد

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم　　بہر بوسہ زلف درازش کشم

ہنوزم ہمانا دل بگوش اندر است　　زدل بانگ نوشم بگوش اندر است
چو آں نامرادی بیاد آیدم　　بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلے نہ کہ کمتر شکیبد بباغ　　در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور　　کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرو ہائے مستانہ کو　　بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش　　چہ گنجائی شورش نائے و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا　　خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش کہ چہ　　غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار　　چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ ایش کجا　　فریبد بہ سوگند و نیش کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو　　بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند دلالۂ　　نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل　　ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

بہر جرم کز روے دفتر رسد　　زمن حسرتے در برابر رسد

بغزلئے کیں داوری چوں بود　　کہ از جرم من حسرت افزوں بود

شراب کے متعلق مرزا کے یہاں اتنے شعر پائے جاتے ہیں کہ اگر سب شعر جمع کئے جائیں تو شاید اُن کی تعداد خیام وحافظ کے شعروں سے کم نہ رہے۔ مگر ہمارا یہاں نہ یہ مقصد ہے کہ ہم خیام وحافظ کے ساتھ مرزا کے اشعار کا مقابلہ کریں۔ اور نہ فلسفہ خمریات سے بحث کرنا مقصود ہے۔ بلکہ ہم چند ایسے اشعار شراب کے متعلق جنکر پیش کرتے ہیں

جن میں ایک قسم کی ہلکی اور لطیف ظرافت موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم سے شراب پلانے کا وعدہ حشر کے لئے کیا گیا ہے۔ ادہر وعدہ کرنے والا شاید یہ سوچتا ہوگا کہ یہ وعدہ ہم کو بہت ہی گراں گزرے گا۔ اور ہم اس طول مدت سے گھبرا جائیں گے۔ مگر ہم کو اس سے اور زیادہ خوشی ہے اس لئے کہ شراب جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اور بھی لطیف ہوتی جاتی ہے سہ

گفتی زمی بحشر و رنجم ازیں درنگ　　مستی دہد زیادہ چو صہبا کہن شود

ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ عید کا دن ہے خوشحالی اور سرور و خرمی کا دور دورہ ہے۔ پی اور خوب جی بھر کے پی۔ کیا تو گناہ سے ڈرتا ہے۔ اچھا یہی بات ہے تو گناہ میرے ذمہ رہا۔

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام است　　می نوش گنہ بر من اگر بادہ حرام است

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شراب بھی کیا کوئی روزہ ہے جو آج کے دن حرام ہے

عید است و صلائے خورد و نوش است بہ عالم　　می روزہ نباشد کہ دریں روز حرام است

ساقی سے کہتے ہیں کہ یہ تو تجھ کو معلوم ہی ہے کہ شراب صرف اندازہ سے پینا حرام ہے۔ بے اندازہ حلال ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ تو اٹھ کر اپنا شیشہ ہمارے پیمانہ پر پٹک دے۔

می باندازہ حرام آمدہ ساقی ورنہ　　شیشہ خود بشکن بر سر پیمانہ ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جتنی ہو بس اس کو آج ہی چڑھا جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ شریعت ہم کو یہی خبر دیتی ہے کہ شراب آج پانی ہے۔ مگر کل یہ آگ ہو جائے گی سہ

پاک خور امروز دز نہار از پئے فردا منہ　　در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اس جنگ و جدل کو چھوڑ کہاں کے فضول جھگڑوں میں پڑا ہے میخانہ کی باتیں کر کیونکہ وہاں نہ جنگ جم کی باتیں ہوتی ہیں اور نہ کوئی فدک کا جھگڑا لے کر بیٹھتا ہے

بحث و جدل بجا گزار میکدہ جوئے کاندراں　　کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب پی اور خدا کے کرم پر بھروسہ رکھ کیونکہ خط پیالہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنی پینی چاہئے۔ کب پینی چاہئے۔ کیونکہ پینی چاہئے مطلب صرف پینے سے ہے پئے جا۔

می نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن　　خط پیالہ را رقم چون و چند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بس برسات صرف ان تین باتوں کے لئے آتی ہے۔ اور اس موسم کے پیدا کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ شراب چڑھائے۔ آم کھائے۔ اور برف کا شربت پئے۔

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگال　　غیر از شراب و انبہ و برفاب قند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ابر کرم کا مشغلہ بس اتنا ہی ہے۔ کہ جن لوگوں کے خرقے پر شراب کے داغ ہوں انھیں دھو دیا کرے ؎

شست و شو مشغلہٴ شوخی ابر کرم است دزم آں خرقہ کہ با داغ نبیا سود ن رفت

معشوق کو ہدایت کرتے ہیں کہ روزہ کے مہینے میں زلفیں کھولے ہوئے تو پریشان ہو کر کیوں پھر رہا ہے۔ مزہ کر شراب پی۔ کہ آج زمانہ میں تیری زلفیں پریشان ہونے کی وجہ سے یا تیرا چاند سا چہرہ دیکھنے سے عید کی چاند رات ہو رہی ہے۔

در ماہ روزہ طرہ پریشاں چہ میروی مے خور کہ در زمانہ شب بودہ است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بھئی اب ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اتنی دور جائیں اور گھڑا بھر کر شراب لے کر واپس آئیں۔ ہمارا مکان تو بس میخانہ کے قریب ہی بننا چاہیے تھا۔

بر نتابم سبو بادہ ز دور آوردن خانہٴ من بسر کوے مغاں میبایست

ایک جگہ یوں منادی کرتے ہیں کہ بھائیو ولایتی شراب آگئی ہے اور بہت سستی ہو گئی ہے۔ ایک دین کے عوض ایک گھونٹ ملتی ہے۔ خرید و دوڑو۔ دیکھو بہت سستی ہے شاید پھر نہ ملے

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است جرعہ را دین عوض آید مے ارزاں شدہ است

آپ کعبہ میں ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں۔ کہ ہے کوئی خدا کا ایسا نیک بندہ جو کعبہ میں ہمیں بھرا ہوا شراب کا ایک پیالہ پلائے۔ ضمانت کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم جامہٴ احرام گرو رکھ سکتے ہیں۔

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد ور گروگاں طلبد جامہٴ احرامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ بغدادی کون ہے اور بسطامی کون ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حسینان نازنین تاتار سے آتے ہیں۔ اور شراب لندن سے آتی۔

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار ماندانیم کہ بغدادی و بسطامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ خلوت میں جو روزانہ دوست کے ساتھ شراب پیتا رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح حور اور کوثر اور بہشت کی حقیقت کو جانتا ہے اور اس شعبدہ بازی کا حال سب اوس پر کھلا ہوا ہے۔ یا یہ کہ اس کا لطف اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

اسی غزل میں کہتے ہیں۔ آج کل میاں غالب شراب کا نرخ دریافت کرتے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ مصحف اور خرقہ کہیں بک گیا ہے۔

از کاسہٴ کرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیبہٴ کاس کرام چیست

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخ مے لالہ فام چیست

ایک جگہ کہتے ہیں شراب سب کو ایک ہی سبو سے ملتی ہے۔ مگر قسمیں سب کی الگ ہیں۔ جمشید جام جم میں پیتا ہے۔ اور قلندر اپنی تونبی میں

از یک سبو است بادہ و قسمت جدا جدا است جمشید جام برد و قلندر کدو گرفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب جو بہشت میں گیا داروغہ بہشت نے شیر و شہد سے تواضع کی اس غریب نے کہا کہ معاف فرمائیے یہ نہیں ہمیں تو شراب چاہیئے۔

رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی بہار برسات ہے۔ خیر خدا کا شکر ہے یہاں بھی شراب پینے کا ایک موسم ہے

بہار ہند بود برشگال ہاں غالب دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب سے جو منع کرتے ہیں اس کی وجہ معلوم ہے یا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ اور یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر اس میں آیا ہے اسقدر بلیغ ہے کہ سیکڑوں ظرافت آمیز معنے اس میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

ایک جگہ کہتے ہیں کہ نہ معلوم مجھے لوگ شراب پینے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں کوئی محدث اور فقیہ تو ہوں نہیں کہ میری ثقاہت کو شراب نقصان پہونچائے گی۔ میں تو شاعر ہوں شاعر کو شراب سے کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔

بادہ گر بودم میل، شاعرم نہ فقیہ سخن چہ ننگ آلودہ دامنی دارد

اسی غزل میں کہتے ہیں کہ ہم میکدے میں آئے ہیں تو ساقی بھاگا جاتا ہے۔ ہم اپنے جی میں خوش ہیں۔ کہ ہماری بڑی تعظیم ہو رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ شراب رہی نہیں ہے ساقی صرف اس بزرگ داشت پر ہم کو ٹالنا چاہتا ہے۔

خوشم ببزم ز اکرام خویش و زیں غافل کہ مے نماندہ و ساقی فروتنی دارد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ یہ بے مزے واعظ سمجھے ہیں کہ جنت میں حوریں ہیں کوثر ہے کیونکہ اسی کی خبر دی گئی ہے اور احمق یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ حور و کوثر فقط ایک استعارہ ہے شراب و شاہد کا کھلم کھلا نام لینا منع ہے۔ ان کو صرف یہ نام لیکر کام میں پھنسا دیا ہے باقی مطلب وہی شراب و شاہد ہے۔

گفتند حور و کوثر و دادند ذوق کار منع است نام شاہد و مے آشکار برد

ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ میں توبہ کر کر اکے مسجد میں آگیا تھا۔ اپنے ذوق عبادت میں مصروف تھا۔ ساقی آیا اور ہنس کر کہا کہ کیا تسبیح لے کے بیٹھا ہے۔ آجکل شرابخانہ میں طرح طرح کی شرابیں آئی ہیں۔ بس یہ سنکے میرے منھ میں پانی بھر آیا۔

اور تسبیح و مصلےٰ چھوڑ کر پھر میں میخانہ میں آگیا۔ اب جو یہاں آ کے دیکھا تو یہ سب فریب تھا۔ یہاں ایک دو ساغر سے زیادہ موجود نہیں ہے۔

ساقی دگرم بُرد بے خانہ ز مسجد　　کیکدو قدح بود و فریبم بہ سبو داد

ایک جگہ واعظ سے کہتے ہیں۔ کہ ہمیں تو صرف شراب کا ایک مٹکا بھر کے بھیجدے باقی پھر تو چاہے جتنے دودھ کے دریا بہائے جا ہمیں اور پرہیزگاروں کو فریب دیئے جا

خمی از مے بہ مالو فرست و آنگہ ہر قدر خواہی　　رواں کن جوئے از شیر و دل از پرہیزگاران

کہتے ہیں کہ روزہ داروں کے اوپر بڑا رحم آتا ہے عید کے دن بھی غریب شیر و خرما میں مست ہیں بھلا اس شیر و خرما میں شراب کا لطف کہاں۔ بھئی خدا کے لئے کوئی بیچاروں کو ہمارے نشاط میں سے تھوڑا سا حصہ پہونچا دو

ندارد شیر و خرما ذوق صہبا رحم مے آید　　نشاط عید ابنا ہے بہ سوی روزہ داراں کن

ایک جگہ کہتے ہیں کہ کیا کہنا ہے کوثر اور کوثر کی شراب مقدس کا۔ مگر ہمارے خمار میں وہ کام نہیں آسکتی بس اتنی ہی خرابی ہے۔

خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در وست　　از ان رحیق مقدس درین خمار چہ حظ

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سنو بھئی غالب خیر یہ تو منظور ہے کہ ہم تم کو میخانہ کے پاس ہی کہیں رہنے کے لئے جگہ دلوا دیں گے مگر شرط صرف یہ ہے کہ صرف سونگھنے پر قناعت کیجئے پینے کو نہیں ملے گی۔

ترا بہ پہلوئے میخانہ جا دہم غالب　　بشرط آنکہ قناعت کنی ببوئے رحیق

ایک جگہ کہتے ہیں کہ دوزخ اور کوثر میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ میرے سینہ میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی اور میرے ساغر میں بھی ایسا ہی پانی تھا۔

تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں　　آتشے در سینہ و آبے بہ کوثر داشتم

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم ذمی ہیں۔ یعنی وہ کافر ہیں کہ جنھیں بادشاہ نے پناہ دی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے اب اگر ہم رمضان کے مہینے میں بازار میں بیٹھ کر پئیں تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں کرسکتا

من کافر زنہاری شاہم بہ من ارزد　　مے در رمضان بر سر بازار کشیدن

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جنت مل بھی گئی تو کیا لطف اور وہاں شراب بھی پی تو کیا نتیجہ۔ نہ تو بادۂ طہور میں محتسب کا غم۔ اور نہ اس عیش میں اندیشۂ زوال۔ پھر وہ شراب کس کام کی۔ اور اس عیش کا کیا مزا۔

در بادۂ طہور غم محتسب کجا　　در عیش خلد لذت بیم زوال کو

کہتے ہیں کہ حشر میں میری حسنات کا جائزہ لیا گیا تو سوائے ایسے روزوں کے جو شراب سے کھولے گئے تھے، ایک

نکی بھی نہ ملی۔

خجلت نگر کہ در حسنات م نیافتند جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب چاندنی رات ہے شراب پیو۔ اچھا یہ تو چاندنی رات ہے۔ فرض کیجئے کہ رمضان ہوتا تو کیا کرتے کیا یوں ہی خاموش بیٹھے رہتے۔

غالب سر خم بکشا پیمانہ بہ می در زن آخر نہ شب ماہ است گیرم رمضانستے

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم شہر عدم کے اطراف کے رئیس زادہ ہیں۔ عنقا کے انڈے ہمارے یہاں کے موتی ہیں۔ شوخی یہ ہے کہ عنقا خود معدوم ہے۔ لہذا اس کا انڈا بھی معدوم ہے۔ یعنی ہمارے پاس کچھ نہیں۔

محتشم زادۂ اطراف بساط عدمیم گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم پیاسے مسافر ہیں سفر کرتے کرتے دریا پر پہونچے اور بھوک کے مارے پانی پینے کے لئے دریا میں کود پڑے اب ہمارا نشان یہی ہے کہ ہمارا توشہ دریا کے کنارے رکھا ہوا ہے۔ اور ہمارا کہیں نشان بھی نہیں۔

بہر و لفتۂ در رفتہ بہ آبم غالب توشۂ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

ایک جگہ پیر مغاں کے ہاتھ جوڑ رہے ہیں قدموں میں سر رکھتے ہیں۔ خدا کے واسطے دیتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں کہ للہ ہماری خطا معاف فرما دیجئے۔ ہم نے احرام مستی میں باندھ لیا تھا۔ آپ بیکار ناراض ہو گئے۔

بیگناہم پیر دیرا ز من مرنج من بمستی بستہ ام احرام را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ آج کل میں ہمارا معشوق ہمارے پہلو میں بیٹھنے والا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کو اپنے امتحان پاکبازی کا دھوکا دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ذرا دیکھئے تو ہم کو آزمائیے تو ہم بڑے پاکباز ہیں۔ اور اتفاق سے وہ ہمارے فریب میں آگیا ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے آزمانے کے لئے ہمارا پہلو گرم کرنے والا ہے۔ اور وہ بھی خلوت میں۔

بخلوت می دہد نزدیکی یار است پہلو را فریب امتحان پاکبازی دادہ ام اورا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں ایک مسافر راہ نورد ہوں۔ اور حالت یہ ہے کہ تاریک رات ہے منزل دور ہے۔ راستہ میں کہیں کسی مسافر کا نقش قدم نہیں۔ سخت مصیبت ہے۔ وہ تو کہئے کہ کبھی کبھی جو میں شراب پی لیتا ہوں۔ اوس سے ایک بجلی سی چمک جاتی ہے اور دس بیس قدم چل لیتا ہوں ورنہ راہ قطع کرنا میرے لیے نہایت دشوار تھا۔

جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے شراب کے مضمون کو اس شوخی بیان کے ساتھ کسی نے نہیں کہا۔

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا الا گم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

ایک جگہ بطریق تجرید کہتے ہیں۔ کہ کیا کہا جائے عجب دیوانے سے ہمارا واسطہ پڑ گیا ہے۔ غالب نہ تو مسلمان ہے، اور نہ کافر ہے عجب گوگو میں ہیں کہ آخر ہم اس سے کیا کہکر خطاب کریں۔

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں بادشاہ کا وہ غلام ہوں جو کھاتا زیادہ ہے کام کم کرتا ہے۔

در پرستش سستم و در کار جوئی استوار بادشہ را بندۂ کم خدمت پرخوار ہست

ایک جگہ بتوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔ کہ اے بتو خدا کے لئے جلدی غالب کو راضی کر لو۔ سنا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کو پھرتا ہے۔ اگر کہیں سچ مچ مسلمان ہو گیا۔ تو پورے بتخانے کی آبرو پر پانی پھر جائے گا۔

خدارا ای بتاں گردو لش گردیدنی دارد دریغا آبروئے دیر گر غالب مسلماں شد

اللہ میاں سے کہتے ہیں کہ آپ کیا غضب کرتے ہیں کہ مجھے بہشت دے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں مجھے وہی گلی یاد آئے گی۔

آب ہوائے ایں فضا کوئے کہ یاد میدہد   میدہیم بخلد جا رحم کجاست اے خدا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میرا نالہ و فغاں قابل رحم نہیں ہے۔ میں عاشق ہوں۔ لہذا مجھ پر کرم نہیں کیا جاسکتا۔ خیر اس کا مجھ کو کوئی شکوہ نہیں۔ مگر اس کا کیا جواب ہے۔ کہ منشی بے بدل بھی ہوں۔ شاعر خوش گفتار بھی ہوں۔ رند ہزار شیوہ بھی ہوں۔ مصاحب اور ندیم بھی ہوں۔ غرضکہ ہر فن مولا آدمی ہوں۔ اگر بحیثیت عاشق کے رحم نہیں کیا جاتا تو نہ کیا جائے۔ مگر ان کاموں کا مشتاق سمجھ کے تو رحم کیجئے۔ کیا سرے سے ایک عشق کے ساتھ میری تمام عزتیں اور تمام استحقاق دریا برد کر دئیے گئے۔

گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید   دبیرم۔ شاعرم۔ رندم ندیم شیوہا دارم

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگر تیرے ناز کی یہی درازیاں جاری رہیں۔ تو یقیناً دارا کی ملک سکندر کو نہیں پہونچ سکتی۔

بہ سکندر نرسد ہر چہ ز دارا ماند   گر چنیں ناز تو آمادہ یغما ماند

ایک جگہ کہتے ہیں جو مئے و معشوق کی تمنا لے کر دنیا سے جا رہا ہے گویا وہ شخص حور اور کوثر ہمیں ساتھ لئے جاتا ہے اوس کو وہاں مے و کوثر کی ضرورت نہیں ہے۔

ذوق مے ناب و ہوس روئے نکو برد   ہمرہ رود ش کوثر و حوراں کہ دم مرگ

ایک جگہ معشوق کی شوخی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ظالم کی یہ کیفیت ہے کہ اوروں کو تو شراب دیتا ہے اور جب میرا نمبر آتا ہے تو پیالہ بھر کے مجھے دکھاتا ہے۔ اور زمین پر گرا دیتا ہے۔

بمن نماید و در انجمن فرو ریزد   دہد بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبت من

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگرچہ نبیذ رطب ہی سے بنتی ہے۔ مگر پھر بھی دونوں میں بڑا زبردست فرق ہوتا ہے۔ رطب میں وہ مزا کہاں ہے جو نبیذ میں ہے۔ اسی طرح جب بوسہ دشنام بنجاتا ہے تو بات ہی اور پیدا ہو جاتی ہے۔

لذت دگر دہد بوسہ چو دشنام شد   ہست تفاوت بسے ہم ز رطب تا نبیذ

ایک جگہ معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ تو میں کہتا نہیں کہ یہ سب ظلم جو مجھ پر ہو رہا ہے۔ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خدا تیرے زمانہ میں کسی پر رحم نہیں کرتا۔

خدا بہ عہد تو بر خلق مہرباں نشود   نگفتہ ام ستم از جانب خداست ولے

معشوق نے مرزا صاحب کی طرف ذرا التفات کی ہے۔ مرزا صاحب کے دوست احباب خوش و خرم چلے آتے ہیں۔ مبارک سلامت کا شور و غل ہے۔ جو آتا ہے وہ تہنیت کے الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ مرزا صاحب سب سے یہ کہتے ہیں کہ بھئی یہ مقام تہنیت نہیں ہے۔ اللہ سے دعا کرو کہ یہ کوئی نئی قسم کا امتحان نہ ہو۔

دعا کنید کہ نوعے ز امتحاں نبود   بہ التفات نگارم چہ جائے تہنیت است

معشوق سے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کیا کہا کہ ہماری حسرت دیدار خطا ہے۔ سُن لیجئے اگرچہ خطا ہے تو معاف فرمائیے۔ یہ خطا تو ہم قیامت تک کریں گے۔

گفتہ باشی کہ زما حسرت دیدار خطاست　　ایں خطائے است کہ در روز جزا نیز کنند

ایک جگہ خدا سے کہتے ہیں کہ مجھے چھوڑیئے میں قابل التفات اور لائق حساب کتاب نہیں ہوں۔ دنیا میں میرے آپ نے کون سے مقاصد پورے کیے تھے کہ اب گناہ کا حساب کرنے بیٹھے ہیں۔ کچھ میرے مقصد پورے کیے ہوتے طالع ور بنایا ہوتا تو اعمالنامے میں کچھ گناہ بھی ہوتے۔ جب پہلے ہی سے بدنصیب پیدا کیا تھا تو اب یہ گناہ کا حساب کیوں کیا جا رہا ہے۔

کام نہ بخشیدہ گنہ چہ شماری　　غالب مسکیں بہ التفات نیرزد

معشوق سے کہتے ہیں کہ مجھ سے جو آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ زہد و تقوے اختیار کرو۔ سبحان اللہ کیا خوب آپ کی فرمائش ہے۔ آپ ذرا آراستہ ہو کر بڑے بڑے تقوے شعار زاہدوں کے حجرے میں تو تشریف لے جائیے پھر دیکھئے کہ کتنوں کا دعوئے تقوے و زہد قائم رہتا ہے۔

مرا گوئی کہ تقوے ورز۔ قربانت شوم خود را　　بیارا و بخلوت خانۂ تقوے شعاراں بر

اللہ میاں سے کہتے ہیں کہ یہ کن ناتجربہ کاروں ناقدرے زاہدوں کو بہشت دے رہا ہے۔ نہ کبھی انھوں نے کسی معشوق کے ظلم اٹھائے نہ ان پر کوئی مصیبت پڑی۔ پھر بھلا ان کی اور حوروں کی کیا بنے گی۔

یارب بزاہداں چہ دہی خلد رائیگاں　　جور بتاں ندیدہ و دل خوں نکردہ کس

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میاں غالب کیا پڑے ہوئے سو رہے ہو اٹھو صبح ہو گئی۔ زاہد مسجد میں پہونچ گئے اور رند باغ میں پہونچ چکے یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔

صحبت وگوناگوں اثر غالب چہ پی بیخبر　　نیکاں بمسجد رفتہ و رنداں بگلشن گشتہ جمع

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مرگ پدر میں مجھے رونا پڑا۔ مگر میں تیرے غم کو یاد کر کر کے کہہ رہا ہوں کہ ہائے قضا کی وجہ سے میرے یہ چند نالے بیکار برباد گئے۔

باغمت مرگ پدر سنجم و گویم ہیہات　　نالۂ چند کہ در کار قضا گشت تلف

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مجھے ہرگز یہ دعوے نہیں ہے کہ میرا کہیں کوئی وجود ہے۔ بلکہ میں ایک ایسا نقش ہوں جس کے بنانے کا صرف نقاش نے ارادہ کیا اور رہ گیا۔ خارج میں میرا کوئی وجود نہیں۔

نقش بضمیر آمدۂ نقش طرازم　　حاشا کہ بود دعوئی پیدائی خویشم

زاہد سے فرماتے ہیں کہ ہم نے جو یہ ایک انگور کا خوشہ تجھے دیا ہے اس کو حقارت سے نہ دیکھ یہ بہت ہے۔ یوں سمجھ کہ تجھکو

یہ خوشہ دے کر ہم نے پورے ایک ساغر شراب کا نقصان کیا ہے۔

ناچار ز انگور بہ یک خوشہ قناعت کردیم
ہ ندانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

یک جگہ کہتے ہیں کہ بس آجکل ہم کو یہ دھن لگی ہوئی ہے کہ ویران مسجدوں کی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے ہیں اور کوئے مغاں میں عمارت تیار کر رہے ہیں۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ مے آریم و شہر
خانہ در کوئے ترسایاں عمارت میکنیم

واعظ سے کہتے ہیں کہ آپ عجب احمق ہیں ہم سے آپ ناراض کیوں۔ ارے صاحب ہم گناہ کرتے ہیں تو صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بہشت میں تنہا آپ ہی رہیں اور ہم اس کے حصہ دار نہ ہوں۔ پھر بھلا خیال تو کیجئے کہ ہم گناہ کر کے آپ کی خیر خواہی کر رہے ہیں یا بدخواہی۔

گر گنہگاریم واعظ گو مرنج
را در روضہ تنہا خواستیم

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اچھا یہ ہم نے مان لیا کہ ضد میں آپ نے ہم سے ملنا چھوڑ دیا۔ مگر مہربانی کر کے یہ تو بتا ہے کہ اس ذوق کو آپ مجھ سے کیونکر چھین سکتے ہیں جو زمانہ گذشتہ پر مجھکو ہے۔ ہم تو جب مانیں گے کہ آپ ہمارے اس ناز عہد ماضی کو بھی ہم سے چھین لیں۔

چہ غم از بعد گرفتی ز من احتراز کردن
نتواں گرفتن از من بگذشتہ ناز کردن

... سے کہتے ہیں کہ تم جو ہم سے یہ کہہ رہے ہو کہ غیر کے پاس سے میرے پاس کون پیغام لایا ہے وہ کہاں ہے ذرا دکھا ... ہی سہی۔ مگر ذرا یہ تو بتائیے کہ وہ خمیدہ پشت، سست قدم بڑھیا اگر دلالہ نہیں تھی تو کون تھی جو ابھی ابھی تمہارے پاس سے گئی ہے۔

گوئی پیام کس بکہ ز دشمن رسیدہ کو
آں پیر زال سست پے قد خمیدہ کو

... تے ہیں کہ شیخ ضعان کے جاہ و جلال کو سن سن کر مجھے اس پر رشک تو ضرور آتا ہے۔ اور ویسی زندگی کو جی چاہتا ہے مگر صاحب اس شان و شوکت کا حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اُن کی طرح ستر برس عبادت کون کرے اور ایک عمر کا جھنجھٹ کون پالے

داغم ز رشک شوکت ضعان لے چہ سود
آں دستگاہ طاعت ہفتاد سال کو

ایک جگہ کہتے ہیں کہ آج کل غم عشق مجھے عشق الٰہی بن کے آیا ہے۔ اے داغ عشق تجھے چاہیے کہ تو دل سے ہوتا ہوا چلا آ اور یہاں آکر ظاہر ہو جا۔ کیونکہ اب بس عشق الٰہی کی ہی پہچان رہ گئی ہے۔

آوردہ غم عشق در بندگی ایزد
اے داغ بدل در رو در جبہ نمایاں شو

... کہتے ہیں کہ تو نوبہار نہیں ہے۔ نوبہار کے ساتھ اتنا سان ناز کہاں ہوتا ہے۔ مجھے تو تو کسی کے

کارخانۂ لیغما کی فہرست معلوم ہوتا ہے۔

بانو بہار ایں ہمہ سامان ناز نیست　　فہرست کارخانۂ لیغائے کیستی

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تعلقات دنیاوی نہایت ہی بُرے ہوتے ہیں۔ اور ہم ہرگز ہرگز اس شخص کو عقلمند کہہ سکتے جو ان کے مخصوں میں پھنسے۔ جو ایسا کریگا او سکو رنج و غم سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اللہ میاں کو دیکھو کہ تمام دنیا میں اوس کا گھر ہے۔ مگر کسی گھر میں بیوی نہیں ہے۔ پھر بھلا وہ قوی کیوں نہو۔ بیوی بچے ہوتے پر قوی رہتے تو ہم جانتے او ایسی حالت میں تو قوی وہ نہوں گے تو کیا ہم ہوں گے۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود　　وز غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو　　نازم بخدا چرا تو انا نبود

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے ادبی متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت عمار

گہوارۂ تمدن — (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عو... نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کسقدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عمار

شہاب کی سرگزشت۔ حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا رعالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید۔ مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ علاوہ محصول ۱ر

جذبات بھاشا۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

تذکرۂ خندۂ گل۔ مولفہ عبد الباری آسی جسمیں ۴۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں۔ قیمت عہ محصول ۳ر

صحابیات جسمیں عہد رسالت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات کئے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے قیمت علاوہ محصول عمار

مینیجر نگار

ایک جگہ گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ دنیا میں ہمیں کوئی فائدہ پہونچا۔ بہار کا زمانہ ہے بہت سا روپیہ دے کہ شراب اور پھولوں کے کام آئے۔ ان زاہدوں نے جو یہ خزانے جمع کر رکھے ہیں یہ سب ہمکو دلوا دے ان کا خرچ ہی کیا ہے نمک اور جو کی روٹی۔ سو اس کے لئے کیا خرچ کی ضرورت ہے۔

یارب سودے بروزگاراں مارا　　وجہ گل و مل بنو بہاراں مارا
صرف نمک و جو چہ قدر خواہد شد　　گنجینۂ ایں صومعہ داراں مارا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب اس میں شک نہیں کہ آپ شاعر تو بہت بڑے ہیں۔ مگر واللہ آپ کو عقل ذرا سی بھی نہیں ہے آپ شراب فروش کی دوکان پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور وہاں شراب مانگتے ہیں۔ عمدہ قسم کی مانگتے ہیں اور بہت سی مانگتے ہیں۔ بھلا خیال تو فرمائیے یہ سب شرائط کیوں کر پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ شراب فروشی ہے یا ساقی گری کہ بہت سی بھی دے۔ مفت بھی دے اور عمدہ بھی دے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ طنزیات اور شکوہ وغیرہ مرزا کے خاص مضامین میں سے ہیں۔ شکوہ ہر چند شکوہ ہے۔ اور طنز یقینی طنز ہے۔ مگر مرزا کا حسن بیان اُن کو اس قدر سبک اور رنگین کر دیتا ہے کہ پھر نہ شکوہ شکوہ رہتا ہے۔ اور نہ طنز طنز۔ بلکہ برعکس اس کے وہ بے انتہا رنگین بے انتہا لطیف چیزیں بنجاتی ہیں۔ اور ظرافت کا رنگ اُن سے چھلکنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کلکتہ گئے اور وہاں ان کے ساتھ شاگردان قتیل نے معارضہ کی صورت اختیار کی۔ تو مرزا نے علاوہ مثنوی باد مخالف کے ایک قطعہ کہا۔ جس میں ساقی بزم آگاہی یعنی عقل سے انھوں نے مختلف شہروں کے متعلق سوال کئے ہیں کہ فلاں شہر کیسا ہے اور فلاں کیسا ہے۔ اور عقل ان کو جواب دیتی رہی ہے۔ اسی میں انھوں نے کلکتہ کا حال دریافت کیا ہے اوسی میں ایک لطیف طنز کرتے ہیں۔

حال کلکتہ باز جستم گفت　　باید اقلیم ہشتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد دروے　　گفت از ہر دیار و از ہر فن
گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد　　گفت از ہر کہ ہست تسیدن
گفتم ایں جا چہ کار باید کرد　　گفت قطع نظر ز شعر و سخن

ایک جگہ طنز یہ کہتے ہیں کہ جب یہ راز طشت از بام ہو ہی گیا ہے کہ ارم خلق سے چھینا گیا ہے۔ پھر آخر اب ارم کے چھپانے سے کیا فائدہ ہے بات جو کچھ تھی وہ تو مشہور ہو ہی چکی ہے۔

چوں فاش شد آخر کہ ہم از خلق گرفتند　　بیفائدہ از خلق نہفتند ارم را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم مصیبت میں ہیں تو خیر یہ کہہ کے دل کو تسکین دے لیتے ہیں کہ مر جائیں گے تو ان جھگڑوں سے نجات ہو جائے گی۔ مگر یہ خضر و مسیحا کیا کریں جنھیں کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ واقعی ان کی حالت زار قابل رحم ہے۔

دل بامرگ سا تسکیں بمردن میتواں کردن   چہ امیدست آخر خضر و الیاس و مسیحا را

کہیں کہیں مرزا صاحب محض ظرافت بھی لکھتے ہیں جس سے طنز و تشنیع وغیرہ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف ایک ظرافت ہے جس سے خود کو اور دوسرے کو خوش کرنے کے سوائے کوئی خاص مقصود مد نظر نہیں ہوتا۔

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم آدم کی اولاد ہیں۔ ہم کو گناہ کرنا چاہئے لہذا کرتے ہیں

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم ز عصیاں میزنم

ایک قطعہ میں کہتے ہیں کہ اب ہمارا بڑھاپے کا زمانہ ہے، ہوش و حواس مسلوب ہو رہے ہیں عقل و خرد رفتہ رفتہ رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ نہ دماغ صحیح ہے۔ نہ حافظہ درست ہے۔ اوامر اور نواہی میں سے بس دو باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ نواہی میں سے لاتقربوا الصلوٰۃ۔ اور اوامر میں سے کلوا واشربوا۔

بر خاست است گرد ز سر چشمۂ حیات   در حافظہ نماندہ نے در سبو مرا

لاتقربوا الصلوٰۃ ز نہیم بخاطر است   وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں ساری عمر زمانہ کے ہاتھوں عاجز و پریشان رہا۔ اور عمر بھر اپنے نصیب سے امیدیں لگائے شمار رہا۔ بغیر پونجی کے ہمیشہ یہ فکر رہی کہ کچھ نفع ہونا چاہئے۔ اور بغیر وعدے کے ہمیشہ انتظار کرتا رہا۔

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر   واز بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

بے مایہ بفکر سود ماندم ہر جا   بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

مرزا کی مایوسیوں کے مناظر ان کی نثر و نظم میں برابر جلوہ افروز ہیں۔ مگر وہ مناظر چاہے خود کتنے ہی غم و الم پر مبنی ہوں۔ مگر دوسروں کے واسطے سامان تفریح ضرور ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو ایک جگہ یہ رنگ بھی دیکھ لیجئے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر میں عزیزوں کے ظلم و جور کی تشریح لوگوں کے سامنے کردوں تو یقینی دنیا سے امید کی رسم اٹھ جائے۔ اور پھر کوئی امید کی ہمت ہی نہ کرے۔

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب   رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تیرے اور میرے زمانہ میں ہفت اقلیم سے امید و بیم اٹھ گئی ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ جلوہ باقی کہاں رہ گیا ہے جس سے قیامت کے مناظر کو رونق دی جائے گی- اور شعلے کہاں رہ گئے ہیں جن سے دوزخ کو زینت دیں گے- ان میں سے ایک چیز تیرے کام آچکی- اور ایک میرے کام آگئی- پھر یہ سب کیا ہنگامہ سن رہے ہیں

در عہد تو و منست در ہفت اقلیم بر خاستن امید و خوں گشتن بیم
از جلوہ چہ ماند تا بسازند بہشت در شعلہ چہ ماند تا بتابند جحیم

مرض کے بیان و عنوان سے بھی مرزا کی تمام اُردو و فارسی کی تحریریں بھری ہوئی ہیں- حد درجہ شوخی لئے ہوئے ہے-

فرماتے ہیں کہ میرے نہ مرنے کو کہیں اس بات پر محمول نہ سمجھئے کہ میں ابھی طاقتور ہوں- حاشا و کلا یہ بات نہیں ہے- بلکہ ہے یہ کہ ضعف کی کشاکش کی وجہ سے میری روح تن سے جدا نہیں ہو سکتی- اسی لئے میرا نہ مرنا ناتوانی کی وجہ سے ہے- نہ کہ توانائی کی وجہ سے-

درکشاکش ضعفم نگسلد روان از تن اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

ایک جگہ اپنی تعریف فرماتے ہیں اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے اپنی حالت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم کا واقعہ تم نے سنا ہی ہوگا کہ وہ آگ میں بھی نہ جلے تھے۔ خیر۔ ایک تو وہ تھے ایک ہم کو دیکھئے کہ بغیر آگ، اور شعلہ کے جلے جاتے ہیں۔

شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم   ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا ہم نے مانا۔ غالب کے شعر وحی نہیں ہیں۔ اور ہم انھیں وحی بتاتے بھی نہیں۔ مگر تمھیں خدا کی قسم ذرا سچ کہنا کہ اگر وحی نہیں ہیں تو کیا انھیں الہام بھی نہیں کہہ سکتے۔

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم و لے   تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

احمد حسین میکش، اور جواہر سنگھ جوہر، مرزا غالب کے دو عزیز شاگرد تھے۔ مرزا نے اُن کی مدح میں ایک رباعی کہی ہے جس میں دونوں تخلصوں کو کمال خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم   شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست   در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

ایک جگہ کہتے ہیں میں بہت خوش ہوں آسمان سب سے زیادہ میری عزت کرتا اور مجھ کو مغتنم جانتا ہے جو غم کسی سے نہیں کھایا جاتا۔ وہ مجھے دیتا ہے۔ اور اس پر مجھے بڑا ناز ہے۔

نازم کہ نزد چرخ گرامی ترم بقدر   چوں کس نخورد غمے بمن اندر نہاں دہد

سجدہ کی کیفیت کا یوں اظہار کرتے ہیں کہ میں اس سجدے کا متمنی نہیں ہوں جس سے ماتھے پر گھٹا پڑ جائے۔ میں تو اُس سجدے کی تلاش میں ہوں جس میں میری پیشانی کا وجود ہی نہ رہے۔ اس خیال کی چستی۔ اور شوخی پھر اس کے ساتھ اثر کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

سجدہ خواہم کہ ز سیما نگزارد اثرے   اثر سجدہ چہ خواہی کہ بہ سیما ماند

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تعالیٰ اللہ۔ بارک اللہ۔ بھلا شان رحمت کی کیا تعریف ہو۔ کہ جن لوگوں نے گناہ نہیں کئے تھے اداں کو بخش دیا۔ ٹھیک ہے۔ بخشنا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ بیچارے اپاہج تھے۔ دنیا میں یہ کچھ کر نہیں سکے تھے اگر یہاں بھی بخشے نہ جاتے تو غریب شرمندہ ہوتے۔

تعالیٰ اللہ برحمت شاد گردن بیگناہاں را   خجل نپسندد آزرم کرم بدستگاہاں را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ یہ نہ کہو کہ رند نے طاعت حق نہیں کی۔ اس میں بڑا راز ہے طاعت حق اس کے لئے کچھ گراں نہیں

تھی۔ وہ تو ہزار شیوہ تھا۔ جہاں اور ہزاروں خرافاتیں کرتا تھا۔ یہ بھی کر لیتا۔ مگر راز یہ ہے کہ بتوں کو پیشانی کا مشترک اطاعت ہونا گوارا نہیں ہوا۔ اس لئے وہ طاعت حق نہ کر سکا۔

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود　　　لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل ناتواں کے لئے افتادگی ہی اب نماز ہے۔ یہ قعود و قیام کے جھگڑے کی تاب نہیں لا سکتا۔ رات دن پڑا ہوا ہے۔ اسی کو نماز سمجھو۔ سجدہ کہو۔ قعود جانو۔ غرض جو کچھ ٹھہراؤ اختیار ہے۔

افتادگی نماز دل ناتوان ماست　　　در د سر قیام و قعودش نماندہ است

معنی آفرینی ہی وہ شے ہے جس کو مرزا شاعری کے لئے سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ غالب میں اگر ہندوستان کے تمام شعرا سے زیادہ کوئی ممتاز چیز ہے۔ تو وہ معنی آفرینی ہی ہے۔ مگر اس معنی آفرینی سے جوان کے دیوان کا جزو غالب ہے۔ ہم کوئی بحث نہیں کرتے۔ بلکہ سردست ہم کو اس معنی آفرینی کا مختصراً ذکر کرنا ہے جس میں انہوں نے اپنی فطری شوخی کو مدنظر رکھا ہے۔ جیسا کہ غمزۂ لاجوردی غمزہائے غیر مکرر کو کہتے ہیں۔ اور لاجورد ایک پتھر بھی ہے جو نیلا ہے۔ لہٰذا اسی لفظ تخیل کی بنا رکھ کر فرماتے ہیں۔

سراسر غمزہایت لاجوردی بود و من عمر　　　بہ مشوقی پرستیدم بلاے آسمانی را

اسی طرح ذیل کے شعر میں بتاتے ہیں کہ ارہ چونکہ دوسرے لوگوں پر ظلم کرتا ہے لہٰذا ارہ کے سر پر بھی تشدید کا ارہ چل رہا ہے۔ اور یہ اس کی سزا ہے کہ ظالم کبھی خوش نہیں رہتا۔

ظالم ہم از نہاد خود آزار مے کشد　　　بر فرق ارہ ارۂ تشدید بودہ است

ایک جگہ اپنے تخلص سے فائدہ اٹھا کر معنی آفرینی کرتے اور کہتے ہیں کہ میرا تخلص ظاہرا غالب ہے لیکن دراصل میں مغلوب ہوں۔ لہٰذا جہاں کہیں غزل میں میرا تخلص غالب تجھے نظر آئے اس کو کاٹ کر اس کے بجائے مغلوب لکھ دے۔

ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا　　　مے تراش آنرا و مغلوب بجایش می‌نویس

دوزا ایک جگہ شاعری کے درجہ سے تنزل کر کے ناصح کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں مگر اس میں بھی وہی انداز ظرافت ہے معشوق نے عاشق کو قتل کر دیا ہے۔ اور اب وہ وارثان قاتل کے بلوے سے خوف و ہراس کھا رہا ہے۔ اور پریشان ہے۔ تو اب اس کو سمجھاتے اور کہتے ہیں کہ آخر آپ اوس کے وارثوں سے کیوں پریشان ہیں کہہ دیجئے۔ کہ موت بڑی ظالم چیز ہے۔ اس میں ہماری کیا خطا ہے۔ موت آئی مر گئے۔ ہماری ادا نے کیا کیا۔

ز وارثان شہیداں ہراس یعنی چہ　　　تو لیست دست قضا کشتہ ادا تو کیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عالم شباب میں زہد و تورع کی علت گویا کہ عالم ہستی کی ناقدری ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے

پارسا جوانوں کی جان پر آفت آتی ہے۔ خدا اس سے ہر مسلمان کو بچائے۔

شباب و زہد چہ نا قدر دانی ہستی است   بلا بجان جوانان پارسا ریزد

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ دولت سعی سے کبھی نہیں ملتی ہے۔ یہ سعی اس قابل ہے کہ آدمی کو اس سے پشیمان ہونا چاہئے آسان ترکیب یہی ہے کہ اگر کافر ہونا میسر نہیں ہوتا ہے تو مجبوراً انسان مسلمان ہو جائے۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو   کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

معذرت نامہ

رسالہ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالےٰ جل شانہٗ و حضرات انبیاء کرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالتمآب صلعم و دیگر بزرگان دین و ائمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شایع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار برائت و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم من کل ذنب و اتوب الیہ و صلی اللہ تعالےٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین و علی جمیع الانبیاء والمرسلین و من اتبعھم احسان الیٰ یوم الدین والحمد للہ رب العالمین۔

۱۱؍ اکتوبر کے ہمت کے اعلان اور اکتوبر کے "نگار" میں جو کچھ "ملاحظات" کے تحت میں چھپا ہوا اسکو اعلان معذرت سے قبل لکھے جانے کے باوجود کالعدم قرار دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ معذرت نامہ پر دستخط کرنے سے پہلے لکھے گئے تھے، مگر ان کی اشاعت بعد کو بھی ہوئی اور اس معذرت نامہ کی روح کی منافی تھی۔ نگار میں آئندہ سے [illegible] قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کروں گا۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

نیاز

لطایف غالب

اس حصہ میں غالب کی زندگی کے وہ واقعات یا ان کے وہ اقوال درج کیے جاتے ہیں جو لطائف غالب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو یادگار غالب، آب حیات یا بعض رسائل سے ہم نے لئے ہیں۔ لیکن بعض لطایف ایسے بھی ہیں جو ہمیں دوسرے ذرایع سے حاصل ہوئے ہیں اور ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

مرزا صاحب کرنل برون سے ملنے گئے تو وہی کلاہ پیاخ جو یہ پہنتے تھے ان کے سر پر تھی۔ جس کی وجہ سے ایک عجیب و غریب قطع معلوم ہوتی تھی۔ کرنل نے انھیں دیکھ کر کہا کہ مرزا صاحب آپ مسلمان ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضور آدھا مسلمان ہوں۔ کرنل صاحب نے یہ سنکر حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا بات۔ آدھا مسلمان کیسا۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضور آدھا یوں کہ شراب پیتا ہوں۔ سؤر نہیں کھاتا

جب نواب یوسف علی خاں والی رامپور کا انتقال ہوگیا۔ تو مرزا صاحب بھی تعزیت کے لئے رام پور تشریف لے گئے تھے۔ اون کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے اوسی زمانہ میں نواب کلب علی خاں لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لئے بریلی جارہے تھے اون کی روانگی کے وقت مرزا صاحب بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے رسماً کہا کہ اچھا مرزا صاحب خدا کو سونپا۔ مرزا نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ حضور غضب ہے۔ پوچھا کیوں۔ مرزا نے کہا کہ خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا۔ اب آپ خدا کے سپرد کرتے ہیں

مرزا نے جب قاطع برہان لکھی تو مخالفین ٹڈی دل کی طرح اُمڈ آئے۔ بہت سے جوابات لکھے گئے اُن میں سے امین الدین بھی ایک شخص تھے جنہوں نے قاطع برہان کے جواب میں قاطع قاطع لکھی۔ چونکہ اس کتاب کی بنا محض بدگوئی اور فحش گوئی پر رکھی ہے اسی وجہ سے مرزا نے اوس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک شخص نے مرزا صاحب سے کہا کہ آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو مرزا صاحب نے فرمایا کہ حضرت اگر کوئی گدھا آپ کے لات مارے تو آپ کیا جواب دیں۔

قاطع برہان میں یوں تو مرزا نے بہت سی ستم ظریفیاں کی ہیں مگر بعض جگہ بہت ہی خوب ہیں چنانچہ ایک جگہ محمد حسین دکنی مؤلف برہان قاطع نے۔ آدر بروزن مادر لکھ کر معنے بیان کئے ہیں۔ مرزا نے لکھا ہے کہ اول تو آدر کے وزن ہی کی کون سی ضرورت پڑی تھی۔ اور اگر ضرورت تھی اور اس کے بغیر کام ہی نہ چلتا تھا تو چادر بھی اس کا

وزن تھا۔ پھر اس کے بعد فقرہ لکھا ہے۔ "چادر زا گز اشتن و مادر را آوردن بیحیائی است"

جامع برہان قاطع نے "فراز" کو لغات اضداد میں سے قرار دیا ہے۔ اور بند کرنا کھولنا دونوں معنے لکھے ہیں مرزا اس کے خلاف تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے معنے صرف بند کرنے کے ہیں۔ مگر اہل ہند کا اجماع ہے کہ یہ لفظ لغات اضداد میں سے ہے۔ مرزا صاحب کو جب لکھا گیا کہ اس پر اجماع ہے تو مرزا نے جواب دیا کہ یہ ایسا ہی اجماع ہے جیسے اہل شام نے خلافت یزید پر اجماع کیا تھا۔

نہ معلوم مرزا کو بُرہان قاطع کے مصنف سے کتنا زبردست اختلاف تھا کہ ایک دو جگہ نہیں سیکڑوں جگہ ایسے ایسے زبردست فقرے چست کئے ہیں کہ پڑھنے والے کو مجبوراً ہنسنا پڑتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "چوں شناسائی حقیقت جوہر لفظ ندارد فرہنگ چرا نگارد۔ بوریا مے بافت۔ رسی مے تافت۔ ہیزم مے فروخت۔ گلخن مے افروخت"۔ یعنی جب لفظ و معنی کی حقیقت نہیں پہچانتا تو پھر فرہنگ نویسی کی زحمت کیوں برداشت کی۔ بوریا بنتا رسی۔ لکڑیاں بیچتا۔ بھاڑ جھونکتا۔

قاطع برہان نے لوگوں کو ایسا برافروختہ کر دیا۔ کہ لوگ جواب تو جواب زبان درازیوں پر اُتر آئے تھے۔ بُرا کہتے تھے۔ گالیاں دیتے تھے۔ فحش خط بھیجتے تھے۔ ایک روز مرزا صاحب کے پاس مولانا حالی بیٹھے ہوئے تھے ایک اسی قسم کا خط آیا۔ مرزا نے لفافہ مولانا حالی کو دیا۔ کہ اسے کھول کر پڑھو مولانا نے پڑھا۔ خط میں ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مولانا کو پڑھنے میں تکلف ہوا۔ مرزا صاحب نے خط چھین لیا۔ اور خود پڑھ کر کہا کہ کم بختوں کو گالیاں دینی بھی نہیں آتیں۔ بڈھے یا ادھیڑ کو ماں کی گالی نہیں دینی چاہئے بلکہ بیٹی کی۔

رمضان شریف ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ مرزا صاحب قلعہ گئے تو بادشاہ نے پوچھا کہیئے مرزا صاحب آپ نے کتنے روزے رکھے۔ مرزا نے جواب دیا کہ پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مکان کے سامنے ایک بہت تاریک چھتہ تھا۔ جب اس چھتہ کو طے کر لیتے تب کہیں مکان کے دروازے پر پہونچتے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب اسی مکان میں نواب صاحب سے ملنے کے لئے گئے۔ چھتہ کو طے کرکے جب دروازے پر پہونچے تو نواب صاحب استقبال کے لئے موجود تھے مرزا صاحب نے دیکھ کر یہ مصرع پڑھا کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکی است

کسی صحبت شعر و سخن یا اور ایسے ہی جلسہ میں مرزا صاحب میر تقی میر کے انداز کلام کی تعریف کر رہے تھے۔ اور استاد ذوق سودا کے طرز بیان کی۔ مرزا صاحب نے کہا کہ استاد ہم تو تم کو میری سمجھتے تھے مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں

مرزا جس مکان میں رہتے تھے اس مکان میں دروازے کی چھت پر ایک کمرہ تھا اور اس کے ایک جانب کو ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی کوٹھری تھی گرمی کے موسم میں لو وغیرہ سے بچنے کے لئے اسی کوٹھری میں تین چار بجے تک بیٹھتے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں اسی کوٹھری میں بیٹھے چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے کہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ آ گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر مرزا کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ مرزا صاحب ہم نے پڑھا تھا کہ رمضان شریف میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت پر کچھ شبہ ہو گیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا۔ کہ مولانا حدیث بالکل صحیح ہے صرف یہ بات ہے کہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے

آخر عمر میں مرزا کی خوراک کم ہوتے ہوتے اس درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ ایک اندازہ کرنے والا آسانی کے ساتھ اس کو اس بات سے تعبیر کر سکتا تھا۔ کہ وہ کچھ بھی نہ تھی۔ صبح کو اکثر شیرۂ بادام دو پہر کو پاؤ بھر گوشت کا قورمہ۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں۔ دوسرے میں لعاب یا شوربا ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا۔ شوربے میں ڈوبا ہوا۔ کبھی کبھی ایک انڈہ کی زردی۔ اسی پر انھوں نے ایک روز ایک مختصر سا لطیفہ کہا جس میں تجنیس الفاظ نے ندرت پیدا کر دی۔
دو پہر کا کھانا گھر میں سے آیا۔ دستر خوان بچھا۔ بہت سے برتن تھے جن میں ذرا ذرا سا کھانا رکھا ہوا تھا مرزا صاحب حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ سبحان اللہ ہمارا بھی کیا دستر خوان ہے۔ اگر برتنوں کی کثرت کو دیکھئے تو دستر خوان یزید۔ اور کھانے کی مقدار ملاحظہ فرمائیے تو بایزید کا۔

ایک دن بہادر شاہ مرحوم آموں کے موسم میں چند مصاحبین خاص کے ساتھ باغ حیات بخش میں ٹہل رہے تھے
، کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ مرزا بار بار آموں کو غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ مرزا
تم بڑے غور سے دیکھ رہے ہو۔ آخر کیا دیکھتے ہو۔ کیا اس سے پہلے کبھی آم نہیں دیکھے ہیں۔ مرزا نے دست بستہ عرض کیا
پیر و مرشد آم تو دیکھے ۔۔۔ ہیں۔ اس وقت تو میں کچھ اور ہی بات دیکھ رہا ہوں۔ کہ کسی بزرگ نے جو یہ شعر کہا ہے کہ ؎

بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

بھلا ان آموں کے دانوں پر کہیں میرا اور میرے باپ دادا کا بھی نام لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ سلامت سنکر مسکرائے
اور اسی دن عمدہ عمدہ آموں کی ایک بہنگی مرزا کو بھجوا دی۔

حکیم رضی الدین مرحوم جو دلی کے ایک نہایت نامی گرامی طبیب تھے مرزا کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے
مگر اتفاق کی بات کہ آم اُن کو مرغوب نہیں تھے۔ ایک دن مرزا صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا بھی پاس
ہی بیٹھے تھے۔ آموں کا زمانہ تھا۔ وہاں برامدے کے سامنے آموں کے کچھ چھلکے پڑے تھے۔ ایک گدھے والا ادھر
سے اپنے گدھے لئے ہوئے گزرا۔ گدھے نے آم کے چھلکے سونگھے اور چھوڑ دئے کھائے نہیں۔ حکیم صاحب نے ہنسکر
کہا۔ دیکھو مرزا تم آموں کی بڑی تعریف کرتے ہو۔ آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔ مرزا نے جواب دیا
جی ہاں بیشک۔ گدھے آم نہیں کھاتے۔

کبھی کبھی جب پئے ہوئے ہوتے تھے۔ اور بے تکلف دوستوں یا شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا۔ تو ایسی بے تکلفانہ باتیں
کرتے تھے۔ کہ لطف آجاتا تھا۔ ایک دن مرزا پئے ہوئے پلنگ پر دراز تھے۔ اتنے میں میر مہدی مجروح آپہونچے۔
اور مرزا کے پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا کہ ارے بھئی تو سید زادہ ہو کر پاؤں دباتا ہے بیکار بیکار کیوں مجھے گنہگار کرتا
ہے۔ مگر حسن عقیدت کا جوش۔ خلوص اور اعتقاد کی فراوانی میں کون سنتا ہے۔ مجروح نہ مانے اور برابر پاؤں دباتے
رہے۔ جب مرزا نے بہت اصرار کیا تو بولے۔ قبلہ و کعبہ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اجرت دے
دیجئے گا۔ مرزا نے کہا خیر یہاں تک کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ جب پاؤں دبا چکے تو میر مہدی بولے کہ لائیے حضرت
اُجرت دلوائیے۔ مرزا بولے کہ واہ بھئی۔ واہ۔ آ۔ ماں اجرت کیسی۔ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھاری
اجرت دابی۔ دونوں برابر ہو گئے۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ سورج چھپنے والا تھا۔ مرزا کا کھانا گھر میں سے آیا۔ کھانے میں اور کچھ نہ تھا صرف

خامی کباب تھے۔ مرزا کھانے لگے مولانا وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ تندبیار رومال ہلانے اور مکھیاں جھلنے لگے۔ مرزا نے کہا بھیا تم بیکار تکلیف کرتے ہو۔ میں ان کبابوں میں سے تمھیں کچھ بھی نہ دوں گا۔ مولانا حالی ہنس پڑے۔ اس پر مرزا نے یہ لطیفہ بیان کیا۔ کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے۔ مگر خاص نواب صاحب کے لئے ہمیشہ ایک خاص چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ صرف اوسی چیز کو کھاتے تھے۔ دوسرے کھانوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے تھے۔ ایک دن اون کے لئے مزعفر پکا تھا۔ وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ چڑھا تھا۔ نواب صاحب نے اوس کو کھانا دینے کے لئے خالی پلیٹ مانگی پلیٹ کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب صاحب کھانا کھاتے جارہے تھے اور خالی رکابی برابر مانگ رہے تھے۔ وہ ڈوم نواب کے سامنے رومال ہلانے لگا اور بولا کہ حضور دوسری پلیٹ کی ضرورت کیا ہے۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔ نواب یہ سنکر ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور رکابی اسی کی طرف سرکادی

سید سردار مرزا مرحوم مرزا کے دوستوں میں تھے۔ اتفاق سے شام کے وقت مرزا کے پاس آپہونچے۔ تھوڑی دیر بیٹھے پھر اٹھکر جانے لگے تو مرزا نے ہاتھ میں شمعدان لیا۔ اور کھسکتے کھسکتے تا لب فرش آئے تاکہ روشنی میں جوتہ دیکھ کر پہنیں۔ سردار مرزا بولے حضرت قبلہ آپ نے کیوں زحمت کی۔ مَیں خود اپنا جوتہ پہن لیتا۔ مرزا نے جواب دیا کہ حضرت میں آپ کا جوتہ دکھانے کے لئے شمعدان لے کر نہیں آیا ہوں بلکہ اپنا جوتہ دکھا دینے کے لئے آیا ہوں کہ وہ محفوظ رہنا چاہئے کہیں آپ اسی کو نہ پہن جائیں۔

مرزا کے سامنے کسی نے شراب کی مذمت کی۔ مرزا نے کہا کہ کیوں آخر اس میں کیا برائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر ذرا یہ تو بتاؤ کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کم بخت کو اور کونسی دعا کی ضرورت ہے۔

غدر کے بعد جب پنشن بند ہوگئی تھی اسی زمانہ میں ایک روز پنڈت موتی لال مرزا سے ملنے کے لئے آئے بند شدہ پنشن کا ذکر آیا۔ مرزا بولے۔ جناب عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر ایک دن نماز پڑھی ہو تو گنہ گار۔ پھر نہ معلوم سرکار نے کیوں مجھے باغی مسلمان سمجھا اور کیوں میری پنشن بند کی۔

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب سے پروں میں منھ

چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا۔ میاں مٹھو نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو

ایک مرتبہ مرزا مکان بدلنے کی فکر میں تھے چنانچہ اسی سلسلہ میں مختلف مکانات دیکھ رہے تھے۔ ایک مکان دیکھا تو اس کا دیوان خانہ تو پسند آیا۔ محلسرا دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ گھر آکر بیگم صاحبہ کو اس کے دیکھنے کے واسطے بھیجا وہ دیکھ کر واپس آئیں تو حال پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس مکان میں لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا ہنسے اور ہنسکر کہا۔ کیا تم سے زیادہ بھی کوئی اور بلا ہے۔

مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نے مرزا کو ایک شجرہ نقل کرنے کے لئے دیا۔ آپ نے یہ حرکت کی کہ ایک نام لکھا اوس کے بعد ایک حذف کر دیا۔ پھر ایک لکھا پھر حذف کر دیا اسی طرح پورا شجرہ تمام کر کے اُن کے حوالے کیا۔ نواب نے دیکھا تو بہت حیران ہوئے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا۔ انہوں نے کہا کہ صرف ایک ایک نام حذف کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا تم نے بڑا غضب کیا۔ شجرہ غلط ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ حضرت شجرہ دراصل خدا تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے۔ زینہ کی حالت یہ ہے کہ اگر ایک ایک سیڑھی درمیان سے نکال دی جائے تو کوئی حرج نہیں اوچک کر اوپر کی سیڑھی پر چڑھ سکتے ہیں۔ وہ یہ سنکر بہت ہی جز بز ہوئے مگر مرزا دوبارہ نقل کی زحمت سے بچ گئے۔

ایک مرتبہ مرزا گھر میں جانے لگے تو دیکھا بیگم صاحبہ عین صحن میں مصلے بچھائے ہوئے نماز پڑھ رہی ہیں۔ مرزا صاحب یہ دیکھ کر دروازے پر ٹھہر گئے۔ جب وہ نماز پڑھ چکیں تو آپ نے جوتہ اتار کر سر پر رکھا۔ اور برہنہ پا آہستہ آہستہ ڈرتے ہچکچاتے ہوئے صحن تک آئے۔ بیگم نے یہ حالت دیکھی تو مسکرا کر تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ کچھ نہیں آپ کے مصلے کی تعظیم و تکریم منظور ہے۔ انھوں نے تشریح چاہی تو آپ نے جواب دیا کہ اب تمام صحن تو مسجد ہو گیا۔ پھر اگر کوئی قدم رکھے تو کہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے اس لئے جوتہ اتار کر سر پر رکھ لیا ہے۔

ایک مرتبہ مغفرت کا کچھ ذکر چلا۔ بیوی نے کہا کہ آپ تو کبھی نماز بھی نہیں پڑھتے ورنہ تو خیر بہت بڑی چیز ہے۔ آپ نے کہا کہ خیر یہ تو ٹھیک ہے مگر تم سے ہمارا حشر اچھا ہوگا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کیوں تو آپ نے کہا کہ آپ تو انھیں نیلے تہمد والوں کے ساتھ ہوں گی جن کے تہمد کے پلے میں مسواک بندھی ہوگی ہاتھ میں ایک ٹوٹنی دار بدھنی ہوگی۔ سر منڈے ہوئے ہوں گے۔ اور ہمارا حشر بڑے بڑے جلیل القدر عالی نسب بادشاہوں کے ساتھ ہوگا جیسے فرعون۔ نمرود۔ شداد۔ اور مونچھیں چڑھاتے اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے۔ چار فرشتے ادھر جلو میں ہونگے چار ادھر۔

ایک روز کسی سے کہنے لگے کہ کیوں صاحب ہم تو مرد ہیں ہمارا نماز پڑھنا ٹھیک ہے۔ ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس لئے پڑھتے ہیں کہ حوریں ملیں غلمان ملیں۔ یہ عورتیں آخر کیوں نماز پڑھتی ہیں اور انھیں کن کی تلاش ہے۔

ایک روز کسی صحبت شعر و سخن میں مولانا صہبائی کا ذکر آیا۔ مرزا نے کہا کہ مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے۔ عمر بھر میں ایک ملّو بھی پینا نصیب نہیں ہوئی۔ اور صہبائی تخلص رکھا ہے۔ سبحان اللہ قربان جائیے اس اتقا کے اور صدقے جائیے اس تخلص کے۔

مرزا کے ایک عاشق مزاج دوست پہلے جو کسی کے حلقۂ گیسو کے اسیر تھے۔ اور اب تائب ہو کر حج کو جا رہے تھے۔ . . . مرزا سے ملنے کے لئے آئے۔ مرزا نے ہنس کر کہا کہ غرض کوچہ گردی کی عادت نہ گئی۔ اور دشت پیمائی کا چسکا نہ چھٹا۔ جب یوں مارے مارے پھرتے تھے اب یوں پھروگے۔

ایک مرتبہ آپ کسی کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان ایرانی آیا اور دکاندار

سے دریافت کیا کہ دیوان غالب داری۔ دکاندار نے جواب دیا کہ دیوان غالب نہ دارم دیوان ظہوری دارم۔ دیوان نظیری دارم۔ ایرانی نے پھر کہا کہ نے نے اینہمہ مطلوب نیست دیوان غالب داری۔ آن قرم ساق خوب میگو دیکاندار نے کہا کہ دیوان غالب نہ دارم۔ غالب دارم۔ جب اُسنے سنا کہ غالب دارم اور مرزا کو دیکھا تو بہت ہی شرمندہ ہوا مرزا ہنس کر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے کہ شرمانے کی بات نہیں ہے واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ہی ملی ہے۔

مارچ ۱۹۱۳ء کے رسالہ ادبی دنیا میں سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی نے مرزا کا ایک عجیب وغریب لطیفہ لکھا ہے:-

ایک دن میرے میاں حافظ داؤد کے کمرہ پر کنور ابراہیم علی خاں صاحب رئیس اترولی ضلع بلند شہر سے ملنے گئے۔ کنور صاحب نے میرے میاں سے کہا کہ نواب صاحب مرزا نوشہ صاحب سے ملے ہوئے کئی دن ہوگئے ہیں صبح کا سہانا وقت ہے چلئے ہم اور آپ مرزا صاحب سے مل آئیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ بسم اللہ۔ اور دونوں صاحب مرزا صاحب کے مکان پر پہونچے۔ دیکھا کہ دیوان خانہ خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ نہ خود بدولت ہیں۔ نہ میاں کلیاں نہ خدمتگار۔ انگنائی میں مونڈھے بچھے ہوئے تھے۔ دونوں صاحب اون پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ یکایک مرزا صاحب بیت الخلا سے اس ہئیت کے ساتھ برآمد ہوئے۔ ننگے سر گلے میں ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ ایک برہ پاجامہ پاؤں میں کفش پائیاں۔ اور سیدھے ہاتھ میں برانڈی کی خالی بوتل۔ مرزا صاحب کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر ان دونوں صاحبوں کو تاب نہ ہوئی اور ہنسی کے مارے لوٹ ہوگئے ہنستے ہنستے گلے میں اچھو لگ گیا مرزا صاحب بھی ان کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور مزاج پرسی ہونے لگی۔

نواب صاحب۔ کیوں آقا اب پینے کا شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ بیت الخلا میں بھی بوتل ساتھ جانے لگی۔

مرزا صاحب۔ توبہ کیجئے توبہ۔ اپنے منھ پر تھپیڑ مارئیے۔ شراب جیسی پاک چیز بیت الخلا میں نہیں جا سکتی میں اس کی حرمت کو خوب جانتا ہوں۔

نواب صاحب۔ تو پھر یہ بوتل آپ بیت الخلا کیوں لے گئے تھے۔

مرزا صاحب۔ آپ ان باتوں کے پیچھے نہ پڑے

مگر نواب صاحب اور کنور صاحب نے نہ مانا۔ اور خدا رسول کا واسطہ دیا کہ راز بتا ہی دیجئے۔ تو مرزا صاحب نے ایک آہ کھینچکر کہا کہ میں آج صبح اٹھا تھا اور جائے ضرور جانے کا ارادہ تھا۔ صحن چبوترہ کے کھسنے پر خدمتگار آفتابہ تانبے کا پانی سے لبریز رکھ کر چلا گیا تھا۔ ایک فقیر دیوان خانے میں گھس آیا۔ اور کہنے لگا کہ نواب صاحب کے دم قدم کی خیر۔ ایک چراغ دلوائیے۔ میں نے کہا کہ بابا اس وقت تو کچھ حاضر نہیں ہے۔ معاف فرمائیے۔ میں نے ہرچند

یقین دلایا کہ اس وقت پیسہ نہیں ہے۔ مگر اس نے نہ مانا اور کہا کہ آفتابہ موجود ہے لیجائیے۔ فقیر نے آفتابے کا پانی پھینکا۔ آفتابہ جھولی میں ڈالا اور چل دیا۔ اس میں قضائے حاجت کا وقت قریب آگیا۔ تو میں نے اس خالی بوتل میں پانی بھرا اور جائے ضرور میں طہارت کے لئے لے گیا۔ طہارت کر کے باہر آتا تھا کہ آپ دونوں صاحب وارد ہوئے اور ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گئے کہ بتائیے بوتل شریف بیت الخلا میں کیوں گئی تھی۔

مرزا کے ایک مصرع پر ناطق مکرانی نے اعتراض کیا۔ مصرع یہ ہے۔ ع خوک شد و بچہ زد و نہ صار کرد ـــــ اعتراض یہ تھا کہ خوک کے بچہ نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کو یہ لکھ کر بھیجا۔ مرزا نے جواب میں لکھ بھیجا۔ کہ آپ کی بندہ نوازی کا ممنون اور آپ کی اصلاح کا ممنون ہوں۔ خیر میں اس کو بدل دوں گا۔ معاف کیجئے میں نے سوروں کا کاروبار نہیں کیا اس لئے مجھے معلوم نہ تھا۔

ایک دن مرزا غالب فتح الملک بہادر سے ملنے گئے جب غلام گردش میں پہونچے تو خدمتگار نے صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں وہ کسی کام میں تھے فوراً بلا نہ سکے۔ مرزا غالب وہیں ٹہلتے رہے صاحب عالم نے کچھ دیر کے بعد ملازم سے پکار کر فرمایا۔ ارے دیکھ مرزا صاحب کہاں ہیں۔ مرزا غالب نے وہیں سے جواب دیا غلام گردش میں ہے۔ صاحب عالم ہنستے ہوئے نکل آئے اور ساتھ لے آئے۔

ایک دفعہ مرزا صاحب کسی دعوت یا مشاعرہ سے واپس آرہے تھے۔ رات زیادہ گزر گئی تھی۔ مولانا فیض الحسن صاحب فیض سہارنپوری بھی ہمراہ تھے۔ ایک تنگ گلی سے ہو کر گزر رہے تھے۔ آگے ایک گدھا کھڑا تھا۔ مولانا فیض نے کہا۔ کہ مرزا صاحب دلی میں گدھے بہت ہیں۔ مرزا صاحب نے بیساختہ کہا کہ نہیں صاحب باہر سے آجاتے ہیں۔ مولانا خفیف ہو کر چپ ہو رہے۔

مرزا صاحب سے کہا گیا کہ آپ اپنی ثقل سماعت کا علاج نہیں کرتے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ دو وجہوں سے۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں بہشتی ہو گیا۔ دوسرے مرنے کے بعد جب نکیرین سوال کریں گے من ربک و ما دینک تو عذر گراں گوشی سے ہاں ہوں کر کے ٹال دوں گا۔

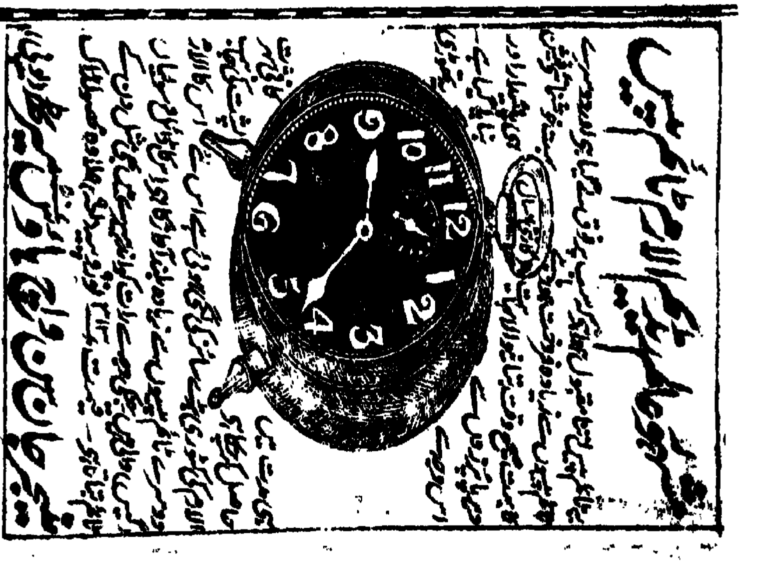
دلی میں ایک مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی ایک فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ اور مولوی امام بخش

صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھاع بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیاع وے بجلہ اول عصائے شیخ بخفت

بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا لیں گے۔

بھوپال سے ایک شخص دلی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ ان سے بکمال اخلاق پیش آئے مگر معمول! وقت تھا بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ ان بیچارے کو خبر نہ تھی کہ آپ کو شوق بھی ہے۔ انھوں نے کسی شربت کا شیشہ سمجھ کے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس تھے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکے اٹھا لیا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ اور فرمایا کہ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی

عبد الباری آسی



مُلاحِظات

غالب کا مطالعہ اس وقت تک اتنی مختلف نگاہوں سے ہو چکا تھا کہ بظاہر کوئی زاویہ ایسا نہ رہ گیا تھا، جس کو پیش نظر رکھ کر بحث کا کوئی جدید پہلو اختیار کیا جاتا، لیکن ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالباری آسی نے آخر کار ایک اسلوب جدید گفتگو کا نکال ہی لیا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ جس طرح انھوں نے غالب کی شوخ نگاریوں کا استقصا کر کے اس مضمون کو مرتب کیا ہے، وہ یقیناً کافی محنت و دردسری چاہتا تھا۔

غالب ایک فلسفہ طراز شاعر تھا یا نہیں؟ — اس پر دو مختلف رائیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ غالب، صحیح رنگ تغزل کے لحاظ سے بلند ترین مرتبۂ شاعری کا حامل تھا یا نہیں؟ — اس مسئلہ پر علیحدہ علیحدہ مختلف دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں۔ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے کوئی خاص پیغام دنیا کو پہونچایا یا نہیں؟ — یہ بھی محل اختلاف و نظر ہو سکتا ہے — لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ غالب اپنی شوخ طبعی، فطری ذہانت، اور شوخ نگاری کی حیثیت سے ایک مخصوص امتیاز کا مالک تھا، تو یقیناً یہ ایک ایسا دعوے ہوگا جس کے ثبوت میں نہ کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ملک میں دو رائیں اس مسئلہ پر نظر آئیں گی۔

اس کا کلام یکسر الہام فلسفہ تھا، مسلّم — اس کا رنگ تغزل جذبات محبت کے سوا کچھ نہ تھا حقیقت مبرہن — اس کا پیام شاعری بالکل پیام خداوندی تھا، لاریب فیہ — لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ اگر اس نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ صرف فلسفۂ تفاؤل و مسرت تھا، اگر اپنی غزل سرائی میں اس نے جذبات محبت سے بحث کی تو وہ یاس و قنوطیت سے بالکل علیحدہ تھی اور اگر اس نے کوئی پیام الوہیت سنایا، تو وہ اُس خدا کا تھا جس کا مظہر یونانیوں میں باخوس (شراب کا دیوتا)

پھر اگر آپ اُس کے اس فطری رنگ کو تلخ یا شیریں حقیقت نہیں کہہ سکتے تو سوائے شوخی و شوخ طبعی کے کس چیز سے تعبیر کریں گے — یہی سبب ہے کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے متعلق جس قدر شاعرانہ استہزا سے اس نے کام لیا، شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نظر آئے۔ اور یہی اس کی فطرت ہے کہ انتہائی ملول و حزین جذبات کو بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی کہ

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز
گزار بادا کہ ماتم زدہ تنہا ماند

کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے اسی لئے دشنہ چھپا رکھا تھا کہ وہ اپنی جان دے دیگا۔ اور اس سے مقصود نمائش کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے یہاں نہ تو بیدل کا وہ عمیق فلسفۂ تصوف ہے جو براہ راست روح انسانی کو متاثر کرکے کسی اور عالم میں پہونچا دیتا ہے، نہ درد کی سی وہ درد سرائی ہے جو انسان کو دل پکڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کرتی ہے، و نہ کاروبار محبت میں مومن کی سی حقیقت نگاری ہے جو سینہ میں نشتر پر نشتر توڑتی چلی جاتی ہے، لیکن بایں ہمہ نہ آج بیدل سے کوئی اسقدر واقف ہے جتنا غالب سے اور نہ درد و مومن کا اتنا چرچا زبانوں پر ہے جس قدر غالب کا — اس وقت تک جتنا لٹریچر اردو میں غالب پر فراہم ہو چکا ہے، اور برابر ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی اردو یا فارسی شاعر کو نصیب ہوا ہو — اس کا سبب صرف غالب کی رندانہ شاعری، آزاد نگاری، شوخ گفتاری و خوش طبعی ہے جو ہر جگہ اپنے لئے ایک نیا اسلوب بیان، ایک جدید طرز ادا، ایک بدیع شیوۂ گفتار پیدا کر لیتی ہے اور سننے والا کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ

گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یاد رکھئے زمانہ جس قدر ترقی کرتا جائے گا، غالب کے پرستار بڑھتے جائیں گے، کیونکہ یہ دور روحانیت و جذبات کا نہیں ہے، بلکہ مادی ترقی اور شدت عمل کا ہے۔ دنیا حزن و ملال سے بیزار ہو کر اب نشاط و مسرت کا تعاقب کر رہی ہے جس کے اسباب علوم جدیدہ نے ہر چہار طرف منتشر کر رکھے ہیں۔ اس لئے اب وہ کوئی بات دل دکھانے والی نہیں سننا چاہتی، بلکہ وہ صرف ایسی گفتگو چاہتی ہے، جس میں تفاول و مسرت ہو، نشاط و ولولہ ہو، اور چونکہ کلام غالب کی بنیاد ہی طربیہ جذبات پر قائم ہے، اس لئے اس کو مقبول ہونا چاہئے اور جوں جوں انسانیت دنیاوی ترقی میں آگے بڑھے گی، اتنی ہی زیادہ قبولیت اس کو حاصل ہوتی جائے گی۔

دین و مذہب دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق ایک شخص کے ذاتی اعتقادات سے ہے۔ اور دوسرے کا سوسائٹی سے۔ اس لئے غالب مذہب کے لحاظ سے جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن دین کے لحاظ سے ان میں ابن الراوندی، ابو العلاء المعری، یا کم از کم علامہ ابن تیمیہ کی روح ضرور کام کر رہی تھی۔ اور اس خصوص میں ان کی آزاد خیالی کا اب سے ایک صدی قبل وہی عالم تھا جس میں آج ہر شخص سرشار نظر آتا ہے اور جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ

بامن میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

میرا یہ ظاہر کرنا ہے کہ غالب کی شاعری چونکہ حد درجہ آزاد شاعری تھی۔ اور وہ دین ایسی چیز کو بھی اسے مجروح کئے بغیر نہیں رہتے تھے، اس لئے دور حاضر کے انسان کو جو ہر چیز میں آزادی چاہتا [illegible]۔ اور یہ آزادی جس قدر ترقی کریگی، غالب اتنا ہی زیادہ ہر دلعزیز ہوتا

جائے گا۔

یہ درست ہے کہ غالب کے یہاں ایسے شعر بھی ہیں جو ان کے اصل پیغام سے علیحدہ صرف دنیائے جذبات اور تاثرات حزن و ملال کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں، لیکن اول تو وہ بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں بھی غالب کی تنقیدی انفرادیت بدستور باقی رہتی ہے ——— ان کی ایک نہایت ہی پاکیزہ غزل ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بہ جرم تپیدن کنارہ میکردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم — ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

دیوان غالب میں مشکل ہی سے اس سوز و گداز کے شعر اور مل سکتے ہیں، یہاں تک کہ اول نظر ان کے زمرۂ غالب ہونے پر بھی آسانی سے یقین نہیں ہو سکتا، لیکن جنھوں نے غالب کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عالم یاس و نامرادی میں بھی ان اشعار کے اندر غالب کی انفرادیت بدستور قائم ہے اور اس کی فطرت کا وہ جوش جو دوسرے اشعار میں شوخی کی صورت سے نمودار ہے، یہاں اس نے الفاظ کے رکھ رکھاؤ، مضمون کی بلندی، خیال کی رفعت اور بندش و ترکیب کی صورت اختیار کر لی ہے اور اگر ان خصوصیات کو علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ عالم تاثر یکسر محو ہو جاتا ہے۔

الغرض مدعا یہ کہنا ہے کہ غالب کی وہ خصوصیت جو اسے تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہے، صرف اس کی شوخی و رندی ہے اور بدقسمتی سے اسی چیز کو اس وقت تک اکثر نقادان فن نے نظرانداز کر دیا تھا۔

ہم ممنون ہیں کہ جناب آسی صاحب نے بہت کاوش سے اس موضوع پر اتنا مسالہ فراہم کر دیا۔ اور آئندہ اگر کوئی شخص اس بحث پر کچھ لکھنا چاہے گا تو اس کو ان صفحات سے بہت مدد ملے گی۔

نیاز

بسم اللہ

نگار

سلسلہ ۲۱ — فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۴۲ء — شمارہ ۲

نگار

جلد ۲۱ فروری سنہ ۱۹۳۲ء شمارہ ۲

ملاحظات

سنتے ہیں کہ عہد عتیق میں جب خدا کسی ملک وقوم پر اپنی برہمی کا اظہار کیا کرتا تھا، توکبھی صورتیں مسخ کرکے انسان سے بندر بنادیتا تھا، کبھی "طیراً ابابیل" کی قسم کا کوئی آسمانی عذاب مسلط کرکے برباد کردیتا تھا اور کبھی من وسلویٰ کی فراہمی دبند کرکے گرسنگی کے شدائد میں مبتلا کردیتا تھا۔ فرعون واہل فرعون کی غرقابی نیل کی داستان کسے نہیں معلوم اور ساکنان سدوم پر آتشیں بارش کا افسانہ کس سے مخفی ہے ——— لیکن اب خدا ان طبیعی ذرائع سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ انسان کو خود ہی کے اکتسابات سے تباہ کراتا ہے اور اس کی عقل خود اسی کی بربادی میں صرف کی جاتی ہے

آج یورپ کا ترقی یافتہ انسان، مہذب وشائستہ انسان، علوم وفنون کا ماہر انسان، اخلاق وانسانیت کے لحاظ سے جس رتبۂ بلند پر فائز ہے، اس کا حال ان محکوم ومغلوب جماعتوں، اُن مجبور ومقہور قوموں سے پوچھو جو اس کی سیادت وحکومت میں غلامانہ زندگی بسر کررہی ہیں اور پھر غور کرو کہ کیا نوع انسانی کا اپنے اخلاق کے لحاظ سے بندر ہوجانا اس سے زیادہ کوئی مفہوم اور رکھ سکتا ہے ——— گزشتہ محاربۂ عظیم میں ہوائی جہازوں نے دنیا کی جتنی بے گناہ آبادی کو خاک میں ملادیا، کیا اس کا اندازہ آسان ہے اور کیا "طیراً ابابیل" اس سے زیادہ سخت آسمانی عذاب ہوسکتا تھا؟ ——— پھر آج دنیا جن اقتصادی دشواریوں میں مبتلا ہوکر اپنی ذہنی ودماغی، معاشری واقتصادی، سیاسی واخلاقی توازن کو ہاتھ سے کھوتی جارہی ہے اور جس عسرت وافلاس نے اس کے جسم وروح کو شدید گرسنگی سے بیتاب بنارکھا ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ من وسلویٰ کے بند ہوجانے پر اس سے زیادہ اضطراب کسی جماعت میں پیدا ہوا ہوگا ——— حقیقت یہ ہے کہ باوجود تمام ترقیوں کے انسان ہنوز ایک درندہ ہے اور دوسرے درندوں سے

اگر اسے کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف اسقدر کہ اُن کے ناخن و چنگال ہر شخص کو نظر آجاتے ہیں اور انسان کے ناخن و چنگال اس کے دماغ میں پنہاں ہیں، اگر شیر کے پنجے صرف جسم کو مجروح کرتے ہیں تو انسان کی خونخواریاں روح کو زخمی کر دینے والی ہیں۔ وہ اگر انسان کو تباہ کرتا ہے تو یہ انسانیت کو برباد کرنے والی ہیں

مغرب و متبعین مغرب کی ترقی کا نصب العین صرف دولت کی فراہمی اور سرمایہ داری کا قیام ہے، علوم و فنون کی ترقیاں، ایجادات و اختراعات کا ہنگامہ، مشینوں کی گردش، صنعت و حرفت کی گرم بازاری، یہ سب نتیجہ ہے اس قارونی ذہنیت کا جس کے نزدیک دولت کا مصرف محض انفرادی عیش و کامرانی اور اجتماعی تباہی و بربادی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ دور اجتماعی احساس کا ہے لیکن ذہن انسانی کے نتائج، اعمال و افکار انسانی کی خواہشات اسقدر خود غرضانہ ہیں کہ مشکل ہے ہم جاہ و ثروت کی ترقی کو انسانی ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار چاہتا ہے کہ ساری دولت اسی کو مل جائے اور طبقہ عمال صرف زندہ رہنے کی حد تک اپنی ضروریات کو پورا کر سکے، مغربی حکومتیں جو صرف سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہیں چاہتی ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کو اپنی غیر ضروری مصنوعات کی منڈی بنا کر محتاج و مفلس بنا دیں اور جس وقت کسی قوم یا ملک میں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے تو تیغ و تفنگ کی مدد سے اس حق استبداد و ملوکیت کو تسلیم کرایا جاتا ہے

پھر ہر چیز کی ایک حد و انتہا ہوا کرتی ہے، اور انتہا کا نام رد عمل ہے۔ جس میں آج تمام مغربی ممالک مبتلا ہیں اور جنگی وجہ سے انگلستان و امریکہ کے دولتکدوں کے سامنے آج خاک سی اُڑ رہی ہے۔ کارخانوں میں مصنوعات کی افراط سے تل رکھنے کی جگہ نہیں لیکن خریدنے والے مفقود، ٹکسالوں میں زر و سیم کے انبار لگے ہوئے ہیں، لیکن بازار میں سکہ کی گردش کرنے کے اسباب موجود نہیں صناعت گاہیں بند ہیں، بنکوں کے دیوالے نکل رہے ہیں، مزدوری فاقہ کشی میں مبتلا ہیں اور بڑے بڑے ساہوکار خودکشی پر آمادہ

چونکہ ترقی علوم و فنون سے صرف استحکام سرمایہ داری کا کام لیا جاتا تھا اس لئے کسی نہ کسی وقت اسکا نتیجہ وہی ہونا چاہئے تھا جو اب ظاہر ہو رہا ہے، لیکن جنگ عظیم نے جرمنی اور روس میں انقلاب پیدا کرکے دنیا کو اس انجام سے قریب تر کر دیا اور وہ زمانہ دُور نہیں جب دنیا کے گوشہ میں روس ہی کا سا اجتماعی انسان (COLLECTIVE MAN) نظر آئے گا اور دولت و ثروت کا طلسم ٹوٹ کر نوع انسانی پھر اسی سطح پر آئے گی جس کا نام مساوات یا زیادہ اصطلاحی رنگ میں "اجتماعیات" و "اشتراکیت" ہے

ہندوستان کے موجودہ سیاسی لٹریچر میں "فن" کا بہترین نمونہ جسے یقیناً "شاہکار" کا مرتبہ حاصل ہونا چاہئے، ہمارے ملک کے گورنر لارڈ ولنگڈن کا وہ پُر از معلومات خطبہ ہے جس میں جناب موصوف نے ہندوستان کے شاندار مستقبل اور اسکی موجودہ خوشحالی و ترقی پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ صاحب موصوف نے سرزمین ہند کی جس "UTOPIA" کا نقشہ پیش کیا ہے وہ اصلاحات جدیدہ کے نفاذ سے قبل کا ہے اسلئے جس وقت گول میز کانفرنس اپنے تمام برکات و انعامات ارزانی فرما چکے گی تو پھر "ہندوستان جنت نشان" کی مسرت و نشاط کا کیا عالم ہوگا ——— فیھا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام والحب ذو العصف والریحان

فبای آلاء ربکما تکذبان ۔ واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کا اندازہ کرنے سے بالکل عاجز و درماندہ ہے

و ملک فہم و کرم ہیں حضرات جو دولت برطانیہ کی حکومت کو ایک ضغطہ و معصیت جانتے ہیں ، کیا حضور ویسرائے کی اس تقریر کے بعد بھی "ان کو غالب کے اس شعر پر ایمان لانے میں تامل ہوگا کہ

بالم بخویش بسکہ بہ بند کمند تو
مردم گماں برند کہ تنگم بہ بند تو

امریکہ میں ایک سیاہ فام حبشی قتل کا مرتکب ہوتا ہے لیکن خود بھی مجروح ہو کر اسپتال پہونچا دیا جاتا ہے اگر مجرم سپید جرم طلاو۔ نیلگوں آنکھیں رکھنے والا ہوتا تو اس کی صحت کا انتظار کیا جاتا اور پھر باقاعدہ عدالت گاہ میں جرم کی تحقیق ہو کر سزا یا رہائی کی صورت میں کوئی نتیجہ پیدا ہوتا ، لیکن وہاں اس کا انتظار نہیں کیا جاتا ، اور ایک جماعت اسے اسپتال سے زبردستی کھینچ کر باہر لے جاتی ہے ۔ اور نذر آتش کر دیتی ہے ——— یہ ہیں اخلاق اس قوم کے جو ہمارے لئے " بیرحمی جانوراں " کو بھی گوارا نہ کر کے اس کے انسداد کے لئے قانون نافذ کرتی ہے ۔ پھر فرض کیجئے کہ اگر آج ہم سیاہ قوموں کے پاس بھی ہوائی جہاز ، جنگی بیڑا ، اور کوہ شکن توپیں کثیر تعداد میں موجود ہوں اور ہم بھی کسی سفید رنگ انسان کے ساتھ یہی سلوک کریں تو کیا کسی کو زبان ہلانے کی جرأت ہو سکتی ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز دنیا میں صرف " قوت " ہے اور یہ نعمت جب تک کسی کو حاصل ہے اس کی ہر بات سراہے جانے کے قابل ہے ، اس کا ظلم بھی ایک ادا ہے اور اس کی بے اعتنائی بھی ایک عشوۂ دل نواز

سر سید مرحوم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اگر نماز میں بجائے قرآنی آیات کے ان کا ترجمہ پڑھا جائے تو کیا حرج ہے ۔ سر سید نے جواب دیا کہ " حرج تو کچھ نہیں لیکن نماز نہ ہوگی " ——— سر سید غریب کو کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے جب مسلمانوں ہی کی حکومت میں انھیں کا ایک فرمانروا قانوناً قرآنی آیات کا نماز میں پڑھنا ممنوع قرار دیگا اور بجائے ان کے صرف ترجمہ کا پڑھنا کافی سمجھا جائے گا ۔ پھر کیا ہے ہندوستان کے ۷ کرور مسلمانوں میں یہ جرأت جو دنیا کے اس سب سے بڑے دجال وکالی چرن کو اس فعل سے باز رکھ سکے اور کیا ہے کوئی مذہب کے نام پر جان دینے والا جو اس کافر اعظم ، اس ملحد اکبر ، اور اس زندیق دہریہ کو تہ تیغ کرے

جس وقت ترکی کی مذہبی آزادی کی کوئی خبر آتی ہے تو یہاں کا مذہبی طبقہ اسے صرف غلط پروپگنڈا کہکر ٹال دیتا ہے ، اس لئے نہیں کہ وہ واقعی اسے غلط سمجھتا ہے ، بلکہ صرف اسی بنا پر کہ اس کو صحیح سمجھنے کے بعد وہ آخر کر بھی کیا سکتا ہے

جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ مصطفے کمال پاشا کی آزادیوں کو غلط ہی سمجھیں لیکن جس وقت ان لوگوں سے گفتگو کا موقعہ ملتا ہے جو وہاں جاکر خود اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات کا مطالعہ کر آئے ہیں تو پھر ہم اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہمارا

اسلام پر آنسو بہانے کے قابل ہے یا مصطفےٰ کمال کی بیدینی! اگر یہ پیشین گوئی صحیح ہے کہ دنیا سے مذہبیت کا اُٹھ جانا لازمی نتیجہ ذہن انسانی کی ترقی و آزادی کا ہے تو ممکن ہے عہد حاضر کی تاریخ میں مصطفےٰ کمال کے یہ کارنامے زریں حروف سے لکھے جائیں لیکن کم از کم ہندوستان کے مسلمان کبھی اس سے متفق نہیں ہو سکتے

افسوس ہے کہ اس وقت تک کسی خانوادۂ علم و اعتبار سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی کہ ان حالات میں حکومت انگورہ کی مسجد میں نماز جائز ہے یا نہیں اور وہاں کے مسلمان خاندانوں سے رشتۂ مناکحت قائم کرنا کیسا ہے؟

لاہور میں عرصہ سے ایک انجمن قائم ہے جو اپنے آپ کو "عقل پرست" کے نام سے موسوم کرتی ہے اور جس کے لائحۂ عمل میں سب سے پہلا فرض خدا کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ حال ہی میں ہمیں اس انجمن کا ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں نہایت شد و مد سے انکار خدا کے دلائل پیش کئے گئے ہیں

اس میں شک نہیں کہ "عقل پرستی" نہایت معقول بات ہے اور کون ہے جو عقل سے کام لینے کو بُرا جانے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا ہی کو کیوں عقل کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی کے بہت سے مسئلے ایسے ہیں جو عدم استعمال عقل کی وجہ سے ہنوز لاحل پڑے ہوئے ہیں، سب سے پہلے ان پر کیوں نہ عقل صرف کی جائے۔ معاشرت و اقتصاد، تعلیم و تربیت، صنعت و تجارت، سیاست و تمدن سے متعلق کثرت سے ایسے مسایل ہمیں ملتے ہیں، جن پر ہم نے آجتک غور نہیں کیا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو تو نظر انداز کیا جائے جن سے ایک قوم کا مستقبل بنتا ہے اور خدا کو لے لیا جائے کہ اس کے وجود سے انکار کرنا کسی طرح صحت اخلاق کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ ایسے مسایل میں سر کھپانا سراسر تضیع اوقات ہے اور اب دنیا کو ان کی طرف متوجہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم اس خیال سے کہ ممکن ہے یہ پمفلٹ ناظرین نگار میں سے کسی کی نظر سے گزرا ہو، اس ماہ کی اشاعت میں ایک مضمون اس موضوع پر شایع کیا جاتا ہے

لندن کی ایک گلی ہے جس کے دونوں طرف پختہ لیکن کثیف عمارات کا سلسلہ نظر آتا ہے ایک جماعت نکلتی ہے جن کے جسم پر کوٹ، ٹانگوں میں پتلون، سر پر ہیٹ، گلے میں کالر سبھی کچھ موجود ہے لیکن زرا شکستہ و خستہ حالت میں ـــــ یہ جماعت اپنے افلاس کے بیان سے کلیسائے وسٹ منسٹر سے لے کر قصر ونڈسر تک ایک تہلکہ برپا کر دیتی ہے کیونکہ ان لوگوں کو صبح کے وقت توس کے ساتھ کافی مکھن نہیں مل سکتا، ناشتہ میں بھنی ہوئی مچھلی ان کو میسر نہیں ہوتی، رات کو وہ تھیٹر و سینما میں شریک نہیں ہو سکتے، اپنے کپڑے روزانہ دھوبی کو نہیں دے سکتے اور عمدہ قسم کا تمباکو ان کے پائپ میں نظر نہیں آتا، ان کی تعداد دنیا سے زیادہ چند لاکھ ہے

ہندوستان میں ایک جماعت ایسی ہے جسے دو وقت تک خشک روٹی نہیں ملتی جن کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی

نظر نہیں آتا، جو جاڑوں میں سردی کی شدت سے، گرمیاں گرمی کی سختی سے اور برسات میں بارش کی نمی سے لاکھوں کی تعداد میں ہر سال مختلف عوارض کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہے، جس نے لہو لعب، سیر و تفریح کے سلسلہ میں کبھی سینما و تھیٹر کا نام بھی نہیں سنا۔ اور ان کی تعداد کروروں سے زیادہ ہے۔ لیکن لندن کی وہ چند لاکھ نفوس پر مشتمل ہونے والی جماعت جسے رئیسانہ زندگی بسر کرنے کے ذرائع حاصل نہیں ہیں، زیادہ اہم، زیادہ قابل توجہ اور زیادہ غریب ہے۔ اور ہندوستان کے وہ کروروں انسان جن پر آسمان و زمین دونوں تنگ ہیں، جو بقاء حیات کے لئے بھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے، زیادہ بہتر حالت میں ہیں اور زیادہ بے توجہی کے قابل ——— یہ ہے موجودہ دَور کے عقل و حکمت کا فیصلہ اور یہ ہے عہد حاضر کی متمدن دنیا کی وہ ذہنیت جس کی بلندی کا ماتم ہر طرف گایا جا رہا ہے اور جس کے سامنے ہماری خوئے تسلیم و رضا کا ہنوز یہ عالم ہے کہ:

بردست و پائے بندگرانے نہادۂ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ

مسلمانوں کی دو تحریکیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں، ایک تحریک خلافت دوسری تحریک تبلیغ، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں نے کافی نقصان ملک کو پہونچایا۔ ہندوستان میں بیٹھ کر خلافت کے نام سے کسی جماعت کی تنظیم سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کہ مسلمانوں کو اندرون ملک کے مسائل کی طرف سے غافل و بے پرواہ رکھا جائے، چنانچہ جس وقت تک ترکی میں خلافت کا وجود باقی رہا، ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ اس سے دلچسپی لی۔ اور اپنی بڑی قوت اسی پر صرف کرتے رہے، درانحالیکہ قیام خلافت کے بہترین زمانہ میں بھی سلطنت ترکی مسلمانان ہند کی کوئی امداد کر سکی اور نہ کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسیات اندرونی میں وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے اور کبھی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ انہیں زندگی اسی ملک میں بسر کرنا ہے اور اسی ملک والوں کے ساتھ تعلقات تمدن قائم کرنا ہیں۔ لاکھوں روپیہ خلافت کے نام پر مسلمانوں سے جمع کیا گیا اور اس کا ایک پیسہ بھی کسی ایسے کام میں صرف نہ ہوا جسے ہم کو کوئی فائدہ پہونچتا۔ اگر یہ رقم محض مسلمانوں کی تعلیم ہی پر صرف ہوتی تو آج معلوم نہیں یہ جماعت ترقی کے کس زینہ پر ہوتی

اس کے بعد ہی بدقسمتی سے تحریک تبلیغ شروع ہو گئی جس کا عظیم ترین نقصان یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی شدھی و سنگھٹن کے نام سے نہایت ہی نامعقول تحریک مضبوط ہو گئی اور ہمیشہ کے لئے ملک کی ان دو بڑی جماعتوں میں ایک وسیع خلیج حایل ہو گئی۔ وہ لوگ جنھوں نے تاریخ ہند کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کوئی مذہب صحیح معنی میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ صرف ایک معاشرتی نظام ملک کے اندر قائم تھا جس میں تمام قومیں برابر کی شریک تھیں۔ جب مسلمان یہاں آئے اور انھوں نے مذہب کی آواز بلند کی، تو ہندوؤں میں بھی اسی قسم کی تنظیم کا خیال پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ تعصب و احتراز، مغایرت و اجنبیت کی کیفیت

بقیہ نمبر ۶

پھر اس میں کلام نہیں کہ ہر چند مُسلم حکومت یہاں آنے کے بعد بھی مُسلم ہی رہی، لیکن اس نے ہندوؤں کو مُسلمان بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی، اور نہ اس تفریق کی بنا پر اصول عدل و انصاف کو متاثر ہونے دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے سوائے دو چار کے، اسی ملک کو اپنا گھر بنالیا اور یہیں کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ تمدنی تعلقات قائم کئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی مغائرت کا نظم حکومت پر کوئی اثر نہ پڑا اور نہ ہندوؤں نے اس تفریق کو زیادہ محسوس کیا۔ جب یہ دور ختم ہو کر برطانیہ کی حکومت شروع ہوئی تو چاہیے تھا کہ یہاں کی مسلم آبادی تفریق مذہب کو بالکل بھلا دیتی اور معاملات ملکی میں دونوں کا اجتماع ہو جاتا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور مسلمانوں نے اپنی عمر کا کافی حصہ صرف اس غرور و نخوت کی پرورش میں صرف کر دیا کہ وہ شاہان ہند کی یادگار ہیں اور اس لئے ان کو حق حاصل ہے کہ وہ ہندوؤں کو اسی طرح محکوم سمجھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہونے لگی اور ہندوؤں کی بعض جماعتوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان تبلیغی مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے اپنی جماعت کو بڑھانے کا زیادہ موقع رکھتے ہیں، اپنی اندر بھی ایک جماعت آریہ سماج کے نام سے پیدا کی جو بالکل مسلمانوں کی طرح دوسرے مذاہب والوں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی مدعی تھی اور ہے —— مگر چونکہ ہندوؤں میں یہ تحریک بالکل ان کے مسلک قدیم کے خلاف تھی اس لئے اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور ان کی کوشش زیادہ سے زیادہ یہی رہی کہ کوئی ہندو مسلمان نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے بعد جب مسلمانوں نے ایک مستقل انجمن ہی تبلیغ کے نام سے قائم کر لی تو پھر ان میں بھی جوش پیدا ہوا اور اس طرح باقاعدہ دو محاذ تیار ہو گئے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں انجمن تبلیغ کے ابتدا اس وقت ہوئی جب پہلے آریہ جماعت نے آگرہ کے ایک گاؤں میں چند نومسلم لوگوں کو شدھی کرنے کا اعلان کیا، لیکن اس کا جواب اگر مسلمان صرف خاموشی سے دیتے اور اس طرف کوئی توجہ نہ کرتے تو ان کی تحریک شدھی اسی وقت فنا ہو جاتی۔ اور سنگھٹن وغیرہ کے جھگڑے بھی نہ پیدا ہوتے جو شدھی سے زیادہ مضرت رساں مسلمانوں کے لئے ثابت ہوئے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر چند لاکھ دیہاتی اور غیر تعلیم یافتہ ہندوؤں کو مسلمان بنا بھی لیا جائے تو اس سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے جبکہ مسلمانوں کی موجودہ تعداد ہی کو منظم کر کے ان کی تعلیم و اصلاح کا اہتمام نہیں کر سکتے —— عہد سعادت، عہد خلافت اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں کبھی یہ ذہنیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو تعداد میں زیادہ کر لیں، بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جتنے مسلمان ہیں انھیں کو صحیح معنی میں مسلمان قائم رکھیں۔ اسلام نے ہمیشہ کمیت کے مقابلہ میں کیفیت کو ترجیح دی ہے اور اسی بنا پر اس نے دس افراد نے مخالف کے سو افراد کو نیچا دکھایا ہے، لیکن اب ہماری ذہنیت یہ ہے کہ صرف تختہ مردم شماری میں چند ناموں کا اضافہ دیکھنے کو کافی سمجھتے ہیں اور غالباً یہی بڑا ثبوت ان کے نزدیک اسلام کی صداقت کا ہے۔ اس وقت ضرورت تو اس کی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ ۷ کروڑ کی تعداد کو بھی گھٹا کر نصف کر دیا جائے تاکہ جلد سے جلد اُن کی تنظیم ہو سکے، نہ یہ کہ اس میں اور ناکارہ افراد کا اضافہ کر کے اصلاح کو اور زیادہ دشوار بنا دیا جائے۔ یہ خیالات میں نے اس لئے

ظاہر کے گر اس دوران میں بعض مقامات سے تبلیغ و خلافت کے نام سے چند اشتہارات و رسائل بغرض اشاعت و تبصرہ میرے پاس آئے تھے اور اس لئے میں ان انجمنوں کو جنھوں نے یہ لٹریچر میرے پاس روانہ کیا ہے بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ان دونوں تحریکوں کا مخالف ہوں اور مخالفت کے اسباب یہ ہیں جو عرض کئے گئے

اس ماہ کے رسالہ سے ایک نہایت ہی ضخیم و بسیط کتاب "تذکرۂ معرکۂ سخن" کا سلسلۂ اشاعت شروع کیا گیا ہے۔ جب تک یہ کتاب ختم نہ ہوگی ہر ماہ ۱۶ صفحات اس کے شایع ہوتے رہیں گے۔ اس لئے میں ناظرین نگار کو مطلع کرتا جاتا ہوں کہ وہ ان اوراق کو بہت حفاظت سے رکھیں اور جب کتاب ختم ہو جائے تو سب کو ایک شیرازہ سے منسلک کرا کے اپنی کتاب تیار کرا لیں، ورنہ اخیر میں یہ مجموعہ کسی طرح چار روپیہ سے کم میں نہ ملے گا۔ یہ تالیف جس قدر اہم و مفید ہے، اسکا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں، لکھنے کی ضرورت نہیں

نگار میں آیندہ جیسے جیسے اہم مضامین شایع ہونے والے ہیں ان کا اندازہ ذیل کے بعض عنوانات سے ہو سکتا ہے:

(۱) مذاہب عالم اور اعضار جنسی کی پرستش	یہ مضمون کئی جزو پر مشتمل ہے اور نہایت نادر واقعات و تحقیقات کا مجموعہ ہے
(۲) عریانی، تاریخ و فلسفہ اخلاق و مذہب کی نظر سے	یہ مقالہ بھی کافی طویل ہے اور نہایت دلچسپ حقایق اپنے اندر رکھتا ہے
(۳) عہدنامۂ عتیق کی روایات کا ماخذ	یہ مضمون بھی کئی جزو کا ہے اور عجیب و غریب انکشافات تاریخی کا حامل ہے

یہ تمام مضامین اڈیٹوریل ہوں گے۔ علاوہ ان کے شعبۂ ادب میں بھی نہایت معرکۃ الآرا مقالات پیش کئے جائیں گے

افسوس ہے کہ اس مرتبہ پریس کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے نگار چار چھ دن کی تعویق سے شایع ہو رہا ہے۔ ہر چند نگار کی صحیح تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ ہے لیکن چونکہ ہمیشہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں اسکی اشاعت ہو جایا کرتی ہے اس لئے یہ معذرت ضروری تھی۔ یقین ہے کہ آیندہ اہل مطبع اس شکایت کا موقعہ نہ دینگے۔

مسئلہ حسب و نسب خالص اسلامی نقطۂ نظر سے

ہمارے فاضل دوست مولوی عبدالمالک صاحب آروی نے یہ مضمون جس کاوش و محنت و تحقیق و استقصاء سے لکھا ہے اس کا اقتضا یہ تھا کہ اس کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جاتا اور حقیقتاً فاضل مضمون نگار کا بھی یہی مقصود و مدعا تھا۔ لیکن محض ہمارے اصرار پر انھوں نے اس مقالۂ گرامی کو ہمارے پاس بھیجدیا۔ اور موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے ہم نے اس کی اشاعت دسمبر سنہ ۳۱ء کے نگار سے شروع کردی

دسمبر کے نگار میں صرف تمہیدی حصہ اس اہم مضمون کا شائع ہوا ہے، اسکے بعد جناب عبدالمالک صاحب نے اقوام عالم کی تقسیم پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور پھر نسلی خاطت، فلسفۂ معاشرت و ازدواج پر اپنی تحقیقات پیش کی ہے۔ ہم ان دونوں حصوں کو ابھی شائع نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس ماہ سے اس مضمون کی اشاعت اُس حصہ سے شروع کرتے ہیں جو بغیر طویل مباحث ذیلی کے اصل موضوع کی طرف منجر ہوجاتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ناظرین نگار اس میں کافی ذخیرۂ معلومات تاریخی کا پائیں گے اور تفاخر نسب کا جو خیال بعض قوموں میں پیدا ہوگیا ہے اسکی حقیقت سے واقف ہوکر اس چیز پر فخر کرنا سیکھیں گے جسکا نام صرف انسانیت و اخلاق ہے۔ ہم نے اس تغیر کے ساتھ اس مضمون کا عنوان بھی بدل دیا ہے امید ہے کہ جناب عبدالمالک صاحب اس سے اتفاق فرمائیں گے

تخیل نسب پر سیاسیات کا اثر

تاریخ کے صفحات ہمیں بتاتے ہیں کہ مرور ایام کے ساتھ مختلف ملتیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں دنیا نے نہ ہمیشہ کسی کا ساتھ دیا ہے نہ دیگی، اقوام کی تاریخوں اور افراد کے سوانح زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک قوم کسی مخصوص زمانہ میں انتہائی پستی سے نکل کر برسر اقتدار ہوتی ہے، اور دوسری کمال ترقی کے بعد بتدریج منازل ہبوط سے گزرنے لگتی ہے۔ پھر عروج و زوال کے اس تغیر کے ساتھ صرف ہماری ذہنیت ہی نہیں بدلتی بلکہ

ہیئت اجتماعیہ کے روابط بھی اسی انقلاب کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص اپنی افتادگی و بیچارگی کی حالت میں دنیا کی ہر چیز کے ساتھ وابستگی اور ربط رکھنے پر مجبور تھا تو آج تغیر حالات کے ساتھ اس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے، کہ وہ اس تعلق کو جو فرو تر اصحاب کے ساتھ قائم تھا منقطع کر دے اور یہی خیال فخر نسبی کا سنگ بنیاد ہے، اسیاسیات نے اس کو تین صورتوں سے بیان کیا ہے:۔

(۱) حصول حکومت و طلب جاہ کے لئے نسب کے بارہ میں غلط بیانیوں سے کام لینا

(۲) حکومت و دولت حاصل ہونے کے بعد اثر قائم رکھنے کے لئے سلسلۂ نسب غلط وضع کرنا

(۳) مال و دولت، حکومت و ریاست کے ذریعہ سے اعلیٰ خاندانوں کو اپنے اندر جذب کرنا

تاریخ کے اندر ان تینوں صورتوں کے شواہد بکثرت ملتے ہیں

علویۂ مصر حضرت امام جعفر صادق ؑ کی وفات کے بعد، زیدیہ و رافضی کے علاوہ شیعوں کے یہاں دو اہم جماعتیں اور پیدا ہو گئیں، ایک حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ کی امامت کی قائل ہوئی اور دوسری نے محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادق ؑ کی امامت تسلیم کی، پہلی جماعت "اثنا عشری" کہلاتی ہے، دوسری "اسمٰعیلیہ" علویۂ مصر اپنا نسب محمد بن اسمٰعیل ؑ سے ملاتے ہیں لیکن تاریخ اور انساب میں اس کے خلاف روایتیں موجود ہیں اور بعض نسابین، علویۂ مصر کو "سید" تسلیم نہیں کرتے،

۲۹۶ھ میں عبید اللہ المہدی نے حکومت کی بنا ڈالی اور ۵۶۳ھ میں العضد لدین اللہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان میں جو ۱۰ حکمران گزرے ہیں، اپنی ڈھائی صدی کی حکومت میں وہ سلطنت کے ساتھ اسمٰعیلیہ مذہب کی بھی ترویج کرتے رہے، جسے ایک سیاسی پروپگنڈا کہہ سکتے ہیں اور اسی فرقہ وارانہ عصبیت نے ان کی حکومت عباسیہ جیسے زبردست حریف کے مقابل میں ڈھائی سو برس سے زیادہ قائم رکھی ان کے متعلق علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

الملوك العبيدية بمصر الذين وفدوا من المغرب ويقال انهم ينتمون الى محمد بن جعفر بن محمد بن اسمٰعيل بن الصادق عليه السلام وقد نفاهم العباسيون من النسب وكتبوا بذالك محضراً[۱]۔

مصر کے ملوک عبیدی جنہوں نے مغرب سے وفد بھیجے اور جنکا نسب محمد بن جعفر بن محمد بن اسمٰعیل بن (جعفر) صادق ؑ تک منتہی ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ عباسیہ نے ان کا نسب نہیں تسلیم کیا اور اس کے خلاف ایک محضر تیار کیا۔

---

[۱] صحاح الاخبار فی نسب السادة الفاطمیة الاخیار ۱۲

فرشتہ نے برہان نظام شاہ کے سلسلہ میں ایران کے ایک اثنا عشری مبلغ شاہ طاہر کے ورود ہند اور شیعی نشر و تبلیغ کا تذکرہ کیا ہے ، اور تاریخ حبیب السیر کے حوالہ سے ضمناً علویہ مصر کا بھی حال لکھا ہے۔ شاہ طاہر سلاطین اسمعیلیہ (علویہ) مصر کی اولاد سے تھے ، اسمعیلیہ مصر کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں اس خاندان کے ایک پرہیز گار اور عالم فاضل شخص نے ترک دنیا کیا اور فقیروں کا لباس پہنکر لوگوں کو اثنا عشری مذہب کی دعوت دی اور اپنے جد امجد اسمٰعیل کی امامت کا عقیدہ چھوڑ دیا۔ اہل مصر و مغرب اس سید کے بڑے معتقد ہو گئے ، مریدوں کی کثرت ہو گئی ، آپ کے فرزندوں میں یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوتے گئے ، ۵۶۷ھ میں جب اسمٰعیلیہ مصر کی حکومت ختم ہو گئی اور ان کے ممالک محروسہ پر عباسیہ کا قبضہ ہو گیا تو اس مضافات میں علویہ کی بود و باش بہت دشوار ہو گئی ، وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے ایک سجادہ نشین سید نے موضع "خوند" میں جو گیلان کے علاقہ میں قزوین کے جوار میں ہے ، سکونت اختیار کی ان کی اولاد "سادات خوندیہ" کے نام سے مشہور ہوئی تین سو سال سے کچھ کم زمانہ تک یہ خاندان صوفیانہ تبلیغ و ارشاد کرتا رہا ، سلاطین وقت اور حکام عصر ان کا احترام کرتے تھے ، یہاں تک کہ شاہ طاہر سجادہ نشین ہوئے ، یہ صورت و سیرت ، علم و فضل ، اور زہد و تقویٰ میں اسلاف سے بھی زیادہ ممتاز نظر آتے تھے ، مصر و بخارا سمرقند و قزوین وغیرہ کے شیعہ شاہ طاہر کے حلقۂ ارادت میں آ گئے ان کی بڑی شہرت ہوئی اس وقت شاہ اسمٰعیل صفوی کا زمانہ تھا چونکہ صفویہ نے خود بھی پیری مریدی کے ذریعہ حکومت حاصل کر لی تھی اس لئے وہ بیعت و ارشاد کی تحریکوں کو اپنے مقاصد کے خلاف جانتے تھے ، آخر کار شاہ فارس نے شاہ طاہر پر پابندیاں عاید کیں اور بیعت و ارشاد کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اس کے بعد وہ کاشان میں درس دینے لگے ، وہاں رفتہ رفتہ مریدوں نے پھر ہجوم کیا ادھر غمازوں نے مختلف افواہیں اڑائیں اب کی مرتبہ شاہ ایران نے قتل کا فرمان جاری کر دیا شاہ طاہر بھاگ کر ہندوستان میں آئے اسمٰعیل عادل شاہ سپاہیوں کے علاوہ کسی دوسرے طبقہ سے التفات نہیں رکھتا تھا ، قلعہ پرندہ میں خواجہ جہان دکنی سے شاہ صاحب موصوف کی ملاقات ہو گئی انہوں نے ان کو اپنے ساتھ رکھا اور ملا پیر محمد آپ کے تلمذ میں داخل ہوئے ، اور انھیں کی وساطت سے برہان نظام شاہ سے ملاقات ہوئی ، برہان نظام شاہ کا لڑکا عبد القادر اتفاقاً سخت بیمار ہو گیا زیست کی امید نہ تھی ، شاہ طاہر کو شیعیت کی ترویج کا اچھا موقع ملا انہوں نے برہان نظام شاہ سے کہا کہ عہد کیجئے کہ اگر آپ کا لڑکا اچھا ہو جاوے گا تو آپ اثنا عشری مذہب اختیار کریں گے اور اس کو رواج دیں گے ، بادشاہ لڑکے کی زندگی سے مایوس ہو رہا تھا ایک صوفی منش کی زبان سے یہ خوش خبری سنکر فوراً عہد کر لیا۔ رات کے وقت عبد القادر کے پلنگ کے نزدیک شاہ طاہر اور برہان نظام شاہ دونوں رہے ، صبح کے وقت بادشاہ کی آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی بزرگ ہیں اور آپ کے دونوں طرف چھ چھ آدمی ہیں ، بادشاہ نے نزدیک جا کر سلام کیا کسی نے کہا ان بزرگ کو جانتے ہو کون ہیں ، یہ محمد مصطفیٰ ہیں اور آپ کے

اور گیارہ امام ہیں ان حضرت نے فرمایا کہ اے برہان! خدا نے علیؑ اور ان کی اولاد کی برکت سے عبدالقادر کو صحت دی اب میرے فرزند "طاہر" سے جو کچھ تم نے وعدہ کیا ہے، اس سے تجاوز نہ کرو۔ فرشتہ نے اس خواب سے علویۂ مصر کی صحت نسبی پر استدلال کیا ہے، شاہ طاہر اسمٰعیلیہ خاندان سے ہیں اور آں حضرتؐ طاہر کو بیٹا کہتے ہیں صحیح حدیث "من رانی فی المنام فقد رانی" (جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھی کو دیکھا) کے مطابق برہان نظام شاہ کے خواب میں آن حضرتؐ کا تشریف لانا رویائے صادقہ ہے، لہٰذا اسمٰعیلیہ کا علوی ہونا پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے، لیکن اسی خواب کے متعلق خود آگے چل کر فرشتہ نے لکھا ہے کہ میرے خیال میں یہ رافضیوں کی افترا پردازی ہے بہرحال نسابین نے اسمٰعیلیہ مصر کی علویت پر اعتراض کیا ہے، مغربیوں کی ایک جماعت ان کو عبداللہ بن سالم بصری کی اولاد بتاتی ہے، اور عراقیوں کا ایک فرقہ انھیں عبداللہ بن میمون قداح کی ذریت ثابت کرتا ہے، اسمٰعیلیہ کی ایک جماعت کہتی ہے، کہ آں حضرتؐ کی ایک حدیث علی رأس ثلاث مایۃ یطلع الشمس من مغربہا (تیسری صدی کی ابتدا میں آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا) میں لفظ "شمس" سے مہدی (عبیداللہ اسمٰعیلی) مراد ہیں، بعض شیعوں کا یہ خیال ہے کہ مہدی مغربی کی ولادت ۲۶۰ھ میں ہوئی اور حضرت امام مہدی صاحب الزماں کی ولادت ۳ رمضان ۲۵۵ھ بمقام "سرمن رائی" ہوئی، اور حدیث کے لفظ "شمس" سے محمد بن حسن عسکری (جن کا لقب مہدی صاحب الزماں ہے) مراد ہیں فرشتہ نے اسمٰعیلیہ کا جو نسب بیان کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

عبداللہ المہدی (سلطان مغرب) بن الرضا ابن التقی قاسم بن الموفی احمد بن الرضا محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادق

امیر علی نے جو نسب نامہ لکھا ہے وہ یوں ہے۔

عبیداللہ المہدی بن محمد الحبیب بن جعفر المصدق بن محمد المکتوم بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؑ۔

فرشتہ اور امیر علی کے شجرہ میں صرف یہی نہیں کہ اسمار کا اختلاف ہے، بلکہ فرشتہ نے ایک نام اور زیادہ لکھا ہے فرشتہ کی معلومات تاریخ حبیب السیر سے ماخوذ ہے، امیر علی نے ابن خلدون اور مقریزی سے یہ شجرۂ نسبی درج کیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ ابن اثیر نے محمد الحبیب اور جعفر المصدق کے بدلے دو دوسرے نام لکھے ہیں۔ علامہ رفاعی نے جو اسمار لکھے ہیں وہ امیر علی سے مل جاتے ہیں، ان اختلاف کے باوجود یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی (۳۸۱ھ تا ۴۲۲ھ) کے زمانہ میں ان کے جعلی انتساب خاندانی کے متعلق سنی فقہار اور ائمہ نے لعن طعن کیا۔ اور عباسیہ کے حکم سے ایک رپورٹ تیار کی گئی جیسا کہ رفاعی نے لکھا ہے، مورخ امیر علی اس کو خاندانی نزاع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عبیداللہ (اور اسمٰعیلی خلیفۂ مصر) کو مقریزی، ابن اثیر، ابوالفدا، اور ابن خلدون حضرت علیؑ کی صحیح النسب اولاد تسلیم کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے عباسیہ کے اس اتہام و افترا کی جو صراحت کی ہے وہ تاریخی تنقید کا شاہکار ہے،

اس میں شک نہیں امیر علی نے اس اعتراض کو خاندانی نزاع اور حسد پر مبنی کیا ہے۔ وہ ایک حد تک صحیح ہے، اسمٰعیلیہ، عباسیہ کے ایک زبردست حریف تھے، ان کی یہ آتش فشانیاں کسی نفسیاتی تحلیل کی محتاج نہیں عبیداللہ مہدی کا معاصر خلیفہ المقتدر عباسی (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) تھا اس کے بعد عباسیہ خاندان میں یکے بعد دیگرے القاہر، الراضی، المتقی، المستکفی، المطیع، الطائع تخت خلافت پر بیٹھے، لیکن کسی نے اعتراض نسبی کے متعلق کوئی محضر تیار نہ کرایا۔ اس کا خیال پیدا ہوا تو القادر کو اور وہ بھی تقریباً ایک صدی (۹۱ برس) کے بعد،

علویہ مصر کے انتساب خاندانی کے متعلق تاریخ اور انساب میں جو مختلف اور بعض متضاد روایتیں پائی جاتی ہیں وہ ایک بے لوث ناقد کو گرداب حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ فیصلہ کیا کرے، تنقیدی دیانت مقتضی ہے، کہ قدیم مورخین اسلام اور اس عہد کی ادبیات کا حوالہ و اقتباسات دینے کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے، اور یہاں اس طول بحث کی گنجائش نہیں اس ساری بحث کے بعد اگر ہم علویہ کے سلسلۂ نسبی کو جعلی نہیں کہہ سکتے، تو یہ بھی ہے کہ قطعی فیصلہ کی بنا پر انھیں اہل بیت میں شامل نہیں کر سکتے، اس واقعہ اور بحث کو میرے موضوع سے یہ علاقہ ہے کہ عہد ماضی میں "نسب" سیاسیات کے لئے کس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ عباسیہ نے نہ فوج سے کام لیا نہ اپنے وسیع اثر و رسوخ سے بلکہ انہوں نے ان کی تباہی کے لئے یہی ایک صورت نکالی، ظاہر ہے کہ جس عہد میں نسب کو یہ اہمیت حاصل ہو اس وقت سیاسی اغراض کے لئے کتنی افسانہ تراشیاں نہ کی گئی ہوں گی۔

دولت خلجیہ خلجیوں کا دور حکومت ہندوستان میں صرف ۳۴ سال (۶۸۹ھ تا ۷۲۱ھ) رہا، لیکن اس قلیل زمانہ میں اس خاندان نے ترقی و تنزل کے وہ عبرت انگیز مناظر پیش کئے کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔[۱]

خلجی خاندان کے ایک شخص محمود نے مالوہ میں حکومت کی اس دور کا ایک مورخ شہاب الدین حکیم کرمانی اپنی کتاب طبقات محمود شاہی میں سلطان جلال الدین خلجی اور سلطان محمود مالوی کا نسب چنگیز خاں کے داماد قالج خاں سے ملاتا ہے، عبدالقادر بدایونی طبقات محمود شاہی کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" اما ظاہر آنست کہ ایں معنی وقوعے نداشتہ باشد و صاحب طبع سلیم را باندک تاملے فساد دعوی او

---

[۱] اس موضوع پر میرا ایک مقالہ "دولت خلجیہ کا آخری نظارہ" کے عنوان سے 'صوفی'، بابت جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

معلوم میشود (اشارہ ہے کہ محمود شاہ کی خوشامد میں حکیم کرمانی نے یہ افترا پردازی کی ہے) ونیز درمیان قالج و خلج ہیچ نسبتے نیست باآنکہ قالج بزبان ترکی ملایمتے ندارد واگر باشد بمعنی شمشیر و در بعض تاریخ آوردہ کہ خلج نام یکے فرزندان یافث بن نوح است[۱]

محمد علی خاں انصاری لکھتے ہیں۔

بقول صاحب سلجوقنامہ ترک بن یافث را یازدہ پسر بود یکے ازاں جملہ خلج نام داشت[۲]،

بدایونی کی تنقید جو انھوں نے مصنف "طبقات محمود شاہی" کے بیان کردہ نسب پر کی ہے، دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بہمنیہ کو بہرام گور سے ملایا گیا اسی طرح خلجیہ کو بھی غلط طور پر چنگیز خاں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ اس لئے کہ موجودہ جاہ وجلال خاندان کی دیرینہ عظمت کے ساتھ مل کر رعایا کے قلوب میں مطیعانہ سپردگی کی کیفیت پیدا کردے

سیّد خاندان

عہد تغلق شاہی میں تیمور کے حملہ نے ہندوستان پر جو آفتیں ڈھائیں تاریخ کی دلگداز داستان ہے خاندان مٹ گیا اور خضر خاں بن ملک سلیمان تخت دہلی پر بیٹھا ۸۱۷ھ سے ۸۵۵ھ تک ان کی حکومت رہی بدایونی اور فرشتہ (فرشتہ نے "تاریخ مبارک شاہی" کے حوالہ سے لکھا ہے جو خضر خاں کے بیٹے مبارک خاں کے عہد میں اسی کے نام پر لکھی گئی تھی) دونوں نے خضر خاں کی ہاشمیت اور سیادت کے متعلق روشنی ڈالی ہے، بدایونی کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

در حقیقت سید زادہ بود عالی تبار تا آنکہ روزے مخدوم جہانیاں سید السادات منبع السعادات شیخ جلال الحق والشرع والدین البخاری قدس سرہ، بجہت مہمے در خانہ ملک مروان دولت تشریف آوردند و طعام کشیدند وملک سلیمان طشت وآفتابہ پیش مخدوم آوردہ تا آب بر دست مبارک الیشاں بریزد، و مخدوم خطاب بہ ملک مروان دولت فرمودند کہ ایں پسر سید زادہ است وایں چنیں خدمت باو فرمودن مناسب نیست ازاں روز معلوم شد کہ ملک سلیمان سید بے شبہ است و باوجود ایں آثار سیادت وسعادت واخلاق رضیہ وصفات حمیدہ در ذات مسند عالی خضر خاں معائن ومشاہد بود[۳]

فرشتہ نے "تاریخ مبارک شاہی" کے حوالہ سے تقریباً یہی لکھا ہے، لیکن بعض ایسے الفاظ لکھے ہیں جن کے نکات کو بدایونی نے عقیدت کیشی میں نظر انداز کر دیا ہے مثلاً فرشتہ کی روایت ہے کہ ملک مروان دولت کے یہاں سید جلال بخاریؒ مہمان ہوئے اور ملک سلیمان نے آپ کا ہاتھ دھولانا چاہا تو آپ نے فرمایا

فرمود کہ ایں "سید" را بدین خدمت باز داشتن گستاخیست وچوں ایں سخن بر زبان اہل صلاح گذشتہ

---

[۱] منتخب التواریخ [۲] بحر المواج [۳] منتخب التواریخ بدایونی

یقین کہ او سید خواہد بود[1]

بدایونی لکھتے ہیں کہ حضرت جلال بخاری نے "سیدزادہ" کہا صاحب فرشتہ صرف "سید" لکھتے ہیں بہت ممکن ہے حضرت جلال بخاری نے ملک سلیمان کے ناصیہ فرخندہ میں آیندہ ملنے والی حکومت و سیادت کا مطالعہ کیا ہو اس لئے "سید" نسبی علاقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ جاہ و مرتبت کے اعتبار سے کہا ہو دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتہ کی روایت کے مطابق ملک سلیمان اس سے قبل کبھی "سید" ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، خود بدایونی نے بھی لکھا ہے کہ

"ازاں روز معلوم شد کہ ملک سلیمان سید بے شبہ است "

اگر واقعی وہ سیدزادہ تھے تو کبھی تو اس کا اظہار کرتے ۔ اظہار نہ کرتے کسی کو تو معلوم ہوتا لیکن ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک سلیمان، خضر خاں وغیرہ کی سیادت پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ محض حضرت جلال بخاری کی ایک پیشین گوئی پر مبنی ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ "سید" کی اصطلاح حکومت کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

ملک سلیمان کے اخلاق و فضائل کے متعلق فرشتہ اور بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے، میں مانتا ہوں لیکن کسی انسان کی پاک نفسی اور نیک طینتی اس کے سیدزادہ ہونے کی دلیل نہیں ورنہ بڑے بڑے اولیاء اللہ، صوفیہ و زہاد تو چمار، لوہار، غلام اور غلام زادہ گزرے ہیں بلکہ حضرت جامی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ شیخ الاسلام کہتے تھے کہ ایک ہزار دو سو صوفی اماموں کو پہچانتا ہوں ان میں صرف ڈیڑھ صوفی "علوی" گزرے ہیں ایک ابراہیم سعد علوی، دوسرے حمزہ علوی[2] شرافت نسبی کا تخیل انسان کے اخلاق جمیل کو جس طرح پامال کرتا ہے دنیا سے مخفی نہیں اس لئے نیک نفسی اور اخلاق حسنہ کی کثیر مثالیں عموماً خدا کے ایسے بندوں میں پائی جاتی ہیں جو دنیا میں نسلی امتیاز نہیں رکھتے کیونکہ افتادگی و فروتنی کے بعد ان کے قلوب دنیا سے بیزار رہتے ہیں اور یہیں سے خالق و مخلوق کے حقیقی تعلق کی بنیاد پڑتی ہے،

"تاریخ مبارک شاہی"، خود سید خاندان کی حکومت کے زمانہ میں لکھی گئی اس لئے مورخ کو سید جلال الدین بخاری کے ایک مبہم جملہ کا بہانہ مل گیا اور اس نے اس کو دوسرے رنگ میں جلوہ دیا جا سکتا ہے نکتہ چینی کے لحاظ سے یہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ نسب نامہ کی جو نوعیت بیان کی جاتی ہے، وہ قابل غور ضرور ہے، اور اس لحاظ سے ہر شخص اپنے فہم و ادراک کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔

سلاطین دکن

دکن کے اسلامی بادشاہوں کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں ۔ خاندان بہمنیہ (حکمرانان حسن آباد گلبرگہ و احمد آباد بیدر) کے بعد پانچ حکومتیں منصۂ شہود پر آئیں

عادل شاہیہ (سلاطین بیجاپور) نظام شاہیہ (شاہان احمد نگر) قطب شاہیہ (سلاطین تلنگ) عماد شاہیہ

---

[1] فرشتہ ذکر سید خاندان [2] نفحات الانس جامی تذکرہ ابراہیم سعد علوی

(سلاطین برار) بریدشاہیہ (شاہان بیدر)

ان پانچوں حکومتوں کے بانی کسی شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اور نہ کسی حکومت کی طرف سے ان کے اجداد اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، حوادث زندگی نے ان کو غلامی کی ذلت انگیز زنجیر میں جکڑ دیا تھا ان تمام خاندانوں کے بانی مختلف بادشاہوں کے زرخرید غلام تھے اور محض اپنی اولوالعزمی، اپنی لیاقت طبع اپنے اخلاق و اوضاع کی بنا پر بادشاہ بن بیٹھے قدرت کی فیاضیاں ان پر زیادہ ہوئیں اور غلامی سے نجات پاکر بادشاہ ہوگئے تو سیاست نے ان کے اندر نسبی شرافت کا ادعا بھی پیدا کر دیا اور اسی کے ساتھ دنیا کے معزز خاندانوں نے ان میں بعض کے ساتھ نسلی تعلقات بھی قائم کر لئے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

بہمنیہ اس کا بانی علاء الدین حسن، سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے ایک برہمن کا نوکر تھا، جسے دربار شاہی سے لگاؤ تھا بخت نے مساعدت کی اور تدریجی ترقی کرتے کرتے وہ بادشاہ بن بیٹھا، جمعہ کے دن ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ میں اس کی تاجپوشی ہوئی اور ایک سو ستر سال تک اس کے خاندان میں حکومت رہی، اسکی اولاد سے تقریباً بیس آدمی بادشاہ ہوئے، اس گھرانہ کا آخری فرمانروا کلیم اللہ بہمنی تھا،

حکومت ملنے کے بعد خوشامدگو شعراء نے اس کا عجیب وغریب نسب نامہ بھی تیار کر دیا، تحفۃ السلاطین، سراج التواریخ اور بہمن نامہ دکنی کے مصنفوں نے صاف طور پر حسن گانگوی بہمنی کے نسب کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی لیکن بعض جگہ انھوں نے اسے شاہان کیانی کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض جگہ اسفندیار اور بہمن سے، مثلاً

'کلاہ کیانی بر سر نہادہ و پائے بر تخت کیانی گذاشتہ بنشست،

اور جیسے

'شاہ بہمن نژاد فرزندہ کاخ بہمنی،

فرشتہ کو اس پر اعتراض ہے کہ بہمن نامہ شیخ آذری کی تصنیف ہے، چونکہ آذری ایک بے لوث عالم تھے، انکی شان سے بالکل بعید ہے کہ کسی امر کی تحقیق وکاوش کئے بغیر اسے لکھدیں، اس کے علاوہ 'بہمن نامہ، کے اسلوب بیان اور طرز انشاء سے استادانہ متانت واضح نہیں ہے، اور نہ کسی جگہ شیخ آذری کا تخلص درج ہے، بہرحال فرشتہ کے نزدیک بہمن نامہ کا بیان کردہ نسب نامہ قابل وثوق نہیں وہ لکھتے ہیں کہ جب میں احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ کا ملازم تھا تو شاہی کتبخانہ سے ایک رسالہ مجھے دستیاب ہوا جس میں سلطان علاء الدین حسن گانگوی کے حالات نسبی درج تھے لیکن مصنف کا نام درج نہ تھا، اس رسالہ کے مطابق سلطان حسن گانگوی کا سلسلہ نسب بہرام گور تک پہونچتا ہے،

علاء الدین حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی بن حسن بن سہام بن سیمون بن سلام بن ابراہیم بن نصیر بن منصور بن رستم بن کیقباد بن منوچہر بن نامدار بن اسفندیار بن کیومرث بن خورشید بن صعصاے بن فغفور بن فرخ بن

شہریار بن عامر بن سعید بن ملک داؤد، بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن نوح بن صانع و نسبت او
بہ چند واسطہ بہ بہرام گورمی رسد و بہرام گور از نسل ساسانست و ساسان از نسل بہمن بن اسفندیار کہ از
جملہ بادشاہان کیاں بود۔

فرشتہ کے نزدیک یہ معتبر نہیں،

اما بہ خاطر ناقص ایں جامع اخبار میرسد آنست کہ چوں نام گانگوی بہمن جزو نام سلطان علاء الدین حسن گردیدہ
بود با بہمنی گفتند اما شعراء و مورخان خوشامد گوئے را دستاویزے بہم رسیدہ ایں معنی را در لباس دیگر جلوہ دادند[1]

عادل شاہیہ

اس خاندان کا بانی یوسف عادل خاں تھا اس کے نسب کے متعلق مورخین نے مختلف روایتیں لکھی ہیں ابوالقاسم مصنف تاریخ فرشتہ اور محمد ابراہیم الزبیری مصنف بساتین السلاطین نے عجیب و غریب افسانہ لکھا ہے۔ لیکن محمد علی خاں انصاری صاف لکھتے ہیں کہ

یوسف عادل خاں غلامے بود چرکس و سلطان محمد شاہ بہمنی او را خریدہ بود،[2]

تمام روایات کو ملانے سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف عادل خاں کا چرکسی غلام کی حیثیت سے محمد شاہ بہمنی کے یہاں فروخت ہونا ایک مشہور بات ہے، البتہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے افسانہ تراشی کی گئی ہے، فرشتہ خود ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے لکھی گئی اور اس کے مصنف ابوالقاسم کو شاہی وظائف نے بڑی حد تک گرانبار احسان بنا رکھا تھا، جیسا کہ خود انہوں نے خاندان بہمنیہ کا نسب بیان کرتے ہوئے اس جذبہ منت پذیری کا اظہار کر دیا ہے اس لئے انہوں نے آسانی کے ساتھ ایک طویل افسانہ اپنی تاریخ میں درج کر دیا ورنہ جس طرح انہوں نے علاء الدین حسن گانگوی بہمنی کے نسب کے متعلق ناقدانہ بے لوثی اور محققانہ غیر جانبداری سے کام لے کر حقیقت نفس امری کا اظہار کیا اسی طرح اس میں بھی کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ پر زور تائید کے ساتھ افسانہ کو حقیقت کے لباس میں پیش کیا جو ان کے دامن تحقیق پر ایک بدنما دھبہ نظر آتا ہے،

نظام شاہیہ

اس خاندان کا بانی ملک نائب نظام الملک بحری بھی احمد شاہ بہمنی ——— کا غلام تھا لوگوں نے اسے ایران اور روم کے شاہی خاندانوں سے تو نہ ملایا، مگر "برہمن زادہ" بتلایا گیا وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی نژاد تھے، چنانچہ فرشتہ میں ہے،

ملک نائب از اولاد برہمناں بیجانگر است نام اصلی او "تیما بہت" و نام پدر او "بہر" بود در عہد فرخندہ
سلطان احمد شاہ بہمنی در ولایت بیجانگر اسیر مسلمانان گردیدہ و موسوم بہ ملک حسن گشتہ در سلک بادشاہان

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم روضہ اول [2] بحر المواج

شاہی نظام اور انتظام یافت

ایک ہندی نژاد غلام کا ترقی کرتے کرتے مملکت تلنگ کا گورنر ہونے کے بعد خود کو "برہمن زادہ" بتانا وہ بھی ہندو رعایا کی جھرمٹ میں، یقیناً قابل بحث بات ہے، لیکن کوئی استحالۂ عقلی نہیں۔ اس خاندان میں پہلے پہل ملک نائب کا لڑکا "احمد نظام شاہ" کے نام سے مشہور ہوا ابتدائے دسویں صدی ہجری سے ان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس عہد میں بعض مجہول النسب حضرات کو شاہی خاندان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، جس کی حکایت بہت دلچسپ ہے، فرشتہ نے بسط کے ساتھ اس پر بحث کی ہے،

نظام شاہیہ خاندان میں بدترین قسم کی خانہ جنگیاں ہوتی رہیں اس خاندان میں حبشی امرا کو بڑا اقتدار و رسوخ تھا درباریوں کے باہمی تعلقات ناخوشگوار تھے، ہر شخص اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا چنانچہ ۱۰۰۳ھ میں جب ابراہیم نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی لشکر عادل شاہی کے ہاتھ سے مارا گیا تو نظام شاہیہ خاندان کے فوجی افسروں نے بہادر شاہ بن نظام شاہ کو جس کی عمر اس وقت ایک برس سات ماہ کی تھی بادشاہ بنانا چاہا لیکن منجھو نامی دربار کے ایک سر برآوردہ شخص اور بعض دکنی امرا نے بہادر شاہ کی کمسنی کے باعث اس امر سے اختلاف کیا میاں منجھو کی سعی سے احمد شاہ بن شاہ طاہر کو جو جوند جنیر کے قلعہ میں مقید تھا، لوگ احمد نگر میں لائے اور بقرعید کے دن ۱۰۰۳ھ میں اس کو بادشاہ بنا دیا اور بہادر شاہ بن ابراہیم نظام شاہ کو قلعہ جوند میں مقید کر دیا اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ احمد شاہ نظام شاہی خاندان سے نہیں، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

نظام شاہیہ خاندان کے بانی احمد نظام شاہ بحری نے انتقال کیا تو حسین نظام شاہ اس کا جانشین ہوا اس کے بھائیوں نے جن کا نام سلطان محمد خدابندہ، شاہ علی، محمد باقر، عبد القادر، اور شاہ حیدر تھا، مصلحت یہی سمجھی کہ موروثی ملک سے ہجرت کر جائیں، چنانچہ سب ادھر ادھر چلے گئے، مرتضیٰ نظام شاہ (۹۷۱ھ - ۹۹۶ھ) کے عہد میں شاہ طاہر نامی ایک شخص حیدر آباد میں آیا اور ظاہر کیا کہ محمد خدابندہ نے فلاں تاریخ بنگالہ میں وفات کی اور میں ان کا صلبی فرزند ہوں نظام شاہی دربار کے مدبر صلابت خاں نے کوشش کی کہ صحیح بات کا پتہ لگے لیکن ایک زمانہ کی بات تھی پتہ نہ لگا، اس لئے حزم و احتیاط کے خیال سے اسے ایک قلعہ میں مقید کر دیا کہ کہیں فتنہ پرداز اوباش لوگ اس کے ساتھ جمع ہو کر حکومت کے خلاف کوئی شورش نہ پیدا کریں آدمیوں کو برہان نظام شاہ کی خدمت میں جو اس وقت دربار اکبری میں ملازم تھے، روانہ کیا کہ صحیح حالات کا پتہ لگائیں برہان نظام شاہ نے جواب دیا کہ محمد خدابندہ کی زندگی میرے یہاں گزری اور ان کی اولاد میں فلاں فلاں لڑکیاں اور لڑکے میرے ساتھ ہیں اگر کسی شخص نے ان کی فرزندی کا دعویٰ کیا ہے تو یہ محض اس کی افترا پردازی ہے،

صلابت خاں اور دوسرے اعیان سلطنت کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے خیال کیا کہ عوام میں یہ

بات پھیل چکی ہے، کہ یہ محمد خدا بندہ کا لڑکا ہے، اس لئے سب لوگوں کے اعتقاد کا بدلنا ناممکن ہے، بہتر ہے کہ مدت العمر قید میں رہے چنانچہ یہی ہوا شاہ طاہر نے قید ہی کی حالت میں وفات پائی اس کا ایک لڑکا احمد نامی تھا، میاں منجھو نے اسی کو غلط فہمی کی بنا پر ابراہیم نظام شاہ کے قتل ہونے کے بعد بادشاہ بنایا، میاں منجھو کے اس طرز عمل پر تمام حبشی امرا بگڑ گئے وہ بہادر شاہ بن نظام شاہ کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن منجھو کے اثر سے قلعہ دار بہادر شاہ کو حبشیوں کے سپرد نہیں کرتا تھا انھوں نے ایک مجہول النسب لڑکے کو احمد نگر کے بازار سے پکڑا اور اسے نظام شاہی خاندان سے منسوب کر کے اس کے نام پر سکہ و خطبہ جاری کر دیا، اس کے بعد امرائے حبشی میں اختلاف ہوگیا، اکثر منتشر ہوگئے، منجھو نے غلطی یہ کی تھی کہ حبشیوں نے اس کا محاصرہ کیا تو اس نے شاہزادہ مراد بن اکبر بادشاہ کو دعوت دیدی جو اس زمانہ میں اکبر کی طرف سے دکن کی مہم پر آئے ہوئے تھے لیکن ادھر لطیفہ غیبی نے منجھو کو فتح دلائی، حبشیوں میں مناصب اور جاگیر کے لئے جھگڑا ہوا بعض امرائے دکن منجھو سے مل گئے اور اس طرح سے ۵ محرم الحرام ۱۰۰۴ھ میں حبشیوں کو شکست ہوئی لیکن پھر مغلوں نے حملہ کیا منجھو نے یہ بلا خود مول لی تھی عادل شاہ اور قطب شاہ سے مدد مانگنے کی غرض سے احمد شاہ کو لے کر وہ قلعہ اوسہ میں چلا گیا چاند بی بی نے مغلیہ حملہ کی مدافعت کی لیکن آخر کار مغل سپاہ نے شاہزادہ مراد سے بلا رائے لئے ہوئے احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس وقت نظام شاہی امرا تین جماعتوں میں منقسم تھے۔ اول منجھو جو احمد شاہ کو نظام شاہی خاندان کا آدمی سمجھ کر عادل شاہی حکومت کی سرحد میں پڑا ہوا تھا۔ دوسرا اخلاص خاں حبشی جس نے موتی نامی ایک مجہول کو بادشاہ بنایا تھا، تیسرا آہنگ خاں حبشی جس نے شاہ علی بن برہان شاہ اول (جس کی عمر اس وقت ستر برس کی تھی اور بیجاپور میں رہتا تھا) کے سر پر چتر شاہی بلند کیا تھا اس کے بعد اور بھی سیاسی نزاکتیں نظام شاہی خاندان میں پیدا ہوگئی تھیں لیکن مجھے یہاں صرف ان واقعات سے بحث کرنا ہے کہ حصول جاہ و حکومت کے لئے نسب کے معاملہ میں کس قدر افترا پردازیاں کی جاتی ہیں۔

قطب شاہیہ اس خاندان کا بانی سلطان قلی تھا اس کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے،

"سلطان قلی از ترکان بہارلوست از قوم میر علی شکر و بعضی از منسوباں آں دوماں دعوی می کنند کہ سلطان قلی از احفاد میرزا جہاں شاہ مقتول است، اما روایت اول بصحت اقرب است"

یہ شخص ہمدان میں پیدا ہوا، اور وہیں نشو و نما پائی، سلطان محمد شاہ لشکری کی سلطنت کے آخری زمانہ میں دکن میں آیا چونکہ محمد شاہ ترکی غلاموں کو زیادہ دوست رکھتا تھا، سلطان قلی نے خود کو ترکی ہی غلاموں سے وابستہ کرایا،

صاحب "تاریخ محمد قطب شاہ" لکھتے ہیں کہ قطب شاہی خاندان کے اجداد ترکستان کے حکمران گزرے ہیں اس خاندان میں اغز خاں مسلمان ہوگیا تھا اس کے متعلق صاحب "جہاں کشائے" کا بیان ہے کہ اس نے پیدا

ہونے کے بعد تین دن تک ماں کا دودھ نہ پیا اور ماں سے خواب میں آکر کہا کہ جب تک تم مسلمان نہ ہوگی میں دودھ نہ پیوں گا چنانچہ وہ مسلمان ہوگئی اغز خاں نے تین شادیاں کیں اس کی اولاد میں امیر تور بیگ چنگیز خاں کا معاصر تھا یہ امیر ۵۹۹ھ میں گزرا ہے، یہ شخص امیر قرا یوسف کا جد ششم تھا،

قلی قطب شاہ محمد شاہ کی طرف سے تلنگ کا خراج وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا ۹۱۸ھ میں خود بادشاہ بن بیٹھا، اس وقت صفویہ کا سیاسی پروپگنڈا زوروں پر تھا، شیعی مبلغین، شاعر اور صوفی کے لباس میں ترویج مذہب کر رہے تھے، یوسف عادل شاہ، برہان نظام شاہ وغیرہما کی طرح اس نے بھی مذہب اثنا عشری قبول کیا۔

محمد قلی قطب شاہ (جو فرشتہ کا معاصر تھا) نے سادات کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرنا شروع کئے چنانچہ شاہ میرزائی اصفہانی (جو طباطبائی سید تھے، سادات کی اس شاخ کا سلسلہ حضرت حسن مثنیٰ تک منتہی ہوتا ہے) کی لڑکی سے شادی کی اور اس طور سے گویا محمد شاہ بہمنی کے ایک غلام کی نسل میں بنی ہاشم کا خون جاری و ساری ہوگیا اسی طرح محمد قلی قطب شاہ اپنی ایک لڑکی کو شاہ عباس صفوی کے یہاں (اس کی اولاد میں کسی کے ساتھ مناکحت کے لئے) بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا فرشتہ میں ہے۔

> الاں زماں کہ آفتاب رایات اسلام از افق ہندوستان طالع گشتہ ہیچیک از سلاطین سابق آں دیار را نسبت وصل و پیوند با بادشاہان عظیم الشان ایران دست نداده، درین عصر میمنت اثر آں شہنشاہ قباد بخت، جمشید تخت عباس والی ایران یکے از معتمدان درگاہ عرش اشتباہ خود را بہ دکن فرستادہ صبیۂ فرمانده تلنگ را جہت ازدواج وہم بستری یکے از اولاد امجاد خود خواستگاری فرمود و آں حضرت شرف دنیا و آخرت در قبول آں دانستہ در سامان و استعداد آنست کہ آں کریمہ سعادتمند را بہ روشن سلاطین کامگار روانۂ ایران سازد۔

سلاطین صفویہ حضرت موسیٰ کاظمؑ کی اولاد ہیں اس لئے دو صورتوں سے قطب شاہی خاندان میں سادات کا خون شامل ہوگیا،

خاندان عماد شاہیہ کا بانی فتح اللہ عماد الملک کفار بیجانگر کی اولاد سے تھا۔ اسی طرح سلاطین بریدشاہیہ کا جد امجد قاسم برید گرجی نسل کا ترکی غلام تھا، جسے شہاب الدین علی یزدی نے سلطان محمد شاہ فاروقی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا عماد شاہیہ کی حکومت تو تاریخ فرشتہ کی تدوین کے وقت مٹ چکی تھی اور ان کے مقبوضات نظام شاہیہ کے تصرف میں آگئے تھے، لیکن ۱۰۱۸ھ میں جبکہ ابوالقاسم فرشتہ بریدشاہیہ کا تذکرہ لکھ رہے تھے، امیر برید حکمران تھا۔ لیکن مصنف کو اس خاندان سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لئے ان کے نسب کے متعلق کوئی ایسی بات درج نہیں کی جو تاریخی تنقید کے اعتبار سے دور از کار ہو، عماد شاہیہ اور بریدشاہیہ کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

حکایات عماد شاہیہ و بریدشاہیہ در ہیچ از کتب متداولہ مسطور نگردیدہ آنچہ در یں کتاب نوشتہ ام از مردم کہن سال کہ معاصر ایشاں بودہ اند از زبان آنہا شنیدہ در یں اوراق ثبت نمودہ ام۔[۱]

سلاطین فاروقیہ

اس خاندان میں سب سے پہلے جو خاندیس کی حکومت پر فائز ہوا، ملک راجہ فاروقی ہے، اس کے باپ کا نام خانجہاں فاروقی تھا جس کے آباؤ اجداد، سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صاحب عزت امرا گزرے ہیں خانجہاں نے وفات کی تو اس کے لڑکے ملک راجہ کو نامساعدت بخت سے منصب امارت نہ مل سکا، وہ بڑی پریشانی اور افلاس سے زندگی گزارتا تھا آخر کار بڑی تدبیر سے سلطان فیروز شاہ باربک کے خاص شاہی نوکروں میں شامل ہو گیا اور ایک گھوڑے پر خدمت بجا لاتا تھا۔ ماہانہ مشاہرہ کم تھا اس لئے زندگی بڑی تنگی سے گزارتا تھا لیکن سیر و شکار کا بڑا دلدادہ تھا اور وقت بے وقت وہ شکار کھیلا کرتا تھا اس زمانہ میں جبکہ سلطان فیروز ہندوستے ہوا گجرات میں آیا تھا ایک دن شکار گاہ میں ایک شکار کے پیچھے چند مخصوص حضرات کے ساتھ چودہ پندرہ کوس دور نکل گیا، بھوک کا غلبہ ہوا، چونکہ بستی دور تھی اور اس کے ساتھیوں میں کسی کے پاس کھانے کو نہ تھا سلطان بے تاب ہو کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا دور سے دیکھا کہ ایک سوار دو تازی کتے اور چند شکاری کئے ہوئے جانور لئے شکار کے پیچھے جا رہا ہے، سلطان چونکہ بھوک سے پریشان تھا اس سے پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے، اس نے کہا ہاں اور جو کچھ تھا فقیروں کی حیثیت سے پیش کیا اور ادب کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں کھڑا ہو گیا جب بادشاہ کھا چکا تو پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو، اس نے زمین خدمت چومی اور عرض کیا کہ میں خان جہاں فاروقی کا بیٹا ہوں اور میرا نام ملک راجہ فاروقی ہے، بادشاہ خان جہاں فاروقی کو اچھی طرح جانتا تھا آج اس کے لڑکے کی ادائے خدمت بھی اسے بھا گئی، اس نے ایک مقرب امیر سے کہا کہ کل جب دربار لگے اس کو میرے سامنے حاضر کرو، جب یہ موقع آیا اور وہ سلطانی خدمت میں باریاب ہوا تو بادشاہ نے کہا کہ اس کے دو حقوق مجھ پر ہیں ایک تو سابق محبت کا تعلق ہے، دوسری یہ خدمت جو یہ شخص شکار گاہ میں بجا لایا اس لئے بادشاہ اسی وقت اس کو منصب دو ہزاری اور تھالیز و کرونڈ کی جاگیریں جو مملکت خاندیس سے متعلق ہیں عنایت کیں ملک راجہ ۶ھ میں وہاں انتظام کے لئے چلا گیا اس کے بعد اس کے خاندان میں کچھ کم دو سو برس تک حکومت رہی فرشتہ نے ان کے نسب و حسب کے متعلق میرزا محمد علی اسفرائنی سے دریافت کیا (جو سلاطین فاروقیہ کا کتب خانہ دیکھ کر آئے تھے) کہ انھوں نے کوئی کتاب دیکھی ہے، انھوں نے کہا ایسی کتاب تو نظر سے نہیں گزری لیکن ایک ورق جس میں ان کے نسبی حالات اور ان کی تاریخ جلوس و فوت لکھی ہوئی تھی، مجھے کتب خانہ سے ملا اس کی نقل میں نے کر لی، انھوں نے اسے بیان

---

[۱] فرشتہ مقالہ سوم: روضہ ششم

لیا، اس سے معلوم ہوا کہ ملک راجہ خود کو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد بتاتا تھا اس کے بعد فرشتہ نے ملک راجہ کا نسب نامہ بیان کیا ہے،

ملک راجہ بن خانجہاں بن علی خاں بن عثمان خاں بن شمعون شاہ بن اشعث شاہ بن سکندر شاہ بن طلوع شاہ بن دانیال شاہ بن اشعث شاہ بن ارمیا شاہ بن سلطان التارکین و برہان العارفین ابراہیم شاہ بلخی بن ادہم شاہ بن محمود شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن اعظم شاہ بن اصغر بن محمد احمد بن محمد بن عبد اللہ بن فاروق عمر ابن الخطاب،

چند حیثیت سے اس نسب نامہ کی صحت مشکوک معلوم ہوتی ہے،

(۱) حضرت ابراہیم بن ادہم نے بروایت صحیح ۱۶۶ھ میں وفات پائی، اور ملک راجہ نے ۸۰۱ھ میں انتقال کیا، ملک راجہ سے حضرت ابراہیمؒ تک بارہ پشتیں ہوتی ہیں اس لئے اگر فی صدی تین پشت کے معیار حساب کو ملحوظ رکھیں تو اس حساب سے درمیانی زمانہ .. ۴ سال تک محیط ہوتا ہے، اس صورت میں حضرت ابراہیم کا زمانہ ملک راجہ کے جد امجد ارمیا شاہ کے زمانہ سے دو بتیس سال بعید ہو جاتا ہے، حالانکہ ارمیا شاہ کو حضرت ابراہیم ادہمؒ کا بیٹا بتایا گیا ہے،

(۲) حضرت ابراہیم ادہم کا سلسلۂ نسب یہ نہیں ہے جو تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے، یعنی ابراہیم بن احمد بن محمود بن احمد الخ بلکہ حضرت جامی لکھتے ہیں

ابراہیم بن ادہم از طبقہ اولی ہست کنیت او ابو اسحق است و نسب او ابراہیم بن ادہم بن سلیمان بن منصور البلخی است (نفحات الانس)

اس سے ظاہر ہے کہ یہ نسب نامہ جعلی ہے اور دنیاوی جاہ وحکومت حاصل ہونے کے بعد سلاطین فاروقیہ کو دوسرے خاندانوں کی طرح اس افسانہ تراشی کی ضرورت پیدا ہوئی، صفویہ کی طرح ملک راجہ نے بھی حکومت کے ساتھ پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھا۔ فرشتہ نے اسے شیخ زین الدین کا مرید بتایا ہے، آپ سے اس کو خرقہ ملا، مرنے کے بعد اس نے یہ خرقہ اپنے لڑکے نصیر خاں فاروقی کو تفویض کیا اس کے بعد فاروقیہ خاندان میں حکومت کے ساتھ سلسلۂ بیعت بھی جاری رہا،

شاہان مغلیہ سرسید مرحوم کی ایک ابتدائی تصنیف "جام جم" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں موجود ہے، مصنف نے اس میں تاریخ کی مختلف کتابوں کی مدد سے بعض سلاطین افغانی چغتائی کی ہندو ماؤں کا نام لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر سلاطین مغلیہ ہندو عورتوں کے بطن سے تھے،

نام بادشاہ	ماں کا نام
ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر شاہ بن اکبر بادشاہ	صبیہ راجہ بہارا مل
شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ	نواب جودھ بائی
شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالمگیر	نواب بائی
محمد معظم الدین بن محمد معظم ملقب بہ بہادر شاہ	نظام بائی
محمد معزالدین جہاندار شاہ بن محمد معظم	نظام بائی
مجاہد الدین محمد بن محمد ابو نصر بہادر شاہ	ادہم بائی (مخاطب بہ ممتاز محل)
عزالدین عالمگیر ثانی بادشاہ غازی بن معزالدین جہاندار شاہ	انوپ بائی
ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بن محمد اکبر شاہ ثانی	لعل بائی

علاء الدین خلجی کی ماں جاٹنی تھیں اسی طرح سکندر بن بہلول لودی کی والدہ سنارن تھیں ان کا نام نیا تھا فرشتہ نے سکندر بن بہلول کے وقت جلوس کا وہ واقعہ لکھا ہے جب اس کے چچا نے یہ کہکر مزاحمت کی تھی کہ سنارن کا بیٹا بادشاہ ہوگا باوجودیکہ علاء الدین غیر قوم کی عورت سے پیدا ہوا تھا اس کے چچا جلال الدین خلجی نے اپنی لڑکی اسے بیاہ دی اسی طرح سکندر بن بہلول لودی برادری سے خارج نہ ہوا مغلیہ تو بطناً بعد بطنٍ راجپوتن اور ہندو ماؤں سے تھے، لیکن باوجود اس اختلاط نسلی کے دنیا انھیں سلاطین مغلیہ ہی کے نام سے پکارتی ہے، مغلیہ نے صرف یہی نہیں۔ کہ سیاسی فضا سے متاثر ہوکر راجپوت قوم کی عورتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا بلکہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے بھی اپنے خاندان کی ایک لڑکی جہانگیر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی اس لڑکی کی شادی شاہزادہ خورم سے ہوئی معتمد خاں لکھتا ہے،

دریں تاریخ جشن طوی شاہزادہ بلند اقبال سلطان خورم باصبیہ مظفر حسین مرزا ابن سلطان علی حسین مرزا صفوی آراستگی یافت (اقبال نامہ جہانگیری وقایع سال نہم) (باقی آیندہ)

عبدالمالک آروی

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب، اردو حصہ علاوہ محصول ۸؍ انگریزی حصہ علاوہ محصول ۸؍ ہر دو حصے معہ محصول عہ؍

منیجر نگار

تخلیق شاعر

(ایک ہندی گیت سے ماخوذ)

شاعر نے کرسی اپنی بیوی کی کرسی کے قریب کھینچ لی - اور محبت آمیز انداز سے اس کی شبگوں زلفوں میں شانہ کرنے لگا - اس نے کہا "افسانہ یقیناً دلچسپ ہوگا - تم مجھے پڑھ کر ضرور سناؤ گی - اور بتاؤ گی کہ اس نے ہماری زندگی میں کیونکر انقلاب پیدا کیا"

اس کی بیوی نے میز سے ایک کتاب اٹھالی - اور پڑھنے لگی۔

"ہندوستان کی کسی بستی میں ایک دوشیزہ رہتی تھی - جس کا نام کملا تھا - وہ کنول کے پھول سے زیادہ حسین تھی - مگر وہ کسی آدمی سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتی تھی، لوگوں میں مشہور تھا - کہ درپردہ اس کا کسی فرد سے ارتباط ہے - چنانچہ اس کی ماں بھی اس سے اکثر شادی کے متعلق استفسار کرتی رہتی۔

آخر کار ایک دن لڑکی نے اقرار کر لیا کہ

"بے شک میں اپنا دل ایک من موہن کی نذر کر چکی ہوں - مگر مجھے یہ معلوم نہیں - کہ وہ کون ہے - اور کہاں سے آتا ہے - کیونکہ وہ رات کی خاموشی اور تاریکی میں میرے پاس آتا ہے - اور صبح ہونے سے قبل مجھے چھوڑ کر روح کی طرح غائب ہو جاتا ہے"

اس کی ماں نے اسے مشورہ دیا - کہ وہ دروازے اور کھڑکیاں شام سے قبل بند کر دے - تاکہ وہ صبح کو اُسے دیکھ سکے۔

ہر چند کملا کو فریب کاری مرغوب نہ تھی - مگر وہ یہ بھی چاہتی تھی - کہ کسی طرح وہ اپنے معبود خیال کا پورا حال معلوم کرے چنانچہ اُس نے ماں کے مشورہ پر عمل کیا - جب صبح مرغ نے بانگ دی - تو اس نے کملا سے کہا - کہ وہ اب جانا چاہتا ہے - مگر کملا نے اُسے یقین دلایا - کہ ہنوز صبح نہیں ہوئی - مگر جب اس نے جانے پر اصرار کیا - تو کملا نے جلدی سے کھڑکی کھول دی - تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے - مگر اس پر روشنی کی کرن پڑتے ہی ایک ملکوتی صدا سنائی دی کہ "تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پا لیا ہے - اس لئے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہوگا"

"چنانچہ اس طرح ایک فرشتہ کو فانی انسان میں تبدیل کر دیا گیا، اور گو اُسے کملا سے بہت الفت تھی - اور اسے

شادی بھی کرچکا تھا۔ لیکن کملا کو تمام عمر اپنی اس حرکت پر تاسف رہا جس کی وجہ سے اُس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کردیئے گئے"

پڑھنے والی کی سُریلی آواز ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگئی

وہ بولی کہانی کا باقی حصّہ ہم سے متعلق نہیں اب میں تمھیں اپنی زندگی کا افسانہ سنانا چاہتی ہوں"

شیاما کی گول سی آنکھیں غصّہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ انا کو گھور رہی تھی۔ اور اپنا ننھا پاؤں زور زور سے فرش پر پٹخ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے پر اس شدت سے باہم ضربیں لگا رہے تھے۔ کہ اس کشمکش میں اس کی ساری بہت دھلک کر پشت پر آرہی

"میں ضرور جاؤں گی۔ میں اماں کے پاس جاؤں گی۔ بیا تو انا! جا دفع ہوجا"

"بی بی تمھاری اماں نے کہا تھا کہ تم باغ میں جاکر کھیلو۔ آؤ میں تمھیں ایک اچھا کھیل بتاؤں"

"میں کھیلنا نہیں چاہتی۔ میں اماں کے پاس جاؤں گی"

شیاما ضدی واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور گھر کے تمام آدمی اسے چاہتے تھے۔ بلکہ نازاں بھی رہتے تھے

وہ یہ برداشت نہ کرسکتی تھی۔ کہ اسے کسی ایسے فعل کے علم سے تاریکی میں رکھا جائے۔ جو اُس کے مکان کی کسی چیز سے متعلق ہو۔ وہ غیر معمولی ذہنیت کی مالک تھی۔ اور وہ اس قوت سے اکثر کام لیا کرتی تھی

آج صبح اس کی والدہ نے اُسے حکم دیا کہ وہ انا کے ساتھ باغ میں جاکر کھیلے۔ کیونکہ وہ بہت مصروف تھی۔ مگر جونہی اس کو یہ حکم ملا، وہ اس مصروفیت کی حقیقت معلوم کرنے پر تل گئی۔ اور انا سے تکرار کرنے لگی

چونکہ انا کسی طرح نہ مانتی تھی، اس لئے اس نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ وہ بولی:-

"اچھا انا، تم باغ میں چلو۔ میں اپنے کمرے سے گیند اور بلّا لے کر آتی ہوں"

اس فوری انقلاب پر حیران تو ہوئی۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کے خیال سے اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ شیاما کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ حتےٰ کہ وہ باغ میں غائب ہوگئی۔ اور اس کے بعد شیاما دبے پاؤں والدہ کے کمرے سے ان کی مصروفیت کا سُراغ لگانے کی غرض سے اس کے کمرے میں داخل ہوگئی

یہ تھی وہ فطرت جس کا مظاہرہ شیاما بچپن میں کیا کرتی تھی

جب شیاما جوان ہوئی۔ تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اُن کے خیال میں یہ اُن کی بہت

تذلیل تھی۔ کہ اُن کی لڑکی کو کوئی موزوں خاوند نہ ملے۔ شیاما کی رائے اُن سے مختلف تھی۔ لیکن بظاہر ان کی تجاویز سے اتفاق کرتی رہی۔

اسے اپنے گھر اور والدین سے عشق تھا۔ اس لئے یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اپنی زندگی کی مسرتوں کو کسی مرد کی نذر کر دے خصوصاً ایسے آدمی کے جس سے اُس کی شناسائی بھی نہ ہو۔ اور وہ عمر میں بھی اس سے بڑا ہو۔

وہ اپنے آپ سے کہا کرتی۔

"مجھے سب سے پہلے خود اپنے شباب سے محظوظ رہنا ہے۔ مَیں شادی کر کے ناکارہ نہیں ہو جانا چاہتی۔ اور نہ مجھے بچے پیدا کرنا اتنا مرغوب ہے۔ میں کالج میں داخل ہونے کو شادی پر ترجیح دیتی ہوں"

شیاما اور اُس کے والدین میں خوب بحث ہوئی۔ وہ اپنی تجویز پر مُصر تھے۔ اور اُن کے نزدیک اس کا کالج میں داخل ہونا دولت اور وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔

شیاما نے کہا۔

"لیکن میں تحصیل تعلیم کے بعد شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ فی الحال مجھے کالج میں داخل ہونے کی اجازت دے دیجئے۔ خدا کے لئے۔ . . . . . . "

اُس کے دلائل غیر موثر ثابت ہو رہے تھے۔ مگر اُس کے والدین محسوس کر رہے تھے۔ کہ اُنھیں شکست تسلیم کرنی ہوگی۔ چنانچہ جب انھوں نے مجبوراً اپنی رضامندی ظاہر کی۔ تو اس کے ساتھ ہی شیاما کو سخت سُست الفاظ بھی سننے پڑے۔ اور یہ تنبیہ کر دی گئی۔ کہ اس تعلیم کے نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہو گی۔

شیاما کو نتائج کی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے کالج میں داخل ہو گئی

اُس کا پہلا سال نئی فضا سے مانوس ہوتے میں گذرا۔ وہ اپنی ہم عمر ہمجولیوں کی معیت میں بہت خوش رہتی۔ اور کالج کی دلچسپ مصروفیتوں اور علمی دلچسپیوں سے پورا پورا لطف اٹھاتی۔

اس کا مرغوب مضمون ادب تھا۔ اور اگر وہ جانبداری سے کام نہ لے۔ (یہاں افسانہ گو کے ہونٹوں پہ ایک لطیف تبسم کھیلنے لگا) تو اسے یہ اقرار کرنے میں باک نہ ہونا چاہئے۔ کہ ادب کا معلم بھی بہت دلچسپ انسان تھا۔ وہ کالج میں سب سے کم عمر معلم تھا۔ وہ ایک خوش رو نوجوان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت اندرونی ابتہاج کی وجہ سے مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس کا نام منوہر جی تھا۔ تمام طلبہ اُسے دوسرے پروفیسروں کی ضد سمجھتے تھے۔ اس کا لکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اور اس کی علمی قابلیت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً شیاما کے لئے وہ دیوتا سے کم نہ تھا۔ کیونکہ اسی پروفیسر کی بدولت اُس نے نظم کی خوبیوں کو سمجھنا سیکھا تھا۔

کالج کے تمام طلبہ اُسے چاہتے تھے۔ اور اُس کی عزت کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود شیاما کی طرح اس کے مضمون سے دلچسپی نہ لیتے تھے۔ چنانچہ نصف سال کے عرصے میں وہ اس مضمون کو اس قدر چاہنے لگی۔ کہ اس کا جی دوسری مصروفیتوں میں بالکل نہ لگتا۔

شیاما کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ ایک شام اس کی ہم جماعتوں نے اُسے ٹینس کھیلنے کی دعوت دی۔ اُس نے بخوشی منظور کر لی۔ کیونکہ اسے یہ کھیل بہت مرغوب تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنا وقت کسی نہ کسی طرح کاٹ دینا چاہتی تھی، کیونکہ منوہر جی چار دن سے رخصت پر تھے۔ اور اُن کے دلچسپ لیکچروں کے بغیر وہ اپنی زندگی میں کچھ ناگوار خلا سا محسوس کر رہی تھی۔

تیسرا سٹ کھیلا جا چکا تھا۔ کہ ایک لمبا۔ پتلا خوش رو نوجوان جامعہ سے نکل کر ٹینس کے میدان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

شیاما کا دل قدموں کی مانوس چاپ سُن کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ تماشائی کی حیثیت سے رہا ہے۔ اس نے اپنی تمام مساعی کھیل کے مظاہرہ میں صرف کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اس روز وہ اس صفائی سے کھیل رہی تھی۔ کہ ایک انجان تماشائی بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

جب شیاما کی ایک کاری ضرب نے کھیل کا خاتمہ کر دیا تو پروفیسر نے بہت تعریف کی اور وہ اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی۔ پروفیسر بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ تم اس قدر اچھا کھیل سکتی ہو۔ اچھا کسی وقت میرے ساتھ کھیلنا"

اس نے کہا۔ "بہتر۔ آپ بخیریت ہیں؟"

"شکریہ۔ میں اچھا ہوں،،

خیر، دراصل تمھیں وہ شعر بتانے آیا تھا۔ جس کے متعلق تم نے گذشتہ ہفتہ مجھ سے استفسار کیا تھا۔ وہ ارجن کے متعلق ایک رزمیہ نظم کا شعر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ آسکو۔ تو میں تمھیں کتاب بھی دے سکتا ہوں،،

شیاما نے زیر لب اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے ساتھ ہولی۔

اس نے پوچھا۔

"تو تمھیں نظم سے رغبت ہے،،

"جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تمھارا آخری مضمون خوب تھا۔ مگر صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ دلچسپی کا

اظہار یوں سب کرتے ہیں۔ لیکن صحیح طور پر دل سے محسوس کرنے والے کم ہوتے ہیں"
دونوں جامعہ کی عمارت میں داخل ہوگئے۔ پروفیسر نے الماری سے کتاب نکالی۔ اور بولا
"اسے لے جاؤ۔ مگر احتیاط سے رکھنا۔ کیونکہ اس کا دوسرا نسخہ ہمارے کتب خانہ میں نہیں ہے"
شیاما نے شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ ایک ثانیہ کے لئے پروفیسر کے ہاتھ میں رہا۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

راستہ بھر اس کا دل اچھل اچھل کر اس کی پسلیوں سے ٹکراتا رہا
"لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں۔ جو صحیح طور پر دل میں محسوس کرتے ہیں"...... وہ دل میں دہرا رہی تھی۔
مگر میں تو محسوس کرتی ہوں۔ دنیا میں نظم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ خوبصورت خیالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے بہتر کیا کام ہوسکتا ہے؟

شیاما تین ماہ تک کالج کے وقت کے سوا پروفیسر سے نہ ملی۔ ایک دن باقی جماعت کے چلے جانے کے بعد اُسے اچانک پروفیسر نے بلایا۔

"تمہارا جواب مضمون بہت اچھا تھا" اُس نے کہا "مجھے یقین ہوگیا ہے۔ کہ تم ایک قابل نقاد بن سکتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری چند مختصر نظموں کو ایک نظر دیکھ لو۔ کیا تم ایسا کرسکو گی؟"
شیاما کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ کہ وہ بمشکل گفتگو کرسکتی تھی۔
"یقیناً بڑی خوشی سے۔ مجھے اس میں راحت محسوس ہوگی"
کچھ دیر کے بعد اس کے ڈسک پر ایک چھوٹا سا پلندہ پڑا ہوا تھا۔
وہ پلندہ کو اس حفاظت سے گھر لے گئی۔ گویا دنیا کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس نے شام کا کھانا کھاتے ہی مطالعہ کا عذر کرکے والدین سے رخصت لی۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔
چند گھنٹے بعد وہ میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے لکھا۔
"یہ نہایت بلند نظمیں ہیں۔ صحیح اور پاکیزہ جذبات سے لبریز۔ میں آپ کی اس عزت افزائی کی بہت ممنون ہوں۔ آپ نے میرے مطالعہ کے لئے جو گوہر پارے عنایت فرمائے ہیں ان میں صحیح مشرقی شاعری کا لوچ ہے۔ آپ نے مجھ سے صداقت کے اظہار کے لئے اصرار کیا تھا۔ سو میں سب کچھ سچ کہہ رہی ہوں آپ کا تخیل بہت بلند ہے"
دوسرے دن اس نے تمام نظمیں رقعہ کے ساتھ لوٹا دیں۔ پروفیسر نے رقعہ خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔ اس نے

شیاما کی طرف ایک نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اور پھر چندماہ تک وہ ایک دوسرے سے بالکل نہ ملے۔ مگر یہ فراق دیرپا نہ تھا۔ وہ شروع ہی سے ایک دوسرے کی طرف آپس میں کشش محسوس کرتے تھے۔

پروفیسر نے اسے ایک دن کی سیر کے لئے دعوت دے دی۔ وہ شرما گئی۔ اور کچھ سوچنے لگی آخرکار اُسے کہنا پڑا

"شکریہ۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی "

ان کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ پہلے پہل ہر آنے والا دن دونوں کی زندگی میں ایک نئی مسرت کا اضافہ کرتا۔ دونوں اکٹھے رہتے۔ اور ہر کام باہم مل کر کرتے۔ مگر اب کچھ انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ وہ شام تک تو شیاما کے ساتھ رہتا لیکن کھانے کے بعد کام کرنے کے لئے چلا جاتا۔

وہ کہتا۔ "تمہیں بھی کچھ کام کرنا چاہئے۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم میرے دارالمطالعہ میں آکر بیٹھ جاؤ۔ پھر وہ گفتگو کا انداز بدل کر کہتا

"جب تم وہاں ہوتی ہو۔ تو مجھے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔ اور چونکہ مجھے کام کرنا ضروری ہے اس لئے تمھیں اس میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ . . . . . . "

شاید یہ اہانت آمیز رنج تھا۔ جو شیاما ان الفاظ کو سُن کر محسوس کرتی۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اس لئے اسے اس تجویز سے اتفاق کرنا پڑتا۔ اور اکثر اسے شام کو تنہا بیٹھنا پڑتا۔ مگر اس عمل سے اُسے غیر معمولی ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑتی۔ اُسے تنہائی سے نفرت تھی۔ اور اب بلاوجہ اسے تنہائی کی مصیبت اٹھانی پڑتی۔

مگر کیا یہ تکلیف درحقیقت تنہائی کی وجہ سے تھی؟ نہیں بلکہ یہ اس کی بچپن کی وہ فطری بغاوت تھی جواب عود کر آئی تھی۔ وہ شام کے اکثر گھنٹے کرب میں گزارتی۔ اسے اپنی ذمہ داری اور اطاعت کا پورا احساس تھا۔ مگر یہ عذاب بھی ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ اس نے مجبور ہو کر خاوند سے درخواست کی۔ کہ وہ صرف اسے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدے اور وہ اس کے کام میں مداخلت نہ کرے گی

اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ

"اگر میں تمھیں کام بتادوں۔ یا تمھیں اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دوں تو میرا سارا کام بگڑ جائیگا۔ اس لئے تمھیں اس کام میں دخل نہیں دینا چاہئے "

شیاما ان دلائل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے اپنی خواہش پر قابو نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ دبے پاؤں دارالمطالعہ کے باہر پہنچ گئی۔ اور بند دروازے کی کنجی کے روزن کے ساتھ کان لگا کر سننے لگی۔ شاید اس کا یہ فعل شرمناک حد تک قبیح تھا۔ مگر اس کے احساس کے باوجود وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

وہ سن رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر حیرانی سے شکنیں پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دبے سُر میں خودساختہ اشعار

گا رہا تھا۔ اشعار صحیح جذبات کا عکس اور نظم کی بہترین رنگینیاں سے لئے ہوئے تھے۔ اس کے دل پر اتنا اثر ہوا۔ کہ وہ وہاں بُت کی طرح کھڑی ہو گئی

بالآخر آواز سنائی دینی بند ہو گئی۔ اور شیاما نے حرکت کی۔ اس کا ہاتھ دروازے کے دستہ پر تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اندر داخل ہو جائے۔ یا اسے اپنی تخلیق کی مقدس فضا میں تنہا چھوڑ کر چلی جائے۔

اس تذبذب کے عالم میں اس کے کان میں اس کہانی کے الفاظ گونجے۔

"تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پالیا ہے۔ اس لئے تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہوگا" چنانچہ اس طرح پر ایک فرشتہ کو فانی انسان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور گو کملا سے اُسے بہت الفت تھی۔ اور اس سے شادی بھی کر چکا تھا۔ لیکن کملا کو تمام عمر اپنی اس حرکت پر تاسف رہا۔ جس کی وجہ سے اس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کر دیئے گئے ...."

آہ! وہ کیا کرنے والی تھی۔ کیا کملا کی طرح اپنے خاوند کے الہامی جذبات کو فنا کرنا چاہتی تھی۔ وہ دبے پاؤں نیچے اُتر آئی۔ اور گو اسے اس راز کے متعلق اپنے خاوند سے استفسار کرنے کی وجہ سے ہر وقت اندرونی خلش رہتی۔ تاہم اسے اس کا اجر مل کر رہا۔ کیونکہ اس کا خاوند دنیا کا ایک نامور شاعر ہو گیا۔ اور وہ وفاداری سے زندگی کے باقی ایام میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

منوہر جی نے محبت آمیز انداز میں اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"پیاری شیاما، مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ تمھیں میری شاعری کے لئے کتنی قربانی کرنی پڑی ہے۔ اب میں اس کے متعلق ایک گیت لکھوں گا"

نسیم رضوانی

صنعت و تجارت اور دنیا کا امن و سکون

صنعت و تجارت کی تنظیم جس انداز پر آج کل مہذب ممالک میں پائی جاتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ملک اپنی تجارت کے لئے جس قدر وسیع میدان پیدا کر سکتا ہے، کرے۔ مگر اس اضافۂ تجارت کی کوشش سے دو ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ جن کا ایک وقت میں جمع ہونا محال ہے۔

تجارت میں اضافہ، بین الاقوامی اعتبار سے، اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دنیا میں امن و امان قائم نہ ہو، اس لئے ہر قوم کا نفع اسی میں ہے کہ دنیا میں امن و سکون کی کوششیں جاری رہیں۔ مگر قومی اعتبار سے تجارت میں اضافہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک قوم، دوسری قوم کے برابر ہونے یا اس پر سبقت لیجانے، یا اپنی سبقت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش نہ کرے۔ اور اس سے وہ توازن، جو ایک خاص وقت میں، مختلف قوموں کے درمیان قائم ہوتا ہے، مٹ جاتا ہے اور رشک و حسد، اندیشہ و خوف کے جذبے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تجارت کے پرانے توازن کو از سر نو، زندہ کرنے کی خواہش کی جاتی ہے جو اخیر میں، باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مگر چونکہ جنگ امن و سکون کے منافی ہے اور امن و سکون، تجارت کے قیام اور فروغ کے لئے ضروری ہے، اس لئے صنعت و تجارت میں اضافہ کی جگہ کمی، پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جس کے لئے جنگ کی گئی تھی۔ یہ ایک پیچ در پیچ گتھی ہے جس کے سلجھانے میں دنیا اس وقت لگی ہوئی ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم اس مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام رہی اور موجودہ لیگ آف نیشنس اور ہیگ کا بین الاقوامی کورٹ بھی، ابھی تک، اس مسئلہ کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔

اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور، اور اُن قوتوں کا اندازہ، کرنے کے لئے جن کا اثر اس مسئلہ پر پڑتا ہے، یہ ضروری ہے کہ پہلے، علم المعیشت کے چند ایسے مسائل پر تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی جائیں جن کا تعلق، براہ راست بین الاقوامی تجارت سے ہے۔ ہم ان مسائل کو ابتدا میں، دو بڑی تقسیموں میں منقسم کرتے ہیں (الف) وہ مسایل جو دنیا کی امن و امان کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ (ب) وہ مسائل جو دنیا کو لڑائی اور فساد کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی، مندرجۂ ذیل چار چار تقسیمیں ہو سکتی ہیں:-

(الف) ۱- تقسیم عمل اور دولت کی پیداوار بڑے پیمانہ پر۔

۲۔ جدید طریقہ بنک کاری (Banking) کا بین الاقوامی پہلو
۳۔ جدید تجارت کے بین الاقوامی ذرائع نقل و حرکت و خبر رسانی
۴۔ بین الاقوامی قرضے اور تجارتی معاہدے

(ب) ۱۔ زرعی اور صنعتی ممالک۔
۲۔ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک
۳۔ ضرورت سے زیادہ آباد اور کم آباد ممالک
۴۔ تجارت اور صنعت کی ترقی اور حفاظت کے طریقے

تقسیم عمل اور دولت کی پیداوار بڑے پیمانہ پر

جدید عہد کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تقسیم عمل کی بہت زیادہ تکمیل ہوگئی ہے۔ اور اس کی بدولت، دشوار، پیچیدہ، اور طاقت طلب کام، چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر آسان ہو گئے ہیں۔ اس سے مزدوروں میں مہارت اور کمال پیدا ہوتا ہے۔ وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اور جب کام تقسیم ہوتے ہوتے اس قدر آسان ہو جاتے ہیں کہ محض اُن کا بار بار دہرانا کافی ہوتا ہے تو پھر ایسے کاموں کے لئے بہت جلد کوئی مشین ایجاد ہو جاتی ہے۔ لیکن بامہارت مزدوروں اور مشینوں سے اسی حالت میں فائدہ ہو سکتا ہے جب کہ کام کی کثرت ہو۔ ورنہ اگر کام کم ہے تو ایک آدمی کا کام چند آدمیوں اور مشینوں سے لینا سراسر نقصان رساں ہے۔ اس لئے ہر بامہارت مزدور اور مشین سے، پورے وقت تک کام لینے کے لئے، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پیداوار بڑے پیمانہ پر شروع کی جائے۔ اور بڑے پیمانہ پر پیداوار جاری رکھنے کے لئے، بڑی منڈی یعنی بہت سے خریداروں کا ہونا لازمی ہے۔

اشیاء کی دو قسمیں کی جاتی ہیں (۱) اشیاء خام اور (۲) مصنوعات۔ یہ تقسیم محض اضافی و نسبتی ہوتی ہے کیونکہ بہت سی اشیاء کے لئے، ایک وقت خاص میں، فیصلہ کرنا کہ یہ اشیاء خام ہیں یا مصنوعات بہت دشوار ہے۔ ایک شئے کو اس کی خالص قدرتی حالت میں، بیشک ہم خام شئے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اُس وقت سے لے کر جب کہ اس کی نقل و حرکت، تعمیر، اور نگہداشت میں انسانی کوششیں شامل ہونے لگتی ہیں اس وقت تک کہ وہ براہ راست انسانی ضرورت کو پورا نہ کرنے لگے، درمیانی مدارج میں، اس امر کا فیصلہ کرنا کہ وہ شئے خام ہے یا شئے مصنوعہ، محض ایک نسبتی تخیل ہو جاتا ہے۔ تقسیم عمل کی تکمیل سے ان درمیانی مدارج میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اشیاء خام کو اشیاء مصنوعہ بننے کے لئے لاکھوں ہاتھوں اور ہزاروں مشینوں کے درمیان سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تمام ہاتھوں کو اور مشینوں کو، کام سے لگائے رکھنے کے لئے سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا معاوضہ، کافی وقت گذرنے پر،

اشیاء مصنوعہ کے فروخت ہونے ہی پر مل سکتا ہے اور اس طرح سرمایہ دار کی ضرورت مسلّم ہو جاتی ہے۔ اور نظام سرمایہ داری عالم وجود میں آجاتا ہے۔ خریدار کو ایک شئے مصنوعہ اس کی ضرورت کے وقت، ایک خاص مقام پر درکار ہے۔ لیکن ایک دکاندار اسی وقت اور اسی مقام پر خریدار کے حسب منشاء کوئی شئے، موجودہ نظام سرمایہ داری میں، تیار کرنے سے عاجز ہے۔ ایک موچی، ایک جلاہا، ایک لوہار، بڑھئی، کمہار وغیرہ یہ کر سکتے ہیں۔ لیکن لاکھوں بامہارت مزدوروں اور ایک خاص طرح کی چیزیں بنانے والی مشینوں کی مدد سے چیزیں پیدا کرنے والا آجر یہ کرنے سے قاصر ہے۔ اسے مہینوں، بلکہ برسوں پہلے سے، ایک کپڑا بننے، ایک جوتا بنانے، ایک اوزار ڈھالنے کے کام کو شروع کرنا پڑتا ہے۔ وہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں روزانہ چیزیں بناتا ہے جو رفتہ رفتہ شئے خام اور شئے مصنوعہ کے درمیانی مدارج طے کرتی ہوئی بالآخر خریداروں کی منڈی میں پہونچتی ہیں۔ وہ کروڑوں، اربوں روپیہ، اس بات کا یقینی علم ہوئے بغیر کہ کس مقام پر کس کس قسم کی اشیاء کی کن اوقات میں مانگ ہوگی، صرف اندازے اور تخمینے اور بعض وقت محض وہم و گمان پر، خرچ کرتا ہے، اگر یہ اندازہ و تخمینہ غلط ہو جائے تو جو نقصان اسے برداشت کرنا ہوتا ہے وہ اس نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے جو تخمینہ کے صحیح ہونے کی صورت میں اُسے حاصل ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جدید تنظیم صنعت میں، نقصانات کے خطرات بہت کثیر ہیں۔ اور یہ صرف ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ تقسیم عمل سے، اشتراک عمل، غرض مشترک اور امداد باہمی سے کچھ ایسے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کا اثر سلسلہ در سلسلہ لاکھوں، کروڑوں مختلف قوموں اور ملکوں کے افراد تک پہونچتا ہے۔ آج کل عام طور پر مشترک سرمایہ اور محدود ذمہ داری کی کمپنیاں قائم کی جاتی ہیں۔ اور لاکھوں آدمی ایک کمپنی کے حصہ دار اور قرضخواہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک کمپنی کا فائدہ و نقصان ان تمام آدمیوں کو جو اکثر مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں برداشت کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس سے وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جو ایک خاص کام میں مہارت پیدا کر کے اور ایک خاص قسم کی اشیاء خام اور مشینیں بنا کر، اپنے آپ کو، دوسرے تمام کاموں کے کرنے کے معذور بنا لیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ، یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد، جو کثیر پیداوار پر مبنی ہوئی سستی اور پائدار اشیاء کے خریدنے کے عادی ہو جاتے ہیں، بہت کثیر ہوتی ہے۔ اس لئے جو پریشانی، وقت اور تکلیف، اشیاء کے مہیا نہ ہو سکنے سے، پیدا ہوتی ہے اس کا اثر بہت وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ اس لئے تمام ایسے امور جو اشیاء کی مانگ کے ردّ و بدل میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر انداز ہوتے ہیں، کبھی اشیاء کے بنانے والوں اور ان کے صرف کرنے والوں کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ جنگ و فساد، خصوصیت کے ساتھ، صنعت و تجارت پر، برا اثر ڈالتے ہیں، اس لئے قدرتاً صناعوں اور تاجروں کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

جدید طریقہ بنک کاری کا بین الاقوامی پہلو

تقسیم عمل اور دولت کی پیداوار کو بڑے پیمانہ پر لانے کے

لئے، لاکھوں کروڑوں سودے، روزمرہ بازاروں اور منڈیوں میں ہوتے ہیں۔ اور جدید تنظیم صنعت کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں کاروبار، تمامتر لوگوں کے ساکھ اور اعتبار پر چلتے ہیں۔ ایک اشارۂ چشم و ابرو پر لاکھوں کروروں کا سودا طے پا جاتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی ادائیگی فوراً نہیں کرنا پڑتی اور کوئی صورت ایسی پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے کاروبار کی رفتار میں سستی یا دیر ہو جائے۔ سینکڑوں معاہدے، دستاویزیں روزانہ مرتب ہوتی ہیں اور ان ہی کے بھروسہ پر لاکھوں کا مال، ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک وقت سے دوسرے وقت کے لئے، منتقل ہوتا رہتا ہے اس حیرت ناک اور دشوار طریق عمل کو ممکن اور سہل بنانے کا سہرا، جدید طریقہ بنک کاری کے سر ہے۔ بنکوں کی موجودگی کی وجہ سے، اربوں روپیہ کا سودا، روزانہ کاغذ کے پرزوں سے کیا جاتا ہے۔ اشیاء خام، کانوں اور کھیتوں سے چلتی ہیں، گاڑیوں ریلوں پر لادی جاتی ہیں، کارخانوں میں اُن کی شکلیں بدلی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملائی اور جدا کی جاتی ہیں اور بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک وقت سے دوسرے وقت کے لئے، اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ، دولت پیدا کرنے والا ہے اور دولت خرچ کرنے والا بھی۔ افراد، اپنے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی اشیاء، اپنی ذاتی محنت اور دیگر شخصی خصوصیات فروخت کرنے کے لئے بازار میں لاتے ہیں اور اسی قسم کی دوسری اشیاء اور خدمات خریدتے ہیں۔ اور جدید تنظیم صنعت کے ذریعہ سے، تمام عالم اس سلسلہ میں منسلک ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی بستیاں، دنیا سے، مٹتی جا رہی ہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود فراہم کر سکتی ہوں۔ ہر ملک دوسرے ملک پر روزانہ زیادہ انحصار کرنے کے لئے مجبور ہو رہا ہے۔ جدید طریقہ بنک کاری سے اس میں سہولتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر بنک نہ ہوتے تو بین الاقوامی مبادلہ کا مسئلہ بہت مشکل و پیچیدہ ہو جاتا۔ کیونکہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سامان پہنچنے اور اس کے فروخت ہونے اور اُس کی قیمت کے وصول ہونے کے درمیان جو وقفہ ہوتا، اس میں سرمایہ بہ سلسلۂ کاروبار ایک ہی جگہ پھنس جاتا۔ درانحالیکہ، سرمایہ سے انتہائی فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ انتہائی گردش کرتا رہے۔ آج ایک چیز بنائی، آج ہی اس کے دام مل گئے۔ آج جو دام وصول ہوئے اسے کاروبار میں پھر لگا دیا۔ لیکن اگر آج کی بنائی ہوئی چیز آج ہی نہ بکی اور اس کے فروخت ہونے میں کئی دن اور کئی مہینہ لگ گئے تو یا تو سرمایہ اتنا کافی ہونا چاہیے کہ کاروبار جاری رکھا جا سکے۔ ورنہ کاروبار، اُتنے دنوں اور مہینوں کے لئے بند کرنا پڑے گا یا اس میں اس درمیان میں، اسقدر توسیع نہ ہو سکے گی جتنی کہ ضروری اور ممکن سمجھی جاتی تھی۔ ان دقتوں کو محسوس کرتے ہوئے بنکوں نے ہنڈیاں اور سرخط سکارنے کے لئے ایسے طریقے نکالے ہیں کہ کاروبار کرنے والوں کو اشیاء کے، کارخانے سے، روانہ ہوتے ہی، فوراً دام ملنا شروع ہو جاتے ہیں اور تھوڑی سی کٹوتی کٹنے کے بعد، کسی درمیانی شخص کا سرمایہ پھنسنے نہیں پاتا۔ اس سے کاروبار میں بڑی تیزی اور آسانی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ سہولتیں جب ہی تک رہتی ہیں جب تک کسی قسم کی بدامنی و بے ترتیبی دنیا میں نہیں ہوتی اور ہر کام اپنے مقررہ وقت، مناسب جگہ اور اندازے و

نتیجے کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔ اعتبار کی یہ عالیشان عمارت، نہایت نازک دھاگوں سے لٹکی ہوئی ہے۔ اور مخالف ہوا کا خفیف جھونکا بھی اس کے زیر و زبر کر دینے کے لئے کافی ہے چہ جائیکہ جنگ و امکانات جنگ کہ ان کی تباہیاں تو اظہر من الشمس ہیں۔ اس لئے بنک کار اور تجارت پیشہ آدمی جنگ و فساد کے طبعاً مخالف ہوتے ہیں۔

جدید تجارت کے بین الاقوامی ذرائع نقل و حرکت و خبر رسانی

مندرجۂ بالا تمام ترقیوں کا امکان، ذرایع نقل و حرکت و خبر رسانی کی سہولتوں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر دنیا سے آج پختہ سڑکیں نہریں، ریل کی لائنیں، ریل گاڑیاں، موٹریں، دخانی جہاز ہوائی جہاز، آلات جر ثقیل (Cranes) ڈاکخانے، تار گھر، تار کی لائنیں، لاسلکی، علیحدہ کر دیئے جائیں تو ہر چھوٹی بستی دوبارہ اس بات پر مجبور ہو جائے کہ اپنے اسباب معیشت خود ہی فراہم کرے۔ نہ تقسیم عمل کی تکمیل باقی رہے نہ مشینری کا رواج قائم رہے، نہ دولت کی پیداوار بڑے پیمانہ پر ہو، اور نہ بنک کاری کے وہ کارنامے نظر آئیں جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ ان چیزوں کی ایجادوں نے وقت اور زمانہ کی قیود سے، انسان کو بہت حد تک آزاد کر دیا ہے۔ بڑے بڑے بوجھل سامان، ایک جگہ سے دوسری جگہ، بہت کم مدت میں منتقل ہو سکتے ہیں اور ان کی روانگی کی اطلاع تو آناً فاناً، ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتی ہے۔ تمام دنیا کے بازاروں میں، ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمتیں، تقریباً یکساں رہتی ہیں۔ کیونکہ جس وقت قیمتیں زیادہ کم ہوتی ہیں، اسی لمحہ میں تاروں کے ذریعہ سے، دنیا کی تمام منڈیوں میں اس کی خبر پہنچ جاتی ہے۔ اور خریدار و بایع اپنے آرڈر تار کے ذریعہ سے، روانہ کر دیتے ہیں اور اشیاء کی قیمت یکساں ہو جاتی ہے۔ ایسی چیزیں جو جلدی خراب ہو جانے والی یا سڑ جانے والی ہیں، ان کے لئے سرعت انتقال کے انتظامات کئے جاتے ہیں تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائیں۔ وزن اور حجم دونوں، اب تجارت کے موانع کی فہرست سے خارج کر دئے گئے ہیں۔ دنیا کی بعض نہایت کم درجہ لیکن مفید چیزیں مثلاً کوئلہ، پھٹے پرانے چیتھڑے، ہڈیاں، کھر، سینگ، بال، برابر ایک ملک سے دوسرے ملک کو، لاکھوں میل کی مسافت قطع کرنے کے بعد منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ پتھر، کنکر، مٹی تک ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے رہتے ہیں۔ کم آباد ممالک سے لوگ، آ جا سکتے ہیں، فنون کے ماہرین، نہایت آرام سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا آ سکتے ہیں۔ ادب و علم کی اشاعت کے امکانات بہت ترقی کر گئے ہیں۔ دنیا کی ایک قوم دوسری کے جذبات، تخیلات اور علمی ترقیوں کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتی ہے اور ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہے اور ایسی آبادی کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جسے اپنے خیالات و عقائد کے اعتبار سے، اگر بین الاقوامی آبادی کہا جائے تو غیر مناسب نہیں ہے۔ لوگوں کی دنیا، اپنی محدود بستی سے پھیل کر، نہ صرف کرۂ زمین بلکہ کل کائنات پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ خیالات کی یہ وسعت اور ہمدردیوں کی ان ہمہ گیریوں سے یقیناً پرانی تنگ نظری،

تعصب اور غیر رواداری میں کمی واقع ہو رہی ہے - جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کی جگہ، بین الاقوامی جذبہ ترقی پا رہا ہے۔ جس کے ماتحت جنگ کے امکانات کے مفقود ہو جانے کی بہت امید کی جا سکتی ہے -

بین الاقوامی تجارتی معاہدے اور قرضے

بین الاقوامی تجارتی معاہدے، قرضے اور تمام دوسرے مطالبے، دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قوموں کے افراد، اپنی انفرادی حیثیت سے کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو قومیں، قومی حیثیت سے آپس میں کرتی ہیں۔ یہ معاہدے اور قرضے دستاویزوں، سرخطوں اور ہنڈیوں کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں مگر یہ اُن دستاویزوں اور ہنڈیوں سے مختلف ہوتے ہیں جو ایک قوم کے افراد کے درمیان، اندرون ملک میں رائج ہوتے ہیں۔ کیونکہ آخر الذکر کی پابندی، تکمیل اور تعمیل کی ذمہ داری، ملکی عدالتوں اور جماعت عالیہ پر عائد ہوتی ہے۔ مگر اول الذکر کے لئے، اس قسم کی کوئی علیحدہ عدالت یا جماعت عاملہ نہیں ہوتی بلکہ زیادہ تر ملکوں اور اُن کی حکومتوں کی خوش معاملگی، نیک نیتی، دیانت داری اور اعتبار پر بھروسہ کرکے، تجارتی تعلقات پیدا کئے جاتے ہیں اور خیانت اور بد معاملگی کا فیصلہ، صرف جنگی مظاہرہ یا پھر میدان جنگ ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ تو انتہائی صورت ہے جس کی نوبت شاذ و نادر ہی کبھی آتی ہے۔ مگر عام طور پر، معاہدے اور قرضے، اُس وقت تک، محفوظ سمجھے جاتے ہیں، جب تک حکومتوں کے بجٹوں اور اُن کی بین الاقوامی تجارتوں میں توازن قائم رہتا ہے اُن کے تعلقات دوسری قوموں سے خوشگوار رہتے ہیں اور اندرونی اور بیرونی فضا میں امن و امان ہوتا ہے - ان حالات میں حکومتوں کے مقامی سکوں، نوٹوں، اور دستاویزوں کی دوسری حکومتوں اور اُن کے افراد کے نزدیک قدر و قیمت ہوتی ہے - لیکن جہاں بے امنی و بے ترتیبی پیدا ہوئی، چاہے وہ کسی سبب سے کیوں نہ ہو، قوموں کی ساکھ میں فرق آجاتا ہے اور تمام دیگر قومیں اپنے مطالبات کی ادائیگی چاہنے لگتی ہیں اور پھر نہ مقامی سکہ کی پوچھ گچھ ہوتی ہے نہ نوٹ اور دستاویزوں کی۔ تار پر تار چلنے لگتے ہیں اور تمام قرضخواہ اور مطالبہ کرنے والے، اس ملک کے نوٹوں، سکوں اور دستاویزوں کو (جن کی قیمتیں بھی گرنا شروع ہو جاتی ہیں) فروخت کرنے لگتے ہیں اور ان کی فوری ادائیگی پر مصر ہوتے ہیں۔ پھر انھیں اس سے مطلب نہیں رہتا کہ ان کی اشیاء، سلسلۂ فروخت کے کس درجہ اور منزل کو طے کر رہی ہیں، اُن کا قرض دیا ہوا سرمایہ، کن نفع بخش کاروباروں میں لگا ہوا ہے۔ گورنمنٹ کے بجٹ میں پائداری اور استواری کے کیا عناصر شامل ہیں، قومی تجارت کی ترقی کے مستقبل قریب میں، کتنے امکانات ہیں۔ وہ ان میں سے کسی بات کو سننا نہیں چاہتے۔ وہ نقد ادائیگی چاہتے ہیں اور اس کے لئے تھوڑا سا نقصان بھی برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے ضدی قرضخواہوں سے معاملہ سلجھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں ادائیگی صرف اشیاء، یا سونے، یا دوسری ایسی قوموں کے سکوں، نوٹوں اور دستاویزوں کی برآمد سے ممکن ہو سکتی

ہے جن کا ساکھ دنیا میں اُس وقت بھی قائم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مطالبات کی فوری اور نقد ادائیگی کے تقاضے سے، یک ملک سخت پریشانی اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے کاروبار میں سخت ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ملک یا حکومت کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے بین الاقوامی تعلقات کے اور زیادہ نازک ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، صنعت و تجارت کی تنظیم، عہد حاضر میں، اس انداز سے ہوتی ہے کہ بہت کم روپیہ کو کاروبار میں پھنسا رہنے دیا جاتا ہے۔ اور جتنا سونا چاندی فی الواقع دنیا میں ہوتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ کام، ملکی سکوں، نوٹوں، دستاویزوں، سرخطوں اور ہنڈیوں کو چلا کر لیا جاتا ہے۔ یہ سب کام اندازے اور تخمینے پر ہوتے رہتے ہیں کہ فلاں وقت اور فلاں مقام سے اس وقت مطالبہ کیا جائے گا، جس کی تعمیل فلاں ملک کے ادائے مطالبہ سے کی جائے گی اور جو تھوڑا سا فرق باقی رہیگا وہ سونے کی شکل میں (جو تمام اقوام کے لئے یکساں قدر و قیمت رکھتا ہے) ادا کیا جائے گا۔ لیکن جب اس اندازے و تخمینے میں فرق آجاتا ہے تو ملک کے بنک کاروں کے حواس گم ہو جاتے ہیں اور عقلیں ٹھکانے نہیں رہتیں کہ کس طرح تمام قوموں کے مطالبات کو فوراً ان شکلوں میں پورا کریں جو ان کے لئے لائق قبول ہوں۔ نتیجہ دوالہ کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ اور اس دوالہ کا اثر ان ملکوں میں منتقل ہوتا ہے جن کا روپیہ مارا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے بھی عدم اعتمادی پھیلتی ہے۔ ان پر بھی مطالبات کی بھرمار ہوتی ہے۔ ان کے اندازے اور تخمینے میں بھی فرق آتا ہے۔ اور سلسلہ در سلسلہ دنیا کی ہر قوم، اس وبا سے متاثر ہو جاتی ہے۔ اس لئے تمام وہ امور جن سے دو ملکوں میں فساد پھیلنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، تجارت پیشہ اور بنک کاروں کی عملی مخالفت کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے، ان مستقل قوتوں پر نگاہ کی ہے، جو دنیا میں قیام امن و امان کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں۔ اب ہم اُن قوتوں کا بیان کرنا چاہتے ہیں جو دنیا کو لڑائی اور فساد کی طرف لے جا رہی ہیں۔ دنیا میں جس وقت توازن بگڑتا ہے تو فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس توازن کے بگڑنے کا سبب اکثر و بیشتر، عدم مساوات کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں کے توازن کے لئے حقیقی مساوات ضروری نہیں ہے جو چیز لازمی ہے وہ یہ ہے کہ عدم مساوات کا احساس یا تو بالکل فنا ہو جائے یا اتنے عرصہ کے لئے محو ہو جائے، جب تک توازن قائم رہے۔ عدم مساوات کا احساس قوموں اور ملکوں میں مختلف طریقوں پر پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ایک قوم کی ہوس ملک گیری اور فتوحات سے، کبھی زرعی ملکوں میں اس احساس کے پیدا ہونے سے کہ صنعتی ممالک اُن کے مقابلہ میں زیادہ دولت مند ہیں، کبھی غیر ترقی یافتہ ملکوں کو اس بات کا علم ہو جانے سے کہ اُن کے ملک میں قدرتی ذرائع دولت بہت کثیر ہیں، اور کبھی ضرورت سے زیادہ آباد ممالک کے اس یقین سے کہ اب ان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے

لیے اُن کے ملک میں کوئی گنجائش ترقی کی باقی نہیں رہی ہے، ان احساسات کا نتیجہ عام طور پر اُس پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں "تأمین" (protectionism) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ پر ملک کی زراعت و صناعت و تجارت کی حفاظت اور ترقی کیلئے جد و جہد کی جائے۔ اور جب اس پالیسی پر عمل ہونے لگتا ہے تو توازن بگڑنے لگتا ہے۔ اور توازن کے بگڑنے سے بے ترتیبی، بے چینی اور اضطراب کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں جو آخر کار جنگ کی شکل میں ظاہر ہو کر رہتی ہیں۔

ذیل میں ہم زیادہ شرح و بسط کے ساتھ ان اسباب کے عمل کو بیان کرتے ہیں۔

زرعی اور صنعتی ممالک

جو لوگ زراعت کا عملی تجربہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں تقسیم عمل کے اسقدر وسیع امکانات نہیں ہیں جتنے کہ صنعت و حرفت میں ہوتے ہیں۔ زراعت میں سب سے زیادہ اہم چیز زمین اور موسمی اثرات ہوتے ہیں۔ اور ان کی پیدائش اور رد و بدل میں انسانی کوششیں ابھی تک بہت عاجز اور محدود ہیں۔ برخلاف اسکے صنعت و حرفت میں اہم چیزیں سرمایہ اور مزدور ہوتی ہیں جن میں اضافہ بہت جلد اور کثرت سے ہو جاتا ہے۔ علاوہ اسکے زمین کی قوت پیداوار بھی محدود ہوتی ہے جس کی وجہ سے اکثر اُسے پرتی یعنی بلا کاشت کئے ہوئے چھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ عناصر سے دوبارہ اپنی زرخیزی حاصل کر سکے پھر موسمی تغیرات کے لئے چونکہ اوقات مقرر ہیں اس لئے انسان کو انھیں کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ ان تمام خصوصیات زراعت کی وجہ سے اُس قوم کے افراد جو محض زراعت پر انحصار کرتے ہیں زیادہ تر اپنے آپ کو قدرتی طاقتوں کے سامنے مجبور اور بے دست و پا پاتے ہیں۔ اور اُن کی ترقی کے لئے وہ وسیع و کشادہ میدان نہیں ہوتے جو صنعتی ممالک کے افراد کے سامنے ہوتے ہیں۔ زراعتی پیداوار کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ نو توڑ زمینوں کو چھوڑ کر عموماً ہر توسیع زراعت کی کوشش سے خالص آمدنی فی ایکڑ مزروعہ کم حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے صنعت و تجارت کی ہر توسیع کے ساتھ خالص آمدنی بڑھتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں، زراعت کے کاروبار کے لئے آبادی کے پھیلاؤ کی ضرورت ہے اور صنعتی آبادی کے لیے اُس کے اجتماع کی۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ زرعی آبادی میں وہ اجتماعی خصوصیات پیدا نہیں ہونے پاتیں، جن کی ترقی سے قومیں منظم ہوتی ہیں۔ زرعی آبادی کا شیرازہ بکھرا ہوا ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ صنعتی آبادی کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہیں صنعتی آبادی، ہر ہر قدم پر علم و سائنس کی ترقیوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اور سائنس سے جہاں تعمیر کا کام لیا جا سکتا ہے وہاں اسیقدر آسانی اور سہولت سے تخریب کا کام بھی لیا جا سکتا ہے، اسلئے ذرائع تخریب و محافظت بھی صنعتی آبادی کے پاس زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں، علم کی ترقی چونکہ تبادلۂ خیال سے ہوتی ہے، اور اس کی سہولت شہروں میں بہ نسبت دیہاتوں کے زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے شہری آبادی دیہاتی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ ہوشیار اور عقلمند ہوتی ہے صنعتی شہروں کی کثیر آبادی کے لئے، عام صنعت کی چیزیں بھی کم خرچ سے، کثرت کے ساتھ، حکومتیں مہیا کر سکتی ہیں (مثلاً کتب خانہ، زندہ اور مردہ عجائب گھر، سینما، پارک وغیرہ وغیرہ) جو دیہاتی آبادی کے لیے بلا صرف کثیر

مہیا نہیں کی جا سکتیں۔ ان تمام اُمور کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ممالک جو زیادہ تر زراعت پر انحصار کرتے ہیں اُن میں وہ تہذیب و تمدن پیدا نہیں ہوتا جو صنعتی ممالک میں نظر آتا ہے۔ اپنی حفاظت و مدافعت میں بھی وہ صنعتی ممالک کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہیں اور جب اپنی پیداوار کا تبادلہ صنعتی ممالک کی پیداوار سے کرتے ہیں تو اس میں بھی اکثر گھاٹے میں رہتے ہیں۔ جب ان تمام باتوں کا احساس اُن ملکوں کے سیاست دانوں اور مدبرین کو ہوتا ہے تو وہ صنعت و حرفت کے قایم کرنے کی تمنائیں کرنے لگتے ہیں اور ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب یہ کوششیں بار آور ہوتی ہیں تو وہ صنعتی ممالک جو پہلے اپنا مال اس ملک میں فروخت کرتے تھے ایک بڑی منڈی کو اپنے لیے بند پاتے ہیں اور انھیں اس منڈی کی مانگ کے لحاظ سے اپنی پیداوار کو گھٹانا پڑتا ہے جس سے بے روزگاری پیدا ہوتی ہے، مشینیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور تقسیم عمل کی تکمیل میں انحطاط رونما ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ تجارت کو اس کی پرانی سطح پر لانے کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور اُن کا یہ عزم و ارادہ بعض وقت جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک

زرعی اور صنعتی ممالک سے مشابہ ایک اور صورت ہوتی ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک اپنی جہالت، اور خانہ جنگی یا مواقع کی کمی کی وجہ سے اکثر اپنے قدرتی وسائل دولت سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، ملک میں زرخیز کانیں، کوئلے اور لوہے۔ تیلوں کی ہوتی ہیں۔ لیکن یا تو لوگ اُن سے بے خبر ہوتے ہیں یا اُن سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بڑے بڑے جنگل ہوتے ہیں جنگی خام پیداوار ملوں سے لاتعداد مصنوعات کے بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایسے آبشار اور دریا ہوتے ہیں جن سے لاکھوں گھوڑوں کی قوت والے انجن حرکت میں لائے جا سکتے ہیں۔ مٹیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے شیشے اور چینی کے نہایت عمدہ ظروف بنائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح تانبے، سیسے، ٹین، المونیم وغیرہ کی اشیا بنانے کے پورے مواقع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب وسائل دولت زمین میں دفن ہیں اور کسی کو ان سے فائدہ حاصل کرنے کی توفیق و سلیقہ نہیں ہوتا۔ اب اگر حکومت ایسی قائم ہو جاتی ہے جو ملک کی خانہ جنگیوں کو ختم کر دیتی ہے اور قومی ترقی کے نصب العین کو پیش کر کے آبادی کی تعلیم، اُن کی قدامت پرستی سے رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُن کے سامنے ترقی کے امکانات کو رکھتی ہے۔ مساوات اور حریت کے جذبات کو پیدا کر کے اُن کے ولولۂ عمل کو اُبھارتی ہے۔ تو اُسی قالب بے جان میں آثار حیات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ قوم خود اپنی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرتی ہے اور دوسری قومیں اُس کی اُٹھتی ہوئی جوانی کو دیکھ کر اُس کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اُس کی مدد کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت کے میدان میں، پھر وہ ایک حریف اور مدِمقابل کی حیثیت سے چمکنے لگتی ہے۔ اور اس کی روز افزوں ترقیاں قدیم اقوام کے لیے ایک مستقل دعوتِ مقابلہ بن جاتی ہیں جن سے عاجز آ کر بعض صورتوں میں، اقوام کو بہانے تلاش کر کے، اعلان جنگ کرنا پڑتا ہے۔

ضرورت سے زیادہ آباد اور کم آباد ممالک

آبادی کا تحمل ذرائع دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ذرائع دولت کثیر اور متفرق ہیں اور کاروبار کو وسعت دینے کا امکان ہے تو ملک چاہے اس کی آبادی کسی قدر کثیر کیوں نہ ہو۔ ضرورت سے زیادہ آباد نہیں کیا جا سکتا، برخلاف اس کے، ایک ملک کی آبادی کس قدر قلیل کیوں نہ ہو اگر وہاں کے وسائل دولت محدود ہیں تو وہ انھیں کی نسبت سے ضرورت سے زیادہ آباد کیا جائیگا۔ اس کا فیصلہ عموماً ممالک کی فی کس آمدنی، اور ان کی ناگزیر احتیاجات کے مقابلہ سے کیا جاتا ہے۔ اگر ناگزیر احتیاجات کے پورا کرنے کے بعد، ممالک کے افراد کو، اپنی آمدنی سے اس قدر پس انداز ہو سکتا ہے کہ وہ اُن مشاغل میں حصہ لے سکیں جن سے تمدن، تہذیب اور معاشرت کی ترقی ہوتی ہے تو ملک کو کبھی ضرورت سے زیادہ آباد نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت سے زیادہ آبادی کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ملک کے غیر ترقی یافتہ وسائل دولت سے کام لینے کے مواقع نہ ہوں ایسے اسباب سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی، پیدا ہو جائیں جن سے قدرت کے انعامات معطل حالت میں ہیں اور اُن سے کام لینے والا کوئی نہ ہو۔ ایسی صورت میں گو عارضی طور پر ہم ملک کو ضرورت سے زیادہ آباد کہیں گے۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اس ملک کے لیے فیصلہ کرنا غلط ہوگا۔ بہرحال جس نقطۂ نگاہ سے بھی ہم ضرورت سے زیادہ آباد اور کم آباد ممالک کا تعین کریں۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ دنیا کے بعض ممالک آج کل ضرورت سے زیادہ آبا[illegible]ہیں۔ اور اس تفریق کو اُن ممالک کی حکومتیں نقل وحرکت اور توطن کے خلاف قوانین بنا کر برابر قا[illegible] رکھنا چاہتی ہیں۔ اور یہ صورت حال ضرورت سے زیادہ آباد ممالک کے لیے مستقل سبب شکایت کا [illegible]تی ہے۔ خصوصاً جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی دماغی اور جسمانی محنت اور سرمایہ سے کم آباد ممالک کے [illegible] دولت کو ترقی ہو سکتی ہے اور باہمی منفعت کا امکان ہے تو اس وقت یہ قیود اور بندشیں اور زیادہ [illegible] گزرتی ہیں اور تعلقات کی یہ کشیدگی، جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

تجارت وصناعت کی ترقی وحفاظت کے طریقے

تجارت وصناعت کی ترقی وحفاظت کے تمام طریقے اصطلاح معاشیات میں لفظ "تأمین" کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ اور اس میں تمام وہ جد وجہد شامل ہوتی ہے جو ایک ملک کی حکومت کو اس غرض کے حصول کے لیے اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس کی عام شکل محاصل انتناعی ہیں جن سے غیر ملکی اشیاء پر درآمد کے وقت اس قدر محاصل بڑھائے جاتے ہیں کہ اُن کے ادا کرنے کے بعد وہ ملک کی مصنوعہ اشیاء کے مقابلہ میں گراں ہو جاتی ہیں اور اس لئے اُن کے فروخت کا امکان اس ملک کی منڈیوں میں مفقود ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اندرون ملک کی تمام منڈیاں، ملکی مصنوعات کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ملکی سرمایہ کی حفاظت کے لیے بھی مختلف قانونوں اور سرمایہ کے محاصل سے بندوبست کیا جا سکتا

اور غیر ملکیوں کے توطن کو بھی روکا جا سکتا ہے۔ یہ تو اندرون ملک کی حفاظت کے طریقے ہیں۔ بیرون ملک کی تجارتی حفاظت کے لیے انعامات اور مالی امداد کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ملکی جہاز والوں کو سرکاری نقصان پر سستے کرایوں پر مسافر اور مال ڈھونے پر مائل کیا جاتا ہے اور دوسرے بیگانوں کے طریقے منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ان سے قدرتی طور پر ان قوموں کے ساتھ جو پہلے سے منڈیوں میں موجود ہوتی ہیں، مخالفت پیدا ہو جاتی ہے جو بڑھتے بڑھتے جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مندرجۂ بالا بیانات سے بے شمار قوتوں کے، دو مرکزی رجحانوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک اجتماع تو قوموں کو امن و عافیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے۔ اور دوسرا فساد اور بے امنی کی طرف۔ دونوں میں جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ مشترک ہے۔ ہر قوم اپنے افراد کی حالت بہتر سے بہتر بنانا چاہتی ہے لیکن اکثر وہ یہ بھول جاتی ہے کہ دوسری قوموں کو بھی اپنے افراد کی حالت بہتر بنانے کا ایسا ہی حق حاصل ہونا چاہیے جیسا کہ اسے خود حاصل ہے۔ علم و عمل کی اس ترقی کے بعد جس نے تمام دنیا کو باہمی امداد پر مجبور کر دیا ہے، اب محض خود غرضی اور ذاتی منفعت ناممکن ہو گئی ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم اسی جذبۂ خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ماتحت لڑی گئی لیکن جس طرح وہ اپنے نتیجہ کے لحاظ سے ناکام رہی وہ دنیا پر روز بروز روشن ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا اپنی تنگ نظری اور عاقبت نااندیشی کی وجہ سے اور کتنی جنگیں لڑے گی اور کتنی قوموں اور ان کی پیدا کی ہوئی دولتوں اور تہذیبوں کی بربادی کا باعث ہوگی۔ لیکن آخر میں تھک کر اور ہار کر اس کو سمجھ آئیگی اور ضرور آئیگی اور اس وقت ایک ایسی اصلی بین الاقوامی عدالت معرض وجود میں آئیگی جس کے نزدیک سب قومیں اور نسلیں مساوی درجہ رکھیں گی اور بین الاقوامی معاملات آپس کی مخلصانہ اور دوستانہ مشاورت سے طے پایا کریں گے۔

محمد عاقل ایم۔ اے (علیگ)

الف لیلہ کے بعد

سندباد جہازی کی آخری سیاحت

(جدید جغرافی، تاریخی و اثری تحقیقات کے نقطۂ نظر سے)

جب ایک ہزار اور ایک راتیں ختم ہو گئیں تو ملکہ شہرزاد نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا کہ خدا کا شکر ہے اُس نے اتنی مدت تک میری جان سلامت رکھی مگر مجھ سے ایک بڑی فروگذاشت ہو گئی ہے، دنیازاد نے دریافت کیا وہ کیا؟ ملکہ نے کہا کہ میں نے سندباد جہازی کی تمام سیر و سیاحت بیان کی مگر اس کی آخری اور سب سے زیادہ دلچسپ سیاحت باقی رہ گئی۔ جس کے لیے میں شہریار سے باادب معافی چاہتی ہوں بہر حال اگر بادشاہ کا حکم ہو تو وہ آخری سیاحت بھی بیان کروں۔ بادشاہ کو بھی جو اب بیدار ہو گیا تھا سندباد کی آخری سیاحت سننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور اس نے قصہ بیان کرنے کی اجازت دی۔ ملکہ نے وہ آخری کہانی سندباد کی زبانی اس طرح بیان کرنی شروع کی

"برسوں تک میں اپنے گھر پر مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کرتا رہا، کیونکہ اب میری عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اور مجھے زیادہ سکون کی ضرورت تھی۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ اور میں نے اپنے اعزہ و احباب سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ ہر شخص میرے سن و سال کا خیال کر کے مخالفت کرنے لگا۔ مگر میں نے کسی کشتی اور سفر کا انتظام کر کے ایک روز کسی کو اطلاع کیے بغیر سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے ساتھ زیادہ بھاری چیزیں نہیں لی تھیں بلکہ بیش قیمت اور نادر اشیاء کے صرف دو صندوق ساتھ لیے تھے۔ یہ سامان ایک حمال پر بار کر کے میں ساحل پر پہونچا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی جہاز اس طرف سے گذرے تو اُس پر سوار ہو کر نئے ممالک کی سیاحت کروں۔

تمام سامان ساحل پر رکھ کر ہم چند درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرنے لگے کئی گھنٹے گذر گئے مگر کوئی جہاز نظر نہ آیا۔ بالآخر کچھ دیر بعد سمندر کی طرف سے ایک عجیب غریب گونج کی سی آواز سنائی دی جو مسلسل آ رہی تھی سخت بھیانک تھی رفتہ رفتہ یہ آواز زیادہ قریب سے آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس چیز سے وہ آواز پیدا ہو رہی ہے وہ تیزی کے ساتھ ہماری طرف آ رہی ہے۔ بالآخر اُفق پر ایک سیاہ سا دھبا نمودار ہوا جو بتدریج قد و قامت اور طول و عرض میں بڑھتا جاتا تھا جب وہ داغ ہم سے زیادہ قریب ہو گیا تو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی عظیم الجثہ جانور تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے جس کے جسم کا

بڑا حصہ سطح آب کے اوپر تھا۔ وہ جانور ہماری طرف اس قدر تیز رفتاری سے آ رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اُس کے سینہ سے جھاگ کی کوہ پیکر موجیں اٹھ رہی تھیں۔ اور جہاں سے وہ گذرتا تھا سمندر میں سفید جھاگ کی ایک وسیع سڑک ایسی بن جاتی تھی جیسے آسمان پر کہکشاں۔

جب وہ جانور ذرا قریب آ گیا تو بہت صاف نظر آنے لگا۔ اگر تین بڑے بڑے سر فلک درخت ایک کے اوپر ایک کھڑے کیے جائیں تب شاید اس عجیب و غریب جانور کے طول کا اندازہ ہو سکے۔ اس کا عرض اتنا تھا جتنا کہ قصر امیر المومنین یا ایوان دربار عام کا۔ اس کا جسم مچھلیوں کا سا نہ تھا بلکہ جس قدر حصہ اس کا سطح آب سے باہر تھا وہ نہایت چمکدار اور سیاہ تھا۔ اور تمام جسم چٹان کی طرح ٹھوس اور سخت تھا۔ ایک سرخ رنگ کی دھاری اس کے چاروں طرف محیط تھی۔ اس کا شکم جو سطح آب سے نیچے تھا۔ اور جس کی جھلک کبھی کبھی نظر آ جاتی تھی۔ نقرئی چھلکوں سے پوشیدہ تھا۔ اور ان کا رنگ ایسا تھا جیسا کہر کی حالت میں شب کے وقت چاند کا ہوتا ہے۔ اُس کی پشت چپٹی اور قریب قریب سفید تھی اور اس پر چھ عدد کانٹے میناروں کی طرح بلند تھے۔ ان کانٹوں کا طول تمام جسم کے طول سے بقدر نصف ہوگا۔

طرفہ یہ کہ اس ہولناک جانور کے منہ نہیں تھا۔ یا کم از کم ہم کو نظر نہیں آتا تھا۔ مگر یہ کمی آنکھوں کی کثرت نے پوری کر دی تھی جن کی تعداد اسّی کے قریب ہوگی۔ یہ آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اور تمام جسم کے چاروں طرف دو قطاروں میں نمایاں تھیں لیکن ایک آنکھ اوپر اور ایک نیچے تھی اور آنکھوں کی قطاریں سرخ لکیر کے متوازی چلی گئی تھیں۔ اسی طرح گویا وہ سرخ لکیر ابروؤں کا کام دیتی تھی۔ ان خوفناک آنکھوں میں سے دو تین بمقابلہ دوسری آنکھوں کے بہت بڑی تھیں۔ اور ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا ٹھوس سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ جانور ہماری طرف انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آ رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ جادو کے زور سے چل رہا ہے۔ کیونکہ نہ اس کے مچھلیوں کی طرح پر تھے۔ نہ بط کی طرح جھلی دار پاؤں تھے۔ اور نہ پرندوں کی طرح بازو تھے۔ اُس کا سر اور دُم دونوں ایک وضع کے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ دُم کے قریب دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جو نتھنوں کا کام دیتے تھے۔ ان نتھنوں میں سے وہ ہولناک جانور نہایت سختی کے ساتھ سانس نکالتا تھا۔ اور سانس لیتے وقت نہایت ناگوار شور پیدا ہوتا تھا۔

اس خوفناک جانور کو دیکھ کر ہم پر بیحد دہشت طاری ہوئی۔ اور یہ دیکھ کر تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی کہ اس جانور کی پشت پر بہت بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تھی جن کے قد و قامت انسان جیسے تھے۔ اور صورت بھی انسانوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ ہماری طرح لباس پہنے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے ان کے جسم پر کچھ چھلکا سا پیدا کر دیا ہے جو کپڑے سے مشابہ ہے۔ جو ان کے جسم سے پیوست تھا۔ اس قدرتی لباس کی وجہ سے اُن کی صورتیں مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں اور غالباً ان جانوروں کو اٹھتے بیٹھتے تکلیف بھی ہوتی تھی۔

ان انسان نما جانوروں کے سروں پر مربع وضع کی ایک چیز تھی جو صندوقچہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ممکن ہے قدرت نے

ان کے لیے اسی قسم کے عمامے بنائے ہوں۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ صندوقچیاں نہایت ضروری تھیں۔ خیال گذرتا ہے کہ قدرت نے ان صندوقچیوں کے بوجھ سے ان جانوروں کے سروں کا توازن قائم رکھا ہوگا۔ اور انہی سے سروں کی حفاظت بھی ہوتی ہوگی۔ ان جانوروں کی گردنوں میں سیاہ رنگ کے پٹے دغالباً طوق غلامی تھے۔ مگر یہ طوق بہت سخت اور مضبوط تھے۔ اور ان کی وضع بالکل ہمارے کتوں کے پٹوں کی سی تھی۔ ان کی وجہ سے ان قابل رحم جانوروں کو اس قدر تکلیف ہوتی تھی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر اپنی گردن نہیں موڑ سکتے تھے۔ اس طرح وہ بیچارے ہمیشہ اپنے ناک کے سامنے دیکھنے پر مجبور تھے۔ اور ان کی صورتیں ایک حد تک مضحک ہو گئی تھیں۔

جب وہ عجیب الخلقت جانور اس ساحل کے قریب پہونچ گیا جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے تو اس نے دفعتاً اپنی ایک آنکھ بہت کچھ باہر نکالی۔ اور ایک آنکھ میں سے ایک خوفناک شعلۂ آتشیں نمودار ہوا۔ شعلے کے بعد دھویں کا تاریک بادل چھا گیا اور بادل کے گرجنے کی طرح ہولناک شور پیدا ہوا۔ دھویں کا بادل چھٹ گیا تو ہم نے دیکھا کہ ان عجیب غریب انسان نما جانوروں میں سے ایک نرسنگے کی وضع کی کوئی چیز ہاتھ میں لیے ہوئے جانور کے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ اس جانور نے نرسنگے کا رخ ہماری طرف کر کے منہ لگایا اور اپنی زبان میں جو کرخت اور بعید از فہم تھی ہماری طرف خطاب کیا۔

میں اس کی کوئی بات نہ سمجھ سکا اسلیے حیران تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ اسی پریشانی میں حمال کی طرف متوجہ ہوا جس پر بوجہ خوف کے غشی طاری ہونے والی تھی۔ اور اس سے دریافت کیا کہ یہ عجیب الخلقت جانور کس قسم کا ہے۔ اور وہ کیا چاہتا ہے اور جو انسان نما جانور اس کی پشت پر نظر آ رہے ہیں وہ کیا ہیں۔ حمال نے بہت کچھ غور و خوض کے بعد بیان کیا کہ اس نے ہیں دابتہ البحر کا حال پہلے بھی سنا ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک دیو ہے۔ اس کے پیٹ میں گندھک اور اس کی رگوں میں خون کے بجائے شعلہ ہائے آتش دوڑتے ہیں۔ یہ جانور بنی نوع آدم کو ایذا دینے کے لیے جنوں نے بنایا تھا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے انسان نما جانور جو اس کی پشت پر نظر آ رہے ہیں وہ اسی قسم کے خورد جانور ہیں۔ جیسے کتوں اور بلیوں کے جسم پر پیدا ہو جایا کرتے ہیں یا جیسے انسان کے جسم پر چچڑیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اور جب یہ چھوٹے چھوٹے جانور اس دابتہ البحر کے جسم میں کاٹتے ہیں تو وہ شعلہ ہائے آتشیں پھینکتا اور تکلیف کی وجہ سے بادل کی طرح گرجتا ہے۔ اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اسے اپنے نفس آتشیں سے جلا کر خاک کر دیتا ہے۔

جب حمال سے میں نے یہ بات سنی تو وہاں سے جان لیکر بھاگا۔ اور اس بری طرح بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور پہاڑیوں میں جا گھسا۔ یہی حال اس حمال کا بھی ہوا۔ مگر وہ دوسری طرف فرار ہوا۔ مگر کمبخت اس حالت میں بھی میرا تمام اسباب لے گیا۔

اس طرف تو میں بھاگا اور اس طرف ان انسان نما جانوروں نے دابتہ البحر کی پشت سے کود کر میرا تعاقب کیا۔ اور مجھے پہاڑیوں میں جا پکڑا۔ اسکے ان جانوروں نے جو کہ کشتیوں میں بیٹھ کر ساحل پر آئے تھے میرے ہاتھ پاؤں

انسان نما کیکڑی میں سے ایک کے ہمراہ پھر اسی داتبۃ البحر پر جا پہنچا۔ اس کے بعد وہ عجیب الخلقت جانور پھر کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔
اس وقت بحالت قید و بند میں اپنی حالت پر سخت متاسف ہوا کیونکہ میں آرام و راحت سے بسر ہو رہی تھی۔ نہ سیر و سیاحت کا سودا سر میں سمایا نہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتا مگر اب پشیمانی سے کیا ہوتا تھا۔ بہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ رہنے لگا اور حتی الامکان کوشش کرنے لگا کہ جس طرح ہو سکے اس نرسنگھے والے انسان نما جانور کی تالیف قلب کروں۔ کیونکہ یہی جانور اپنے ساتھیوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اور وہ میرے حال پر عنایت فرمانے لگا۔ اس نے مجھ پر یہاں تک مہربانی کی کہ اپنی زبان بھی مجھے سکھانے لگا حتی کہ کچھ دنوں بعد میں اس قابل ہو گیا کہ ان کی زبان میں باتیں کر سکوں اور میں نے اپنے قید کرنے والے کو سمجھایا کہ میں دنیا کی سیر و سیاحت کا بیحد شائق ہوں۔

ایک روز کھانے سے فراغت کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا:۔ "ون ٹیش اسکوا سٹیش اسکو ٹیک سند باد ہیڈ بڈل ڈیڈل گرنٹ ہانٹ ہس ہس ہس ہس۔"

اس زبان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ان لوگوں کی زبان گھوڑوں اور مرغوں کی زبان کے درمیان تھی۔ بہرحال میں ان الفاظ کا ترجمہ کئے دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ :۔ "میرے دوست سند باد میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ تم واقعی اچھے آدمی ہو اب ہم لوگ ایک کام کرنے والے ہیں جسے سمندر چکر کہتے ہیں یعنی تمام دنیا کے گرد گھومیں گے۔ اور چونکہ تم سیر و سیاحت کے بیحد شوقین ہو اسلئے میں تم کو اس جانور کی پشت پر بٹھا کر خوب سیر کراؤں گا۔"

جب ملکہ شہرزاد یہاں تک قصہ بیان کر چکی تو بادشاہ نے کروٹ بدلی۔ اور فرمایا:" ملکہ واقعی بہت حیرت انگیز قصہ ہے۔ مجھے اس جہازی کی سیر و سیاحت کے قصے سنکر بہت لطف حاصل ہوا۔"

ملکہ شہرزاد نے پھر قصہ کا سلسلہ یوں جاری کیا

"میں نے اس انسان نما جانور کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس داتبۃ البحر کی پشت پر اطمینان سے رہنے لگا۔ جو سمندر میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تیر رہا تھا۔ اگرچہ اس طرف کے سمندر کی سطح چپٹی نہیں بلکہ انار کی طرح ہے۔ اسلئے ہم کبھی موجوں کی چوٹی پر چلتے تھے اور کبھی ہموار سطح پر۔

بادشاہ:۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔

ملکہ:۔ بالفعل نہایت سچی بات ہے۔

بادشاہ:۔ مجھے بھی شک نہیں۔ بہرحال آپ قصہ کا سلسلہ جاری رکھیں۔

"بہت اچھا" کہہ کر شہرزاد نے بیان کیا کہ وہ داتبۃ البحر سطح سمندر پر تیرتا رہا اور کچھ دنوں بعد ہم ایک جزیرے میں پہنچے جس کا دور کئی سو میل کا تھا لیکن اس میں یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس جزیرہ کو سمندر کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں نے بنایا تھا۔ عہ

عہ۔ مونگے کا جزیرہ۔

ایک جزیرے سے روانہ ہوکر ہم اُس دوسرے جزیرے میں پہونچے جہاں ایک بہت بڑا جنگل سنگین درختوں کا تھا[1] جو اس قدر سخت تھے کہ مضبوط سے مضبوط کلہاڑی بھی ان کے کاٹنے سے عاجز تھی۔

پھر ہم نے بری سیر کرکے ہر ایک ایسے ملک میں پہونچے جہاں ایک غار زمین کے اندر بیس چالیس میل تک چلا گیا ہے۔ اور اس غار کے اندر نہایت عظیم الشان محل اور حویلیاں ہیں کہ بغداد اور دمشق میں بھی نہ ہونگے۔ ان محلات کی چھتوں پر ہزاروں لاکھوں جواہر و الماس وغیرہ قدآدم سے بھی بڑے لٹکتے تھے۔ اور بازاروں میں جگہ جگہ مینار اور اہرام اور برج بنے ہوئے تھے اور یہیں بڑے بڑے دریا بہتے تھے جن کا پانی بقدر سیاہ تھا جیسے روشنائی۔ اور لطف یہ تھا ان دریاؤں کے اندر مچھلیاں بکثرت تھیں۔ مگر ان مچھلیوں کے آنکھیں نہیں تھیں۔

بادشاہ:۔ ہوں!

اس کے بعد ہم سمندر میں تیرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں ایک سر بفلک پہاڑ تھا۔ اور اس کے اطراف میں گھلی ہوئی دھاتوں کے چشمے بہتے تھے۔ بعض بعض چشمے سا ٹھ میل لمبے چلے گئے تھے اور بارہ میل چوڑے تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمیق غار تھا جس کا گھیر

---

[1] یا ستہائے متحدہ امریکہ کی ریاست ٹیکساس (Texas) کے اندر ایک عجوبۂ قدرت یہ ہے کہ دریائے بازگو کے مخرج کے قریب ایک متحجر جنگل ہے۔ یعنی جس کے درخت پتھر بن گئے ہیں۔ ان درختوں کی تعداد کئی سو ہے۔ اور جو درخت اب نکل رہے ہیں وہ بھی کسی حد تک متحجر ہو گئے ہیں (ملاحظہ ہو کینیڈی صاحب کی کتاب "ٹیکساس" جلد اول صفحہ ۱۲۰) پہلے تو اس واقعہ کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا مگر جب سے کوہستان راکی (Rocky) میں گال پہاڑیوں (Black Hills) میں دریائے جامس کے مخرج پر ایک پورا جنگل بحجر یافت ہوا ہے۔ اسوقت سے اس بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔

روئے زمین پر کوئی منظر اس قدر دلفریب نہ ہوگا جیسا کہ مصر کے شہر قاہرہ کے قریب متحجر درختوں کا جنگل ہے۔ جب سیاح شہر سے باہر گور غریباں سے گذرنے کے بعد جانب جنوب اس سڑک سے جو سوئز کو جاتی ہے زاویہ قائمہ بناتا ہوا چلے گا تو تقریباً دس میل کے فاصلہ پر پہونچکر اسے ایک بنجر نشیبی وادی ملیگی۔ جہاں ریت، چھوٹی چھوٹی ٹھیکریاں، کوڑیاں، گھونگھے وغیرہ پڑے ہوئے ملیں گے۔ اس وادی سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی ریت کی پہاڑیوں کا گذرتا ہے جو راستہ سے کچھ دور تک متوازی چلا گیا ہے۔ یہاں جو منظر سیاح کے پیش نظر ہوگا وہ عجیب و حیرت انگیز ہے۔ یعنی میلوں تک سنگین درختوں کا ایک جنگل چلا گیا ہے جس پر اگر گھوڑے کا سم پڑتا ہے تو وہ ڈھلے ہوئے لوہے کی طرح بجتا ہے۔ ان درختوں کی لکڑی سرخی مائل بھورے رنگ کی ہے۔ اور اس میں لکڑی کی تمام خصوصیات اور اندرونی جوہر موجود ہیں۔ درخت عموماً ایک فٹ سے پندرہ فٹ تک دبیز اور نصف فٹ سے تین فٹ تک موٹے ہوتے ہیں۔ اور یہ درخت اسقدر گنجان ہیں کہ ایک مصری گدھا ان میں سے بمشکل گذر سکتا ہے۔ ان درختوں کی جڑیں اور شاخوں کے ڈنٹھ پوری طرح مکمل اور سالم ہیں۔ اور بعض میں چھال کے نیچے کیڑوں کے کھائے سوراخوں اور لکیروں کے بھی نشانات موجود ہیں۔ لکڑی کے اندر تمام حلقے اور خلایا اور رطوبت صاف اور مکمل نظر آتے ہیں جنھیں خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جا چکا ہے۔ اور تمام درخت اسقدر سختی سے متحجر ہو گئے ہیں کہ شیشہ پر خط کھینچنا ایک لکڑی کی نوک سے بہت آسان ہے علاوہ ازیں ان پر نہایت اچھی پالش بھی ہو سکتی ہے۔ (ایشیاٹک میگزین جلد سوم صفحہ ۵۹ سلسلہ سوم)

[2] کنٹکی ملک شمالی امریکہ کا غار ہے جسے انگریزی میں (Mammoth Cave of Kentucky) کہتے ہیں۔

[3] جزیرہ آئسلینڈ (Iceland) کے اندر ۱۷۸۳ء میں ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔

کی اس قدر مقدار گرد فضا میں پھیلتی تھی کہ چاروں طرف شب تاریک کا عالم طاری رہتا تھا۔ اور اس تارکی کی شدت اس قدر تھی کہ جب ہم اس پہاڑ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھے اس وقت بھی ہم کسی دودھ کے مانند سفید چیز کو بھی آنکھوں کے قریب لاکر نہ دیکھ سکتے تھے۔

اس ملک سے روانہ ہو کر ہمارے واجد الہمہ نے اپنے سفر کا سلسلہ جاری رکھا حتیٰ کہ ہم ایک ایسے ملک میں پہونچے جہاں کی دنیا ہی نرالی تھی۔ یعنی یہاں ہم نے ایک بڑی عمیق جھیل دیکھی جس کے اندر سطح آب سے سو فٹ نیچے درختوں کا ایک بڑا گنجان شاداب جنگل نظر آتا تھا۔ جب ہم یہاں تقریباً سو میل آگے بڑھے تو وہاں کی ہوا ہم نے اس قدر کثیف دیکھی کہ اس میں لوہا اور فولاد اس طرح معلق تیرنے لگتا تھا جیسے ہماری ہواؤں پر کاغذ کا ٹکڑا اڑتا ہے۔

بادشاہ:۔ بالکل جھوٹ!

اسی سمت ہم کچھ اور آگے بڑھے اور ایک ایسے خوبصورت اور دلفریب ملک میں پہونچے کہ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس ملک کے اندر وسیع سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا ایک نہایت عظیم الشان دریا ہزاروں میل تک بہتا ہے۔ یہ دریا اسقدر عمیق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور پانی اسقدر شفاف ہے جیسے بلور۔ دریا تین میل سے چھ میل تک چوڑا ہے۔ اور اس کے کنارے بعض بعض مقامات بارہ سو فٹ بلند ہیں۔ سدابہار درختوں کا سرسبز جنگل چلا گیا ہے جہاں خود رو گل ریاحین کی روح افزا خوشبو ہر وقت دوش صبا پر اڑتی رہتی ہے۔ الغرض یہ تمام ملک اپنی سرسبزی و شادابی اور خوبصورتی سے رشک جنت بنا ہوا ہے لیکن آب و ہوا یہاں کی اسقدر خراب ہے کہ وہاں کی سرزمین پر قدم رکھنا موت کے منھ میں جانا ہے۔

۱۸۸۳ء میں جب جزیرہ کراکاٹوا (Krakatoa) نامی کوہ آتش فشاں جوش میں آکر پھوٹا تو خاکستر کے اس قدر گہرے بادل فضا میں چھا گئے تھے کہ شہر [illegible] جو پہاڑ سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسقدر تاریکی چھا گئی تھی کہ لوگ ہاتھوں سے ٹٹول کر راستہ چلتے تھے۔ اور ۱۸۲۲ء میں جب اٹلی کا آتش فشاں پہاڑ ویسو ویس ([illegible]) پھٹا تو مقام تیغرہ میں جو بارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس قدر تاریکی چھا گئی تھی کہ لوگ مشعلیں جلا کر راستہ چلتے تھے۔ یکم مئی ۱۸۱۲ء کو جزیرہ سینٹ ونسنٹ کے آتش فشاں پہاڑ سے خاکستر کا اس قدر گہرا بادل نکلا کہ تمام جزائر باربیڈوز پر چھا گیا اور تاریکی کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر کے وقت کھلے میدان میں لوگوں کو قریب کے درخت اور دیگر چیزیں نظر نہ آتی تھیں اور چھ انچ کے فاصلہ پر سفید رومال نہ دکھائی دیتا تھا (مریے انسائیکلوپیڈیا آف جیاگرفی صفحہ ۲۲۱)

۱۸۱۲ء میں بمقام کاراکاس (Caraccas) اسقدر زبردست زلزلہ آیا کہ وہاں کی سنگلاخ زمین کا ایک طبقہ جو آسپاڈا (Aspada) کے جنگل کا ایک حصہ تھا نیچے بیٹھ گیا۔ اور وہاں ایک جھیل پیدا ہو گئی جس کا قطر آٹھ سو فٹ تھا۔ اور جو اسی سے سو فٹ تک گہری تھی۔ جنگل کے درخت جو اس جھیل کی تہ میں تھے وہ کئی ماہ تک بدستور سرسبز و شاداب رہے۔ (مریے انسائیکلوپیڈیا جغرافیہ صفحہ ۲۲۱)

تحقیق سے ثابت ہوا کہ لوہا بھی دھونکنی کے ذریعے آنچ دیکر اسقدر باریک سفوف کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہوا میں اڑنے لگے۔

یہ ملک مغربی افریقہ میں وادی دریائے نائیجر ہے جسے نائیجریا (Nigeria) کہتے ہیں۔ یہ ملک قدرتی طور پر نہایت سرسبز و شاداب ہے مگر یہاں کی آب و ہوا یورپین اقوام کو ناموافق ہوتی ہے۔ اور وہ اس ملک کو "موت کا ملک" کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سائمنڈ کا کولونیل میگزین۔
(Region of the Niger. Simmonds Colonial Magazine)

بادشاہ:- پھر کیا!

الغرض ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہو گئے اور چند روز بعد ایسے ملک میں پہونچے جہاں ہم نے وہ کون عجیب الخلقت جانور ایسے دیکھے جن کے سروں پہ ہتھنے کی وضع کے سینگ تھے۔ یہ کریہ صورت جانور اپنے رہنے کے لئے زمین میں بڑے بڑے غار کھودتے ہیں جن کی شکل مخروطی ہوتی ہے۔ اور غار میں چاروں طرف چٹانوں کے ٹکڑے اس طرح جما دیتے ہیں کہ جب کوئی دوسرا جانور اس پر پاؤں رکھتا ہے تو وہ فوراً پھسل کر گر پڑتا ہے۔ اور وہ خونخوار مخلوق فوراً اس جانور کا خون چوس لیتی ہے اور لاش کو حقارت کے ساتھ غار کے دہانے سے جو درا صل "غار قعنا" ہے۔ بہت دور پھینک دیتی ہے۔

بادشاہ:- واہیات!

ہم اپنا سلسلۂ سفر جاری رکھتے ہوئے ایک ایسے علاقہ میں پہونچے جہاں نباتات زمین میں نہیں بلکہ ہوا میں اگتی ہے۔ اور بعض درخت ایسے بھی تھے جو درختوں پر اگے ہوئے تھے۔ بعض درخت ایسے تھے جو جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ بعض درخت ہم نے یہاں ایسے بھی دیکھے جو جڑ سے چوٹی تک آگ کی طرح چمکتے تھے۔ اور بعض نباتات ایسے بھی تھے جن میں نقل و حرکت کی قوت بھی تھی اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ ان سب سے زیادہ عجیب و غریب ایک قسم کے پھول دیکھے جو سانس لیتے تھے، جان رکھتے تھے۔ اور پنکھڑیوں کو اپنی قوت ارادی سے حرکت میں لاتے تھے۔ ان پھولوں میں انسان کی طرح یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ اپنے حسن فریب سے جانوروں کو پھانس لیتے تھے جنھیں وہ بھیانک کال کوٹھریوں میں مقید رکھتے تھے۔

عہ۔ ایک قسم کی چیونٹی ہوتی ہے جسے انگریزی زبان میں "مرمیلیون" (Myrmeleon) یعنی "شیر چیونٹی" کہتے ہیں۔ لفظ "عجیب الخلقت" جو استعمال کیا گیا ہے وہ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے جانوروں پر عائد ہو سکتا ہے۔ اور غار کیلئے جو لفظ "بڑے" استعمال کیا گیا ہے وہ اعتباری ہے کیونکہ معمولی چیونٹی کے سوراخ سے "شیر چیونٹی" کا غار نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ لفظ "چٹان" کا اطلاق سائنس کی اصطلاح میں ریت کے ذرہ پر بھی ہو سکتا ہے۔

عہ۔ اکاس بیل جسے انگریزی میں "Epidendrum flos aeris" کہتے ہیں۔ یہ بیل ڈورے کی طرح درختوں اور جھاڑیوں پر پھیلی ہے اور ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے۔

عہ۔ طفیلی (Parasitic) درخت جیسے ببول، پیپل، برگد اور شیشم وغیرہ پر اکثر ایک قسم کی نباتات اگ آتی ہے جسے "بندہ" کہتے ہیں۔

عہ۔ مسٹر جے۔ بی۔ ولیمس ساکن سالم (امریکہ) نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کو ایک کیڑا نذر کیا جسے وہ نیوزی لینڈ سے لائے تھے اور اسکی نسبت یہ تحریر کیا کہ یہ جانور ایک (Moth) کہلاتا ہے جو سبزہ اراکی وضع کا ہے۔ وہ یہ "راتا" (Rata) درخت کی جڑوں میں رہتا ہے۔ اور اسکے سر سے ایک پودا نکلتا ہے۔ یہ کیڑا درخت پر چڑھتا چلا جاتا ہے جب چوٹی پر پہونچتا ہے تو سوراخ کرتا ہوا جڑ تک اتر آتا ہے جہاں سوراخ کھود کر باہر نکلتا اور مر جاتا ہے۔ اور وہ پودا اس کے سر پر بڑھتا رہتا ہے۔ اس کیڑے سے ایک قسم کا رنگ بنایا جاتا ہے۔

عہ۔ معادن اور قدرتی غاروں میں ایک قسم کے پھول کا سار دغ پایا جاتا ہے جس سے تیز روشنی نکلتی ہے۔

عہ۔ Gowhia, Scabius & Vallisneria (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بادشاہ:- بالکل جھوٹ۔

اس ملک سے روانہ ہو کر ہم بہت جلد ایک دوسرے ملک میں پہونچے جہاں کی چڑیاں اور شہد کی مکھیاں نہایت ہی زبردست ریاضی داں واقع ہوئی ہیں۔ اس ملک کے عقیل و فہیم لوگ ان جانوروں سے روزمرہ علم الہندسہ میں سبق لیتے ہیں۔ اس ملک کے بادشاہ نے دو سوال پیش کر کے بھاری انعام کا وعدہ کیا۔ ان سوالوں کا فوراً حل کر دیا گیا۔ ایک سوال شہد کی مکھیوں نے اور دوسرا چڑیوں نے حل کیا گویا وشام نے ان سوالات کے حل مخفی رکھے۔ آخر سالہا سال کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزیوں کے بعد بڑی بڑی کتابیں لکھکر اس ملک کے ریاضی دانوں نے وہ حل معلوم کیے۔[۵]

بادشاہ:- معاذ اللہ اس قدر جھوٹ!

ابھی ہم اس سلطنت کی حدود سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک دوسرے ملک میں پہونچے۔ یہاں ساحل بحر سے مرغوں کا ایک سقدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ صفحہ) اس پھول کو انگریزی میں (ARISTOCHIA CLAMATITIS) کہتے ہیں۔ اس کا چہرہ نالی دار ہوتا ہے۔ پھول کی جڑ کروی ہوتی ہے۔ نالی دار حصہ کے اندر سخت بال اس طرح ہوتے ہیں کہ ان کے سرے نیچے کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ کروی حصہ میں ایک حصہ ہوتا ہے جس میں بیضہ دان (GERMEN) علہ اور سر تھچہ (STIGMA) علہ دونوں ہوتے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف زردان STAMENS ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ زردان بمقابلہ بیضہ دانوں کے چھوٹے ہوتے ہیں اسلیے وہ سر تھچہ پہ زردانہ نہیں پھینک سکتے۔ کیونکہ پھول ہمیشہ سیدھا رہتا ہے تاوقتیکہ حاملہ نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک کوئی خارجی مدد حاصل نہ ہو زردانہ پھول کی تہ تک نہیں پہونچتا اسکے لئے قدرت نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ایک چھوٹا سا کیڑا جسے انگریزی زبان میں (TRIPULA PENNICORIS) حلقہ کہتے ہیں بتلاش شہد پھول کی نالی میں داخل ہوتا ہے۔ اور کروی حصہ میں پہونچ جاتا ہے۔ اسکے بعد وہ چاروں طرف پھرتا ہے حتی کہ اس پر زردانہ لپٹ جاتا ہے۔ لیکن چونکہ نالی کے اندر بالوں کا رُخ نیچے کی جانب ہوتا ہے اسلئے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ وہ گھبرا کر پھول کے اندر چاروں طرف مارا مارا پھرتا ہے۔ حتی کہ وہ سر تھچہ میں گھوم پھر کر اسکے اندر اپنے جسم سے کافی مقدار زردانہ کی پہونچا دیتا ہے۔ جس سے وہ پھول حاملہ ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد پھول کا سر بہت جلد نیچے کی طرف جھک جاتا ہے اور نالی کے اندر بال بھی دیواروں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اب وہ کیڑا آسانی باہر نکل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

ع۵ - جب سے شہد کی مکھیاں وجود میں آئی ہیں۔ ہمیشہ اپنا چھتہ ایک ہی وضع کا سا بناتی چلی آتی ہیں۔ ہر خانہ کا طول و عرض اسکے اضلاع اور اضلاع کے درمیان زاویے ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ ان کے طول اور زاویوں میں سر مو فرق نہیں ہوتا۔

گذشتہ صدی کے آخری زمانہ میں ریاضی دانوں میں یہ مسئلہ چھڑا کہ ہوائی چکی کے پنکھوں کو بہترین وضع کس طرح دی جائے۔ یہ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ تھا۔ بہت سے مشہور و معروف ریاضی دانوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ بالآخر سخت کوششوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قدرت نے پرندوں کے بازوؤں کو جو شکل و صورت دی ہے اس سے بہتر صورت چکی کے پنکھوں کو نہیں دی جا سکتی۔

زبردست بادل اڑ کر ہمارے سروں پر سے گذرا کہ اس بادل کا طول دو سو چالیس میل اور عرض ایک سو میل تھا۔ اگرچہ یہ مرغ ایک میل فی منٹ کی رفتار سے اڑ رہے تھے مگر ان کو گذرنے میں پورے چار گھنٹے لگے۔ اس بادل میں کئی کروڑ مرغ تھے۔

بادشاہ:۔ اُف! اس قدر جھوٹ!

جب پرندوں کا یہ غول جس کی وجہ سے ہم کو سخت تکلیف ہوئی۔ ہمارے سروں پر سے گذر گیا۔ تو ایک اور مرغ نہایت ہیبت انگیز اور خوفناک نمودار ہوا۔ اسکی جسامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بغداد میں اتنا بڑا گنبد کوئی نہیں۔ اس خوفناک پرند کا سر نظر نہیں آتا تھا۔ فقط پیٹ ہی پیٹ تھا جو نہایت مضبوط اور گول تھا علاوہ ازیں وہ کسی قسم کے ملائم مادہ کا بنا ہوا تھا۔ تمام پیٹ نہایت چکنا اور چمکدار تھا۔ اور اس پر مختلف رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اپنے پنجوں میں یہ مرغ ہولناک ایک مکان بلا سقف و بام لئے ہوئے اڑا جاتا تھا۔ غالباً اسکا آشیانہ آسمان پر ہوگا۔ کیونکہ وہ بتدریج اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس نے مکان کی چھت توڑ کر پھینکدی ہے۔ مکان کے اندر ہم کو آدمی بھی بیٹھے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے جو یقیناً خوفزدہ تھے۔ اور موت ان کی نظروں میں پھر رہی تھی۔ ہم نے ہر چند گلا پھاڑ پھاڑ کر شور و غل مچایا تاکہ وہ ڈر کر ان کا شکار چھوڑ دے۔ مگر اس نے ہمارے سروں پر ایک بھاری تھیلا پھینک مارا جسمیں ریت بھری تھی[عہ]

بادشاہ:۔ لاحول ولا قوۃ!

اس واقعہ کے بعد ہم ایک طویل و عریض براعظم میں پہونچے جس کے طول و عرض کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس براعظم کی زمین نہایت ٹھوس واقع ہوئی تھی۔ مگر با ایں ہمہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ اسے آسمانی رنگ کی ایک گائے اپنے سینگوں پر اٹھائے ہوئے تھی۔ اور ان سینگوں کی تعداد چار سو سے کم نہ تھی[سہ]۔

بادشاہ:۔ اس بات کا میں یقین کرتا ہوں کیونکہ میں نے یہی بات کسی کتاب میں بھی پڑھی ہے۔ اور کتابی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں۔

ہم فوراً اس براعظم کے نیچے گائے کی ٹانگوں میں ہو کر گذرے اور چند گھنٹے کے بعد ایک نہایت عجیب و غریب ملک میں پہونچے۔ اس انسان نما جانور نے مجھے بتایا کہ یہ ملک ان کا وطن ہے یعنی اس سرزمین میں اسی قسم کے انسان نما جانور رہتے ہیں۔ یہ بات سنکر میرے دل میں انسان نما جانوروں کی بیحد قدر و وقعت ہوئی۔ اور اب واقعی مجھے یہ خیال کر کے شرم آتی ہے کہ اب تک میں ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اب اس ملک میں پہونچکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ انسان نما جانور درحقیقت نہایت طاقتور جادوگروں کی

عہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسنے فرانکفورٹ اور انڈیانا کے علاقہ کے درمیان کبوتروں کا ایک غول گذرتے دیکھا ہوگا۔ جو کم از کم ایک میل چوڑا ہوگا۔ یہ غول چار گھنٹہ میں گذر سکا۔ اگر ان کی رفتار ایک منٹ فی میل لگائی جائے تو تمام غول کا طول ۲۴۰ میل ہوتا ہے۔ اور اگر ایک مربع گز کے اندر تین کبوتر فرض کیے جائیں تو تمام کبوتروں کی تعداد ۲۲۳۰۲۷۲۰۰۰ ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو سیاحت کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ مرتبہ لفٹننٹ ایف۔ ہال)

عہ۔ یہ مرغ ہیبتناک جدید قسم کا غبارہ تھا۔ جب ہوا میں زیادہ بلند ہونا منظور ہوتا ہے تو غبارہ سے ریت کی بھری ہوئی بوری پھینکدی جاتی ہے تاکہ سبک ہو کر اوپر چڑھے۔

سہ۔ قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ زمین ایک نیلگوں گائے کے سینگوں پر قایم ہے۔ اور ان سینگوں کی تعداد چار سو ہے

ایک قوم ہی۔ ان لوگوں کے مغز میں کیڑے ہوتے ہیں[عـ] جب یہ کیڑے کلبلاتے ہیں تو ان لوگوں کا دماغ میدان خیال میں خوب کام کرتا ہی۔

بادشاہ:- توبہ! توبہ!!

ان جادوگروں نے بہت سے عجیب و غریب جانور پال رکھے تھے۔ مثلاً ایک بہت عظیم الجثہ گھوڑا تھا جس کی ہڈیاں لوہے کی تھیں اور خون کی جگہ اس کی رگوں میں کھولتا ہوا پانی دوڑتا تھا۔ دانہ کے بجائے وہ گھوڑا سیاہ پتھر کھاتا تھا۔ اور باوجود اس قدر سخت غذا کے بھی وہ نہایت تندرست اور طاقتور رہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس قدر وزن گھسیٹ لیجاتا تھا کہ بغداد بھر میں کوئی مسجد اس قدر وزنی نہ ہوگی اور تیز رو بھی اس قدر تھا کہ بہت سے پرندے اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے[عـ]۔

بادشاہ:- لغو اور غلط!

اسی قوم کے یہاں میں نے ایک مرغی بھی دیکھی جس کے جسم پر ایک بھی پر نہ تھا۔ لیکن جثہ میں وہ اونٹ سے بھی بڑی تھی۔ اسکے جسم میں بجائے گوشت و استخواں کے لوہا اور اینٹیں تھیں۔ اور مندرجۂ بالا کی طرح اس کا خون بھی کھولتا ہوا پانی تھا۔ اور اسی کی طرح یہ بھی سیاہ پتھر یا لکڑی کھاتی تھی۔ یہ مرغی ایک دن میں اکثر پانصد انڈے سکر بچے نکالتی تھی۔ اور انڈوں سے باہر نکلنے کے بعد وہ چوزے کئی ہفتہ تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہتے تھے[عـ]۔

بادشاہ:- توبہ توبہ!

جادوگروں کی اس زبردست قوم کے ایک طاقتور ساحر نے پیتل۔ لکڑی اور چمڑے کا ایک انسان بنایا اور اس میں اس قدر عقل پیدا کی کہ وہ شطرنج کھیلنے میں خلیفہ ہارون الرشید اعظم کے سوائے دنیا کے تمام شاطروں کو مات دیتا تھا[عـ]۔ اسی قوم کے ایک دوسرے جادوگر نے ایک اور پتلا بنایا جو حساب کتاب میں بڑے بڑے ماہرین کو شرمندہ کر دیتا تھا۔ یعنی وہ ایک سکنڈ میں اس قدر بڑے بڑے حساب صحت کے ساتھ لگا دیتا تھا کہ ان کے حل کرنے میں پچاس ہزار آدمیوں کی متفقہ محنت و جانفشانی کو ایک سال درکار ہوتا[عـ]۔ اسی قوم کے ایک تیسرے جادوگر نے ایک اور عجیب و غریب چیز بنائی جو نہ انسان ہے نہ حیوان لیکن اس کا مغز سیسہ کا ہی اور سیسہ میں قیر کے

عـ۵۔ ان کیڑوں کو انگریزی زبان میں (ENTOZOA) کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو دیاش صاحب کی کتاب "فزیالوجی صفحہ ۱۴۳"

عـ۵۔ ریلوے انجن (LOCOMOTIVE) لندن اور اکسیٹر کے درمیان جو گریٹ ویسٹرن ریلوے چلتی ہے اس پر اکثر ۷۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار پوری کی جا چکی ہی۔ ایک ٹرین پاڈنگٹن اور ڈڈکوٹ کے درمیان جس کا وزن ۹۰ ٹن (ایک ٹن = ۲۸ من تقریباً) ۵۳ میل کے فاصلہ پر ۵۱ منٹ میں پہونچائی جا چکی ہی۔

عـ۵۔ مرغی کے انڈے سینے کی بھٹی۔

عـ۵ MAELZEL'S AUTOMATIC CHESS PLAYER

عـ۵ BABBAGE'S CALCULATING MACHINE

مانند ایک سیاہ چیز لی ہوئی تھی - اور اس کی انگلیاں بلا تکلف ایک گھنٹہ کے اندر پچاس ہزار قرآن لکھ دے سکتی ہیں - اور وہ بھی اس قدر صحت کے ساتھ کہ ایک نسخہ دوسرے سے اعراب میں بھی مختلف نہیں ہو سکتا - یہ چیز اس قدر طاقتور واقع ہوئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو زبردست سے زبردست سلطنت کو بھی تہ و بالا کر دے سکتی ہے - اور دیکھتے دیکھتے ایک معمولی جماعت کو قوم اور قوم کے لئے ایک وسیع سلطنت قائم کر سکتی ہے - الغرض خیر و شر دونوں باتیں اسی چیز کے ہاتھ میں ہیں۔

بادشاہ:- لاحول ولا قوۃ! اس قدر جھوٹ!!

ساحروں کی اس قوم میں ایک شخص ایسا بھی گذرا جس کی رگوں میں سمندر (آگ کا جانور) کا خون دوڑتا تھا - کیونکہ وہ جلتے ہوئے تنور میں بیٹھ کر اپنا حقہ پی سکتا تھا - اور وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا بھی پکا لیتا تھا - ایک اور جادوگر ایسا تھا جو ظلمانی اشیاء کو روشنی میں تبدیل کر دیتا تھا اور ان پوشیدہ اشیاء کو نہ دیکھتا تھا - ایک اور شخص ایسا گذرا ہے جس نے ایک آلہ کے ذریعہ سے ایسا باریک تار بنایا جو آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا تھا - اور ایک شخص تو اس قدر عجیب و غریب دماغ والا ہے کہ وہ ایک نچدار چیز کے اہتزاز کا شمار ایسی حالت میں کر سکتا تھا جبکہ وہ ایک سکنڈ میں نو لاکھ مرتبہ حرکت کرتی تھی

بادشاہ:- جھوٹ کی حد ہوگئی۔

انہی جادوگروں میں سے ایک شخص نے ایک غیر مرئی سیال شے کے ذریعہ سے یہ کمال دکھایا کہ انسانی ڈھانچوں میں جان ڈال دی اور چلنے پھرنے، ہاتھ پاؤں ہلانے اور ناچنے کودنے لگے - ایک اور جادوگر نے اپنی آواز کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک اپنی بات سنا سکتا ہے - ایک جادوگر نے اپنا ہاتھ اس قدر بڑھایا ہے کہ اگر وہ دمشق میں بیٹھا ہو تو بغداد میں خط لکھ سکتا ہے - بلکہ بغداد تو کیا وہ ہر جگہ یہ کام کر سکتا ہے - ایک جادوگر نے بجلی کو حکم دیا کہ وہ آسمان سے اتر اس کے پاس آئے - چنانچہ وہ اتری اور اس ساحر کے ساتھ کھیلتی رہی - ایک اور ساحر نے دو آوازیں لیں اور ان دونوں سے سکوت پیدا کر دیا - دیگر ساحر نے دو نہایت درخشاں روشنیاں لیں اور ان دونوں کو ملا کر تاریکی پیدا کر دی - ایک جادوگر نے دہکتے ہوئے تنور کے اندر برف

ELECTRO TYPE پریس (PRESS) عہ (CHABERT) اور اس کے بعد صدہا دیگر اشخاص سے - الکٹروٹائپ

وولاسٹن (WOOLASTON) نے دوربین کے لیے ایک تار ایک انچ کا اٹھارہویں ہزار حصہ کے برابر بنایا تھا - یہ تار اس قدر باریک تھا کہ صرف خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جا سکتا تھا - نیوٹن نے دکھایا تھا کہ شبکیہ (RETINA) بنفشئی شعاعوں کے زیر اثر ایک سکنڈ میں نوے کروڑ مرتبہ اہتزاز کرتی ہے - برقی رو (VOLTAIC PILE) الکٹرو ٹیلیگراف (ELECTRO.TELEGRAPH) جس کے ذریعہ سے فوراً پہونچ جاتی ہے THE ELECTRO TELEGRAPH PRINTING APPARATUS طبیعیات کا ایک معمولی تجربہ ہے کہ اگر دو منور نقطوں سے دو سرخ شعاعیں کسی تاریک کمرہ میں کسی سفید چیز پر اس طرح ڈالی جائیں کہ ان کے طول میں ۰۰۰۰۲۵۸ ۰ انچ کا فرق ہو تو ان شعاعوں کی تنویر بالمضاعف ہو جائیگی - اسی طرح اگر طول کا فرق ۱½ یا ۲½ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو تنویر میں شدت پیدا ہوتی رہیگی لیکن اگر (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

پیدا کرو تھی۔ دوسرے نے آفتاب کو حکم دیا کہ وہ اسکی تصویر کھینچے چنانچہ آفتاب نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اسکی تصویر کھینچ دی ایک اور جادوگرنی نے شمس قمر اور دیگر سیاروں کو لیا اور ان کو نہایت صحت کے ساتھ وزن کیا، ان کے تمام گہرے اسرار معلوم کئے اور جن تاروں کے دیکھے ہوئے ہیں ان کی کثافت معلوم کی۔ الغرض یہ تمام قوم اس قدر زبردست ساحر واقع ہوئی ہے کہ انکے بچے کھلونوں تک بھی ان چیزوں کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں جن کا وجود نہیں۔ یا جو اس قوم کے وجود میں آنے سے بھی بیس ہزار سال پیشتر صفحہ ہستی سے نابود ہو گئی تھیں۔

بادشاہ:۔ لاحول ولا قوۃ!

ان عظیم الشان اور زبردست جادوگروں کی بیویاں اور بیٹیاں انتہا درجہ کی شایستہ، سلیقہ شعار، عالمہ، فاضل اور دانشمند ہوتی ہیں۔ الغرض جس قدر خوبیاں بلحاظ فضائل خیال میں آسکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں حسن و جمال میں بھی قدرت نے ان کو زبردست حصہ مرحمت فرمایا ہے مگر ایک سخت عیب ان میں پایا جاتا ہے جو باوجود کوشش بسیار ان کے شوہروں اور والدوں سے بھی دور نہ کیا جا سکا۔

بادشاہ:۔ وہ کیا عیب ہے؟

کسی خبیث جن نے جو ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ انسان کو مضرت پہونچائیں۔ ان شایستہ خواتین کے دل میں یہ بات ڈالدی ہے کہ جس چیز کو حسن و جمال سے تعبیر کرتے ہیں محض اس قدر ہے کہ جسم کا وہ حصہ جو بانس سے نیچے ہے کوہان شتر کی طرح ابھرا ہوا ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شعاعوں کے طول کے فرق ۱/۲ یا ۳ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو قطعی تاریکی پیدا ہو جائیگی۔ اسی قسم کے تجربات اگر آواز کے ساتھ کئے جائیں تو یہی نتائج پیدا ہونگے۔

عـــہ۔ پلاٹینم کی ایک کٹھالی اسپرٹ لیمپ پر رکھو اور سرخ آنچ دو بعد ازاں اسمیں گندھک کا تیزاب ڈالو۔ اگرچہ معمولی ٹمپریچروں میں یہ تیزاب سب سے زیادہ اڑتا ہے لیکن وہ اس وقت کٹھالی میں قایم رہیگا۔ اگر اس وقت پانی کے چند قطرے کٹھالی میں ڈالدیئے جائیں تو تمام تیزاب بسقدر تیزی سے غائب ہو جائیگا کہ پانی کے قطروں کی حرارت مستور بھی اسی کے ساتھ اڑ جائیگی۔ اور پانی کے قطرے منجمد ہو کر بصورت برف رہ جائینگے۔ اسطرح گویا دہکتے ہوئے تنور میں برف بنجاتی ہے۔ عـــہ DAGUERREOTYPE عـــہ اگرچہ روشنی کی رفتار دو لاکھ میل فی سکنڈ ہے لیکن کرۂ ارض سے قریب ترین ثابت جس کا نام "کلب اکبر" (DOG STAR) ہے وہ اس قدر دور ہے کہ اسکی روشنی کو کرۂ ارض تک پہونچنے میں کم از کم تین سال لگیں گے۔ اور اس سے بھی آگے جو ستارے ہیں انکی روشنی بیس سال بلکہ بعض کی ایک ہزار سال میں ہم تک پہونچیگی۔ برعکس ازیں یہ سمجھنا کہ اگر وہ ستارے بیس یا بیس ہزار سال پیشتر فنا ہو جاتے تو ان کی روشنی ہم کو ابتک نظر آتی یعنی وہی روشنی جو انکی سطح سے بیس یا ہزار سال پیشتر چلی تھی کرۂ ارض پر ابتک نظر آتی ہے۔ (ایڈورڈ جنرل نوٹ)

بقول ہرشیل کبیر (ELDER HERSCHEL) جو روشنی خفیف ترین سدیم کی اسکی دوربین کے ذریعہ سے نظر آتی ہے وہ تیس لاکھ سال پیشتر چلی ہوگی اور جو سدیم لارڈ راس (ROSS) کی دوربین سے دکھائی دیتی ہے وہ کم از کم دو کروڑ برس قبل چلی ہوگی

وہ کہتی ہیں کہ جس قدر بڑا اگراہان ہوگا اُسی قدر زیادہ ایک عورت حسین و جمیل ہوگی۔ الغرض باوجود اس قدر زیادہ شائستگی اور علم و فضل کے وہ خود کو مادۂ شتر بنانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

بادشاہ:- بس بند کرو اپنی لغو داستان! میں اس سے زیادہ ہرگز سننا نہیں چاہتا، تمہاری دروغ بیانیوں سے میرے سر میں درد ہوگیا ہے۔ اب صبح بھی ہونے والی ہے۔ آہ! ہماری شادی ہوئے کس قدر عرصہ گذرا؟ میرا ضمیر اب مجھے بُرا بھلا طعن کرنے لگا ہے۔ بس اب تمہاری عمر ختم ہوگئی۔ اور اب مجھیں بھی میری دوسری بیویوں کے پاس جانا پڑیگا۔"

بادشاہ کا یہ حکم سنکر ملکہ شہرزاد کانپ اُٹھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ اس کے شوہر کے منھ سے نکل گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا اس لیے اس نے اپنے آپ کو خوانہ جلاد کردیا۔ اور اس طرح سندباد جہازی کی سرگذشت کا بہت حصّہ باقی رہ گیا جس کے سُننے سے دُنیا اب تا ابد محروم رہے گی۔

(اڈگرالن پو)

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۲۶۸ ۱۳ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج ماتحت مقام اناؤ

چندر بھوکن ولد گوبردھن داس قوم برہمن ساکن منکا جو پرگنہ بھگوت نگر ضلع اُناؤ .... مدعی

بنام

ماتا بدل سنگھ

بنام ماتا بدل سنگھ ولد گیا بخش سنگھ قوم ٹھاکر ساکن دبنکولی مزرعہ کسری کھیڑہ پرگنہ دریدسہ کھیڑہ ضلع اناؤ ...... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ۔۔۔ روپئے دائر کی ہے۔ لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ دس ماہ فروری ۱۹۳۲ء بوقت ۱۰ بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو۔ اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار کیلئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اُسی روز اُن کو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ جنوری ۱۹۳۲ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

وقت حاضری بدفتر سب ججی اناؤ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

مہر عدالت دستخط حاکم بخط انگریزی

کیا خدا کا وجود ہے؟

دنیائے شاعری میں، وجودِ باری پر سب سے زیادہ پاکیزہ خیال مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے جنھوں نے اپنے احساسِ بیچارگی و بےکسی کا نام خدا رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:—

علاجِ نیست داغِ بندگی را اگر بیشم وگر کم آفریدند

اسی خیال کو اکبر الہ آبادی نے اس طرح ظاہر کیا ہے:—

بندگی حالت سے ظاہر ہے، خدا ہو یا نہ ہو

خیر یہ تو شاعرانہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے انکارِ خدا پر بھی باز پرس نہیں ہو سکتی، لیکن لطف تو یہ ہے کہ جب ہم شاعری سے قطع نظر کر کے، حکمت و فلسفہ، علم و تحقیق سے مدد چاہتے ہیں، تو نتیجہ وہی نکلتا ہے جو بیدل یا دوسرے شعراء نے سمجھا ہے، اور یہاں بھی اعتراف عجز ہی سے معرفتِ الٰہی کی بصیرت شروع ہوتی ہے۔

آیئے آج کی صحبت میں اس اجمال کی تفصیل پر متوجہ ہوں۔

کائنات اور اس کی وسعت کو تو خیر جانے دیجئے کہ ضرورت اس آسمان پر واری کی نہیں ہے۔ بلکہ اسی زمین پر رہنے اور بسنے کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے اس "زمین" ہی کو دیکھنا چاہیئے کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لیے کوئی دلائل و شواہد یہاں چھوڑے ہیں یا نہیں؟

زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتے ہیں۔ اور حرکت ارادی کے بھی مالک ہیں۔ مثلاً انسان۔ شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ۔ اور اس قسم کو حیوان کہتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں، جو زندہ تو ہیں لیکن حرکت ارادی سے محروم ہیں اور ان کا نام نباتات ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے، نہ حرکت ارادی پر قادر۔ جیسے مٹی۔ پانی، ہوا۔ اور ایسے جمادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اور کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا درخت ہو جائے۔ اور گلاب ترقی کر کے کبھی انسان بن جائے۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس قدر ظاہری و معنوی بُعد و تفریق کے جس وقت ان تینوں کی کیمیاوی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں مواد جامدہ سے جو نہ جان رکھتے ہیں اور نہ حرکت ارادی پر قادر ہیں۔ اور جن کا نام علمی دنیا میں "عناصر" رکھا جاتا ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین پر ڈالتے ہیں۔ اور یہ دانہ، مٹی، پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کر کے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے، آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ مرغی کے انڈے کو ایک متعین مدت تک گرمی پہونچا کر اس سے مرغی ہی کا بچہ پیدا کرتے ہیں، مرغابی کے انڈے سے مرغابی اور کچھوے کے انڈے سے کچھوے ہی نکلتے ہیں۔

تماشہ یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انھیں عناصر سے ہوئی ہے، جو بیجان ہیں جن میں کوئی حرکت ارادی نہیں، لیکن کیا ممکن کہ گیہوں کے تخم سے انڈے، اور طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہوسکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہے تو یہ تفریق کیسی، اور حیات کی صورتوں میں یہ تنوع، یہ نیرنگی، یہ بوقلمونی کہاں سے آئی؟

اہل علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کو تحلیل کریں اور دیکھیں کہ یہ حیوانات و نباتات کے اجزائے ترکیبی اور نباتات و جمادات کے اجزائے حیات میں کیا فرق ہے، لیکن جب انھوں نے یہ عمل کیمیاوی کیا تو ہر صورت میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جاندار ہوں یا بیجان، چند عناصر بسیط سے مرکب ہیں جو بالکل بیجان ہیں۔ پھر انھوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان کو علٰحدہ علٰحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا نہ باقی ہو، آؤ ان کو پھر ملا کر دیکھو، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ وہ عناصر کو ایک بار علٰحدہ کرنے کے بعد باہم گھل مل ہی نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ملا دیں تو ان میں کوئی آثار حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک عندلیب ہمارے سامنے چہچہا رہا ہے، طرح طرح کے نغمے اس کی منقار سے پیدا ہو رہے ہیں۔ پاس ہی ایک گلاب کا درخت ہے جس کے رنگین پھولوں کی خوشبو ہمارے دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ اور وہیں ایک پتھر کا وزنی ٹکڑا ہے جس کو ہم اپنے ہاتھ سے آسانی کے ساتھ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن جب ہم عندلیب کو ہلاک کرکے اس کی ترکیب حیات کی جستجو کرتے ہیں۔ گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں۔ پتھر کے اجزاء کی تحلیل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجزاء بالکل جامد ہیں بیجان ہیں، نہ ان میں کوئی آواز ہے نہ نغمہ، نہ خوشبو نہ وزن، اور مطلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو بلبل کے حقیر جثہ میں ایک دنیائے نغمہ، پھول کی ضعیف و نازک شکل میں یک ہنگامۂ نکہت، اور پتھر کے سکون ہی میں ایک وزن اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی — پھر جب یہ صورت تحقیق و تفتیش کی کسی نتیجہ تک نہ پہونچا سکی تو انھیں علماء نے جستجو کی ایک اور راہ اختیار کی جو یقیناً زیادہ بالغ نظری پر مبنی تھی۔ انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام خوردبین ہے اور جو اجسام صغیرہ کو لاکھوں کروڑوں گنا بڑا کرکے دکھاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے جب انھوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں جو شفاف ہیں بے رنگ ہیں اور کچھ انڈے کی سپیدی کی طرح لیسدار ہیں۔ یہ جراثیم مختلف شکل کے ہیں اور نباتات و حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے بطور غذا مواد جامد حاصل کرکے کسی ایسے طریقہ سے جس کا علم اس وقت تک انسان کو حاصل نہیں ہوسکا۔ ان کو زندگی بخشتے ہیں، اور پھر اعصاب، شرائین، عضلات وغیرہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ جو جراثیم ہڈی بنانے کے لیے متعین ہیں وہ ہڈی ہی بنائیں گے جو پتی کی تشکیل پر مامور ہیں وہ پتی ہی ترتیب دینگے، اور جن کے سپرد پھل بنانے کی خدمت ہے وہ سوائے پھل کے کچھ نہ بنا سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو ایک ہی قسم کا ماحول حصول غذا کے لیے نہیں ملتا۔ لیکن باوجود اسکے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے، یعنی پھل کی جگہ نہ کونپل لگتی ہے اور نہ پتی کے بجائے پھول اور آخرکار یہ جراثیم تمام جسم میں، شرائین میں، اعصاب میں، عضلات میں، الغرض ہر جگہ اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر

ایک ہستی کا جزو ہو جاتے ہیں کہ سُوئی کی نوک کے ہزارویں حصّہ کے برابر بھی جسم کا کوئی حصّہ اُن سے خالی نہیں ہے۔

یہ صحیح ہو کہ یہ تمام جراثیم چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہو کہ سب سے پہلا زندہ جرثومہ جو ان جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا ہو؟ اس میں زندگی کس چیز نے بخشی۔ اور پھر اُس سے مختلف خواص و کیفیات رکھنے والے لاکھوں کروروں سے بھی زیادہ، قابل شمار جراثیم کیونکر پیدا ہوئے۔ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب آج تک کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا۔ اور یہی وہ عجز ہے جو کسی قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے کی طرف ایک شخص کی رہبری کرتا ہو۔

آپ کسی کارخانہ میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے دیو پیکر آہنی پہیے ہر وقت گردش میں ہیں۔ بہت سے آلات اِدھر اُدھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ایک منظم طریقہ سے مشین کے تمام پُرزے اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کیلئے بھی یہ خیال کسی کو پیدا ہو سکتا ہو کہ یہ تمام حرکت و جنبش، یہ تمام نظم و عمل از خود پایا جاتا ہو۔ یقیناً عقل انسانی اس کا سبب دریافت کریگی۔ اور جب اسکو معلوم ہو جائیگا کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ و پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائیگا۔ پھر جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اس کی حرکت و عمل بغیر کسی موجد و محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بیشمار مظاہر و آثار، موجودات کی کروروں صورتیں کس طرح از خود ظہور میں آ سکتی ہیں۔

خیر اس مشین کی مثال کو چھوڑیئے کہ یہ ایک نہایت ہی فرسودہ طریق استدلال ہو۔ آپ اُن چھوٹے چھوٹے جاندار کیڑوں کو لیجئے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور جو اس حد تک غیر مرئی ہیں کہ اگر ہزار اندر ہزار ان جمع کیا جائے تو بھی سرسوں کے دانہ سے زیادہ اُن کا حجم نہیں ہوتا۔ یا دریا کی کائی کو لیجئے جو خوردبین سے دیکھے جانے کے بعد ایک مستقل جنگل درختوں کا نظر آتی ہے۔ پھر لطف یہ ہو کہ یہ تمام خوردبینی کیڑے اور نباتات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ بڑھتے ہیں فنا ہوتے ہیں، جیسے اور تمام ذی حیات مخلوق، اور علم انسانی آج تک نہ اُن کی حقیقت آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ اس امر پر قادر ہوا کہ ان تمام حقیر مخلوقات میں سے کسی ایک ہی مخلوق کے کسی ایک عضو کو بنا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہو۔ برق و کہربا کے ذریعہ سے زمین کی طنابیں کھینچے ہوئے ہے۔ اپنی ایجادات و اختراعات سے اُسنے انسانی زندگی کے اصول کو بالکل بدل دیا ہے۔ لیکن با اینہمہ تم دنیا کے ماہرین کیمیا و حیاتیات و فضلائے تشریح کو جمع کر کے دریافت کرو کہ کیا وہ مچھر کی ایک آنکھ کی طرح کوئی آنکھ بنا سکتے ہیں مکھی کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح کوئی عضو بنا کر دکھا سکتے ہیں؟ تو وہ اسپر قادر نہ ہوں گے اور آخر کار ان سب آسمان و زمین کے قلابے ملا دینے والوں کو اعتراف کرنا پڑیگا کہ یہ اُن کے امکان سے باہر ہے۔

یہی انسان کا اعتراف عجز، یہی اس کی عقل و فراست کی حیرانی، اور یہی اس کی بیچارگی و بےبسی ہے جہاں سے وجود باری کے وجوب کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ اور آخر کار بقول رازی انسان کو کہہ دینا پڑتا ہو کہ اس کے پہچاننے کے لیے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہو نہ کسی حجت و برہان کی۔ کیونکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تکوین اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہو اور اسی کو ایک شاعر نے "ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار" کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک مراد یہ بھی قابل غور ہے یعنی یہ کہ کیا خدا آفرینش کے اس سلسلہ کو قائم کرکے علیحدہ ہوگیا ہے اور اب اسے دنیا کے نظام سے کوئی تعلق باقی نہیں ۔ یا یہ بھی کا خیال ہی ہے۔ آئیے اس مسئلہ پر بھی ایک نگاہِ جستجو ڈال لیں۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ تمام زندہ اجسام، شفاف و نیم سیال جراثیم سے بنے ہیں اور ان جراثیم کی ترکیب تمام حیوانات و نباتات میں ایک ہی ہے۔ اچھا اب دیکھئے کہ ان جراثیم کی ترکیب کیمیاوی کیا ہے؟

یہ علم غالباً اکثر حضرات کو ہوگا کہ جراثیم چار عناصر بسیط سے مرکب ہیں:۔ آکسیجن، ہیڈروجن، نیٹروجن اور کاربن۔

کاربن ایک زہریلی گیس ہے۔ آکسیجن ایک گیس ہے جو اجسام کو مشتعل کر دیتی ہے، اسی طرح ہیڈروجن ایک شفاف گیس ہے جو آکسیجن سے ہلکی ہوتی ہے۔ اور نائٹروجن بھی۔ لیکن ان کے باہم امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے ہر طالب علم کو معلوم ہوں گے۔ کہ جب آکسیجن اور ہیڈروجن دونوں گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ سمندر، دریا، نہر اور بادل وغیرہ میں ہر جگہ پانی کا وجود انھیں دونوں گیسوں کے امتزاج سے ہے۔ نائٹروجن اور آکسیجن جب دونوں ملیں گے تو تیزاب پیدا ہوگا۔ آکسیجن و کاربن جب ملیں گے تو ایک زہریلی گیس پیدا کریں گے، اور ہیڈروجن و کاربن ناقابل اشتعال گیس کی صورت اختیار کرلیں گے۔ اور اگر یہ چاروں مل جائیں تو ظاہر ہے کہ انھیں مذکورہ بالا مرکبات میں سے کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہوگی۔ اور یہ مخفی نہیں کہ ان میں سے کوئی صورت حیات کے لیے مفید نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان عناصر بسیط کو مرکب کرکے جراثیم کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس اہلیت کے ساتھ کہ نباتات پیدا کرنے والے جراثیم نباتات ہی پیدا کریں گے۔ حیوانات کے جراثیم حیوانات ہی بنائیں گے۔ کبھی ایسا نہ ہوگا کہ پھول کے جراثیم کسی طائر کی ساخت میں مصروف ہو جائیں۔ اور طائر کے جراثیم کسی انسان کی ترکیب میں۔

اگر یہ نظم و اہتمام جسے صرف نگہداشت ہی کہنا چاہیئے شامل حال نہ رہے تو آکسیجن ہمارے جسموں کو جلا ڈالے۔ ہیڈروجن سے مل کر تمام دنیا کو عالم آب بنا دے۔ نائٹروجن کے ساتھ ترکیب پاکر ہمارے اوپر تیزاب کا سا کام کرنے لگے۔ گوشت بنانے والے جراثیم صرف خون بنانے لگیں اور ہم ایک رقیق چیز کی طرح ادھر سے ادھر بہتے پھریں۔ اس طرح ایک کاشتکار گیہوں بوئے اور مینڈک اگنے لگیں۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھائیں اور ان سے سانپ پیدا ہونے لگیں۔ الغرض تمام نظم عالم درہم برہم ہو جائے۔

اگر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا فطرت انسانی سے متعلق ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر استدلال ہی ضروری ہے تو شواہد طبیعت اور مظاہر کائنات سے زیادہ کوئی برہان مقصود تک پہونچانے والا نہیں

شبستاں کا قطرۂ گوہریں

اس افسانہ کا سلسلہ نومبر ۱۹۳۲ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کی دو قسطیں نومبر و دسمبر ۱۹۳۲ء کے پرچوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس لیے جن حضرات کی خریداری جنوری سے شروع ہوتی ہے، وہ دفتر سے نومبر و دسمبر کے نگار طلب کریں۔ اس طرح اُن کی خریداری بجائے جنوری کے نومبر ۱۹۳۲ء سے محسوب ہوگی۔

پھولوں سے لدی ہوئی مسہری پر ملکۂ ناہید منہ پر ہلکی نقاب ڈالے ہوئے پڑی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے۔ خاموش ہے۔ خوابگاہ میں سوائے اُس نوبہار کنیز کے جو پائیں میں بیٹھی ہوئی ملکہ کا منہ تک رہی ہے اور کوئی موجود نہیں۔ دفعتہً ملکہ ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بولی: "نوبہار کیا سوچ رہی ہے، اور کیا دیکھ رہی ہے؟"

— "کچھ نہیں ملکۂ عالم۔ یہ دیکھ رہی ہوں کہ مسہری کے پھولوں میں ایک گلاب کا پھول کیسا پیارا، کیسا شگفتہ اور کس قدر حسین ہے!"

ملکہ نے چہرے سے نقاب ہٹا کر پوچھا "کہاں ہے؟"

— "یوں نہیں ملکۂ عالم۔ آپ پھر نقاب چہرہ پر ڈال لیجئے، تو بتاؤں کہ وہ کہاں ہے"

ملکہ نقاب سے چہرہ چھپاتے ہوئے — "ہاں بتا کہاں ہے"

نوبہار — "مسہری کے اُس کنارے پر میری دسترس سے دور ایک گلاب کا پھول ہے اور نقاب کے اندر ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی نے آنچل میں اسے باندھ لیا ہو"

ملکہ — "شریر۔ میں سمجھی — اچھا اور کیا سوچ رہی تھی۔"

نوبہار — "اور یہ سوچ رہی ہوں کہ سنسان جنگل کی جھاڑیوں میں جب صبح کو کلیاں کھلتی ہیں، شبنم کے قطرے پھولوں کی پنکھڑیوں پر جھلکتے ہیں تو وہاں اُن کا دیکھنے والا کون ہوتا ہے۔ اور قدرت کا حسن کی اس رائیگاں آرائش سے کیا مدعا ہے۔"

ملکہ — "بیوقوف — اچھا اور کچھ؟"

نوبہار — "اور ہاں یہ سوچ رہی ہوں کہ آج کی رات بھی ملکۂ عالم مجھے یہیں پائیں میں سونے کا حکم دیں گی، اور پھر میں اس ڈر سے ساری رات جاگتی رہوں گی کہ کہیں میرے لب ملکہ کے تلوؤں سے نہ چھو جائیں۔"

ملکہ — "نہیں، آج میں بجائے پائیں کے تجھے اپنے پہلو میں جگہ دوں گی اور رات بھر تجھ سے باتیں کروں گی۔ جب تو میرے پاس رہتی ہے میں ایسا لطف محسوس کرتی ہوں جیسے برفباری کے وقت شعلہ کی گرمی، اور جب تو نہیں ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا ہے۔ آ، ادھر آ، میرے پہلو میں میرے جسم سے اپنے جسم کو لگا کر لیٹ جا"

نوبہار ـــــ "ملکۂ عالم میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ میں کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ جو ملکہ کے قدموں تک پہونچنے کے خیال سے کانپنے لگے اس کا کیا حال ہوگا۔ اگر اس کا جسم ملکہ کے جسم سے مس ہو جائے ــ"

یہ سنکر ملکہ دفعتہً اُٹھ بیٹھی اور بولی کہ "نوبہار نہیں آج میں نہ مانونگی۔ تیرا کوئی عذر نہ سنونگی۔ میں نے تجھے کنیزوں کے حلقہ سے نکالکر مشیران خصوصی کے زمرہ میں اسی لیے شامل کیا ہے کہ تیرے دل سے کنیز ہونے کا بار ہلکا ہو جائے، اور تو ایک معزز خاتون کی حیثیت سے میری جلوت و خلوت میں میرے جسم و روح دونوں کی شریک ہو سکے۔ لیکن تیری تہذیب تو میرے لیے ایک عذاب ہو کر رہگئی ہے۔ ایک آہنی دیوار ہے جو مجھے تجھ سے ملنے ہی نہیں دیتی"

نوبہار ـــــ "ملکۂ عالم کی ان شاہانہ عنایات کا شکریہ ادا کرنا حقیقتاً میرے امکان سے باہر ہے۔ اور میں واقف ہوں کہ ملکہ نے میرے مرتبہ کو استحقاق سے بہت زیادہ بلند کرکے کس طرح ایک ذرہ کو دفعتہً آفتاب بنا دیا۔ لیکن باوجود اس کے جب ملکہ مجھے اپنے نرم و نازک جسم چھونے کا حکم دیتی ہے تو میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ میرا دل۔ میری روح اور میرے جسم کا تمام خون اس سر انگشت کو توڑکر باہر نکل جانا چاہتا ہے جسے ملکہ کے معطر جسم کے چھونے کا فخر حاصل ہونے والا ہے۔ اس وقت میرے اعصاب میرے ہاتھ کی رگیں اور میری قوت گرفت سب میرے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ اور اس ہیجان کو ضبط کرتے وقت میری وہی حالت ہوتی ہے جیسے دفعتہً کسی کی گردن پر چھری پھیر دی جائے اور ایک بھیانک آواز کے ساتھ خون کا فوارہ اس کے حلقوم سے بلند ہو۔ ملکۂ عالم میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہے، لیکن اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں کہ ملکہ کے حضور میں، میں اپنی نسائیت بالکل کھو دیتی ہوں اور میں اپنے اندر کچھ ایسے مردانہ جذبات پیدا ہوتے دیکھتی ہوں جن کے اظہار کی مجھ میں جرأت نہیں۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔

ملکہ ـــــ "مردانہ جذبات! میں نہیں سمجھی۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ ایک عورت میں مردانہ جذبات! صاف صاف کہہ یہ مردانہ جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ میں سننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کیفیت ہے جو صرف مردوں سے مخصوص سمجھی جاتی ہے، لیکن ہاں تو نے ایک عورت ہو کر یہ کیسے معلوم کیا کہ وہ جذبات مردانہ ہیں؟ مردانہ، مردانہ!! اُف کس قدر مکروہ، کیسا قابل نفرت لفظ ہے۔ (چیں بجبیں ہو کر) اے نوبہار، یہ تو نے کیا کہا، میری خلوت میں یہ کس نامبارک چیز کا ذکر کیا۔ (نوبہار کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھ میں پکڑ کر) بتا، جلد بتا، وہ کیا کیفیت ہے جسے تو اس نابکار جنس سے منسوب کرتی ہے، میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(ملکہ کے ہاتھوں کی گرفت دفعتہً ڈھیلی پڑ جاتی ہے، لہجہ کی خشونت نرمی میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور کچھ خوفزدہ سی ہو کر، پھر مسہری پر منہ ڈھک کر پڑ جاتی ہے۔ پندرہ منٹ تک دونوں جانب سکوت طاری رہتا ہے۔ اور پھر ملکہ نوبہار کو مخاطب کرکے کہتی ہے)

"نہیں، میں نہیں سننا چاہتی، اپنے سوال کا جواب تجھ سے نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ واقعی تیرے جسم میں وہ خون نہیں ہے، جو عام عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ میں خود تیرے جسم کو چھو کر کپکپی سی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ ایک خاص قسم کی گرم رو میرے جلد کے اندر سے ہو کر قلب تک دوڑنے لگتی ہے۔ خیر ہو گا۔ اب تو مجھے کوئی کہانی سنا، لیکن اس زمانہ کی نہیں، بلکہ اس قدیم عہد کی جب ایک بادشاہ اپنے شہزادہ کو وزیر زادہ کی معیت میں شکار کی اجازت دیتے ہوئے نصیحت کیا کرتا تھا کہ فلاں جنگل میں پہونچکر

داہنے ہاتھ کا راستہ مت اختیار کرنا۔ لیکن وہ نہیں مانتا تھا، اور جب آگے بڑھ کر دریا میں اسے لعل بہتے ہوئے ملتے تھے تو وہ ان کا پتہ چلاتے ہوئے کسی باغ میں پہونچتا تھا۔ جہاں ہر شخص پتھر کا ہوتا تھا۔ اور پھر وہ محل کے اندر پہونچکر کسی شاہزادی کا کٹا ہوا سر چھت سے معلق پاتا تھا جس خون کے قطرے نیچے پانی میں ٹپک ٹپک کر لعل بنجاتے تھے۔ اور بہہ بہہ کر دریا میں چلے جاتے تھے۔

نوبہار ——— "لیکن ملکۂ عالم ان کہانیوں میں ایک بڑی خرابی ہے اور وہ یہ کہ ہمیشہ شاہزادہ دیو سے جنگ کر کے اس شاہزادی کو آزادی دلاتا تھا اور پھر اس سے شادی کر کے خوش و خرم اپنے گھر واپس آتا تھا۔"

ملکہ ——— "ہاں، یہ تو ہے۔ میں اس وقت بھی جب بہت چھوٹی تھی اور میری دایہ اس قسم کی کہانیاں سنایا کرتی تھی تو میں اس سے کہا کرتی تھی کہ نہیں ان کہانیوں کا آخری حصہ جھوٹ ہے۔ شاہزادی نے کبھی اس سے شادی نہ کی ہوگی۔ بلکہ صاف جواب دیدیا ہوگا یہ کہانیاں مردوں کی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ کیا شکار کے لیے باہر نکل کر کبھی کوئی شاہزادی داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار نہ کر سکتی تھی کہ وہ کسی شاہزادہ کو مصیبت سے نجات دلائے اور پھر جب وہ شادی کی درخواست کرے تو یہ برہم ہو کر چلی آئے۔ اچھا اسے جانے دو، کوئی اور کہانی سہی۔"

نوبہار ——— "اجازت ہو تو میں خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں، لیکن اس میں بھی مرد کا ذکر ضرور آئیگا، کیونکہ دنیا کی کوئی بات اس وقت تک مکمل ہوتی ہی نہیں جب تک مرد عورت دونوں نے ملکر اس کو واقعہ نہ بنایا ہو۔"

ملکہ ——— "اگر کوئی ایسا واقعہ تیری زندگی کا ہے تو سنا۔ میں اسے سنونگی، لیکن اگر مجھے اس درمیان میں نیند آجائے تو تو چلی نہ جانا یہیں سو رہنا۔"

نوبہار ——— "ملکۂ عالم، اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی ہے، اب سے ۵ سال قبل کی بات ہے کہ میرے محلہ میں ایک نووارد شخص آکر رہا، اسکی عمر بھی تقریباً وہی تھی جو میری۔ یہ اپنے پیشہ کے لحاظ سے ایک نقاش تھا۔ لیکن اپنی صورت کے اعتبار سے وہ خود قدرت کا ایک بہترین نقش تھا۔ ہمارا قصبہ چونکہ مناظر فطرت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اسلیے وہ وہاں کے نقوش لینے آیا تھا اور کم از کم چھ ماہ اسے ٹھہرنا تھا۔ چونکہ میرے والدین کو بھی اس فن سے خاص لگاؤ تھا، اس لیے آپس میں بہت جلد مراسم پیدا ہوگئے اور اس کی آمد و رفت شروع ہوگئی

وہ بات بہت کم کرتا تھا۔ لیکن جو بات کرتا تھا ایک شاعر کی طرح اس کے دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تو اسکی آنکھیں مجھے ایسی نظر آتیں جیسے کوئی عمیق سمندر ہے جس کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔"

ملکہ۔ "بات کاٹ کر، بالکل صحیح یہی کیفیت تیری نگاہوں کے سامنے میری ہوجاتی ہے۔ لیکن مجھے اس وقت تک یہ الفاظ اس کیفیت کے ظاہر کرنے کے لیے نہ ملے تھے، میں زیادہ سے زیادہ "شعلہ کی گرمی سے شمع کا پگھلنا" کہہ سکتی تھی۔ اچھا پھر کیا ہوا؟"

نوبہار ——— "دن گزرتے گئے۔ معلوم نہیں کتنی شامیں ہم نے اس ساتھ ہنس کھیل ... کر اسی طرح گزار دیں۔ ایک صبح وہ میرے مکان پر آیا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرد لیکن بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ میرے والدین کسی تقریب سے دوسری جگہ گئے ہوئے تھے۔ میں گھر پر

تنہا تھی۔ اُس نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ اور ایک ایسی نگاہ سے جس میں حزن وملال کے ساتھ خاص قسم کا جذباتی جوش بھی پنہاں تھا۔۔۔"

ملکہ ۔۔ "یہ جذباتی جوش کیا چیز ہوتی ہے"

نوبہار ۔۔ "ملکۂ عالم بس اب آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے کس کیفیت کا اظہار ان الفاظ سے کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس کی نگاہوں میں کوئی ایسی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہو، کوئی پیام پہونچانا چاہتا ہو۔ اگر بغیر الفاظ کی مدد کے کوئی گفتگو ہوسکتی ہے تو اسکی نگاہیں بھی گفتگو کررہی تھیں اور اگر بغیر سامعہ کی مدد کے کوئی بات سنی جاسکتی ہے تو ملکۂ عالم کو باور کرنا چاہیے کہ میں وہ بات سن رہی تھی۔

ملکہ ۔۔ "وہ کیا بات تھی؟

نوبہار ۔۔ "کیا عرض کروں وہ کیا بات تھی۔ بات کیا تھی ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی۔ خون میں سرعت دوران کی، روح میں بالیدگی کی اور احساس میں اُس شگفتگی کی جو صبح کو نسیم کے چھو جانے کے بعد کلی میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُس کی ہر نگاہ مجھ پر وہ اثر کر رہی تھی جو شعاع آفتاب کسی پارۂ یخ پر کرسکتی ہے۔ اس نے دیر تک مجھے دیکھتے رہنے کے بعد کہا کہ "۔۔ کل میں رخصت ہونے آیا ہوں "۔۔ میں جو کبھی اس کے سامنے آزادی سے بات نہ کرسکتی تھی۔ یہ سنکر دفعۃً گھبرا گئی اور بولی "۔۔ ابھی سے" وہ یہ سنکر مسکرایا اور میں شرما گئی۔

وہ دیر تک خاموشی سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ میں ایسا محسوس کررہی تھی جیسے کوئی ساحل پر بے خبر کھڑا ہو۔ اور دفعۃً سیلاب آکر اس کو بہا لیجائے۔ اُس نے مجھ سے قریب آکر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیلئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اعضا کی جان کسی نے نکال لی ہے"

ملکہ یہ سنتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ نوبہار کے ہاتھ میں دیکر بولی "سچ بتا، یہ تو اپنا حال بیان کر رہی ہے یا میرا!

نوبہار ۔۔ "ملکۂ عالم جو کیفیتیں مجھ پر گزری ہیں۔ وہی عرض کر رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کے ساتھ میں کسی دوسرے کا حال کیونکر بیان کرسکتی ہوں"

ملکہ ۔۔ "نوبہار، یقین کر۔ . . . . . "اگر میں کچھ کہہ سکتی، تو زیادہ سے زیادہ یہی کہتی جو تو کہہ رہی ہے۔ آہ تو نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تو نے کبھی شراب پی ہے؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ شراب پینے کے بعد جب رات کو دفعۃً خمار کے عالم میں آنکھ کھل جاتی تو تشنگی کا کیا عالم ہوتا ہے اور اس وقت سرد پانی کا ایک ایک گھونٹ کس قدر لطف دیتا ہے۔ باور کر کہ تیری طرف سے میری تشنگی کی کیفیت بالکل یہی ہے اور جب تو میرے پاس نہیں ہوتی تو میرا حال وہی ہوتا ہے جو پانی سے دور رہنے والے مستسقی کا۔

نوبہار ۔۔ "یہ ملکہ کی عنایت ہے، شاہانہ التفات ہے جسپر میری خوش بختی جس قدر ناز کرے کم ہے لیکن اے میری معبودۂ قلب وروح۔ یہ مہربانیاں جس قدر بڑھتی جارہی ہیں میرا خون اسی قدر خشک ہوتا جاتا ہے کہ اگر مبادا کسی وقت ملکہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ الطاف وعنایات بالکل رائیگاں صرف کیئے گئے اور اس ہستی کو مورد کرم بنایا گیا جو اسکی اہل نہ تھی تو پھر میرا کیا انجام ہوگا۔ اور ملکہ کی برہمی کا کیا عالم"

ملکہ — "اے نوبہار، جس وقت تک تو میرے پاس نہ تھی، میں سمجھتی تھی کہ زندگی نام ہے صرف ریگزار کی سی وحشت کا۔ بے آب و گیاہ سرزمین کی سی خشکی کا۔ لیکن تیرے آتے ہی میں دیکھتی ہوں کہ اس ریگستان سے بہت سے چشمے پھوٹ نکلے ہیں۔ جو میری زندگی کے صحرا، میری ہستی کے ویرانہ کو دعوتِ بہار دے رہے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا چیز ہے جو مجھے تیری طرف اس قدر کھینچ رہی ہے، تجھ میں وہ کونسی بات ہے جو میرے دل میں خاص قسم کا گریہ آمیز گداز پیدا کرتی ہے، جب تو پاس نہیں ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندر ہی اندر میرے دل کو مسوس رہا ہے، بھینچ رہا ہے۔ اینٹھ رہا ہے اور اس وقت جو سانس میرے سینہ سے نکلتی ہے وہ غیر معمولی طویل اور عجیب قسم کی سردی لیے ہوتی ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتی ہوں کہ اگر واقعی محبت بھی کسی ایسی مجبور کن کیفیت کا نام ہے تو دنیا میں کسی محبت کرنے والے کا جان دیدینا بالکل قرینِ عقل ہے اور اسکو سزا نا انصاف سے دور۔"

نوبہار — "ملکۂ عالم، کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ کل مرزا شاہرخ کے کاغذات پر کیا فرمانِ شاہی نافذ ہوا۔"

ملکہ مسکرائی اور پھر سنجیدگی کے ساتھ بولی "اس میں شک نہیں کہ شاہرخ کا نیلوفر کے ساتھ یوں مخفی طور شادی کر لینا، میرے ذاتی جذبات کی بنا پر نہایت سنگین جرم ہے۔ اور نیلوفر کے والدین کی برہمی بالکل حق بجانب ہے، لیکن جو مرافعہ شاہرخ اور نیلوفر کی طرف سے پیش ہوا ہے، وہ ہرچند اس سے قبل مجھ سے کوئی رحم نہ حاصل کر سکتا تھا۔ اور اب بھی شاید زیادہ کامیاب نہ ہو لیکن کم از کم مجھے یہ خیال ضرور پیدا ہو چلا ہے کہ انسان واقعی بسا اوقات مجبور ہو جاتا ہے اور مجبور کی معصیت ایک حد تک ضرور قابلِ غور ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ تجھے میں وہ کاغذات دکھاؤنگی، لیکن بھول گئی۔ کل میں نے شاہرخ اور نیلوفر دونوں کی حاضری کا حکم دیا ہے۔ اور تیرے ہی سامنے میں اس معاملہ کا فیصلہ کروں گی۔"

نوبہار — "کیا ملکۂ عالم، مجھے بتائیں گی کہ نیلوفر کے والدین نے بارگاہِ ہمایوں میں کیا فریاد پیش کی ہے؟"

ملکہ — "یہی کہ بغیر ان کی رضامندی کے شاہرخ نے نیلوفر کو اپنی طرف مائل کر کے شادی کر لی۔"

نوبہار — "تو کیا سرزمینِ شبنمستان میں یہ کوئی جرم ہے؟"

ملکہ — "یقیناً سخت جرم ہے اور اس کی سزا مرد کے لئے قصاص ہے اور عورت کے لئے ہمیشہ کے لئے مجرد رہنے کا عہد و پیمان۔"

نوبہار — "تو کیا واقعی ملکہ، شاہرخ کے قتل کا حکم دیدینگی اور کیا نیلوفر، نوجوان نیلوفر، ایک راہبۂ معبد کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جائے گی؟"

ملکہ — "انصاف اور قانون کا منشا تو یہی ہے؟"

نوبہار — "کیا یہ قانون ملکِ شبنمستان کا دیرینہ قانون ہے؟"

ملکہ — "نہیں، یہ صرف میں نے اپنے عہد میں نافذ کیا ہے۔"

نوبہار — "تو کیا ملکہ ایسے قانون کو منسوخ نہیں فرما سکتیں؟"

ملکہ ——"لیکن منسوخی کا سبب"

نوبہار نے غور سے ملکہ کو دیکھا۔ اور پھر اپنا ہاتھ ملکہ کے ہونٹوں تک لیجا کر ان کو ایک نہایت نرم جنبش سے مل کر کہا "آہ ان خوبصورت ہونٹوں سے یہ کریہہ الفاظ، ان نرم و نازک لبوں سے ایسی کرخت و درشت باتیں۔ ان گلاب کی پنکھڑیوں سے یہ نکہت تلخ و ناگوار"

نوبہار کے ہاتھ کا ملکہ کے ہونٹوں سے مس ہونا تھا کہ وہ بیتاب ہوگئی۔ اور بالکل بے اختیارانہ نوبہار کو اپنی آغوش میں کھینچکر اس کے لبوں کا ایک طویل اور گرم بوسہ لیا اور اسطرح بے قابو ہو کر گر پڑی جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو

(باقی) **نیاز**

عتبارات

ایک رات قصر امارت میں جشن طرب برپا تھا اور لوگ مکلف لباسوں میں آ جا رہے تھے، دفعتہً انھیں آنے والوں کے ساتھ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اور امیر کو پورے احترام و وقار کے ساتھ آداب بجالا کر کھڑا ہو گیا۔

امیر اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اس کی آنکھ پھوٹی ہوئی تھی اور اس سے خون جاری تھا۔

امیر نے پوچھا۔ "یہ تجھے کیا ہوا"

اس نے جواب دیا۔ "اے امیر، میں چور ہوں۔ آج رات کی تاریکی میں حسب معمول میں چوری کرنے کے لئے نکلا اور ایک صراف کے مکان میں داخل ہونے کے لئے دیوار پر چڑھا۔ لیکن غلطی سے بجائے صراف کے گھر کے ایک جلاہے کے مکان میں پہونچ گیا۔ جب مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی تو میں نے وہاں سے بھاگنا چاہا۔ رات تاریک تھی اور کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ ناگہاں جلاہے کی نال کپڑا بننے کی میری آنکھ میں لگی اور مجھے اندھا کر گئی۔ اس لئے میں فریاد لیکر آیا ہوں کہ انصاف فرمایا جائے"۔ امیر نے جلاہے کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اس کی آنکھ نکال لیجائے۔ جلاہے نے عرض کی کہ "اے امیر فیصلہ بالکل درست ہے، اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ میری آنکھ بھی پھوڑ دی جائے، لیکن مجھے اپنے پیشہ کے لحاظ سے دونوں آنکھوں کی ضرورت ہے کیونکہ تھان کے دونوں کناروں کو مجھے ہر لمحہ دیکھنا پڑتا ہے، البتہ میرا ایک پڑوسی جوتہ بنانے والا ہے جو دو آنکھیں رکھتا ہے، حالانکہ اس کو اپنے پیشہ کے لحاظ سے صرف ایک آنکھ کی ضرورت ہے، اگر بجائے میرے اسکی ایک آنکھ نکلوا لیجائے تو بعید از انصاف نہ ہوگا۔

امیر نے اسی وقت جوتا بنانے والے کو بلایا۔ اسکی ایک آنکھ نکلوالی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ایک دانشمند کتا کسی دن بلیوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرا اور علیحدہ چھپ کر دیکھنے لگا کہ یہ کیا کر رہی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک بلی ان میں سے کھڑی ہوئی اور سب کو مخاطب کر کے بولی کہ "اے بہنو، خوب جی لگا کر عبادت کرو، اور میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ اگر تم نے پورے جوش اور انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی تو ابھی ابھی آسمان سے بجائے پانی کے چوہے برسنے لگیں گے"۔

کتا یہ وعظ و نصیحت سنکر دل ہی دل میں خوب ہنسا اور یہ کہتا ہوا واپس آیا کہ "یہ بلیاں بھی کس قدر بیوقوف و احمق ہوتی ہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ کتاب مقدس میں صاف لکھا ہے کہ جب بہت گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی ہیں

تو آسمان سے چوہے نہیں بلکہ ہڈیاں برستی ہیں"

تین چیونٹیاں ایک آدمی کی ناک پر چڑھ گئیں جو دھوپ میں پڑا ہوا سو رہا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔ ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک بولی۔ "آج جس نشیب و فراز کو مجھے طے کرنا پڑا ہے، یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ سارا دن ختم ہو گیا کہ اس دانہ کے طول و عرض کو دریافت کروں لیکن کامیابی نہیں ہوئی"

دوسری بولی۔ "میں عرصہ سے اپنے قبیلہ والوں سے سُن رہی تھی کہ ٹیڑیوں کے رہنے کی سرزمین بہت پیچ در پیچ ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ آج میں اتفاق سے وہیں پہونچ گئی ہوں"

تیسری نے اپنا سر اٹھایا اور بولی کہ۔ "اے بہنو، آج ہم ایک بہت بڑی لامتناہی چیونٹی کی ناک پر کھڑے ہوئے ہیں اس چیونٹی کا جسم تو اتنا بڑا ہے کہ ہماری نگاہیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اس کا سایہ اتنا وسیع ہے کہ ہم اس کی پیمائش نہیں کر سکتے۔ یہی وہ ازلی و ابدی چیونٹی ہے۔ جس کے حدود کا معلوم کرنا۔ ہمارے امکان سے باہر ہے"

جس وقت تیسری چیونٹی نے اپنا خطبہ ختم کیا تو ہر ایک نے دوسرے کو دیکھا اور آپس میں ہنسنے لگیں اتنے میں آدمی نے چونک کر ہاتھ سے اپنی ناک مل دی۔ اور تینوں چیونٹیاں وہیں پس کر رہ گئیں

میں نے کل شام ایک عورت کو ہیکل کے زینوں پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ اُس کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ ایک اُس کے داہنی طرف بیٹھا تھا، دوسرا بائیں جانب۔ اور دونوں اس عورت کو دیکھ رہے تھے

میں نے نہایت تعجب سے دیکھا کہ اس عورت کا داہنا رخسار خشک و پژمردہ تھا اور بایاں شاداب و شگفتہ

میں نے شاہراہ پر کسی مکان کے سایہ میں ایک نابینا کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میرے رفیق نے کہا کہ

"یہ شخص ہماری قوم میں بڑا دانا انسان ہے"

میں نے اس کو سلام کیا اور دریافت کیا۔ "جناب آپ کی بینائی کب سے نہیں ہے"

اُس نے جواب دیا کہ "میں نابینا پیدا ہی ہوا تھا" میں نے پوچھا کہ "مذاہب حکمیہ میں کس مذہب کے آپ پیرو ہیں" جواب ملا کہ "میں منجم ہوں ستارہ شناس ہوں۔ اور پھر اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ

"میں ان آفتابوں، ان چاندوں اور ان ستاروں کی رصد کیا کرتا ہوں"

باب الاستفسار

کشمیر

(جناب مرتضیٰ علی صاحب)

اس وقت کشمیر کا مسئلہ ہر شخص کی زبان پر ہے، غالباً بے محل نہ ہوگا اگر آپ نگار میں اس سرزمین کے تاریخی حالات مختصراً قلمبند کر دیں۔

(نگار) کشمیر نام ایک وسیع وادی کا ہے جو ہمالیہ کے شمالی مغربی حصہ میں واقع ہے۔ اس کا طول تقریباً ۸۴ میل اور عرض ۲۰ اور ۲۵ میل کے مابین ہے۔ اس کا رقبہ ۱۹۰۰ مربع میل ہے۔ اور اس کی سطح تقریباً ۶۰۰۰ فٹ سطح آب سے بلند ہے۔

کشمیر کے بالکل ابتدائی حالات نامعلوم ہیں، اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار سال کی تاریخ کا علم اس وقت تک حاصل ہو سکا ہے۔ قدیم ترین ذریعہ معلومات، کلہان کی منظوم تاریخ۔ راج ترنگنی ہے، جو اب بالکل نایاب ہے اور جسے اسٹین نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ علاوہ اس کے چینی سیاح ہیوانگ چوانگ کا سیاحت نامہ، تاریخ البیرونی، آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ برنیر سے بھی یہاں کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ سکوں کا جو ذخیرہ ہے ان سے بھی سلسلہ وار ہندو، مسلمان، مغل، درانی اور سکھ فرمانرواؤں کے حالات کا کچھ نہ کچھ پتہ چلتا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات تاریخ کشمیر میں یہ نظر آتی ہے کہ بڑے بڑے فاتحین میں سے کسی نے اس حصۂ زمین پر قبضہ نہیں کیا، سکندر اعظم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ محمود غزنوی اس پر قابض نہ ہوا۔ چنگیز خاں، تیمور، اور بابر بھی یونہی اس سے گزر کر چلے گئے۔ البتہ جب اکبر نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کیا تو اس سلسلہ میں کشمیر بھی آ گیا۔ اسی طرح نادرشاہ نے بھی اس وادی کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ احمد شاہ درانی اور اس خاندان کے دوسرے فرمانرواؤں نے البتہ یہاں مستقل حکومت قائم کر لی تھی، جسے آخر آخر سکھوں نے ختم کر دیا۔

افلاطون سے قبل یہاں کے عہد عتیق کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ کیونکہ سکندر اعظم کے مورخین نے اس کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ افلاطون نے البتہ ظاہر کیا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں یہاں ایک قومی حکومت قائم کی تھی، جو شمالی ہند کی سلطنت خاندان کُشن کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اس نے اس حصۂ زمین کا نام کسپیریا بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ دریائے ہداسپیس (یعنی جہلم)، سنداپس (دریائے چناب)، اور رایدوتی (دریائے راوی) کے منبع سے نیچے واقع ہے۔

اس سے قبل کا کوئی حال صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن یقین کرنے کے اسباب موجود ہیں کہ مسیح سے ۲۵۰ سال قبل کشمیر سلطنت اشوکا کے زیر اثر تھا۔

شہنشاہ اشوک کے زمانہ میں ۲۴۵ ق م کے قریب بدھ مذہب کے داعی کشمیر بھیجے گئے تھے، اور کشمیر اشوک کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ بارہ مولا کو جانے والے راستہ کے قریب ہی بمقام مانسہرہ اشوک کا ایک کتبہ پایا جاتا ہے۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ شہر سرینگر اشوک نے آباد کیا تھا۔ اگرچہ اس کا اصلی مقام "پرانا دھشتان" جو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے بعد کشانی خاندان کے راجاؤں ہوشک، جشک، اور کنشک نے سن عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں کشمیر پر حکومت کی۔ پانچویں اور دسویں صدی کے درمیان کشمیر میں ہندو مندر تعمیر ہوئے۔ چھٹی اور ساتویں صدیوں کے درمیان کشمیر میں چینی سیاح آئے۔ ان میں سے ایک چینی سیاح کشمیر کے راجہ کا مہاوت تھا۔ ہوان چوانگ کشمیر میں ۶۳۱ء سے ۶۳۳ء تک رہا۔ اس نے اس کا نام "کاسی میلو" تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد کی صدی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرمانروایان کشمیر کچھ عرصہ تک چین کے باجگذار رہے تھے۔

چھٹی صدی کے اوائل میں کشانی خاندان کی حکومت کا تختہ ہن قوم نے الٹ دیا۔

ساتویں صدی میں جب مشہور چینی سیاح ہوان چانگ کشمیر میں پہونچا تو اس وقت وہاں کا راجہ دُرلبھ تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہاں ایک سو بودھ مذہب کی خانقاہیں تھیں۔ آٹھویں صدی میں کشمیر سے چین کے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے چنانچہ ۷۱۳ء میں چین سے وہاں ایک سفارت بھی آئی تھی۔ ۷۲۰ء کے بعد سلطنت چین نے کشمیر کے راجہ کو باقاعدہ تسلیم کر لیا۔ چین کی سب سے آخری سفارت ۷۵۹ء میں کشمیر آئی۔ اس وقت وہاں کارکوٹک خاندان کی سلطنت تھی۔ ۷۱۳ء میں کشمیر پر عرب حملہ آوروں نے یورش کا ارادہ کیا۔ اسی وجہ سے وہاں کے راجہ نے شہنشاہ چین سے امداد طلب کی تھی اور وہاں سے سفارت آئی تھی۔ محمد بن قاسم یلغاریں کرتا ہوا دامن کوہ ہمالیہ تک جا پہونچا تھا مگر اس سے آگے نہ بڑھا

بلاذری نے لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے زمانہ میں ہشام بن عمر التغلبی امیر سندھ نے کشمیر اور ملتان فتح کر لیا۔ بعد ازاں کشتیوں کے ذریعہ سے نیچے اتر کر اس نے قندھار پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ اس واقعہ کی تصدیق یعقوبی نے بھی کی ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفتوحہ علاقہ وہ حصہ تھا جو وادی جہلم کے جانب مغرب واقع ہے۔ خاص کشمیر نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی مدیوں تک کشمیر میں ہندوؤں کی حکومت جاری رہی۔ ان ہندو راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور راجہ اونتی ورمن تھا جس نے اونتی پور آباد کیا تھا۔ اس راجہ نے ۸۵۵ء سے ۸۸۳ء تک حکومت کی تھی۔ ۱۰۱۳ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے شاہی خاندان کے آخری راجہ ترلوچن پال پر حملہ کیا تو راجہ مذکور کی مدد کشمیر نے بھی اپنی فوج بھیج کر کی تھی۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کشمیر کا راجہ ہرش (۱۰۸۹ء لغایتہ ۱۱۰۱ء) مسلمانوں کے زیر اثر آگیا۔ اس راجہ نے اپنی فوج میں ترک سپاہی بھرتی کئے۔ اور ہندوؤں اور بودھوں کے بت توڑ دیئے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلسل سازشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے ملک کی حالت خراب ہو رہی تھی اسی وجہ سے راجہ نے ترکی سپاہی بھرتی کیے تھے۔ ورنہ ہندو راجہ بت شکن کیونکر ہو سکتا ہے۔

۱۳۲۰ء میں تاتاریوں نے ذوالقدر خاں کے ماتحت کشمیر پر حملہ کیا اس کے بعد ۱۳۳۹ء شاہ میر سواتی افغانوں کی فوج لیکر چڑھ آیا۔ تخت و تاج چھین لیا اور خود شمس الاعظم کے نام سے سلطنت کرنے لگا۔ اس وقت سے کشمیر میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ مگر مسلمانوں نے نہایت بے تعصبی اور رواداری سے کام لیا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھ میں بڑے بڑے عہدے رکھے۔

سکندر شاہ کے زمانہ میں (۱۳۸۶ء لغایۃ ۱۴۱۳ء) معاملات بدل گئے۔ یہ بادشاہ سخت پابند مذہب اور متعصب تھا اس نے ہندوؤں کو ستایا اور ان کے مندر توڑ دئے۔ یہ بادشاہ "بت شکن" کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن سلطان زین العابدین کے زمانہ میں (۱۴۲۰ء لغایۃ ۱۴۶۶ء) حالت پھر بدلی۔ یہ بادشاہ ہر صورت سے نہایت اچھا تھا۔ ہندوؤں سے بے تعصبی اور رواداری برتتا تھا۔ اس کا عہد کشمیریوں میں بہترین عہد کہلاتا ہے۔ یہ بادشاہ نہایت عدل گستر اور رعایا پرور تھا۔ اس نے سڑکیں، نہریں اور پل بھی تعمیر کئے اس وقت تک کشمیر کے سکوں پر لفظ "سلطان" درج ہوتا تھا مگر اس کے بعد حسین شاہ محمد علی اور محمد یوسف نے اپنے سکوں پر لفظ "بادشاہ" لکھوایا۔

جب بابر شاہ نے شمالی ہند پر تسلط قائم کیا تو اس کی توجہ کشمیر کی طرف ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک مہم بھیجی جسے کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے مقابلہ سے فرار ہوا تو کاشغر کے فرماں روا خاندان کے ایک رکن حیدر مرزا نے ہمایوں کو ترغیب دی کہ وہ کشمیر پر حملہ کرکے قابض ہوجائے۔ مگر ہمایوں اس وقت ایسا نہ کرسکا۔ لیکن خود حیدر مرزا نے شمال کی جانب سے کشمیر پر حملہ کیا اور فتح کرکے بنام ہمایوں سلطنت کرنے لگا۔ ۱۵۵۱ء میں بغاوت ہوئی اور حیدر مرزا قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد شہنشاہ اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور ۱۵۸۶ء میں فتح کرکے سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا، اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے وادی کشمیر کو اس قدر پسند کیا کہ اسے اپنا گرمائی صدر مقام بنالیا۔ اس بادشاہ نے وہاں بہت سے محل تعمیر کئے اور باغ لگوائے اور ڈل کے کنارہ باغ لگا کر کشمیر کو جنت نظیر بنادیا۔ اسی بادشاہ نے کشمیر میں درخت چنار لگوایا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں بہت سی سرائیں علی مردان خاں نے تعمیر کرائیں۔ اور ڈل کے کنارہ پہاڑ پر دارا شکوہ نے پری محل تعمیر کرایا۔ اورنگ زیب نے وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں جو اب تک موجود ہیں۔

تقریباً ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی نے کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ اور ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خاں سدوزئی کو کشمیر میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ تاہم ۱۷۶۰ء تک شہنشاہ عالمگیر ثانی ہی کے نام کا سکہ جاری رہا۔ احمد شاہ کے نام کا پہلا کشمیری سکہ ۱۱۷۶ء کا ہے۔ ۱۸۱۴ء تک کشمیر میں درانیوں کی حکومت رہی۔ مگر اسی ۱۸۱۴ء میں فتح خاں بارکزئی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کرلیا، اگرچہ اس وقت بھی برائے نام سلطنت محمود شاہ اور ایوب شاہ کی تھی مگر در اصل سیاہ و سفید کے مالک بارکزئی سردار تھے۔

۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کرکے اس کا الحاق اپنی سلطنت سے کرلیا اور اس طرح وہاں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۸۲۰ء میں رنجیت سنگھ نے جموں راج کو ضبط کرکے وہاں کا انتظام ایک ڈوگرا راجپوت

مسمی گلاب سنگھ کے سپرد کر دیا۔ اس شخص نے چھوٹی چھوٹی پہاڑی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرکے اپنی ریاست کو خوب وسعت دی۔ اور کشمیر میں بھی اپنا اثر قائم کر لیا۔ راجہ گلاب سنگھ نے کشتوار اور لداخ کے علاقہ بھی فتح کر لئے۔

۱۸۴۵ء میں جب سکھوں سے انگریزوں کی جنگ چھڑی تو راجہ گلاب سنگھ بالکل الگ رہا اور جب مہاراجہ دلیپ سنگھ سے صلح ہو گئی تو میجر لارنس کے مشورہ سے وادی کشمیر اور وادی سندھ کے درمیان کا کل علاقہ پنجاب سے علیحدہ کرکے ایک ریاست بنا دی گئی ۱۸۴۶ء میں ایک عہدنامہ ہوا جس کی رو سے مندرجۂ بالا ریاست راجہ گلاب سنگھ کو دے دی گئی۔ گلاب سنگھ نے خراج دینا اور برطانوی گورنمنٹ کی سیادت کو قبول کر لیا اور کئی کروڑ روپیہ بھی انگریزوں کو دیا

اس زمانہ سے "ریاست جموں و کشمیر" کی جدید تاریخ شروع ہوتی ہے

مہاراجہ گلاب سنگھ کو کشمیر پر تسلط جمانے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ وہاں کی سرکش بومبا قوم نے امام الدین گورنر کی ماتحتی میں سخت مزاحمت کی اور گلاب سنگھ کی فوج کو شکست دیدی۔ مگر جب انگریزی فوج جموں میں بھیجی گئی تو مہاراجہ گلاب سنگھ نے رفتہ رفتہ اپنا تسلط تمام ریاست پر جما لیا۔ مگر اس کو کئی سال لگے۔ ۱۸۵۷ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی جگہ ان کے صاحبزادہ مہاراجہ رنبھیر سنگھ تخت نشین ہوئے۔ اور اس طرح یہ حکومت اسوقت تک ڈوگرا خاندان میں چلی آتی ہے۔

مطبوعات موصولہ

تجلیات فرخ

ناظرین نگار جناب فرخ بنارسی کے نام نامی سے ناآشنا نہ ہوں گے کیونکہ نگار میں اکثر ان کی غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ یہ مجموعہ انھیں کے قصاید و غزلیات و رباعیات کا ہے۔

جناب فرخ اس عہد کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت سنجیدہ ہیں اسی طرح انکی شاعری بھی متین خیالات کی حامل ہوتی ہے ۔ وہ معمولی پیش پا افتادہ جذبات کی طرف بہت کم اعتنا کرتے ہیں اور چونکہ وہ ہمیشہ بلند اور عمیق فکر کے ساتھ اپنے شعر کی ابتدا کرتے ہیں اسلئے لازماً ان کے اسلوب بیان کو بھی بدیع ہونا چاہئے اور ہوتا ہے چنانچہ وہ اگر کبھی کوئی معمولی بات ظاہر بھی کرتے ہیں تو اپنے انداز بیان سے اس میں خاص شگفتگی و ندرت پیدا کر دیتے ہیں مثلاً عاشق کا افسانہ ہمیشہ سوز شمع و بیتابی پروانہ سے شروع ہوتا ہے لیکن فرخ صاحب محض اپنے انداز بیان سے اس میں اس طرح تازگی پیدا کر دیتے ہیں کہ

اضطراب برق، سوز شمع، پروانے کا شوق — مختلف عنوان لے کر میرا افسانہ بنا

داستان عشق کے اختصار و اطناب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن فرخ صاحب کا انداز بیان ملاحظہ ہو:-

فرخ اک آہ کھینچ کے خاموش ہو گیا — پھر بھی انھیں گلہ ہے کہ قصہ دراز تھا

میں اس وقت کسی بسیط تبصرہ کے لئے تیار نہیں اس لئے اسکو کسی صحبت آئندہ پر ملتوی کرتے ہوئے صرف چند اشعار یہاں نقل کئے دیتا ہوں جس سے ارباب نظر کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی شاعری کس قدر بلند، ان کی تلاش کس درجہ وسیع اور ان کے جذبات اپنے معنی کے لحاظ سے کتنے عمیق ہیں:-

هوش جب آیا فنا کا اور سودا بڑھ گیا — نشۂ ہستی اُترنے پر بھی اتنا تیز تھا
اجل نے قصۂ غم نا تمام چھوڑ دیا — یہیں سے سلسلۂ داستاں نہیں ملتا
جس نے دیکھا ہی نہیں وہ تجھکو کیونکر جانتا — دیکھنے پر بھی تو کوئی حسن کا محرم نہ تھا
ہو گیا دم بھر میں فرخ مجھسے کچھ رنگ چمن — خندۂ گل میں خدا معلوم کیسا پیغام تھا

الغرض تمام دیوان اسی قسم کے نادر افکار سے لبریز ہے اور وہ حضرات جو صحیح رنگ تغزل کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُن کو ضرور ایک نگاہ اسپر ڈال لینا چاہئے ۔ شروع میں جناب رضی بدایونی کا تبصرہ اور مولوی ضیا احمد صاحب ایم ۔ اے کا مقدمہ بھی شامل ہے ۔ جناب فرخ کی تصویر بھی ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان کے کس دور شاعری سے متعلق ہے ۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور علی ہادی صاحب پسر مصنف سے محلہ انصار اناؤ کے پتہ پر مل سکتا ہے ۔

آنکھ کا نور اور دوسرے افسانے

جناب افسر میرٹھی کے نو افسانوں کا مجموعہ جسے ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس میرٹھ نے نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے ، اس میں جناب افسر کے جتنے

ہیں وہ سب مختلف رسایل میں شائع ہو چکے ہیں اور ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ جناب افسر کی افسانہ نگاری کی خصوصیت زبان کا شستگی و لطف اور پلاٹ کا عامۃ الورود واقعات پر منحصر ہونا ہے اس لئے قدرتاً وہ ہر شخص اور ہر عمر کے انسان کو پسند آتے ہیں میں تو جب انکو پڑھتا ہوں تو مجھے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی الاؤ کے پاس بہت سے لوگوں کے ساتھ میں بھی بیٹھا ہوا ہوں اور گانؤں کا کوئی تجربہ کار فرزانہ نہایت مشفقانہ انداز میں یہ دلچسپ کہانیاں سُنا سُنا کر رات کی سردی کو پر لطف بنا رہا ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲؍ زیادہ نہیں۔

مولود ہمایوں سیرۃ نبوی کے متعلق جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شروانی رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں مختصراً جناب سرور کائنات صلعم کی حیات مبارک کے حالات ولادت سے ہجرت تک درج کئے گئے ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سیرۃ نبوی پر اردو میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود اس کتاب کو کسی خاص نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اسرا یا معراج پر گفتگو کرتے ہوئے مخالفین اسلام کی نکتہ چینیوں کا بھی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن صرف اس طرح کہ ہندوؤں کی بعض کتابوں سے اُنکے اکابر کا بھی اپنے خاکی جسم کے ساتھ خدا کے پاس پہونچنا دکھایا ہے۔ ہماری رائے میں اس نوع کے استدلالات تمثیلی پیش کرنے سے بہتر یہ تھا کہ اس موضوع کو ہاتھ ہی نہ لگایا جاتا، کیونکہ ایک بڑا اعتراض واقعۂ معراج پر یہی ہے کہ یہ خیال دوسرے مذاہب سے لیا گیا ہے علاوہ بریں اس استدلال کی رُو سے پہلے ہندوؤں کی روایات مذہبی کو صحیح ماننا ضرور ہو جائے گا۔ لیکن وہ شخص جو اُن کو بھی نہ مانتے وہ کیونکر اس دلیل سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ استدلال زیادہ سے زیادہ ہندوؤں کے سامنے پیش ہو سکتا ہے، وہ شخص جو کسی مذہب کا ماننے والا نہ ہو اُس پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب مطبع عمدۃ المطابع حیدرآباد سے ۱۲؍ میں مل سکتی ہے۔

جام صہبائی جناب عبدالسمیع صاحب آثر صہبائی بی۔اے کے رباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے اور ۸؍ میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے۔ غالب کے زمانہ میں فارسی نظم و نثر کے نہایت مشہور اُستاد امام بخش صہبائی ہوئے ہیں جنکے متعلق غالب کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ " مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے۔ عمر بھر ایک چلو بھی پینا نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے، قربان جائے اس اتقا کے اور صدقے جائیے اس تخلص کے " لیکن ہمارے اثر صاحب صہبائی کے متعلق اس قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اگر انھوں نے کبھی پی نہیں، تو کم سے کم پینے والوں کا سا کلام ضرور رکھتے ہیں اور پورے لطف و سرور کے ساتھ۔ اس مجموعہ کی اکثر رباعیاں خمریات سے متعلق ہیں اور خوب ہیں۔

اقبال نامۂ جہانگیری جہانگیر کے بخشی معتمد خاں کی اس مشہور تصنیف پر ایک بسیط ریویو نگار کے فاضل مقالہ نگار خصوصی مولوی عبدالمالک آروی کے قلم سے حال ہی میں نکل چکا ہے۔ اب یہ کتاب مولوی

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی ۔ کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گُل نہ رہنے پائے
مٹا کے نقشِ دوئی، صد رنگ و بو کیلئے ۔ مہین جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے
کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی ۔ نمو کی ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے
گھٹا کی جیب تراشی، فضا پہ ڈالے دام ۔ قدم پہ شمس کے تڑپی قمر کے ناز اُٹھائے
گذشتہ زہرہ جبینوں کے دل نشیں ذرات ۔ نفس کی لَو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے
جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک ۔ جمودِ پیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے
تری زمین سے لی، آسمان سے گرمی ۔ صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چُرائے
بھگو کے رنگ میں ذرّات کے بنائی تہیں ۔ اور اُن تہوں میں تکلّف کے ساتھ نقش بنائے
گرہ لگائی پھر اک، مثلِ نرگسِ مخمور ۔ اور اس طرح کہ ہواؤں کی رَو میں کھلتی جائے
اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی ۔ چمن فروز ہوئی پتیوں سے منہ کو چھپائے
سحر کے وقت بالآخر کھلی، گلاب بنی ۔ مشامِ جاں کو کیا مست بوستاں مہکائے
اور اس کے بعد جو دیکھا غروب کے ہنگام ۔ پڑی ہوئی تھی سرِ خاک ناوکِ غم کھائے
یہ کیا نظام ہے معبود! بزمِ ہستی کا ؟ ۔ کھلے جو صبحِ نو، وقتِ غروب کملا جائے
جب ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سال خراب ۔ تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے

"بیا کہ قصرِ اَمل سخت، سست بنیاد است
بیار بادہ، کہ بنیادِ عمر برباد است"

([illegible]) جوشؔ ملیح آبادی

غزلیات

اظہر امرت سری

بجھی شمع نشاطِ زندگانی صرصرِ غم سے — بہت افسردہ دل ہو کر اٹھے ہم بزمِ عالم سے
مرا جاتا ہوں قیدِ چار دیوارِ عناصر میں — خدا کے واسطے مجھکو نکالو قصرِ عالم سے
بہشت اک نام ہے شاید اسی پاکیزہ گوشہ کا — جہاں ہم تم ملا کرتے تھے چھپکر چشمِ عالم سے
ضیائے وعدۂ دیدار کی مشعل کے سائے میں — کوئی ہم کو لئے جاتا ہے ظلمت خانۂ غم سے
ترا ذوقِ فنا اے زندگی مجھکو بھی لے ڈوبا — کہ تیرے ساتھ اٹھوایا گیا ہوں بزمِ عالم سے
اگر مرگِ حقیقی ہے جہاں ہو واقف اے اظہر — فراغت ہو نہ دم بھر بھی کسی کو اپنے ماتم سے

محمود اسرائیلی

شکوہ اور اس سے التجا کیا خوب — بے کشش عرضِ مدعا کیا خوب
فطرتِ عشق بھی ہے کیا ناداں — حسن سے خواہشِ وفا کیا خوب
کتنے ناداں ہیں مرے ہمدرد — عشق کا درد اور دوا کیا خوب
اس نے سب کچھ میں کہہ کے پچھتایا — سو گلوں کا جواب تھا کیا خوب
میرے گھر میری موت سے پہلے — آئے وہ دیر آشنا کیا خوب
رند تھے میکدے میں کل محمود — آج مسجد میں پارسا کیا خوب

الہامی لودھیانوی

جبر کر کے میں طبیعت پہ جئے جاتا ہوں — تلخ جو جام ملا ہے وہ پیئے جاتا ہوں
زندگی بارِ گراں موت بھی امکاں میں نہیں — بسر اوقات بہر حال کئے جاتا ہوں
عقل پر دو رہے مرا جوشِ جنوں الہامی — کر کے میں جامہ دری خود ہی سئے جاتا ہوں

ذہین فاروقی

بن بن کے مٹ گیا ہوں مٹ مٹ کے بن گیا ہوں — وہ نقشِ آرزو ہوں وہ حرفِ مدعا ہوں
میں اپنی وسعتوں میں کچھ کھو گیا ہوں ایسا — ہر قیدِ جستجو سے آزاد ہو گیا ہوں

کس کی نظر سے دیکھوں تیری تجلیوں کو — تو کب ملا ہے مجھ سے جب میں نہیں رہا ہوں
سب تار بج رہے ہیں [illegible] — ہے میں درد آشنا ہوں
میں اپنی زندگی کو تجھ پر نثار کرتا — اے کاش تو نہ کہتا میں صبر آزما ہوں
میں نامراد عالم اب کس سے دل لگاؤں — حد ہو گئی کہ خود سے بیزار ہو گیا ہوں
کافر ہو جس کے دل میں ہو لطف کی تمنا — میں تو جفائے جاناں دلدادہ وفا ہوں
اب تو ذہن میں بھی دنیائے جستجو میں — تصویر نارسی ہوں تعبیر خواب پا ہوں

فرخ بنارسی

اثر فریب الفت کوئی میرے دل سے پوچھو — غم جاوداں بنا ہے ترا التفات کرنا
یہی راز سرخوشی ہے یہی درس زندگی ہے — غم جان مضطرب کو طرب حیات کرنا
تجھے ذکر نے زباں کو یہ کیا ہے محو لذت — کوئی کچھ ہی کیوں نہ پوچھے مجھے تیری بات کرنا
کبھی کاش درد دل کا وہی دور پھر بھی آتا — وہ تڑپ کے صبح کرنا وہ تڑپ کے رات کرنا
نہ تلونات ہوتے نہ حیات عشق بڑھتی — ترا شیوۂ تغافل بھی ہے التفات کرنا
ابھی کیا ہوا ہے فرخ یہ جنوں کی پہلی حد ہے — کبھی بات کر کے رونا کبھی رو کے بات کرنا

غنی بنارسی

مجھے روز اس کے غم میں یونہی ساری رات کرنا — کبھی چپکے چپکے رونا کبھی دل سے بات کرنا
شب وصل صبح کر دی مری حال پر سو نہیں — کوئی میرے دل سے پوچھے ترا التفات کرنا
نہ کرے تڑپ تڑپ کے دل زار خون پانی — ہے ابھی تو آہ و زاری مجھے تا حیات کرنا
یہ غنی کو کیا ہوا ہے کئی دن سے دیکھتے ہیں — نہ کسی کی بات سننا نہ کسی سے بات کرنا

خوشتر منگروری

کریم دیکھ کے تیری یہ بے طلب بخشش — کسی کے سامنے دامن دراز ہو نہ سکا
خموش ہو کے بھی دل نالہ کش رہا ہر دم — نوائے سوز سے خالی یہ ساز ہو نہ سکا
سزائے جرم و معاصی کا ڈر کسے تھا لیکن — نہ اختیار رہا احتراز ہو نہ سکا
بس ایک آہ نے قصہ ہی کر دیا کوتہ — فسانۂ غم ہستی دراز ہو نہ سکا
فغاں تو باب اثر تک پہونچ سکی نہ مگر — در قبول دعا سے بھی باز ہو نہ سکا
کسی کے جلوۂ رنگیں میں یہ دورنگی تھی — نظر نواز ہوا دل نواز ہو نہ سکا
مطیع حکم قضا و قدر رہا خوشتر — کشیدہ بندۂ ناز و نیاز ہو نہ سکا

معلومات نسائی

حسنِ مغرب کا ایک نمونہ بدیع

اس وقت مغرب کے مشاغل تفریح میں ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ وہ دیگر فنون لطیفہ کی طرح حسن وجمال میں بھی مسابقت ومقابلہ کی دعوت عام دیتا ہے۔ چنانچہ وہاں ہر سال مختلف ممالک یوروپ کی عورتیں جمع ہوتی ہیں اور ہر ملک سے ایک ایک ملکہ حسن کا انتخاب کرکے اُن میں سے بھی ایک "گل سرسبد" چھانٹ لیا جاتا ہے، اور اُسے "سرخیل حسینان عالم" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب ایک عورت کے چہرہ کی ساخت، قامت کی رعنائی، قد کی موزونی، اعضاء کے تناسب کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی ہوا کرتا ہے اور گویا یہ انتخاب ایک عورت کی عام دلکشی سے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض انتخابات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق علیحدہ علیحدہ اعضاء جسمانی سے ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ پنڈلیاں کس کی خوبصورت ہیں، آنکھوں میں کس کے زیادہ سحر وافسوں پایا جاتا ہے، بالوں کے لحاظ سے کون زیادہ "دام بردوش" ہے، کس کے شانہ وگردن کی عریانی جذبات کے لئے زیادہ ہیجان انگیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت تک کا تجربہ ان حسن کے جائزہ لینے والوں کا یہ تھا کہ تاایندم کوئی نمونہ جمال نسائی کا ایسا نہیں ملا، جو اپنے ہر ہر عضو کے لحاظ سے مکمل قرار دیا جائے۔ اگر کسی عورت کی آنکھیں فسوں خیز ہوتی ہیں، تو اس کی ناک ویسی نہیں ہوتی، کسی کے لب بادہ چکاں ہوتے ہیں، تو گردن میں کوئی بات نہیں ہوتی، قامت اگر قیامت انگیز ہوتا ہے تو تناسب اعضاء مفقود ہوتا ہے۔ لیکن اب اتفاق سے اطالیہ میں ایک خوش نصیب عورت ایسی نظر آئی ہے، جو بحیثیت مجموعی بھی قیامت ہے اور اعضاء کی انفرادیت کے لحاظ سے بھی بے پناہ ـــــ اس المتہ الجمال کا نام مدموزیل ساندرینی ہے۔

اس کے متعلق یوروپ کے تمام نقاشوں، مصوروں اور بت تراشوں کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک تفصیلی حسن کا ایسا نادر وجمیل امتزاج کہیں نظر نہیں آیا۔ اور سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک ہر ہر چیز اپنی جگہ ایسا عجیب وغریب نمونہ تکمیل آفرینش کا ہے۔ کہ بالکل "لیلۃ القدر" کی پیدائش معلوم ہوتی ہے۔

پھر اگر یہ آیہ حسن، یہ روح جمال، یہ سحر متشکل، ہندوستان میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ یا تو حرم کے اندر توبرتو پردوں میں پایا جاتا یا حجابات قلب کے اندر مستور اور دونوں صورتوں میں ایک فرمانروایانہ انداز سے پورے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتا، لیکن چونکہ بدقسمتی سے یہ خاتون یوروپ نژاد ہے، اس لئے یہ حسن اس کیلئے بلائے جان ہوگیا ہے اور روزانہ دن میں دس دس گھنٹے اس کو تمثال کی صورت سے نقاشوں، مصوروں اور بت تراشوں کے سامنے مختلف ہیئتوں سے بیٹھنا اُٹھنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرزمین مغرب کی مادہ پرست دنیا میں حسن وعشق

کی جیسی مٹی پلید ہوئی ہے، شاید ہی کسی کی ہوئی ہو اور اگر کوئی اور حجت غیر بھی موجود نہ ہو تو یہی ایک دلیل یورپ کے کافر اور کافر نعمت سمجھنے کے لئے کیا کم ہے؟

پست ترین قامت کی عورت

اب اطالیہ کی اس بری جمال خاتون کے ساتھ انگلستان کی بھی ایک خاتون کا حال سُن لیجئے جس کا نام مس ہانزی ریکس ہے اور جو وہاں کے اسٹیج پر کام کرتی ہے۔ اس کی عمر ۲۶ سال کی ہے، لیکن آپ کا قامت صرف ۲۶ انچ سے زیادہ نہیں ہے، یعنی اگر بگار کی دھندلائی میں آپ صرف ۱۰ انچ کا اضافہ اور کر دیں تو اس خاتون کے قد کی ناپ معلوم ہو جائے گی۔ اس کا وزن ۳۴ پونڈ یعنی تقریباً ۱۷ سیر ہے جو ۳ یا ۴ سال کے بچہ کا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے میں بھی بالکل صغیر سن بچہ معلوم ہوتی ہے اور لوگ اسے تحائف بھی وہی دیتے ہیں جو عام طور پر بچوں کو دئے جاتے ہیں، لیکن اسکی دماغی وسعت پہنائی کا یہ عالم ہے کہ متعدد زبانوں کی ماہر ہے، بڑی وسیع المطالعہ ہے اور تمام واقعات عالم پر اسی طرح رائے زنی کرتی ہے جیسے کسی کالج کا پروفیسر۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسکے والدین کا قد و قامت ویسا ہی ہے جیسا عام انسانوں کا ہوتا ہے اور اسکے ایک بھائی بہن خاصے طویل القامت ہیں، اور خود اسکا بھی نشو و نما ابتدائی ۵ سال تک تمام بچوں کی طرح ہوتا رہا، لیکن اس کے بعد وہ دفعۃً بند ہو گیا۔ اور ۵ سال کی عمر تک پہونچ کر یہ ایک "مستقل جوہر بالذات" چیز ہو کر رہ گئی۔

دولتِ حسن

چند سال ہوئے جب امریکہ کی ایک نوجوان لڑکی ان کی ملکہ جمال منتخب ہوئی تو ۵ ڈالر اور ایک رکار ملبوس اسکو بعطور ترف جمال کے علاوہ پیش کیا گیا۔ وہ ہنوز اس انعام کو گھر لیجا کر اطمینان و سکون کیساتھ بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ محکمۂ ٹیکس کا افسر آیا اور اس انعام کا ٹیکس طلب کیا۔ ظاہر ہے یہ تو اس زمانہ کی بات تھی جبکہ دنیا موجودہ اقتصادی مشکلات میں مبتلا نہ تھی اور اگر وہ اس ٹیکس کو ادا کرتی تو بھی شاید چنداں پروا نہ کی جاتی، لیکن اب کہ دنیا کی ہر دولت حرص و تحقیق میں آکر اداۂ ٹیکس میں آگئی ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دولتِ حسن بلکہ محض نسائیت عام اس سے کہ وہ انتخاب ملکۂ جمال کے کام آئے یا نہ آئے، ٹیکس سے علیحدہ رہے۔ جب یورپ کی عورت اپنی آواز کے لحن کا، اپنی نازک انگلیوں کے لوچ کا، اپنے موئے میان کے اہتزاز کا اور اپنے لچیلے قدموں کی حرکات رقصیہ کا بیمہ ہزاروں لاکھوں روپیہ میں کراتی ہے، اور جبکہ وہ محض اسلئے کہ ایک عورت ہے، اسٹیج پر آکر دین و ایمان، اخلاق و انسانیت ایسی قیمتی چیزیں بھی لوٹ لیجاتی ہے کیوں نہ اس سے خراجِ حسن حاصل کیا جائے۔ یہ ایک تجویز ہے جو عورت کی بڑھی ہوئی آزادی سے تنگ آکر امریکہ کے بعض ارباب نظر نے پیش کی ہے اور حقیقتاً وہ وقت عجیب ہوگا۔ جب مرد دنیا کی عورت سے اپنی محرومی جنت کا انتقام اس طرح لینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا

بلغاریا اور اسباب جمال

بلغراد پایۂ تخت بلغاریہ کے زنانہ مدارس ثانوی کے ناظم نے حکم نافذ کیا ہے کہ طالبات آئندہ سے نہ ہونٹوں پر سرخی کا استعمال کریں، نہ عطریات لگائیں، اور نہ ایسے اسباب زینت و آرائش اختیار کریں جو حیا و عفت کے منافی ہیں۔ اس حکم پر وہاں کی لڑکیوں نے سخت احتجاج کیا ہے کہ ہم کبھی اسکو گوارا نہیں کر سکتے کہ ہماری زیست قرون وحشت کی لڑکیوں کی طرح ہو، ہمارے لئے ہونٹوں کو سرخ کرنا، عطریات کا استعمال، ناخنوں کی تزئین، بالوں کی آرائش اور اسی نوع کے اور اسباب زینت و آرائش لاطینی اور یونانی زبانوں کی تعلیم اور اسپورٹ کی اور بہت سی خرافات سے زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے لئے سب سے بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی مستقبل زندگی کے لئے بہترین ماؤں

حاصل کر سکیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ابھی زینت و آرائش کی طرف پوری طرح توجہ نہ کریں۔ اگر آج ہم دنیا بھر کی دانائیاں حاصل کرلیں اور دماغی تربیت کے لحاظ سے فلاطون و ارسطو بن جائیں تو کیا نتیجہ ہے اگر ہم کو کوئی بہتر شوہر نہ مل سکے۔"

ہم کو مرکیوں کی اس صدائے احتجاج پر تعجب نہیں ہے بلکہ حیرت ہے اس نظامِ تعلیم پر جس نے یورپ کی عورتوں میں اس قدر شعور پیدا کرکے بعض نے تو دنیا کا نام لیا اور وہاں کی لڑکیوں نے تزئینِ جسم کے مقابلہ میں تہذیبِ عقل و دماغ کو ترجیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کی حکومت اس شخص کو جس کا دماغ یقیناً خراب ہو گیا ہے، زیادہ عرصہ تک اس خدمت پر قائم نہ رکھے گی۔

دنیا کی مسلمان عورتیں

اگر گذشتہ ادوار کا سلسلہ بدستور جاری رہتا اور مسلمانوں کی ذہنیت میں بھی وہ انقلاب پیدا ہو جاتا جو اس وقت مغرب یا مشرق کے ممالکِ متمدنہ میں نظر آتا ہے، تو اس میں شک نہیں کہ اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا کا احترام ایک رسول ہی کی حیثیت سے کیا جاتا، کیونکہ اس وقت تک کسی ملک کی زمانی تاریخ میں کوئی ہستی ایسی نہیں گزری جس نے مصطفیٰ کمال کی طرح چند دنوں میں قرنوں کے جمود کو دفعۃً دور کر دیا ہو اور صدیوں کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی روایات کو اس طرح مٹا دیا ہو گویا وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ایک ملک کی اصلاح میں عورتوں کا ہوتا ہے، سو اس باب میں بھی اس کے اعجاز کا قائل ہونا پڑے گا کہ بابِ عالی کی وہ روایاتِ حرم جو نسائی حجاب و تحفظ میں زبان زد تھیں۔ آج ان کا کہیں نشان بھی نہیں ملتا۔ ترکی کی عورت نے صرف اپنا نقاب ہی نوچ کر نہیں پھینکا بلکہ اسی کے ساتھ ان تمام اوہامِ باطلہ و مراسمِ سخیفہ اور اعتقاداتِ رکیکہ کو بھی اپنے دل سے نکال دیا ہے، جنھوں نے قوم کی قوم کو تباہ کر رکھا تھا۔ آج وہ ہر جگہ مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہے اور حکومت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں وہ سرگرمِ کار نظر نہ آتی ہو، علم و ادب میں، فنونِ لطیفہ میں، اصلاحِ مسائلِ جنسی و معاشری میں، ریاضتِ جسمانی و دماغی میں، قضا کے دفاتر میں، صنعت و حرفت کے کارخانوں میں، طیران و فنونِ سپہگری میں، الغرض زندگی و تمدن کے ہر ہر شعبہ میں آج وہ پیش پیش ہے، اور آئندہ جنگ میں اگر ترکی قوم برسرِ پیکار ہوئی، تو دنیا حیرت کرے گی کہ ان کی عورتوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے۔

ترکی کے بعد مصر کی عورتوں کا درجہ ہے جو تقریباً ترکی ہی کے اصول پر کام کر رہی ہیں لیکن چونکہ مصر کو وہ آزادی حاصل نہیں ہے جو ترکی کو میسر ہے۔ اس لئے وہاں اسی نسبت سے ترقی میں کمی ہے، تعلیم، فنونِ لطیفہ، رقص و تمثیل میں بےشک ان کی ترقی ہے لیکن زیادہ مفید کاموں کی طرف ہنوز توجہ نہیں ہوئی۔ ایران میں بھی بہت بیداری پیدا ہو گئی ہے، اور پردہ مفقود ہو گیا ہے۔ حکومتِ ایران بھی بالکل ترکی کے قدم بہ قدم چل رہی ہے، اور اس نے بھی سب سے پہلے مولوی جماعت کو محو کیا جو ہر جگہ ترقی کے مانع آتی ہے۔

عراق کی لڑکیاں بھی تعلیم پا پاکر باہر نکل رہی ہیں اور مشکل ہی سے ان کو دیکھ کر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ سرزمینِ عرب کی خواتین ہیں۔ افغانستان و ہندوستان کا حال آپ کو معلوم ہی ہے، لکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہندوستان کی ہندو عورتوں میں علمی و سیاسی بیداری بڑی حد تک پیدا ہو گئی ہے اور مسلمان عورتوں میں بھی بہ نسبت پہلے کے تعلیم زیادہ پھیل گئی ہے

تذکرہ معرکہ سخن

مولوی عبدالباری آسی

تقریب

یہ تالیف اپنی نوعیت ترتیب و افادۂ ادب کے لحاظ سے اُردو میں بالکل پہلی چیز ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک ادیب یا انشا پرداز کی حیثیت سے رُونما ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف اسکولوں کے لٹریچر کا مطالعہ کرے، متقدمین و متاخرین کے کلام نظم و نثر کو دیکھے، کیونکہ بغیر اس کے تنقید کی پوری اہلیت پیدا ہونا دشوار ہے۔ اسی کا نام وسعت معلومات ہے اور اسی کو درکِ فن و صلاحیتِ سخن کہتے ہیں۔

نظم ہو یا نثر، صحتِ لغوی کا خیال، تراکیب الفاظ کا تنوع، محاورات کا صحیح استعمال۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے رکھ رکھاؤ کا نام شاعر و ادیب ہونا ہے اور ان پر عبور حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور اُن پر جو ایرادات و اعتراضات ہوئے ہیں، ان کو پوری دقتِ نظر کے ساتھ دیکھا جائے۔

اس وقت تک اُردو فارسی کے سیکڑوں شاعر ایسے گزر چکے ہیں جن کے کلام پر اعتراض کیا گیا اور اس کا جواب دیا گیا، لیکن اگر کوئی آپ سے سوال کرے کہ بتائیے میر و سودا، ذوق و غالب، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، خاقانی و انوری، عرفی و ظہوری کے کس کس کلام پر کیا کیا اعتراض کئے گئے اور اُن اعتراضات کی کیا نوعیت ہے تو مہینوں تک درجنوں کتب خانے چھاننے کے بعد بھی آسانی سے اس کا جواب نہ دے سکیں گے۔ اس لئے سخت ضرورت تھی کہ کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا جاتا جس کو دیکھ کر اس تمام "معرکۂ سخن" کی تاریخ سامنے آجاتی۔

ہر چند اُردو میں جہاں تک نظم کا تعلق ہے، کافی ذخیرہ تنقید کا موجود ہے، لیکن تا ایندم کوئی تذکرہ ایسا مرتب نہیں ہوا تھا جو ایک طرف درسِ تنقید بھی دے اور دوسری طرف فن شعر و سخن کی تحصیل میں سلکِ معاون ثابت ہو، اس مجموعہ میں یہ دونوں فائدے ملحوظ ہیں، یعنی اس کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ تنقید اپنی نوعیت کے لحاظ سے کس قدر وسیع چیز ہے اور اس کا بھی علم ہوگا کہ شعر و سخن میں لغت و اصطلاح، عروض و قافیہ، بیان و معانی کے اعتبار سے کن کن نقائص کا لحاظ ضروری ہے۔ اس لئے یہ مجموعہ گویا مرقع ہے تمام ان محافل شعر و سخن کی گرما گرمی کا جو اس وقت تک دنیائے ادب میں مرتب ہوئیں اور جن کے نقوش خدا جانے کہاں کہاں منتشر ہیں۔

شعراء کی باہم نوک جھونک، علمی مباحث، ادبی لطائف، لغوی تحقیقات، مختلف اساتذۂ فن کا انداز بیان، مناظرۂ ادبی، محاکمۂ رفیع، الغرض اس تالیف میں جو سیکڑوں صفحات کو محیط ہوگی آپ کو ہر وہ چیز نظر آئے گی جس کا علم ادب لطیف اور ادب تنقیدی کے سلسلہ میں ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔

لکھنؤ ۲۰ جنوری ۱۹۳۲ء

نیاز فتحپوری

"آتش" و آزاد

آتش — دخترِ رزمری مونس ہے مری ہمدم ہے — میں جہانگیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہے

اعتراض۔ بیگم ترکی لفظ ہے۔ اہلِ زبان گاف پر پیش بولتے ہیں۔ (لہذا قافیہ غلط ہے)

جواب آتش۔ ہم ترکی نہیں بولتے ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے۔

(مولف) آتش کا جواب صحیح ہے کیونکہ اہلِ ہند کا یہی محاورہ ہے، اور کلام اساتذہ میں بھی بضم کاف فارسی کہیں نہیں دیکھا گیا۔ علاوہ اس کے مصنف غیاث اللغات لکھتے ہیں "بیگم بکسر کاف فارسی زن عمدہ۔ وفتح کاف فارسی بمعنی امیر من لغات ترکی" اگر بفرض محال اس کو بالضم مان لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ قدما ایں اختلاف توجیہ کو بڑا عیب نہ سمجھتے تھے۔ آتش ناسخ غالب وغیرہ کے زمانہ تک یہ جائز تھا۔ غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہوگئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

"صاحب"۔ رب۔ سب وغیرہ کا ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔ حالانکہ صاحب بکسر حائے حطی صحیح ہے اور بفتح غلط ہے

سلہ ۵ خواجہ حیدر علی نام تھا۔ آباواجداد دلی کے باشندے تھے جو نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی سے فیض آباد آئے۔ اور آتش فیض آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے۔ بڑھے۔ اور جوان ہوئے۔ اسداللہ نواب محمد تقی خاں ترقی کے ساتھ لکھنؤ آئے یہیں شاعری نے فروغ پایا۔ مادھولال کی چڑھائی پر حویلیوں کے قریب رہتے تھے۔ آزاد وضع۔ متوکل۔ بانکے۔ اور نیک مزاج تھے۔ سنہ ۱۲۶۳ ہجری میں انتقال کیا۔ اولاد ظاہری میں ایک لڑکا محمد علی نام متخلص بہ جوش اور اولاد معنوی میں غزلوں کے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ مصنف تذکرۂ گل رعنا نے لکھا ہے۔ کہ ان کی تعلیم علمی خام تھی۔ اسی لئے زندگی میں بھی کلام پر اعتراض ہوئے۔ اور اس کے بعد بھی دیوانوں پر لوگوں نے اعتراضات کئے منجملہ ان کے آزاد نے اپنے تذکرۂ آبحیات میں ان پر دوسرے لوگوں کے نام سے اعتراضات کئے ہیں۔ جن کو ہم خود مولانا آزاد ہی کے نتائج افکار سمجھتے ہیں

آتش۔ اس خال کی نمش کفِ یار سیاہ ہے۔

اعتراض۔ نمشک صحیح ہے۔ نمش غلط ہے۔

جواب آتش۔ جب فارس جائیں گے تو ہم بھی نمشک کہیں گے۔ یہاں سب نمش کہتے ہیں۔ تو نمش ہی شعر میں لکھنا چاہئے

(مولف) میرے نزدیک آتش کا جواب صحیح ہے۔ اس لئے کہ لفظ اگرچہ نمشک بفتحتین ہے۔ اور بعض جگہ بجائے کاف تلمے فرشت بھی بھی پائی گئی ہے۔ مگر مُہمَلہ ہو کر نمش رہ گیا ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں الفاظ اردو میں رائج ہیں

آتش ؎ پیشگی دل کو جُدے لے وہ اسے تھیلے   ساری سرکار وں کے ہی عشق کی سرکا جدا

اعتراض۔ پیشگی ترکیب فارسی ہے۔ مگر فارسی والوں کے استعمال میں نہیں۔

جواب آتش۔ یہ ہمارا محاورہ ہے

(مولف) اس میں شک نہیں کہ پیشگی لفظ فارسی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ اہل ایران کی زبانوں پر اس معنی میں نہ ہو مگر یہ وہ فارسی ہے جو اہل ہند کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال میں کوئی نقصان نہیں۔ اردو میں بکثرت اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور اساتذہ نے ان کا استعمال کیا ہے

آتش ؎ زہر بھی ہیز ہو گیا مجھ کو   درد درماں سے المضاف ہوا

اعتراض۔ المضاعف صحیح ہے۔ المضاف غلط ہے

(مولف) یقیناً غلط ہے۔ اگرچہ سودا وغیرہ کے کلام میں ایک آدھ جگہ اسی طرح دیکھا گیا ہے

آتش ؎ لعل شکر بار کا بوسہ میں کیونکر نہ لوں   کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بیدود کو

اعتراض۔ شاید حلوا۔ کو حلوہ سمجھے

(مولف) حلوہ لکھنا صحیح نہیں۔ یہ لفظ حلوآ الف کے ساتھ ہے۔ جو مضاف ہونے کی حالت میں (ی) کی صورت میں لکھا جائے گا۔ اہل فارس حلوائے بیدود کا اطلاق شیریں میوؤں پر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بغیر آگ کے دہوپ کے صرف گرمیٔ آفتاب سے پکتے ہیں۔ حلوائے شہد۔ حلوائے مغزی۔ حلوائے نشیمں۔ وغیرہ سب الف اور ے سے لکھے جائیں گے بصورت ہائے ہوز ترکیب غلط قرار دی جائے گی۔

آتش ؎ رنگ زرد و لب خشک و مژۂ خوں آلود   کشتۂ عشق ہیں ہم ہے یہ کفارہ اپنا

اعتراض ۔ کفارہ بہ فائے مشدد صحیح ہے بہ تخفیف غلط ہے

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے

آتش ؎ لکھے ہیں سرگزشت دل کے مضمون کیا قلم اس میں ۔ تماشہ قتل گہ کا ہے مطالع میرے دیوان کا

اعتراض آزاد۔ مطالع غلط ہے

(مولف) اعتراض صحیح ہے مطالعہ باب مفاعلہ سے مصدر ہے جس میں تائے مصدری کا ہونا ضروری ہے

آتش ؎ کنا کش دم کی مار آستین کا کام کرتی ہے ۔ دل بیتاب کو پہلو میں اک گرگ بغل پایا

اعتراض۔ مار آستین فارسی مرکب ہے۔ گرگ بغل کے لئے فارسی کی سند چاہئے بلا سند صحیح نہیں

(مولف) مار آستین کی صحت میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ مگر گرگ بغل کوئی محاورہ نہیں۔ گرگ آشتی۔ گرگ آشنائی۔ گرگ باراں دیدہ گرگ مست۔ گرگ فسوں گر۔ گرگ سپید وغیرہ محاورے پائے گئے۔ گرگ بغل کہیں نہیں پایا گیا۔ البتہ گرگ در پیرہن داشتن ایک محاورہ ہے جو نا جنس سے صحبت رکھنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ شاید آتش کے خیال میں یہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی تصرف فی المحاورہ ہے

آتش ؎ چار ابرو میں ترے حیراں ہیں سلفے خوشنویس ۔ کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتب تقدیر کا

اعتراض۔ چار ابرو بمعنی چہرہ لیا ہے۔ اور محاورہ میں چار ابرو کا لفظ بغیر صفائی کے نہیں آتا جس سے مراد یہ ہے کہ ابرو اور ریش و بروت کو صفاچٹ کردیں وہ بے نواؤں اور قلندروں کے لئے خاص ہے نہ کہ معشوق کے لئے

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے۔ چار ابرو چہرہ کے معنی میں نہیں آتا۔ البتہ چار ابرو کا صفایا بولا جاتا ہے۔

آتش و آسی

آتش۔ بہار گلستاں کی ہے آمد آمد ۔ خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اعتراض۔ خوش کے بجائے خوشی لکھا ہے۔ یہ محاورہ ضرور ہے مگر بالکل عوام اور اسافل کا محاورہ ہے

آتش۔ ناخدا ہے موت جو دم ہے سو ہے باد مراد ۔ عزم ہے کشتئ تن کو بحر ہستی پار کا

اعتراض۔ بحر ہستی پار۔ بالکل غلط ترکیب ہے

آتش۔ بے گمان عشق ہو دل پر نقش بیٹھے دوست سکہ لگنا غیر ممکن ہے طلائے خام کا

اعتراض۔ ردیف غلط ہے۔ پر۔ کے بجائے کا۔ استعمال کیا ہے۔ اگر لگنا چلنے کے معنی میں ہے تو بھی یہاں خلاف محل ہے

آتش۔ جاں بخش لب کا یار کے رتبہ بلند ہے فی الواقعی مقام مسیحا بلند ہے

عقل سے ہوتا ہے فی الواقعی جاہل خالی

اعتراض۔ فی الواقع کی جگہ فی الواقعی غلط ہے

آتش و ناسخ شاگرد ناسخ

آتش۔ تیری کاکل میں پھنسا ہے دل جوان و پیر کا سیکڑوں آزاد ہے پابند اک زنجیر کا

اعتراض۔ اگر ردیف کو بدل کر مصرع ثانی یوں موزوں کرتے تو شعر حسب محاورہ درست ہو جاتا۔ "سیکڑوں آزاد ہیں پابند اک زنجیر کے"

جواب مولوی آغا علی صاحب۔ دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں اُن کو دیکھئے یہ اس کی نظیر ہیں

میر۔ ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا

مومن۔ نہ نکلی آہ یوں بھی حسرت دل یہی سو بحر چشم خونفشاں ہے

بقول آپ کے یہاں بھی دیکھا کی جگہ دیکھے اور سو بحر کی جگہ سو بحریں حسب محاورہ ہونا چاہیئے

(مولف) جواب بالکل صحیح ہے۔ خود آتش کے یہاں اس کی دوسری مثال یہ ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مگر مجیب نے جو دوسرا جواب مومن کے شعر سے دیا ہے وہ اس محل پر صحیح نہیں ہے۔

آتش۔ شمع رو نے میرے اُٹھا جو سر محفل نقاب ایک پر ایک ہوا ساکن محفل بھاری

اعتراض۔ ساکن محفل خلاف محاورہ ہے سند چاہیئے۔ اگر ساکن کی جگہ صاحب کہتے تو مضائقہ نہ تھا

جواب ۔ ساکن محفل کہاں کے محاورے کے خلاف ہے۔ اگر لکھنؤ کے محاورے کے خلاف کہتے ہیں تو غلط ہے اس واسطے کہ خواجہ سے مسلم الثبوت کے کلام میں یہ موجود ہے اور جو کچھ خواجہ صاحب فرما گئے ہیں اوس میں اہل لکھنؤ کو بجز تسلیم کے مقام عذر نہیں۔ اگر ساکن محفل آپ کے محاورے کے خلاف ہے تو ہو۔ اردو کو اُس سے کچھ سروکار نہیں۔

یہ مقصد ہے کہ ساکن محفل دہلی کے محاورے کے خلاف ہے تو ہم کہیں گے کہ بہتر۔ لکھنؤ اور دہلی کے بہت سے محاورات میں اختلاف ہے۔ یہ تو جواب تھا۔ اب دوستانہ گزارش کیجئے کہیں آپ ساکن محفل کی جگہ صاحب محفل دہلی یا لکھنؤ کی پابندی میں نہ کہہ بیٹھیے گا۔ ورنہ ہنسے جائیے گا۔ ہماری زبان میں صاحب محفل بانیٔ محفل کو کہتے ہیں۔ نہ شریک محفل کو۔ اور یہی اہل دہلی سے بھی سُنا ہے

(مولف) میرے نزدیک معترض کا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ ساکن محفل کسی طرح صحیح نہیں۔ اگر ساکن محفل۔ اہل محفل کا مرادف بھی قرار دیا جائے تب بھی ہر نکتہ اور ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ ایک ہی لفظ ایک جگہ فصیح ہوتا ہے اور دوسری جگہ غیر فصیح معترض نے جو اصلاح کی ہے کہ ساکن کی بجائے صاحب ہوتا۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ اور اس میں مجیب کے حق میں فیصلہ ہو سکتا ہے

آتش۔ کیا کاٹے گا پھوڑا ہے مرے دل کا بہت سخت ۔ نائیدہ روئی کا ہے یہ سیماب کا پھاہا

اعتراض۔ مصرع ثانی کی بندش بسبب لفظ نائیدہ کے کس قدر عمدہ اور دلچسپ ہے

جواب۔ نائیدہ جائز ہے سودا کا یہ شعر ہے ؎

غم کا ہی لسیر خواندہ اور درد کا بالیدہ ۔ مضمون جو طبیعت میں سودا کی ہے نائیدہ

(مولف) میرے خیال میں یہ جواب بھی۔ جواب از آسمان کی شان رکھتا ہے۔ کیونکہ معترض یہ نہیں کہتا کہ لفظ نائیدہ غلط ہے۔ بلکہ اوس کا خیال ہے کہ دوسرا مصرع سُست اور غیر دلچسپ ہے۔ میرے نزدیک سیماب کا پھاہا بھی ایک عجیب و غریب چیز ہے کیونکہ اس وقت تک مرہم سیماب سنا تھا۔ سیماب کا پھاہا نہیں سنا تھا۔ پھاہے کو روئی کا نائیدہ ٹھہرانا یہ بھی نہایت رکیک سی بات ہے

آتش۔ زار ہوں ایسا کسی کو میں نظر آتا نہیں ۔ عشق میں گھل گھل کر کمر کا یار کی مو ہو گیا

اعتراض۔ مصرع ثانی کی خرابی بندش بیان نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں ایک صنعت یہ ہے کہ ایک مصرع میں چھ کاف موجود ہیں۔ شاید چہل کاف کے جواب میں یہ مصرع کہا گیا ہے

(مولف) اگرچہ شعر کو چست نہیں کہہ سکتے۔ مگر ظاہرا کوئی قباحت نہیں۔ چھ کاف اگر جمع ہو گئے ہیں تو یہاں مصرع میں تنافر نہیں پیدا ہوتا۔ واضح ہو کہ صرف حروف کا ایک جگہ جمع ہونا نہ فصاحت کو مانع ہے اور نہ ثقالت پیدا کرتا ہے۔ ہزاروں مثالیں اس قسم کی موجود ہیں۔

آتش۔ ہجر کی شب میں ہے اشتیاق روز وصل — رات بھر رہتی ہیں آنکھیں انتظار آفتاب

اعتراض۔ لفظ انتظار بجائے منتظر غلط ہے

جواب۔ تحریف کاتب پر اعتراض کرنا سنت استاد ہے پھر اس سنت پر آپ کیونکر نہ قائم رہیں۔ مصرع صحیح یوں ہے۔ — رات بھر رکھتی ہیں آنکھیں انتظار آفتاب

(مولف) اگر مجیب صاحب نے کسی نسخہ میں اس مصرع کو اسی طرح دیکھا ہے جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں تو یقینی اعتراض غلط ہے۔ ورنہ صحیح۔ مگر مطبوعہ نسخوں میں یوں ہی ہے تو یہ کہنا کہ یہ تحریف کاتب ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس طرح تو ہر ایک اعتراض کو ٹالا جا سکتا ہے

آتش۔ عشق کا صدمہ نہیں اٹھ سکنے کا معشوق سے — پہلے مجنوں سے کریگی لیلی محمل قضا

اعتراض۔ لیلی محمل کی ترکیب مہمل ہے لیلی محمل نشیں کہتے تو شعر درست ہوتا

جواب۔ دونوں ترکیبوں سے فائدۂ تخصیص یکساں حاصل ہوتا ہے۔ اور بحیثیت ترکیب لیلی محمل میں کوئی غلطی نہیں

(مولف) میرے نزدیک جواب صحیح ہے

آتش۔ نکہت گل ہی نہیں جامے سے اپنے باہر — کون دیوانہ دہ تیرا ہے جو بےخویش نہیں

اعتراض۔ بےخویش کے لفظ سے فصاحت ٹپکتی ہے اور اس قدر رکیک کہ شعر خالی ہو گیا۔ بےخود کی جگہ بےخویش نہ دیکھا نہ سنا

جواب۔ بہت سے آدمی دنیا میں اس وقت موجود ہیں جنھوں نے زندگی بھر نہ کچھ دیکھا نہ سنا آپ ہی میں یہ صفت نہیں۔ مگر یہ نہ دیکھنا اور نہ سننا موجودات کی معدومیت کے واسطے حجت نہیں ہو سکتا اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں

ع تو بےخویش شو تا بہ خویشت کشند ع چو بےخویش گشت انچہ کرد از خداست

خسرو شیریں امیر خسرو ۔ بےخویشم ز گفتگوئے خویشاں — وز طعنہ چو زلف خود پریشاں

میر تقی میر — از خویش رفتہ اس بن رہتا ہے میر اکثر — کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں نہیں ہے

(مولف) پہلا اور دوسرا شعر معنی مقصود پر دلالت نہیں کرتا۔ البتہ امیر خسرو کا شعر بےخود کے معنی میں ہے۔ ہمارے نزدیک بےخویش صحیح ہے مگر یہاں گفتگو فصاحت میں ہو کہ اس جگہ فصیح ہے یا غیر فصیح۔ بےخویش کی طرح بےخویشتن بھی صحیح ہے جیسا کہ مولوی روم فرماتے ہیں ۔ آں خواجہ را در نیم شب بیماری پیدا شدہ — تا روز بر دیوارہا بےخویشتن سر میزند

آتش۔ عشوہ و غمزہ بدمذہب و ناز و انداز — واسطے تیرے گنہگاروں کے جلاد ہیں سب

اعتراض۔ عشوہ اور غمزہ کی صفت میں سلف سے کسی نے آج تک بدمذہب نہیں کہا۔

جواب ۔ غمزہ کی صفت کافر، بدکیش ہزار جگہ اساتذہ کے کلام میں موجود ہے۔ اگر کافر اور بدکیش کی جگہ پر بدمذہب لکھا جائے تو کیا قباحت ہے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر کوئی لفظ اساتذۂ سلف کے استعمال میں نہ آیا ہو تو اُسے اساتذۂ جدید بھی نہ صرف کریں۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ فصیح ہے یا غیر فصیح اور فصحا کے روزمرہ میں داخل ہے یا نہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جو اساتذۂ قدیم کے استعمال میں تھے۔ بہت ایسے بھی ملیں گے جو اب داخل نظم و نثر کئے گئے ہیں

(مولف) میرے خیال میں اگر غمزہ بدمذہب اس لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے کہ اوس کی جگہ کج بیش اور کافر لکھا گیا ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ باپ و دادا کو خال عمرہ یا نو چشم لکھنا جائز نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ غمزہ کی صفت کافر اور بدکیش کی گئی ہے۔ اور وہ درست ہے۔ مگر ایجاد میں الفاظ کی مناسبت و نامناسبت دیکھنا بہت ضروری ہے۔

آتش۔ قاصد کی طرح قتل جو کرتے تو خوب تھا — ہوتا تھا اضطراب وق کا خود نامہ بر مجھے

اعتراض۔ خط کا نامہ بر ہوا یعنی چہ۔ یہ من قبیل شب لیلۃ القدر ہے

جواب ۔ جناب مولوی صاحب خط کا نامہ بر ہونا اس میں کیا نقص ہے۔ یہ تو آپ کے فرمانے کی بات نہ تھی۔ نامہ بر اسم فاعل ترکیبی۔ عام طور پر بمعنی قاصد مستعمل ہے۔ چنانچہ آپ کے رہنمائے اول میاں جرأت ۔۔۔ فرماگئے ہیں ؎

جنھوں کا نامہ پہونچتا ہے اس ستمگر تک — انھیں کا کاشکے جرأت بھی نامہ بر ہوتا

آپ نے اس ترکیب کو شب لیلۃ القدر کس وجہ سے تصور کیا۔

(مولف) معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب معترض کے اعتراض کو سمجھے ہی نہیں، جس کا منشا یہ ہے کہ قاصد کو وہ قتل کر دیتا ہے اچھا ہوتا کہ میں اپنا خط آپ لے جاتا۔ تاکہ وہ اس قاصد کے بجائے مجھے قتل کر دیتا۔ مگر کہتے یوں ہیں کہ خط کا نامہ بر ہونا مجھے چاہئے تھا۔ یہ فقرہ بالکل بے معنی ہے۔ گویا نامہ کوئی شخص ہے جس کے نامہ بر آپ ہوتے۔ اگر نامہ بر اسم فاعل ترکیبی ہے۔ تو اسی صورت سے لیلۃ القدر بھی ایک علم ہے۔ اس کے بعد شب لیلۃ القدر کہنے میں کیا تامل ہے۔ اور جب یہ درست ہے تو مغز تخم کدو کے بیج بھی بے ضرر قابل استعمال ہیں خیال میں نہیں آتا کہ یہ فقرہ کیونکر درست ہوگا۔ کہ میں اپنے خط کا نامہ بر ہوں۔

آتش۔ کنج تنہائی میں بھی چلا کے رو سکتا نہیں — لوگ کہتے ہیں در و دیوار کے بھی گوش ہیں

اعتراض۔ لوگ کہتے ہیں کہ "دیوار کے بھی گوش ہے"۔ یوں نہیں کہتے "در و دیوار کے بھی گوش ہے"

جواب۔ واقعی یہ قول بالکل صحیح ہے۔ اور آتش نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ جیسا لوگ کہتے ہیں شاعر کی خطا نہیں یہ خطا آپ کی ہے۔ کہ آپ شعر کو صحیح نہ پڑھ سکے۔ در و دیوار نہ پڑھے بلکہ ڈر و دیوار کے بھی گوش ہے پڑھئے

(مولف) یہ بالکل ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے لکھا جا چکا کہ اپنی ضرورت کے موافق جہاں جیسا چاہا بنادیا اور غریب کاتب کی غلطی بتادی۔ اگر بالفرض آتش نے یہی کہا تھا تو بھی مہمل ہے "دیوار گوش دارد شمیدہ لب بجنباں" کا اس سے ـــ بدتر ترجمہ کیا ہوگا

آتش۔ کیسے نیند آتی ہے اے صنم پرست طاق ابرو کی یاد میں
کبھی سنتے ہیں بلبل سر مرغ قبلہ نما نہیں

اعتراض۔ اس شعر میں ابرو کا لفظ مضاف الیہ واقع ہوا ہے۔ ایسے حل میں ابرو کے واؤ کا گر جانا ہرگز درست نہیں

جواب۔ ان باتوں کی پابندی خواجہ اور شیخ کے وقت سے شروع ہوئی۔ متقدمین پابند نہ تھے۔ اساتذہ قدیم کے کلام میں نظائر جابجا موجود ہیں اگر ان کے ابتدائی کلام میں یہ ندرت یہ نقص رہ گیا تو اس فرد گذاشت پر غفلت کا احتمال نہیں ہو سکتا

(مولف) اعتراض صحیح ہے جس کا مجیب کو بھی اقرار ہے۔

آتش۔ دیکھتے ہیں زور اپنے ہاتھ کا وہ آجکل
خون عاشق ل کے پنجہ کرتے ہیں قصاب سے

اعتراض۔ پنجہ سے اور قصاب سے کیا نسبت ہے۔ شاید لکھنؤ میں قصاب لوگ ہی پنجہ کرتے ہیں

جواب۔ پہلے آپ کو اپنے استاد سے اس اعتراض کا جواب لینا چاہئے سے

دل ہوا خوں دیکھ کر دست حنائی کو ترے
پشت خار ای شوخ پنجہ بن گیا قصاب کا

اون سے پوچھئے کہ یہاں پنجہ قصاب کو کیوں تکلیف دی ہے۔ وہی ہمارا بھی جواب ہے

(مولف) یہ جواب صحیح نہیں۔ شعر یقیناً مہمل ہے۔ جواب میں جو سند ناسخ کا شعر پیش کیا گیا ہے وہ اس شعر سے بالکل جدا ہے۔ ناسخ کے شعر میں صرف ایک تشبیہ ہے۔ برعکس اس کے آتش کا شعر محتاج توجیہ ہے۔ ناسخ کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو مہندی ملی تو دست حنائی کا پشت خار تک اثر ہوا۔ وہ بھی سرخ ہو کر پنجہ قصاب معلوم ہوتا ہے۔ اور آتش کے یہاں یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کا زور دیکھتے ہیں اور قصائیوں سے پنجہ لڑاتے ہیں۔ نہ معلوم یہ کیوں کہا ہے۔ بظاہر کوئی وجہ نہیں ہو لہذا معترض کا اعتراض صحیح ہے۔

آتش۔ لامکان یار کو لکھتا ہوں خط شوق یہ
نہیں رہتے ہیں تباہی میں کبوتر کسند

اعتراض - لامکان یار کی ترکیب درست نہیں

جواب - یہ ترکیب درست کیوں نہیں۔ عدم تصریح سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ مصرع اول کی ترکیب سمجھے ہی نہیں

(مولف) معلوم ہوتا ہے کہ مجیب صاحب خود اعتراض کا منشا نہیں سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف لامکاں لکھنے سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ لامکانی لکھنا چاہیے۔ جیسے خلد مکانی۔ عرش آشیانی وغیرہ۔ بغیر یائے نسبت کے یہ لکھنا غلط اور بے معنی ہے

آتش - خوش بیاں لاتے ہیں ایمان کلام اقدس کلمہ پڑھتے ہیں وہ سنتے ہیں جو قرآں تیرا

اعتراض - ایمان کلام اقدس لانے کی ترکیب نئی ہے۔ اور خلاف محاورہ ہے

جواب - کلام مستند محتاج سند نہیں جو لوگ لکھنؤ کی زبان میں شعر کہتے ہیں اون کے واسطے یہی سند ہے

(مولف) میرے نزدیک اعتراض صحیح ہے۔ جواب صرف خوش عقیدگی کا ایک نمونہ ہے اس سے تو یہی بہتر تھا کہ یہاں بھی کہدیتے کہ مصرع یوں تھا ؎ خوش بیاں لاتے ہیں ایماں بہ کلام اقدس - تو پھر کوئی اعتراض باقی نہ رہتا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایمان کلام اقدس لکھنؤ کے کس کوچہ کی زبان ہے جو مجیب نے بے تکلف مذکورہ بالا نعرے کہدیے

آتش - مردہ تھے دیکھے سے تیرے یار زندہ ہو گئے جان میں جان آگئی دم میں ہمارے دم ہوا

اعتراض - دم ہوا بھی کیا خوب۔

جواب - اس کی خوبی میں کیا شک اہل زبان کا کلام ہے غیر کو یہاں مجال دم زدن نہیں مصرع میر اپنی آگاہی کے واسطے ملاحظہ کیجئے ؎ ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اکدم کے بیچ

(مولف) مجیب نے جو مصرع سند میں پیش کیا ہے بالکل خلاف محل ہے۔ یہاں دم میں دم آیا ہونا چاہیے۔ میر کا اصل شعر یہ ہے ؎ رونق آبادیٔ ملک سخن ہے اس تلک ہوں ہزاروں دم الٰہی میر کے اکدم کے بیچ معنی یہ ہیں کہ خدا میر کی عمر میں برکت دے اور آتش کے یہاں محاورہ بالکل دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی قرار آیا۔ ہوش آیا وغیرہ۔ لہذا اعتراض قائم ہے۔ اور جواب غلط۔

آتش - ہمارے حلق میں ہے رات ذکر پاک حضرت ہو خدا لنگی ہی یہ تسبیح خاک پاک سے پیدا

اعتراض - حلق میں ذکر ہونا یہ کہاں کا محاورہ ہے۔

جواب - جناب یہاں حلق نہیں خلق بہ خائے معجمہ پڑھئے۔

(مولف) اگر دراصل حلق ہے تو کوئی جواب کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور اگر خلق بخائے معجمہ ہے تو بھی معنی کچھ قابل اطمینان

نہیں مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری خلقت یا ہماری فطرت ہی میں ذکر پاک ہے۔ یہ کوئی مضمون نہیں اگر خلق مانا جائے تو بھی یہاں نخافت کا محل ہے۔ دوسرے خدا نے یہ تسبیح پیدا کی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے

آتش۔ دفتر عشق بھی کیا فرخوش طالع ہے :: نظری فرد نہیں اسمیں کوئی صاد ہیں سب

اعتراض۔ دفتر کو خوش طالع کہنا درست نہیں

جواب۔ مقیمائے نمی (فقرہ) شان تخت فیروز بخش بلند کہ سایہ اش تا بر عرش افتاد رفعتش بکرسی نشست ملاحظہ کیجیے کہ جب تخت کو فیروز بخت کہنا درست ہے تو دفتر کو خوش طالع کہنا کیوں درست نہیں

(مولف) میرے نزدیک خوش طالع صرف انسان کی تعریف لکھنا صحیح ہے۔ دفتر کو خوش طالع کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو مثال سنداً جواب میں پیش کی گئی ہے۔ اول تو اس کا محل اور مقام صحیح نہیں لکھا گیا۔ دوسرے ہر زبان کی انشا کی بالکل جدا صورت نہ بھی ہو تب بھی بہت سی باتیں مختلف ہوتی ہیں

آتش۔ زلف خوباں دراز لازم ہے خال کوتاہ و مختصر ہے خوب

اعتراض۔ خال کی صفت کوتاہ درست نہیں۔ کیونکہ کوتاہ ضد دراز ہے

جواب۔ جامۂ کوتاہ اور معنی کوتاہ بھی بولتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا قول تحقیق کے خلاف ہے جامۂ کوتاہ کو چراغ ہدایت میں دیکھیے اور معانی کوتاہ کو شعر ذیل میں ملاحظہ کیجیے سلیم ؎

مرا معانی کوتاہ دلپسند نباشد :: چو کرسی شنوم تا سخن بلند نباشد

(مولف) میرے نزدیک جواب سوال سے بالکل جدا ہے۔ جامہ کوتاہ۔ قصہ کوتاہ۔ سخن کوتاہ۔ معانی کوتاہ کا جواز خال کوتاہ کو جائز نہیں کر سکتا

آتش۔ پڑی ہے خال رخ یار پر نظر دیکھیں :: اثر ہے اپنا یہ مشکیں ستارہ کیا کرتا

اعتراض۔ مشکیں ستارہ غلط ہے

جواب۔ اہل بصیرت نے ایسے ہزار ہا ستارے دیکھ ڈالے۔ عبد القادر بیدل ؎

خال رخش فسانۂ روز تباہ کیست :: ایں سرگیں ستارۂ بخت سیاہ کیست

(مولف) اگرچہ مشکیں ستارہ کی مثال پیش نہیں کی جاسکی۔ مگر یہ صحیح ہے۔ میں نے بھی کہیں ضرور دیکھا ہے۔ مگر افسوس کہ شعر یاد نہیں

آتش۔ شرط ہے رتبۂ مردانِ خدا کا انصاف ڈوبا فرعون وہیں موسیٰ وہیں پایاب اُترا

تل کیا بنایا یار نے روئے صبیح پر فرعون کو تختِ عاج کے اوپر بٹھا دیا

اعتراض۔ فرعون کے واؤ کے ماقبل اگر عین مضموم ہوتا تو فرعون کو بروزن فعلن استعمال کر سکتے۔ چونکہ عین مفتوح ہے اس لئے فرعون کو بروزن فعلن لانا جائز نہیں

جواب۔ فرعون کو بروزن فعلن ناجائز تصور کرنا عین خطا بلکہ خطائے عین ہے۔ کیونکہ اگر آپ نظر رکھتے ہوتے تو ایسا نہ فرماتے۔ نظیر ملاحظہ کیجئے۔ نظامی ؎

نظامی زارغنوں آواز دادہ ز پردہ سحر فرعوں ساز دادہ

(مولف) فرعون کو بغیر اعلان نون لانا اردو میں کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگرچہ اس کی مثالیں اور بھی بہت سی مل سکتی ہیں

آتش۔ ذرّے ہماری خاک کے برباد تو رہیں ہوں گے کبھی تو روزنِ دیوار کے پسند

اعتراض۔ تو کی تکرار بہت خوب۔ اور مصرعِ ثانی کی تو نے تو ایسے مقامِ عالی پر جگہ پائی ہے کہ کیا کہنا

جواب۔ افسوس آپ ان دونوں لفظوں کے معنی کا فرق بھی نہیں سمجھ سکتے دیکھئے اسی اختلافِ معنی کی وجہ سے جرأت نے بھی اس لفظ کو مکرر صرف کیا ہے ؎

کیا کہئے نہیں تیرے تغافل نے تو مارا لے ابتو خبر اے بتِ بیداد ہماری

اہلِ ذوق شعر خواجہ صاحب میں جو تکرار واقع ہوئی ہے اُسے بہ نسبت شعرِ جرأت کی تکرار کے زیادہ پسند کریں گے۔

(مولف) مثال میں جو شعر پیش کیا گیا ہے وہ شعر باوجود تکرار خواجہ آتش کے شعر سے زیادہ فصیح ہے۔ خواجہ صاحب کے شعر کے مصرعِ ثانی میں تو نہایت بُری جگہ واقع ہوا ہے۔ جس سے سخت مذموم تعقید پیدا ہو گئی ہے

آرزو و رسا[1]

آرزو۔ دریدہ جامۂ یوسف کشیدن داماں چہ گنہ ز جانبِ سرپنجۂ زلیخا نیست

رسا ؎ آنقدر خوئے گرز درنگیں نماید تیشہ کو ضعف بیتر سم خجل از روئے فرہاد کند

اعتراض۔ سرپنجہ، زور و طاقت کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہاں شاعر سرپنجہ بمعنی ہاتھ لینا چاہتا ہے لہذا

---

[1] سراج الدین علی خاں آرزو نام تھا۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ گوالیار کی بود و باش ہمیشہ دلی ہی میں رہی کیونکہ خان آرزو ۱۱۱۰ھ میں

صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں مجمل از فرادم کند کافی تھا۔ روئے فرادم صحیح نہیں ہے۔

(مولف) اعتراض صحیح نہیں ہے، اس واسطے کہ سرپنجہ میں اگرچہ سر زاید ہے مگر غلط نہیں، پنجہ کے معنی میں اس کو استعمال کرتے اور کرسکتے ہیں۔ سر تیز بمعنی نوکدار و تیز، سرچشمہ بمعنی چشمہ، سرسبز بمعنی سبز وغیرہ سب اسی قبیل سے ہیں۔ چنانچہ مصنف برہان قاطع سرپنجہ کے متعلق لکھتا ہے۔ " بابائے فارسی و جیم بروزن از زندہ پنجہ دست را گویند۔ وکنایہ از مردم پرقوت و زبردست، و مردم آزار و بیباک ہم ہست "

دوسرے شعر میں بھی روئے کے معنی میرے خیال میں مواجہہ کے لئے ہیں جو بالکل صحیح ہیں۔ صرف فرادم کند اتنا صحیح نہیں جتنا کہ روے فرادم کند صحیح ہے

آرزو[1] لکھنوی و سروش لکھنوی

آرزو۔ ہاتھ سے آج اُس کے یوں اک سخت جاں مارا گیا ‏ آگ نکلی جائے خوں خنجر جہاں مارا گیا

اعتراض۔ مصرع ثانی میں " جائے خوں " اگرچہ ترکیباً غلط نہیں مگر اصول فصاحت کے خلاف ہے۔ فصحا اعلان نون

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) پیدا ہوئے۔ فرخ سیر کے عہد میں گوالیار سے ۱۱۳۲ھ میں دہلی چلے آئے تھے۔ آخر وقت میں لکھنؤ آئے یہیں ۱۱۶۹ھ میں انتقال کیا۔ مگر وصیت یہ تھی کہ مجھے دہلی میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی لاش دہلی لائے اور یہیں سپرد خاک ہوئی۔ آپ فارسی کے زبردست محقق اور شاعر تھے۔ بہت سی کتابیں فارسی کی اور دو دیوان فارسی آپ سے یادگار ہیں۔ اُردو میں بھی کبھی کبھی فکر سخن کرتے تھے میر تقی میر آپ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ مگر بعض ذاتی اور خانگی امور کی وجہ سے باہمی شکر رنجی ہوگئی تھی۔ پھر بھی میر تقی آپ کے بیحد معروف رہے۔ خان آرزو نے بہت سے اپنے معاصرین کے کلاموں پر اعتراض کئے ہیں جو اپنے اپنے محل پر درج ہوں گے۔ مگر خود ان کے کلام کو بھی لوگوں نے اچھوتا نہیں چھوڑا ہے۔ اور ان پر بھی خال خال اعتراضات نظر آتے ہیں۔ چنانچہ انند رام رسا جنکی ایک قلمی کتاب میری نظر سے گزری تھی جس کو بطریق کشکول انہوں نے جمع کیا تھا۔ اوس میں بہت سے شعرا کے کلام کے معائب۔ عیوب شعر کے ضمن میں انھوں نے درج کئے تھے۔ اوسی میں خان آرزو کے دو شعروں پر ہلکے ہلکے اعتراضات کئے گئے تھے

[1] آرزو صاحب دور موجودہ کے مشہور باکمالوں میں ہیں اسم گرامی انور حسین تخلص آرزو عرف منجھو صاحب میر ذاکر حسین یاس لکھنوی کے خلف الصدق اور جلال مرحوم کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں۔ ایک دیوان فغان آرزو۔ اور کئی ڈراما۔ اور ان کے ماسوا بعض ادبی رسایل آپ کی تراوش طبع کے نتیجہ سے ہیں ۱۲۹۹ھ میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور تقریباً چالیس برس کی عمر تک یہیں رہے۔ اب عرصہ سے بلاد شرقیہ کلکتہ وغیرہ کی طرف آپ کا قیام رہتا ہے۔ فکر سخن برابر جاری ہے۔ اور زبان کے اشعار درد و اثر سے لبریز خوب فرماتے ہیں۔ شاید جس زمانہ میں جلال مرحوم

کے ساتھ" خون کے بدلے خون کی عوض خون کی جگہ" بولتے ہیں۔ یہ تو مطلع کی تفصیلی حالت عرض کی گئی۔ اب معنوی حالت ملاحظہ ہو۔ مطلع اپنے دامن میں شاعری کے عالم ظاہر کا ایک معمولی خیال لئے ہوئے ہے۔ جو اثر سے دُور غرابت سے ہمدوش ہے۔ پہلا مصرع تو یہ ہے ع ہاتھ سے آج اُس کے یوں اک سخت جاں مارا گیا۔ اور لفظ (یوں) پر زور دیا ہے۔ اور (جو) زور دینے کا لفظ تھا۔ اوسے چھوڑ دیا۔ جس سے مطلع معنوی کرسی سے گر گیا۔ دوسرا مصرع ؎

آگ نکلی جائے خوں خنجر جہاں مارا گیا۔ نکتہ سنج حضرات کے دیکھنے کی بات ہے کہ خون کی جگہ خنجر کی ضرب سے آگ نکلی اس کا تعلق معنوی لفظ "یوں" سے ہوا۔ یا اس کے ہاتھ سے میں سے اوپر یہ بھی لکھا ہے کہ مطلع معنوی اعتبار سے غرابت سے ہمدوش ہے۔ وہ غرابت یہ ہے کہ پہلے مصرع میں صرف سخت جاں کہکر دوسرے مصرع میں بجائے خون آگ نکالی گئی ہے۔ تو یہ مجسمہ پہلے مصرع کی لفظ "سخت" سے فائدہ لیکر لوہے یا پتھر کا سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ خنجر فولاد کی ضرب سے آگ نکلی۔ پہلے مصرع کی لفظ سخت جاں اس لئے علیحدہ ہو گئی کہ خون تو نکلا نہیں۔ بلکہ خون کے عوض آگ نکلی۔ اور جب خون نہ نکلا کہ مرکب روح ہے۔ تو سخت جاں مارا کیونکر گیا۔ اب ایک بات اور رہی وہ یہ کہ مطلع کے دوسرے مصرع میں جہاں کا لفظ بھی مشتبہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں تو یہاں صرف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور روئے محاورہ بھی اس لفظ کے صرف کے کئی محل ہیں جہاں یعنی جس جگہ۔ جہاں جہاں۔ جہاں کہیں۔ جہاں یعنی جب بظاہر یہاں دوسرے مصرع میں لفظ جہاں کا تصرف جب یا جہاں کہیں کے معنوں میں کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ محل جہاں جہاں کا ہے۔ لہٰذا دوسرا جہاں کیا اضمار ہے

قافیہ کے بعد اضمار ایک اہل فن سے تعجب ہے۔ اور دوسرے ردیف بھی مصرع ثانی کی بیکار سی ہے۔ یعنی حرف مارا شاعر کے مطلب کو پورا کرتا ہے۔ اگر مطلع مذکور کی نثر بنائی جائے تو یوں ہوگی۔

۔آج اس ظالم کے ہاتھ سے اک وہ سخت جاں مارا گیا۔ آگ نکلی خون کے بدلے خنجر جہاں یا جس جگہ مارا گیا۔ موجودہ الفاظ کے ساتھ مطلع کی ادبی ترکیب میں بھی کلام ہے۔ مصرع اولیٰ کی لفظ یوں۔ اور لفظ سخت سے دوسرا مصرع علاوہ معنوی خرابی کے لفظاً بھی دست و گریباں نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں ہونا چاہئے تھا ؎

ہاتھ سے آج اُسکے اک وہ سخت جاں مارا گیا سنگریزے خوں ہیں تھے خنجر جہاں مارا گیا

اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے ؎ آج وہ اک حامل سوز نہاں مارا گیا آگ نکلی جائے خوں خنجر جہاں مارا گیا۔ جائے خوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) کا انتقال ہوا۔ اوس وقت آپ نے جانشینی جلال کا دعوےٰ کیا تھا۔ زمانہ حاسد ہے۔ لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ اونھیں میں سے بعض نے اعتراضات کئے چنانچہ اپریل ۱۹۱۴ء کے رسالہ معیار میں سروش کے نام سے آپ کی ایک غزل پر یہ اعتراضات کئے گئے ——— جہاں تک میرا خیال ہے سروش ایک فرضی نام ہے۔ کوئی تخلص نہیں ہے۔ اسی وجہ سے مجھے کوئی حال ان حضرت کا باوجود تلاش معلوم نہیں ہو سکا

کی نامانوس ترکیب سے تو بہتر ہے دوسرا مصرع یوں ہوتا ؎ خون کی جا آگ تھی خنجر جہاں مارا گیا۔

(مولف) پہلا اعتراض یہ ہے کہ جائے خوں فصاحت کے خلاف ہے۔ مگر صحیح ہے۔ میرے نزدیک اگر جائے خوں کے بجائے خوں ہو تو بہت ہی بہتر ہے۔ خون کو اگر باعلان نون کہا جائے تو خون کی عوض۔ خون کی جگہ۔ خون کے بدلے یقینی جائے خوں سے اچھے ہیں۔۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مصرع اثر سے دور غرابت سے بھر پور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بجائے خون آگ نکلنا ایک دور از قیاس سی بات ہے۔ مگر اسی کو غرابت کہا جائے تو ہزارہا شعر ہندی شاعروں کے دیوان سے خارج کرنا پڑیں گے۔ اور پھر ان کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ مثلاً پیارے صاحب رشید کا یہ شعر

ہوا ہے سخت مشکل دفن ہونا تیرے وحشی کا ۔۔۔ جہاں پر قبر کھودی جاتی ہے پتھر نکلتے ہیں

ایک وحشی کا لفظ رکھ کر پوری تخئیل کی بنا قائم کر لی گئی ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ لفظ (یوں) پر زور دیا گیا۔ اور (جو) کو چھوڑ دیا۔ یہ بالکل مہمل ہے۔ اس واسطے کہ شاعر نے یوں کا لفظ رکھ کر ایک تصویر دکھائی ہے۔ اور جو میں صرف ایک بیان واقعہ ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا مصرع تو چاہتا ہے۔ جو نداردہے۔ جس کی نثر اس طرح ہوگی۔ آج جو اُس کے ہاتھ سے ایک سخت جان مارا گیا۔ تو خون کی جگہ آگ نکلی جہاں خنجر لگا

ایک اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرع میں صرف سخت جان کہکر دوسرے مصرع میں بجائے خون آگ نکالی گئی ہے۔ تو یہ مجسمہ پہلے مصرع کی لفظ سخت سے فائدہ لے کر لوہے یا پتھر کا سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ خنجر فولاد کی ضرب سے آگ نکلی الخ۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر کی نظر میں سخت جاں کا لفظ تھا۔ ورنہ بجائے خون آگ نہ نکالی جاتی۔

دوسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ خون مرکب روح ہے اور خون نکلا نہیں آگ نکلی۔ مگر جان کا نکلنا خون کے نکلنے پر منحصر ہے پھر سخت جان مارا کیونکر گیا۔ میرے نزدیک یہ بھی غیر شاعرانہ اعتراض ہے جو صرف منطق کے صغریٰ کبریٰ کے نتیجہ نکالنے میں کام آسکتا ہے۔ شاعر کے لئے اس قسم کی پابندیاں ضروری نہیں ہیں کہ وہ جو دعوےٰ کرے وہ صحیح بھی ہو۔ اور حقیقتاً ایک فلسفی اور شاعر میں یہی فرق ہے۔ فلسفی جو کچھ دعوےٰ کرتا ہے اوس کا نتیجہ سچ پر مبنی ہوتا ہے اور شاعر صرف ایک بات کہکر سامع کو خوش کر دیتا ہے خواہ وہ جھوٹ ہو یا سچ ہو۔ اسی شعر کے مطابق مومن کے اس شعر کو دیکھئے ؎

درد ہے جاں کی عوض ہر رگ و پے میں ساری ۔۔۔ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

یا ؎ چھٹکر کہاں اسیر محبت کی زندگی ۔۔۔ ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

دونوں صورتوں کو دیکھئے کہ جان کی عوض رگ و پے میں درد کبھی ساری نہیں ہوتا۔ اور فرض کیجئے کہ درد ہی ساری ہوتا ہے تو کیا درد کے جاتے ہی جان جاتی رہتی ہے۔ یا بند غم کے ٹوٹتے ہی قید حیات کا ٹوٹنا لازمی ہے۔ اسی طرح آرزو نے کہا ہے کہ ایک سخت جاں آج مقتل میں یوں مارا گیا کہ بیچارے کے جہاں خنجر لگا۔ خون کی جگہ آگ نکلی۔ یعنی اسقدر دل جلا تھا کہ جسم میں خون رہا ہی نہیں تھا۔ بس یہی آگ تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

جلد ۲۱ | فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء | شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

ایڈیٹر:۔ نیاز (فتحپوری)

جلد ۲۱	مارچ سنہ ۱۹۳۲ء	شمارہ ۳

ملاحظات

اب سے ۳۸ سال قبل ۱۸۹۴ء کا زمانہ ہے کہ سلطنت روس کے بعض اکابر ایشیائی حصۂ مملکت میں ریل لیجانے کی تجویز پر غور کرتے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی توجہ اس طرف مبذول ہوجاتی ہے۔

فرانس کے اصحاب جاہ و ثروت جو بحر پاسیفک سے وسط ایشیا تک ذرائع نقل و حرکت کی تشکیل و تکمیل کے بہت متمنی تھے فوراً آمادہ ہوجاتے ہیں اور آخرکار حکومت روس کی ضمانت پر فرزندان فرانس روپیہ فراہم کر دیتے ہیں اور وہ ریلوے لائن بننا شروع ہوجاتی ہے جو " Trans - Siberian " کے نام سے مشہور ہے۔

جسوقت یہ خط آہنی بڑھتے بڑھتے حدود "چین" تک پہونچتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت چین اپنی سرزمین میں ریل لیجانے کی اجازت دیگی یا نہیں۔ چنانچہ دونوں حکومتوں میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور آخرکار حکومت چین منچوریا میں ریل لیجانے کی اجازت اس شرط سے دیدی ہے کہ حدود چین کے اندر جو ریلوے لائن بنائی جائے اس کا نام " Southern China Rly " یعنی "جنوبی چین کی ریل" قرار دیا جائے۔ روس نے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا کیونکہ محض نام کی تبدیلی سے اصل مقصد فوت نہیں ہوتا تھا اور سرمایہ داروں کی جماعت وہی تھی۔ چین کا محض نام ہی نام تھا

اس کے دو سال بعد جب ریلوے لائن طیار ہوگئی تو چین کی اجازت سے حدود منچوریا میں ریلوے لائن کے دونوں جانب پچاس پچاس میٹر (metre) زمین پر بھی روس نے قبضہ کرلیا اور ریلوے لائن کے حفاظت کی غرض سے فوج کے قیام اور اس کے لئے بارکیں بنوانے کی بھی اجازت لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں روس کا اثر منچوریا میں بہت بڑھ گیا۔ اور ایک شہر اُس نے آباد کرلیا جس کا نام ہر بن ہے۔ پھر چونکہ منچوریا کا یہ حصہ اپنی زرخیزی، شادابی اور معدنوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا، اس لئے روس کا یہ اقتدار سب سے زیادہ جاپان کو ناگوار ہوا، جو عرصہ سے سرزمین چین پر اپنے دانت لگائے ہوئے ہے۔

روس منچوریا سے زیادہ عرصہ تک متمتع نہ ہوا تھا کہ ۱۹۰۴ء میں روس و جاپان کی مشہور جنگ شروع ہوگئی جب روس کو شکست ہوئی تو حسب معاہدہ پورٹس متھ (۱۹۰۵ء) میں وہ مراعات جو جنوبی منچوریا میں اس کو حاصل تھیں جاپان کو ملگئیں اور چین کو بھی بادل ناخواستہ اس پر راضی ہونا پڑا۔ اس معاہدہ کی رو سے جاپان کو جنوبی منچوریا کی ریلوے مل گئی وہاں فوج کے قیام کا حق مل گیا وہ تمام معدنیں بھی ہاتھ آگئیں جو ریلوے لائن کے آس پاس تھیں اور صوبہ کوانٹنگ پر بھی ۱۹ سال کے لئے قبضہ ہوگیا جس میں بندرگاہ پورٹ آرتھر و ڈایرن شامل ہیں۔

جاپان نے یہ اقتدار ملتے ہی منچوریا کو تمام جدید ذرایع سے ترقی دینی شروع کی۔ ۵ ہزار کیلومیٹر کے طول میں جدید ریلوے لائن بنائی اور بندرگاہ ڈایرن کو اتنا وسیع کرلیا کہ بندرگاہ "ولاڈی واسٹک" کی اہمیت بالکل جاتی رہی۔

جاپان یہ سب کچھ کرتا جارہا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ تمام استعماری دراز دستیاں اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتیں جب تک چین باقاعدہ طور پر معاہدہ پورٹس متھ پر دستخط نہ کردے۔ چنانچہ اتفاق سے اسی دوران میں یوروپ کی جنگ عظیم چھڑ گئی اور حلفاء نے جاپان کی امداد کا عوض اس طرح دیا کہ چین کو مجبور کرکے معاہدہ پورٹس متھ پر دستخط کرادیئے اور ایک نئی شرط یہ بڑھادی کہ "جاپان کو منچوریا میں ہر قسم کی تجارت اور اراضی کی خریداری کا حق حاصل ہوگا اور بغیر منظوری جاپان منچوریا میں کوئی نئی ریل نہ بنائی جائے گی"۔ یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔

ہرچند چین نے اس وقت اپنے ملک کے اندرونی مصائب و مشکلات کو دیکھ اس عہدنامہ پر دستخط تو کردیئے، لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رعایتیں ایک دن اس کے حق میں سم قاتل ثابت ہونگی اور بلاد چین پر جاپانی اثر و اقتدار بہت بڑھ جائیگا۔ جب جنگ عظیم ختم ہوگئی اور جاپان کے اثرات حدود چین میں بہت زیادہ بڑھنے لگے تو چین نے امریکہ کے سرمایہ داروں کی مدد سے خود اپنی ایک نئی ریل علاقہ منچوریا میں بنانا شروع کردی اور جاپان کا ایک روپیہ بھی اس میں نہ شامل ہونے دیا۔

جاپان نے یہ دیکھکر صدائے احتجاج بلند کی اور چین کے اس طرز عمل کو خلاف معاہدہ قرار دیکر تحریک شروع کردی اور یہ وہی مخالفت ہے جس نے گزشتہ اگست میں چین و جاپان کی فوجوں کو متصادم کردیا اور باقاعدہ جنگ

کی صورت اختیار کرلی۔

جب جمعیۃ الامم (لیگ آف نیشنز) نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ طول کھینچتا جارہا ہے تو انھوں نے ان دونوں سے مطالبہ کیا کہ جنگ کو ختم کردیا جائے اور دنیا کے امن و سکون کو خطرہ میں نہ ڈالا جائے۔ اس پر جاپان نے جواب دیا کہ جاپان کو جو حقوق منچوریا میں حاصل ہوئے ہیں اور جو آبادی جاپانیوں کی اس علاقہ میں پائی جاتی ہے ان کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریلوے لائن محفوظ رہے۔ اور چین کی وہ تمام تحریکیں جو جاپانی تجارت کے لئے مضرت رساں ہیں یک قلم روک دی جائیں۔ چین نے کہا کہ جب تک جاپانی افواج حدود چین میں داخل ہیں اور جب تک چین کے نقصانات کا معاوضہ جاپان سے نہ دلایا جائے وہ کسی شرط کے ماننے کے لئے تیار نہیں۔

جاپان نے یہ دیکھا کہ جمعیۃ الامم بعض مصالح کی بنا پر کچھ مدد دینے سے مجبور ہے اور اس کے پاس جدید اسباب حرب سے آراستہ فوج ایسی موجود ہے کہ چین اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، فوراً شنگھائی اور اس کے مضافات پر حملہ کردیا تاکہ چین مجبور ہوکر اس کے تمام مطالبات کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ اس وقت شنگھائی پر تمام دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں اور نتیجہ کی منتظر ہیں۔۔۔۔ یہ تو مختصر بیان ان تمام واقعات و حالات کا جو چین و جاپان کی موجودہ آویزش کا سبب ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس جنگ کی اصل روح یہی ہے اور کیا جمعیۃ الامم کی خاموشی بے سبب ہے؟

وہ لوگ جو جاپان کی وسعت تجارت، اور اس کی ترقیوں سے بے خبر نہیں ہیں، انھیں بخوبی معلوم ہے کہ ایشیا میں جاپان ہی ایک ایسی سلطنت ہے جو صحیح معنے میں مغرب کے استعماری اصول پر کام کررہی ہے اور جو رات دن اس فکر میں سرگرداں ہے کہ نئی نئی منڈیوں پر اس کا تسلط قائم ہوجائے۔ نئی نئی زمینیں اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے حاصل ہوجائیں۔ اور وہ دنیا کی دولت کھینچ کر اپنے قبضہ میں کرلے یعنی اس کی حالت بجنسہ وہی ہے جو کسی وقت جرمنی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ان ہوسکاریوں کی جولانگاہ سرزمین چین سے بڑھکر کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی، جہاں کی زمین وسیع ہے اور آبادی باوجود کثیر ہونے کے جاہل و بے خبر ہے۔ چنانچہ روس سے جنگ کرنے کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ منچوریا پر اس کا اثر و اقتدار قائم ہوجائے۔ اور منچوریا پر اثر و اقتدار صرف اس لئے چاہتا تھا کہ اپنی تجارتی و استعماری دستبرد کا ہدف بنالے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ جنگ نے جس قدر تباہیاں روئے زمین پر پھیلائیں اتنی ہی برکات بھی وہ اپنے ساتھ لائی، یعنی اگر ایک طرف اس نے بہت سی جیتی جاگتی ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا تو دوسری طرف بعض سوتی ہوئی قوموں کو اس نے بیدار بھی کردیا اور دنیا میں ایک عام احساس استعماری و استبدادی حکومتوں کے خلاف پیدا کرکے اشتراکیت و جمہوریت کی روح زمین کے ہر گوشہ میں دوڑا دی، چنانچہ جرمنی کا انقلاب، روس میں بالشیوک حکومت کا قیام، ترکی

میں جمہوری سلطنت کی تشکیل، سب اسی جنگ کی برکتیں ہیں، جن سے چین بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور وہاں بھی قدیم شخصی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہر چند اس وقت تک چین میں کوئی منظم آئین حکومت قائم نہیں ہوسکا اور مختلف جماعتوں کے باہم اختلاف نے طوائف الملوکی کی سی کیفیت پیدا کر رکھی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ملک میں عام بیداری ضرور پیدا ہوگئی ہے اور قومی حکومت کے مفہوم سے وہاں کے لوگ بیگانہ نہیں رہے۔ چنانچہ اس کا سب سے پہلا ثبوت جو اہل چین نے دیا یہ تھا کہ انہوں نے ملکی صناعت کو ترقی دینے کے لئے، جاپان کی مصنوعات کا مقاطعہ شروع کر دیا

ظاہر ہے کہ جاپان، جو سرزمین منچوریا پر قابض ہونے کے بعد چین کی تمام وسیع آبادی سے اپنی صناعی ترقیوں کا خراج وصول کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا، کس طرح اس طرز عمل سے خوش ہوسکتا تھا۔ وہ حالات تو تمام اپنی امیدوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ کر بیتاب ہوگیا اور اس نے وہی کیا جو ایسی صورتوں میں اس کا سا ... ہمیشہ کیا کرتا ہے۔

اس لئے جاپان اس جنگ کے چھیڑنے کی وجہ جو چاہے ظاہر کرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ چین سے صرف اس لئے ناراض ہے کہ وہ کیوں اس کی مصنوعات کا مقاطعہ کر رہا ہے اور اپنے ملک کا روپیہ جاپان کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتا۔

جمعیۃ الامم میں جتنی بڑی قومیں شامل ہیں وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ زیادتی جاپان کی ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس وقت چین پر ظلم ہو رہا ہے، لیکن ان میں ہمت نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر جاپان کو روکیں یا اس سے اس ظالمانہ پیشقدمی کا احتساب کریں، کیونکہ خود ان کا طرز عمل بھی ان کے مستعمرات میں یہی ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی مصنوعات کے لئے منڈیاں پیدا کرنے میں اس سے زیادہ ظلم کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ پھر یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ جمعیۃ الامم جاگ جاگ کر سو سو جاتی ہے، یہ جو آج تک اس کے اعضاء منچوریا یا شنگھائی پہونچکر کوئی تدبیر صلح کی پیدا نہیں کرسکے، اس کا سبب صرف اخلاقی بزدلی اور ضمیر کی ملامت ہے کہ جس چیز کو وہ خود اپنے لئے روا رکھتے ہیں اس پر جاپان سے مطالبہ کرنے کا ان کو کیا منہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود اس لیت و لعل کے بھی جمعیۃ الامم کوئی نہ کوئی صورت اس جنگ کو ختم کرنے کی نکالے گی اور یہ بھی صحیح ہے کہ جہاں تک آلات حرب و فن حرب کا تعلق ہے، چین بہ نسبت جاپان کے بہت ضعیف ہے، کیونکہ اس کے پاس نہ جدید آلات حرب ہیں نہ کوئی منظم فوج، نہ بحری بیڑہ ہے نہ ہوائی جہازوں کی معقول تعداد، اور بالکل ممکن ہے کہ آخر میں شکست کے نقصانات اسی کو برداشت کرنا پڑیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ واقعہ چین کی بیداری کے لئے صدائے غیب ثابت ہوگا اور چین کی تاریخ مستقبل میں ۱۹۳۲ء کو وہی اہمیت دیجائے گی جو تاریخ فرانس میں ۱۷۸۹ء کو حاصل ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج جاپان منچوریا کے تمام علاقہ پر قبضہ کرلے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بزور شمشیر وہاں اپنی مصنوعات کو بھی پھیلا سکے، لیکن کل جاپان کے لئے وہ دن آنا ہے اور آکر رہنا ہے کہ چین اُس کو مچھر کی طرح اپنی چٹکی میں لئے ہوگا اور یہی جمعیۃ الامم جو آج جاپان کے خلاف زبان ہلاتے ہوئے پس و پیش کر رہی ہے، کہہ رہی ہوگی کہ یقیناً اس کو مسل ڈالنا چاہئے کیونکہ ایشیا کا امن و سکون ہمیشہ اسی کی وجہ سے خطرہ میں رہا ہے۔

اس وقت چین کے اندر جو عام جوشِ جاپان کے خلاف پیدا ہو رہا ہے وہ اپنے اندر بڑا شاندار مستقبل لئے ہوئے ہے اور اگر جنگ نے طوالت اختیار کی تو اسی وقت ورنہ آئندہ بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ جاپان نے جو دشمنی کا بیج آج بویا ہے وہ کل اسی کے لئے کیسا تلخ حنظل ثابت ہوا۔ کیا جاپان اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اب غلام ممالک میں بھی تیغ و تفنگ کی مدد سے استعماری و تجارتی حقوق عرصہ تک قائم نہیں رکھے جا سکتے چہ جائیکہ چین ایسا ملک جو خود مختار ہو اور ترقی کی تمام راہیں اختیار کرتا جا رہا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر یہ جنگ کچھ عرصہ تک اور قائم رہی تو ساری دنیا کی سلطنتوں کو اس میں شامل ہو جانا ہے مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ اس وقت کی اقتصادی حالت کسی سلطنت کو مصارفِ حرب برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیسکتی، لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت آئندہ عالمگیر جنگ کی داغ بیل ضرور پڑ جائے گی اور ایشیا کا وہ زرد خطرہ جس سے یورپ ہمیشہ خائف رہا اُن سے قریب تر ہو جائیگا۔

اسوقت عام اقتصادی و تجارتی کساد بازاری کا بڑا سبب تاوانِ جنگ ہے جو جرمنی پر عاید کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ قرض کی وہ مقدار جو یورپ کی دوسری سلطنتوں نے زیادہ تر امریکہ اور کچھ برطانیہ سے حاصل کیا تھا۔ ہرچند بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس تاوان و قرض کا ساری دنیا پر کیوں اثر پڑا لیکن جو لوگ مسائلِ اقتصاد سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اب اسباب نقل و حرکت کی وسیع اشاعت اور بین الاقوامی تعلقاتِ صنعت و تجارت نے ساری دنیا کو ایک نظام سے وابستہ کر رکھا ہے اور موجودہ ترقی تمدن کی مشین میں تمام سلطنتیں ایک دوسرے سے اس طرح متعلق ہیں جیسے گھڑی کے پھیئے کہ اگر ایک پہیّے کی بھی چول ڈھیلی ہو جائے تو سب پرزے بند ہو جائیں اور گھڑی بیکار ہو کر رہجائے۔ جرمنی پر جو تاوانِ جنگ عاید کیا گیا ہے اسکی مقدار ۲۷ ارب ۴۲ کرور ۱۹ لاکھ ۴۴ ہزار آٹھ سو ڈالر (ڈالر تقریباً ساڑھے تین روپیہ کے برابر) ہے جو ۵۸ سال کی مدت میں بالاقساط اُسے ادا کرنا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم ادا کرنا کسی ملک سے ممکن نہیں۔ خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اور یہی وہ احساس ہے جو اب جرمنی کو پیدا ہوا ہے اور جس کی بنا پر اس نے تاوانِ جنگ کے دینے سے معذوری ظاہر کی۔ اس لئے اب بہت بڑی گتھی یہ ہے کہ اگر جرمنی تاوانِ جنگ برطانیہ و فرانس وغیرہ کو ادا نہ کرے تو یہ ممالک اس قرضہ کو کیونکر ادا کریں جو انھوں نے امریکہ سے لیا ہے اور امریکہ کیوں اپنی رقم چھوڑ دے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس اُلجھن کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ممالک یورپ یا تو ایثار سے کام لیکر اپنے مطالبات سے باز نہ آئیں یا پھر دوبارہ جنگ ہو کر ساری دنیا پھر ایک بار اس دورِ وحشت میں نہ چلی جائے جب انسان دولت کو دولت کے لئے حاصل نہ کرتا تھا۔ آئندہ ایک مفصل مضمون اس موضوع پر شائع کیا جائیگا تاکہ اس مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں۔

حال ہی میں مصر کے جو مصوّر رسالے موصول ہوئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ رمضان میں ترکی زبان میں تلاوت کلام مجید کی رسم ادا ہوگئی۔ تصویروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کوٹ پتلون پہنے ہیٹ لگائے مسجد میں بیٹھے ہیں اور امام ایک اونچی میز کے سامنے کھڑا ہوا برہنہ سر بالکل اس طرح خطبہ پڑھ رہا ہے جیسے کسی کلیسہ میں کوئی پادری وعظ کہہ رہا ہو۔ اذان بھی ترکی

زبان میں دی گئی اور اذان دینے والا بھی فرنگی لباس میں برہنہ سر اذان دے رہا ہے یہ ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ہندوستان کے بعض اخبار جو ترکی کے متعلق اس نوع کی خبروں کو دشمنوں کا پروپاگنڈا قرار دیتے ہیں ان کو حقیقت کا علم ہوجائے اور دوسرے یہ کہ مغربی تعلیم وتہذیب کا جو اثر شعائر اسلام پر آہستہ آہستہ ہوتا جارہا ہے اس کا اندازہ ہمارے علمائے کرام کو ہوسکے جو ابتک بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے طیار نہیں

دین اسلام نام ہے صرف تعلیمات قرآنی کا اور فقہ ایک قانون ہے جس میں ہمیشہ اختلاف رائے پایا گیا اور پایا جائیگا، اس لئے اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ جماعت اسلامی کے رشتۂ اتحاد کو صرف قرآن مجید سے وابستہ کیا جائے اور "تشریع وافتا" کی دنیا کو اس سے بالکل علحدہ کردیا جائے۔ یعنی اگر ایک شخص ہاتھ کھولکر آمین بالجہر کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو اسکو غیر مسلم نہ ٹھہرانا چاہئے اور اگر کوئی کچھوے اور مینڈک کا کھانا جائز سمجھتا ہے تو اسے بھی اپنی جماعت سے علحدہ نہ کرنا چاہئے، اس قسم کے اختلافات پر مسلمانوں میں بہت کافی جنگ ہوچکی ہے اور ناقابل تلافی نقصان اٹھایا جاچکا ہے۔ آئندہ اسکو محو کردینا چاہئے کیونکہ جب خود قرآن پاک کی افہام وتفہیم میں تمام دنیا کے مسلمان کسی ایک بات پر متفق نہیں ہوسکتے تو فروعی مسائل پر اجماع کیونکر ممکن ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ نماز میں قرآن پاک کی اصل عبارت کے بجائے کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ پڑھنا سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ اعتقاد پیدا ہوجائے کہ کلام پاک "بلفظہ" نہیں بلکہ صرف اس کا مفہوم "وحی" ہوا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اب عہد عباسیہ تو ہے نہیں جو قرآن پاک کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ کوئی زبردست سیاسی اہمیت اختیار کرلے، اس لئے اب بجز اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ یا تو ترکوں کی اس اُپج کو نظر انداز کرکے انھیں بدستور جماعت اسلامی میں شامل رکھا جائے یا انھیں ملحد ومرتد قرار دیکر کفر کا فتویٰ ان کے خلاف صادر کردیا جائے۔ پھر ظاہر ہے کہ کفر کا فتویٰ کوئی تیغ وتفنگ تو ہے نہیں جس کا انھیں ڈر ہو اور اس کے خوف سے اُن کی موجودہ ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہوسکے۔ (جبکہ یہ ذہنیت نہ صرف ترکی بلکہ مصر، ایران اور خود عراق وشام اور نجد وحجاز میں پوری قوت کے ساتھ نشو ونما پارہی ہے) اس لئے لامحالہ ہم کو یہ تمام بدعتیں گوارا کرنا پڑینگی اور زہر کھانے کے بعد جینا پڑے گا اگر زمانہ یہی چاہتا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام ترکی کے مقابلہ میں اپنی ان مجبوریوں کو رواداری کی صورت دے سکیں تاکہ دنیا کو معلوم ہوجائے کہ اسلام کا مفہوم "بیکسی وبیچارگی" کے سامنے گردن جھکانے کا نہیں بلکہ "معقولیت وآزادی رائے" کے سامنے سر اعتراف خم کردینے کا ہے۔

اس ماہ کے نگار میں آپ غالباً بہت زیادہ سامان دلچسپی پائیں گے اور وہ تمام خصوصیات آپ کو بدرجۂ اتم نظر آئیں گی جو نگار کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

شروع سے نگار کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ پبلک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کیجائیں جو ان کے معلومات میں اضافہ کا باعث ہوں اور ایک خاص قسم کا تحقیقی وتنقیدی ذوق مطالعہ پیدا کرسکیں، چنانچہ اس وقت تک جن جن مباحث پر نگار

میں گفتگو ہوئی وہ اسی نصب العین کے ماتحت تھی اور آئندہ بھی اسی اصول پر کاربند رہنے کا عزم ہے۔ لیکن اگر گزشتہ دس سال کا مکمل فائل نگار کا آپ کی نگاہ سے گزر چکا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان خصوصیات کے قائم رکھنے کے لئے مجھے کتنی محنت صرف کرنا پڑی اور اگر نگار کا شعبۂ تحریر خود ہی اس ذمہ داری کو اپنے سر نہ لیتا تو اس کا التزام مشکل تھا کیونکہ ملک میں کسی خاص معیار کے مضامین لکھنے والے بہت کم ہیں اور محض دوسروں کے اعتماد پر کوئی رسالہ نگار کے معیار کا نہیں چل سکتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ ماہ کا رسالہ بھی نصف سے زیادہ شعبۂ تحریر کے مضامین سے پر تھا۔ اور ماہ رواں کے رسالہ کا بھی یہی حال ہے۔ بہر حال اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر واقعی یہ خدمات آپ کے نزدیک مستحسن ہیں تو کیوں آپ اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہ فرمائیں اور کیوں نہ ہمیں موقعہ دیں کہ اس سے زیادہ بہتر صورت میں ہم اس خدمت کو انجام دے سکیں۔ یقیناً نگار میں کوئی ظاہری دلکشی "نقش و رنگ" کی موجود نہیں، یہ بھی درست ہے کہ اس کی قیمت بھی بعض مصور و خوشنما رسالوں سے زیادہ ہے لیکن اگر دنیائے معاملہ "بیع و شری" اور "داد و ستد" میں "سیرت" کو کوئی اہمیت حاصل ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ نگار کے بارہ میں کیوں مغز کو چھوڑ کر پوست کی دلکشی کا سوال اٹھایا جائے

موجودہ مضامین میں سے ایک نہایت اہم مضمون "فلسفۂ عریانی" اس ماہ میں شائع کیا جا رہا ہے اور آئندہ ماہ سے "مذاہب عالم اور عضائے جنسی کی پرستش" کا سلسلہ شروع کیا جائے گا جو اردو کی دنیا میں بالکل اچھوتی ادبی چیز ہے۔ دیگر مضامین جو مرتب ہو چکے ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱ - عہد نامۂ عتیق (توریت) کی روایتوں کا ماخذ اصلی۔

۲ - ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد کی خدمت اردو کا ایک حیرت انگیز کارنامہ گا سوردی کے ایک ڈرامہ کے ترجمہ (ذریعۂ عمل) پر سرسری نگاہ

۳ - تاریخ کا ایک گمشدہ ورق۔ صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو۔

۴ - کیا سیارے آباد ہیں۔

۵ - کشاکش حیات پر ایک تحقیقی نظر۔

۶ - لا ادریت

۷ - روس کا اجتماعی انسان۔

۸ - مسئلۂ تاوان جنگ اور موجودہ اقتصادی مشکلات (۹) ڈرامہ شکنتلا موجودہ فن تنقید کے معیار سے (۱۰) ترجمہ ڈرامہ قلوپطرہ (برنارڈ شا)۔ (۱۱) شریعت مسیحی اور عورت کا زوال۔ (۱۲) جغرافیہ اور عہد اسلام وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ ان کے دلچسپ افسانوں، مفید استفسارات دلکش معلومات اور اعتبارات و تفریحات کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو برابر پیش ہوتا رہیگا

نیاز

مسئلۂ حسب و نسب خالص اسلامی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ماسبق)

شاہان صفویہ

تقی اوحدی نے عرفات العاشقین میں شیخ صفی الدین اردبیلی کے سلسلہ میں صفویہ کا مختصر تذکرہ کیا ہے، تاریخ فرشتہ کے اندر سلاطین دکن کے سلسلہ میں صفویہ کے حالات جستہ جستہ ملتے ہیں "پرشین آرٹ" کے تاریخی مقالہ نگار ڈینیسن کی تاریخی شہادت کی بنا پر صفویہ نے سنہ ۱۵۰۲ء سے سنہ ۱۷۳۶ء تک حکومت کی جو مشہور صوفی شیخ صفی الدین کی اولاد تھے اور جنکا سلسلۂ نسب موسیٰ کاظم تک منتہی ہوتا ہے، صفویہ نے پیری مریدی کے ذریعہ رفتہ رفتہ حکومت حاصل کرلی ان کی پوری حکومت کا زمانہ اثنا عشری مذہب کی تبلیغ اور سیاسی پروپگنڈا میں گزرا خصوصیت کے ساتھ ان کی توجہ دکن کی طرف مبذول رہی، برہان نظام شاہ، یوسف عادل شاہ، قطب شاہ وغیرہ شیعہ تھے، نظام شاہیہ اور قطب شاہیہ کو تو شیعی حکومت ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ صفویہ کی تبلیغ سلاطین گجرات کے یہاں بھی ہوتی رہی، مغلیہ کے ساتھ بھی انکا یہی رویہ رہا، ان کے صناع و مصور، ان کے شاعر و مغنی، ان کے علماء و زہاد عہد بہ عہد آتے رہے، اور اپنی مذہبی تبلیغ کرکے روانہ ہوگئے،[1] صفویہ نے عباسیہ کی طرح اپنی عظیم الشان خلافت قائم کرنا چاہی تھی، اور ساری اسلامی دنیا پر اپنا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے مغلیہ اور قطب شاہیہ کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرلئے، اور اس طور سے سادات کا خون منگولین نسل اور ترکی غلام کے خون سے مل گیا

قدیم عربوں کا افتخار نسبی

بعثت اسلام کے قبل عرب جن وحشیانہ فکر و عقاید میں مبتلا تھے ان کے مفصل حالات "جاہلی شعراء" (جاہلی" اُن شعرا کو کہا جاتا ہے جو عہد اسلام سے قبل گزرے ہیں) کے کلام سے معلوم ہوتے ہیں اس عہد کی شاعری میں کثرت کے ساتھ، نسب و حسب کے متعلق طعن و تشنیع، فخر و مباہات کے تخیلات ملتے ہیں کوئی شاعر اپنے قبیلہ کی نجابت بیان کر رہا ہے، کوئی حریف قبیلہ کے نسب و حسب کی مذمت کر رہا ہے، الغرض نسب و حسب کا تخیل بھی ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا شعرا

---

[1] میں اپنے مقالہ "دیوان شمس تبریز مرتبہ ڈاکٹر نکلسن" کے اندر اس کے متعلق اظہار خیال کرچکا ہوں۔ یہ کتاب "ایوان اشاعت گورکھپور" سے شایع ہو رہی ہے،

اسکے ذریعہ سے اپنے قبیلہ کو جنگ وجدال کے لئے اُبھارتے تھے، اور اپنے مخالف قبائل کو ذلیل کرتے تھے

بنی قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے،

انا بنی نھشل لا ندعی لاب　　عنہ ولا ھو بالابناء یشرینا

ترجمہ:۔ ہملوگ بنی نہشل کی اولاد ہیں اس کے سوا کسی دوسرے کو اپنا باپ نہیں بتاتے؛ اور نہ وہ ہم لوگوں کو غیروں کی اولاد کے بدلے بیچتا ہے

مطلب یہ ہے کہ نہشل نو خود بڑا شریف ونجیب ہے، اس لئے ہم لوگوں کو ضرورت نہیں کہ اظہار شرافت کے لئے کسی دوسرے شخص تک اپنا سلسلۂ نسب پہونچائیں اور اس کو بھی ہم لوگوں پر فخر ہے اس لئے وہ بھی ہمیں اپنی معزز اولاد بتانے سے اغماض نہیں کرتا

قبیلۂ طے کا ایک جاہلی شاعر انیف بن زبان النبہانی کہتا ہے،

جمعنا لکم من حی عوف ومالک　　کتائب یردی المقرفین نکالھا

ترجمہ:۔ ہم نے تمہارے لئے قبیلہ عوف ومالک سے مع تمام ساز وسامان کے فوجیں جمع کر رکھی ہیں جنکی عبرت انگیز سزا دو دوغلوں کو تباہ کردے گی

عرب کے اندر "مقرفین" اور "ہجین" کی دو اصطلاحیں تھیں اسکے متعلق علامہ تبریزی لکھتے ہیں

المقرف الذی امہ عربیہ وابوہ مولی ــ والھجین الذی ابوہ عربی وامہ امۃ	"مقرف" وہ شخص ہے جس کی ماں عربیہ ہو اور باپ غلام ــ اور "ہجین" وہ ہے جسکا باپ عربی ہو اور ماں لونڈی

آیندہ سطور سے آپ کو پتہ چلے گا کہ قرآن مجید کی پاک تعلیم نے اس ناپاک تخیل کو کس حد تک مٹایا، سرور کائنات صلعم اور آپ کی اولاد امجاد نے خود اپنے خاندان میں لونڈیوں اور غلاموں کو جذب کرکے دنیا کو کون سا پیام دیا، اور عرب جس انسان کو مقرف اور ہجین پکار کر ذلیل سمجھتے تھے اسے اسلام نے کس حد تک محترم بنادیا

عمرو بن معدیکرب ایک "مخضرمی" شاعر کہتے ہیں

ان الجمال معادن ــ ومناقب اورثن مجدا　　ترجمہ:۔ انسان کا جمال نسب وحسب ہیں جو اسے بزرگی عطا کرتے ہیں

یہاں "معادن" کے اصطلاحی معنی نسب کے ہیں جیسا کہ خود ایک حدیث کے اندر آں حضرتؐ نے بھی فرمایا ہے، تبریزی نے "مناقب" کے معنی انسان کے خصائل جمیلہ لکھے ہیں مولانا فیض الحسن سہارنپوری اسکے معنی "حسب" (مادری نسب) بتاتے ہیں ــ ایک اور عربی شاعر کہتا ہے،

مسانا من الآباء شیئا وکلنا　　الی حسب فی قومہ غیر واضع

ترجمہ:۔ ہم نے آباواجداد میں جستجو کی تو ہم نے دیکھا کہ ہم اور تم اپنی قوم میں صاحب جاہ وشریف ہیں

فلما بلغنا الامّھات وجدتم   بنی عمکم کانوا کرام المضاجع

جب ہم ماؤں تک پہونچے تو تم نے اپنے چچازاد بھائیوں کو (شاعر اپنے قبیلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) شریف ماؤں کی اولاد پایا

بنی عمنا لا تشتمونا وادفعوا   علی حسب مافات قیل الاکارع

ترجمہ:۔ ہمارے چچازاد بھائیو! ہمیں گالیاں نہ دو اور ہماری نجابت و شرافت کو جو ہم پاؤں کی نلی تک برابر بھی تم سے کم نہیں ملحوظ رکھتے ہوئے (نزاع کو) دور دفع کرو۔

اسی طرح عہد جاہلیت کا ایک اور شاعر جابر بن ارلان السنبسی کہتا ہے

لعمرك ما اخزي اذا ما نسبتني   اذا لم تقل بطلا علی و مینا

ترجمہ:۔ تمہاری زندگی کی قسم جب تم میرا نسب صحیح صحیح بغیر جھوٹ و افترا بیان کروگے تو مجھ ذلت نصیب نہ ہوگی

بنی اسد کا ایک شاعر کہتا ہے

اذا کنت ممن جھلت منہ مانتي   انا نسيب ممن جھلت کريم

ترجمہ:۔ اگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جن سے تو واقف ہے تو کیا ہم میں ان اعلیٰ نسب (والوں) سے منسوب ہوں جنکو تو نہیں جانتی

ومن یفتقر فی قومہ یحمد الغنی   وان کان فیھم واسط العم مخولا

ترجمہ:۔ اپنی قوم میں جو شخص فقیر و مفلس ہوتا ہے اگرچہ عالی خاندان نجیب الطرفین ہو لیکن مال و دولت ہی کو اچھا پاتا ہے

اسی طرح ایک قدیم جاہلی شاعر سعد بن مالک کہتا ہے

یتساقط الاوشاظ والذ   نبات اذ جھد الفضاح

ترجمہ:۔ جب فضیحت و رسوائی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو اوباش کم رتبہ اور دوغلے درماندہ ہوکر گر جاتے ہیں

تلاش کرنے سے ایام جاہلیت کے شعرا کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملیں گے جن میں نسب و حسب کو اپنی نواسنجیوں کا دلچسپ موضوع بنالیا تھا لیکن اس ظلمت کدہ میں جہاں انسانوں کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا جاتا تھا، جہاں مساوات و اخوت مفقود تھی، بساط آرائے شہود نے ایک ایسا مبلغ بھیجا جس نے اپنی پرسوز نوحہ طرازیوں سے، اپنے مؤثر اسلوب خطابت سے، اپنی وسیع انسانی ہمدردیوں سے صرف یہی نہیں کہ ان کی انانیت کا خاتمہ کردیا بلکہ سارے ملک و قومیت، اخوت کے نشہ سے سرشار بنا ڈالا۔ اب وہی قوم جو "ثار" اور "انساب" کی لغویات و مہملات میں پھنسی ہوئی تھی ایک منظم جماعت بنکر انسانیت کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور قلیل مدت میں چار دانگ عالم میں اپنے پیغمبر کی پاک تعلیم پہونچادی

عربوں کے تخیل نسبی پر اسلام کا اثر

تاریخ و سیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کس بیچارگی کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ میں آئے آپ کے بعد قریشی مسلمانوں

نے بھی ہجرت کی، مدینہ کے رہنے والے صرف یہی نہیں کہ قریشی قبیلہ سے نہ تھے بلکہ وہ آل مضر میں بھی شامل نہ تھے وہ بنی حمیر تھے، آل مضر اور بنی حمیر کی نزاع اگلے سطور میں لکھی جا چکی قریش اہل مدینہ کو اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے لیکن اسلام جب مدینہ میں آیا تو مہاجرین (قریشیوں) اور انصار میں شادی بیاہ ہونا شروع ہوا اس کے بعد کثرت سے غربا اور اجنبی نسل کے لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے ان انصار اور مہاجرین کے پیوند سے جو اولاد پیدا ہوئی انھیں زمانہ اور اسلامی سیاسیات نے مجبور کیا کہ وہ انھیں اجنبیوں غلاموں اور لونڈیوں کو اپنے اندر جذب کریں اور یہی ہوا چنانچہ قرآن مجید نے سیاسی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو قانون ازدواج پیش کیا وہ قابل غور ہے، اور اگر ہمارے زمانہ کے مسلمانوں نے اس پر توجہ کی تو عمدہ نتائج مترتب ہو سکتے ہیں

ولا تنکحوا المشرکت حتی یؤمن ولامۃ مؤمنۃ خیر من مشرکۃ ولو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرک ولو اعجبکم (بقرہ)

مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں نکاح نہ کرو مسلمان لونڈی مشرکہ (کنبہ کی عورت) سے بہتر ہے گو (مشرکہ) تم کو بھلی ہی کیوں نہ معلوم ہو (اسی طرح) مشرک مردوں سے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ نکاح نہ کرو اور مسلمان غلام، مشرک (اعلیٰ خاندان) مرد سے بہتر ہے، گو وہ (مشرک اعلیٰ خاندان والا) تم کو محبوب ہو

یہاں یہ قابل غور امر ہے کہ اسلام نے ایسی تعلیم کیوں دی؟ ظاہر ہے کہ اس وقت نسلی امتیاز کا خیال رکھا جاتا تو یقیناً اسلام کی اشاعت ہی ناممکن ہو جاتی کیونکہ قریش جو اسلام لا چکے تھے تعداد میں بہت کم تھے، شادی بیاہ کرنا فطری تقاضا تھا اگر قریش کنبہ کا خیال کرتے تو ان کو کفار مکہ سے شادی بیاہ کرنا پڑتا اور اگر اسلام اس کی اجازت دیتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلم قریشیوں کی جو لڑکیاں مکہ کے قریشی کافروں سے بیاہی جاتیں ان کی اولاد اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم رہتی اسی طرح اگر قریش کی کافرہ عورتوں سے مسلمان قریشی شادی کرتے تو ان کی اولاد کے ذہنی رجحانات پر ماں کی تربیت اور اُن کے افکار و عقائد کا اثر پڑتا ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں مقاصد اسلام کے منافی تھیں، پہلی صورت میں مسلمانوں کی تعداد پر بُرا اثر پڑتا دوسری صورت ان کے عقاید کے لئے زہر ہلاہل تھی اس لئے اسلام نے ایک سرے سے اُن کے ساتھ ازدواجی تعلق کرنا ہی حرام قرار دے دیا اس سے ایک تیسری صورت اور پیدا ہو جاتی جو اشاعت اسلام کے لئے خطرناک اور مہلک ثابت ہوتی عرب کے چند گوشوں میں اس کے ماننے والے ہوتے اور ان کی زندگی کے بعد یہ مذہب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا وہ صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کے ساتھ نسلی علاقہ نہ ہوتا تو وہ اخوت و خلوص باہم نہ پیدا ہوتا جس کی بدولت قلیل عرصہ میں مسلمان دنیا پر چھا گئے قرن اولیٰ کے مسلمانوں نے نسب و حسب کے امتیازات کو بالکل خیرباد کہہ ڈالا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اجنبی نسل کے مسلمانوں کو اپنے اندر کیوں کر جذب کر سکتے،

اور اگر اجنبی لوگ دیکھتے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایک تو کفار کی طرف سے جور و تشدد ہو رہا ہے، وہ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان بھی انانیت پرست ہیں یہاں بھی امتیازی شان ہے شادی بیاہ کے مواقع پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسلام کو اس شوق سے قبول نہ کرتے۔ اگر انسان کے مقابلہ میں کبریائی کا یہی عالم ہوتا تو آخر اسلام میں کون سی خوبی باقی رہ جاتی۔۔۔ کہ غیر مسلم اس سے متاثر ہو کر اس کے حلقہ بگوش ہوتے قرآنمجید نے دوسری جگہ صاف اعلان کر دیا کہ مسلمان عورتیں جو بھاگ کر مدینہ میں آئیں انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو، کفار انہیں حلال نہیں

اذا جاءکم المومنت مہجرت فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مومنت فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن

جب تمھارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کی آزمائش کر لو، خدا ان کے ایمان سے زیادہ باخبر ہے پس جب تم جان لو کہ وہ مومنہ ہیں تو انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو۔ یہ (عورتیں) ان کے لئے حلال ہیں نہ وہ (کفار) ان کے لئے"

نبی اکرمؐ نے اپنی وسعت قلبی اور خلوص نیت سے محض قلیل عرصہ میں صدیوں کا پندار ختم کر دیا آپ نے خود اپنے گھرانے کے اندر اجنبی نسل کے لوگوں کو جذب کر لیا آپ کے خاندان میں غلام بھی مل گئے اور لونڈیاں بھی یہ خلوص دیکھ کر کون تھا جو آپ کا پیام نہ سنتا آپ نے جو کچھ زبان سے فرمایا اسے خود کر کے بھی دکھایا آج ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سید و شیخ صاحبان عبائے دراز پہنکر ممبر پر کھڑے ہوتے ہیں، بڑے درد مند قوم بنتے ہیں اخوت اسلام کا درس دیتے ہیں ان کا ریاکارانہ وعظ و پیام صرف اسی لائق ہوتا ہے کہ سامعین سنکر تلخ تبسم سے کام لیں، یہ یہودیوں کی طرح سب سے ملتے ہیں لیکن خود کو سب سے ممتاز رکھنا چاہتے ہیں معاشرت کے رسوم و قیود نے انھیں حد درجہ مرعوب بنا رکھا ہے وہ کبھی کبھی اپنا ذاتی اثر و وقار پیدا کرنے کے لیے زبان سے تو اس کے خلاف نوحہ طرازیاں کر لیتے ہیں لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو رسم و رواج کے خلاف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، ان کی انانیت اور ان کا پندار پوشیدہ طور پر ان پر مسلط رہتا ہے، پھر بھی اضطراری طور پر یہ اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے، جب کبھی جذبات ان کے تصرف سے باہر ہو جاتے ہیں

آں حضرتؐ کو نسب و حسب میں طعن کرنا نہایت گراں گزرتا تھا مسلم شریف میں ایک حدیث ہے جس میں "الطعن فی النسب" سے آپ نے منع فرمایا اس قسم کی حرکات سے خواہ مخواہ دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے اور اخوت و محبت باقی نہیں رہتی امام بخاری نے ایک حدیث روایت کی ہے جس سے آپ کے قلب مبارک کی عجیب و غریب کیفیت پر روشنی پڑتی ہے حضرت زید ابن حارثہ آپ کے غلام تھے آپ ان کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے، محبوب کا محبوب بھی پیارا ہوتا ہے، حضرت زیدؓ کے لڑکے اسامہ پیدا ہوئے تو ان کو بھی آپ بہت زیادہ پیار کرتے تھے، چنانچہ احادیث میں ہے، کہ آپ حضرت اسامہ بن زید اور امام حسنؓ کو اٹھا لیتے اور فرماتے اللھم احبھما فانی احبھما (خداوندا، میں بھی انھیں پیار کرتا ہوں تو بھی انھیں پیار کر)

یہ تھے غلاموں اور غلام زادوں کے ساتھ آپ کے تعلقات، قربان جائیے ایسے ہادی پر، کیسے دردمند اور کیسے وسیع القلب تھے، بخاری میں ہے کہ ایک دن حضرت زیدؓ اور آپ کے صاحبزادہ اسامہ ایک ہی چادر میں لپٹے ہوئے سورہے تھے دونوں صاحبوں کا پاؤں باہر نکلا ہوا تھا عرب کا ایک قیافہ شناس (مدلجی) اس طرف سے گزرا اس نے کہا یہ پاؤں تو ایک دوسرے سے نکلے ہیں نبی اکرمؐ نے سنا تو آپ خوش ہوگئے، آپ کو یہ بات بھلی معلوم ہوئی فسر بذلک النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعجبہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے اس کا تذکرہ کیا[۱]، حضرت زیدؓ گورے تھے اور حضرت اسامہؓ کالے دنیا میں مختلف طبیعت اور مزاج کے آدمی ہیں، منافقوں کو شک ہوا کہ حضرت اسامہ زید کی اولاد نہیں ہیں آں حضرتؐ کی خوشی کی حالت پڑھکر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کو لوگوں کے اس شک وشبہ سے صدمہ تھا کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اسقدر خوشی کے کیا معنی؟

مسلمانو! پیغمبر صلعم نے یوں اسلام کو پھیلایا آپ کی محبت وہمدردی کا یہ عالم تھا تب عرب جیسے سخت دل انسان مالوف ہوئے آج ہم ہیں کہ اپنوں کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اپنے سے جدا کرتے ہیں او رصحابہؓ نے اپنے خون سے سینچ کر نخل اسلام کو تروتازہ بنایا خدا کے لیے اس کی شادابی وقومی ڈالیوں کو کاٹ کاٹ کر نخل کو باد حوادث کے حوالہ نہ کرو،

اس سلسلہ میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو عام مسلمانوں کے سننے کے لائق ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دولت وحکومت حاصل ہونے کے بعد لوگ خواہ مخواہ شیخ یا سید بن بیٹھتے ہیں اسلام نے یہ حرکت سخت مذموم قرار دی ہے حدیث شریف میں ہے؛

عن ابی ذر انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیس من رجل ادعی لغیر ابیہ وھو یعلمہ الا کفر ومن ادعی قوما لیس لہ فیھم فلیتبوأ مقعدہ من النار	حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلعم سے سنا کہ جس نے جان کر اپنے باپ کے علاوہ خود کو کسی دوسرے کا بیٹا بتایا اس نے کفر کیا اور جس نے جھوٹ موٹ کسی قوم کی طرف منسوب کیا اس نے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا؛

یہ قابل غور بات ہے کہ اسلام نے اس سے کیوں منع کیا؟ کیا اسلام ہماری ترقی نہیں چاہتا کیا وہ چاہتا ہے کہ ہم نسلاً بعد نسل سوسائٹی میں فروتر ہی سمجھے جائیں؟ حاشا یہ بات نہیں اگر نسبی شرافت اسلام کے نزدیک قابل قدر چیز ہوتی تو یقیناً اسلام ہمیں اس "نعمت" کے حاصل کرنے سے منع نہ کرتا لیکن اسلام چونکہ نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا اس لئے اوس نے ابن الوقت قسم کے لوگوں کو اس حرکت ذمیمہ سے منع کردیا تاکہ لوگ خواہ مخواہ نسب کی افسانہ تراشیاں کرکے اس کی اہمیت کو اور بڑھانہ دیں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ارباب جاہ وحکومت کے سامنے نسب وحسب کے بڑے بڑے مدعیوں کا سر خم ہوگا جیسا کہ ہوتا ہے اور دولت وزر، جاہ ومنصب کے زیر اثر ان حضرات سے رشتہ جوڑیں گے جن کو کوئی نسلی امتیاز نہیں، اور اس صورت سے خود بخود تخیل نسب میں اعتدال پیدا ہوجائے گا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو سوسائٹی میں فروتر

[۱] بخاری کتاب المناقب

سمجھا جاتا ہے ، مال و دولت ، علم و فضل حاصل کرنے کے بعد خود کو قریشی یا ہاشمی بنا کر مفلس شیخ سید کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے ظاہر ہے کہ یہ سخت ذلیل حرکت ہے اور اس سے ہماری سوسائٹی میں برے نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں جھوٹ موٹ کی نسبی افسانہ تراشی آج عام طور پر مروج ہے ، اور مسلمانوں کے اکثر گھرانے جو اپنی شرافت و نجابت کا پندار رکھتے ہیں ، غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں نسبی تخیل کو مٹانے کی ہرگز یہ صورت نہیں ہو سکتی اس سے چند در چند برائیاں ہوتی ہیں اول تو یہ کہ راز طشت از بام ہونے کے بعد جانبین کے حسیات ہمیشہ کے لئے مجروح ہو جاتے ہیں اور ازدواجی تعلقات سے جو باہمی ارتباط ہونا چاہئے نہیں ہوتا دوسری برائی یہ ہے کہ ایسی طبیعتوں کے اندر جن کے گھرانوں میں اس قسم کا واقعہ ہوتا ہے ، نسبی شرافت کا ادعا اور بڑھ جاتا ہے اور وہ نسبی تخیلات کی الجھنوں اور طعن و تشنیع میں زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں اسلام نے عام اجازت دیدی ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں البتہ فقہائے متاخرین کے رجحانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کفو کی تعیین کر دی ہے ۔ لیکن اس سے اسلام کا عام قانون نہیں بدل سکتا ۔ ایسے غداروں کو جو جھوٹ موٹ نسب نامہ گڑھ لیتے ہیں سوسائٹی اور بھی فروتر سمجھتی ہے ، اس لئے چاہئے کہ انسان نسبی افسانہ تراشی کرنے کے بجائے ، اپنی اخلاقی اور اقتصادی حالات پر نظر کرے اور اسی کی اصلاح میں لگا رہے ، اس طور سے خود بخود یہ تخیل اعتدال پر آجائے گا ۔ اور جب ازدواجی رشتہ داریاں ظاہر طور پر عام ہو جاویں گی تو پھر نسبی امتیاز باقی نہیں رہے گا ، نجابت و شرافت کے مدعی پوشیدہ طور پر تو آج بھی مالی جاہ کی طمع میں ازدواجی رشتہ قائم کر لیتے ہیں لیکن چونکہ یہ خفیہ کارروائی ہوتی ہے ، اور اس کے بعد سوسائٹی کے دہ (اصطلاحی) فروتر اصحاب جو اعلیٰ طبقات میں داخل ہو جاتے ہیں اپنی اصلیت کو محجوب کر لیتے ہیں اس لئے اس کا اثر عوام پر کچھ نہیں ہوتا اگر یہی بات بہ بانگ دہل کی جاتی ، تو اسلامی سوسائٹی کے مبارک ایام دور نہ تھے کیونکہ اس سے اوروں کو ترغیب ہوتی اور پھر کسی کو فخر و مباہات کا موقعہ ہی نہ تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا بعض غدار لوگ شرافت و نجابت کے دعویداروں کو دھوکہ دیتے ہیں اور اپنی سعی باطل سے اصلاح کے بجائے چند در چند خرابیاں پیدا کر لیتے ہیں جن سے دنیا اور دین دونوں کا خسران ہے ،

حضرت جامیؒ نے ایسے لوگوں کی ہجو میں ایک پُر لطف نظم لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے ،

ہمچو این جاہلان جاہ طلب　　که غلو کرده در علو نسب

پدر و مادر از نسب عاری　　پسر افتاده در نسب داری

دمی پسر از اراذل قردی　　پسر امروز سید علوی

مادرش لولی و پدر لاله　　او زند دم ز حیدر و زهرا

سازد از آل مصطفیٰ خود را　　گوید از نسل مرتضیٰ خود را

گوید این لیک خلق و فعل و فنش　　می کند دم بدم دروغ زنش

پسرے کش پدر مغیره بود　　مرنبی را چسان نبیره بود

کے بود زاہل بیت آں نااہل کہ گریزد ز جہل او بوجہل
زد خرے لاف با خران دگر کہ مرا خرنش رستمست پدر
داد زانہا یکے جوابش باز کہ گواہ تو بس دو گوش دراز

می ندانم کہ با ولی و نبی ایں چہ گستاخیست و بے ادبی
ناکساں چوں کنند بے باکاں نسبت خویش با چناں پاکاں
مایۂ زرق و قلبی و دغلی چوں بود نقد جان مصطفیٰ و علی
مرغ مایل بہ دانۂ تلبیس چوں بود ز آشیانۂ تقدیس
میوۂ بد مذاق تلخ سرشت چوں بود از درخت بہشت
کے چوں نافہ خریطۂ سرگیں فتد از ناف آہوئے مشکیں
ہذیان مسیلم کذّاب چوں بود زادہ حدیث کتاب

لعن اللہ تارک الادب داخلا بینہم بغیر نسب
باد لعنت براں کہ مہرۂ خر کرد پیوند سلک دُر و گہر
باد لعنت براں کہ دیدہ بدوخت خاک تیرہ بہ نرخ مشک فروخت
پیش ازیں فاضلاں لبیب بدند کہ ز کسب ہنر نیاسودند
بود در ہر زماں و در ہر حال سعی شاں در مزید فضل و کمال
ہنرے جائے کرد در دل شاں کہ بکوشش نہ گشت حاصل شاں
نسب اہل بیت بر خواندند لیک در کسب آں فروماندند
با کمال جلی و قدر سنی نہ حسینی شدند و نے حسنی
حبذا قابلان ایں دوراں کز حسب آنچہ بود در امکاں
عمر در جستجو بسر بردند تا ز امکاں بہ فعلش آوردند
بعد ازاں پائے سعی فرسودند در نسب راہ کسب پیمودند
از نسب نامہائے آل رسول ہر نسب شد کہ او فتاد قبول
نسبت خویشتن بداں کردند گوہر خویش را عیاں کردند

شد ز جولاہگی و آل گری — حال شان منتقل بہ آل گری

یک باقتدار بحکم عقل محال — کہ گلیم سیاہ گردد آل

آن خساں کین محال می طلبند — زر درروئی آل می طلبند

مجھے یہاں تک تو مولانا جامی سے اتفاق ہے لیکن آپ کے مفصلۂ ذیل ابیات قابل احتجاج ہیں

افرستے خدائے حجابت — بر سر او ز معدلت تاجے

تا چناں کا وایں نفس جہول — کرد جد در زوال آل رسول.

کند ایں سا آفریں بہ دانش و داد — دفع ایں زادگان شر و فساد

شود از آب تیغ تیز آثار — از شعار جمال آل ایں عار

منقولۂ بالا ابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف کو یہ گوارا نہیں کہ جائز طور پر بھی آل رسول سے اتحاد ہو کیونکہ جب کسی شخص کے علوی یا آل رسول بننے سے آپ کے نزدیک سادات کرام کا زوال ہوتا ہے تو یہ کیونکر خاندان رسالت سے کوئی (اصطلاحی) فرد تر درجہ کا مسلمان ازدواجی رشتہ قائم کرسکتا ہے جامی نے شاعرانہ غلو سے کام لیا ہے میرے خیال میں، نہ کسی کے جھوٹ موٹ آل رسول بننے سے سادات کرام کی توہین ہوتی ہے نہ ان کے شاہ خاندانی لگاؤ قایم ہونے کے باعث سادات کی نسلی خصوصیت بدل سکتی ہے، جب حقیقت یہ ہے تو "زوال آل رسول" کے کیا معنی؟ جو شخص آل رسول یا علوی بنتا ہے، وہ البتہ ہماری تمدنی زندگی کے اعتبار سے ایک ناقابل عفو معصیت کوشی کر رہا ہے. کیونکہ اس کا اثر ہماری قومی ذہنیت و اخلاق پر پڑتا ہے، اس قسم کی افترا پردازیوں سے نسلی امتیاز کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اور ہمارے اندر رفتہ رفتہ دارانہ عصبیت کی پرورش ہوتی ہے پس ایسے افراد سے "زوال آل رسول" تو نہیں ہوتا لیکن ہماری قومی حیات کے اوراق ضرور پریشان ہو جاتے ہیں

باعث مدعی بریں وسواس — نیست جز حب جاہ عند الناس

تا بیابد ز عام و خاص قبول — می کند خویش را ز آل رسول

چوں ندارد قرابت دینی — دم زند از قرابت طینی

نسبت جان و دل چو باشد سست — نسبت آب و گل چہ سود درست

بود بوطالب آں تہی ز طلب — مر نبی را عم و علی را اب

خویشتر نزدیک بود با ایشاں — نسبت بہا نیافت با خویشاں

ہیچ سودے نداشت آں نسبش — شد مقر در سقر چو بولہبش

اس کے بعد جامی نے ایک عمدہ حکایت لکھی ہے، جو سادات و شیوخ کے لئے عبرت آموز ہے،

شیخ ہمنہ کہ در فضائے وجود　　کس ازو مہ نبود ز اہل شہود
بود صافی ز رنگ کبر و ریا　　تافتے وعکس کبریائے خدا
بادشاہانہ مجلسے می ساخت　　نرد صحبت بہ ہر کسے می باخت
بر وے در زد ز ذوق راہروی　　رہ بداں جمع سید علوی
شوکت و جاہ شیخ را چو بدید　　شوک آں شوکتش بہ سینہ خلید
گفت ہستم من آل پیغمبر　　ایں بزرگی مرا بود درخور
با چنیں رفعت نسب کہ مراست　　ایں بزرگی نصیب شیخ چراست
ہر خیالے کہ در مقابل شیخ　　گرد اندیشہ تافت بر دل شیخ
شیخ آئینہ ہست لیک کری　　رویش از زنگ احتجاب بری
ہر چہ ظاہر شود ز جملہ جہات　　منعکس گردد اندراں مرآت
پیش ایں شیخ گر روی زنہار　　خاطر از زشت و خوب خالی دار
کانچہ باشد بداں دل تو گرو　　بر دل شیخ افگند پرتو

گفت القصہ شیخ با علوی　　کاے فروغ چراغ مصطفوی
نہ از نسب یافت آنچہ جد تو یافت　　از نسب کے بہ قرب حق بشتافت
گر نسب ساختے سرافرازش　　بو لہب نیز بودے انبازش
من ہم ایں از نسب نیافتہ ام　　بلکہ در پے روی شتافتہ ام
مصطفیٰ را ز فضل ربانی　　گشتہ ام در متابعت فانی
بہ رہ سنتش فرو شدہ ام　　تا بحدے کہ جملہ او شدہ ام
ہستی من در وجود او برسید　　حق بہ محبوبی خودم برگزید[1]

---

[1] پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں جامی کی غزلیات و نظموں کا ایک مجموعہ ہے، اس قلمی نسخہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خود جامی کا لکھا ہوا ہے کیونکہ اس کتاب کے اول صفحہ پر آپ کے صاحبزادہ ضیاء الدین کی تاریخ ولادت ثبت ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ اکثر غزلیں اور مقطعات جو نسخہ کے حاشیہ پر ثبت ہیں خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، بہر حال یہ کتاب یقیناً جامی کی نظروں سے گزری تھی، اور اسلئے بہت گرانمایہ و نادر ہے، مذکورہ بالا ابیات اسی نسخہ سے لئے ہیں،

مشجرہ اہل بیت اگلے سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایام جاہلیت میں نسب و حسب کے متعلق عربوں کا کیا تخیل تھا اور اسلام نے اپنی تعلیمی ضیا باریوں سے کون سی فضا پیدا کر دی آں حضرت صلعم کی پاک سیرت اور وسعت قلبی نے سارے عربوں کو اخوت کے نشہ میں سرشار کر دیا اب وہی مغرور قریشی و ہاشمی عرب و عجم کے نو مسلموں کو اپنے اندر جذب کرنے لگے، صہیب رومیؓ، حضرت بلال حبشی، مقداد ابن اسود، زید بن حارثہ کو قریشیوں نے جس نگاہ احترام سے دیکھا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے، مقدادؓ کا نکاح بی بی صفیہ (قرشیہ) سے ہوا۔ زیدؓ کا زینب بنت جحش (ہاشمیہ) سے اسی طرح تاریخ میں بہت سی نظیریں ہیں لیکن یہاں مجھے اپنے موضوع کے لحاظ سے صرف "اسوت" ان کے متعلق یہ بحث کرنا ہے جانے دیجئے بخاری کی اس روایت کو جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے سارے عربوں کو خطاب کر کے کہا ہے کہ اے بنی ماء السما!

(پانی کی اولاد) تم ابراہیم کی لونڈی کے بطن سے ہو، جانے دیجئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہیالی رشتہ داروں بنی نجار (جو قریشی نہ تھے بلکہ انصاری تھے) کے تذکرہ کو آئیے آں حضرت صلعم کے بعد آپ کے اہل بیتؑ کے مشجرات پر غور کریں تاریخ انساب کا ایک طالب العلم سخت حیران رہ جاتا ہے جب وہ روایات کے خلاف اپنے تنگ معاشرت پر غور کرتا ہے، حقیقۃً زندگی نام ہے ایک فریب خیال کا ایک مغالطۂ نفس کا اور ایسے اوہام و ظنون کی بیجا پرورش کا جو زندگی کے آلام و مصائب میں انسان کے لئے سامان سکون ہو جاتے ہیں نسب کا تخیل اور اس کا پندار انسان کے اندر صرف اسی لئے پیدا ہوا تاکہ اس کی آرزوہائے پامال کے لئے تعزیت کا کام دے انسان اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک سہارا تلاش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس فریب خیال سے بڑی حد تک انسان کو سیرابی ہو جایا کرتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان اس مغالطہ سے صرف اپنی غمناک گھڑیاں ہی خوشگوار بنا لینے پر قانع نہیں بلکہ اس کو اس نے اپنی اخوت کی تباہی، اجتماع کے انہدام، قومیت کی بیخکنی کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان "مے شبانہ" کو بھول کر جس نے ان کو نشۂ قومیت میں سرشار کر دیا تھا آج اس تبہ کن "بادۂ صبوح" کے دلدادہ بنے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنی اجتماعی قوت اپنے قومی نشو و ارتقا کو محض فریب نفس اور مغالطہ خیال پر قربان کرتے جاتے ہیں ع　بنگر وظیفۂ سحر و ورد شام ما

مسلمانوں کے تمام طبقات میں عام ازیں کہ سوسائٹی میں وہ بالاتر سمجھے جاتے ہوں یا فروتر یہ مرض پایا جاتا ہے کہ جہاں اپنی ذات کے کسی فرد نے کسی دوسری ذات کی عورت سے عقد کیا پھر وہ "برادری" سے خارج سمجھا جانے لگا، درصورت یہ ہے کہ اس طبقہ کے علما بھی ان "خارج برادری" افراد سے ازدواجی و معاشرت و معاشرانہ تعلقات نہیں رکھتے شیوخ و سادات کو لے لیجئے وہ بہت زیادہ اس بلا میں مبتلا ہیں اور روزانہ اپنی قبائلی خصوصیات کو کھوتے جاتے ہیں نہ ان کے پاس علم ہے نہ دولت نہ تنظیم ہے نہ قرینہ اگر کسی سید یا شیخ نے کسی غیر نسل کی عورت سے شادی کی تو اس کی اولاد کو طرح طرح کے برے القاب سے یاد کرتے ہیں جس طرح جاہلیت عرب میں "ہجین" اور "مقرفین" کی اصطلاحیں تھیں اور جس طرح ہنود "سرلوالال" اور "بغلا" پکارتے ہیں اسی طرح ایک سید اور شیخ اپنی برادری کے ان افراد کو ذلیل نگاہ سے دیکھتا ہے جو غیر برادری کی عورت

کے بطن سے ہوں حالانکہ تمام سادات اور شیخ آں حضرت کے زمانہ سے آجتک اپنے وضعی معیار نجابت کے مطابق اصل حالت میں بھی نہیں اور میں اس وقت تاریخ اور انساب کے اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں،

عام طور پر مسلمان شریف و نجیب اس کو کہتے ہیں جس کے ماں اور باپ پشتہا پشت اور ایک غیر معلوم زمانہ سے ایک ہی نسل کے ہوں اور کوئی واقعہ جدات پدری (دادیوں) اور جدات مادری (نانیوں) کے سلسلہ میں ایسا نہ ہو جو غیر نسل کے ساتھ آمیزش پر دلالت کرتا ہو، اگر ایسا ہے، تو پھر نہ تو اس کی شرافت باقی رہتی ہے نہ نجابت بلکہ "دوغلا" کہلاتا ہے، اگر معیار نجابت یہی ہے تو آئیے دیکھیں اہل بیت اطہار جن کی سیادت و شرافت دنیا میں مسلم ہے اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

(باقی آیندہ)

عبدالمالک آروی

پردیسی

بوڑھے مہیش اونچے کُل کے برہمن تھے ان کو اپنے خاندان پر ناز تھا۔ گھر میں بوڑھی عورت اور اکلوتی لڑکی رادھا کے سوا اور کوئی نہ تھا جوانی میں یہ کسی پلٹن میں ملازم تھے اب چار روپیہ ماہوار پنشن پاتے تھے۔ ان کے گاؤں کنس پور میں ان کی کوئی جائداد نہ تھی جب تک ان کے بازوں میں طاقت رہی کاشتکاری سے اپنا کام چلاتے رہے لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا، ان سے کاشتکاری کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چار پانچ بیگھے کھیت لیکر وہ دوسروں کو دے دیتے اور پیداوار میں آدھا حصہ لے لیتے۔ وہ اسی میں خوش تھے رادھا کے بیاہ سے پہلے وہ سوچا کرتے "جب رادھا کا بیاہ ہو جائے گا تو ہم دونوں رہ جائیں گے آدھ سیر آٹے میں ہمارا کام بن جائے گا ایک دن مر جائیں گے چھٹی ہو جائے گی"۔ لیکن ان کا منشا پورا نہ ہوا رادھا کی سگائی انھوں نے روپ نگر کے ایک عالی خاندان برہمن زمیندار پرتاب نراین کے لڑکے سورج پرشاد سے کی تھی روپ نگر سے برات بڑی دھوم دھام سے آئی رسوم ادا ہوئیں بھونریاں پڑ چکیں لیکن بدقسمتی سے بوڑھے مہیش کی ساری جمع پونجی ختم ہو چکی تھی۔ برات کی خاطر مدارات میں تو انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن جو کچھ طے ہوا تھا وہ نہ دے سکے دو چار روپیہ کی بات نہ تھی سیکڑوں کا معاملہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ رام پرتاب برات واپس لے گئے اور جاتے وقت کہہ گئے کہ وہ اپنے لڑکے کا دوسرا بیاہ کر دیں گے ہمارے بھروسہ اپنی لڑکی کو نہ بٹھا رکھنا

(۲)

بیاہ کو پورے پانچ سال ہو گئے کبھی یہ سننے میں آتا کہ سورج پرشاد کا بیاہ ہو گیا اور کبھی یہ سُن پڑا کہ ابھی ہوا نہیں لیکن ہونے والا ہے۔ بوڑھے مہیش کا بُرا حال تھا وہ رادھا کے لئے پریشان تھے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہئے۔ ایک دن رادھا سو گئی تھی آدھی رات ہو گئی تھی مہیش کی آنکھوں میں نیند نہ تھی یہی حال اُن کی بیوی کا تھا مہیش کی زبان سے بہت آہستہ سے نکلا "بھگوان اب کیا ہوگا؟"

مہاراجن نے کہا۔۔۔ "رات دن چنتا میں آپ کیوں ڈالے رہتے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا جو کچھ بھگوان نے ہمارے بھاگ میں لکھ دیا ہے وہی ہوگا"

"ہونا جانا کچھ نہیں۔ گھل گھل کر اپنی جان دینا ہمارے بھاگ میں لکھا ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی بتاتا ہے کہ جو بھاگ میں لکھا تھا وہی ہوا یہ کوئی نہیں بتاتا کہ میرے مرنے پر میری رادھا کا کیا ہوگا؟"

بوڑھی مہاراجن چپ چاپ سنتی رہیں ان کی زبان سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ مہیش چادر سے اپنا منھ چھپا کر رو دئے تھے کچھ دیر کے بعد سسکتے ہوئے بولے۔ "بھگوان! اس سے تو یہی بہتر تھا کہ کوئی اولاد ہی نہ دی ہوتی ہمارے بعد میری پیاری

دُلاری کس کی ہو گی"

مہاراجن نے آہ بھر کر کہا۔ "گاؤں والے تو کہتے ہیں کہ رادھا کا دوسرا بیاہ ہو سکتا ہے"

"دوسرے لڑکے کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے، ہم اونچے کُل کے برہمن ٹھہرے ایسا تو نیچ جاتیوں میں ہوتا ہے"

(۳)

رادھا اب لڑکپن سے گذر کر عالم شباب میں آ چکی تھی جب پاس پڑوس کی عورتیں اس کے گھر میں آتیں اور اس کی ماں سے رادھا کے متعلق باتیں کرتیں تو وہ دل تھام کر رہ جاتی اور تنہائی میں جا کر اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتی

ایک دن جب مہیش اپنی بیوی سے رادھا کے متعلق باتیں کر رہے تھے رادھا بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گئی ماتا پتا کو رنجیدہ دیکھ کر وہ اداس ہو کر ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھ گئی۔ مہیش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رادھا نے سوچا۔ "میری ہی وجہ سے میرے ماتا پتا کو اتنا رنج اٹھانا پڑتا ہے میں ایسا کیوں نہ کروں آج ان کو سمجھا کر کہہ دوں کہ میری کوئی فکر نہ کریں" اس کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔ "پتا جی آپ فضول سوچا کرتے ہیں میں زندگی بھر آپ کی سیوا کروں گی اسی میں خوش رہوں گی ماتا پتا کی سیوا سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی"

رادھا کی بات سنکر مہیش نہ سنبھال سکے دل کا پھپھولا پھوٹ گیا آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ دیر تک آنسو بہانے سے جب ان کا جی کچھ ہلکا ہوا تو انہوں نے کہا — "رادھا! ابھی تیرا لڑکپن نہیں گیا ہم کیا تیری زندگی بھر تیرا ساتھ دیکھیں گے" — اتنے میں رادھا کی کئی سہیلیوں نے آ کر کہا — "رادھا! آج ہمارے گاؤں میں ایک سبھا ہے کیا دیکھنے چلے گی؟"

مہیش نے کہا — "جانے کیوں نہیں۔ جا بھئی دیکھ آ۔"

رادھا سہیلیوں کے ساتھ سبھا میں پہنچ گئی۔ یہ کسان سبھا تھی اس میں ایک نوجوان کھدر پوش نے لکچر دیا۔ اس کا نام تو کوئی جانتا نہ تھا سب اُسے "دیش سیوک" کہتے تھے۔ دیش سیوک نے ملک کی موجودہ حالت عورتوں۔ بیواؤں اور کسانوں کی مصیبتوں کا کچھ ایسے دردانگیز پیرایہ میں ذکر کیا کہ سننے والے رو پڑے۔ جب سبھا ختم ہوئی اور رادھا اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے سوچا۔ "اگر پتا جی دیش سیوک کو اپنا حال بتائیں تو یہ ضرور مدد کریں گے۔"

— گاؤں والوں نے "سیوک جی" کو کچھ دنوں کے لئے گاؤں سے جانے نہ دیا سیوک جی ٹھہر گئے اور کھدر کا پرچار کرنے لگے

(۴)

ایک دن صبح کے وقت سیوک جی گاؤں کے مکھیا رگھوناتھ داس کے ساتھ مہیش کے مکان کے پاس سے گذرے مہیش کی طبیعت خراب تھی وہ تکلیف کے مارے کراہ رہے تھے۔ سیوک جی رُک گئے اور انھوں نے دریافت کیا۔ "یہ کون کراہ رہا ہے رگھوناتھ۔" "مہیش پرشاد ایک بوڑھے برہمن ہیں وہی کراہ رہے ہیں"

"کیا ان کے گھر میں اور کوئی نہیں؟"

"بس ایک لڑکی ہے ایک ہفتہ ہوا ان کی بوڑھی عورت بھی پرلوک سدھاری" یہ کہکر رگھوناتھ نے رادھا کی شادی کا بھی سارا حال سنا دیا۔ سیوک جی نے کہا۔ "کیا اس وقت ہم مہیش پرشاد کو دیکھ سکتے ہیں"

"ہاں چلئے" کہکر رگھوناتھ سیوک جی کے ساتھ مہیش کے گھر میں "رادھا" کو پکارتے ہوئے گھسے ان کے پاس پہونچ کر رگھوناتھ نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "پنڈت جی! کیا حال ہے؟"

مہیش نے آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا بتاؤں بیٹا! موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ بدن بہت درد ہے سر پھٹا جاتا ہے —— آہ —— آہ —— بیٹا یہ... تمہارے ساتھ کون ہیں۔ مجھے دکھائی کم ...... !"

"یہ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے چیلے ہیں۔ دیش کی سیوا کے لئے نکلے ہیں۔ ہم سب ان کو سیوک جی کہتے ہیں"

"گاندھی جی تو دیوتا ہیں ان کے بھگت دھن ہیں ...... آہ! آہ!"

سیوک جی نے مہیش کی نبض دیکھ کر کہا۔ "میں آپ کی دوا لانے والا ہوں آپ کی سب تکلیف کم ہو جائے گی بخار بھی اتر جائے گا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں"

"...... بیٹا! دہائی گاندھی جی کی —— آہ! آہ! ......"

تھوڑی دور پر رادھا کھڑی تھی دوا لینے چلے تو سیوک جی کی نظر رادھا پر پڑی انھوں نے سوچا" یہ جوان لڑکی بیوہ ہے اس کے چھاتی کا بوجھ ہو رہی ہے۔ ایسی سندری اور اتنی بدقسمت! واہ رے بھگوان!"

رادھا نے مہیش کے پاس جا کر کہا۔ "پتا جی! یہ جو ابھی دوا لانے گئے ہیں انھیں نے اس دن سبھا میں دھیان دیا تھا بڑی اچھی اچھی باتیں کہتے تھے ——"

پھر سیوک جی نے گھر میں آکر کہا۔ "لیجئے پنڈت جی دوا کھا لیجئے ذرا آپ کو آرام معلوم ہوگا"

رادھا لاج و شرم سے وہاں سے ہٹ کر الگ کھڑی ہو گئی۔ مہیش نے ایک بار آنکھیں کھولیں پھر بند کرتے ہوئے کہا "بیٹا! بیٹھ جاؤ! میرے کارن تمھیں بڑی تکلیف ہوئی"

اس بات کا کچھ جواب نہ دے کر سیوک جی نے رادھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھوڑا سا پانی لائیے۔ میں ابھی ......"

رادھا ایک گلاس میں پانی لے آئی۔ سیوک جی نے دوا پلا کر کہا۔ "اب میں جاتا ہوں کل پھر آؤں گا"

مہیش نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا بھگوان تمھیں بنائے رکھیں بیٹا!"

(۵)

مہیش کے جسم کا درد تو اسی دن غائب ہو گیا اور بخار بھی تیسرے دن جاتا رہا۔ سیوک جی روزانہ ان کے گھر پر جا کر دوا

[redacted]

پلایا کرے۔ طبیعت سنبھل جانے پر مہیش کے دل میں سیوک جی کی بڑی فنبت ہو گئی۔ سیوک جی کی باتیں مہیش کو امرت کی طرح معلوم ہوتی تھیں وہ بنیا سے گھبرا چکے تھے لیکن سیوک جی کو پا کر ان کا غم غلط ہو گیا مگر کتنے دنوں کے لئے ؟

ایک دن مہیش نے سیوک جی سے کہا۔ " بیٹا ہم تمھارے بڑے احسان مند ہیں۔ ہمارے کون تھا جو ہماری اتنی خدمت اور دیکھ بھال کرتا۔ مجکو تو پورا یقین تھا کہ اب میں نہ بچوں گا مگر تم نے آکر میری جان بچالی۔ ہائے میں بڑا بدقسمت ہوں جب مجھے اپنی معصوم بچی کا خیال آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ میرے بعد اس کا کیا حال ہوگا تو کلیجہ کانپ اٹھتا ہے " یہ کہہ کر مہیش نے رادھا کی شادی کا مفصل حال سنا دیا۔ مہیش کی باتیں سنکر سیوک جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

تھوڑی دور پر رادھا بیٹھی ہوئی یہ سب باتیں سن رہی تھی سیوک جی نے بڑی حسرت بھری نظروں سے رادھا کی طرف دیکھا رادھا نے سرکا آنچل سرکا کر ایک لمبی سانس لی۔

سیوک جی نے کہا۔ "پنڈت رام پرتاب کے لڑکے سورج پرشاد کو کبھی آپ نے رادھا کے بارے میں کوئی خط نہیں لکھا"

" نہیں بیٹا میں نے کبھی نہیں لکھا "

" آپ کو ضرور لکھنا چاہئے تھا "

کچھ دیر کے بعد سیوک جی اٹھ کر چلے گئے۔ رادھا گھر کے کام میں لگ گئی اس کی نظروں کے سامنے اب سیوک جی کی موہنی صورت ہر وقت رہنے لگی اس کو سیوک جی کی پیاری باتیں یاد آتیں وہ سوچتی "سیوک جی" کتنے نیک اور کتنے رحم دل ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت ان کی باتیں سنا کروں

ایک دن سیوک جی گاؤں سے کہیں باہر چلے گئے۔ رادھا کا جی اداس ہو گیا کام میں اس کا دل نہ لگا۔ بار بار گھر جا کر وہ چاروں طرف دیکھتی اور پھر کسی کو نہ دیکھ کر واپس آجاتی۔ کام کرتے کرتے وہ چونک اٹھتی اسے ایسا معلوم ہوتا گویا سیوک جی آگئے ہیں

جب تین دن ہو گئے اور سیوک جی نہ آئے تو رادھا کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی جب تک اس نے سیوک جی کو دیکھا نہ تھا اسے کسی بات کی تکلیف نہ تھی اس قسم کی اسے کبھی بے چینی نہ ہوئی تھی لیکن اب وہ سیوک جی کو غیر نہیں اپنا سمجھتی ہے۔ جب مہیش کہتے " معلوم ہوتا ہے کہ سیوک جی اب نہ آئیں گے افسوس وہ جاتے وقت کچھ بھی نہ کہہ گئے" تو رادھا کا دل بیتاب ہو جاتا وہ ایسا اداس ہو جاتی گویا اس کی جان سے زیادہ پیاری چیز کھو گئی ہے

دو دن اور گذر گئے رادھا کی پریشانی اور بڑھ گئی اس نے یہ نہ سوچا کہ سیوک جی حقیقت میں اپنے نہیں پرائے ہیں وہ ایک دن رلا کر چلے جائیں گے

ایک دن سہ پہر کے وقت گھر کے آنگن میں رادھا اداس بیٹھی تھی کہ سیوک جی آگئے۔ رادھا فوراً اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ مہیش کو پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹے

دیکھ کر سیوک جی نے رادھا سے پوچھا ۔ "کیا پنڈت جی سو رہے ہیں" رادھا کچھ جواب نہ دے سکی تھوڑی دیر کے بعد پھر سیوک جی نے اپنا سوال دھرایا۔ اب رادھا نے جس طرح سے بھی ہوسکا بڑی مشکل سے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور سیوک جی کی طرف دیکھ کر ایک عجیب انداز میں بولی۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے"

"ایک دوسرے گاؤں میں سبھا ہونے والی تھی وہیں گیا تھا"

"جاتے وقت کچھ کہہ بھی نہ گئے۔ اتنے دنوں میں نہ جانے۔ . . . . . ." یکبارگی رادھا کو اپنی کمزوری کا خیال آگیا آہ اسکی زبان سے کیا نکلنے والا تھا اس نے سنبھل کر کہا۔ "پتاجی برابر آپ کو یاد کیا کرتے تھے"

سیوک جی نے بے ساختہ کہا ۔ "اور آپ ؟"

رادھا نے مسکرا کر اپنا سر جھکالیا شرم و لحاظ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکی

سیوک جی نے پوچھا۔ "کیا پنڈت جی ابھی نہ جاگیں گے ؟"

رادھا کسی اور عالم میں تھی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں اس کے کانوں میں بار بار کوئی کہہ رہا تھا ۔ "اور آپ !"

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل اسی وقت پھر آؤں گا" یہ کہکر سیوک جی چلے گئے اور دوسرے دن آکر مہیش سے ملے۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے رادھا وہیں کچھ دور پر بیٹھی باتیں سن رہی تھی آخر میں سیوک جی نے مہیش سے کہا ۔ "پنڈت جی آج میں چلا جاؤں گا۔ میری وجہ سے اگر آپ کو کچھ تکلیف پہونچی ہو تو معاف کیجیے گا"

سیوک جی کی بات سنکر رادھا کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ مہیش نے کہا۔ "بیٹا ! تم نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے اب میں تمہیں کہاں دیکھوں گا۔ تم کو پاکر میں اپنا دکھ بھول گیا تھا اب کون میری مدد کرے گا۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ابھی سے میری آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ تم تو اب جا ہی رہے ہو اچھا جاؤ پرماتما تمہیں سکھی رکھیں لیکن مجھے کوئی ایسی بات تو کہتے جاؤ جس سے دل کو کچھ ڈھارس ہو"

مہیش کی باتیں سنکر سیوک جی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں انھوں نے کہا۔ "آپ گھبرائیے نہیں میں خود روپ نگر جاکر سورج پرشاد کو اچھی طرح سمجھاؤں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ میری بات مان لیں گے اور فوراً آپ کی سیوا میں آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اب تک کوئی دوسرا بیاہ نہیں کیا وہ میری ہی طرح مہاتما گاندھی کے بھگت ہیں اور دیش کی سیوا میں لگے ہوئے ہیں ۔"

چلتے وقت سیوک جی نے رادھا کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "آج میں جا رہا ہوں اگر میری وجہ سے کوئی تکلیف پہونچی ہو تو معاف کیجئگا" رادھا کے گالوں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک پڑیں آواز بند ہوگئی اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ سیوک جی رخصت ہوگئے مہیش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے رادھا بھی پتا کی چارپائی سے لگ کر آنسو بہانے لگی

(۶)

سیوک جی کو پاکر مہیش کو جو اطمینان قلب حاصل ہوا تھا وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا وہ پھر رنج و غم کی زندگی بسر کرنے لگے رادھا کی دنیا تاریک ہوگئی وہ دن میں کئی بار چونک اٹھتی رات کی نیند حرام ہوگئی جس سے خواب میں بھی سیوک جی سے ملنے کا سہارا نہ رہا۔ اس نے پہلے سمجھا تھا کہ دو چار دن میں وہ مہیش کو بھول جائے گی لیکن اس کے برخلاف اس کی بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ جب اس کو خیال آتا کہ اب سیوک جی کبھی واپس نہ آئیں گے تو وہ سوچنے لگتی۔ "وہ ایک پردیسی مسافر تھے کچھ دن یہاں رہ کر اپنی میٹھی باتوں سے سب کو اپنا بنالیا اور جب جی چاہا یہاں سے چلے گئے ان کا اور میرا کیا تعلق میں ان کے لئے کیوں بے کل ہو رہی ہوں مجھے تو بھگوان نے ابھاگن بنایا ہے میں سہاگن ہونے کی کیوں امید رکھتی ہوں؟"

وہ اسی قسم کی باتیں سوچ کر اپنے دل کو بہت سمجھاتی کہ اب وہ سیوک جی کو نہ یاد کرے گی لیکن اس کا دل پھر مچل جاتا اور سیوک جی کی یاد پھر ستانے لگتی اور وہ سوچتی۔۔۔۔ "ہائے میں اس پاپی جیرا کو کیا کروں۔ جو اُن کو بھولتا ہی نہیں آخر وہ میرے کون تھے جس کے تھے اس کے یہاں چلے گئے۔ جو چیز اپنی نہیں ہے اس کے لئے بیکار ہائے ہائے کیسی؟ ان کے ساتھ محبت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ میں نے ان کے ساتھ کیوں محبت کی۔ کیا میرے ساتھ جو کوئی اچھی طرح سے باتیں کرے گا مجھے قدر و عزت کی نظر سے دیکھے گا اُسے میں پیار کرنے لگوں گی۔ یا جو کوئی پتا جی کی مدد کرے گا مجھے اس کے ساتھ اتنی محبت ہو جائے گی کہ اسکو بغیر دیکھے مجھسے رہا نہ جائے گا۔ ایک غیر شخص کی میٹھی باتیں سننے کے لئے میں کیوں تڑپ رہی ہوں۔ کسی خوبصورت آدمی سے جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ ابھاگن کی قسمت میں تو عمر دکھ ہی نہیں پھر یہ مفت کی بے چینی کیسی؟" اسی طرح کی باتیں سوچ کر رادھا اپنے دل کو کوستی رہتی

پھر بھی اس کا دل سیوک جی کی یاد سے غافل نہ ہوتا وہ بار بار اپنے دل سے پوچھتی۔ "آخر وہ میرے پاس کیوں آئے تھے۔ میں بد قسمت تھی۔ فلک کی ستائی تھی پریشان حال اور دکھیا تھی لیکن اپنے قسمت پر شاکر تھی ان سے اپنا دکھڑا رونے نہیں گئی تھی۔ میں ان کو بلانے تو نہیں گئی تھی پھر وہ میرے یہاں کیوں آئے ان کو کس نے بلایا تھا۔ اور جب آئے ایک دفعہ نہیں بار بار آئے تو پھر کیوں چلے گئے؟" رادھا محبت کی آگ میں رات دن جلنے لگی۔ کوئی اس کے دل کی لگی کو بجھانے والا نہ تھا

ایک دن شام کے وقت رادھا اپنے باپ کے سر میں لگانے کے لئے کوئی دوا پیس رہی تھی اتنے میں پڑوس کی ایک عورت نے گھر میں آکر کہا۔۔۔۔ "روپ نگر سے سورج پرشاد آئے ہیں۔ پالکی۔ گھوڑا گاڑی اور کئی آدمی اون کے ساتھ ہیں"

رادھا گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ مہیش بھی اپنی چارپائی سے اُٹھے لالٹین لے کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ایک کھدر پوش جوان نے دوڑ کر مہیش کے چرن چھو لئے۔ رادھا حیرت زدہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ مہیش

نے لالٹین اوپر اٹھا کر لونوار دکو بڑی حیرت اور غور سے دیکھا اور بصد جوش مسرت میں چلا اٹھے۔ " بیٹا! تم نے میرے ساتھ یہ چھل کیوں کیا ؟"

جواب میں سوشیل پرشاد یا سیوک جی نے رادھا کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور رادھا سر کا آنچل سر کا کر لجاتی ہوئی کوٹھری میں گھس گئی ——

اعظم کریوی

(ماخوذ)

شہنشاہیت اور اُس کا مستقبل

شہنشاہیت یعنی ایک مُلک و قوم کا دوسرے ملک و قوم پر حکومت کرنا، تاریخ انسانی کی ایک قدیم معصیت ہی جس طرح ایک جماعت کے چند برسر اقتدار افراد، اپنے ملک و قوم کے دوسرے افراد کو غلام بنانے اور رکھنے کے لئے ہمیشہ کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک ملک و قوم کے چند منظم افراد، اپنے ملک کے تمام ذرایع کے ساتھ اس بات کی بھی سعی کرتے رہے ہیں کہ کسی طرح دوسرے ملک و قوم کے کل افراد کو اپنا محکوم بنائیں اور اُن کے ذرایع دولت پر تصرف حاصل کرکے اپنے اسباب عیش و تنعم میں اور اضافہ کریں۔ اور جس طرح عہد جدید میں، حریت، مساوات اور اخوت کے احساس نے .... ملکوں کی حکومتوں میں انقلاب پیدا کرکے، دیمقراطی طریقہ حکومت کی ترقی پانے کے امکانات کو قوی کر دیا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی تعلقات میں انھیں اصولوں کے طلوع نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے شہنشاہیت کی بنیادیں آج متزلزل نظر آرہی ہیں اور شہنشاہیت پسند طبقہ، رائے عامہ کی عدالت میں، ایک کمزور مدعا علیہ کی صورت سے کھڑا ہوا ہے

ایک مُلک کی سرزمین میں پیدا ہونا، اس کی غیر آباد زمینوں کو جنگلوں سے صاف کرکے اُنھیں آبادی و زراعت کے لایق بنانا، اور ان پر محنت ... جاری رکھتے ہوئے، تمدن و تہذیب کی توسیع کے امکانات کو پیدا کرنا، اگر کسی آبادی کو ایک مُلک کا حقدار بنا سکتے ہیں اور اگر دنیا، انصاف پرکار بند ہونا چاہتی ہے اور جس کی لاٹھی اسکی بھینس کے فلسفہ پر عمل کرکے، کمزور جماعتوں کو طاقتور جماعتوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں چاہتی، تو شہنشاہیت کے لئے یہ ناممکن ہی کہ وہ محض زیادہ طاقت کے گھمنڈ پر، اب دنیا میں ایک لمحہ کے لئے بھی قایم رہ سکے۔ گو یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ باہمی منفعت کے اصول پر دو ملکوں کی آبادی ایک دوسرے کے منافع میں مساوی طور پر شریک ہو جائے یا مستقل طور پر ایک ملک کی کچھ آبادی، دوسرے ملک میں مساوات کے تعلقات کو قایم رکھتے ہوئے منتقل ہو جائے

دنیا سخت تاریک عہدوں سے گذر چکی ہے اور ایک ملک و قوم کے افراد نے اکثر بہت ناروا سلوک دوسرے ملک و قوم کے ساتھ جائز رکھے ہیں۔ دنیا میں چند غیر متمدن اقوام ایسی بھی گذری ہیں جو مردم خوار تھیں اور جن کے درمیان کسی اجنبی جماعت کے افراد کا پہونچ جانا، مستقل جشن ضیافت کا ایک اذنِ عام ہوتا ہے یہ انسانی بہیمیت اور درندگی کی انتہائی شکل تھی۔ لیکن تاریخ میں برابر، آرین اور شودر، یہود و غیر یہود۔ آقا و غلام، کافر و دیندار، عرب و عجم، آقا و غلام، مومن و کافر، یورپین اور نیٹو، گورا اور کالا کی جو تفریق نمایاں طور پر نظر آتی ہے یہ سب، اسی جذبہ عہد تاریک کے مختلف مظاہر ہیں۔ اور اس دورِ علم و روشنی میں قطعاً بے محل معلوم ہوتے ہیں اور ان کا فنا ہونا لازمی ہے

اسی طرح ایک ملک و قوم کے افراد نے جو دوسری قوم و ملک پر حملے کئے ہیں، اُن کی خونیں داستانیں بھی عبرت کا ایک مرقع ہیں۔ چنگیز، ہلاکو، محمود و تیمور، سکندر، ہنی بال سے لے کر، سیزر، نپولین و قیصر تک سب بہ تفریق مراتب دوسرے ممالک اور اقوام کے پیدائشی حقوق کے غصب کرنے میں بڑے جری اور دلیر تھے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ اُن کے حملوں میں کس حد تک محض تمنائے خونریزی و غارتگری، جوشِ تخریب و تخریب، نشۂ قوت و اقتدار، طمعِ زر و جواہر، شوقِ جستجو، مقابلہ و حرص ملک گیری اور والہانہ عقیدت مذہبی شامل تھی اور کس حد تک کس حملہ آور کی یورش نتیجہ کے لحاظ سے مفتوح ملک کے لئے مفید یا کم نقصان دہ ثابت ہوئی۔ یہاں صرف واقعۂ غصبِ ملک و دولتِ ملک کا تذکرہ مقصود ہے

شہنشاہیت کی شکل، ملکوں کے مختلف طرزِ حکومت کے اعتبار سے مختلف رہی ہے۔ ایک ملک کے طرزِ حکومت کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ جس میں ایک فردِ واحد مطلق العنان فرمانروا ہو یعنی دورِ بادشاہت۔ تاریخ میں یہ طرزِ حکومت بہت قدیم، عالمگیر، بہیم اور دیرپا نظر آتا ہے۔ دوسرا طرزِ حکومت وہ ہے جس میں ایک جماعت کے چند افراد حکومت پر قبضہ کر لیں یعنی دورِ امارت۔ اور تیسرا وہ کہ جس میں آبادی کے کثیر حصہ کی رائے و ایما سے معاملاتِ حکومت طے کیے جائیں یعنی دورِ دیمقراطی۔ موخر الذکر کا وجود تاریخ عالم کا ایک جدید واقعہ ہے گو محدود طبقوں میں اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تاریخ کا وجود۔۔۔ شہنشاہیت ان تینوں دورِ حکومت میں قائم ہوئی ہے اور کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر دور میں، جیسا کہ آئندہ ظاہر کیا جائے گا، اس کے منافع کی تقسیم مختلف انداز میں ہوتی ہے

اسی طرح شہنشاہیت سے جو منافع حاصل کئے جاتے ہیں ان کی شکل مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے گو مقصود ہمیشہ یہی رہا ہے کہ محکوم ملک سے، کسی نہ کسی طریقہ پر، خراج وصول کیا جائے۔ خراج، قدیم زمانے میں، جب کہ وسائل آمد و رفت و خبر رسانی بہت نامکمل تھے، اور صنعت و تجارت اپنے ابتدائی مدارج ارتقاء طے کر رہی تھیں، اور کافی بالذات طریقہ معیشت پر ملک و قوم میں زیادہ تر کاربند تھیں، عام طور پر، زر و جواہر، عیش و عشرت کے بیش بہا اور نادر تحائف اور غلام و کنیز کی خدمت کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ گو عہدِ جدید کی ترقیوں کے ساتھ، جیسا کہ آئندہ ظاہر کیا جائے گا اسکی شکل مختلف ہو گئی ہے

ہر عہد و زمانہ میں، شہنشاہیت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ محکوم ملک کے نظامِ حکومت کو اپنی جگہ پر قائم رکھا جائے اور اسے فاتح ملک کے نظام میں بلاواسطہ شریک نہ کیا جائے اور صرف مقررہ خراج اس سے لیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی مخصوص حکومت کو مٹا کر، اپنی طرف سے ایک حکومت اس پر متعین کر دی جائے۔ آخر الذکر صورت میں تین اور شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے نظمِ حکومت میں اس مفتوح علاقہ کو بالکل ضم کر لیا جائے۔ اور مفتوح آدمی کو وہی حقوق و آزادی دے دی جائے یا قیود و پابندیاں عاید کر دی جائیں جن کا فاتح ملک میں رواج ہو۔ اور اس طرح اسے بالکل فاتح ملک کی آبادی کی سطح پر لے آیا جائے۔ شہنشاہیت کے مسکن میں بھی کوئی پابندی نہ ہو۔ شہنشاہیت کا مرکز، فاتح اور مفتوح دونوں ممالک میں سے، جس ملک میں چاہے رہ سکے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ مفتوح علاقہ کو اپنے ملک میں ضم نہ کیا جائے بلکہ ایسا نیا

طریقۂ حکومت اُس کی آبادی پر عائد کیا جائے جو بالکل یا بہت زیادہ فاتح ملک کے طریقہ سے مشابہ ہو۔ لیکن فاتح اور مفتوح ملک میں فرق اس حیثیت سے باقی رہے کہ شہنشاہیت کا مسکن صرف فاتح ملک میں رہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ ایک نیا طریقۂ حکومت، مفتوح ملک پر عاید کیا جائے اور وہ فاتح ملک کے طریقہ سے مختلف، اور مفتوح ملک کے پرانے طریقۂ حکومت سے مشابہ ہو اور اس میں مفتوح ملک کو وہ حقوق و آزادی حاصل نہ ہوں جو فاتح ملک کی آبادی کو حاصل ہیں۔ لیکن فاتح ملک کے افراد کو مفتوح ملک میں وہی حقوق حاصل ہوں جو انھیں فاتح ملک میں حاصل تھے۔ اور شہنشاہیت کا مسکن فاتح ملک رہے اور اس طرح دو قوانین اور دو اصول کے ماتحت شہنشاہیت فاتح اور مفتوح ملک میں اپنا عمل کرنے لگے

مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں، شہنشاہیت کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے صرف دو صورتیں ہوا کرتی تھیں یعنی یا تو مفتوح ملک کی موجودہ حکومتوں کو برقرار رکھا جاتا تھا اور اُن سے مقررہ خراج لیا جاتا تھا یا مفتوح ملک کو اپنے ملک میں ضم کر لیا جاتا تھا اور شہنشاہیت کا مرکز کبھی فاتح ملک میں اور کبھی جدید مقبوضہ میں رکھا جاتا تھا۔ شہنشاہیت کے منافع زر و جواہر، بیش قیمت ہدایا اور تحائف اور غلام و کنیز خاص بادشاہ کی ذات کے لئے ہوتے تھے۔ مگر قدرتی طور پر جس ملک میں، شہنشاہ پیدا ہوتا تھا، پرورش پاتا تھا، جہاں کے لوگوں، زبان، مذہب، رسم و رواج اور روایات سے اُسے سابقہ پڑتا تھا، ان کی طرف اس کی ہمدردی اور تعلق زیادہ رہتا تھا۔ اسی ملک کے لوگ اس کے زیادہ تر مصاحب، مقرب اور معتمد ہوتے تھے اور انھیں کی معیت میں اُسے یک جہتی و یگانگت اور لطف و دلبستگی حاصل ہوتی تھی اور انھیں کی امداد پر ضرورت کے وقت وہ زیادہ بھروسہ بھی کرتا تھا اور اس لیے اس جماعت کے نفع و آرام کو وہ اپنے مفتوحہ ممالک کے لوگوں کے مقابلہ میں مقدم رکھتا تھا۔ اس طرح ایک ایسی بلند اور معزز جماعت پیدا ہو جاتی تھی جسے دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں زیادہ منافع اور حقوق حاصل ہوتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے زیادہ تر انھیں کے لئے وقف ہوتے تھے فوج میں ان کا دستہ ایک وسیع اور ممتاز مرتبہ رکھتا تھا۔ اور یہ جماعت، دوسری جماعتوں کو اپنے سے حقیر اور کم مایہ سمجھ کر اُن سے خدمت لینا اپنا فطری حق سمجھتی تھی۔ یہ جماعت اپنی مخصوص زبان، مذہب، تہذیب و تمدن و روایات پر قائم رہنا، فاتحانہ شان کا جزو لازم سمجھتی تھی۔ اور مفتوح ملک کے باشندے، ممتاز بننے کے لئے، وہ شہنشاہ کی خوشنودی کے لئے انھیں کی نقل کرتے تھے

شہنشاہیتوں سے محکوم قوموں کو، بعض صورتوں میں، منافع بھی حاصل ہوئے ہیں۔ قیام امن و امان، عدل و انصاف اور اُن خصوصیات حکومت سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی جو اس کے ابتدائی اور غیر منفک لوازمات ہیں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شہنشاہیتوں کے بعض حامیوں نے سڑکیں، نہریں، سرائیں، باغات، مدارس، شفاخانے، خیرات خانے وغیرہ بھی جاری کئے اور علم و فضل، صنعت و حرفت، شاعری، صناعی و عمارت سازی وغیرہ کی مربیانہ سرپرستی بھی کی اور اس طرح تہذیب و تمدن کی شمع کو روشن رکھا۔ لیکن اس کے باوجود مفتوح ملک کے افراد کو وہ آزادی فکر و عمل اور فارغ البالی اور

ملکی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے مواقع کبھی نصیب نہ ہو سکے جس کی انھیں قدرتاً ہمیشہ تمنا رہی۔ ان کے علاوہ عام طور پر، مطلق الانسان شہنشاہیتوں کے مظالم، ان کی سفاکی کی خونیں داستانیں، مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے واقعات، محاصل کی زیادتی اور فرائض حکومت سے غفلت کا جب خیال کیا جاتا ہے تو مطلق العنان بادشاہوں کی شہنشاہیت بصورت مجموعی ایک ناقابل عفو معصیت نظر آتی ہے جس سے انسانیت کی پیشانی ہمیشہ داغدار رہے گی

قدیم عہد کے دور امارت اور دور دیمقراطی میں شہنشاہیت کا مسکن فاتح ممالک ہوا کرتا تھا لیکن اور اعتبارات سے وہ دور بادشاہت کی شہنشاہیت سے بالکل مشابہ ہوتا تھا۔ فرق صرف اسقدر رہ جاتا تھا کہ شہنشاہیت کے وہ منافع جو دور بادشاہت میں صرف بادشاہ کی ذات کے لئے مخصوص ہوتے تھے اول الذکر صورت میں امراء کے تمام گروہ کے درمیان اور آخر الذکر صورت میں کل دیمقراطی آبادی کے درمیان تقسیم کئے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ یونانی دیمقراطیہ کے زوال کا سبب، براہ راست، غلاموں کی کثیر آبادی قرار دی جاتی ہے جس سے کہ محنت و مشقت کے اپنے تمام کام، اہل یونان انجام دلواتے تھے۔ رومائی دیمقراطی شہنشاہیت اپنی خوبیوں کی تکمیل کے لحاظ سے، عہد قدیم کی بہترین شہنشاہیت قرار دی جاتی ہے اور اس میں تمام وہ خصوصیات پائی جاتی تھیں جن کا بیان بہترین بادشاہی شہنشاہیت کے ضمن میں کیا جا چکا ہے

عہد جدید سے ایک نئی شہنشاہیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں تجارت کا عنصر غالب ہے۔ عہد جدید کی ابتداء میں، جب ترکی سلطنت کی توسیع نے، مشرق کی تجارت کی راہوں کو، یورپ کی تجارت کرنے والی قوموں کے لئے مسدود کر دیا تو انھیں نئی بحری راہوں کی جستجو ہوئی اور اس تلاش میں اُن کے ملاحوں نے ایک نیا ملک امریکہ دریافت کر لیا۔ اس کے بعد جہاز رانی اور نئی راہوں کی جستجو اور تجارت کا شوق ایک دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا اور یورپ کی ہر قوم نے اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کر کے اپنا مال اور جہاز سمندر کے راستے مشرقی ممالک میں بھیجنا شروع کر دیئے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ، جدید براعظم میں نوآبادی بسانے کا خیال و عمل بھی ترقی کرتا رہا۔ یہ خیال بڑھتے بڑھتے، ایشیا میں مقبوضات پیدا کرنے کی حد تک ترقی کر گیا۔ اور مقبوضات و تجارت کی جد و جہد میں یورپ کی مختلف قومیں ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کرنے لگیں جس میں آخرکار، جزائر برطانیہ کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ... اس کی حیثیت دنیا کی سب سے ... شہنشاہیت ہونے کے اعتبار سے بالکل مسلم ہو گئی۔ برطانیہ، بلا شرکت غیرے سمندروں کا حکمراں ہو گیا اور اس کے جنگی بیڑے ... بن گئے

ابتداء چونکہ دنیا کے ذرائع آمد و رفت و خبر رسانی بہت غیر ترقی یافتہ تھے اس لئے صرف بیش قیمت اور ہلکی اشیاء ایک مقام سے ... عام کی ... منتقل کی جاتی تھیں اور مشرق سے زیادہ تر بیش قیمت مصنوعات برآمد ہوتی تھیں۔ لیکن انگلستان میں، دخانی ... ہے اور ... کے کوئلہ کو ملا کر فولاد بنانے کی ایجادوں اور دخانی انجن کی دریافت، اور عام صنعتی انقلاب کے بعد، ذرائع آمد ... و رسائل، اور صنعت و حرفت میں بہت ترقی ہوئی اور برطانیہ اور اس کے مقبوضات کی تجارت میں اضافہ اور اس کی ... میں انقلاب ہو گیا۔ برطانیہ کے کارخانوں کی اہلیت پیداوار میں ہر صنعتی ایجاد کے بعد اضافہ ہونے لگا اور اُن کے مالکوں کو

ہر مرتبہ یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اپنے مال کی نکاسی کے لئے روز افزوں منڈیاں تلاش کریں۔ اور اس غرض کے حصول کے لئے انھوں نے اپنی تجارتی کمپنی کے ملازموں کو، جو اب ہندوستان، امریکہ و اسٹریلیا میں آراضی یا مقبوضات حاصل کرکے سلطنتیں قائم کر رہے تھے، اس بات کی ہدایت کی ضرورت ہے۔ وہ اس کی کہ اپنے مفتوحہ ممالک کی صنعتوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں اور مفتوحہ ممالک کی آبادی کو محض اشیاء خوردنی اور اشیاء خام کی پیداوار میں مصروف رکھیں، اور مصنوعات کی خرید کے لئے بالکل فاتح ملک کا پابند کریں۔ اس حکمت عملی سے اس شہنشاہیت کا آغاز ہوا جسے تجارتی یا صنعتی شہنشاہیت کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ اس شہنشاہیت میں سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی آواز اب تک بہت موثر رہی ہے اس لئے اگر اسے سرمایہ داروں کی شہنشاہیت کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ اس شہنشاہیت کی ابتدا دور مشینری یعنی دور سرمایہ کے آغاز سے، اور مشینری کے عمل کی اس خصوصیت سے ہوتی ہے کہ جتنی بڑی مشین ہوگی یعنی جتنا زیادہ اس میں تقسیم عمل تکمیل کو پہونچا ہوا ہوگا اتنی ہی زیادہ مشین سے زیادہ تعداد و مقدار میں پیداوار حاصل کی جاسکے گی اور اتنی ہی کم لاگت فی شئے مصنوعہ پر مالک مشین کو برداشت کرنا پڑے گی۔ اور اسی تناسب سے اس کے منافع میں اضافہ ہوگا۔ لیکن مصنوعات کی جب تک مانگ نہ ہو ان کو زیادہ تعداد و مقدار میں بنانا لاحاصل ہے، اور مانگ کا اس وقت تک پیدا کرنا مشکل ہے جب تک دوسرے ملک کی اسی قسم کی مصنوعات کو تباہ نہ کیا جائے اور ان کو صرف اپنے ملک کی مصنوعات خریدنے کے لئے پابند نہ کیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان ملکوں کی حکومتوں میں اثر و اقتدار قائم نہ کیا جائے یا ان ملکوں پر براہ راست حکومت نہ کی جائے اور اس طرح تجارت اور مال کی نقل و حرکت میں سہولت اور ریاست کی مربیانہ سرپرستی پیدا نہ کی جائے۔ اس لئے تجارت کے لئے ملکوں کا فتح کرنا یا آباد کرنا ضروری ہوا۔ علاوہ بریں ضرورت سے زیادہ ملکی سرمایہ کو بیرونی ممالک کے کاروبار میں محفوظ طریقہ پر لگانے کے لئے بھی یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان ممالک پر کسی نہ کسی نہج سے قبضہ کیا جائے۔ تیسرے اپنے جہازوں کے لئے سامان اور مسافر مہیا کرنے کے لئے بھی مقبوضات کا رکھنا ضروری خیال کیا گیا۔ چوتھے اپنی زاید از ضرورت اور بے روزگار آبادی کے لئے عمدہ شاہی عہدے ... کے لئے بھی ایک مفتوح ملک کا ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ اور اخیر میں اشیاء خام اور اشیاء خوردنی کی لازمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وسیع زرعی ممالک پر قبضہ از بس ضروری ہوگیا۔ ان تمام وجوہ و اسباب کی بنا پر تجارتی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت رفتہ رفتہ معرض وجود میں آئی۔ اس شہنشاہیت سے فائدے، اب تک زیادہ تر، سرمایہ اور تجارت کے منافع کی شکل میں، سرمایہ دار اور متوسط طبقہ کی آبادی اٹھاتی رہی۔ اور انھیں طبقوں کے نوجوان زیادہ تر محکوم ممالک کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ لیکن اب مزدور پیشہ طبقہ اپنے روز افزوں اقتدار کے ساتھ، اس کے فائدوں میں شرکت کا دعویدار ہوتا جا رہا ہے۔ اور اپنی بے روزگاری کو رفع کرنے کے لئے، شہنشاہیت کے اقتدار سے منڈیاں پیدا کرنا اپنی پالیسی کا ایک عنصر سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں، مزدوروں کی کثیر آبادی جو برطانیہ میں اب اسقدر مرفہ الحال ہوگئی ہے کہ وہ بنکوں میں اپنا روپیہ جمع کرتی ہے اور یہی سرمایہ اندرون اور بیرون ممالک ... میں لگایا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ کے منافع میں بھی مزدوروں کی شرکت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ان تمام حالات ... مزدوروں کی شہنشاہیت رونما ہو رہی ہے۔ مزدور طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد اب مفتوح ممالک کے اعلیٰ عہدوں پر ...

لگیں گے اور موجودہ شہنشاہیت کو پورا اقتدار ، دیما قریطی شہنشاہیتوں کی طرح سے حاصل ہوجائے گا

اس ابتدائی بیان کے بعد اب آئیے یہ دیکھیں کہ برطانیہ کی شہنشاہیت کے اجزا کی تنظیم اُن کی مختلف نسلی اور مقامی خصوصیات کی بنا پر کن مختلف طریقوں پر ہوئی ہے۔ اس تمام وسیع مملکت کی وحدت کی علت اعظم تاج برطانیہ کا وجود ہے۔ جس کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان سلطنت برطانیہ کا ہر رکن کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تین بنیادی اصول اور ہیں جو تمام اجزائے سلطنت برطانیہ پر عائد ہی سمجھے جاتے ہیں اول اصول یہ ہے کہ اپنی حکومت آپ کرو (سلف گورنمنٹ) دوسرا اصول ہے اپنا خرچ آپ برداشت کرو (سلف سپورٹ) اور تیسرا اصول ہے اپنی مدافعت آپ کرو (سلف ڈفنس) ان اصولوں پر سلطنت کے کچھ حصوں میں زیادہ ... کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے اور کچھ ایسے ممالک ہیں جن سے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ابھی اپنے سیاسی ارتقا کی تمام منزلیں طے نہیں کی ہیں اس لیے وہاں ان اصولوں پر کمی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا ہے۔ اور کچھ ممالک میں عارضی طور پر خاص وجوہ کی بنا پر ان اصولوں پر ... کر دیا جاتا ہے اور بعض ایسے ممالک بھی ہیں ... مدافعت کی ذمہ داری ہے ، یا کل سلطنت ... نظر یہ کہ قبضہ کیا گیا ہے اور ان ممالک میں مندرجہ بالا اصولوں پر بالکل عملدرآمد نہیں ہوتا

جزائر برطانیہ ، تاج برطانیہ کا مسکن اور نسل برطانوی کا مرجع ہونے کی حیثیت سے تمام شہنشاہیت برطانیہ میں امتیازی ... رکھتے ہیں انھیں شہنشاہیت کا بجا طور پر دل و دماغ کہا جا سکتا ہے۔ جزائر شہنشاہیت کی مملکت میں پچاس حکومتیں ہیں اور ان کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے کہ ان میں تین طرح کی مستعمرات ہیں اور باقی سب مقبوضات ہیں تین طرح کے مستعمرات کی تقسیم اس طریقہ پر ہوتی ہے (۱) تاج برطانیہ کی مستعمرات (۲) ایسی مستعمرات جن میں قومی ادارے میں قوم کے نمائندے ہوتے ہیں لیکن جن کی جماعت عاملہ ان نمائندوں کی جوابدہ نہیں ہوتی (۳) ایسی مستعمرات جن میں قومی اداروں میں نمائندگی بھی ہوتی ہے اور جن کی جماعت عاملہ ان نمائندوں کی وساطت سے قوم کو جوابدہ ہوتی ہے ——— تاج برطانیہ کی مستعمرات ہیں اُن میں جزائر برطانیہ کی حکومت ہی قانون بناتی ہے اور حکومت کے عمال کو مقرر کرتی ہے ——— نمائندگی والی مستعمرات میں قانون بنانے کا حق قومی نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے لیکن قانون منسوخ کرنے کا حق تاج برطانیہ کو حاصل ہوتا ہے اور حکومت کا تقرر ، جزائر برطانیہ کی حکومت کرتی ہے ——— اور جواب دہ حکومتوں میں صرف منسوخ کرنے کا حق تاج کو حاصل ہوتا ہے ، باقی قانون بنانے اور حکومت کے عمال کے تقرر کے اختیارات (سوائے گورنر کے تقرر کے اختیار کے جسے تاج برطانیہ خود مقرر کرتا ہے) سب قوم کو حاصل ہوتے ہیں

... کی امتیازی خصوصیات عموماً یہ ہیں کہ اُن میں برطانوی نسل کے گورے رنگ کے آدمی آباد ہیں۔ جن کا تمدن و معاشرت سب جزائر برطانیہ یعنی حاکم حکومت سے بالکل مشابہ ہیں۔ اور اُن کی آبادی اور جزائر برطانیہ کی ... رشتے و تعلقات بھی برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں ان میں زیادہ طبقہ اس آبادی کا ہے جو اُن مہاجرین کی نسل ... ہوں نے اسباب معیشت کی تلاش میں جزائر برطانیہ کو خیرباد کہا تھا۔ اور نئی دنیا کو بسا کر اس میں تمدن و

ہر مرتبہ یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اپنے مال کی نکاسی کے لئے روز افزوں منڈیاں تلاش کریں۔ اور اس غرض کے حصول کے لئے انھوں نے اپنی تجارتی کمپنی کے ملازموں کو، جو اب ہندوستان، امریکہ و آسٹریلیا میں آراضی یا مقبوضات حاصل کرکے سلطنتیں قائم کر رہے تھے اس بات کی ہدایت کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے مفتوحہ ممالک کی صنعتوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں اور مفتوحہ ممالک کی آبادی کو محض اشیاء خوردنی اور اشیاء خام کی پیداوار میں مصروف رکھیں اور مصنوعات کی خرید کے لئے بالکل فاتح ملک کا پابند کرلیں۔ اس حکمت عملی سے اس شہنشاہیت کا آغاز ہوا جسے تجارتی یا صنعتی شہنشاہیت کہہ سکتے ہیں۔ اور چونکہ اس شہنشاہیت میں سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی آواز اب تک بہت موثر رہی ہے اس لئے اگر اسے سرمایہ داروں کی شہنشاہیت کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ اس شہنشاہیت کی ابتدا، دور مشینری یعنی دور سرمایہ کے آغاز سے ہوئی۔ دور مشینری کے عمل کی اس خصوصیت سے ہوتی ہے کہ جتنی بڑی مشین ہوگی یعنی جتنا زیادہ اس میں تقسیم عمل تکمیل کو پہونچا ہوا ہوگا۔ اسی قدر مشین سے زیادہ تعداد و مقدار میں پیداوار حاصل کی جاسکے گی اور اتنی ہی کم لاگت فی شئے مصنوعہ پر مالک مشین کو برداشت کرنا پڑے گی۔ اور اسی تناسب سے اس کے منافع میں اضافہ ہوگا۔ لیکن مصنوعات کی جب تک مانگ نہ ہو ان کو زیادہ تعداد و مقدار میں بنانا لاحاصل ہے اور مانگ کا اس وقت تک پیدا کرنا مشکل ہے جب تک دوسرے ملک کی اسی قسم کی مصنوعات کو تباہ نہ کیا جائے اور ان کو صرف اپنے ملک کی مصنوعات خریدنے کے لئے پابند نہ کیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان ملکوں کی حکومتوں میں اثر و اقتدار قائم نہ کیا جائے یا ان ملکوں پر براہ راست حکومت نہ کی جائے اور اس طرح تجارت اور مال کی نقل و حرکت میں سہولت اور ریاست کی مربیانہ سرپرستی پیدا نہ کی جائے۔ اس لئے تجارت کے لئے ملکوں کا فتح کرنا یا آباد کرنا ضروری ہوا علاوہ بریں ضرورت سے زیادہ ملکی سرمایہ کو بیرونی ممالک کے کاروبار میں محفوظ طریقہ پر لگانے کے لئے بھی یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان ممالک پر کسی نہ کسی نہج سے قبضہ کیا جائے۔ تیسرے اپنے جہازوں کے لئے سامان اور مسافر مہیا کرنے کے لئے بھی مقبوضات کا رکھنا ضروری خیال کیا گیا۔ چوتھے اپنی زاید از ضرورت اور بے روزگار آبادی کے لئے عمدہ شاہی عہدے تلاش کرنے کے لئے بھی ایک مفتوح ملک کا ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ اور اخیر میں اشیاء خام اور اشیاء خوردنی کی لازمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وسیع زرعی ممالک پر قبضہ ازبس ضروری ہوگیا۔ ان تمام وجوہ و اسباب کی بنا پر تجارتی سرمایہ دارانہ شہنشاہیت رفتہ رفتہ معرض وجود میں آئی۔ اس شہنشاہیت سے فایدے، اب تک زیادہ تر، سرمایہ اور تجارت کے منافع کی شکل میں، سرمایہ دار اور متوسط طبقہ کی آبادی اٹھاتی رہی۔ اور انھیں طبقوں کے نوجوان زیادہ تر محکوم ممالک کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ لیکن اب مزدور پیشہ طبقہ اپنے روز افزوں اقتدار کے ساتھ، اس کے فائدوں میں شرکت کا دعویدار ہوتا جارہا ہے۔ اور اپنی بے روزگاری کو رفع کرنے کے لئے، شہنشاہیت کے اقتدار سے منڈیاں پیدا کرنا اپنی پالیسی کا ایک عنصر سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں، مزدوروں کی کثیر آبادی جزائر برطانیہ میں اب اسقدر مرفہ الحال ہوگئی ہے کہ وہ بنکوں میں اپنا روپیہ جمع کرتی ہے اور یہی سرمایہ اندرون اور بیرون ملک کے کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ کے منافع میں بھی مزدوروں کی شرکت بڑھتی جارہی ہے۔ اور ان تمام حالات کے ماتحت اب مزدوروں کی شہنشاہیت رونما ہو رہی ہے۔ مزدور طبقہ کے تعلیمیافتہ افراد اب مفتوح ممالک کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فایز ہونے

لگیں گے اور موجودہ شہنشاہیت کو پورا اقتدار، دیگر قدیم شہنشاہیتوں کی طرح سے حاصل ہو جائے گا

اس ابتدائی بیان کے بعد اب آئیے یہ دیکھیں کہ برطانیہ کی شہنشاہیت کے اجزا کی تنظیم اُن کی مختلف نسلی اور مقامی خصوصیات کی بنا پر کن مختلف طریقوں پر ہوئی ہے۔ اس تمام وسیع مملکت کی وحدت کی علت اعظم تاج برطانیہ کا وجود ہے۔ جس کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان سلطنت برطانیہ کا ہر رکن کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تین بنیادی اصول اور ہیں جو تمام اجزائے سلطنت برطانیہ پر حاوی سمجھے جاتے ہیں اول اصول یہ ہے کہ اپنی حکومت آپ کرو (سلف گورنمنٹ) دوسرا اصول ہے اپنا خرچ آپ برداشت کرو (سلف سپورٹ) اور تیسرا اصول ہے اپنی مدافعت آپ کرو (سلف ڈفنس) ان اصولوں پر سلطنت کے کچھ حصوں میں زیادہ تکمیل کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے اور کچھ ایسے ممالک ہیں جن کو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ابھی اپنے سیاسی ارتقا کی تمام منزلیں طے نہیں کی ہیں اور اس لئے وہاں ان اصولوں پر کمی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا ہے۔ اور کچھ ممالک میں عارضی طور پر خاص وجوہ کی بنا پر ان اصولوں پر عمل ملتوی کر دیا جاتا ہے اور بعض ایسے ممالک بھی ہیں۔ جن پر مدافعت کی غرض سے، یا کل سلطنت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر قبضہ کیا گیا ہے اور ان ممالک میں مندرجہ بالا اصولوں پر بالکل عملدرآمد نہیں ہوتا

جزائر برطانیہ، تاج برطانیہ کا مسکن اور نسل برطانوی کا مبدا ہونے کی حیثیت سے تمام شہنشاہیت برطانیہ میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ انھیں شہنشاہیت کا بجا طور پر دل و دماغ کہا جا سکتا ہے۔ برطانوی شہنشاہیت کی مملکت میں پچاس حکومتیں شامل ہیں۔ اور ان کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے کہ ان میں تین طرح کی مستعمرات ہیں اور باقی سب مقبوضات ہیں۔ تین طرح کی مستعمرات کی تقسیم اس طریقہ پر ہوتی ہے (۱) تاج برطانیہ کی مستعمرات (۲) ایسی مستعمرات جن میں قومی اداروں میں قوم کے نمایندے ہوتے ہیں لیکن جن کی جماعت عاملہ ان نمایندوں کی جوابدہ نہیں ہوتی (۳) ایسی مستعمرات جن میں قومی اداروں میں قوم کی نمایندگی بھی ہوتی ہے اور جن کی جماعت عاملہ ان نمایندوں کی وساطت سے قوم کو جوابدہ ہوتی ہے —— تاج برطانیہ کی جو مستعمرات ہیں اُن میں جزائر برطانیہ کی حکومت ہی قانون بناتی ہے اور حکومت کے عمال کو مقرر کرتی ہے —— نمایندگی رکھنے والی مستعمرات میں قانون بنانے کا حق قومی نمایندوں کو حاصل ہوتا ہے لیکن قانون منسوخ کرنے کا حق تاج برطانیہ کو حاصل ہوتا ہے اور عمال حکومت کا تقرر، جزائر برطانیہ کی حکومت کرتی ہے —— اور جواب دہ حکومتوں میں صرف منسوخ کرنے کا حق تاج برطانیہ کو حاصل ہوتا ہے، باقی قانون بنانے اور حکومت کے عمال کے تقرر کے اختیارات (سوائے گورنر کے تقرر کے اختیار کے جسے کہ تاج برطانیہ خود مقرر کرتا ہے) سب قوم کو حاصل ہوتے ہیں

مستعمرات کی امتیازی خصوصیات عموماً یہ ہیں کہ اُن میں برطانوی نسل کے گورے رنگ کے آدمی آباد ہیں۔ جن کا تمدن و تہذیب، زبان و معاشرت سب جزائر برطانیہ یعنی حاکم حکومت سے بالکل مشابہ ہیں۔ اور اُن کی آبادی اور جزائر برطانیہ کی آبادی کے درمیان، رشتے و تعلقات بھی برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں ان میں زیادہ طبقہ اس آبادی کا ہے جو اُن مہاجرین کی نسل سے تعلق رکھتی ہے جنھوں نے اسباب معیشت کی تلاش میں جزائر برطانیہ کو خیر باد کہا تھا۔ اور نئی دنیا کو بسا کر اس میں تمدن د

تہذیب کی بنیاد قائم کی تھی۔ اس لئے مستعمرات کی حیثیت بالکل ایسی اولاد کی سی ہے جو والدین سے جدا ہو کر کسی دوسرے ملک میں آباد و خوشحال ہو جائے اور اپنے والدین سے تعلقات قائم رکھے۔ اُن کی اعانت اپنی ضرورت کی چیزوں میں چاہتی رہے اور خود جو کچھ خدمت کر سکتی ہے اُس سے دریغ نہ کرے۔ اس لئے شہنشاہیت کے مذموم پہلو مستعمرات میں بہت زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ علاوہ اس کے جب سے دول متحدہ امریکہ نے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لی ہے، مستعمرات کی طرف سے جزائر برطانیہ خائف رہنے لگی ہے اور اُن کی برابر دلجوئی کرتی رہتی ہے۔ ہوڈلس، چیمبرلین اور بارکن سے پہلے، اور امریکہ کی بغاوت کے ایام سے انیسویں صدی کے آخری ربع تک، مانچسٹر اسکول کے سیاسیین کا جو آزاد تجارت کے بھی حامی تھے برابر یہ عقیدہ رہا کہ تمام مستعمرات کا انجام آخر کار ان کی مکمل آزادی کی شکل میں رونما ہوگا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جزائر برطانیہ کی تمنا ہمیشہ یہی رہی کہ اس کی نوآبادیاں اور مستعمرات، صرف اشیاء خام اور اشیاء خوردنی کے پیدا کرنے اور بنانے میں مصروف رہیں اور مصنوعات قدیم ملک یعنی جزائر برطانیہ سے حاصل کرتے رہیں۔ نوآبادیوں کو چونکہ آبادی کی کمی زرخیز زمین کی فراوانی، اور مشینری کی [illegible] کی بنا پر اشیاء خوردنی اور اشیاء خام کی پیداوار میں ابھی تک خوب منافع حاصل رہتے ہیں، اس لئے انھیں جزائر برطانیہ کی اس خواہش کے پورا کرنے میں بہت زیادہ تعرض نہیں ہوا ہے۔ لیکن وہ برابر اپنے اس حق آزادی کو ہر امپیریل کانفرنس میں منوا لیتی ہیں کہ یہ صورت حال صرف باہمی منفعت کے وجود تک قائم رہے گی۔ اور جس دن مستعمرات نے یہ محسوس کیا کہ ان کی معاشی ترقی کے لئے یہ انتظام مضرت رساں ہے اسی دن وہ اس صورت حال کو بدل دیں گے۔ اسی طرح سرمایہ کے کاروبار میں لگانے کی وجہ سے جو منفعتیں، جزائر برطانیہ، مستعمرات سے حاصل کر رہے ہیں، اُن کا انحصار بھی باہمی منفعت کے اصول پر ہے۔ نوآبادیاں چونکہ نئی بستیاں ہیں جہاں سرمایہ کی فراہمی کافی نہیں ہے اس لئے وہ بیرون ملک سے سرمایہ، اپنی ملکی دولت کو ترقی دینے کے لئے، قرض لینے کے لئے مجبور ہیں۔ اور یہ سرمایہ عام طور پر پیداوار کے سامان اور مشینری کی شکل میں حاصل کیا جاتا ہے اور چونکہ جزائر برطانیہ کا مال نسبتاً اچھا ہوتا ہے اور اس ملک سے قدیمی اور تمدنی تعلقات بھی قائم ہیں، اس لئے اُن کے مال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جہازوں کی خدمات میں بھی یہی باہمی منفعت کا اصول زیادہ تر کام کر رہا ہے۔ اور جزائر برطانیہ کے بے روزگاروں کو ملازمت بھی مستعمرات میں اسی لیے ملتی ہے کہ آبادی کی کمی کی وجہ سے اُن ممالک میں اُن کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ لیکن مقبوضات کے ساتھ معاملات کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ اور ان ممالک میں سرمایہ دار شہنشاہیت اپنے اصلی رنگ میں دکھائی دیتی ہے اور اس کی تباہ کاریوں کے مظاہرے اب مشرق و مغرب کے تصادم میں جلوہ گر ہونے لگے ہیں

مقبوضات میں، سرمایہ دار شہنشاہیت کا طریقہ حکومت، چند سال پیشتر تک، خالص مطلق العنان استبدادیت رہا ہے۔ گو اس میں تھوڑی سی آمیزش روشن خیالی کی ضرور، ابتدائی عہد کو چھوڑ کر ہمیشہ پائی گئی ہے۔ مقبوضات کی آبادی کا تعلق عموماً دوسری نسل، دوسری زبان، دوسرے رسم و رواج، معاشرت و روایات، طریقہ بود و ماند اور تہذیب و تمدن

سے ہے۔ اس لئے یہاں حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہونے کے لئے خوب وسیع میدان تھا۔ چنانچہ وہ انتہائی شکل میں پیدا ہوئے۔ علاوہ اس کے یہاں کی آبادی، استبدادی طریقۂ حکومت اور اس کے قبیح ترین پہلوؤں سے، زمانۂ قدیم سے مانوس بلکہ عادی چلی آرہی ہے۔ ان کی تاریخیں، مطلق العنان بادشاہوں کی جابرانہ اور پُرشقاوت دستبرد کا ایک مسلسل مرقع ہیں۔ ایسی فضا، ماحول اور روایات کے درمیان، جدید سرمایہ دار شہنشاہیت کے نشو و نما کا امکان بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے کھلے ہوئے مظالم سے ویلزلی، ہیسٹنگز اور ڈلہوزی کی فتوحات تک اور کارنوالس، کیننگ اور رپن کے عہد اصلاحات کو شامل کرتے ہوئے، ایسٹ انڈیا کمپنی اور تاج برطانیہ کا ہر زمانہ میں یہی منشا رہا کہ ہندوستان کی دولت سے، جن ممکن طریقوں پر، جسقدر زیادہ فائدہ، جزائر برطانیہ حاصل کرسکے اُس کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے۔

ہندوستان کی مصنوعات ختم کردی گئیں۔ زرعی لگان و محاصل بڑھائے گئے۔ زرعی پیداوار اسقدر ہندوستان سے باہر کھینچی گئی کہ ہندوستان کی کثیر آبادی فاقہ زدہ ہوگئی۔ اُن کی قوت مدافعت اُنھیں غیر مسلح کرکے اُن سے چھین لی گئی۔ اُن کے سکوں اور شرح مبادلہ کا اس طرح انتظام کیا جس سے اُن کو برابر بین الاقوامی تجارت میں سخت نقصانات برداشت کرنا پڑے اُن کے بحری بیڑے کو برباد کیا گیا اور آیندہ کے لئے اُس کے پیدا ہونے کے امکانات کو فنا کیا گیا۔ ہندوستانی قابلیت اور اہلیت کو کبھی موقعہ، اپنی قوتوں کو ترقی دینے اور اُن سے خود فائدہ اٹھانے اور قوم کو فایدہ پہنچانے کا نہیں دیا گیا۔ تھوڑی سی کوشش اگر بہتری کی کی گئی تو وہ نہروں کے ذریعہ سے زرعی پیداوار کو محفوظ کرنے کے لئے کی گئی تاکہ جزائر برطانیہ، اشیاء خام اور اشیاء خوردنی کی طرف سے مطمئن ہوکر، پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ، صرف مصنوعات کی پیداوار میں اپنی تمام قوتیں صرف کرسکے یہی اصول برطانیہ کے دیگر مقبوضات مثلاً آئرلینڈ، مصر وغیرہ وغیرہ میں بھی کارفرما رہا۔ اور مشرق قریب اور مشرق بعید کے ممالک میں داخل ہونے کی شاطرانہ مساعی بھی جاری رہیں، اور انیسویں صدی کے آخری سالوں میں برطانوی شاہنشاہیت تمام عالم کی اقتصادی اور سیاسی زندگی پر حاوی رہی۔ پھر اس کے بعد دوسرے حریف خطرناک حد تک طاقتور ہوگئے۔

انیسویں صدی کے آخری ربع کی ابتدا تک، یورپ کی اقوام اپنی اندرونی سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں لگی رہیں لیکن اس کے بعد جب چند بڑی اقوام نے اپنی اندرونی حالت مستحکم کرلی تو انہیں برطانیہ کی طاقت اور اس کے روزافزوں منافع کو دیکھ کر بہت رشک و حسد پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی مصنوعات کو تامین کے اصولوں پر کاربند ہوکر ترقی دی اور ان کے دلوں میں بھی ایک مشرقی شہنشاہیت کی ہوس پیدا ہونے لگی اور انھوں نے اسی کی ضرورت اس لیے محسوس کی تاکہ ان کی کثیر آبادی کے درمیان اپنی مصنوعات جاکر فروخت کرسکیں اور وہاں سے اشیاء خام اور اشیاء خوردنی کی رسد کا معقول اور مستقل انتظام ہوسکے۔ جن ملکوں پر برطانیہ اپنا اقتدار قایم کرچکی تھی وہاں انھیں رسائی محال نظر آئی اس لئے برطانیہ کو سب سے بڑا مدِ مقابل سمجھ کر، اُن کے دلوں میں اُس کی طرف سے حسد و کینہ کا جذبہ پرورش پانے لگا۔ ایسے ممالک میں جہاں برطانیہ کا اثر نہ تھا، مغربی ڈپلومیسی نے اپنے جال ڈالنا شروع کئے۔ لیکن وہاں بھی برطانیہ رخنہ انداز ہونے لگا۔ اور ان یورپین قو

میں باہم دگر چلنے لگی۔ ہر ایک دوسرے سے خائف رہتا تھا اور جنگ کی تیاری میں معروف رہتا تھا۔ اس کشاکش کا نتیجہ گذشتہ عالمگیر جنگ عظیم کی صورت میں رونما ہوا۔ اور چونکہ مغربی اقوام کی یہ جنگ آپس کی ہوس ملک گیری اور تمنائے شہنشاہیت کے جذبہ کے ماتحت شروع ہوئی تھی اس لئے حریف اقوام نے ایک دوسرے کے عزائم اور نیتوں کی خرابی اور عدم انصاف کے متعلق خوب پروپگنڈا شروع کیا اور اپنی طرف سے، فتح کے بعد، ہر قوم و ملک کے لئے، حقوق آزادی، خود مختاری اور مساوات کا اعلان کر دیا اور اس بات کے حتمی وعدے کئے کہ فتح کی صورت میں اتحادیین ہر قوم و ملک کے لئے، امن و چین، سکون و عافیت، حریت و ارتقاء کے امکانات پیدا کریں گے۔ بہت سے سادہ لوح ممالک ان اعلانات کے فریبوں میں آکر جنگ میں شریک ہوئے۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور ورسلیز اور پیرس کے صلح نامے اور معاہدے مرتب ہوئے تو گو زبانی جمع خرچ کے لئے مسٹر ولسن کے چودہ نکات کو بہت شہرت دی گئی۔ اور لیگ آف نیشنس اور ہیگ کی بین الاقوامی عدالت قائم کی گئی۔ لیکن فی الاصل تمام دنیا کو فاتح اقوام نے آپس میں تجارت واکتساب شہنشاہیت کے لئے تقسیم کر لیا۔ ترکی سلطنت کے حصے حصے کر دیئے گئے۔ اسی طرح افریقہ میں تجارتی حلقے بنا کر تقسیم کر لیے گئے ـــــ اور دیگر مشرقی ممالک اور چین وغیرہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو جاگیا۔ اور استبدادی ذہنیت کا جیسا مکمل مظاہرہ، دنیا نے، اس کے بعد دیکھا وہ تاریخ عالم میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ پھر ظاہر ہے کہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونا، بالکل قدرتی امر تھا۔ چنانچہ اب ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی ہے جس نے شہنشاہیت کا فنا کرنا اپنا مقصد زندگی بنالیا ہے

اگرچہ شہنشاہیت کے خلاف جو جماعت ہے اسے ابھی تک سلطنت کی پالیسیوں میں دخل دینے کا موقعہ سوائے بالشویک روس کے کسی اور ملک میں ۔۔۔ نہیں ملا ہے لیکن یہ برابر پلیٹ فارم اور پریس سے، بین الاقوامی اخوت، مساوات اور حریت کا درس دے رہے ہیں۔ ان کی آواز روز بروز قوی، ان کا حلقہ روز بروز وسیع اور ان کے عزائم روز بروز پختہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ جماعت شہنشاہیت کی بے انصافیوں کو دنیا کے تمام مصائب و معاصی کا سرچشمہ بتلاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب تک شہنشاہیت کا تخیل باقی ہے دنیا سے جنگ کا امکان فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ گذشتہ جنگ عظیم کی غارتگریوں کی داستان سناتی ہے اور آئندہ جنگ کے ہولناک امکانات کا نقشہ کھینچتی ہے دنیا کی موجودہ کرب و بے چینی، ابتلاء و مصیبت، بے روزگاری اور بے امنی کو رائے عامہ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور پھر ان سے درخواست کرتی ہے کہ متحد و مضبوط ہو کر ایسی تدابیر اختیار کریں کہ جنگ کی بنا یعنی شہنشاہیت اور اس کے حصول و قیام کے لئے جو بین الاقوامی کشمکش دنیا کے ڈپلومیٹک حلقوں میں ہے، فنا ہو جائے۔ اس جماعت کی تعداد کے اضافہ اور اس کے حصول اقتدار کے ساتھ دنیا کا مستقبل وابستہ ہے۔ حالات کا اقتضا تو یہی ہے کہ اس جماعت کو فتح حاصل ہو اور اس کی فتح کی وجہ سے لیگ آف نیشنس کو (جو آجکل منافقت اور جبن کا سرچشمہ بنی ہوئی ہو) وہ عزم، قوت اور مردانگی نصیب ہو جو صرف صداقت و انصاف ہی سے حاصل ہو سکتی ہے

محمد عاقل ایم۔ اے (علیگ)

شبستان کا قطرۂ گوہریں

(بہ سلسلۂ ما سبق)

ملکہ ناہید ایک قد آدم آئینہ کے سامنے خاموش کھڑی ہوئی اپنے سراپا کو غور سے دیکھ رہی ہے اور کوشش کر رہی ہے کہ دربار میں جانے سے قبل خشونت و برہمی کے پورے آثار اپنے اوپر طاری کر لے، تاکہ وہ شہرت جو مردوں کی طرف سے اظہار بیزاری میں اسے حاصل ہو چکی ہے، بدستور قائم رہ سکے کبھی وہ اپنی پیشانی میں شکنیں ڈال کر اپنے چہرہ کو دیکھتی ہے۔ ابروؤں کے درمیان کی گرہ کو چٹکی سے پکڑ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی وہ اپنی آنکھوں کے انداز خیرگی سے خشونت کی کیفیت طلب کرتی ہے کبھی سانس روک کر چہرہ میں سرخی اور گردن کی رگوں میں ابھار پیدا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اسے کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا، کہ آج وہ اپنے آپ کو اسی ناہید کی حیثیت سے پیش کر سکے گی، جو مرد کا نام آتے ہی اپنے غصہ سے تمام دربار کو رعشہ بر اندام کر دینے میں مہارت تامہ رکھتی تھی ——— نوبہار جو دور سے کھڑی ہوئی اس "اہتمام دل آزاری" کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی، آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اور سر جھکا کر بولی کہ "ملکۂ عالم کا انتظار ہو رہا ہے اور وزرا حاضر ہیں، مرزا شاہرخ بھی مع اپنی محبوبہ کے پابزنجیر لایا گیا ہے اور جلاد بھی حکم شاہی کی تعمیل کے لئے شمشیر بکف موجود ہے"

ملکہ ——— (آستینیں چڑھاتے ہوئے) حاضر رہنے دو۔ (آئینہ میں پھر ایک بار اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے) لیکن اے نوبہار مجھے آج کیا ہو گیا ہے، کیا میرا احساس مٹا جا رہا ہے، کیا میری فطری غیرت خودداری محو ہو رہی ہے ——— مجھے معلوم ہے، یقین ہے کہ ایک ظالم و خونخوار مرد کے سر قلم کئے جانے کا حکم مجھے دینا ہے، لیکن نہ میری دل میں کوئی کیفیت برہمی کی پیدا ہوتی ہے، نہ چہرہ سے آثار جلال ——— تمام اہل دربار جو ایسے مواقع پر مجھے دیکھتے ہوئے تھرا اٹھنے کے عادی ہیں آج وہ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے ——— میں ابھی تک اسی اولین حصۂ شب کے خیال سے لذت اندوز ہو رہی ہیں جو تیری معیت میں بسر ہوا تھا۔ میرے اندر ہنوز وہی تبسم مسرت موجود ہے جو کل شام کی گلگشت میں تجھے دیکھ دیکھ کر میرے عروق کے اندر خون کے ساتھ ملا ہوا دوڑ رہا تھا ——— تو پھر کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں شاہرخ کے قتل کا حکم دوں اس کیفیت کے ساتھ کہ تبسم میرے لبوں پر کھیل رہا ہو، ایک فوارۂ خونیں کے بلند ہونے کا منظر دیکھوں اس حال میں کہ میری پیشانی پر ایک شکن بھی موجود نہ ہو۔ دنیا مجھے کیا کہے گی، میں دنیا کو کیونکر منہ دکھاؤں گی

نوبہار ——— "ملکۂ عالم، کیا ہنس ہنس کے ذبح کرنے سے زیادہ پر لطف صورت جور و ستم کی کوئی اور ہو سکتی ہے۔ یہ مجبوری تو صرف مرد ہی کو ہے کہ جب وہ کسی کو قتل کرے گا تو اس کی آنکھوں سے خون بھی ضرور ٹپکے گا، لیکن عورت تو اتنی بے بس نہیں کہ وہ کسی کو ذبح کرے اور مسکرائے بھی نہیں، علی الخصوص ملکۂ عالم کی سی کوئی عورت کہ اس کا تبسم ہی دیت و خونبہا بھی ہو ——— اگر

ملکۂ عالم کو اس کا علم ہوتا کہ بعض کا تبسم بھی عریاں خنجر سے کم نہیں ہوتا، تو شاید اس اہتمام کو ضروری نہ سمجھا جاتا"

ملکہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر، نوبہار کے قریب آگئی اور اپنے ریشمی معطر بالوں کو جو گھڑی گھڑی پیشانی پر آجاتے تھے ہٹاتی ہوئی بولی " ہاں، نوبہار، اس داستان محبت کو ختم کر، جو کل رات تو نے شروع کی تھی، تو جب وہ نقاش آیا اور اس نے تجھ سے جانے کی اجازت طلب کی تو کیا جواب دیا۔ غالباً تو پہلے بہت ہنسی ہوگی اور پھر کہدیا ہوگا کہ جاؤ"

نوبہار ——— " ملکۂ عالم ایسی کہانی رات ہی کو کہی جاتی ہے اور خاصکر اس رات کی کہانی، جس رات میں سب سے پہلے کسی کو شباب و محبت کی کیفیت کا علم حاصل ہوا ہو ——— لیکن یہ بتائے دیتی ہوں کہ میں نے اس سے وہ نہیں کہا جو ملکۂ عالم نے سمجھا ہے بلکہ میں خاموش ہوگئی اور جب اس نے مجھ سے اس خاموشی کا سبب دریافت کیا تو میں اس کے شانہ پر سر ڈال کر رونے لگی ——— لیکن خیر اس کی تفصیل تو میں پھر عرض کروں گی، فی الحال تو ملکۂ عالم کو فسانہ سننا نہیں ہے، بلکہ باہر دربار میں جاکر ایک نیا فسانہ پیدا کرنا ہے خواہ وہ کیسا ہی خونیں والم انگیز کیوں نہ ہو"

ملکہ ——— " مگر اسے نوبہار کیا کروں ہمت نہیں ہوتی کہ باہر جاؤں اور لوگوں کو اس سرگوشی کا موقع دوں کہ ملکہ ناہید شاید اپنے قانون کی غلطی کو محسوس کرنے لگی ہے ——— اچھا تو جا، دربار کو برخاست کردے اور شاہرخ و نیلوفر کو یہیں میرے حضور میں لے آ"

شاہرخ، شبنمستان کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے کا نوجوان تھا، اور تمام اُن صفات سے متصف تھا جو ایک بلند خاندان کے انسان میں پائی جانی چاہئیں۔ وہ فنون سپہ گری کا ماہر تھا اور پردہ دکھیاؤں میں بارہا اہل ملک سے تحسین حاصل کر چکا تھا، بلکہ اس کی داستان محبت کی ابتدا ہی اس طرح ہوئی تھی کہ میدان مسابقت میں جب ایک خونخوار شیر چھوڑا گیا اور شاہرخ کی تلوار نے اس کو دو نیم کرکے رکھدیا تو سب سے قیمتی انعام جو اسے ملا وہ نیلوفر کا دل تھا لیکن چونکہ بدقسمتی سے ان دونوں خاندانوں میں عرصہ سے مخالفت چلی آرہی تھی اس لئے نیلوفر کا باپ کامران شادی پر راضی نہ ہوا اور آخر کار شاہرخ نے مجبور ہوکر نیلوفر کے والدین کی اجازت حاصل کئے بغیر اس کو اپنا بنا لیا ———

شاہرخ اور نیلوفر دونوں قصر کے ایک گوشہ میں اس طرح خاموش کھڑے ہوئے ہیں گویا کسی ہیکل میں دو مجسمے قائم ہوں اور اپنے پجاریوں کا انتظار کر رہے ہوں۔ کیونکہ اگر شاہرخ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا تو نیلوفر بھی حسن نسائی کی ایک بے مثل مورت تھی اور ان دونوں کو یکجا دیکھنے کے بعد کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ فرصتوں میں بنایا ہے۔ ملکہ ناہید دور سے ان دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اپنی برہمی کا اظہار ان پر کرے۔ نوبہار، جو اس منظر کی تمام کیفیات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، ملکہ کے پاس کھڑی ہوئی منتظر تھی کہ دیکھئے ملکہ کیونکر گفتگو کا آغاز کرتی ہے اور کس نتیجہ پر پہونچتی ہے ———

ملکہ دفعۃً ٹہلنے لگتی ہے اور پھر کچھ دیر کے بعد ایک جگہ ٹھہر کر نیلوفر کی طرف بڑھتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی

کو اوپر اٹھاکر پوچھتی ہے ۔ " نیلوفر یہ تو نے کیا کیا ۔ کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ شاہرخ ، کامراں کے خاندان کا دوست کبھی نہیں ہو سکتا "

نیلوفر ـــ (آنکھوں میں آنسو لاکر) ملکۂ عالم ، مجھے کامراں کے خاندان اور شاہرخ کو اپنے خاندان سے اب کیا واسطہ ـــ

نوبہار ـــ (بات کاٹ کر) کیوں واسطہ کیوں نہیں ـــ ملکۂ عالم نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ اس کی رعایا میں باہم خاندانی نزاع قائم رہے اور اس لئے اگر کوئی صورت کسی ایسی مخالفت کے دور کرنے کی پیدا ہو سکتی ہے تو ارادۂ شاہی اُسے نگاہ استحسان سے دیکھنے میں کبھی پس و پیش نہیں کر سکتا ۔ نیلوفر ، تم کو الطاف شاہانہ سے درخواست کرنا چاہئے کہ وہ اس واقعہ کو ان دونوں خاندانوں کی نزاع دور کرنے میں مثال کے طور پر قائم کرے اور اگر کوئی قانونی فروگذاشت ہوئی ہے تو اس کو اپنے رحم و کرم سے معاف فرما دے "

ملکۂ ناہید ، نوبہار کی یہ تقریر سنکر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ایک ایسے تبسم کے ساتھ جس میں لطف سے زیادہ تنقید کا طنز شامل تھا بولی کہ " اے نوبہار ، اگر تجھے شبنمستان پر حکومت کرنے کا شوق ہے ، تو میں وہ بھی تیرے سپرد کر دینے کے لئے آمادہ ہوں ۔ لیکن قبل اس کے کہ تجھے یہ اختیار ملے ، اس کے صرف کرنے میں اس عدم تجربت سے کام لینا مناسب نہیں ۔ یقیناً میں پسند نہیں کرتی کہ ملک کے امن و سکون میں اضطراب پیدا ہو ، اور ہو سکتا ہے کہ رشتۂ ازدواج کو دو مخالف خاندانوں میں باہم تعلق پیدا کرنے کا بہانہ قرار دیا جا سکے ۔ لیکن کیا شاہرخ کو معلوم نہیں تھا کہ ایسی صورت میں اسے سب سے پہلے رخصت شاہی حاصل کرنا چاہئے تھی ، علی الخصوص ـــ "

نوبہار ـــ (بات کاٹ کر) " اس بات سے ہم سب اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ ملکۂ عالم سے بارہا اس قسم کی اجازت طلب کی گئی اور کبھی نامنظور نہیں ہوئی ۔ رہا شبنمستان پر حکومت کرنے کا شوق ، ہو تو اس کی تمنا مجھے کیا ہو سکتی ہے جبکہ میں جانتی ہوں کہ عورت نام ہے صرف " لغزش " کا جو تخت شاہی پر نہیں بلکہ خلوت ہی میں کچھ اچھی معلوم ہوتی ہے "

نوبہار کا یہ جواب ایسا زبردست نقد رکھتا تھا کہ ملکۂ ناہید میں تھوڑی دیر کے لئے اس غضبناک شیرنی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جس کے لئے راہ فرار بالکل مسدود ہو ، لیکن نوبہار کی نگاہوں سے تصادم ہوتے ہی وہی عالم ہوا جیسے کوئی چھوئی موئی کے درخت کو چھو لے اور اس کی شاخیں جھک کر رہ جائیں ۔ وہ دیر تک خاموش رہی ، سر نیچا کر کے کچھ سوچتی رہی ۔ اس کے چہرہ پر ایک خاص قسم کا حزن و ملال طاری تھا ، اس کی صورت اُداس تھی اور آنکھوں سے عجب طرح کی تلون ظاہر ہو رہی تھی ۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا نوبہار نے اس کی توہین نہیں کی اور کیا یہ اس کو برداشت کرنا چاہئے ۔ اس نے ایک بار ارادہ کیا کہ نوبہار کو باہر چلے جانے کا حکم دے ، لیکن اسی خیال کے ساتھ ہی معاً وہ تمام لذتیں و سرشاریاں یاد آنے لگیں جو نوبہار کی معیت میں اسے حاصل ہوئی تھیں اور پھر ضبط کر کے ایسے انداز کے ساتھ جس میں معقولیت سے زیادہ مغلوبیت پنہاں تھی ، شاہرخ سے مخاطب ہو کر بولی کہ ـــ " اے شاہرخ ، نیلوفر میں وہ کیا بات تھی جس نے تجھے احکام شاہی کی مخالفت میں شدید ترین عقوبت برداشت کرنے پر جری بنا دیا ؟ "

شاہرخ ـــــ "ملکۂ عالم میں کیا عرض کرسکتا ہوں، جب کہ آج تک کسی کو بھی دنیا میں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مقناطیس لوہے کو کیوں کھینچ لیتا ہے، چاند کو دیکھ کر چکور کیوں دیوانہ ہو جاتا ہے، شمع پر قربان ہونے کے لئے پروانہ کیوں مجبور ہے"

ملکہ ـــــ "میں اس وقت شاعری سننے کے لئے آمادہ نہیں، اور نہ میں ان دور از کار مہمل تشبیہات سے مطمئن ہو سکتی ہوں (نیلوفر سے مخاطب ہو کر) تو بتا کہ شاہرخ میں وہ کونسی خصوصیت تھی کہ تو نے اس کے لئے فرمان شاہی سے سرتابی کی بھی پروا نہ کی، کیا تجھے معلوم نہیں کہ مردنے اس وقت تک عورت پر کیا کیا ظلم توڑے ہیں اور یہ قوم عورت کی کمزوری سے کس قدر فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کی محبت بلکل فریب اور اس کی شیفتگی سراپا مکر و خود غرضی ہے، اس کا عورت سے محبت کرنا اپنے نفس سے محبت کرنا ہے اور اس کا ایثار، عورت کے لئے ایک صیاد کا سا دام ہے جس سے وہ شاہین کا شکار کرنا چاہتا ہے پھر جب تک عورت پر اس کو اقتدار حاصل نہیں، وہ ایک غلام سے زیادہ تابع فرمان نظر آتا ہے، لیکن ایک بار اس پر قابو پانے کے بعد وہ ایک گرسنہ شیر ہے، جو کسی طرح اپنے صید زبوں کے جسم سے اپنے پیوست ہو جانے والے ناخن و چنگال جدا کرنے کے لئے طیار نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ تو اس حقیقت کو معلوم کرکے، شاہرخ سے اپنی بیزاری کا اعلان میرے سامنے کردے، تاکہ میں رشتۂ ازدواج کے قطع کردیئے جانے کا حکم دیکر تجھ کو پھر ایک بار دنیا میں مسرور زندگی بسر کرنے کا موقعہ دوں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی غور کروں کہ قصاص سے کم وہ کون سی سزا ہے جو شاہرخ کو دی جاسکتی ہے"

نیلوفر ـــــ "اے ملکۂ عالم، اگر شاہرخ کی جاں بخشی اسی طرح ممکن ہے تو میں اس کے لئے بھی ـــــ"

نیلوفر یہیں تک کہنے پائی تھی کہ شاہرخ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔ اور ملکہ سے مخاطب ہو کر بولا ـــــ "کیا شبنمستان کے خاندان شاہی کے افراد اسقدر عقل سے دور ہیں، کہ جس وقت وہ دوسروں کی داستان مکر و فریب بیان کرنے لگتے ہیں، تو ٹھیک اسی وقت وہ خود اپنے مکر و فریب کو بھی چھپانے پر قادر نہیں ہو سکتے؟ مرد کا عورت کو دھوکا دینا تاریخی حقیقت سہی لیکن کیا ایک عورت دوسری عورت کو اس سے زیادہ دھوکا دے سکتی ہے جو اس وقت شبنمستان کی ایک جلیل القدر ملکہ، غریب شاہرخ کی معصوم بیوی نیلوفر کو دینا چاہتی ہے ـــــ جان کے قیمتی ہونے کا ذکر نیلوفر سے کیا جاتا ہے جس کی حیات کا تنہا مقصود، مرد کی ..... پرستش ہے ـــ لیکن ملکۂ ناہید "میرزا شاہرخ بیگ" سے استمزاج کی تکلیف گوارا نہیں فرمائیں، تاکہ وہ بتاتا کہ حیات انسانی جس کا سودا کبھی صرف "نیم نگاہ محبت" سے ہو جاتا ہے کسی وقت اسقدر گراں ہو جاتی ہے کہ اسے شبنمستان کی صاحب لعل و گہر ملکہ بھی نہیں خرید سکتی"

ملکہ یہ سنکر غصہ سے بیتاب ہو گئی اور نہایت بلند آواز سے بولی کہ "شاہرخ خاموش ہو جا قبل اس کے کہ جلاد کی تلوار تجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کرے"

شاہرخ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) اپنے غصہ اور جلاد کی تلوار سے اس بزدل کو ڈرا، جو تجھ سے اس عارضی زندگی کے لیے چند سانسوں کی بھیک لینے کا آرزومند ہو۔ وہ شخص جو "گرانبار کرم" زندگی کو موت سے بدتر جانتا ہے، اس کے لیے تیری پیشانی کی یہ شکنیں، بستر کی وہ شکنیں ہیں جن پر نگاہ ڈالے بغیر صبح کو سو کر اٹھنے والا باہر نکل جاتا ہے ـــــ کیا تجھ

یقین ہے کہ نیلوفر، مجھ سے جدا ہو کر کسی اور کی آغوش کو قبول کر لے گی اور کیا میں اس سے جدا ہو کر اسقدر ضعیف و ناتوان ہو جاؤں گا کہ اگر جلاد کی تلوار میرے گلے تک نہ پہونچے تو میں خود اپنے حلقوم کو اس تک پہونچا سکوں۔ اے ملکہ! ہوش میں آ، اپنے لطف و کرم کا جادو صرف اُن بے غیرت ہستیوں پر ڈال جو تیرے دروازہ پر کتوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، جان دینے والوں سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں"

ملکہ نے جس کا سارا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے شاخ بید سے کوئی طائر آ کر چلا جائے اور وہ دیر تک تھرتھرایا کرے، امیز پر جلدی جلدی فرمان قصاص لکھا اور نوبہار کو بلا کر حکم دیا کہ "یہ فرمان وزیر اعظم تک ابھی پہونچا دیا جائے"

نوبہار نے اسے دیکھا تو سر سے پاؤں تک کانپ گئی کیونکہ اس میں نہ صرف شاہرخ بلکہ نیلوفر کے بھی تہ تیغ کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی تعمیل کی گئی تو ملک میں جو پہلے ہی سے برافروختہ تھا، بہت زیادہ ہیجان پیدا ہو جائیگا۔ اس نے جانے میں کچھ تامل کیا تو ملکہ نے غضب آلود نگاہوں سے اُسے دیکھ کر پوچھا کہ "یہ پس و پیش کیسا؟"

نوبہار نے کہا کہ "اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں اور وہ یہ کہ ان مجرموں نے جسقدر گستاخی ملکہ کے حضور میں کی ہے، وہ اس سے بہت زیادہ سزا کی مستحق تھی"

ملکہ ------ "قصاص سے زیادہ سزا سخت اور کیا ہو سکتی ہے"

نوبہار ------ "ملکۂ عالم! سزا سے مقصود مجرم کو اذیت میں مبتلا کرنا ہے اور سب سے بڑی اذیت وہ ہے جو عرصہ تک احساس انسانی کو بے چین رکھے۔ اگر ان دونوں کو قتل کر دیا گیا تو انھیں بجائے تکلیف کے اس خیال سے مسرت ہوگی کہ مصیبت سے جلد چھٹکارا مل گیا، لیکن اگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے مقید کر دیا گیا تو یہ ایک مستقل تکلیف و اذیت ہوگی، جو ایسے گستاخ لوگوں کو پہونچنی چاہیئے۔ اس لیے میری رائے تو یہی ہے کہ ان کو قلعہ کے اندر علیحدہ علیحدہ محبوس کر دیا جائے اور قید و بند کے لیے فی الحال کوئی میعاد نہ مقرر کی جائے"

ملکہ جو نوبہار کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو مجبور سی محسوس کرنے لگتی تھی، یہ سنکر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر فرمان کو چاک کر کے دوسرا حکم تحریر کیا اور حد درجہ خستگی کے ساتھ کرسی پر ایک طرف کو گردن ڈال کر خاموش پڑ رہی

ملکہ ناہید اپنی فطرت کے لحاظ سے خواہ کیسی ہی قابل عزت کیوں نہ ہو، لیکن ملک کے نظم و نسق کا جہاں تک تعلق تھا وہ ناکام ثابت ہوئی۔ وزراء اور ارکان حکومت یہ ضرور چاہتے تھے کہ جو بدنامی ملکہ ناہید کی ہو رہی ہے، اُسے کسی طرح حسن و خوبی کے ساتھ دور کر دیا جائے، لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ وہ چاہتے کچھ تھے اور ناہید کرتی کچھ تھی ------ سب سے زیادہ شکایت اہل ملک کو یہ تھا کہ حسب رواج سلطنت ملکہ ناہید نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور دوسرا سبب برہمی کا یہ تھا کہ وہ مردوں سے سخت متنفر تھی اور اس سلسلہ میں نہایت سخت قوانین نافذ کر کے اُس نے بعض نہایت قیمتی ہستیوں سے

اہل ملک کو محروم کرنا تھا۔ اس وقت اہل ملک کا خاموش رہنا ایک تو اس وجہ سے تھا کہ وہ واقعی ناہید سے محبت کرتے تھے اور اس کا حسن وجمال ایک ایسا سحر تھا کہ اس کے دیکھتے ہی ہر شخص سربسجود ہو جانے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور دوسرے اس سبب سے کہ طبقۂ امرا کے نوجوان، جن میں سے ہر ایک ملکۂ ناہید کی محبت دل میں لئے ہوئے اس سے شادی کرنے کا آرزومند تھا، یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملکہ کو کوئی زخم چشم بھی پہونچے، چہ جائیکہ اس کی ذات یا حکومت کے خلاف بغاوت کرنا۔ لیکن شاہرخ اور نیلوفر کے مقید کر دیئے جانے سے ملک کی ایک بڑی جماعت سخت برافروختہ ہو گئی اور آخرکار اس نے مقابلہ کرنے کا ارادہ کر ہی لیا

ملک کے مختلف حصوں میں ملکۂ ناہید کے خلاف جلسے ہو رہے ہیں، عوام میں اشتعال پیدا کیا جا رہا ہے اور وزراء کو دھمکیا جا رہا ہے کہ اگر ملکۂ ناہید نے جلد سے جلد شادی کر کے اپنی حکومت میں کسی مردانہ دماغ کو شامل نہ کیا تو اس کی معزولی کا مطالبہ کیا جائے گا ——— ملکۂ ناہید، سخت اضطراب کی حالت میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہے، اراکین سلطنت خاموش کھڑے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر رہے ہیں، نوبہار بھی سر جھکائے ہوئے ایک گوشہ میں دم بخود کھڑی ہوئی ہے ——— کچھ دیر کے بعد دفعۃً ملکہ کچھ سوچ کر میز کے پاس آئی اور سب کو مخاطب کر کے بولی کہ "اگر اہل ملک کا مطالبہ یہی ہے تو میں اپنی معزولی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن شادی کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے دوسرے کی کنیز بنا دینا میرے اختیار سے باہر ہے"

وزیر اعظم ——— "لیکن اے ملکۂ عالم، میں بھی عرض کروں گا کہ ملکہ کا شادی کر لینا، کنیز بننا نہیں ہے بلکہ دوسرے کو غلام بنا لینا ہے"

دوسرا وزیر ——— "علاوہ اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے اختیارات حکومت چھین لئے جائیں اگر ملکہ کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت اس سے ظاہر ہو"

یہ سنکر ملکہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ دفعۃً قصر شاہی کے چاروں طرف سے ہنگامہ کی آواز بلند ہوئی اور نسرین نے گھبرائے ہوئے آکر اطلاع دی کہ باغیوں نے محل کا محاصرہ کر لیا ہے اور فوج کا محافظ دستہ انھیں اندر آنے سے روک رہا ہے، یہ سنتے ہی ملکہ کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا اور سلطنت ہاتھ سے جاتے دیکھ کر اس کے تمام عزائم مضمحل ہو کر رہ گئے۔ وزراء نکل کر باہر گئے تھے کہ نوبہار آگے بڑھی اور عرض کیا کہ "ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ کہ ملکہ اپنی شادی کی کوئی تاریخ مقرر کر کے اعلان کر دیں اور کسی عورت کو مردانہ لباس پہنا کر تاریخ مقررہ پر اسی سے شادی کی رسم ادا کر لیں"

ملکہ ——— "لیکن اگر بعد کو یہ راز ظاہر ہو گیا تو پھر کیا ہوگا"

نوبہار ——— "میرے پاس ایک تدبیر اور ہے جو اس راز کو ظاہر نہ ہونے دے گی"

ملکہ ——— "تو کیا تو اس کے لئے آمادہ ہے کہ میرے لئے ایک ساعت کے لئے مرد بن جائے"

نوبہار ——— "اگر ملکہ کا فرمان یہی ہے تو مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے"

ملکۂ ناہید کی شادی ہو چکی ہے، اور تمام شبنستان میں ہر جگہ چراغاں ہو رہا ہے۔ ملکہ اطلس و کمخواب، پرنیاں و حریر میں لپٹی ہوئی، اپنی خوابگاہ میں لیٹی ہے اور نوبہار کو چھیڑ رہی ہے کہ "کیا آج کی رات بھی تجھے میرے پاس رہنے میں کوئی عذر ہو سکتا ہے" نوبہار ـــــ "اے ملکۂ عالم مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ مردوں کی نقل کرتے کرتے بعض عورتیں واقعی مرد بن گئیں اور اس لئے میں کیا کروں گی اگر صبح کو مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب میں "نوبہار" کبھی نہیں بن سکتی"

ملکہ نے یہ سن کے قہقہہ لگاتے ہوئے آخری جام شراب پیا اور بولی کہ "اگر واقعی تو مرد بن گئی تو میں بجائے مردوں کے عورتوں سے نفرت کرنے لگوں گی کہ مبادا کسی دن وہ مجھ سے میرے شوہر کو چھین لیں"

آفتاب کی کرنیں حجلۂ عروسی کے پردوں سے گزر گزر کر اس سنہری پر پڑ رہی ہیں، جہاں ملکہ، حجاب و انفعال کی تصویر بنی ہوئی اس طرح بیٹھی ہوئی ہے، جیسے تیتری اپنے پروں میں سر ڈال کر رہ جائے اور شاہزادہ خرم اسے چھیڑ رہا ہے کہ "اے شبنستان کے قطرۂ گوہریں! میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ بعض دفعہ سبب عورت مرد کا بھیس بدلتی ہے تو پھر وہ عورت نہیں ہو سکتی"

یہ سنکر ملکۂ ناہید بے اختیارانہ اپنی آغوش میں اسے لے لیتی ہے اور مسرت و نشاط کے چند گرم گرم آنسو اس کے سینہ پر ٹپکا کر زندگی میں پہلی بار اپنی نسائیت کا اعتراف کر لیتی ہے۔

نیاز

فلسفۂ عُریانی عہد حاضر کے نقطۂ نظر سے

میری مراد "عریانی" سے بیباکی یا فحاشی نہیں ہے، بلکہ عُریانیِ تن اور برہنگیِ جسم مقصود ہے جو روز بروز مغرب میں بڑھتی جا رہی ہے اور جس کے مفید ہونے کی تبلیغ، نہ صرف جمالیاتی وطبی بلکہ اخلاقی زاویۂ نگاہ سے بھی ہر جگہ ہو رہی ہے ہمارے یہاں کے کسی شاعر کا مشہور شعر ہے کہ

تن کی عُریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

یعنی اُس کے نزدیک عُریانی کے بہتر ہونے کا ثبوت صرف یہ تھا کہ اس ملبوس میں اُلٹا سیدھا دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی، گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اُس نے یا تو صرف ایک "درزی" کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا یا اُس "کاہلی" کی رعایت سے جس کا ہندوستان کے عاشق یا مدعیِ عشق (شاعر) میں پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ـــ لیکن یورپ کا انسان جو روحانیت ایسی چیز کو بھی اپنی مادی جستجو سے مجروح کئے بغیر نہیں رہتا، وہ مسئلہ "عریانی" میں بال کی کھال نکالنے سے کیونکر باز رہ سکتا تھا ـــ وہ غالباً برہنہ بعد کو ہوا ہوگا اور برہنگی کی خوبی کے دلائل اس نے پہلے ہی سوچ لئے ہوں گے

یہ واقعہ ہے کہ انسان برہنہ ہی پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اول اول ایک زمانۂ مدید تک اس نے اسی فطری ملبوس کو عزیز رکھا، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ جب رفتہ رفتہ اس کے ذہن و دماغ نے ترقی کی تو ضرورتاً یا مصلحتاً ستر پوشی و جسم پوشی کا خیال بھی اسے پیدا ہوا یہاں تک کہ لباس و حیا دونوں کا مفہوم تقریباً ایک ہو کر رہ گیا

خود یورپ میں جہاں اس وقت "عریانی" کا ایک مستقل مذہب ہی قایم ہو گیا ہے، لباس و پردہ پوشی نے غیر معمولی حد تک ترقی کر لی تھی اور اٹھارویں صدی کے اخیر تک عورتوں کا ملبوس سر سے پاؤں تک اتنا مکمل تھا کہ سوائے چہرہ کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوتا تھا جو کپڑے سے ڈھکا ہوا نہ ہو ـــ یونان و روما مصر و بابل، ہندوستان و چین، ہر جگہ کی تہذیب قدیم میں بھی لباس کو بڑا درخور حاصل تھا اور سوائے اس کے کہ دیوتاؤں کے بُت یا دیویوں کے مجسمے تو ضرور عریاں بنائے جاتے تھے،[۱] تمدن و معاشرت کے کسی شعبہ میں عریانی کو دخل نہ تھا ـــ ہندوستان میں پرستاران مذہب کی ایک جماعت ضرور ایسی تھی جو تقریباً عریاں رہتی تھی اور اب بھی اس کا یہی حال ہے، لیکن یہ عُریانی صرف مردوں تک محدود تھی عورتیں اس میں حصہ نہ لیتی تھیں، الغرض لباس کو ہمیشہ اور ہر جگہ تہذیب و شائستگی کا مترادف سمجھا گیا اور اسی کو دیکھ کر ایک قوم کے سلیقہ و تمیز پر حکم لگایا جانے لگا ـــ

---

[۱] اس مسئلہ پر ہم اپنے آیندہ مضمون میں بحث کریں گے جس کا عنوان "مذاہب عالم اور اعضاء جنسی کی پرستش" ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ اب وہ کیا اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ وہی فعل جو کل تک داخلِ تہذیب تھا، اب منافیِ تہذیب قرار دیا جاتا ہے اور جس کی خوبی کا ہر شخص معترف تھا آج اس کی برائیاں کی جاتی ہیں

تاریخِ قدیم اور موجودہ وحشی اقوام کے مطالعۂ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس کی ابتدا ہی "ستر پوشی" سے ہوئی تھی، یعنی انسانِ قدیم نے سب سے پہلا قدم جو وضعِ لباس کے سلسلہ میں اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی "شرمگاہ" کو چھپایا ——— اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لباس کے وجود میں آنے کا سبب، شدائدِ موسم کا مقابلہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق "جمالیاتی ذوق" سے تھا یا نفسیاتِ لذت سے بظاہر یہ بات ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ "انسانِ قدیم" کو جمالیات اور نفسیات ایسے بلند و ترقی یافتہ علوم سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ تمام علوم فطرتِ انسانی ہی کی مختلف احساسات و جذبات سے پیدا ہوئے ہیں،

اور جوں جوں ان احساسات و جذبات میں گزشتہ تجربات سے بیداری پیدا ہوتی گئی، اسی لحاظ سے دنیاوی علوم و فنون بھی ترقی کرتے گئے، چنانچہ آج دنیا کی کسی بڑی سے بڑی ایجاد و اختراع کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ اس میں اضافے کس طرح ہوئے ——— بہر حال یہ واقعہ ہے کہ انسانِ قدیم نے سب سے پہلے وضعِ لباس کے سلسلہ میں جس کیفیت سے کام لیا وہ اس کے "جذباتِ لذت و محبت" سے متعلق تھی، ورنہ محض سردی و گرمی سے بچنے کے لئے وہ سب سے پہلے اپنے سینہ و پشت، سر و گردن کو چھپاتا نہ کہ اس حصۂ جسم کو جو شدائدِ موسم سے چنداں متاثر نہیں ہوتا

چونکہ مرد و عورت کا تعلقِ جنسی ایک فطری تعلق ہے، جس کے لئے انسان کو نہ کسی درس کی ضرورت تھی نہ تعلیم و تجربہ کی، اس لئے یہ واقعہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس امر کو محسوس کیا ہوگا کہ وہ اپنی مخالف جنس کی طرف جو خاص قسم کی کشش محسوس کرتا ہے اس کا تعلق زیادہ تر انسان کے جسم اور اس کے مخصوص اعضا سے ہے، یعنی وہ اس طرف رغبت محسوس کرتا ہے، کھنچتا ہے، اور ایسے جذبات میں ہیجان محسوس کرتا ہے ——— پھر ایک زمانہ کے بعد اس نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کشش میں کمی ہونے لگی ہے اور اسی لحاظ سے اس کا ذوقِ لذت بھی پورا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ اس نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جب مرد و عورت دونوں کچھ زمانہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں تو پھر شوق میں کافی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ قدرتاً اس نتیجہ پر پہونچا ہوگا کہ اگر بعض اعضائے جسم نگاہوں سے چھپے ہوئے رہیں تو ممکن ہے ذوقِ لذت عرصہ تک قائم رہے اور اسی اصول کی بنا پر جو یقیناً جمالیات اور نفسیاتِ لذت کا نہایت اہم مسئلہ ہے، اس نے سب سے پہلے "ستر پوشی" اختیار کی ہوگی۔ پھر اس کے بعد جب اس نے دیکھا کہ یہ ستر پوشی نہ صرف اس کے ذوقِ جنسی کے لئے مفید ہے بلکہ سردی گرمی سے بھی ایک حد تک محفوظ رکھتی ہے تو اس نے پھر پورے جسم کو ڈھانکنے کی کوشش کی ہوگی جو اصل بنیاد ہے لباس و ملبوس کی

ظاہر ہے کہ انسان نے اول اول جو لباس وضع کیا ہوگا وہ بہت ہی بھدا رہا ہوگا اور جب اس نے دیکھا ہوگا کہ اس لباس کی نگاہیں عادی ہو گئی ہیں اور کوئی کشش باہم گر باقی نہیں رہی، تو پھر تحسینِ لباس کی طرف توجہ ہوئی ہوگی، جسے آج کل کی زبان میں وضع قطع، تراش خراش یا فیشن کہتے ہیں، اور جس کی ابتدا یقیناً اس خیال سے ہوئی ہوگی کہ جسمِ انسانی جو سر

سے پاؤں تک بالکل مستور رہتی تھی چیز ہوگیا ہے اس کے کچھ حصہ کو کھل جانا چاہئے اور یہی وہ فلسفہ تھا جس کی بنا پر مغرب کی عورتوں نے نیچے سے اپنی پنڈلیوں کو اور اوپر سے گردن وسینہ کو برہنہ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ اب یہ دونوں عریانیاں ایک دوسرے سے مل کر ایک ہوجانا چاہتی ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں جہت کی عریانیوں کا نقطۂ اتصال کس جگہ قائم ہوگا

یوروپ میں اس کی ابتدا انیسویں صدی سے ہوتی ہے اور اس کا سب سے پہلا ذی اثر داعی روشو (Rousseau) تھا اور اس کی تبلیغ کا خلاصہ یہ تھا کہ "فطرت کا اصلی و حقیقی حسن صرف تن عریاں میں نظر آسکتا ہے اور جسم کو چھپانا قدرت کی توہین ہے" جرمنی میں اس تحریک کی علمبرداری فریڈریخ شلیگل (Friedrich Schlegel) نے کی۔ اور اس مسلک کی وہ عرصہ تک تبلیغ کرتا رہا

انگلستان میں بھی اس تحریک کا ایک زبردست حامی بلیک (Blake) تھا اس نے اپنی تبلیغ میں تھوڑا سا عنصر روحانیات کا بھی شامل کرکے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ تن عریاں کے جمال وجلال کی پرستش کریں۔ اور جدید تہذیب وتمدن کے جن ملبوسات نے قابل نفرت پردہ ڈال رکھا ہے انھیں اُتار پھینکیں۔ آدم وحوا دنیا میں عریاں زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ہر بچہ دنیا میں عریاں ہی پیدا ہوتا ہے۔ لہذا "مسلک عریانیت" عین "مسلک فطرت" ہے۔ اس داعی جمالیات عریانیت کا قول یہ تھا کہ:۔
"عہد جدید کے کسی آدمی کے کپڑے اتار کر دیکھو تو اندر سے ذی حیات انسان نہیں بلکہ اس کی لاش نکلے گی جس کو دیکھ کر خوف طاری ہوگا" اور یہ حالت صرف اس وجہ سے پیدا ہوگئی ہے کہ انسان عریاں نہیں رہتا

امریکہ میں اس مسلک کے بہت بڑے داعی تھوریو (Thoreau) وہیٹمن (Whitman) اور بروز (Burroughs) گزرے ہیں

سولھویں صدی کے آغاز میں سر طامس مور نے بھی اس مسلک کی دعوت اپنی کتاب "Utopia" میں دی تھی۔ اور قصہ کے پیرایہ میں ظاہر کیا تھا کہ:۔ "الوٹوپیا میں شادی سے پہلے مرد وعورت ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوکر اپنے تمام اعضاء جسم کو دکھا دیتے ہیں"۔ اسی طرح سینانکور (Senancour) نے اپنی کتاب (De L' Amour) مطبوعہ ۱۸۳۴ء میں مسلک عریانی کی تائید وحمایت کرتے ہوئے اس سے انکار کیا ہے کہ عریانی مخرب اخلاق یا مانع شرم وحیا ہے اور امریکہ میں تھوریو نے اپنے جریدہ مطبوعہ ۱۲ جون ۱۸۵۲ء میں ——————— لکھا تھا کہ اگر آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہو اور اپنی نوٹ بک میں یہ لکھ کر لے جائے کہ دنیائے ارضی میں عریانی پر سخت قواعد وقوانین عائد کئے گئے ہیں تو آسمان پر ملائکہ میں کس قدر ہلچل مچے۔

آئوان بلاخ (Ivan Bloch) نے اپنی کتاب "ہمارے زمانہ کی حیات جنسیہ" (Sexual life of our times) کے باب ہفتم میں مسلک عریانی کی نسبت یہ فتویٰ صادر کردیا ہے کہ:۔ عریانی کا خیال بالکل فطری خیال ہے۔ اور موجودہ زمانہ کی عام جد وجہد حفظان صحت، جمالیات واخلاقیات وغیرہ کے متعلق سب عریانی کی طرف

مائل ہے اور مستقبل میں عریانی ہی کا دور دورہ ہوگا۔

عریانی قدیم یونان میں

اسپارٹا، خیوس (Chios) اور قدیم یونان کے دیگر مقامات میں عورتیں مردوں کیساتھ یا ان کے سامنے برہنہ ہوکر ورزشی کھیلوں اور ناچ وغیرہ میں شریک ہوتی تھیں مثلاً ایتھی نیس نے (Athenaeus) جلد سیزدہم باب بستم میں لکھا ہے :- "جزیرہ خیوس میں ورزشگاہوں اور دوڑ کے میدانوں میں جاکر یہ منظر دلفریب دیکھنا کس قدر دلچسپ اور خوش آئند ہے۔ کہ جوان مرد برہنہ ہوکر عریاں کنو۔ریوں کے ساتھ کشتی لڑ رہے ہیں"۔ حکیم افلاطون (Plato) نے بھی اپنی کتاب "جمہوریت" (Republic) میں اس قسم کی رواج کو بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے اور لکھا ہے کہ جو لوگ اس بات پر ہنستے ہیں وہ بیوقوف ہیں۔ افلاطون نے بہت سی باتوں میں اپنی رائے بدلی لیکن اس بارہ میں وہ ہمیشہ ایک ہی رائے پر قائم رہا۔ اپنی کتاب "قوانین" جلد سوم میں جو بڑھاپے اور پختہ دماغی کے حکیمانہ خیالات کا مجموعہ ہے، افلاطون نے اسی وضع کی تعلیم کو اچھا قرار دیا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں عریاں ہوکر باہم شریک ہوں۔ تاکہ نفسانی خواہشیں ضعیف ہو جائیں۔ علاوہ ازیں اس نے جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ارتباطِ باہمی کو ایسے لباس میں پسند کیا ہے جس سے تناسب اعضا یا جسم کی خوبصورتی مستور نہ ہو۔

الغرض قدیم یونان کے رسم و رواج اور اقوالِ حکما سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلکِ عریانی کے شیدائی تھے۔ اور ضرورت سے زیادہ کپڑے پہننا پسند نہ کرتے تھے۔

عریانی قدیم رومیوں میں

قدیم رومی اگرچہ یونانیوں کے شاگرد تھے لیکن ان کا معیار "اخلاق" زیادہ بلند تھا۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ مسلکِ عریانی کا تعلق درستیِ اخلاق سے کیا ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک "عریانی" بری بات سمجھی جاتی تھی۔ اور وہ اسے ایک قسم کی اوباشی سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ خود بھی کبھی کبھی ننگے ناچ لیتے تھے لیکن اس وضع کو ان میں ہمیشہ ذلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ تھیٹروں میں بیشک "رقصِ عریاں" کا رواج تھا۔ اور عوام اس قسم کے ناچ کا تقاضا بھی کرتے تھے لیکن شرفا اور ثقات کے نزدیک عریانی پسندیدہ چیز متصور نہ ہوتی تھی۔

مسیحیت و عریانی

جب دنیائے فرنگ پر استیلائے مسیحیت ہوا تو اگرچہ اس مذہب نے افلاطون کے اکثر خیالات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا لیکن اُس نے حکیم موصوف کے نظریۂ عریانی سے اتفاق نہیں کیا اور جو نفسیاتی خوبیاں اس میں تھیں ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلیسائے مسیحی ہر اس چیز کے خلاف سخت جہاد کرنا چاہتا تھا۔ جسے اس کی اصطلاح میں (Flesh) "گوشت یعنی نفسِ امارہ" کہتے تھے اور اسی لئے پادریوں نے خواہش نفسانی اور تنِ عریاں دونوں کو ایک ہی چیز سمجھا۔ لہٰذا کلیسا نے یہی تلقین کی کہ چونکہ "گوشت یعنی جسمِ انسانی" مرکزِ گناہ ہے اس لئے اسے مستور رکھنا چاہئے۔ عوام نے اس کی تعمیل کی اور یہ نہ سمجھے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنی ان خواہشات کو نہیں دبا سکتے جو جسمِ انسانی کے لئے ہر شخص کے دل میں فطرتاً پیدا ہوتی ہیں بلکہ حسنِ ملبوس اور زیادہ جاذبِ نظر و خیال ہوگا۔

کیا عریانی مہیج ہے؟ ڈاکٹر برٹن (Burton) نے اپنی کتاب "تشریح مالیخولیا" (Anatomy of Melancholia) میں حکیم افلاطون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"بعض لوگوں کے نزدیک جسم عریاں دیکھتے ہی غایت درجہ کا ہیجان پیدا ہوجاتا ہے اور مرد و زن دونوں میں خواہش جنسی مشتعل ہوجاتی ہے"۔ لیکن اسی کتاب میں آگے بڑھ کر خود ڈاکٹر صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ:- بعض کا قول یہ بھی ہے کہ عورت کو برہنہ دیکھنے سے مرد کی طبیعت ہٹ جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر مانٹین (Montaigne) فرانسیسی کا بھی یہی قول ہے کہ "جو حکما اور اطبا ماہر فن ہوتے ہیں وہ مرد کی خواہش نفسانی کم کرنے کے لئے یہی ترکیب اختیار کرتے ہیں" اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ عورت کو برہنہ دیکھ کر مرد کی خواہش اس قدر شدید نہیں ہوتی جتنی اُس وقت جب اس کو لباس فاخرہ میں آراستہ یا نیم برہنہ حالت میں دیکھا جائے۔ چنانچہ اب یہ امر عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ عمدہ لباس اور اسکی نئی نئی وضع قطع کا مقصد یہی ہے کہ خواہشات نفسانی کو برانگیختہ کیا جائے۔ جو عورتیں مصوروں کے نگارخانوں یا بت تراشوں کے کارخانوں میں بطور نمونہ سامنے بیٹھتی ہیں اُن کا تجربہ ہے کہ جس وقت وہ اپنے ملبوس سے علیحدہ ہوتی ہیں تو ان کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شوفیلڈ (Dr Shufeldt) نے لکھا ہے کہ:- "مجھ سے ایک مشہور عورت نے جو نگارخانہ میں بطور نمونہ بیٹھا کرتی تھی بیان کیا کہ وہ نگارخانہ میں داخل ہوتے ہی حتی الامکان بہت جلد کپڑے اتار دیتی ہے" کیونکہ خوبصورت لباس بہ نسبت عریانی کے زیادہ جاذب نگاہ ہوتا ہے۔

عریانی قرون وسطیٰ میں گو مسیحیت نے عریانی کو ممنوع قرار دیا لیکن چونکہ ظہور مسیحیت کے وقت عہد اصنام پرستی کی بہت سی عریان روایات موجود تھیں اس لئے چنداں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ خود (دوسری صدی عیسوی کے اندر) عیسائیوں میں ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا جو خود کو پیروان آدم (Adamites) کہتا تھا۔ ان لوگوں کا شعار یہ تھا کہ دعا و نماز بالکل عریاں ہوکر ادا کرتے تھے۔ اور بعض مذہبی رسوم بھی اسیطرح انجام دیئے جاتے تھے۔ تیرھویں صدی میں جرمنی کے اندر ایک عیسائی فرقہ ایسا پیدا ہوا جس میں تمام زن و مرد برہنہ رہتے اور جنکا اصطلاحی نام "اخوان روح آزاد" (Brethren of the free Spirit) تھا۔

اس کے بہت زمانہ کے بعد فرانس میں پکارڈوں (Picards) کا ایک جدید فرقہ پیدا ہوا جسکو شارع عام پر بھی عریاں پھرنے میں باک نہ تھا۔ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ نے ان کے پیر و مرشد کو "آدم نو" (New Adam) بنا کر بھیجا ہے تاکہ دنیا میں از سر نو قانون فطرت کی پابندی کرائے۔ مگر ان کو لوگوں نے اس قدر ستایا کہ یہ فرقہ بھی بالآخر نیست و نابود ہوگیا۔

قرون وسطیٰ میں ایک مذہبی ڈرامہ تیار ہوا تھا جس کا نام آدم و حوا تھا۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن دونوں برہنہ ہوکر تمثیل کرتے تھے اور تمام امرا و شرفا اس کو نہایت خوشی سے دیکھتے تھے۔

آر ڈی مانڈلا کلیریر (R. de maulde la claviere) نے فرانسیسی مجلہ (Revue de l'art) (شمارہ ۱۸۹۹ء) میں لکھا ہے کہ سولھویں صدی میں عورتیں اپنے ملنے والوں کو سنگارخانوں بلکہ غسل خانوں میں بھی بلا لینے سے پرہیز نہ کرتی تھیں۔ بعض عورتیں اور زیادہ کھل کھلیں یہاں تک کہ بہت سی مشہور خواتین نے اپنی رنگین تصویریں نا فنک برہنہ ہو کر کھنچوائیں چنانچہ "شانتلی" (Chantilly) کے نگارخانہ میں (Gabrielle d'Estrées au Bain) کی ایسی تصویر موجود ہے۔

سترھویں صدی کے وسط میں انگلستان کی حالت بھی ایسی ہی تھی اور برہنہ پھرنا ممنوع نہ تھا پیپیز (Pepys) نے لکھا ہے کہ ۲۹ جولائی ۱۶۶۷ء کو کویکر (Quaker) فرقہ کا ایک شخص برہنہ حالت میں دوڑتا ہوا ویسٹ منسٹر ہال میں آگیا اور چلانے لگا کہ "اے لوگو توبہ کرو توبہ کرو"۔ اسی طرح سینانکور (Senancour) نے ایسی بہت مثالیں درج کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یوروپ میں اس وقت مسلک عریانی موجود تھا۔

عریانی کا اثر صحت پر

انیسویں صدی میں جو لوگ اس مسلک کے علمبردار ہوئے انھوں نے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ عریانی بلحاظ حفظان صحت نہایت مفید چیز ہے۔ اسکاٹلینڈ کے جج لارڈ مونبوڈو (Lord monboddo) کو جو بہت سے جدید خیالات کے موجد ہیں اب سے دو صدی قبل ہی جسم کو برہنہ رکھ کے ہوا کے دینے کے فوائد معلوم ہو گئے تھے۔ اور وہ عریاں طریقہ جسے عرف عام میں "ہوائی غسل" (Air Bath) کہتے ہیں انھیں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ مشہور انگریز سوانح نگار بوزویل (Boswell) نے اپنی کتاب "جانسن کی سوانح عمری" کی جلد سوم میں صفحہ ۱۶۸ پر لکھا ہے کہ :۔ "۱۷۷۷ء میں مجھ سے لارڈ مونبوڈو نے کہا کہ :۔ میں ہر روز صبح چار بجے اٹھتا ہوں پھر برہنہ ہو کر کمرہ میں ادھر ادھر ٹہلتا ہوں۔ اور بعض اوقات کمرہ کی کھڑکی بھی کھول لیتا ہوں"۔ اس طریقہ کا نام انھوں نے "ہوائی غسل" رکھا تھا۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ صاحب موصوف روز صبح کے وقت محل کے صحن میں اپنی حسین و جمیل بیٹیوں کو بھی عریاں حالت میں ہوائی غسل کی مشق کرایا کرتے تھے۔ اسی صدی کے ایک مشہور و ممتاز شخص بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صحت جسمانی کو ترقی دینے کے لئے اپنے دارالمطالعہ میں بعض اوقات بالکل برہنہ ہو کر کام کیا کرتے تھے۔

"غسل ہوائی اور غسل شمسی" (Sun bath) کے باقاعدہ طریقوں کا سب سے زیادہ جوشیلا علمبردار ریکلی (Rikli) تھا جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرا ٹرییسٹ (Trieste) اور آسٹریا کے دیگر مقامات میں ہوائی اور شمسی غسل خانے قائم کئے۔ اب دنیا کے مختلف مقامات میں شمسی غسل خانے (Sun Bath) مختلف عوارض جسمانی دور کرنے کے لئے قائم ہو گئے ہیں۔ اور اطبائے حاذق نے عام طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ ہوا اور روشنی کا

اثر انسان کی صحت جسمانی پر بہت پڑتا ہے۔ جرمنی میں شمسی غسل خانے اب کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ دق، سل، وجع المفاصل فربہی، کمی خون، ضعف اعصاب وغیرہ میں ڈاکٹر لنکئی (Dr. Lenkei) ہمیشہ ہوائی یا شمسی غسل تجویز کرتے ہیں۔

شکاگو کے پروفیسر جے۔ این۔ ہائڈ (Hyde) کا قول ہے کہ امراض سوداوی روشنی آفتاب کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں جنکا بہترین علاج دھوپ کھانا اور روشنی میں بیٹھنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قول کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ گرم ممالک اور حبشی اقوام میں یہ مرض نہیں پایا جاتا۔ عریانی کے مفید صحت ہونے کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جتنی قومیں برہنہ یا نیم برہنہ رہتی ہیں ان کے جسم مضبوط، ہاتھ پاؤں سڈول اور صحت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ اور جہاں جہاں لوگوں نے مسلک عریانی ترک کرکے لباس پہننا شروع کردیا وہیں تمام قسم کی بیماریاں پیدا ہوگئیں اور ان میں شرح اموات زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ممالک یورپ میں جرمنی کے اہل قلم اور ڈاکٹروں نے برہنگی کی بڑی حمایت کی ہے خصوصاً ڈاکٹر ایچ۔ پیوڈر (H. Pudor) نے اپنی کتاب (Nackt Cultur) اور ڈاکٹر آر۔ انگیویٹز (R. Ungewitter) نے اپنی کتاب "Die Nacktheit" میں اس کی بہت تائید کی ہے اور لطف یہ ہے کہ ان فاضل لوگوں نے یہ حمایت صرف اصول حفظان صحت کی بنیاد پر نہیں کی بلکہ اخلاقی اور فنی وجوہ پر بھی کی ہے۔ ڈاکٹر پیوڈر کا قول ہے کہ کھیل کود اور ورزش گاہوں میں اگر اس کو جاری کردیا جائے تو وہ نہ صرف شفاء الامراض کا کام دیگی بلکہ ترقی اخلاق کا بھی موجب ہوگی لہذا لازم ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو ایک ساتھ بحالت عریانی درستی جسم و اخلاق کی تعلیم دیجائے۔ ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ جن قوموں نے مسلک عریانی کو ذلیل سمجھا وہ روز بروز کمزور ہوتی چلی گئیں۔ اور ڈاکٹر انگیویٹز کو بالکل یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب کچھ دنوں بعد دنیا خود بخود اس مسلک کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگی۔

عریانی تعلیمی و اخلاقی نقطۂ نظر سے

اسوقت ان ماہرین تعلیم کے نقطۂ نظر سے جو تعلیم میں امور حفظان صحت اور تعلقات جنسی دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں، عریانی نہایت ضروری چیز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب جسم کو ہوا اور دھوپ آزادی کے ساتھ میسر آئے گی تو صحت نہایت اچھی رہیگی اور اسی کے ساتھ جب بچوں کے سامنے عریاں جسم رہیگا تو ان کے جمالیاتی احساس کی تربیت ہوگی

ماریا لیسچنوزکا (Maria Lischnewska) اس بات کی زبردست حامی ہیں کہ بچوں کو معاملات جنسی کی باقاعدہ تعلیم دی جائے جس کے لئے عریانی ضروری چیز ہے۔ والٹر جیرہارڈز (Walter Gerhard) نے لکھا ہے کہ جس طرح اسرار جنسی کا علم بالغ لوگوں کے لئے ضروری ہے اسی طرح بچوں کے لئے تعلیم عریانی لازم ہونا چاہئے۔ والدین اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر شرم و حیا کی باتیں سکھاتے ہیں اور پھر اس بات پر فخر و ناز کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں کو کس قدر حیادار

تھا۔ مصنف مذکور نے خود اپنی ابتدائی زندگی کا حال بیان کیا ہے جو گرم ممالک میں بسر ہوئی تھی۔ اور جہاں وہ عرصہ دراز تک
عریاں حالت میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔ "جب میں جرمنی آیا تو میری عمر تقریباً بیس برس کی ہوگی اور مجھے اول اول
اسی ملک میں آکر معلوم ہوا کہ جسم انسانی ناپاک یا فحش ہے۔ اس وقت تک واقعی مجھے معلوم نہ تھا کہ برہنہ جسم دیکھ کر کسی قسم کے
جذبات نفسانی برانگیختہ ہوتے ہیں۔ میں ان جذبات سے واقف ضرور تھا مگر وہ تن عریاں دیکھنے سے مشتعل نہ ہوتے تھے۔"

ڈاکٹر فورل (Forel) نے اپنی کتاب "Die Sexuelle Frage" میں صفحہ ۱۴۰ پر لکھا ہے کہ
بچوں کو شرمیلا اور زنانہ مزاج کا بنانا والدین کا کام ہے۔ اگر وہ انھیں تن پوشی کی زیادہ تاکید کریں گے اور دوسروں کے جسم انکی
آنکھوں سے پوشیدہ رکھیں گے تو وہ خود بخود شرمیلے بنجائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ بچوں کو پہلے ہی جسم انسانی کے جملہ اسرار سے
واقف کردینا چاہیئے خصوصاً ان کی نظروں سے بالغوں کے تن عریاں گزر جانے چاہییں کیونکہ بڑا ہو کر ان کے بھی جسم ایسے ہی
ہو جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے عام غسل خانے کھولنے چاہییں جہاں وہ دونوں ایک ساتھ
عریاں ہو کر نہایا کریں۔

اندرلنگ (Enderling) کا قول ہے کہ عریانی بچوں میں ہیجان جنسی یا بد اخلاقی پیدا نہیں کر سکتی کیونکہ
چھوٹی عمر میں ان کے اندر وہ جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لہذا جس قدر جلد بچوں کو عریانی سے مانوس کردیا جائیگا اسی قدر ان کے
جذبات نفسانی دیر میں نشو و نما پائیں گے۔ بولشے (Bölsche) نے اپنی کتاب "Liebesleben in der Natur" میں لکھا ہے کہ غسل کرتے ہوئے تو لوگوں کو اکثر عریاں دیکھ لیا جاتا ہے، لیکن ضرورت اس
امر کی ہے کہ ورزش کے وقت بھی جسم عریاں رکھا جائے اس کو اول اول تو ہر صنف کے لئے جدا جدا ہونا چاہیے لیکن جب ہم اس
خیال سے مانوس ہو جائیں تو پھر کبھی کبھی زن و مرد دونوں کو اس حال میں ایک جگہ جمع ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر انگیدیٹر (Zingermeister) بھی اس بات کے حامی ہیں کہ ورزش گاہوں اور غسل خانوں
میں کام کرتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو قطعی عریاں ہونا چاہیئے۔ اس طریقہ سے ورزشگاہ ایک مدرسۂ اخلاقیات
بنجائیگا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بچے ایک دوسرے کے تن عریاں سے مانوس ہو کر اس قابل ہو جائیں گے کہ حتی الامکان اپنے اخلاق
کی پاکیزگی کو عرصہ دراز تک قائم رکھیں۔ علاوہ ازیں ایسا کرنے سے بچوں کے بدن مضبوط و توانا ہو جائیں گے۔ اور ان کی طبیعت
میں یہ بات بھی پیدا ہو جائیگی کہ وہ خوبصورت اور قدرتی جسموں کو جمالیاتی ذہنیت سے دیکھیں۔ ڈاکٹر موصوف مثلاً تحریر
فرماتے ہیں کہ دیہات میں جو متمدن دنیا سے دور ہوتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں عریاں نہاتے ہیں لیکن ان میں کسی
قسم کا ہیجان قطعی پیدا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر روڈولف سومر (Rudolph Sommer) مشورہ دیتے ہیں کہ بچوں کو گھر میں، کھیلوں میں، باغات کی
سیر میں اور خصوصاً غسل کرنے کی حالت میں ایک دوسرے کی عریانی سے مانوس کردینا چاہیئے۔ اور اگر کسی گھر میں صرف ایک جنس

کے بچے ہوں تو ماں باپ کو چاہئے کہ وہ کسی دوسرے خاندان سے جس میں دوسری جنس کے بچے ہوں گھر سے تعلقات پیدا کر کے اپنے بچوں کا میل جول کرا دیں تاکہ دونوں جنس کے بچے ایک ساتھ پرورش پائیں۔

عریانی خلاف عفت نہیں

مسلک عریانی کی تعلیم کے ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ انسان کی فطری شرم وحیا کا بھی خیال رکھا جائے۔ یا دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو۔ اگر عریانی سے بچوں میں یہ بات پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے یا دوسروں کے جسم عریاں سے نفور ہو جائیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے اس باب میں بچوں کی تعلیم نہایت دانشمندی سے ہونی چاہئے۔ ہم جانتے ہیں کہ لباس اور شرم وحیا دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ وحشی اقوام جو عموماً برہنہ یا نیم برہنہ پھرتی ہیں لباس پہننے والی اقوام سے زیادہ باشرم اور حیادار ہوتی ہیں۔ ہر چند قدیم یونانیوں میں یہ مثل مشہور تھی کہ لباس اتارتے ہی عورت کی شرم وحیا بھی اتر جاتی ہے۔ لیکن حکیم پلوٹارک نے جو بہت بڑا معلم اخلاق تھا اس کی تردید کی ہے

جمالیاتی نقطۂ نظر سے

اسٹینلی ہال (STANLEY HALL.) نے لکھا ہے کہ جب انسان سن بلوغ کو پہونچتا ہے تو قدرتاً اپنے جسم کے نشو ونما کو دیکھ کر اس کے اندر خود بخود ایک فطری جذبہ خود نمائی اور فخر و مباہات کا پیدا ہو جاتا ہے اور اس زمانہ میں انسان تکمیل صحت وجمال اعضا کے لحاظ سے قدرت کا ایک ایسا پاکیزہ نمونہ صنعت ہوتا ہے کہ اس کے دیکھنے سے طبیعت بہت مسرور ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک آسٹریلوی مصنف نے لکھا ہے کہ میں افسردہ خاطر اور بادل ملول میلبورن اسٹریٹ پر جا رہا تھا کہ برابر کی ایک گلی سے تین بچے کھیلتے کودتے آئے اور دوسری گلی میں چلے گئے۔ میں ان کی متناسب اور خوبصورت ساقہائے سیمین کو دیکھ کر نقش حیرت بن گیا۔ طبیعت کی تمام افسردگی دور ہو گئی۔ اور روح اور جسم پر ایک قسم کی شگفتگی محسوس ہونے لگی۔ طبیعت کے تمام تفکرات دل سے محو ہو گئے میں یہ خیال کرتا تھا گویا میں کسی دوسری دنیا میں ہوں اور حوروں کے بچے میرے سامنے کھیلتے پھر رہے ہیں۔ وہ بچے اگرچہ غریب ماں باپ کے تھے لیکن ان کی خوبصورتی جو آزاد انہ ہوا اور نور آفتاب میں نشو ونما پا رہی تھی میرے لئے آج تک فردوس نظر بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری مرتبہ میں نے ایک حسین وجمیل لڑکے کو تالاب کے کنارے عریاں حالت میں نہاتے دیکھا۔ قدرت کی صناعی کا یہ اعلیٰ نمونہ میرے لئے سامان مسرت بن گیا۔ میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور میری زبان سے اضطراراً یہ الفاظ نکلے کہ "جب تک دنیا میں حسن وجمال موجود ہے میں بھی تنازع للبقا سے منہ نہ موڑونگا"

ڈاکٹر بولشے نے نہایت خوبصورت پیرایہ میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:- ہم کو انسان کے تن عریان کو دیکھنے کی اس طرح عادت ڈالنا چاہئے جیسے ہم کسی خوبصورت پھول کو دیکھتے ہیں۔ تاکہ تناسب اعضاء اور حسن وجمال کا ایک خاص اثر ہمارے دل میں پیدا ہو جائے کیونکہ پھول نہ صرف "جسم عریاں" ہے بلکہ وہ جسم کا سب سے زیادہ متبرک پاک حصہ یعنی پودھے کا عضو جنسی ہے"

ڈاکٹر ہنٹن (Hinton) نے لکھا ہے کہ:- رقص کا سچا اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ لڑکیاں عریاں ہو کر ناچیں

اور وہ دن بہت جلد آنیوالا ہے جب دنیا میں یہی طریقہ عالمگیر ہوجائیگا یعنی عورتیں ننگی ناچینگی اور مرد انھیں پاک نظروں سے دیکھیں گے۔ قدیم یونان اور دیگر ممالک میں یہی رواج تھا۔ اور آج بھی جاپان میں پایا جاتا ہے۔"

چالیس برس کے قریب زمانہ گذرا جب ڈاکٹر ہنٹن نے یہ بات لکھی تھی۔ اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یہ دیکھکر حیران ہوجاتے کہ ان کی پیشین گوئی رفتہ رفتہ کیونکر پوری ہورہی ہے۔

عریانی مُمِدِ حیات ہے

کہا جاتا ہے کہ عریانی میں نہ صرف روحانی اور طبی فوائد مضمر ہیں بلکہ نفسیاتی طور پر بھی اسکا اثر مفید ہوتا ہے جسم انسانی کے اعضا کا دیکھنا اور اس طرح سے کہ ان کے تمام جمالیاتی خصوصیات دل پر اثر انداز ہوں حیات انسانی کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک عورت کے جسم عریاں کو دیکھنا گویا کہ شگفتہ پھول، تاروں بھری رات اور منظاظم سمندر کی سیر کرنا ہے۔ اس قدر روح پرور منظر تھا جبکہ قدیم جزیرۂ مداغاسقر کی رانیاں سالانہ تقریب (Fandroon) یعنی جشن غسل) کے موقعہ پر ایسی حالت میں جبکہ قصر شاہی کا تمام صحن رعایا سے معمور ہوتا تھا اپنے شاہی لباس اتار کر ناز و ادا کے ساتھ خراماں خراماں جاکر تالاب کی مرمریں سیڑھیوں پر اترتی تھیں۔

اخلاقی پہلو

اس مسلک کے متبعین کا خیال ہے کہ جو معلم دانشمند ہوتے ہیں وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو عریانی کی تعلیم دیتے وقت یہ جذبہ بھی ان کے دلوں میں پیدا کردیتے ہیں کہ وہ اس کا مطالعہ صرف جمالیاتی نقطۂ نظر سے کریں اور نفس کو بے قابو نہ ہونے دیں۔ اگر کوئی شخص ترغیبات دنیوی سے گھبرا کر ترک دنیا کرے اور بیابان میں جا بیٹھے تو ہم اس کی پاکدامنی اور تقدس کی عزت نہیں کرسکتے۔ اصلی اور سچا تقدس وہی ہے کہ انسان دنیا میں رہے اور علائق میں نہ پھنسے۔ کسی کے تن عریاں کو دیکھنا ہمیں یہ اخلاقی سبق سکھاتا ہے کہ جس چیز سے ہم خود محروم ہیں اس کے نظارہ سے لطف اندوز ہوں، لیکن نفس امارہ کو مغلوب رکھیں۔ اور ایک اعلیٰ عمرانی زندگی میں یہی ہونا چاہئے۔ بچہ کو یہ سکھانا چاہئے کہ وہ ایک خوبصورت شگفتہ پھول کو دیکھے اور اس کے رنگ و بو اور جمال سے لطف اندوز ہو لیکن گلچینی نہ کرے اسی طرح مرد کو یہ سیکھنا چاہئے کہ وہ کسی حسین و جمیل عورت کے تن عریاں کا نظارہ تو کرے لیکن اس پر قابض ہونے کا خیال دل میں نہ لائے۔

عریانی کی ترقی

اس مسلک کے ماہرین کا قول ہے کہ فی زمانا رقاصہ عورتیں مختلف حالتوں میں اپنے فن کا کمال دکھلاتی ہیں۔ لیکن ایسی "زندہ تصاویر" یا "زندہ بتوں" سے مسلک عریانی کو کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ اور نہ ایسی عورتوں سے کوئی فائدہ پہونچتا ہے۔

ڈاکٹر پیوڈر کا قول ہے کہ اس کے لئے کھلی ہوا، کھلی دھوپ، سبزہ زاروں اور چراگاہوں کی ضرورت ہے۔ رات کے وقت مصنوعی روشنی میں کسی رقص خانہ کے اندر ایسے لوگوں کے سامنے جو خود لباس پہنے ہوئے ہیں اگر کوئی عورت برہنہ ہوگئی تو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زن و مرد کی

ایک معقول جماعت فرصت کے اوقات میں جنگلوں یا دور افتادہ سبزہ زاروں کی طرف نکل جاتی ہے۔ اور وہاں سب ملکر لطف صحبت اُٹھاتے ہیں۔ مرد اپنے کوٹ، جوتے، واسکٹ وغیرہ اتار ڈالتے ہیں اور عورتیں اپنے لباس الگ کر دیتی ہیں اور رفتہ رفتہ جب ان لوگوں میں ایک دوسرے کو نیم عریاں حالت میں دیکھتے دیکھتے ضبط نفس پیدا ہو جاتا ہے تو مرد صرف جانگھیے اور عورتیں صرف پیراہن باقی رہنے دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں درختوں میں جھولے کا پلنگ ڈالکر ان میں لیٹ جاتی ہیں اور مرد نیچے گھاس پر بیٹ کر اُنھیں دیکھتے ہیں۔ ان میں بہت سی عورتیں ناکتخدا ہوتی ہیں لیکن یہ سب ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

یہ ہے جدید فلسفۂ عریانی اور یہ ہیں وہ دلائل جن کی بنا پر آج تمام مغرب میں "عریانی" کی وبا پھیلتی جا رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب ایشیا و ہندوستان میں بھی جدید مغربی تعلیم و اصول حیات کی پابندی یہی صبر آزما مناظر پیش کریگی اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ اور جس انداز سے ہمارے ملک کی عورتوں میں تقلید مغرب کا خیال قوی ہوتا جا رہا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس آغاز کا انجام بھی وہی ہونا ہے جو آج یورپ میں نظر آ رہا ہے۔

اس حقیقت کا مطالعہ اگر کرنا ہو، تو ان لڑکیوں کو دیکھئے جو انگریزی مدارس اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں کہ وہی ہندوستان جاہل عورتوں کے ہر لباس کی غایت یہ ہوا کرتی تھی کہ کوئی حصۂ جسم نمایاں نہ ہونے پائے۔ اب ہاتھوں کو شانہ تک اور گردن و سینہ کے ابتدائی حصہ تک عریاں رکھنا اس قدر عام رواج ہو گیا ہے کہ سوائے چند قدیم خاندانوں کے کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں یہ منظر نہ دکھائی دے حتی کہ ہندوؤں کی لڑکیاں بھی جن میں اہل مغرب سے نفرت کا جذبہ بہت شدید پایا جاتا ہے، کھادی کی ساری پر بجائے ڈھیلی ڈھالی قمیص کے بلاؤز ہی کا استعمال کریں گی تاکہ ان کا ہاتھ شانہ تک اور گردن سینہ تک عریاں رہے

بعض کا خیال ہے کہ جب ہندوستان آزاد ہو جائیگا تو مغربی تہذیب کی رو بھی ضعیف ہو جائیگی، لیکن مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے۔ کیونکہ اول تو ہندوستان کے آزاد ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ علوم مغرب کے اثر سے بھی آزاد ہو جائے اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے، تو بھی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کسی قوم کے خیال میں کوئی جدید انقلاب پیدا ہوتا ہے تو وہ انتہا تک پہونچے بغیر نہیں رہتا۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان کی عورت ایک مرتبہ عریاں ہوئے بغیر رہجائے اب یہ اور بات ہے کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہم کو آپ کو یہ زمانہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

تاتاری جذبۂ انتقام کی ایک دہشت انگیز مثال

تاتار کا فاتح اعظم، چنگیز خاں، اپنی آگ و خون برسانے والی فوج لئے ہوئے شہر بخارا کے پاس پہونچتا ہے، اور چاروں طرف محاصرہ کرکے فرمانروائے بخارا کے پاس اپنا قاصد روانہ کرتا ہے۔

قاصد پہونچکر کہتا ہے:- میرا آقا چنگیز خاں، جو انسانی سروں پر خدا کی کھینچی ہوئی قہرمانی تلوار ہے تم لوگوں تک پیغام پہونچاتا ہے کہ چونکہ تم نے دنیا میں فساد پھیلایا اور گمراہی اختیار کی اس لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سرزمین کو فسق و فجور سے پاک کردوں اور شر کا مقابلہ شروع کردوں بنابراں شہر کی کنجیاں میرے پاس بھیجدو۔ اور میری اطاعت کا حلف اٹھاؤ" چونکہ اس وقت بخارا میں مسلمانوں کی ۲۰ ہزار فوج موجود تھی اس لئے اس پیغام کا جواب اعلان جنگ کی صورت میں دیا گیا۔ اور آخرکار وہ جنگ شروع ہوگئی جسے سرزمین بخارا نے نہ اسوقت تک کبھی دیکھا تھا نہ آئندہ کبھی دیکھ سکی۔ اللہ اکبر کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی دشمن کے نعروں سے زمین دہل رہی تھی، خاک سے آسمان گرد آلود تھا اور خون سے زمین رنگین، مسلمانوں نے جس عزم و ثبات سے مقابلہ کیا، تاریخ اسلام میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھا جائیگا، لیکن ان کی چند ہزار کی جماعت، چنگیز کی ٹڈی دل فوج کا کب تک مقابلہ کرسکتی تھی، آخرکار نتیجہ وہی ہوا جو کثرت کے مقابلہ میں قلت کا ہوا کرتا ہے اور چنگیز خان نے شہر میں داخل ہوتے ہی حکم دیا کہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں کا قتل عام کردیا جائے۔ اور جوانوں کو پابزنجیر کرکے حاضر کیا جائے۔

چنگیز کا معمول تھا کہ جب وہ کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتا تو جوانوں کو قتل نہیں کرتا تھا بلکہ انھیں اپنی فوج میں شامل کرلیتا تھا، چنانچہ بخارا میں بھی اسی اصول پر عمل کیا گیا اور جب قتل عام کے بعد شہر میں آگ لگاکر اسے بالکل خاکستر کردیا تو پانچ ہزار جوانان بخارا کی جماعت پابزنجیر سامنے لائی گئی۔ یہ واقعہ ۶۱۶ھ ہجری یا ۱۲۱۹ء کا ہے۔

جسوقت بخارا کی تباہی و مسماری کے بعد چنگیز خاں کوچ کے لئے آمادہ ہوا تو سردار فوج حاضر ہوا اور عرض کی کہ "اے میرے آقا، مجھے حکم ہوا تھا کہ تمام عورتیں ذبح کردیجائیں اور میں نے اسپر عمل کیا، لیکن ایک عورت کو میں نے قتل نہیں کیا" چنگیز نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر کرخت آواز سے پوچھا کہ "وہ کون عورت ہے اور اس نے کیا کیا" سردار نے جواب دیا کہ "یہ عورت اپنے شوہر کے ایک مکان میں پناہ گزیں تھی اور اس نے ایک شیرنی کی طرح ہمارا مقابلہ کیا یہانتک کہ اپنی فوج کے تین آدمی ضائع کرنے کے بعد میں بمشکل اسپر قابو حاصل کرسکا۔ میں نے اس کے ضعیف شوہر کو تو اسی کے سامنے وہیں قتل کردیا، لیکن اسکو حضور میں لایا ہوں کیونکہ صرف ذبح کردینا اس کے لئے کافی سزا نہ ہوسکتی تھی"۔

چنگیز نے حکم دیا کہ اس عورت کو سامنے لایا جائے اور جس وقت وہ حاضر کی گئی اور چنگیز کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ متحیر ہو کر چیخ اٹھا "اے ہامون! تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو، تو یہاں کیسے آ گئی"

واقعات سمجھنے کے لئے تقریباً ایک ربع صدی قبل کے صفحات الٹ دیجئے ـــ چنگیز کا عہد طفلی ہے اور اس کا باپ شمالی چین میں ایک تاتاری قبیلہ پر حکمراں ہے۔ دفعتہً اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اہل قبیلہ بگڑ بیٹھتے ہیں اور چنگیز کے ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنگیز کی ماں دانشمندی سے کام لیکر اپنے کمسن بچہ کو لیکر اپنے شوہر کے ایک قدیم دوست کے پاس چلی جاتی ہے جو خود بھی ایک قبیلہ کا سردار ہے۔

یہ امیر چنگیز اور اس کی ماں کو پناہ دیتا ہے اور چنگیز میں آثار شجاعت دیکھ کر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دیتا ہے چنگیز روز بروز اپنی جرات و لیاقت سے امیر کے دل میں گھر کرتا جاتا ہے امیر کا بیٹا اس کا یہ عروج دیکھ کر اس سے جلنے لگتا ہے۔ اور اپنے باپ کو بہت سی جھوٹی شکایتیں سنا کر کے چنگیز کا دشمن بنا دیتا ہے۔ چنگیز کی بیوی کو جب یہ خبر معلوم ہوتی ہے تو وہ تمام حالات سے اپنے شوہر کو آگاہ کرتی ہے اور دونوں وہاں سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن اسی دوران میں ایک دن یہ خبر مشہور ہوتی ہے کہ امیر معہ اپنے بیٹے کے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۶۰۳ ہجری یا ۱۲۰۶ء کا ہے۔ اہل قبیلہ چنگیز کے پاس جاتے ہیں اور اسکو لاکر اپنا امیر مقرر کرتے ہیں۔

ٹھیک اسی وقت جبکہ افراد قبیلہ افشردۂ انگور پی پی کر مشتعل آگ کے چاروں طرف رقص و سرود میں مصروف ہوتے ہیں، دفعتہً ایک عورت صفوں کو چیر کر نمودار ہوتی ہے اس حال میں کہ اس کے کپڑے تار تار ہیں، سر کے بال پریشان ہیں اور وہ آگ کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر چیختی ہے کہ "اے بزدلو! اے کمینو! تمہارے امیر اور اس کے لڑکے کا قاتل وہی ہے جسکو تم نے اپنا سردار بنایا ہے، تم نے اپنے عہد وفاداری کو توڑ دیا، تم نے خیانت کی، لیکن میں اس عہد پر قائم ہوں، اور میں اس بھڑکنے والی آگ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ "اے چنگیز! میں تجھ سے اس کا انتقام ضرور لونگی اور جب تک اپنے عہد کو پورا نہ کر لونگی، میرا سینہ اس دہکتی ہوئی آگ کی طرح جلتا رہیگا" یہ کہکر وہ عورت کسی طرف نکل گئی۔ چنگیز نے پوچھا "یہ کون تھی"۔ لوگوں نے جواب دیا کہ "اس کا نام ہامون ہے اور یہ مقتول امیرزادہ کی محبوبہ تھی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا"

یہی وہ عورت تھی جسے چنگیز خاں کی فوج کا سردار تباہی بخارا کے بعد سامنے لایا اور جس کو دیکھتے ہی تمام پچھلے واقعات اسکے سامنے آ گئے۔ یہ عورت چنگیز خاں سے انتقام لینے کا عہد کر کے خدا جانے کہاں کہاں آوارہ پھرتی رہی اور جب بخارا آئی تو ایک عرب عبداللہ الموصلی نے اس کو اپنے یہاں ٹھہرا لیا اور اس سے شادی کر لی۔ اس ازدواج سے تین لڑکے پیدا

پیدا ہوئے اور اس نے ان تینوں لڑکوں میں شروع ہی سے تاتاری انتقام و نفرت کے جذبات چنگیز کے خلاف پیدا کرنے شروع کئے۔ وہ خوش تھی کہ جب یہ لڑکے جوان ہوں گے تو ان کی مدد سے وہ ایک جماعت پیدا کر لیگی اور چنگیز سے جنگ کر کے اپنے قدیم عہد انتقام کو پورا کریگی۔ لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں خود چنگیز بخارا تک آ گیا اور ہاموں نے اپنے شوہر کے دوش بدوش عساکر تاتاری کا ایسا سخت مقابلہ کیا کہ جب تک تیس آدمی اس نے فنا نہیں کر دئے، قابو میں نہ آئی۔

چنگیز خان نے حکم دیا کہ ایک گڑھا کھودا جائے اور ہاموں کو مع اس کے تینوں لڑکوں کے زندہ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ جب تک اس کی تعمیل نہ ہوئی وہ وہیں موجود رہا اور جب ان کی آخری چیخ کو مٹی کے آخری وزن نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تو نہایت مسرور و فرحاں وہ اپنی گاڑی پر سوار ہوا جس میں تیس بیل جوتے جاتے تھے اور دوسرے ممالک و دیار کی تباہی یا بقول اس کے "شر کا مقابلہ شر سے کرنے کے لئے" بے نیازانہ آگے بڑھا، اس حال میں کہ شہر بخارا کے خرابوں سے اب بھی کہیں کہیں دھواں بلند ہو رہا تھا اور ذبح ہونے والے معصوم بچوں اور عورتوں کی کراہ ہنوز فضا میں گونج رہی تھی۔

شباب و شاعر

(شعر منثور)

وہ شبنم سے بھیگی ہوئی، برگ پوش گلاب کی کلی جس کی سُرخی پتیوں کے خطِ انفصال پر ایسی نظر آ رہی ہے جیسے کسی کا محرم مسکرا رہا ہو ——— تم نے دیکھی؟

وہ قوسِ قزح جس کی رنگینیاں ایک راہبانہ پاکیزگی ایک سماوی لحن کے ساتھ بہار کی دیوی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے نمودار ہوتی ہیں ——— تم نے دیکھی؟

سمندر کا وہ جوش جیسے کسی کا سینہ انتہائی ہیجان کے عالم میں تنفس کی شدت سے بے قابو ہو کر سمٹ سمٹ کر پھیل رہا ہو ——— تم نے دیکھا؟

ماہ کامل کا وہ عروجِ نیم شبی جو دنیائے شباب کو اپنی آبشاریں کے لطیف نغموں سے مست و سرشار بنا کر باغ کے کنجوں میں دعوتِ سرگوشی سے بیتاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

شہابِ ثاقب کی وہ روشن لکیر جو سرعتِ برق کے ساتھ فضا میں بلند ہو کر، ایک طرۂ زرکار بناتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے ——— تم نے دیکھی؟

صبح کے وقت افق کی وہ زر اندود کیفیت، جیسے کسی نے سونا پگھلا کر چاروں طرف پھیلا دیا ہو ——— تم نے دیکھی؟

اپریل میں کوہستانِ کشمیر کی وہ گل پوشیاں، جو برف پگھلنے کے بعد زمین کے اندر کی تمام مخفی رنگینیاں اور عطر بیزیاں لئے ہوئے چاروں طرف ایک افسوں سا پھونک دیتی ہیں ——— تم نے دیکھیں؟

تاتار کا وہ غزالِ رعنا جو اپنے مشکِ نافہ کی نکہت سے مست ہو کر، صحرا کی پریوں کو سپردگی کی کیفیت سے بیتاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

تم نے بارش میں کسی باغ کی فصیل پر طاؤس کو کنہیا کی طرح رقص کناں اپنی مستانہ آواز دلوں میں پیوست کرتے دیکھا ہے؟

تم نے کبھی اُس پرشور آبشار کو دیکھا ہے جو پہاڑ کی بلندی سے گرتے ہوئے صحرا کو ایک ہنگامۂ لطیف سے لبریز کر دیتی ہے؟ ———

یقیناً تم نے یہ سب مناظر دیکھے ہونگے، لیکن کیا تم نے ان تمام کیفیات کو ایک جگہ، کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھا ہے ——— اگر نہیں تو تم اس شکستہ حال، غریب الدیار، آوارہ گرد شاعر کے حال سے تعرض نہ کرو جس نے سب سے پہلی بار ان سب کا امتزاج پنگھٹ پر ایک پانی بھرنے والی دہقانی لڑکی کے اندر دیکھا اور ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا ———

باب الاستفسار

لقمان

(جناب سید عبدالمنان صاحب بھروچ)

کیا آپ از راہ کرم بتا سکیں گے کہ سورۂ لقمان میں جن بزرگ کا ذکر ہے وہ کب اور کس زمانہ میں ہوئے ہیں اور ان کے تاریخی حالات کیا ہیں۔

(نگار) لقمان کا ذکر صرف قرآن مجید میں نظر آتا ہے، بلکہ عہد جاہلیت میں کے لٹریچر میں بھی ملتا ہے اور مختلف حیثیتوں سے ملتا ہے، ایک حیثیت ان کی نہایت طویل العمر انسان ہونے کی ہے چنانچہ ان کی عمر کی تعیین اس طرح کی گئی ہے کہ انھوں نے چھ گدھے پالے وہ اپنی عمر طبعی کو پہونچ پہونچ کر مر گئے لیکن جب ساتواں گدھا پالا جس کا نام لُبد تھا تو اس کے ساتھ وہ خود بھی انتقال کر گئے، پھر چونکہ گدھے کی عمر طبعی کم از کم ۸۰ سال مانی گئی ہے اس لئے لقمان کم از کم گویا ۵۶۰ سال زندہ رہے۔ بعض نے ان کی عمر ایک ہزار سال، بعض نے تین ہزار اور کسی نے ساڑھے تین ہزار سال بتائی ہے۔ ابو حاتم السجستانی نے اپنی کتاب المعمرین میں وضاحت سے جناب لقمان کی عمر کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ سات گدھوں کے پالنے کا قصہ صرف تمثیلی بیان ہے، ان کی زندگی کے مختلف منازل و مدارج کا جیسا کہ ساتویں گدھے (لُبد) کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ لبد اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک جگہ جم کر بیٹھ جائے نہ کہیں آئے نہ جائے، چونکہ آخری زمانۂ حیات میں انسان ——— مضمحل ہو جانے سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا اس لئے اس کو لُبد کہتے ہیں اور چونکہ ساتواں گدھا جس کا نام لُبد بتایا جاتا ہے ان کی زندگی کا آخری گدھا تھا اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لُبد بول کر انکی زندگی کی آخری منزل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ پہلے چھ گدھوں کا نام ہمیں نہیں معلوم ورنہ ممکن تھا کہ ان ناموں کے مفہوم سے ہمارے اس نظریہ کی اور زیادہ تصدیق ہو سکتی۔ چونکہ لقمان سرزمین عرب سے تعلق نہ رکھتے تھے اور ان کے واقعات اہل عرب میں کسی دوسری زبان سے منتقل ہوئے ہوں گے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اُس زبان میں بجا لفظ گدھا بول کر کچھ اور مراد لیا جاتا ہو اور بعد کو دوسری زبان کے راویوں نے اصل لغوی معنی لے لئے ہوں اور اس طرح غیر معمولی طوالت عمر کی روایت اہل عرب میں منتقل ہو گئی ہو۔

بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو، عہد جاہلیت میں لقمان کو ایک حیثیت نہایت طویل العمر انسان ہونے کی بھی دیجاتی تھی

لیکن کلام مجید سے اس کی تصدیق کسی جگہ نہیں ہوتی۔

دوسری اہم ترین حیثیت ان کے حکیم و دانشمند ہونے کی ہے اور تیسری وہ جو ان کی حکایات سے متعلق ہے۔ عہد جاہلیت و عہد سعادت میں لقمان کی حیثیت صرف حکیم کی تھی اور بعض نصائح و امثال بھی اُن کے مشہور تھے، لیکن کوئی حکایت اُن سے منسوب نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ جاہلیت کے مشہور شاعر نابغہ نے جہاں جہاں لقمان کا ذکر کیا ہے وہاں ان سے کوئی حکایت نقل نہیں کی بلکہ صرف انکے دانشمندانہ احکام و اقوال ہی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا سب سے پہلے لقمان ہی نے مقرر کی تھی۔ لقمان سے جو حکایات منسوب کی جاتی ہیں وہ رسول اللہ کے کئی صدی بعد کی بدعت ہے، عہد جاہلیت یا عہد رسالت کے لقمان سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ مورخین اسلام کی تحقیق لقمان کے بابت بہت مختلف ہے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ وہ آزاد شدہ حبشی غلام تھے اور داؤدؑ کے زمانہ میں پائے جاتے تھے بنیادی کا بیان ہے کہ وہ باعورا کے لڑکے تھے (اور باعورا، ایوبؑ کا بھانجہ یا خالہ زاد بھائی تھا) طبری کی تحقیق یہ ہے کہ وہ داؤدؑ کے وزیر تھے اور عہد یونسؑ تک زندہ رہے۔ بعض لقمان کو قوم عاد کا ایک شخص بتاتے ہیں، بعض نے انھیں نبی بتایا ہے اور ان کے صحیفہ کا نام مجلہ ظاہر کیا ہے، ثعلبی نے لقمان اور بلعم باعورد کو ایک ہی ہستی قرار دیا ہے۔ بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اور یونانی حکیم (Esop) ایسپ ایک ہی شخص تھے۔ ایک جماعت محققین کی اس طرف گئی ہے کہ لقمان دراصل اخیقار ہے۔ اخیقار سخاریب (شاہ اشوریہ) اور اس کے بیٹے کے زمانہ کا نہایت ہی دانشمند دستی وزیر تھا اور اس سے بہت سے امثال و نصائح نقل کئے گئے ہیں۔

اس مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں سب سے پہلا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لقمان سرزمین عرب کے فرزند تھے یا باہر کے، لیکن چونکہ متفقہ طور پر سب نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اہل عرب میں سے نہ تھے[1] اس لئے اب غور طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کا کیا نام تھا اور مسلمانوں کی روایات میں ان کا ذکر کیونکر آگیا۔ اس وقت تک جتنی تحقیق ہو چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقمان کی ہستی متعین کرنے میں بلعم باعورہ۔ ایسپ یونانی اور اخیقار انھیں تینوں کا نام آتا ہے، اور انھیں تینوں میں سے کوئی ایک شخص سرزمین عرب میں لقمان کے نام سے موسوم ہو گیا ہوگا۔

اب ہم ان تینوں پر علحدہ علحدہ تفصیلی گفتگو کر کے دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کس کو لقمان سمجھیں اور کس کو نہیں۔

(۱) عربی زبان میں جسکو بلعم باعور یا بلعم بن باعورہ کہتے ہیں، وہ وہی ہیں جو عبرانی میں بلعام بن بعور کے نام سے

---

[1] ایک بڑا ثبوت لقمان کے غیر عرب ہونے کا یہ ہے کہ قرون وسطی میں جو حکایات لقمان کا مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں کسی جگہ شترمرغ، اونٹ، گیدڑ اور کفتار کا ذکر نہیں ہے جو عرب کے خاص جانور ہیں اور جن کا ذکر ایک عرب نژاد شخص کے حکایات میں ہونا ضروری تھا

موسوم ہے۔ لقمان و بلعم دونوں کو ایک ہی ہستی قرار دینے کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ لفظ بلعم کا مادہ "بلع" اور لفظ لقمان کا مادہ (لقم) دونوں ہم معنی ہیں یعنی جس طرح بلع کے معنی نگلنے کے ہیں اسی طرح لقم کے بھی ہیں اور یہ بالکل قرین عقل ہے کہ بلعم کا ترجمہ کرکے عربی میں اُسے لقمان کر دیا گیا ہو۔ ثعلبی نے بھی یہی دلیل پیش کی ہے اور لیطرس انفانسوس نے بھی یہی لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ان دونوں ناموں کی لغوی تحقیق کا تعلق ہے یہ بات دل کو لگتی ہے کہ بلعم اور لقمان کو ایک ہی ہستی قرار دیا جائے، لیکن نہ قرآن پاک کی سورۂ لقمان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ عہد جاہلیت کے لٹریچر سے۔ قرآن مجید میں لقمان کو ایک حکیم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کے بہت سے اقوال و نصائح بتاکر ان کا ذکر عزت و توقیر سے کیا گیا ہے جیسا کہ عہد جاہلیت کے لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے۔ درحالیکہ اگر لقمان اور بلعم ایک ہی شخص ہوتے تو نہ کلام مجید میں انکا ذکر احترام سے کیا جاتا اور نہ عہد جاہلیت میں۔ کیونکہ بلعم کا گمراہ ہستی ہونا توریت کی روایات سے ثابت ہے اور عہد جاہلیت و عہد رسالت میں اہل عرب روایات توریت سے بخوبی واقف تھے۔

خود قرآن مجید کی سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ میں بلعم کے مردود ہونے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

واتل علیہم نبا الذی آتینہ آیاتنا فانسلخ منہا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین

(اور ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ پھر وہ ان نشانیوں سے محروم کر دیا گیا کیونکہ وہ شیطان کا تابع ہو کر گمراہ ہو گیا تھا)

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جن میں سے بعض روایات ظاہر کرتی ہیں کہ اس آیت میں بلعم کی طرف اشارہ ہے۔ ہرچند بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں امیہ بن ابی الصلت اور ابو عامر کی طرف اشارہ ہے، لیکن اکثر کا رجحان اسی طرف ہے کہ بلعم مراد ہے۔ علاوہ اس کے خود قرآن پاک کے سیاق و سباق سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی یا اس کے قریب زمانہ کا کوئی شخص مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ آیت سورۂ اعراف کی ہے، جو سورت گویا وقف ہے امم قدیمہ و انبیاء سلف کے ذکر کے لئے، چنانچہ اس آیت سے قبل نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ اور موسٰیؑ کا ذکر سلسلہ وار ہوتا چلا آیا ہے۔ پھر چونکہ بلعم کا ذکر بھی شعیب و لوط ہی کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ آیت زیر بحث میں بلعم ہی کا ذکر کیا گیا ہو، جس نے حسب روایات توریت آخر میں خدا سے غداری کی اور خدا نے اس سے اپنی نشانی مستجاب الدعوات ہونے کی چھین لی۔[۱]

اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ اس آیت میں بلعم کی طرف اشارہ نہیں ہے، تو بھی کلام مجید میں جس لقمان کا ذکر

۱؎ توریت کتاب اعداد باب ۲۲ - ۲۴

ہوا ہے وہ بلعم نہیں ہو سکتا، کیونکہ بلعم کا ایک مرد دہستی ہونا، روایات توریت کے مطابق ضرور رسول اللہ کو معلوم رہا ہوگا اور لقمان کا ذکر قرآن پاک میں نہایت عزت و احترام سے ہوا ہے اگر لقمان و بلعم ایک ہی شخص ہوتے تو لقمان کا ذکر نہ قرآن پاک میں اس طرح کیا جاتا، اور نہ عہد جاہلیت کے لٹریچر میں اسکو کوئی بلند مرتبہ دیا جاتا۔

(۲) وہ لوگ جو لقمان اور ایسپ (یونانی) کو ایک ہی شخص بتاتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ لقمان کا [1] Aethiops یعنی حبشی ہونا ثابت ہے اور " Th " کا تلفظ س یا ش ہوتا ہے، اس لئے ملک شام میں یہ لفظ Saiops (سوفوس) ہوگیا اور یونان میں ایسپ (AESOP) یا ایسپس (AESOPUS) علاوہ اس کے دوسری دلیل یہ ہے کہ ایسپ بھی اپنی نصیحت آمیز حکایات کی وجہ سے بہت مشہور ہوا ہے۔

ہم کو اس کی صحت میں بھی بہت تامل ہے، کیونکہ اگر لقمان واقعی آزاد شدہ حبشی غلام تھے اور عہد داؤد میں وزیر کے مرتبہ پر فائز تھے تو ایسپ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ داؤد کا زمانہ ۱۰۵۰ قبل مسیح تھا اور ایسپ کا زمانہ ۶۲۰ ق م سے ۵۴۴ ق م تک رہا ہے اور اگر لقمان کا عہد داؤد میں پایا جانا غلط سمجھا جائے اور ان کو ایسپ ہی قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ عہد جاہلیت اور عہد سعادت میں ان کی حکایات کا بھی علم رہا ہوگا۔ لیکن عہد جاہلیت کے لٹریچر اور قرآن مجید میں صرف لقمان کے اقوال و امثال پائے جاتے ہیں اور کوئی ایک حکایت بھی روایتاً ان سے منسوب نہیں کی جاتی۔ حکایات لقمان کے نام سے جو مجموعہ مشرقی لٹریچر میں پایا جاتا ہے وہ رسول اللہ کے بہت بعد قرون وسطیٰ کی چیز ہے[1] اور اس میں بیشک ایسپ کے انداز کی بہت سی حکایتیں نظر آتی ہیں، سو یہ ہو سکتا ہے کہ حکایات لقمان والی ہستی ایسپ ہی ہو، لیکن وہ لقمان جس کا ذکر کلام مجید اور قدیم عربی لٹریچر میں نظر آتا ہے وہ ایسپ کے علاوہ کوئی اور ہستی تھی۔

(۳) اخیقار جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا سنحریب شاہ اشوریہ کا وزیر تھا جو اس کے بیٹے ایسارہادون کے زمانہ تک رہا۔ اخیقار کی نسبت لکھا ہے کہ وہ نہایت دانشمند وزیر تھا اور اس سے اقوال و نصائح بکثرت منقول ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ لوگ جنھوں نے اخیقار اور لقمان کو ایک ہی شخص قرار دیا وہ زیادہ راستی پر ہیں، اس کا ثبوت نہ صرف ان کی کتابوں سے ملتا ہے جن میں اقوال لقمان جمع کئے گئے ہیں بلکہ خود قرآن مجید سے ملتا ہے، کیونکہ بعض نصائح یا اقوال جو اس میں بیان کئے گئے ہیں وہی ہیں جو اخیقار کے ہیں۔

ثعلبی نے جو اقوال لقمان کے جمع کئے ہیں ان میں چند اقوال یہ ہیں:۔

---

[1] پہلا مجموعہ حکایات لقمان کا جس میں اہم قصے درج ہیں ۱۲۹۹ء میں بمقام پیرس شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "حکایات حکیم سافوس" کے نام سے زیر ادارت لینڈسبرگ شائع ہوا۔ واضح ہو کہ شامی زبان کا "سافوس" وہی ہے جو یونانی زبان کا ایسافوس یا ایسپ ہے۔

(۱) اپنے دوستوں کے ساتھ محبت و اخلاق کا برتاؤ کرو لیکن اس حد تک نہیں کہ احکام خداوندی کی نافرمانی ہونے لگے۔

(۲) تادیب کی چھڑی بچہ کے لئے اتنی ہی مفید ہے جتنا پانی تخم کے نشو و نما کے لئے۔

(۳) سفر کو نکلو تو مسلح ہو کر نکلو

(۴) بیمار ہونے سے پیشتر طبیب سے مشورہ کر لیا کرو۔

اور یہی تمام اقوال تھوڑے تغیر کے ساتھ بالکل اخیقار کے بھی ہیں۔

خود قرآن پاک کے اندر نصائح لقمان کے سلسلہ میں ایک جگہ یہ نصیحت درج ہے :-

واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر

"جب چلو تو سیدھا راستہ چلو اور گفتگو کرو تو آہستگی سے کیونکہ گدھے کی آواز بدترین آواز ہے"۔

اخیقار کا قول ہے کہ :- "چلنے میں اعتدال اختیار کر، بولنے میں نرمی سے کام لے، کیونکہ اگر بلند آواز سے کوئی گھر بن سکتا تو گدھا ایک دن میں دو گھر بنا لیتا"۔ ان دونوں اقوال کی مماثلت جس قدر واضح ہے محتاج بیان نہیں۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عہد جاہلیت و عہد رسالت میں جس لقمان کا ذکر پایا جاتا ہے اس سے مراد اخیقار ہے جو نینوا کے بادشاہ سنحاریب کا وزیر تھا، اور قرون وسطیٰ میں جو قصص و حکایات لقمان کے نام سے جمع کئے گئے ہیں وہ ایسپ کے ہیں۔ رہا یہ امر کہ اخیقار عربی میں لقمان کیونکر بن گیا، سو اس کی ایک توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اخیقار کے روایات علیم کے نام سے مشہور ہوئی ہوں اور اہل عرب نے اس کا ترجمہ کر کے لقمان کر لیا ہو اور پھر اس نے "علم" کی حیثیت اختیار کر لی، یا خود آشوریہ کی زبان میں اخیقار یا اخیقار کا مفہوم لفظ لقمان سے ملتا جلتا ہو۔

مجنوں

(جناب محمد عبد الکریم خاں صاحب۔ بہرائچ)

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ مجنوں جسے قیس عامری بھی کہتے ہیں، اس کے صحیح حالات کہاں سے مل سکتے ہیں۔

(نگار) "مجنوں" نام نہیں ہے بلکہ قیس کی صفت ہے۔ "دیوانہ یا پاگل" کے معنی میں۔ اس کا نام قیس بن ملوح بتایا جاتا ہے، بعض نے قیس بن معاذ لکھا ہے اور یہی "عامر بن صعصعہ" کے قبیلہ کی مشہور ہستی ہے جسے لیلیٰ بنت سعد سے (جو خود

لڑکی تھی عاشق ہوگیا تھا - اس کی تاریخ وفات سنہ ءِ ظاہر کی جاتی ہے - لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ واقعی یہ کوئی تاریخی ہستی تھی یا نہیں - صاحب اغانی، ابن خلکان اور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ مجنوں کی ہستی بالکل فرضی ہستی ہے اور اس کا وجود ظاہر میں کبھی نہیں پایا گیا -

ابن الکلبی کا بیان ہے کہ مجنوں کا افسانہ اور اس کے اشعار بنو امیہ میں سے کسی شخص کے وضع کردہ ہیں ——— اگر تمام شاعرانہ مبالغوں اور روایاتی اضافوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو لیلیٰ و مجنوں کا افسانۂ محبت سادہ و مختصر الفاظ میں صرف اس قدر رہجاتا ہے کہ ——— "قیس، عورتوں کی ایک جماعت میں لیلیٰ کو دیکھتا ہے اور اولین نگاہ میں عاشق ہوجاتا ہے - پھر اپنا اونٹ ذبح کر کے اس جماعت کی دعوت کرتا ہے، لیلیٰ بھی اُس سے محبت کرنے لگتی ہے - مگر لیلیٰ کا باپ شادی پر راضی نہیں ہوتا اور ایک شخص ورد بن محمد العقیلی سے نکاح کر دیتا ہے، قیس کو یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوتا ہے اور نجد کی پہاڑیوں اور وادیوں میں پاگلوں کی طرح نیم عریاں حالت میں سرگرداں پھرتا ہے اور اشعار فراق پڑھتا رہتا ہے - کبھی کبھی اُسے لیلیٰ بھی نظر آجاتی ہے اور آخر کار وہ اسی عالم نامرادی میں ایک دن مرجاتا ہے"

ریگستان عرب کی اس سادہ کہانی میں عجمی رنگ آمیزیاں سب سے پہلے نظامی گنجوی نے اضافہ کیں جن کے خمسہ میں مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی شامل ہے - بعد کو ہاتفی اور امیر خسرو نے بھی اس فسانہ کو مثنوی کی صورت میں پیش کیا - اور رفتہ رفتہ یہ واقعہ عجم کی شاعری کا ایک خاص جزو بن گیا جس سے اردو نے بھی فائدہ اُٹھایا - مولانا روم کی مثنوی میں بھی لیلیٰ مجنوں کے بہت سے واقعات منظوم کئے گئے ہیں - لیکن وہ سب تعبیرات تصوف ہیں اور واقعیت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں -

---

اعتبارات

ایک دن میں سمندر کی طرف گیا تاکہ وہاں جاکر نہاؤں۔ جب ساحل پر پہونچا تو میں نے تنہائی کی کوئی جگہ ڈھونڈھی تاکہ لوگوں کی نگاہوں سے علیحدہ نہا سکوں۔

میں اسی جستجو میں تھا کہ سامنے کی سیاہ چٹان پر ایک آدمی بیٹھا ہوا دیکھا جو اپنی تھیلی سے نمک کی مٹھیاں بھر بھر سمندر کے اندر پھینک رہا تھا ——— میں نے اپنے جی میں کہا۔ "یہ شاید کوئی متشائم (PESSIMESTIC) شخص ہے جسے زندگی میں سوائے ایک تاریک سایہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اس کے سامنے نہیں نہا سکتا اور مجھے کوئی جگہ دوسری جگہ ڈھونڈھنی چاہیئے"۔

میں آگے بڑھا تو میں نے دوسری چٹان پر ایک اور شخص دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک جواہر کار صندوقچہ تھا جس سے قند کے ٹکڑے نکال نکال کر وہ سمندر میں ڈال رہا تھا — میں نے اپنے جی میں کہا کہ ——— "یہ شاید کوئی متفاول (OPT-IMISTIC) انسان ہے جو ایسی چیزوں سے مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے جن میں کوئی مسرت نہیں اسکے سامنے اپنا جسم عریاں کرنا مناسب نہیں'

کچھ دور آگے چلکے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ساحل سے مردہ مچھلیاں چُن چُن کر کمال محبت سے پانی میں پھینک رہا تھا ——— میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ کوئی رحمدل لیکن بیوقوف انسان ہے۔ صرف زندگی کی تمنا سے موت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے بھی دور ہی رہنا اچھا"!

میں اس کے پاس گزر کر آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنا سایہ پانی کی سطح پر ڈالتا ہے اور جب موجیں اس کو درہم برہم کر دیتی ہیں تو پھر وہ دوبارہ اس کی کوشش کرتا ہے ——— میں نے اپنے دل میں کہا کہ "یہ کوئی متصوف ہے جو اپنے وہم کا بُت بنا کر اُسے پوجنا چاہتا ہے ——— اس کے سامنے بھی نہانا مناسب نہیں"۔

آگے بڑھکر ایک اور شخص نظر آیا جو سمندر کا کف لے لیکر ایک کاسۂ عقیق میں جمع کر رہا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا "یہ کوئی خیال پرست شخص ہے جو مکڑی کے جالے سے ملبوس طیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی اس قابل نہیں کہ وہ مجھے عریاں د

کچھ دور آگے چلکر دفعتہً ایک آواز کان میں آئی کہ "یہی ہے وہ سمندر۔ یہی ہے وہ عمیق و وسیع سمندر"۔ میں آگے بڑھا کہ دیکھوں یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔ دیکھا کہ ایک شخص ساحل کی طرف پشت کئے بیٹھا ہوا ہے اور اپنے دونو کانوں پر دو سیپیاں رکھے ہوئے آواز بازگشت کو سُن رہا ہے۔ میں نے کہا کہ "یہ غالباً کوئی دہریہ ہے جو کلیات سے روگردانی کرکے ناکارہ جزئیات کے سمجھنے میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے"۔

میں اور آگے بڑھا اور دیکھا کہ ایک دبلا پتلا شخص چٹانوں کے درمیان بیٹھا ہوا، ریت میں اپنا سر چھپائے ہوئے ہے میں نے سوچا کہ یہاں مجھے نہا لینا چاہئے کیونکہ یہ شخص کسی کو نہیں دیکھتا۔ لیکن میری روح نے کہا "ہرگز نہیں یہ کائنات کا بدترین انسان ہے، یہ وہ متقشف واعظ ہے جو اپنے نفس کو زندگی کی ٹریجڈی سے بچاتا ہے اور زندگی اپنی مسرتوں سے اُسے محروم رکھتی ہے۔"

اب میری روح پر دفعتہً آثار حزن وملال طاری ہونے لگے اور ایک غمگین آواز سے اس نے کہا کہ "آؤ، ان ساحلوں سے نکل چلیں، یہاں کی ہوا اس قابل نہیں کہ میں اپنے سنہرے بال اس میں کھولوں، اور نہ یہاں کی فضا اس کی مستحق کہ میں اپنے سینہ کی مقدس عریانی کو اس پر ظاہر کروں"

ایک دن آنکھ نے اپنے ساتھ کے دوسرے حواس سے کہا کہ "میں اس وادی سے بہت دور ایک بلند پہاڑ دیکھ رہی ہوں جس پر بادل چھائے ہوئے ہیں اور یہ پہاڑ نہایت خوبصورت ہے"۔

کان نے اس کی باتیں سنی اور بولا کہ "وہ پہاڑ کہاں ہے جس کا ذکر تم نے کیا، مجھے تو اس کی آواز نہیں سنائی دیتی" ہاتھ نے کہا کہ "میں بھی اُسے نہیں چھو سکتا۔ اگر وہ ہوتا تو میں ضرور اُسے چھو لیتا"۔

ناک نے کہا کہ "میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پہاڑ کیسا ہے جسے میں سونگھ نہیں سکتی"

آنکھ یہ سنکر مسکراتی ہوئی دوسری طرف متوجہ ہوگئی اور حواس نے ایک مجلس قائم کرکے آنکھ کے اس بیان پر دیر تک گفتگو کی اور آخرکار باتفاق آراء یہ تجویز منظور کی کہ "آنکھ یقیناً گمراہ ہوگئی ہے اور آئندہ سے اس کی باتوں پر اعتماد کرنا بڑی گمراہی ہے"

کل میں اپنے مکان کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک رند ژولیدہ مو یہ آوازہ لگاتا ہوا گزرا "کہ اُس سچ سے زیادہ کوئی "جھوٹ" نہیں جو انسان سے عقل وضمیر کی آزادی چھیننا چاہتا ہے اور اُس "جھوٹ" سے زیادہ کوئی "سچ" نہیں جو دنیا میں حریت فکر و رائے کے نشو و نما کا حامی ہے"۔

صفحۂ تفریحات و انعام

(صرف طلبہ کے لئے)

:-(۱):-

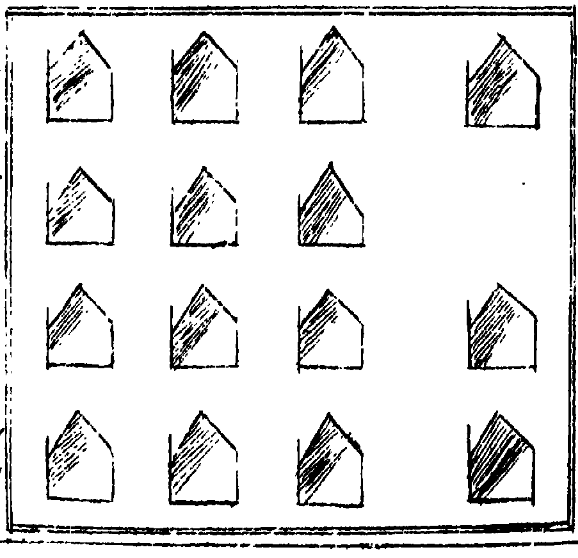
بارہ دیا سلائیاں ہیں جن سے حسب ذیل صورت پیدا کی گئی ہے:-



یعنی چار مربع برابر برابر لئے گئے ہیں۔ لیکن کیا تم ان ربعوں کو مٹا کر یہی بارہ دیا سلائیاں اس طرح رکھ سکتے ہو کہ چھ مثلث ایک ہی ناپ کے بن جائیں۔

:-(۲):-

ایک گانوں کے بارہ خاندان ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک میں چلے گئے اور وہاں جنگل میں بارہ جھونپڑے طیار کئے۔ ان خاندانوں کا ایک سردار بھی ہے جسے ہر رات ان جھونپڑوں کا چکر لگا کر دیکھنا پڑتا ہے کہ سب خیریت سے ہیں یا نہیں۔ اس غرض کیلئے یہ سردار اس طرح روانہ ہوتا ہے کہ اس کو صرف پانچ خط مستقیم بنانا پڑتے ہیں اور زیادہ چلنے کی زحمت نہیں ہوتی۔ کیا تم ان خط کو متعین کر سکتے ہو



-:(۳):-

ایک شخص کو دو لڑکے نظر آئے اس نے ان سے اُن کی عمر دریافت کی تو بڑے لڑکے نے جواب دیا کہ "میری عمر میری ماں کی عمر سے تہائی ہے"۔ چھوٹے نے کہا "اس وقت میری عمر میری باپ کی عمر سے چوتھائی ہے۔ پھر بڑے لڑکے نے کہا کہ "بارہ سال کے بعد میری عمر باپ سے نصف ہوگی" اور چھوٹے نے کہا کہ "میری عمر بھی اس وقت میری ماں سے نصف ہوگی"

بتاؤ کہ دونوں لڑکوں اور ان کے والدین کی کیا عمر تھی جب اُن سے سوال کیا گیا۔

-:(۴):-

مشہور ہے کہ دوؔ اور دوؔ کا مجموعہ چار ہوتا ہے، یعنی جب ۲ اور ۲ کو جوڑیں گے تو حاصل جمع ۴ ہوگا۔ لیکن کیا کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ دو اور دو کا مجموعہ چار سے کم ہو۔

نوٹ:- جن کے چاروں جواب صحیح ہوں گے انھیں "تذکرۂ خندۂ گل" جس کی اصل قیمت چار روپیہ ہے ذریعہ بیرنگ مفت روانہ ہوگا۔ جن کے صرف تین جواب **صحیح** ہوں گے، ان کو کتاب "شاعر کا انجام" مصنفۂ نیاز فتحپوری مفت بیرنگ روانہ کی جائیگی اور ایک صحیح جواب والوں کو کتاب "سائنس کے عجائب" مفت دی جائے گی۔

ان کے جوابات ۲۵ مارچ تک آجانا چاہئے۔ اگلے مہینے میں ان کا حل نگار میں شائع ہوگا۔

صدائے شاعر

لئیموں میں داغ جگر بیچتا ہوں
بہ نرخ خذف تاج زر بیچتا ہوں

جہاں سنگ ریزوں میں آنکھیں ہیں روشن
وہاں جنسِ لعل و گہر بیچتا ہوں

جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے
وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں

جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں

جہاں حُسن کی کوئی قیمت نہیں ہے
وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں

نہ ہوگا کوئی مجھسا بھی تیرہ قسمت
کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں

سنادو! کہ بازارِ نوعِ بشر میں
تمنائے روحِ بشر بیچتا ہوں

گدا ہوں مگر وہ گدائے غنی دل
کہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں

کوئی مشتری ہو تو آواز دیدے
میں کمبخت جنسِ ہُنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوش تاجر
مگر میں برنگِ دگر بیچتا ہوں

جوش (ملیح آبادی)

اظہار حقیقت

[illegible] برستا جاتا ہے [illegible]
[illegible] میں کیا ستم ڈھاتا ہے تو

[illegible] رقص [illegible] کے سامنے [illegible]
یوں بھی [illegible] ملتی ہے کہیں نبضِ جمال تو

[illegible] حسن [illegible] کی [illegible]
اور تو ہے خار زنِ طالبِ طوفانِ رنگ

[illegible] ہیں [illegible] کی [illegible] خمار
مختلف ہے صرصرِ طوفاں سے بادِ نوبہار

[illegible] ملتا ہے کہیں
وہ تبسم جس سے روشن ہے ستاروں کی جبیں

گوشۂ محرم چاہئے [illegible] ترنم کے لئے
بکھری ہے حسن کے نازک تبسم کیلئے

[illegible] حقیقت کا نظام
اور یہاں اب تک تری تابِ نظر ہے ناتمام

[illegible] گھٹا چھائی ہوئی
روح ہر میکش کی مستِ جامِ صہبائی ہوئی

بکھری ہے [illegible] کی شمیم
چھیڑتی ہے قلب کو آہستہ رو موجِ نسیم

اور تو اب تک ہے صرف تلخیٔ عہدِ خمار
اے خزاں پرورِ چمن! محرومِ صہبائے بہار!

ہیں گراں کتنے مزاجِ شعر پہ تیرے اصول
چند تشبیہاتِ بے معنی، کچھ اوہامِ فضول

کوندتی ہیں بجلیاں پہنائے محسوسات میں
اور تو سرگرم ہے تعمیرِ متروکات میں

تونے جانا مل گئی گیسو کی اک تشبیہِ تام
تیری فطرت نے ابھی سمجھا نہیں شب کا پیام

صبح کے جلوے تجھے دیتے ہیں پیری کی خبر
تو اگر سمجھے تو ضدِ شب ہے جوشِ سحر

چھیڑتا ہے نغمۂ بلبل کی شیریں داستاں
گرچہ خرمن پر ترے لہرا رہی ہیں بجلیاں

ہے ابھی بیگانگی پر محرمِ رازِ حیات!
تیری ہستی موت یکسر، تیری دنیا بے ثبات

حسن رازِ زشتیٔ اعمال ہے تیرے لئے
عشق اک بازیچۂ اطفال ہے تیرے لئے

کس قدر بے روح ہے تیرا کلام ناصح اب
کاش تو بھی دیکھ سکتا روئے فطرت بے نقاب

ہیچ ہے بیتابیٔ خاکِ وطن تیرے لئے
چاہئے اک جوئے شیر و کوہکن تیرے لئے

موت ہے جس جا خموشی آچکا ہے وہ مقام ختم کر اسکو کہ دریں خوب ہے تیرا کلام
شعر کو پابندِ الفاظ و بیاں کرتا ہے تو بحرا طوفان کی حد بندیاں کرتا ہے تو
شعر اگر محرومِ معنی ہو تو کیا لطفِ بیاں لاکھ موجِ کوثر و تسنیم ہو تیری زباں
چند ہم آہنگ لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں تیری نازک بندیاں شرمندۂ معنی نہیں

ذوق ہے سوز و گداز دل سے بے پروا ترا
جام ہے ناآشنائے لرزشِ صہبا ترا

اے طلبگارِ ستائش! ہے تجھے یہ بھی خبر ناشناسی پر تری ہنستے ہیں اربابِ نظر
اشتیاقِ "داد" میں ہو ہو کے مضطر دیکھنا ایک مصرع پہ ترا پیہم اکڑ اکڑ کر دیکھنا!
شعر جس نے درج پروا بابِ عرفاں کردیا تو نے اس کو مصدرِ تخریبِ دوراں کردیا
شعر تھا جو نطقِ انسانی کی اک موجِ لطیف کردیا گفتار نے تیری اسے تلخ و کثیف
شعر تھا جس پر کبھی تہذیبِ باطن کا مدار کردیا تو نے اسے تاریکیوں سے ہمکنار
شعر جس سے دوڑ جاتا تھا رگِ دل میں لہو تیری کم ذوقی سے ہے اک غنچۂ بے رنگ و بو
شعر جس نے نطق کو بخشی متاعِ لازوال تو نے اس کو کردیا اہلِ جنوں کی قیل و قال
کیا یہی گفتارِ بے معنی ہے شاعر کا پیام؟ جس نے دم بھر میں بدل ڈالا ہے قوموں کا نظام
کیا اسی رنگِ بیاں پر ہے تجھے نازِ کمال؟ کیا اسی طرزِ سخن کا نام ہے [illegible]؟
جو جگا دیتا تھا روحوں کو یہی انداز ہے؟ کھولتا تھا جو گرہ دل کی یہی اعجاز ہے؟
کیا یہی اوہامِ پستی ہیں نشانِ برتری کہہ گئے ہیں "شاعری جزویست از پیغمبری"

کب تک اہلِ علم و دانش کو ہنسایا جائیگا
شعر کا یہ مضحکہ کب تک اڑایا جائیگا

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

بادۂ سرجوش

شورِ محشر ہوا تو اے سرجوش
عشق میں ہر صدا ہے نغمۂ گوش

اٹھ گئی جب سے قیدِ ہوش و حواس
اسکے جلووں سے ہوں میں ہم آغوش

سن چکے جب وہ سرگذشتِ وفا
لب پہ تھا اک تبسمِ خاموش

یونہی ہنگامہ زا تھا حشر انداز
اور اوسپر خرامِ حشر بدوش

اس کا نقشِ قدم ہے پیشِ نظر
سن رہا ہوں فسانۂ خاموش

تڑپ اٹھے وہ حسن کے جلوے
ذرہ ذرہ ہے آئینہ بردوش

اک طلسمِ سکوت ہے لب پر
بن گئے تم تو پیکرِ خاموش

مے کو ترسا گئیں نگاہوں سے
ہائے کیا شے ہے بادۂ سرجوش

کیا کہوں سرگذشتِ راہِ وفا
ذرہ ذرہ تھا محشرِ خاموش

خاک ہو کر رہِ وفا میں کون
اس کے نقشِ قدم سے تھا ہمدوش

دیکھ تو اے نگاہِ بے پروا
اشکِ پیہم ہیں شکوۂ خاموش

جوش پر ہیں بہار کے جلوے
آگیا پھر پیامِ رخصتِ ہوش

کھل گیا رازِ عشق اے عابد
ہر نفس ہے اک آتشِ خاموش

عابد (شاہجہاں پوری)

تجلیات

وہ شراب ناب پلا مجھے جو بہشتِ کیف و سرور ہو
وہ شراب جس میں ذرا سا رنگ ہو، ہلکا ہلکا سا نور ہو
وہ تجلیات کی جان جس سے نظروں میں برق جھلک اٹھے
وہ تاثرات کی آگ جس میں گدازِ شعلۂ طور ہو

یہ نشہ فضا پہ محیط ہے کہ نظر رہینِ خمار ہے
یہ شفق کی لہر ہے جلوہ گر کہ خدنگِ ہوش نگار ہے
یہ بہارِ شام، یہ منظرِ لب جوئبار، یہ کیفیت!
کوئی نغمہ مطرب خوش نوا، ترا نغمہ جانِ بہار ہے

نہیں دل میں کوئی امنگ، بادۂ لالہ فام کو کیا کروں
نہ رہا شباب تو لطفِ عیش کے اہتمام کو کیا کروں
نہ وہ رنگ ہے نہ وہ آگ ہے نہ وہ شوق ہے نہ وہ گرمی ہے
میں خزاں نصیب بھلا بہار کی صبح و شام کو کیا کروں

یہ عجب بہار ہے جلوہ گر، یہ عجیب فیضِ بہار ہے
کہ کلی کلی کا جگر نشانِ غمِ خزاں سے نگار ہے
یہ کرشمہ سازی گرم و نور نہیں ثبات سے آشنا
یہ طلسمِ حسن و جمال کیا ہے؟ فقط نمودِ شرار ہے

علم

کیفِ آرزو

ہے درد دل بہارِ گلستانِ آرزو
روحِ نشاطِ زندگی و جانِ آرزو
گو ناتمام سوال — باندازۂ کرم
قسمت — بقدرِ وسعتِ دامانِ آرزو
آخر یہ تنگیِ دلِ ناکام تا کجا
اے جوش توڑ دے درِ زندانِ آرزو
اللہ رے عشق دلِ ناتواں کی خیر
بڑھتا ہے اور ضبط سے طوفانِ آرزو
کیا رہ گیا ہے کس کے لئے آئے گی بہار
برباد ہو گیا چمنستانِ آرزو
یہ آپ اپنی نیم نگاہی سے پوچھئے
دل اور شرحِ کاوشِ پیکانِ آرزو
پھر گل سے ہوگی نکہتِ آوارہ ہمکنار
ہاتھ آ گیا اگر کبھی دامانِ آرزو
کوکب چھپائے سے نہ چھپا کوئی رازِ دل
گویا نگاہِ یاس ہے دیوانِ آرزو

(کوکب شاہجہانپوری)

معلومات

لاسلکی تکیے

بلادِ مغرب اپنے افراد کی حفاظت کے لئے جو جو تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ اہلِ مشرق کے لئے بڑا درسِ بصیرت اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے وہاں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ جو بچہ ایک بار پیدا ہو جائے وہ اپنی عمرِ طبعی سے قبل کسی طرح نہ مرنے پائے۔ چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اُنھوں نے محکمۂ حفظانِ صحت کو اتنا وسیع و آراستہ کر دیا ہے کہ اول تو کوئی بچہ بیمار ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو اس کی صحت کے لئے آسمان و زمین ایک کر دیتے ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کی صفائی، عفونت و گندگی پیدا نہ ہونے دینے کا اہتمام، رضاعت و تربیتِ اطفال کے مرکزوں کا بہ کثرت قیام، طبی معائنے، ہدایات تحفظ و نگرانی، اشیاء خوردنی کی جانچ، ملبوسات کی صفائی، ضبطِ اوقات، الغرض وہ کیا چیز ہے جس کا تعلق صحتِ انسانی سے ہے اور اس کا اہتمام وہاں نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب کے انسان کی عمرِ طبعی بھی ۸۰ سال کے قریب ہو گئی ہے اور وہاں کا بچہ ۵ فی صدی کی اوسط سے بھی ہلاک نہیں ہوتا، جبکہ مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں ہماری عمرِ طبعی چالیس سال سے زائد نہیں اور ۵۰ فی صدی سے زیادہ بچے ولادت کے پہلے ہی سال میں ختم ہو جاتے ہیں۔

رضاعت کے بعد جب زمانۂ تعلیم و تربیت کا آتا ہے تو انسانی فطرت و افتاد کا اس قدر لحاظ رکھا جاتا ہے گویا ہر بچہ ایک مستقل قوم ہے جس کے بننے بگڑنے پر ملک کے اصلاح و فساد کا انحصار ہے۔ اس کا اندازہ امریکہ کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ کہ وہاں کوئی لڑکا کھیلتا ہوا تار کے ستون کے پاس پہونچا اور اوپر پتنگ کو الجھا ہوا دیکھ کر بے اختیار اس پر چڑھ گیا، دفعتہً ایک بار برقی رو آئی اور بچہ بیہوش ہو کر زمین پر گر گیا جس سے اس کے جسم کو کچھ صدمہ پہونچا، جس وقت اس واقعہ کی خبر حاکمِ شہر کو پہونچی تو اُس نے تار کے محکمہ کو حکم دیا کہ اتنی رقم بطور معاوضہ بچہ کے والدین کو ادا کرے۔ اور اُس جرمانہ کا سبب یہ بتایا گیا کہ کیوں محکمۂ تار نے ستون ایسی جگہ یا اس طرح نصب کیا کہ ایک بچہ کو اُس پر چڑھنے کی ترغیب ہو سکی۔

ظاہر ہے کہ جن ممالک میں انسانی جان کی حفاظت کا اس قدر خیال ہوگا وہاں کے اسپتالوں کا کیا حال ہوگا اور کیا کچھ انتظام مریضوں کے علاج و راحت کا نہ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ حال ہی میں جب لاسلکی کا زور ہوا اور گھر بیٹھے بیٹھے تمام دنیا کی موسیقی کا سننا ممکن ہو گیا تو وہاں کے شفاخانوں میں بھی یہ آلات نصب کئے گئے تاکہ علاج کے ساتھ مریضوں کی تفریح بھی پوری ہو سکے۔ پھر اُنھوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی کہ شفاخانہ میں کسی ایک جگہ اس کا انتظام کر دیتے، بلکہ اُنھوں نے ہر ہر مریض کے لئے علیحدہ اس کا اہتمام کیا اور ہر مریض کے بستر پر وہ آلہ رکھ دیا جس کو کانوں سے لگانے کے بعد آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ یقیناً رکھ رکھاؤ کی یہ آخری حد تھی اور بظاہر اس میں کسی اور اضافہ کی گنجائش نہ تھی لیکن اُنھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ دیکھ کر کہ بعض مریضوں کے لئے کان تک وہ آلہ لیجانا بھی بار ہوتا ہے۔ آلہ اٹھانے کی زحمت کو بھی دور کر دیا

اور بیماروں کے لئے ایسے تکئے بنا دئے جن کے اندر خود بخود لاسلکی رو دوڑ جاتی ہے اور بغیر کسی زحمت کے ان پر سر رکھے رکھے آپ ہی آپ گانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ کسی ملک کا اس حد تک ترقی کر جانا منحصر ہے حکومت و پبلک کے باہمی تعاون پر اور پبلک میں اس کا احساس اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس میں تعلیم عام ہو جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پبلک میں اس حد تک تعلیم عام کرنا کس کا فرض ہے اور کیا کبھی کسی غیر ملکی حکومت نے اپنے اس فرض کو پوری طرح ادا کیا ہے یا کر سکتی ہے۔

دو کروڑ فرانک کا عمل جراحی

کیا آج تک کبھی کسی نے سنا ہے کہ کسی عمل جراحی پر دو کروڑ فرانک صرف ہوئے ہوں اور کیا اس کا یقین آ سکتا ہے کہ کسی شخص نے اتنی رقم خطیر عمل جراحی پر صرف کرنا گوارا کی ہو۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو حال ہی میں نیویارک کی سرزمین میں پیش آیا

یہ عمل جراحی شاہ سیام کی ایک آنکھ پر کیا گیا تھا، جس کی قیمت اس کو دو کروڑ فرانک یا تقریباً ۲۳ لاکھ روپیہ ادا کرنی پڑی شاہ سیام اپنے ساتھ ۱۶۰ آدمی لیکر گئے تھے، اور نیویارک کے بہترین ہوٹل میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ شاہ سیام کو عمل جراحی کے سلسلہ میں عرصہ تک وہاں ٹھہرنا پڑا اور اس طرح کل مصارف کی مقدار اس حد تک پہونچ گئی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔

یہ ہیں ہمارے ایشیا کے حکمراں طبقہ کی وہ ادائیں جنھوں نے یہاں کی سرزمین کو "دنیائے زر و جواہر" اور سرزمین "سحر و افسوں" مشہور کر رکھا ہے اور یہ ہیں ہمارے فرمانرواؤں کی وہ "غلط بخشیاں" جن پر یہاں کی عام آبادی کے افلاس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ سیام کے اس احمق فرمانروا سے کوئی پوچھے کہ کیا خود اس کے ملک میں یہ عمل جراحی نہ ہو سکتا تھا کیا دنیا کا بہتر سے بہتر ڈاکٹر سیام میں نہ بلایا جا سکتا تھا، اور اگر نیویارک ہی جا کر "آنکھیں کھلنا" مقدر میں لکھا تھا تو کیا صرف چند خدام ساتھ لیکر وہ نہ جا سکتا تھا اور اگر اس کی ایک بیمار آنکھ کی تیمارداری کے لئے حقیقتاً ۱۶۰ ازریں کمر غلاموں کی ضرورت تھی، تو کیا کسی اوسط درجہ کے فرودگاہ میں قیام ناممکن تھا۔ مگر یہ سوال اُس سے کون کر سکتا ہے جبکہ خود یہاں کی جاہل و ذلیل آبادی ابتک ایک انسان کو خدا سمجھکر اس کے ہر ظلم کو خوشی سے برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہے اور وہ کیوں جرأت جبکہ اس کے پاس غریب کاشتکاروں کی کافی جماعت ایسی موجود ہے جن کے خون سے وہ اپنے تاج و دیہیم کے لئے دنیا کا قیمتی لعل شب چراغ فراہم کر سکتا ہے؟

پھر یہ انسانی تذلل و بیچارگی کا منظر صرف سیام ہی کے سرزمین کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ایشیا کا بہت بڑا حصہ اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ اور اگر یقین نہ ہو تو ہندوستان کو دیکھو، یہاں کی ریاستوں کا جاکر مطالعہ کرو کہ جس وقت یہاں کا فرمانروا نینی تال یا شملہ کی چوٹی پر "وسٹ اینڈ کمپنی" سے دولاکھ کی گھڑیاں خرید کر لوگوں کو بطور انعام تقسیم کرتا ہوتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کی رعایا کا بڑا حصہ مرطوب دلدلی زمین میں آباد ہونے کی وجہ سے ملیریا اور نمونیا کا شکار ہو رہا ہے

اور کوئی ایک متنفس ایسا نہیں جو اُن کے بے یار و مددگار، فاقہ زدہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک ہی دن کے لئے جو کی خشک روٹی دینے کا ذمہ دار بنجائے۔

پھر کوئی ان ملاعنہ سے پوچھے کہ یہ ۹۰ لاکھ روپیہ جو ولایت کی ایک کمپنی کو دیئے گئے، یہ ۳۲ لاکھ روپیہ کی رقم جو نیویارک میں تقسیم کی گئی کہاں سے آئی تھی؟ کیا یہ موتی اس تباہ حال طبقہ کی عرق پیشانی سے چن چن کر جمع نہیں کئے گئے ہوتے جو اپنی جانیں دے دینے کے بعد بھی تمھارے ظلم و ستم کی شکایت نہیں کرتا اور کیا تمھاری ان "عیش کوشیوں" کی بنیاد اسی جماعت کی فاقہ کشی پر قائم نہیں ہے جس کے ہاتھ محنت کی زخموں سے خون آلود ہیں۔ اور جسکے سینے مصائب کے ہجوم سے شق ہوجانے کے لئے بیتاب؟ پھر عقل حیران ہے کہ کیوں ابتک انتقام خداوندی محوِ خواب ہے اور اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہوسکتا ہے جس کا آسمانی قہر و غضب انتظار کر رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فرعون و شداد نے وہ مظالم انسان پر روا رکھے کہ تاریخ ان کے اعادہ سے مجبور ہے۔ ہمکو بتایا جاتا ہے کہ چنگیز و ہلاکو نے ایسی بیدردیوں سے انسانی خون کو بہایا کہ دنیا اب اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن جنھوں نے یہاں کے بعض مستبد حکومتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرعون و شداد کے ذہن میں بھی وہ اخلاقی گندگیاں نہ آئی ہونگی جن سے ان کی سرارت معمور رہتی ہے اور چنگیز و ہلاکو کے خواب میں بھی انسانی پامالی کی وہ صورتیں نہ آئی ہوں گی جو یہاں ہر وقت اور ہر آن ہر شخص کو نظر آسکتی ہیں۔ فصل من مل کر!

مکڑی مقیاس موسم ہے

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مکڑی جو مکان کے گوشوں میں باغ کے کنجوں میں لوگوں کی نگاہوں سے دور اپنا کمزور گھر طیار کرتی ہے، وہ انسان کی بڑی خدمت انجام دیا کرتی ہے جس سے ہم غافل رہتے ہیں۔ ہم جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو موسم کے متعلق پیشین گوئیاں کرنا بھی اس گفتگو کا دلچسپ موضوع ہوتا ہے، لیکن اگر ہم اسی وقت کسی مکڑی کے جالے کو جا کر دیکھ لیں تو پورے وثوق کے ساتھ آئندہ موسم کے متعلق حکم لگا سکتے ہیں کیونکہ مکڑی کا قاعدہ ہے کہ جب بارش ہونے والی ہوتی ہے یا آندھی آنے والی ہوتی ہے تو وہ بہت چھوٹے چھوٹے تار نکالتی ہے اور جب موسم کا یہ تغیر زیادہ دیر پا ہونے والا ہوتا ہے تو بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ہے لیکن اگر موسم ابر و باد سے صاف آنے والا ہے تو وہ اپنے جالے کو لانبے لانبے تاروں سے بننے لگتی ہے یعنی اگر وہ مصروف عمل ہو تو سمجھئے کہ موسم صاف رہیگا اور اگر بیکار و مضمحل ہو کر بیٹھ گئی ہے تو جان لیجئے کہ موسم میں تکدر ضرور پیدا ہوگا۔

مکڑی ہر چوبیس گھنٹے میں اپنا جالا بنکر طیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنا جالا غروب آفتاب کے وقت مکمل کرے تو رات کو پانی نہ برسنا یقینی ہے۔

زبان اور اخلاق انسانی

علمار فراست اس سے قبل اخلاق انسانی کا مطالعہ کان، آنکھ، پیشانی اور سر کی ساخت سے کیا کرتے تھے، لیکن اب ایک جدید علم رونما ہوا ہے جس کی مدد سے زبان دیکھ کر اخلاق

کا پتہ چل جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی کی زبان لانبی ہے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے صاف صاف کہتا ہے۔ اگر زبان چھوٹی ہے تو اس کے خلاف حکم لگایا جائیگا۔ اگر زبان چوڑی ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص پُر مذاق اور بہت باتیں کرنے [illegible] اپنے دل کا بھید نہیں چھپا سکتا ہے۔ اگر زبان لانبی اور پتلی ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ایسا آدمی کافی ذہین و آزاد ہے۔ [illegible] اور چوڑی ہو تو ایسا شخص بڑا جھوٹ بولنے والا ہوگا اور اگر چھوٹی بھی اور تنگ بھی تو ایسا شخص بڑا حیلہ باز [illegible] ہوگا۔

دنیا میں موٹروں کی تعداد

اس وقت موٹروں کی کثرت کے لحاظ سے امریکہ کا مرتبہ سب سے بڑا ہے چونکہ وہاں ۲۶ ملین (دو کرور ستر لاکھ) موٹریں پائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد انگلستان کا درجہ ہے جہاں سولہ لاکھ ہیں۔ پھر فرانس ہے جہاں ۱۵ لاکھ موٹریں ہیں۔ لیکن اگر آبادی کے لحاظ سے موٹروں کی تعداد پر نگاہ ڈالی جائے تو انگلستان آٹھویں درجہ پر آتا ہے جہاں ہر ۲۳ آدمی پر ایک موٹر کا حصہ ہوتا ہے [illegible] وہاں ہر فی گھرانا خاندان ایک موٹر پایا جاتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں جتنے موٹر پائے جاتے ہیں ان میں سے ۴/۵ صرف امریکہ میں ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ساٹھ لاکھ موٹر ساری دنیا میں طیار ہوئے لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد گھٹ کر ۴۴ لاکھ رہ گئی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اس سے بھی کم تھی اور سنہ ۱۹۳۲ء میں اور زیادہ کم ہوگی۔

کتوں کے حقوق امریکہ میں

امریکہ کی عدالت گاہ میں کسی شخص کی طرف سے دعویٰ کیا گیا کہ میں ہاتھ میں کچھ سودا لئے ہوئے سڑک کے کنارے "فٹ پاتھ" (… —) پر چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک کتا آیا اور اس کے [illegible] جو نازک چیزیں ہاتھ سے گر کر چور چور ہوگئیں اس لئے کتے کے مالک سے عوض دلایا جائے۔ عدالت [illegible] سماعت کی اور دعویٰ رد کر دیا۔ فیصلہ کے الفاظ یہ تھے کہ فٹ پاتھ پر چلنا سوائے سائیکلوں اور موٹروں [illegible] اور چونکہ کتا نہ سائیکل ہے نہ موٹر اس لئے اسے بھی وہی حق حاصل تھا جو مدعی کو، علاوہ اس کے مدعی کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ جب ایک طرف سے آدمی جا رہا ہو اور دوسری طرف سے کتا آ رہا ہو، تو اس صورت میں آدمی کا فرض [illegible] تصادم نہ ہو، کتے کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس تصادم کو بچائے۔"

تمام دنیا میں مسلمانوں کی آبادی

حسب [illegible] مسلمانوں کی آبادی تمام دنیا میں ۲۵ کرور ثابت ہوئی ہے جس میں زیادہ تعداد ایشیا و افریقہ کے اندر ہے۔ ذیل کے نقشے سے تفصیل معلوم ہوگی۔

شمالی افریقہ ۔۔۔ ۲۹۴۶۸۰۰۰ حسب تفصیل ذیل

مصر ۔۔۔ ۱۲۸۰۰۰۰۰	سوڈان ۔۔۔ ۳۲۰۰۰۰۰	قیروان ۔۔۔ ۲۷۵۰۰۰۰	طرابلس غرب ۔۔۔ ۵۴۹۰۰۰
ٹیونس ۔۔۔ ۲۰۰۰۰۰۰	جزائر فرانس ۔۔۔ ۵۱۷۴۰۰۰	صحرائے ہسپانیہ ۔۔۔ ۵۰۰۰۰	مراکش ہسپانیہ ۔۔۔ ۵۵۰۰۰۰

مراکش فرانس ۔ ۴۷۵۰۰۰۰

غربی افریقہ ۔۔۔ ۶۳۱۰۰۰۰ حسب تفصیل ذیل

سنگال ۔ ۹۱۵۰۰۰ کاٹنا فرانس ۔ ۱۲۰۰۰۰۰ ۔ نائجیریا ۔ ۹۵۲۰۰۰۰ ۔ سوڈان فرانس ۔ ۶۴۰۰۰۰۰ ـــ
سیرالیون ۔ ۴۵۰۰۰۰ ۔ لیبریا ۔ ۲۰۰۰۰۰۰ ۔

وسطی و ساحلی افریقہ ۔ ۹۴۸۰۰۰۰

نائجیریا برطانیہ ۔ ۷۷۹۰۰۰۰ ۔ کیمرون ۔ ۵۰۰۰۰۰ ۔ تنٹلو ۔ ۹۲۰۰۰۰ ۔ نیا سالینڈ ۔ ۱۶۰۰۰۰ ۔
جنوبی حصہ ۔ ۴۶۰۰۰ ۔

شرقی افریقہ ۔ ۷۲۵۰۰۰۰

مڈگاسکر ۔ ۸۷۰۰۰۰ ۔ زنجبار ۔ ۲۰۰۰۰۰ ۔ ٹنگانیکا ۔ ۴۰۰۰۰۰ ۔ اوگنڈا ۔ ۶۰۰۰۰۰ ـــ
کینیا ۔ ۱۰۰۰۰۰ ۔ سومال اٹلی ۔ ۵۰۵۰۰۰ ۔ سومال برطانیہ ۔ ۳۰۰۰۰ ۔ سومال فرانس ۔ ۲۱۰۰۰
اریٹیریا ۔ ۲۶۱۰۰۰ ۔ حبش ۔ ۳۰۰۰۰۰ ۔

شرقی یورپ ۔ ۳۱۰۲۰۰۰

البانیا ۔ ۵۶۴۰۰۰ ۔ یوگوسلاویا ۔ ۱۳۳۷۰۰۰ ۔ بلغاریا ۔ ۶۹۰۰۰۰ ۔ یونان ۔ ۱۸۰۰۰۰ ـــ
قبرص ۔ ۶۱۰۰۰ ۔ روڈس ۔ ۱۲۰۰۰ ۔ رومانیا ۔ ۲۵۰۰۰ ۔ پولونیا ۔ لتوانیا ۔ ۸۰۰۰ ـــ

سوویٹ روس ۔ ۱۷۷۲۵۰۰۰

روسیا و سائبیریا ۔ ۲۹۵۰۰۰ ۔ قوقاز شمالی ۔ ۱۵۰۰۰۰ ۔ قزاق ۔ ۴۱۹۰۰۰ ـــ
بلاد ازبک و داغستان ۔ ۱۰۰۰۰۰ ۔ آذربیجان ۔ ۱۷۰۰۰۰ ۔ جارجیا ۔ ۳۰۰۰۰۰ ۔ قرم ۔ ۱۸۷۰۰۰ ۔
بخارا ۔ ۷۴۷۰۰۰ ۔

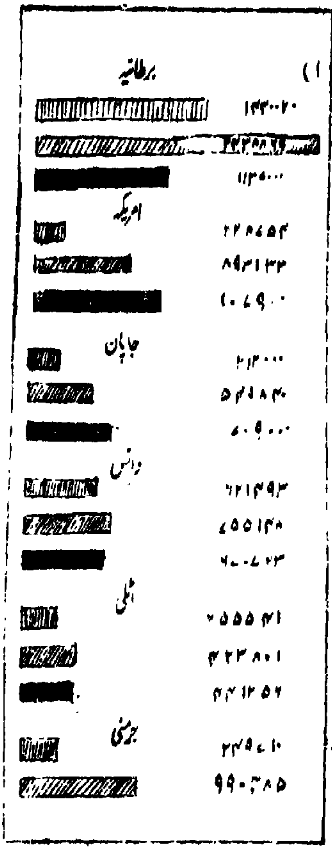
مشرق ادنیٰ ۔ ۳۳۶۲۷۰۰۰

ترکی ۔ ۱۲۶۰۰۰۰ ۔ عراق ۔ ۲۶۴۰۰۰ ۔ سوریا و لبنان ۔ ۱۹۰۰۰۰ ۔ اردن شرقی ۔ ۲۳۰۰۰ ۔
فلسطین ۔ ۵۵۷۰۰۰ ۔ ایران ۔ ۹۳۲۰۰۰ ۔ افغانستان ۔ ۶۳۸۰۰۰ ۔ جزیرہ نمائے عرب ۔ ۱۳۰۰۰۰۰

برطانیہ ہند و سیلون ۔ ۶۸۷۶۸۵۴۵

جزائر ملا ۔ ۲۰۳۴۰۹۲ ۔ چین ۔ ۸۹۰۰۰۰۰ ۔ جزائر ہند ۔ ۴۵۹۸۵۰۰۰ ۔ جزائر فلپائن ۔ ۴۴۳۰۳۷
جزائر روقیانوس ۔ ۷۰۰۰ ۔ امریکہ ۔ ۱۰۰۰۰۰ ۔ برازیل ۔ ۲۵۰۰۰ ۔ ٹرنیڈاڈ ۔ ۱۸۰۰۰ ۔
دیگر بلاد امریکہ ۔ ۱۵۰۰۰ ۔ فرانس ۔ ۱۰۰۰۰۰ ۔ بلجیم ۔ ۵۰۰۰ ۔

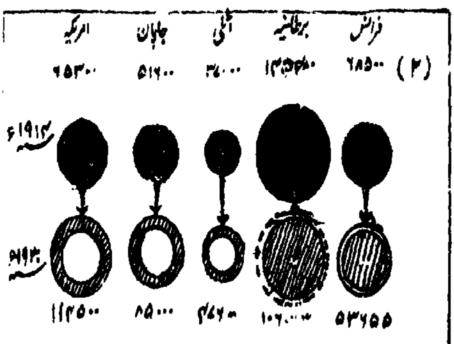
دول یورپ کی بحری قوت اور فوجی مصارف



نقشہ نمبر (۱) میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کی بحری قوت سنہ ۱۹۱۴ء میں کیا تھی سنہ ۱۹۳۲ء میں کیا ہو گئی اور سنہ ۱۹۳۶ء میں کیا ہو گی اگر کوئی اور جدید معاہدہ نہ ہوا —— ہر حکومت کے لئے تین خط ہیں پہلا خط سنہ ۱۹۱۴ء کے لئے، دوسرا سنہ ۱۹۳۲ء کے لئے اور تیسرا سنہ ۱۹۳۶ء کے لئے۔ ہندسوں سے جہازوں کا وزن ٹن میں بتایا گیا ہے۔

نقشہ نمبر (۲) میں بتایا گیا ہے کہ ہر ملک کے پاس سنہ ۱۹۱۴ء میں کتنی بحری فوج تھی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ کتنی ہو گئی۔ سیاہ دائرے سنہ ۱۹۱۴ء کی قوت کو ظاہر کرتے ہیں اور نیچے کے دائرے سنہ ۱۹۳۰ء کو ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ، جاپان اور اطالیہ کی بحری فوج زیادہ ہو گئی اور برطانیہ و فرانس کی کم ——

جنگ عظیم سے قبل جو فوجی مصارف دول یورپ کے تھے ان کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۳۰ء کے مصارف امریکہ میں ۱۹۷ فی صدی زیادہ بڑھ گئے، جاپان میں ۱۳۲ فی صدی، برطانیہ میں ۴۲ فی صدی، فرانس میں ۳۰ فی صدی، البتہ جرمنی میں ۴۰ فی صدی کی کمی ہوئی اس وقت سب سے بڑی فوج فرانس کے پاس ہے۔ یعنی ۶ لاکھ سترہ ہزار مستورات کی فوج اور مسلح پولیس اس کے علاوہ ۵۲۳۵۱ ہے۔ فرانس نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی فوج پر ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ گنی صرف کیں۔ برطانیہ نے اپنی تمام افواج پر ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ گنی صرف کیں۔ اطالیہ کے پاس ۲ لاکھ ۵۱ ہزار فوج باضابطہ ہے اور ۳ لاکھ ۷۶ ہزار والنٹیر ہیں، بلجیم کے پاس ۶۵ ہزار فوج ہے اور جاپان کے پاس ۲ لاکھ ۵۹ ہزار ——



گذشتہ سال امریکہ نے اسلحہ پر ۱۴۱۲۸۵۰۰۰ گنی صرف کیں، روس نے ۱۱۵۷۸۸۵۴۰ گنی، فرانس نے ۴۲۰۹۳۲۰۹ گنی، برطانیہ نے ۳۰۲۵۰۰۰۰ گنی، اٹلی نے ۴۲۷۸۹۴ گنی اور جاپان نے ۲۳۷۴۳۰۰ گنی ——

یورپ کے مہذب و متمدن ممالک کی وہ سرگرمیاں جو امن و سکون کے قیام کے لئے ظاہر ہو رہی ہیں ایک طرف دنیا کو دھوکا دیا جا رہا ہے کہ آلات حرب کے کم کرنے کی کوشش عمل میں آ رہی ہے اور دوسری طرف امن پسند آبادی سے حاصل کیا ہوا روپیہ آتش بار اسلحہ کی طیاری میں صرف کیا جاتا ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ جہاں اپنے معنی میں صرف نہیں ہوا۔ اس لئے کہ جہاں کے معنی کئی ہیں اور یہاں جہاں جہاں کے معنوں میں ہے۔ پھر ایک جہاں کو اضمار (محذوف) بعد قافیہ ماننا اہل فن کو نہ چاہئے۔

یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ جہاں بمعنی جہاں جہاں یقینی آتا ہے مگر اکثر جگہ تنہا دونوں جہاں کا فائدہ دیتا ہے۔ اس میں اضمار اور حذف کا گمان بالکل فضول اور دور از قیاس ہے۔ مثال کے لئے یہ شعر دیکھئے مثنوی زہر عشق۔

کل جہاں پر شگوفہ گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
کل جہاں پر تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

افسوس شاگرد اسیر لکھتے ہیں ؎

دل سے مٹی نہ یاد کبھی دام زلف کی — صیاد میرے ساتھ رہا میں جہاں گیا

میرے نزدیک آخری شعر میں جہاں جہاں چاہئے مگر چونکہ صرف جہاں ایک مرتبہ کہنے سے معنے نکلتے ہیں لہذا غلط نہیں ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ مصرع ثانی کی ردیف بیکار ہے یعنی جہاں خنجر مارا گیا کی بجائے جہاں خنجر مارا سے کام نکل سکتا ہے یہ اعتراض صحیح ہو سکتا تھا۔ مگر اس کی دو تاویلیں ہیں ایک تو یہ کہ اساتذہ کے یہاں اس طرح سے ردیف کا استعمال یا معروف کے بجائے مجہول کا بلا ضرورت استعمال بیسیوں جگہ پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاعر نے خنجر کو مفعول مانا ہے اس لئے گیا کی ضرورت ہے۔ مثال کے لئے نجر کا یہ مطلع دیکھئے۔

راز پوشی سے کبھی ہاتھ اٹھایا نہ گیا — نبض دکھلا کے مرض اپنا بتایا نہ گیا

یعنی شاعر کو کہنا یہ چاہئے۔ راز پوشی سے کبھی ہاتھ نہ اٹھایا۔ نبض دکھا کے کبھی مرض نہ بتایا۔ مگر مجہول کا صیغہ استعمال کیا ہے جو قطعاً صحیح ہے۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ جائے خوں کی ترکیب نامانوس ہے اس کی اصلاح یوں کی گئی ہے "خون کی جا آگ تھی خنجر جہاں مارا گیا"۔ ہر چند کہ جائے خون کچھ اچھا نہیں ہے مگر خوں کی جا اس سے زیادہ بھونڈا ہے۔

آرزو — سر بکف تھا عشق اس سے حسن نے کھینچی تھی تیغ — دل کی شامت تھی کہ آکر درمیاں مارا گیا

اعتراض — حضرت آرزو نے عشق و حسن کے درمیان دل کو ثالث قرار دیا ہے۔ یہ عجیب و غریب تخیل ہے جس نے شعر کی معنویت پر ایک سیاہ پردہ ڈال دیا۔ ناممکن ہے کہ عشق و حسن سے دل علٰحدہ ہو کر ثالث قرار پائے۔ جواب میں امیر خسرو اور درد کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

درد — آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے ہم کو کیا خراب — اور دل کہے کہ آنکھوں نے ہم کو ڈبا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے درد مفت میں — دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

خسرو — خواہی ایجاں برد خواہ بمن باش کہ من — مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

ان شعروں میں دل اور عشق کو علیٰحدہ علیٰحدہ ثابت کیا گیا ہے۔

(سع) یہ تحلیل میرے نزدیک صحیح اور بالکل خام ہے۔ پھر بھی شعر کچھ اچھا نہیں۔ اس سے کا استعمال قابل غور ہے۔ جو یہاں بالکل بُرا معلوم ہوتا ہے۔

آرزو۔ خوں ہوئیں راہِ وفا میں حسرتیں بھی دل کے ساتھ — اک مسافر کے لئے سب کارواں مارا گیا

اعتراض۔ اس شعر کے مصرع اولیٰ میں حسرتوں کو کارواں اور دل کو قافلہ سالار قرار دیا ہے۔ مانی ہوئی بات ہے کہ جب دل کی حسرتیں کارواں سمجھی گئیں تو کارواں سالار بھی ہونا چاہئے تھا جو سوائے دل کے کون ہوسکتا تھا۔ دوسرے مصرع میں لفظ اک کا اشارہ ہے لفظ مسافر کی طرف اور لفظ مسافر کی ضمیر راجع ہے دل کی طرف جو مصرع اول میں قافلہ سالار ہے۔ اور مصرع ثانی میں "اک اہلِ کارواں" ثابت ہوتا ہے۔ فن شعر میں اسے ترقی بہ تنزل کہتے ہیں۔ اور یہ اک ادبی عیب ہے۔ دوسرے اک اور بھی معنوی خرابی ہے جو کسی طرح نظر انداز نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ کہ پہلے مصرع میں تو کہا گیا ہے کہ راہ وفا میں حسرتیں بھی دل کے ساتھ خون ہوگئیں یعنی مرگئیں۔ اور دوسرے مصرع میں دل کے لئے حسرتیں ماری گئیں۔ شعر مذکور کے مصرع ثانی میں لفظ لئے کے معنی ساتھ یا ہمراہ کے لئے جائیں تو شعر کی معنویت درست ہوتی ہے ورنہ معنی بگڑتے ہیں۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ لئے کے معنی ہمراہ یا ساتھ کے ہوسکیں لہذا ثابت ہوا کہ شعر دولخت ہے۔ اس لئے کہ پہلے مصرع میں تو دل اور اس کی حسرتیں ساتھ مریں۔ اور دوسرے مصرع میں دل کے لئے حسرتیں ماری گئیں۔ تیسری خرابی اس شعر میں اور ہے۔ وہ یہ کہ پہلے مصرع میں کہا ہے کہ "خوں ہوئیں راہ وفا میں حسرتیں بھی دل کے ساتھ" مگر ان حسرتوں کے خون کرنے کا کوئی فاعل نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود خون ہوئی ہیں۔ اور دوسرے مصرع کی دوسری ردیف پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اور دل کی حسرتوں کا کوئی فاعل ہے اور ضرور ہے لہذا اس اختلاف بیان سے بھی شعر میں اک زبردست عیب پیدا ہوگیا۔ یعنی دوسرے مصرع کی پہلی ردیف تشریف لے گئی۔ بجائے مارا گیا کے مر گیا ہونا چاہئے۔

جواب۔ اگر مصرعوں کا دولخت ہونا ہی ہے تو اس عیب میں اساتذہ متقدمین و متاخرین سب مبتلا نکلیں گے ایک آرزو پر کیا منحصر ہے۔ مثال کے لئے مرزا غالب کا یہ شعر لیجئے؎

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

حضرت سروش کے مذاق کی موافق دونوں مصرع دولخت ہیں۔ کیونکہ مصرع اول میں کہا ہے "دل موجود ہی نہیں" لہذا داغوں کی بہار کہاں سے آئے۔ جو دکھائی جائے دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں کہ یہ چراغاں جو موجود ہے اس کا کارفرما جل گیا یعنی پہلے مصرع میں داغ معدوم ثابت ہوتے ہیں۔ اور مصرع ثانی میں موجود۔

دوسرا عیب آپ بتاتے ہیں کہ "خوں ہوئیں" اور "مارا گیا" میں تخالف ہے۔ کیونکہ اول مصرعہ میں معلوم ہوتا ہے کہ از خود

حسرتیں خون ہوئیں۔ اور مارا گیا سے نکلتا ہے کہ کوئی خون کرنے والا تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ حسرتوں کا کوئی فاعل ہے اور ضرور ہے۔ کیا خوب بات آپ نے کہی ہے۔ اگر کہا جائے کہ زید قتل ہو گیا تو آپ فرمائیں گے: خود قتل ہو گیا۔ یہاں سے فاعل کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر کہا جائے کہ ناحق قتل کیا گیا تو آپ فرمائیں گے کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کوئی فاعل ہے ضرور۔

(مولف) جواب صحیح ہے۔ اصل میں معترض کا ——— ایک اعتراض تو یہ ہے کہ "حسرتوں کی وجہ سے دل کو قافلہ سالار ملنا پڑے گا۔ اور اک کلمہ اشارہ ہے اور لفظ مسافر کی ضمیر راجع ہے دل کی طرف جو مصرع اولی میں قافلہ سالار ہے۔ اور مصرع ثانی میں "اک اہل کارواں" ثابت ہوتا ہے" یہ اعتراض قطعاً بے محل ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ حسرتوں کا قافلہ مان کر دل کو قافلہ سالار ضرور کہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسی کارواں کے ساتھ دل بھی ایک مسافر تھا جس کے اس کے لئے تمام قافلہ مارا گیا۔ دوسرے اعتراض کا جواب وہی ہے جو مجیب نے دیا ہے ۔۔۔ کے ساتھ ردیف کے بیکار ہونے کا عیب بھی اٹھ جاتا ہے

آرزو ۔ داد کے قابل ہے قاتل کی نگاہ انتخاب ۔۔۔ سو میں تھا جو ایک وہ بانکا جواں مارا گیا

اعتراض ۔ (بعد حذف زوائد) اس شعر میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر یہاں قاتل معشوق کے معنی میں آیا ہے تو جو مارا گیا ہے یقینی وہ عاشق ہے پھر عاشق کی تعریف بانکا جواں۔ خدا جانے ماہرین مرتبۂ عشق کے نزدیک کہاں تک جائز ہے

جواب ۔ آپ مرتبۂ عشق کو کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک عاشق ایک بدقوارہ سن رسیدہ کریہ المنظر شخص ہونا چاہئے خدا جانے آپ خدائے سخن کے اس شعر کو کہاں تک جائز سمجھتے ہیں ؎

عشق میں بو ہے کبریائی کی ۔۔۔ عاشقی جس نے کی خدائی کی

خدا جانے استاد قدیم ممنون کا یہ شعر آپ کی نظر سے گزرا یا نہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ممنون اٹھا دنیا سے ۔۔۔ ایک موزوں سا جواں تھا کبھی دیکھا ہو گا

فارسی میں مثنوی غنیمت ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا کیجئے۔

بگفتا زاں میاں موزوں جوانے ۔۔۔ غنیمت نام بود آتش زبانے

یہ جناب غنیمت جو ایک معشوق کی خدمت میں نیاز پیش کر رہے ہیں معشوق کی زبان سے اپنے آپ کو موزوں جوان بتاتے ہیں۔

سلیم طہرانی کا یہ شعر خدا کرے آپ کی سمجھ میں آجائے۔

گلہ از زود ستم کہ گل باغ وفایم ۔۔۔ در دست تو شائستہ تر از رنگ حنایم

اگرچہ مجیب نے جوابات میں سند اشعار پیش کئے ہیں۔ مگر یہاں محل استعمال و موقع کا جھگڑا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک آرزو کے

شعر میں جس طرح سے بانکا جوان واقع ہوا ہے وہ اچھا نہیں

آرزو و سید نواب علی خاں گوہر[1]

آرزو۔ حسرت کا مرقع ہے تصویر ہے عبرت کی مرجھائی ہوئی صورت بیمار محبت کی

اعتراض۔ مرجھائی ہوئی صورت خلاف زبان محاورہ ہے۔ کملایا ہوا چہرہ بیشک مستعمل ہے۔

(مولف) میرے نزدیک مرجھایا ہوا چہرہ۔ مرجھائی ہوئی صورت کملایا ہوا چہرہ کملائی ہوئی صورت کملایا ہوا رنگ سب مستعمل ہیں۔ اعتراض صحیح نہیں۔ معلوم نہیں کہ معترض صاحب کو اس محل پر کملانے اور مرجھانے میں کیا فرق محسوس ہوا۔ بہرحال دو شعر سودا کے نظیر میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بھی یہ محاورہ اسی طرح بولا جاتا تھا۔

جلد بدن کی ہے تازی یا پانی بن مرجھائی ہے

در مرثیۂ قاسم۔ کیونکہ تم جیتی رہیں وہ گل سی شکلیں دیکھ کر نیزوں اور تابش خورشید سے مرجھائیاں

آرزو قطرہ ایک اک اشک غم کا آتش سیال تھا بہ کے جتنی دور آیا خون اتنا جل گیا

اعتراض۔ قطرہ ایک اک فصیح نہیں۔ اس کی جگہ پر اگر قطرہ قطرہ ہوتا تو یہ عیب مٹ جاتا۔

(مولف) "ایک اک" غیر فصیح نہیں۔ اساتذۂ متقدمین حال یہاں ہزاروں جگہ موجود ہے۔ البتہ جو اصلاح دی گئی ہے اس سے ایک گونہ روانی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

آرزو۔ طے ضعف میں کی جب راہ وفا ہر گام پہ غصہ آتا تھا آنسو کی طرح تیورا کے گرے شعلہ کی طرح تھرا کے اُٹھے

اعتراض۔ طے ضعف میں کی جب راہ وفا آنسو کی طرح تیورا کے گرے۔ شعلہ کی کی طرح تھرا کے اُٹھے" مطلب اس سے پورا ہو جاتا ہے۔ "ہر گام پہ غصہ آتا تھا" حشو ہے۔ غصہ میں کوئی تیورا کے نہیں گرتا۔ ظاہر ہے کہ راہ وفا میں صبر و شکر کی ضرورت ہے غصہ کا کیا کام غالباً یوں زیادہ موزوں ہو۔

طے ضعف میں کی جب راہ وفا ہر گام پہ تھا یہ حال اپنا الخ

اعتراض صحیح ہے اگر چہ ہر گام پہ غصہ آنا۔ بے سبب نہیں ہے۔ معترض کو یہ خیال نہیں کہ یہی ضعف جس کی وجہ سے تیورا

---

[1] گوہر صاحب لکھنؤ کے ایک زمشق گو خوشگو شاعر اور معتقد رئیس زادہ ہیں۔ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر ڈپٹی کلکٹر سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں۔ آپ نے فغان آرزو (دیوان جناب آرزو) کو دیکھتے ہوئے بہت اشعار کے محاسن بیان کئے انھیں میں سے یہ اشعار قابل اعتراض قرار دیئے۔ جو رسالہ مرقع جولائی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے تھے۔

کے گرتے اور تھرا کے اُٹھتے تھے غصہ کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے مگر راہ وفا میں غصہ آنا بھی قیامت ہے۔ کیونکہ غصہ آنا خواہ کسی وجہ سے ہو راہ وفا طے کرتے ہوئے منافی شان عشق ہے۔ جو اصلاح گوہر صاحب نے دی ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کہنا یوں چاہئے کہ جب عشق میں ہم نے راہ وفا طے کی تو ہر گام پر یہ حال تھا کہ آنسو کی طرح تیوراکے گرتے تھے۔ اور شعلہ کی طرح تھرا کے اُٹھتے تھے۔

آرزو۔ نہ بجھ سکا مرے اشکوں کے گرم پانی سے　　　ارے تری نگہ بے پناہ کا شعلہ

اعتراض۔ خدا جانے نگہ بے پناہ کا شعلہ بجھانے کے لئے اشکوں کے گرم پانی کی کیا ضرورت تھی اشکوں کے پانی تک تو درست تھا مگر گرم کی قید شعلہ بجھانے کے لئے فضول معلوم ہوتی ہے۔

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ گرم پانی کی کوئی وجہ نہیں۔

آرزو۔ چشم وفا کا الزام آنکھوں کے ہوتے دل پر　　　ایسا یہ ہے کہ جیسے شیشے کو جام کہنا

اعتراض۔ یہ شعر اس قدر الجھا ہوا ہے کہ مہمل ہوگیا اس کے علاوہ چشم وفا کی ترکیب اضافی ادہر تو یہ سفارش کرتی ہے کہ "چشم وفا" کے معنے اُمید وفا سمجھو اُدہر اضافت تشبیہی ظاہر کرتی ہے کہ چشم وفا کو آنکھ سمجھ لو۔ اُمید وفا کے معنی میں یہ مفہوم ہوگا کہ عاشق کو معشوق سے وفا کی اُمید تھی۔ اس اُمید وفا کو چاہئے تھا کہ معشوق کی آنکھوں کی موجودگی میں آنکھوں ہی پر بے وفائی کا الزام لگاتا نہ کہ اُس کے دل پر۔ یہ تخیل چند صورتوں سے لغو ہوجاتی ہے۔ اول یہ کہ چشم معشوق کو بے مروت کہہ سکتے ہیں بے وفا نہیں کہہ سکتے۔ اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ وفا کو ایک آنکھ فرض کرلیا جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے وفا دل پر وفا کی طرف سے جو الزام لگایا جائے اس میں اس کی کیا ضرورت ہے کہ پہلے وفا کو آنکھ فرض کریں۔ اس کے بعد یہ دعوے کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فساد کے ساتھ چشم کا الحاق صرف دیدہ و دل کی رعایت سے امانت کے رنگ میں کہا گیا ہے کمال یہ ہے کہ چشم کو اگر بالائے طاق رکھدیا جائے تو بھی معنی کا لباس پہننے کے لئے یہ شعر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وفا کا الزام جب ہوگا معشوق پر ہوگا۔ اور معشوق کی آنکھ سے بے وفائی کا تعلق ہرگز اس قدر نہیں ہوسکتا جس قدر کہ اس کے سنگین دل سے ہوسکتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ دیدۂ و دل کو بیوفائی کے معاملے میں شیشہ و جام سے تشبیہ دینا سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ جام شیشہ سے زیادہ بیوفا سمجھا جائے

(مولف) یقینی شعر الجھا ہوا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں جو تشبیہ دی گئی ہے وہ بالکل غیر ضروری اور بے محل ہے۔ لیکن معترض صاحب نے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے معنی یہ ہیں کہ معشوق سے اُمید وفا رکھنے کا الزام باوجود اپنی آنکھیں موجود ہونے کے اپنے دل پر لگانا بے محل ہے۔ کیا آنکھیں نہیں دیکھ رہی تھیں کہ وہ بے وفا ہے۔ اب ہم دل کو کیوں

مورد الزام بنائیں۔ دوسرے مصرع میں یہ کا لفظ اگرچہ معنی تخصیص کے لئے ہے۔ پھر بھی نہ ہوتا تو کچھ نقصان نہ تھا غرض یہ کہ معترض صاحب نے جو اپنے اعتراض کی بنا معشوق کے دیدہ و دل پر رکھی ہے وہ صحیح نہیں۔

آرزو۔ ہاں موسم گل آیا سبزے کی لہک دیکھی — تم پھولو پھلو اچھا۔ ہم زہر بھی کھالیں گے

اعتراض۔ پھولنا پھلنا۔ موسم گل۔ اور زہر۔ سبزے کی لہک۔ رعایت بے معنی اسی کا نام ہے۔ خیر یہی سہی۔ مگر دونوں مصرعوں میں زمانہ کا فرق۔ یہ ہو گیا ہے کہ یا تو یوں کہنا ہوگا کہ تم پھلے پھولے ہم نے زہر کھالیا۔ گویا موسم گل آیا اور سبزے کی لہک دیکھی۔ یا اس طرح کہ تم پھلو پھولو ہم زہر کھائیں گے۔ جو موسم گل ہوگا تو سبزے کی لہک دیکھیں گے۔

(مولف) اس شعر پر سوائے لفظی رعایتوں کے اور کچھ اور بھی نہیں۔ میرے نزدیک معترض صاحب کا اعتراض صحیح ہے۔

آرزو۔ بھیگا جو آنسوؤں سے تو بند اور کس گیا — رو کر خجل ہوئے رسن زلف کے اسیر

اعتراض۔ تخئیل تو جدید ہے مگر حل طلب یہ مسئلہ ہے کہ پلنگ کی ادوائن تو بیشک بھیگنے سے کس جاتی ہے۔ لیکن اونی یا پشمینہ کی رسیاں بھی گیلی ہو کر کس جاتی ہیں یا نہیں۔

(مولف) یہ اعتراض تو خیر معمولی ہے کہ زلف کو پشمینہ کی رسی فرض کر لیا گیا ہے۔ مگر دوسرے اعتراضات جو اس شعر پر کئے جاسکتے ہیں ان پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ تخئیل نہایت رکیک ہے۔ زلف کو رسن سے تشبیہ دینا ہی کیا کم لغو تھا۔ کہ رسن زلف کی اسیری کو ایک مرئی اور واقعی امر ٹھہرا دیا گیا۔ صورت حال یہ پیدا ہو گئی ہے کہ یا تو معشوق خود موجود ہے اور اس کی زلف یا چوٹی سے عاشق کے ہاتھ بندھے ہیں اور یہ حضرت رو رہے ہیں۔ اور یا یہ ہوا ہے کہ ان کے بال کاٹ کر اس کی رسی بٹی گئی ہے اور جناب کے دست مبارک کس دیئے گئے ہیں اور آپ رو رہے ہیں۔ اصل میں یہ غلطی اس لئے سرزد ہوتی ہے کہ اردو کے شعرا ایک تشبیہ لاتے ہیں۔ اور پھر مشبہ بہ کے تمام لوازم بھی موجود کر دیتے ہیں۔ مثلاً نظر کو بجلی ٹھہرایا تو اس کو کہیں گرائیں گے ضرور۔ اور پھر اس سے خرمن بھی جلائیں گے

آرزو۔ لے نامہ رساں باندھ لے بخیرے کاغذ — مضموں ہے بربادیٔ وحشت کا جنوں میں
حلقے الگ الگ ہیں زلفیں جدا جدا ہیں — دوری کا اس کی دفتر لکھا ہے میں نے جتنا

اعتراض۔ (بہ تبدیل الفاظ) ان میں صرف مراعات الفاظ ہے اور کچھ نہیں

(مولف) اعتراض بالکل صحیح ہے اور لکھنؤ کے بڑے بڑے اساتذہ فن اسی بلا میں مبتلا رہے ہیں۔ اور انھیں الفاظ کی تلاش نے لکھنؤ کی شاعری کو مورد اعتراض بنایا۔ ناسخ۔ آتش وغیرہ کوئی بھی ان خیالات سے نہیں بچا پھر غریب آرزو

ہی کو خصوصیت سے کیوں دیکھا جائے

آرزو۔ ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا
مانند چراغ اک سوختہ تن کہ ہنستا تھا گہ روتا تھا

اعتراض ۔ میر کا بھی شعر ملاحظہ ہو ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

دونوں اشعار کی بندش الفاظ، روانی وسلاست درد و اثر سوز و گداز سے قطع نظر کرنے پر بھی "ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں" کے مفہوم کو "ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے" سے ادا کرنا میر کے شعر کا خون کر دینا ہے

موسن اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کے شعر سے یہ شعر ماخوذ ہے مگر یہ بات بھی عام ہے دو متحد المذاق شاعروں کا کلام ممکن ہی نہیں کہ مل جائے۔ یوں تو اس کی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں مگر میں دو ایک پر اکتفا کرتا ہوں۔ مومن مرحوم کا شعر ہے۔

مومن۔ چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

غالب۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آرزو۔ تھا آرزو کا قول بجاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بیقرار گھر آج پھر ہے

میر چاہا اٹھے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی میں اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

آزردہ۔ ہیں تو احباب فراہم تو سامان طرب
بزم ماتم تو ہے گر انجمن شور نہیں

غالب ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

آرزو کے دیوان میں اور بھی شعر اس قسم کے پائے جاتے ہیں مثلاً غالب کا یہ شعر بہت مشہور اور نہایت مقبول ہے۔ ؎

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

آرزو کہتے ہیں۔ افسردہ دل کی مجمع حسرت میں قدر کیا
بجھ کر چراغ لائق محفل نہیں رہا

کسی کا مشہور شعر ہے۔ شادی جو ہوئی غم کے بھی پہلو نکل آئے
جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے

آرزو نے اسے یوں لکھا ہے:۔

اظہار الم کے لئے پہلو نکل آئے
نالوں کو کیا ضبط تو آنسو نکل آئے

آزاد بلگرامی و معترض

سلہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آپ کا مولد و مسکن دار العلم قصبہ بلگرام تھا۔ (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۲۶ پر)

آزاد۔ مرا واسوخت چوں پروانہ آخر حرف گرم او　　　ز خوبان جہاں آتش زبانی کردہ ام پیدا

یعنی۔ اس کی جلی ہوئی گرم باتوں نے آخر مجھے پروانے کی طرح جلا دیا۔ میں نے خوبان جہاں سے آتش زبانی سیکھی یا پیدا کی ہے

معترض۔ واسوختن جو اس شعر میں سوختن کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے صحیح نہیں ہے۔ واسوختن جلنے کے معنی میں نہیں آیا بلکہ نہ جلنے کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ ظہوری نے دیباچۂ خوان خلیل میں یہ فقرہ لکھا ہے۔ اور نہ جلنے کے معنے لئے ہیں۔ "یک بیت سوختن۔ دیک بیت، واسوختن بنا شد"۔ استاد سراج الدین علی خان آرزو نے بھی یہی لکھا ہے کہ واسوختن، سوختن کے معنی میں نہیں آتا۔

آزاد۔ واسوختن۔ باز سوختن یعنی دوبارہ جلنے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے کہ واسوختن زغال میں وا باز کے معنی میں آیا ہے۔ شیخ نظامی ظلم دارا کے بیاں میں کہتے ہیں

زغلق آنچناں بُرد پیوندرا　　　کہ سگ وانہ بیند خداوندرا

واسوختن کے حاصل معنی پورے طور پر جلنے کے ہیں۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جلنے میں کوئلہ (زغال) میں ایک قوت باقی رہتی ہے جو دوسرے مرتبہ جلنے میں ختم ہو جاتی ہے اس وقت کوئلہ خاک ہو جاتا ہے چنانچہ یا نیدرخاں کہتا ہے ؎

گونید داغ سوزکہ واسوزی از غمش　　　خود را تمام سوختم و وانہ سوختم

یعنی داغ کے جلانے والے کہتے ہیں کہ تو اُس کے غم سے پھر جلے گا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو تمام تر جلا لیا۔ اور دوبارہ نہیں جلا۔

میرزا صائب۔ واسوختن علاج تب عشق میکند　　　این داغ را بہ درد دوا میتواں نمود

یعنی جلنا ہی تپ عشق کا علاج کر سکتا ہے۔ یہ درد ایسا ہے کہ داغ دینے سے اچھا ہو سکتا ہے نیز یہ کہ معترض نے ظہوری کا فقرہ جو سند میں پیش کیا ہے اس کے وہ معنی نہیں جو سمجھے گئے بلکہ وہ فقرہ ایجابی ہے جسکے یہ معنی ہیں کہ ایک بیت پہلے جلنا اور ایک بیت دوبارہ جلنا یہ نہیں ہوتا۔ اور اس قول کی میرزا صائب کا یہ شعر تائید کرتا ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) میر عبدالجلیل صاحب بلگرامی اعلی اللہ مقامہٗ کے نواسے تھے۔ فارسی اور عربی کے اُن زبردست عالموں اور فاضلوں میں سے تھے جنسے اہل زبان بھی استفادہ کرتے تھے عمر بھر علم و عمل میں مشغول اور لطائف ادبی کی تالیف و تحریر میں منہمک رہے چنانچہ ید بیضا۔ خزانۂ عامرہ۔ سرو آزاد۔ آپ کے لکھے ہوئے تذکرے موجود ہیں جو اس وقت تک دنیا کو حیرت میں ڈالتے ہیں کہ کیا ایک نظر اتنی وسیع ہو سکتی ہے۔ اور کیا شخص اتنی معلومات بہم پہونچا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ عربی و فارسی کے دیوان۔ اور بہت سی نادر تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ آپ سنہ ۱۱۱۶ھ کو بمقام بلگرام پیدا ہوئے۔ اور بعد تحصیل علوم ہندوستان کے اکناف و اطراف میں پھرے چنانچہ آخر عمر کا حصہ اورنگ آباد میں بسر کیا۔ یہاں جائداد بھی خریدی جو سنا ہے کہ اب تک محفوظ ہے سنہ ۱۲۰۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں خود لکھا ہے کہ میرے ان شعروں پر اعتراض ہوئے اور پھر جواب بھی تحریر فرمایا ہے

قیاس زور ہر مے میتواں کرد از خمار او   کہ از واسوختن گردد عیار سوختن پیدا

معنے یہ ہیں کہ جو کوئلے پہلی آگ میں جلتے ہیں۔ بغیر زیادتی اور نقصان کے دوسری آگ میں اچھے ہوتے ہیں۔ ورنہ اچھے نہیں ہوتے۔ لہذا شاعر نے شراب کے نشے کو آتش اول اور خمار کو آتش ثانی سے تشبیہ دی ہے اور کہتا ہے کہ ہر شراب کا زور اس کے خمار سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ چاشنی سوختن کی واسوختن سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح خان آرزو کے متعلق جو لکھا ہے کہ انکا قول بھی یہی ہے کہ واسوختن = جلنے کے معنی میں ہے یہ خان آرزو پر گویا ایک تہمت لگائی ہے۔ انھوں نے اپنے تذکرۂ مجمع النفائس میں تشبیہی کاشی کے ذکر میں یہ شعر لکھا ہے۔

از وحکایت واسوختن بمن مکنید   نہ سوخت ہست چنانم کہ از تو ہم سوخت

یعنی مجھ سے یہ نہ کہو کہ وہ مجھے پھر جلائے گا۔ اس نے مجھے ایسا نہیں جلایا ہے کہ دوبارہ جلائے اس شعر میں واسوختن صریحی دوبارہ جلنے کے معنے میں آیا ہے۔ پھر بھلا جو شخص اپنی تالیف میں یہ شعر لکھ رہا ہے وہ کیونکر کہے گا کہ واسوختن = جلنے کے معنے میں ہے اسی طرح خان آرزو نے رضائی مشہدی کے ذکر میں لکھا ہے کہ " واسوختہ دار د مثل ملا وحشی کہ بسیار گرم گفتہ "۔ یہ عبارت بھی معنی مجازی کے ثبوت میں ہے۔

نیز خان آرزو نے مرزا عبد القادر بیدل کے ذکر میں یہ شعر لکھا ہے

بداغ صد کلف واسوختم از خامی ہمت   چو مہ از خانۂ خورشید گر آتش طلب کردم

مرزا عبد القادر نے اس شعر میں مجازی معنوں پر واسوختم کا استعمال کیا ہے۔ اگر یہ لفظ معنی سلبی پر ہوتا تو یقینی آرزو کچھ لکھتے

(مولف) میرے خیال میں مولانا نے جس قدر اسناد پیش کی ہیں بہت کافی ہیں۔ اور کچھ لکھنے کی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے۔ یقینی واسوختن دوبارہ جلنے کے معنی میں مولانا کے شعر میں صحیح ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مولانا نے وا کو زائد کیوں نہ قرار دیا کیونکہ وا بہت سی جگہ زائد مستعمل ہوتا ہے۔ جیسے وارستگی۔ وابستہ۔ واجستن وغیرہ وغیرہ ورنہ اس حالت میں شعر پر دوسرا اعتراض اور وارد ہوتا ہے مطلب تو صرف اتنا ہے کہ مجھے پروانہ کی طرح اس کے حرف گرم نے جلا دیا۔ مگر مولانا وا سے تکرار کے معنی لیتے ہیں۔ حالانکہ مشبہ پروانہ ہے جس کو شمع ایک ہی بار جلاتی ہے

آزاد۔   حرف دنیا در کتاب سینۂ دانایاں حک است   گر نبی الحاق در قرآں سزائے کز لک است

معترض۔ سینہ کی تشبیہ قرآن سے کسی نے نہیں دی ہے۔ دل کو قرآن سے مشبہ ٹھہرایا ہے

آزاد۔ سینہ کو شعرا نے کتاب کہا ہے اور ظاہر ہے کہ پہلے ناظم نے کتاب فرض کیا پھر اس کتاب کو قرآن مانا تو کیا قباحت ہے مطلق سینہ کو قرآن نہیں کہا۔ لیکن معہذا اگر صرف سینہ کو قرآن کہیں تو کیا قباحت ہے۔ خاص و عام کی زبان پر یہ فقرہ ہے کہ علم در سینہ نہ کہ در سفینہ پس جبکہ سینہ کو محل علم قرار دیدیا اور کتاب کا اطلاق کیا تو اس حالت میں اگر کوئی قرآن کا

استعارہ کتاب اللہ سے کرے تو کیا ہرج ہے کیونکہ استعارے کا دروازہ مسدود نہیں ہوا ہے۔ اور کتاب اللہ اور کتاب الناس میں صورتاً کوئی فرق نہیں۔

آزاد۔ خرقِ پیران خرابات تماشا کردم   کہ بہ صہبائے کہن باز جوانم کردند

معترض۔ خرق۔ بے لفظ عادت کے سلف و خلف کے کلام میں دیکھا نہیں گیا

آزاد۔ قاعدہ مقررہ یہ ہے کہ لفظ مطلق قرینہ کی دلالت سے مقید ہوتا ہے۔ لفظ پیران خرابات۔ اور مصرع ثانی قرینۂ واضح ہے۔ جوانی دوبارہ سوائے خرق عادت کے اور کیونکر آسکتی ہے۔ مولانا جامی سلسلۃ الذہب میں معجزات انبیا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

از ولی خارقے کہ سر زد است   معجز ان نبی متبوع است

اس بیت میں بھی لفظ خارق مطلق ہے مگر ولی اور معجزے کے قرینہ سے مقید ہو گیا۔

آزاد۔ آزاد جائے عشق بود در کنار حسن   بر شاخ گل درست کند خانہ عندلیب

معترض خانہ کا اطلاق آشیانۂ طیور پر نہیں کیا جاتا۔

آزاد۔ کہا جاتا ہے مثالیں دیکھئے۔

مرا در غربت از این بیگانہ دیار زد   کہ گل عزم سفر کردہ است و بلبل خانہ میساز د

کاہی نیشاپوری۔ استخوان ہائے ضعیف است پناہ دل زار   خانۂ بلبل نالندہ ز خاشاک بود

محتشم کاشی۔ مرغ دل محتشم خستہ را   خانہ کمان خانۂ ابروئے تست

شیخ علی نقی کمرہ۔ بہر آنے چو گل از زدول خونین نا شادے   تزلزل افتد اندر خانۂ بلبل ز ہر بادے

نظیری نیشاپوری۔ چو عریاں شد چمن برخاد مزرت خانہ میساز د   چو قحط گل بود بلبل بہ آب و دانہ میساز د

سلیم طہرانی۔ سید گلفروشش را ماند   خانہ بلبلاں این گلزار

کلیم ہمدانی۔ در گلستانے کہ زاغ و بلبلش ہمخانہ اند   چشم بستم پیش ازین در دیدہ جائے خار نیست

اُمیدی رازی۔ اے چغد بہ ویرانۂ من خانہ نسازی   ترسم کہ تو ہم با من دیوانہ نہ سازی

اسیر شہرستانی۔ ہستی قدر اثر عشق خانہ سوز بس است   کہ برگ گل شدہ دیوار خانۂ بلبل

آزاد۔ بروئے یار عقیق دہن بود نایاب   زخامہ ماند درین نسخہ سرخی سرباب

معترض۔ عقیق دہن مستعمل نہیں عقیق لب آتا ہے

آزاد۔ عقیق دہن مستعمل ہے۔ میرزا صائب کا شعر ہے ؎

اگر نہ فکر عقیق دہان او باشد — کسے علاج جگر ہائے آتشیں چہ کند

آزاد۔ قیامت بر سر این بوستان رفت — کہ یک گل داشت آنہم نوجواں رفت

معترض۔ گل کو نوجواں کسی شاعر نے نہیں کہا۔

آزاد۔ کہا ہے۔ مثالیں یہ ہیں۔

حافظ۔ اے صبا گر بجوانان چمن باز رسی — خدمت من برساں سرو و گل و ریحاں را

نوری ہرمزی۔ نظر بہ پیر و جواں لے گل رعنا باتست — بیر گردی کہ جوانی و نظر ہا باتست

وحشی یزدی۔ نو گلا کہ شوم بلبل دستاں سر ازش — سازم از تازہ جوانان چمن ممتازش

تینوں استادوں کے شعر میں گل کے معنی مجازی بنے ہیں۔ یعنی اس کا اطلاق انسان پر ہے اور اسی طرح ناظم یعنی میرے شعر میں ہے۔ اور جوان کا اطلاق نباتات پر اپنے حقیقی معنی میں بھی آیا ہے جیساکہ

کاتبی۔ ہمارہ پائے در آب و قدح میانہ برف — چراکہ گرم مزاج است و نوجوان نرگس

محتشم کاشی۔ سرو جوان با ہمہ آزادگی — پیر غلام قد دلجوی تست

صائب۔ ریشۂ نخل کہن سال از جواں افزوں تر است — بیشتر دلبستگی باشد بدنیا پیر را

آزاد۔ ز صاحب ظرف می آید قدح نوشی و ہشیاری — نداند ہر کسے گلگوں صہبا را عنا نداری

معترض۔ صاحب ظرف عالی ظرف کے معنوں میں صحیح نہیں ہے کیونکہ جو ظرف رکھتا ہے وہ صاحب ظرف ہے۔

آزاد۔ علم اصول کا مسئلہ ہے کہ مطلق کو مطلق لکھنے کے بعد فرد کامل مراد لیتے ہیں جیساکہ صاحب دل کہہ سکتے ہیں چنانچہ مرزا صائب مطلق ظرف کو ظرف کامل کے معنے میں لائے ہیں ؎

زحرف خام ہر بے ظرف از جا در نمی آیم — شراب کہنہ ام از شیشہ جوشیدن نمیدانم
دریادلاں مے از دل خم نوش میکنند — آنرا کہ ظرف ہست بہ ساغر چہ حاجت است

آزاد و رسا[1]

آزاد۔ آزاد از سواد سخن سرسری مرد — صد بار گر نگہ زدہٴ باز کن لحاظ

---

[1] رسا میرزا خاں رسا نواب آصف جاہ غفراں پناہ کے منشی تھے۔ ماہ شعبان ۱۲۲۱ھ میں بمقام حیدرآباد وفات پائی نہایت خوش فکر اور قابل شخص تھے

رسا۔ "نگاہ زدن" مسموع نہیں ہے۔

آزاد۔ دیکھئے نظامی نے شیریں خسرو میں کہا ہے ؎

نگہ چوں برجمال تازنیں زد — کلہ بر آسماں سر بر زمیں زد

میرزا خاں سنکر پھڑک اُٹھے۔ اور کہا آپ کی بدولت مجھے یہ بات معلوم ہوئی

آزاد و شہید[۵۱]

آزاد۔ گرہ زابروے خود وا نکرد قاتل من — شہید ایں دو کماں مہرہ ہست بسمل من

شہید۔ کماں مہرہ میں قطع اضافت ہوا یہ اچھا نہیں۔

آزاد۔ کماں مہرہ میں ترکیب اضافی نہیں بلکہ ترکیب امتزاجی ہے جیسے بعلبک۔ شیخ سعدی شیرازی کہتے ہیں ؎

مرغ دل صاحب نظراں صید نکردی — الا بکماں مہرۂ ابروے خمیدہ

شیخ اوحدی — چوں کبوتر بطپیدم کہ مرا غمزۂ او — بکماں مہرۂ ابرو چو کبوتر زدہ بود

خواجو کرمانی — مرغ دل صید کماں مہرۂ ابروے تو شد — چہ کماں دست کہ پیوستہ کشد ابرویت

سلمان ساوجی۔ ہر کجا مرغ دلے بال کشاید فی الحال — بکماں مہرۂ ابرو زہوایش اندازد

آزاد و جرأت[۵۲]

آزاد۔ دیدہائے چشم تر اطرفہ طورہاست — نرگس کلاہ بر سر خود واژگوں گذاشت

جرأت۔ لفظ عجب اور طرفہ کا مدخول بغیر یاے تحتانی مستعمل نہیں ہے۔ جیسے کہ صائب کے اس شعر میں ؎

آن نرگس بیمار عجب ہوش ربائے ست — این ظالم مظلوم نما طرفہ بلائے ست

آزاد۔ ایسا نہیں بغیر یا کے بھی طرفہ اور عجب کا مدخول آتا ہے۔ دونوں کی مثالیں مرزا صائب کے کلام سے لیجئے۔

صائب۔ دیدۂ نیست کہ حیران تماشائے تو نیست — قامت ہمچو سنان تو عجب حلقہ رباست

" سرو از زمزمۂ فاختہ موزوں گردید — نفس سوختگاں طرفہ اثرہا دارد

---

۵۱ شہید۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں شہید۔

۵۲ جرأت۔ مولوی خاں جرأت اورنگ آبادی منشی اوّل نواب آصفجاہ ۷ شعبان ۱۱۷۵ھ کو انتقال کیا اور اورنگ آباد کے سواد غربی میں مدفون ہیں

مولانا صدر الدین[1] آزردہ و معترض

آزردہ ۔ اس شوخ سے مربوط بہت سہل سی ہوتے — گر ہم بھی سبک حرکت نا اہل سے ہوتے

اعتراض ۔ حرکت بہ سکون راے مہملہ لکھا گیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں بلکہ بہ تحتین ہے مولانا آزردہ نے اس کا جواب کلام اساتذۂ فارس سے دیا۔

(مولف) حرکت بہ تحتین ۔ جنبش کے معنے میں ہے ۔ اور بہ سکون ثانی اکثر برے اور قبیح کام کے معنوں پر مستعمل ہے "حرکت" بہ سکون ثانی طالوتی کے اس شعر میں موجود ہے

زبس خوش حرکت دشیرین ادا بود — کہ گر میدا د تیزے خوشنما بود

اردو میں حرکت بہ سکون "را" سیکڑوں جگہ مستعمل ہے۔

آسی[2] و سراج

آسی ۔ پھر ایکبار انہی تیوروں سے ایک نگاہ — تجھے قسم تری اٹھتی ہوئی جوانی کی

---

[1] مولانا صدر الدین آزردہ دہلی کے باکمال لوگوں میں سے تھے ۔ مولانا لطف اللہ صاحب کشمیری کے خلف ارجمند اور مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہ کے شاگرد رشید تھے کئی استادوں سے کلام پر اصلاح لی ۔ مگر میر ممنون سے پوری طور پر مشق سخن کر کے اس فن کو درجۂ کمال تک پہونچایا ۔ مرزا غالب شیفتہ ۔ ذوق وغیرہ کے معاصر تھے اور انھیں لوگوں سے رابطۂ اتحاد قائم تھا ۔ غدر کے بعد مشغلۂ شعر و سخن بھی سرد ہو گیا تھا پھر بھی احباب کی فرمائش سے کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے ۔ دیوان مرتب ہونے نہ پایا تھا ۔ البتہ ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا مرتب کیا تھا ۔ خدا معلوم کیا ہوا اور کہاں گیا ۔ نہ کہیں ملتا ہے نہ پتہ چلتا ہے ۔ نہ کوئی تلاش کرتا ہے ۔ اردو ۔ فارسی ۔ عربی ۔ تینوں زبانوں پر کامل عبور تھا ۔ اور تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اکیاسی برس کی عمر پا کر ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں بمقام دہلی انتقال کیا اور درگاہ چراغ دہلی میں دفن ہوئے۔ معترض کا نام معلوم نہیں لیکن مولف تذکرہ خمخانۂ جاوید نے یہ قطعہ لکھا ہے۔

[2] آسی ۔ راقم تذکرہ کا تخلص ہے ۔ میرا وطن نصیر الدین ضلع میرٹھ ہے ۔ مدتوں دلی میں رہا ۔ اب عرصے سے لکھنؤ میں مقیم ہوں میرے دوست سراج نے اکثر میرے بعض اشعار پر نیرنگ میں اعتراض کئے تھے ۔ اور امین صاحب نے جواب دیئے تھے ۔ سراج حمید لکھنوی کے شاگرد ہیں لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اب تخمیناً ۳۵ چالیس برس کی عمر ہوگی ۔ لکھنوی شاعری کے حامی ہیں ۔ اور اکثر ان اعتراضوں کے جواب دیا کرتے ہیں جو لکھنؤ والوں کی شاعری پر کئے جاتے ہیں ۔ علمی قابلیت مجھکو اتنی ہی معلوم ہوئی ہے کہ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی ہے اردو کو کون کہے (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ ہو)

اعتراض سراج تری کی جگہ اپنی ہونا چاہئے

جواب امین - اس جگہ دو شعر یہ بھی ملاحظہ کیجئے :-

غالب - ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ناطق گلاوٹھوی - تجھکو اے قادر مطلق تری قدرت کی قسم　　شان وحدت کی قسم جلوۂ کثرت کی قسم

(مولف) اعتراض یہ ہے کہ مجھے کے ساتھ اپنی کا استعمال ہونا چاہئے تھا - حالانکہ اساتذہ نے اسی طرح لکھا ہے - غالب کا ایک اور شعر یہ ہے :-

اور میں وہ ہوں کہ گر دل پہ کبھی غور کروں　　غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

آسی - جنوں کیا ہے ہر اک آرام کی تدبیر کا دشمن　　مجھے سمجھا دیا تھا پہلے ہی اے بخیہ گر میں نے

معترض کو یہ شعر یوں ملا - "جنوں کیا ہے ہر اک آرام کی تدبیر کی دشمن" - اور اسی پر آپ نے یہ ایراد بھی فرمایا کہ بہت کوشش کی مگر یہ شعر میری سمجھ میں نہ آیا۔

امین - شعر کو یوں پڑھئے -

جنوں کیا ہے ہر اک آرام کی تدبیر کا دشمن　　تجھے سمجھا دیا تھا پہلے ہی اے بخیہ گر میں نے

(مولف) مجھے تعجب ہے کہ ایک نقاد کتابت کی غلطی پر اپنے اعتراض کی بنا رکھتا ہے - اور یہ اور بھی تعجب ہے کہ وہ کوشش کرنے پر بھی شعر کا مفہوم نہیں سمجھتا - نہ تذکیر و تانیث کا فرق دور کر سکتا ہے -

---

آسی - سنوں گا عمر بھر اب ضبط درد و غم کے طعنے بھی　　الٰہی کیوں سنا تھا نالۂ مرغ سحر میں نے

سراج - یہ کوئی اچھا حاصل نہیں ہے -

امین - آپ کے نزدیک شعر کا حاصل بہتر جب ہوتا جبکہ اس میں زلف و رخ تیر خنجر عشوہ - غمزہ کے مضامین نظم ہوتے اسی کو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹) بقول شخصے وہ تو ان کے گھر کی لونڈی ہے - فارسی سے بقدر ضرورت واقف ہیں عربی غالباً نہیں جانتے - رنگ کلام یہ ہے کہ پہلے بالکل زبان کے شعر کہتے تھے اور اس میں قریب قریب ہر طبقہ کی زبان ہوتی تھی - اب زمانہ کی روش کے موافق فارسی ترکیبیں بھی استعمال کر لیتے ہیں - سوز و گداز کی بہت کوشش کرتے ہیں اگرچہ شاعری الفاظ کے ذریعہ سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے - پھر بھی سراج صاحب اپنے معاصرین میں ایک خوشگو کا درجہ رکھتے ہیں - ملنسار، نیک مزاج بامروت - خوش خلق ہیں - امین - منشی امین احمد امین سلونوی کا تخلص ہے سلون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے ہیں اور اب مدتوں سے لکھنؤ میں مقیم ہیں غزلوں میں درد و اثر ہوتا ہے - کم گو ہیں مگر خوشگوئی کو کم گوئی دبا نہیں سکتی - نثر اچھی لکھتے ہیں پہلے رسالۂ نظر کے ایڈیٹر تھے -

آپ شعریت اور حاصل شاعری سمجھتے ہیں۔ تو جناب آپ ہی کو مبارک رہے۔

آسی۔ جتنے کہ رو رہے ہیں یہ اُتنے ہنسے نہ تھے — اے بدنصیب دل ترے زخموں کو کیا ہوا

سراج ۔ اس میں زبان کی فاش غلطی ہے پہلا مصرع یوں ہونا چاہئے ۔ جتنا کہ رو رہے ہیں یہ اتنا ہنسے نہ تھے ۔

امین ۔ غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

(امولف) معترض صاحب نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ ایک فرق ہے جو دلی اور لکھنؤ کی زبان میں پایا جاتا ہے دہلی میں فعل تابع اسم اور اسم تابع فعل ہوتا ہے یعنی دونوں میں مطابقت ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں ایسا نہیں ہے مثلاً دلی والے یوں کہیں گے کہ "مجھے آپ سے کچھ باتیں کہنی ہیں" لکھنو والے اس کے بجائے کہیں گے کہنا ہیں

آسی و معترض گمنام

آسی ۔ ہزاروں نغمۂ رنگیں سے اچھی ہے فغاں میری — مگر میں کیا کروں نیا نہیں ہے رازداں میری

اعتراض ۔ اگر آپ خود ہی کسی وجہ سے دی ہیں تو ثبوت و دلیل پیش کرنا ضروری ہے ۔

امین ۔ یہ وہ مطلع ہے جس پر ادب اردو کو ناز کرنے کا موقع ہے ۔ قبلہ عالم معنی و بیان کی کتابوں کا مطالعہ فرمائیے ۔ لٹریچر پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ادعائے شاعرانہ کیا معنی رکھتا ہے اور کیوں زحمت فرمائے سنئے ہم کریما سے شروع کرتے ہیں ۔ ایک شاعر اور فلسفی میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ شاعر ادعائے محض کر کے خاموش ہو جاتا ہے ۔ اور کہیں حسب ضرورت مثال بھی دیتا ہے ورنہ اس کے لئے ثبوت کا لانا ضروری ہے ۔ سنئے سعدی صاحب فرماتے ہیں ۔

نگہ کن بریں گنبد زر نگار — کہ سقفش بود بے ستون استوار

دعویٰ یہ کیا ہے کہ آسمان گنبد زرنگار ہے ۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ آسمان آسمان ہے یا گنبد ۔ اگر کوئی دلیل آپ سے بیان کی ہو تو ارشاد فرمائیے ۔ غالب کہتا ہے ۔

ملتی ہے اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

خاقانی کہتا ہے ۔ دل من پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش

عرفی کہتا ہے ۔ ہمدم چو نسا درد مدایں صور شیون زاے من — آسماں صحن قیامت گردد از غوغاے من

کیا آپ فرما سکتے ہیں کہ یہ سب ادعائے محض نہیں تو کیا ہیں ۔ میں مشتاق ہوں ۔ آپ یا آپ کے اور کوئی ہمزباں اس کا ثبوت ... ثابت فرمائیں ۔ پھر اگر آسی صاحب نے دعویٰ کیا کہ ہزاروں نغمۂ رنگین سے اچھی ہے فغاں میری ۔ تو آپ کونسی

دفعہ کے رو سے فرد قرار داد جرم لگا سکتے ہیں

آسی ۔ دل پُر داغ سے نکلی ہے آہ ناتواں میری — پلی ہے دامن گلزار جنت میں خزاں میری

اعتراض ۔ یہ شعر بے معنی لفاظی کا ذخیرہ ہے ۔ دل پر داغ کی تشبیہ گلزار جنت سے یعنی چہ ۔ اول تو دل کی شکل صنوبری، دامن گلزار جنت بسیط ۔

امین ۔ بندہ پرور آپ کو معلوم بھی ہے کہ تشبیہ بادنے ملابست بھی جائز ہے ۔ اور دل پُر داغ کو دامن گلزار جنت سے پوری مشابہت ہے ۔ اگر چاہوں تو میں اس تشبیہ کو تشبیہ تام بھی کہہ سکتا ہوں نیز یہ کہ گلزار جنت اور دامن گلزار جنت دونوں شے واحد ہیں ۔ یہ راز ہے اس کو یاد رکھئے (بہ تبدیل الفاظ) تشبیہ کی بہت سی اقسام ہیں میں جناب کے روبرو کیوں بیاں کروں ممکن ہو تو ان سب کی تعریفوں کو پڑھئے ۔ اس کے بعد پھر شعر کو دیکھئے دل پُر داغ کو دامن گلزار جنت سے استعارہ کر کے جو کچھ شاعر نے کہا ہے قاعدے کی رو سے ۔ آپ ایک لفظ بھی اس غلطی کے ثبوت میں نہیں پیش کر سکتے ۔ خزاں کا بہار سے تغیر اور اس کا اس کے موسم تک چمن میں نہ آنا ہی خزاں کا بہار کے دامن میں پلنا ہے ایک شاعر کہتا ہے ۔

جو اہل دل ہیں کسی حال میں نہیں مغموم — خزاں کو جانتے ہیں اک بہار خوابیدہ

آسی ۔ بہت مجبور ہوں اے اشتیاق مرگ ناکامی — کھڑی ہیں راستہ روکے ہوئے مجبوریاں میری

اعتراض ۔ خدا معلوم مرگ کامیاب کا راستہ کھلا رہنے دیا نہیں

امین ۔ شے لطیف کی کمی آپ کو یہ سب کچھ کہنے پر مجبور کرتی ہے ۔ ورنہ آپ خود سمجھ لیتے کہ جو شخص ناکامی کی موت بھی نہیں مر سکتا اس کے لئے مرگ کامیاب کا ذکر کہاں تک درست ہے ۔

آسی ۔ یہ اے صیاد تیرے واہمہ کی بدگمانی ہے — چمن میرا نہ گل میرے نہ شاخ آشیاں میری

اعتراض ۔ یہ واہمہ تو واہمہ، واہمہ کی بدگمانی کہاں سے پیدا کی ۔ وہم و خیال یہ سب الگ چیزیں ہیں ۔ سب کی تعریفیں الگ ہیں واہمہ تو خود ہی شے موہوم ہے ۔ فرضی و غیر یقینی کے واسطے وضع کیا گیا ہے ۔ اس کے تو معنے یہی ہیں اب بدگمانی کا مطلب جو جناب کا اجتہاد ہی ہے بیان فرمائیں

امین ۔ قوت واہمہ ایک ایسی قوت ہے جو صرف گمان و بدگمانی پیدا کرتی ہے ۔ واہمہ کے معنے بدگمانی کے اگر کسی لغت میں ہوں تو دکھائیے ۔ ملا محتشم کاشی کا شعر ملاحظہ ہو ۔

برحرب گاہ چوں رہ آں کارواں فتاد — شور نشور واہمہ را در گمان فتاد

اب بتائیے وہم کا گمان کیسا ۔ آپ کے فرمانے کے بموجب تو واہمہ کے ساتھ گمان و بدگمانی کا ذکر ہی فضول ہے ۔ جو ترتیب قریب ان سب جملوں کو غلط کہتے ہیں ۔ اور ان میں بیشتر مشاہیر ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

جلد ۲۱　　فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۲ء　　شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر :- نیاز (فتحپوری)

جلد ۲۱	اپریل ۱۹۳۲ء	شمار ۴

ملاحظات

غالب کا مشہور مطلع ہے :-

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

یہ خیال غالب نے اس وقت ظاہر کیا تھا، جب شاید بازار میں "حُسن" کی طلب کم تھی یا عشق کی فراہمی محدود - ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ غالب کی موت کاروبار "حسن و شباب" کو اس قدر سرد کر دیتی کہ دل محبت کی کشمکش اور حسن، غمزہ کی کشاکش سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جاتا ---- آج اگر غالب زندہ ہوتے تو شاید وہ اس رشک سے مرنا بھی گوارا نہ کرتے کیونکہ اب اگر حسن کے لئے ایک در بند ہوتا ہے تو سو در اور کھل جاتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہ اندازۂ "عشق" اب "حسن" کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ہے ---- لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں نہ عشق سے مراد وہ "کیفیت مجہول" ہے جس نے دنیا میں قیس و فرہاد ایسی ناکارہ ہستیاں پیدا کیں اور نہ حُسن سے مقصود وہ "ادائے عصمت و حجاب" ہے جسے چلمن کی اوٹ سے بھی اپنے آپ کو دکھانا گوارا نہ ہوتا تھا، یعنی وہ چیز کہ :-

نظارہ نے بھی کام کیا واں حجاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

بلکہ اب "عشق" نام ہے اُس فراست و تدبر کا جو یہ سوچے کہ دنیا کی اور تمام خام پیداوار کی طرح حسن سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور عشق نام ہے اُس "اہلیت و کیفیت" کا جو ہر مصنوعی یا کیمیاوی طریقہ سے ایک عورت کو شیشہ کی الماری میں ایک پوڈر کی خوبصورت شیشی کی طرح پیش کر سکے۔

پھر جس طرح اب "عشق" اس مادی دنیا کے عشق میں ضروریات انسانی و داعیات نفسانی کے تنوع کے لحاظ سے حُسن کی طلب بڑھ گئی ہے، اسی طرح حسن بھی اب مختلف حیثیتوں سے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہے۔ یعنی اگر اس سے قبل فن "مشاطگی" نام تھا صرف زلف و کاکل کی آرائش کا، رخ پر مالش غازہ کا، آنکھوں میں تحریر سرمہ کا، گوشۂ ابرو کے پاس نقش خال کا اور مانگ میں تزئین افشاں کا، تو اب "فن تجمیل" ایک مستقل علم ہے جو برق و کہربا کی مدد سے، عقاقیر و ادویہ کی وساطت سے علم الکیمیا اور ریاضی کے ذریعہ سے، آلات و مشین کی استمداد سے سیاہ کو سفید بنا دینے کا ضامن ہوا اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب امتیاز حسن کے لئے ایک قبیح چیز کی تلاش میں وہی زحمتیں اٹھانا پڑیں گی جو کسی وقت کوہکن و قیس عامری نے جستجوئے جمال میں برداشت کی تھیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لئے عورت کو کیا قربانیاں کرنا پڑتی ہیں، کن کن ضغطوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اس کا جواب کشاکش غمزہ کی وہ طویل و دردناک داستان ہے جس سے اس وقت کی "حسن طلب" دنیا بھی بہت کم واقف ہے، چہ جائیکہ عہد غائب جب دل کے معاملے کیلئے صرف ایک نگاہ غلط انداز ہی کافی سمجھی جاتی تھی اور عورت پر وہ عذاب نازل نہ ہوا تھا جو اب "تزئین و آرائش" کی غرض سے اُسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اسمیں کلام نہیں کہ عورت کی یہ خصوصیت کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں اس سے منفک نہیں ہوئی کہ وہ حسین نظر آئے اور اُس سے محبت کی جائے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی اس تمنا کو محض قدرت کے عطا کردہ ذرایع سے پورا کر لیتی تھی لیکن اب اُسے قدرت کا مقابلہ کر کے یہ خواہش پوری کرنی پڑتی ہے۔

چونکہ پہلے اُس کے فرائض نسائی میں، صرف "محبت کیا جانا اور حکومت کرنا" ہی داخل تھا، اس لئے اس کا محض عورت ہونا، یعنی صرف "خصوصیت نسائی" کافی سبب اس کو دل میں جگہ دینے کی تھی، لیکن اب چونکہ وہ محکوم ہونے کی حد تک اپنی ترقی کو کھینچ لائی ہے اس لئے اُسے صرف یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ عورت ہو یا نہ ہو لیکن تمیل ضرور ہے — جب تک عورت حرم کی ملکہ بنی رہی کسی نے توجہ نہ کی کہ وہ عورت ہونے سے زیادہ کوئی چیز ہے یا نہیں، لیکن جب اُسنے اپنے حدود حکومت گھر کی چار دیواری سے باہر وسیع کئے تو عورت ہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک "جنس خوش گل" ہونے کی حیثیت سے نگاہوں نے اُسے دیکھنا شروع کیا، اور آخرکار وہ ایک ایسی مادی چیز ہو کر رہ گئی جسے ہر شخص کی ضرورت کے

موافق نئے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے۔

گزشتہ جنگِ عظیم نے جرمنی کو تباہ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن نسائیت کو تو یقیناً تباہ کر دیا اور اس سے زیادہ سخت انتقام شاید ہی مرد نے کبھی اس سے لیا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ عورت کی آزادی کا یہی علاج تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی آزادی، مجبوری کا نتیجہ نہ تھی۔ جب دورانِ جنگ میں لاکھوں مرد امن وسکون کی دنیا کو چھوڑ کر آگ اور خون کے جہنم زار کو آباد کر رہے تھے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ عورت گھر میں بیٹھی رہتی اور وہ ان خدمات کو انجام دیتی جو مردوں کے سپرد تھیں۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ جب ذوق عمل کسی میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک تباہ نہ ہو جائے اس لئے اگر عورت اختتام جنگ کے بعد اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں گئی تو اس کی یہ سزا تو نہ ہونی چاہئے تھی کہ اس کے تمام محاسن نسائی کو نظرانداز کر کے صرف اس کے قامت و جسم اور چشم و ابرو کا سودا کیا جاتا۔

آج مغرب کی عورت کے سامنے نہ سوال اس کی نسائیت کا ہے نہ امومیت کا، نہ ملکۂ بیت ہونے کا نہ تربیت اولاد کا نہ اس کے لئے عصمت و دلداری کا کوئی مفہوم رہ گیا ہے نہ شرم و وفاداری کا، بلکہ وہ تختۂ بازار کی ایک ایسی مومی تصویر ہے جس کو صرف اس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ نقاش نے اس کی تعمیر میں کس قدر رنگین ذوق سے کام لیا ہے اور اگر کہیں ایک رگ بھی نامناسب طور پر ابھری ہوئی بن گئی ہے تو منٹ بھر اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لی جاتی ہیں۔

ممکن ہے ایشیا کی عورت، یورپ کی آزاد عورت کو دیکھ کر رشک کرتی ہو لیکن خود اس سے پوچھو کہ یہ آزادی اسکے لئے کس قدر وبالِ جان ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ زندگی کے کس دردناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتی ہو یا کارخانہ میں، وہ مدرسے کی معلمہ ہو یا متعلمہ، کسی گھر کی خادمہ ہو یا مخدومہ، سینما میں ایکٹ کرتی ہو یا تھیٹر میں، الغرض وہ جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں ہو، سوسائٹی نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ "حسین وجمیل" نظر آئے، پُرشباب نظر آئے، کچھ ایسی چیز نظر آئے جو ذوقِ نظر کو پورا کرنے والی ہو، ورنہ وہ ایک جنسِ ناکارہ ہے اور دنیا کو اس کے وجود کی ضرورت نہیں —— پھر آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی عورت مرد کی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے کس کس عذاب کو برداشت کرتی ہے اور سخت سے سخت عمل جراحی میں ایک مرغِ بسمل کی طرح گھنٹوں تڑپتی رہتی ہے۔

گزشتہ جنگ کے دوران میں جب بیکار و مجروح یا مقطوع الاعضاء لوگوں کے علاج کا سوال سامنے آیا تو اس سلسلہ میں فنِ طبابت و جراحی کا ایک جداگانہ شعبہ معیوب اعضا کے درست کرنے کا پیدا ہو گیا اور اس میں اس قدر کامیابی ہوئی کہ اب وہ ایک مستقل علم ہو گیا ہے جسے "فنِ تجمیل و تزئین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور سچ پوچھئے تو مغربی عورت اب اسی کے سہارے زندگی بسر کر رہی ہے۔

”فنِ تجمیل“ کے دو شعبے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق ادویہ و آلات کہربائی سے ہے اور دوسرے کا عمل جراحی سے۔ اور ان دونوں کا مقصود یہ ہے کہ تمام وہ ظاہری خوبیاں جو قدرت بھی عطا نہیں کر سکی ایک عورت کے جسم و اعضاء میں پیدا کی جائیں۔ ناخنوں کی پالش، بالوں کی توجیہی آرائش، لبوں کی سُرخی، عارض کی گلگونی، ابرو کا تناسب، خنجری گردن کی مینا پروری، آنکھوں کی بادہ چکانی، جسم کی بید آسا لچک، کمر کی رشتہ آسا نزاکت، اعضاء کی نعومت و صباحت، الغرض تمام وہ مظاہرِ حسن و جمال جو کبھی صرف پریوں کی کہانیوں میں بیان کئے جاتے تھے ایک انسانی وجود نسائی کے اندر مستقل جوہر بالذات چیز ہو کر رہ جائیں۔

فرض کیجئے کہ وہاں ایک لڑکی جوان ہوئی ہے اور تمام ضروریات حسن و تناسب سے آراستہ ہو کر جوان ہوتی ہے لیکن اس کی کان کی لو بدنما طور پر لمبی ہوئی ہے تو اس وقت تک اسے چین سے نہ بیٹھنے دے گی جب تک نشتر اسے جدا نہ کر دے، یا اگر وہ نامناسب طور پر علیحدہ ہے تو اس وقت تک مضطرب رہے گی جب تک عمل جراحی اسے جلد سے نہ ملا دے۔ اسی طرح اگر ناک کی ہڈی زیادہ ابھری ہوئی ہے تو وہ اسے ترشوا دے گی، اگر زیادہ بیٹھی ہوئی ہے تو اس میں پیوند لگوائے گی۔ یہ تو خیر وہ معمولی نقائص ہیں جن کا چارہ دشوار نہیں اور اگر دشوار ہو بھی تو شباب کی فطری مستیاں و رنگینیاں کافی سے زیادہ تلافی کرتی رہتی ہیں، لیکن یقیناً وہ وقت ایک عورت کے لئے بہت سخت ہوتا ہے جب اس کے چہرہ میں جھریاں پڑنے لگتی ہیں اور اس کی رعنائی کو قہری غارت کرنے لگتی ہے۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے جب سنیں گے کہ وہ ان مصائب کے دور کرنے کیلئے اپنی کھال کھنچوا لیتی ہے۔ بیکار رگوں کے جال کو قطع کرا دیتی ہے، جلد کھرچوا ڈالتی ہے، لوتھڑے کے لوتھڑے گوشت کے نکلوا دیتی ہے اور مہینوں تک ریش و جراحت کی کرب و اذیت کو صرف اس توقع پر برداشت کرتی ہے کہ جب وہ اپنے بسترِ الم سے اٹھے گی تو اس کے چہرے کی کھال تنی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کے جسم کی رعنائی عود کر آئی ہوگی۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تمام صعوبتیں بیکار ثابت ہوتی ہیں یعنی وہ پہلے سے زیادہ بدصورت و بدنما بن جاتی ہے اور اس کا آخری علاج وہ زہر کی شیشی یا پستول کی گولی سے کر کے اپنے عیب کو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن کر دیتی ہے۔

اس نمود و نمائش اور اس ”سطح“ کا نام ہے یورپ کی عورت جس کی آزادی ایک معمہ ہو کر رہ گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ اس لئے ہندوستان کی عورتیں شوق سے تعلیم حاصل کریں، پردہ کو خیرباد کہہ دیں، آزاد ہو کر تمام علوم و فنون کی ماہر بنیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیں کہ عورت نام اس کے جسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی روح کا ہے، جو عبارت ہے ”عصمت و عفت سے“ ”محبت و رأفت سے“ اور اس کشاکشِ غمزہ سے جس کی مختصر سی داستان اوپر بیان کی گئی۔

ہمارے پاس ایک استفسار جناب احمد علی صاحب کا حیدرآباد سے موصول ہوا ہے جس میں ایک خاتون کی نہایت ہی دردناک حالت بیان کرکے ہم سے رائے طلب کی گئی ہے۔ چونکہ باب الاستفسار کی کتابت کے بعد یہ تحریر موصول ہوئی اس لئے اسکی اہمیت کو پیش نظر رکھکر ملاحظات میں ذکر ضروری خیال کرتے ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ عرصہ ہوا ایک شریف خاتون کی شادی ہوئی اور باوجود شوہر کی بے اعتنائی کے وہ اسی گھر میں زندگی بسر کرتی رہیں کیونکہ خسر زندہ تھے اور اس کو بظاہر کوئی تکلیف نہ تھی۔ لیکن خسر کے انتقال کے بعد ان کے شوہر نے پہلے تو غریب کا سارا زیور بیچ کھایا اور پھر جسمانی اذیت دینی شروع کی یہ مجبور اپنے میکہ آگئیں۔ شوہر نے دعویٰ کر دیا اور محکمۂ قضا نے بے توجہی سے کام لیکر رخصتی کی ڈگری کر دی۔ اس کا مرافعہ کیا گیا لیکن بیکار۔ آخر کار خاتون مذکورہ نے مجبور ہوکر اپنے مرتد ہونے کا اعلان کر دیا لیکن محکمۂ قضا اب بھی مُصر ہے کہ وہ اپنے ظالم شوہر ہی کے پاس اپنی دردناک زندگی بسر کریں۔ یہ ہے حال ہماری معاشرتی تباہیوں اور ہمارے علماء کرام کے جہل کا جو ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں عورتوں کی زندگی کو برباد کر چکا ہے اور کر رہا ہے

میں بارہا نگار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ہماری معاشرتی و تمدنی زندگی کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے لیکن ہمارے یہاں کے تنگ نظر کم فہم و کم بیں حضرات جن کو ہماری جاہل و احمق قوم نے "ایک برہمن و پروہت" کی حیثیت دیکر خود اپنے لئے عقل و فراست کو شجر ممنوع قرار دے رکھا ہے، مطلقاً بے خبر ہیں اور کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ "رعایت الاصلح فی الشرع" ہمیشہ سے اسلام کا شعار رہا ہے اور اس لئے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے احکام فقہی کی ترمیم و تنسیخ کو گوارا کرنے کے لئے وہ ہر وقت آمادہ ہے ———

انھیں مسائل میں سے ایک نہایت اہم مسئلہ طلاق و خلع کا بھی ہے تاکہ وہ مظالم جو نفس پرست و بدکار مرد کی طرف سے عورت پر توڑے جاتے ہیں ان کا سد باب ہو جائے، لیکن کسی کو اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اس مسئلہ میں مرد و عورت دونوں کو برابر کی آزادی دیدی ہے یعنی اگر کسی سبب سے مرد عورت کو چھوڑ سکتا ہے تو عورت کو بھی ویسا ہی حق مرد کو چھوڑ دینے کا ہے جس کا نام خلع ہے، لیکن کسقدر افسوسناک امر ہے کہ مرد تو اپنے اس حق کو ناجائز حدود تک استعمال کر سکے اور عورت جائز صورتوں میں بھی اس پر عمل نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ دردناک داستان ایک اسلامی عدالت گاہ کی انصاف پسندی کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک مسلمان عورت تنگ آکر اپنے ارتداد کا اعلان کرنے پر طیار ہو جاتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ طویل الذیل عبائیں استعمال کرنے والے مفتی و قاضی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ شرعاً محض بدسلوکی کی بناء پر ایک عورت مرد سے خلع طلب کر سکتی ہے۔ چہ جائیکہ ارتداد کہ اس صورت میں تو نکاح از خود بغیر کسی رسم کے ٹوٹ کر رہجاتا ہے اور مرد طلاق دے یا نہ دے وہ مطلقہ ہو جاتی ہے

اس نوع کے مردانہ مظالم اور عدالت گاہوں کی غیر منصفانہ روش سے تنگ آکر کسی مسلمان عورت کا ترک اسلام کر دینا پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی کئی واقعات اسی قسم کے رونما ہو چکے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تا ایندم شمار داہل

کسی طرح کوئی قانون اس قسم کا مرتب نہیں کیا گیا جو عورتوں کو مردوں کی اس "رندی و ہوسناکی" سے محفوظ رکھ سکے۔

حال ہی میں ریاست بھوپال نے ایک جدید ضابطہ طلاق و خلع کے متعلق جاری کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ان خرابیوں کے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن پھر بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا اس ضابطہ کے مطابق احکام نافذ کرنا انھیں حضرات کے سپرد نہیں کیا گیا جنھوں نے اس سے قبل کبھی اسلام کے کسی حکم کی صحیح روح کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی اور جو مہارت قرآن کے مدعی ہونے کی حیثیت سے "الرجال قوامون علی النساء" کی زبردست دلیل عورت پر ظلم توڑنے کی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ قانون بالکل مہمل چیز ہے اگر اس کے نفاذ کی خدمت ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو خود اس کا احترام نہیں کرتے۔ اور اس لئے ہمارے "مفتیان دین متین" دوسروں کی بیویوں کی فریاد کو کیا پہونچیں گے جبکہ خود ان کی بیویاں ان کی چیرہ دستیوں سے یکسر نالہ و شیون نظر آتی ہیں۔

شاردا بل کی مخالفت مولویوں کی جماعت نے اسی لئے کی تھی۔ وہ خود کمسن عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے بہت شایق ہیں۔ اور اگر آج کوئی قانون ایسا نافذ کیا گیا جس میں عورت کو خلع کے لئے آسانیاں پیدا کی گئیں تو یہی گروہ اس کی مخالفت کریگا کیونکہ جنسے نکل کر حورد ان سے جدا ہونے کا انتظام حوا کی بیٹیوں سے جس قدر سختی کے ساتھ یہ لے رہا ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

اس وقت ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کی وہی حالت ہے جو عہد عتیق میں برج بابل بنانے والوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی ہانک رہا ہے، اور ان میں سے کوئی نہ دوسرے کی سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ روز نئی خیالی کی نئی جماعتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں اور ہر جماعت کا قائد و رہنما اپنی جگہ سامل تک ہو پہنچا دینے کا دعویدار نظر آتا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ جس وقت نتیجہ و منزل پر نگاہ جاتی ہے تو سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ:-

کشتی ما بورطۂ گرداب فتنہ رفت
صد دیدباں اگرچہ بہ ہر سو گماشتیم

جب ایک مرغی کا صرف دو ملاؤں کے جھگڑے میں حرام ہو جانا یقینی ہے تو اندازہ کیجئے نہ کیا عالم ہونا چاہئے جب کسی مسئلہ پر سیکڑوں ملا اور ہزاروں غیر ملا باہم دست و گریباں نظر آتے ہوں۔

ایک جماعت ذریعۂ نجات صرف یہ قرار دیتی ہے کہ حکومت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے کیونکہ وہی "قبلۂ دین مدد ایمان مدد" کی صحیح مخاطب ہو سکتی ہے۔ دوسری جماعت کا نظریہ ہے کہ جب تک ہم غیرت و خودداری سے کام لے کر ایثار و قربانی کو ذریعہ نہ بنائیں آزادی کا ملنا دشوار ہے۔ ایک گروہ صرف کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت کو تمام دشواریوں کا حل سمجھ رہا ہے۔ دوسرا صرف ناقوس و اذان، مسجد و مندر کی تفریق قایم رکھنے کو کلید امن و سکون قرار دیتا ہے،

کوئی کہتا ہے ہندوؤں سے ملکر کام کرنا ہی صحیح طریق کار ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ ان سے جدا ہو کر اپنی دنیا علیحدہ بسانا ہی تنہا وسیلۂ فلاح ہے الغرض "یکے بزدی، دل بُرد و پردہ دار یکے"

یاں سے وہاں، وہاں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی جھیلتے رہے بستر اپنا

جہاں تک مذہبی اختلاف کا تعلق ہے ہم نے ارباب وطن کو وہی مشورہ دیا جو ہمیشہ سے ہمارا مسلک رہا ہے اور اب بھی ہے کہ

ہم کہ ۔۔ وہم بتکدہ سنگسارہ نابودیم
زدیم وصنم بر سر محراب شکستیم

وطن و ملک کے مسائل کا تعلق مذہب سے نہیں ہے اور سیاسیات کو مذہبیات سے متعلق کرنا سخت اصولی غلطی ہے لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک نہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ سکے ہیں نہ ہندو اور چارہ سازوں کے ہجوم نے دوست و دشمن کی تمیز کا احساس بھی ہم سے چھین لیا ہے حالانکہ

انما ان ما بین الیزیدین فی الندیٰ
یزید سلیم والاغر ابن حاتم

اس میں شک نہیں کہ یہ وقت انتہائی حزم و احتیاط، استقلال و ثبات کا طلبگار ہے اور اس کے بعد پھر کوئی دوسرا زمانہ ایسا آنے والا نہیں جس پر کشود کار کا انحصار ہو، لیکن افسوس ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ تمام کام ملتوی کرکے سب کو "خم طرۂ یارے گیرند" پر عمل کرنا چاہیئے تھا، ہماری پریشان خیالی اور پریشان نظری "ہر آئینہ دار" کو سکندر سمجھ کر اس کا اتباع کرنے لگتی ہے اور منزل مقصود سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ کاش کے ہم میں عقل ہوتی، غیرت و خودداری ہوتی، اور ہم سمجھ سکتے کہ :-

پیکان ترا بجان خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

اس ماہ میں ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک صاحب کا فاضلانہ مضمون "مسئلہ حسب نسب" پر ختم ہوگیا ماہ آئندہ مضمون "مذاہب عالم اور اعضاء جنسی کی پرستش" ختم ہو جائیگا اور اسی کے ساتھ ایک اور مضمون اتنا ہی اچھوتا اور دلکش شروع ہوگا۔ اقتصادیات سیاسی کے مسئلہ میں محمد عاقل صاحب ایم اے کا مضمون "تاوان جنگ" یہ مطالعہ کے قابل ہے۔ باب الاستفسار میں "عالم برزخ" پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی غائر نگاہ سے دیکھے جانے کا محتاج ہے "گمشدہ ورق" کا سلسلہ ابھی جاری رہیگا کیونکہ ناظرین نے اسے بہت پسند کیا ہے۔

نیاز

مسئلہ حسب و نسب خالص اسلامی نقطۂ نظر سے

(سلسل)

سادات کرام، ائمہ معصومین اور ان کی اولاد کے حالاتِ نسب موجودہ رسوم و قیود کی دنیا میں تہلکہ ڈالدینے والے ہیں لیکن یہ نقوش تاریخ کے بیشمار صفحات میں بھرے ہوئے ہیں اس لئے آپ انھیں پڑھ کر جیں بجبیں ہوں تو اس کا اثر علمی و تحقیقی دنیا پر کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ تاریخ کے صفحات سے ان حقیقتوں کا محو کر دینا آپ کے بس کی بات نہیں ناچار خود آپ کو اپنے نظریات بدلنا پڑیں گے۔ دنیا آپ کو بتائے گی کہ آپ کی یہ خیال آرائیاں اب حقیقیات کو محجوب نہیں کرسکتیں۔

حضرت علیؑ کے ایک صاحبزادہ کا نام عمر الاطرف تھا آپ کے متعلق سراج الدین رفاعی لکھتے ہیں۔

قیل امہ ام ولد وھو الملقب بالابلہ ویقال لولدہ لا بنو الابلہ

آپ کی والدہ لونڈی (ام ولد) تھیں، آپ کا لقب "ابلہ" تھا اس لئے آپ کی اولاد بنو ابلہ کے نام سے مشہور ہے

اس سے پہلے علامہ موصوف نے لکھا ہے، کہ انکا نام "صہبا" ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ علقمی تھا حضرت علیؑ نے آپکو مول لیا تھا اور آزاد کرکے شادی کرلی آپ کی اولاد کے متعلق علامہ رفاعی موصوف لکھتے ہیں۔

ولعمر الاطراف ھذا ذیل ببلخ وحران وواسط والیمن وطبرستان والھند وملتان والسند وغیرھا

ان عمر الاطرف کی اولاد بلخ، حران، واسط، یمن، طبرستان، ہند، ملتان اور سندھ وغیرہ میں ہے۔

خیال ہوسکتا ہے کہ آپ کی والدہ لونڈی تھیں تو بلا سے حضرت امیر نے آزاد کرکے شادی کرلی تھی آئیے ایسی نظیریں دیکھئے کہ سادات اہل بیت نے لونڈیاں خریدیں اور ان سے نہ نکاح کیا نہ آزاد کیا پھر بھی ان سے اولاد پیدا ہوئی اور سادات نجیب کے نام سے دنیا میں پھیلی حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے عمر الاشرف اور زید شہید ایک ہی ماں سے تھے، سابق الذکر کی اولاد طبرستان، بلخ، اور بغداد میں پھیلی، آخر الذکر تاریخ کی مشہور شخصیت ہیں آپ کی طرف شیعوں کا ایک فرقہ "زیدیہ" منسوب ہے، علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

یروی ان زیدا دخل علی ھشام ابن عبد الملک فقال لہ لیس احد من عباد اللہ دون ان یوصی بتقوی اللہ ولا احد فوق ان یوصی بتقوی اللہ سبحانہ وانا اوصیت بتقوی اللہ

روایت کی جاتی ہے کہ زید (شہید) خلیفہ ہشام (موں ۱۲۵ھ) کے حضور میں آئے اور فرمایا خدا کے بندوں میں اس سے کمتر کوئی نہیں جو تقویٰ کی وصیت کرے اور نہ ... تقویٰ کی وصیت

فقال ہشام انت زید المومل للخلافۃ الراجی لھا وما انت والخلافۃ لا ام لک وانت ابن امۃ	کریں اور میں تم کو اللہ سے ڈرنیکی وصیت کرتا ہوں ہشام بولا تم ہی زید خلافت کے اُمید وار ہو اور .... تم لونڈی بچہ ہو[۵]

حضرت زید کی رگوں میں نبی اکرم صلعم کا خون تھا، آپ خانوادۂ نبوت میں پلے تھے جواب دیا اور سبحان اللہ کیا اچھا جواب ہے:-

لا اعلم احداً اعظم منزلۃ عند اللہ من نبی بعثہ وھو ابن امۃ اسمعیل ابن ابراھیم وما یقصر برجل جدہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم وابوہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام	کوئی شخص اللہ کے یہاں نبی ؑ سے بڑھکر کسی کا مرتبہ نہیں ہوسکتا سو وہ حضرت اسمعیل ابن ابراہیم کی لونڈی کے بطن سے تھے، اور تمھاری نگاہ میں اُس شخص کے اندر کیا کمی نظر آتی ہے جس کے جد بزرگوار حضرت نبی اکرم اور باپ حضرت علی ہوں

اسی ایک واقعہ پر اگر سادات اور شیوخ غور کریں تو ساری مصیبتیں ختم ہیں جو آج بلائے مبرم کی طرح زیادہ تر قریشی الاصل مسلمانوں پر مسلط ہوگئی ہیں خلیفہ ہشام نے حضرت زید ابن علی بن حسین بن علی پر طعن کیا تھا - اُنھوں نے کیا دنداں شکن جواب دیا اس سے ملتا ہوا ایک واقعہ خود آن حضرت ؐ کی زندگی میں بھی واقع ہوا غزوہ خیبر میں بی بی صفیہ رضؓ گرفتار ہوئیں آپ نے ان کو زوجیت میں لیا ازواج مطہرات اُن کو چڑانے کے لئے یا تحقیر کے خیال سے "یہودن" کہا کرتی تھیں - ایک دن انھوں نے آنحضرت سے اس کا شکوہ کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے کیوں نہیں جواب دیا کہ میرے دادا ابراہیم تھے

---

[۵] آج آپ مسلمانوں کی جس سوسائٹی میں جائے اسی قسم کی مغلظات اور دریدہ دہنیوں کی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی، لونڈی بچہ دوغلا، غلام بیٹا اور اسی قسم کی ناپاک اصطلاحیں بڑے شد ومد سے بولی جاتی ہیں - عوام کو جانے دیجئے ان کے پاس کوئی اور سرمایہ خیال تو ہے نہیں وہ یہ نہ کریں تو اور کیا کریں - ذرا "آب حیات" کے صفحات پڑھ جائیے، کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم بڑے پایہ کے عالم تھے لیکن اکثر انکی کتاب میں نجیب الطرفین عالی حسب والنسب کی اصطلاحیں ملتی ہیں - وہ ہند کی شرافت کے معترف ہیں کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں طرف سے ایک ہی نسل کے ہوتے ہیں - لیکن سید انشا کے سلسلہ میں نواب سعادت علی خاں پر جو پھبتیاں اُڑائی ہیں وہ غور سے پڑھنے کی چیز ہیں، وہ تنقید کے سلسلہ میں "ولد الجاریۃ النجیب" لکھ مارتے ہیں لیکن انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ سید انشا کی اس تہی مایگی پر تنقید تو کرتے کہ نواب موصوف کو "النجیب" لکھکر انھوں نے کس درجہ پست ذہنیت کا ثبوت پیش کیا - سید انشا نے یا تو عمداً اس کی پرواہ نہیں کی کہ جو تنقید ملیح وہ نواب پر فرماتے ہیں وہ اِن پر کس حد تک صادق آتی ہے، یا تاریخ اور انساب سے بالکل نابلد تھے -

میرے والد یعقوب تھے اور میں حضرت محمدؐ کی بیوی ہوں (دیکھو مسلم فضائل بی بی صفیہؓ) اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی کسی انسان پر منھ کی آئے تو وہ اپنے حقیقی فضائل بیان کر سکتا ہے ورنہ فخر کے لئے تو کسی کو نسب کا نام بھی نہ لینا چاہئے

حضرت محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کو عام طور پر مسلمان حسنی سید تسلیم کرتے ہیں لیکن نسابین کے یہاں آپکی ہاشمیت متنازع فیہ ہے، اکثر محققین نے آپ کو عجمی الاصل بتایا ہے۔ آپ کا نسب نامہ جو بیان کیا جاتا ہے حسب ذیل ہے

شیخ عبد القادر بن محمد بن جنگی دوست بن عبد اللہ بن محمد بن یحییٰ بن عبد اللہ بن احمد بن یحییٰ بن محمد بن احمد بن عبد اللہ بن موسی الجون ابن عبد اللہ المحض بن حسن مثنی بن حسن السبطؑ

لیکن اس شجرہ نسبی کے متعلق سید سراج الدین رفاعی کا بیان ہے کہ یہ دعوی نسبی نہ تو خود حضرت قطب الاقطاب نے کیا نہ آپ کے صاحبزادوں میں سے کسی نے، اس کا اعلان قاضی ابو صالح بن ابی بکر نے کیا اسی طرح مشہور نسابہ علامہ عمری اپنے شجرات میں لکھتے ہیں شیخ عبد القادر جیلانی کو عبد اللہ بن محمد بن رومیہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ محمد بن الرومیہ کے بیٹے خود محمدؐ کی طرح "بنو الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں مگر اس نسب کا دعوی نہ خود شیخ عبد القادر نے کبھی کیا نہ آپ کے صاحبزادوں نے، اس کے دعویدار آپ کے پوتے قاضی ابو صالح تھے لیکن انھوں نے نہ تو اس کے متعلق کوئی دلیل پیش کی اور نہ کسی نے اس کو پہچانا عبد اللہ ابن محمد یحیی حجازی شخص تھے اور آپ کبھی حجاز سے باہر تشریف نہیں لے گئے ———— اور "جنگی دوست" ظاہر ہے کہ عجمی نام ہے جب قاضی ابو صالح نے یہ دعوی پیش کیا تو علمائے نسب کی ایک جماعت نے اسپر اعتراض کیا اور چونکہ یہ دعوی بلا دلیل تھا اس لئے لوگوں نے انکار کیا اسباب انکار میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ قاضی ابو صالح نصر بن عبد الرزاق نے جب اس نسبت کا دعوی کیا تو اپنا نسب یوں بیان کیا۔

ابو صالح نصر بن عبد الرزاق بن شیخ عبد القادر جیلانی بن ابی صالح جنگی دوست بن موسی بن عبد اللہ بن یحییٰ بن محمد۔

تمام علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ جن عبد اللہ کی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے وہ ابن محمد یحییٰ ہیں اور ان عبد اللہ بن محمد نے جو "ابن الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں کوئی اولاد نہیں چھوڑی بلکہ ان کے بھائی یحییٰ بن محمد کے اولاد ہوئی، نام کے اختلاف اور لاولد کے ساتھ انتساب کے باعث لوگوں نے اس نسبت کا انکار کر دیا۔ انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن محمد رومیہ نے جنکی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے، سنہ ۴۵۰ھ اور بروایت اصح سنہ ۴۶۰ھ میں وفات کی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ آپ کی عمر اسوقت بیس سال سے کم تھی اور آپ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی جیسا کہ عمیدی وغیرہ نے بیان کیا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ حضرت عبد القادر جیلانیؒ کی ولادت سنہ ۴۷۰ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسب نامہ مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں علامہ واسطی مشہور نسابہ عمری کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

ولو ثبت لی بطرق صحیحۃ ادعاء الشیخ عبد القادر ؒ اور اگر صحیح طریقوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت شیخ عبد القادر

فقال هشام انت زيد المومل للخلافة الراجي لها وما انت والخلافة لا ام لك وانت ابن امة	کریں اور میں تم کو اللہ سے ڈرنیکی وصیت کرتا ہوں ہشام بولا تم ہی زید خلافت کے اُمید وار ہو اور .... تم لونڈی بچہ ہو

حضرت زید کی رگوں میں نبی اکرم صلعم کا خون تھا، آپ خانوادۂ نبوت میں پلے تھے جواب دیا اور سبحان اللہ کیا اچھا جواب ہے :-

لا اعلم احداً اعظم منزلة عند الله من نبي بعثه وهو ابن امة اسمعيل ابن ابراهيم وما يقصر برجل جده رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم وابوه علي ابن ابي طالب عليه السلام	کوئی شخص اللہ کے یہاں نبیؑ سے بڑھکر کسی کا مرتبہ نہیں ہو سکتا سو وہ حضرت اسمعیل ابن ابراہیم کی لونڈی کے بطن سے تھے، اور تمھاری نگاہ میں اُس شخص کے اندر کیا کمی نظر آتی ہے جس کے جد بزرگوار حضرت نبی اکرم اور باپ حضرت علی ہوں

اسی ایک واقعہ پر اگر سادات اور شیوخ غور کریں تو ساری مصیبتیں ختم ہیں جو آج بلائے مبرم کی طرح زیادہ تر قرشی الاصل مسلمانوں پر مسلط ہوگئی ہیں خلیفہ ہشام نے حضرت زید ابن علی بن حسین بن علی پر طعن کیا تھا - اُنھوں نے کیا دنداں شکن جواب دیا اس سے ملتا ہوا ایک واقعہ خود آں حضرتؐ کی زندگی میں بھی واقع ہوا غزوہ خیبر میں بی بی صفیہؓ گرفتار ہوئیں آپ نے ان کو زوجیت میں لیا ازواج مطہرات اُن کو چڑانے کے لئے یا تحقیر کے خیال سے "یہودن" کہا کرتی تھیں - ایک دن انھوں نے آنحضرت سے اس کا شکوہ کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے کیوں نہیں جواب دیا کہ میرے دادا ابراہیم تھے

سلہ آج آپ مسلمانوں کی جس سوسائٹی میں جائے اسی قسم کی مغلطات اور دریدہ دہنیوں کی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی، لونڈی بچہ، دوغلا، فلاں بیٹا کا اور اسی قسم کی ناپاک اصطلاحیں بڑے شد و مد سے بولی جاتی ہیں - عوام کو جانے دیجئے ان کے پاس کوئی اور سرمایہ خیال تو ہے نہیں وہ یہ ذکر یں تو اور کیا کریں - ذرا "آبِ حیات" کے صفحات پڑھ جائیے، کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم بڑے پایہ کے عالم تھے لیکن اکثر انکی کتاب میں نجیب الطرفین عالی حسب والنسب کی اصطلاحیں ملتی ہیں - وہ ہند کی شرافت کے معترف ہیں کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں طرف سے ایک ہی نسل کے ہوتے ہیں - لیکن سید انشا کے سلسلہ میں نواب سعادت علی خاں پر جو پھبتیاں اُڑائی ہیں وہ غور سے پڑھنے کی چیز ہیں، وہ تنقید کے سلسلہ میں "دلیل الجاریۃ الجنب" لکھ مارتے ہیں لیکن انھیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ سید انشا کی اس تہی مایگی پر تنقید تو کرتے کہ نواب موصوف کو "انجب" کہکر انھوں نے کس درجہ پست ذہنیت کا ثبوت پیش کیا - سید انشا نے یا تو عمداً اس کی پرواہ نہیں کی کہ جو تنقید بلیغ وہ نواب پر فرمائے ہیں وہ ان پر کس حد تک صادق آتی ہے - یا تاریخ اور انساب سے بالکل نابلد تھے -

میرے والد یعقوب تھے اور میں حضرت محمدؐ کی بیوی ہوں (دیکھو مسلم فضائل بی بی صفیہؓ) اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی کسی انسان پر منھ کی آئے تو وہ اپنے حقیقی فضائل بیان کرسکتا ہے ورنہ فخر کے لئے تو کسی کو نسب کا نام بھی نہ لینا چاہئے

حضرت محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کو عام طور پر مسلمان حسنی سید تسلیم کرتے ہیں لیکن نسابین کے یہاں آپکی ہاشمیت متنازع فیہ ہے، اکثر محققین نے آپ کو عجمی الاصل بتایا ہے۔ آپ کا نسب نامہ جو بیان کیا جاتا ہے حسب ذیل ہے

شیخ عبد القادر بن محمد بن جنگی دوست بن عبد اللہ بن محمد بن یحییٰ بن عبد اللہ بن احمد بن یحییٰ بن محمد بن احمد بن عبد اللہ بن موسیٰ الجون ابن عبد اللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن حسن السبطؑ

لیکن اس شجرہ نسبی کے متعلق سید سراج الدین رفاعی کا بیان ہے کہ یہ دعوی نسبی نہ تو خود حضرت قطب الاقطاب نے کیا نہ آپ کے صاحبزادوں میں سے کسی نے، اس کا اعلان قاضی ابو صالح بن ابی بکر نے کیا، اسی طرح مشہور نسابہ علامہ عمری اپنے مشجرات میں لکھتے ہیں شیخ عبد القادر جیلانی کو عبد اللہ بن محمد بن رومیہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ محمد بن الرومیہ کے بیٹے خود محمدؐ کی طرح "بنو الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں مگر اس نسب کا دعوی نہ خود شیخ عبد القادر نے کبھی کیا نہ آپ کے صاحبزادوں نے، اس کے دعویدار آپ کے پوتے قاضی ابو صالح تھے لیکن انھوں نے نہ تو اس کے متعلق کوئی دلیل پیش کی اور نہ کسی نے اس کو پہچانا عبد اللہ ابن محمد یمنی حجازی شخص تھے اور آپ کبھی حجاز سے باہر تشریف نہیں لے گئے ------ اور "جنگی دوست" ظاہر ہے کہ عجمی نام ہے جب قاضی ابو صالح نے یہ دعوی پیش کیا تو علمائے نسب کی ایک جماعت نے اسپر اعتراض کیا اور چونکہ یہ دعوی بلا دلیل تھا اس لئے لوگوں نے انکار کیا اسباب انکار میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ قاضی ابو صالح نصر بن عبد الرزاق نے جب اس نسبت کا دعوی کیا تو اپنا نسب یوں بیان کیا۔

ابو صالح نصر بن عبد الرزاق بن شیخ عبد القادر جیلانی بن ابی صالح جنگی دوست بن موسیٰ بن عبد اللہ بن یحییٰ بن محمد۔

تمام علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ جن عبد اللہ کی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے وہ ابن محمد یحییٰ ہیں اور ان عبد اللہ بن محمد نے جو "ابن الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں کوئی اولاد نہیں چھوڑی بلکہ ان کے بھائی یحییٰ بن محمد کے اولاد ہوئی، نام کے اختلاف اور لاولد کے ساتھ اشتباہ کے باعث لوگوں نے اس نسبت کا انکار کردیا۔ انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن محمد رومیہ نے جنکی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے، سنہ ۲۵۰ھ اور بروایت اصح سنہ ۲۶۰ھ میں وفات کی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ آپ کی عمر اسوقت بیس سال سے کم تھی اور آپ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی جیسا کہ عمیدی وغیرہ نے بیان کیا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ حضرت عبد القادر جیلانیؒ کی ولادت سنہ ۴۷۰ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسب نامہ مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں علامہ واسطی مشہور نسابہ عمری کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔۔

ولو ثبت لی بطرق صحیحۃ ادعاء الشیخ عبد القادرؒ اور اگر صحیح طریقوں سے یہ ثابت ہوجائے کہ حضرت شیخ عبد القادر

فمن يدعي هذه النسبة نصدقها لما ثبت عندي من صدق حاله وعلو مقامه وديانته

اس نسبت کے مدعی ہیں تو ہم تصدیق کریں گے کیونکہ ہمارے نزدیک آپ کے حالات کی سچائی اور بزرگی کا مرتبہ سچ ہے۔

مصنف "صحاح الاخبار" نے اعتراضات بالا کا مفصلہ ذیل جواب دیا ہے۔

۱ - یہ روایت کہ اس نسب کے مدعی نہ تو حضرت عبد القادر ہیں نہ آپ کے فرزند متواتر ہے، بایں ہمہ انکار محل نظر ہے کیونکہ ممکن ہے حضرت شیخ نے عبادت الٰہی اور ریاضت قلب میں مستغرق ہونے کے باعث اس طرف توجہ نہ کی ہو اور یہ صوفی عارف کی شان بھی نہیں کہ نسبی تذکرہ اور اس پر فخر کرے۔

۲ - دوسری روایت یہ ہے کہ اس نسبت کا دعوی آپ کے پوتے قاضی ابو صالح بن ابی بکر عبد الرزاق نے کیا اسکا جواب اول تو یہ ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے والد و جد نے اپنی نسبت کو چھپایا ایسا نہ ہو یہ ضایع ہو جائے دوم یہ کہ وہ قاضی تھے اس لئے انھوں نے اپنی نسبی شرافت کا فخریہ اعلان کیا تاکہ اہل زمانہ کے نزدیک آپ کی شان بڑھے،

اس سے زیادہ دلچسپ وہ نامہ و پیام ہے جو قاضی ابو صالح اور مشہور نسابہ ابن میمون کے درمیان ہوا قاضی ابو صالح نے ابن میمون کو لکھا تھا کہ وہ اپنے شجرہ کے اندر آل حسن میں ان کو بھی شامل کرلیں - ابن میمون نے مفصلہ ذیل جواب دیا -

اما انت فنعرفك قاضيا و اما ابوك عبد الرزاق فهو رجل فقيه صالح و اما جدك الشيخ عبد القادر فهو شيخ صوفي تقي يتبرك به ويطلب صالح دعائه و اما نسبه فكما انت اطلقت في بعض كتبك بشتبري ينتهي الى بشتبر بطن من الحمزة بفارس فاتق الله ودع الهاشمية لاهلها۔

جہانتک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ قاضی ہیں آپ کے والد ماجد ایک صالح فقیہ ہیں آپ کے جد بزرگوار شیخ عبد القادرؒ پاکباز صوفی ہیں آپ ان سے دعا و برکت کے طالب ہوجئے اور آپ کا نسب جیسا کہ آپ نے بعض خطوط میں لکھا ہے "بشتبری" ہے جو فارس میں آل ہرمز کی ایک شاخ "بشتبر" سے ملتا ہے پس اللہ کا خوف کیجئے، اور ہاشمیت کا دعوی ہاشمیوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔

مصنف "صحاح الاخبار" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن میمون نے یہ جواب شیخ کی نسبت سے ناواقفیت کی بنا پر دیا۔

فيمكن اتصاله بآل بشتبر من جهة الامومة وكثيرا ما يكنى الرجل العلوي فينسب امه اذا كانت من بيت رياسة وتقدم وهذا مما لا يقدح في نسب الرجل۔

ممکن ہے آپ کا سلسلۂ نسب ماں کی طرف سے آل بشتبر سے ملتا ہو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علوی اپنے ماں کے نسب کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے اگر ماں صاحب حکومت اور ترقی یافتہ گھرانے سے ہو اور اس سے مرد کے نسب میں کوئی خرابی

واقع نہیں ہوتی۔

سید احمد عمید الدین نجفی نے تو قطعی طور پر لکھدیا کہ شیخ عبد القادرؒ کی ہاشمیت کے قایل جاہل لوگ ہیں جو شیخ کی طریقت کے پیرو ہیں اور صوفیہ و فقہا کے بعض وہ احمق جن کو علم النسب سے واقفیت نہیں۔

نجفی چونکہ متعصب شیعی عالم تھے اس لئے ان کی یہ دریدہ دہنی خلاف توقع نہیں عام نسابین نے اس باب میں بحث کرکے سکوت اختیار کیا ہے، رفاعی نے عمری کے حوالہ سے واسطی کی یہ رائے لکھی ہے کہ شیخ عبد القادر کے اقوال سے آپ کا دعویٰ ہاشمیت ثابت ہوجائے تو ہم تسلیم کرلیں گے اور یہ ایک معقول بات ہے لیکن مجھے یہاں آپکو حسنی سید مانتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ بقول رفاعی آپ کا مادری سلسلۂ نسب عجمیوں سے ملتا ہے پھر بھی دنیا کسی طرح آپ کی سیادت و ہاشمیت، نجابت و شرافت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔

اسی طرح ادارسہ (بنی ادریس حکمرانان مغرب) کا سلسلہ بھی جنھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک حکومت کی لونڈی ہی سے چلا، عباسیہ کے تیسرے خلیفہ ہادی (۱۶۹ھ تا ۱۷۵ھ) کے زمانہ میں سید ادریس بن عبد اللہ محض بن حسن مثنیٰ بن حسن السبط نے بربریوں کی مدد سے مغرب میں ایک سلطنت قائم کی اور ۳۰۹ھ تک اس حکومت کا قیام رہا علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

"واما ادریس بن عبد اللہ المحض المکنی بابی عبد اللہ ملک المغرب وھو الذی فتح علی یدیہ الغرب و عقبہ فی ولدہ ادریس وحدہ وھو لام ولد بربریہ توفی ابوہ وھو حمل ووضعت المغاربۃ التاج علی بطن امہ وھو اول ملک ملک المناک حملا فی الاسلام"

اور ادریس بن عبد اللہ محض سلطان مغرب جنکی کنیت ابو عبد اللہ ہے ـــ وہ شخص ہیں جنھوں نے مغرب کو فتح کیا اور ادریس نامی صرف ایک بیٹا چھوڑا جو ایک بربری لونڈی کے بطن سے تھے ابھی یہ پیٹ ہی میں تھے کہ ان کے والد نے وفات کی اہل مغرب نے انکی والدہ کے شکم (مبارک) پر تاج رکھا اور اسلامی دنیا کے یہ پہلے بادشاہ ہیں جنھوں نے ولادت سے پہلے حکومت پائی،

اگر ہم اسی نزاکتوں پر ذرا غور کیا جائے تو پتہ چل جا دیگا کہ خاندان رسالت کی اس شاخ یعنی ادارسہ کو جاہ و جلال نصیب ہوا تو صرف اسلئے کہ یہ بربریہ لونڈی کے بطن سے تھے ورنہ عباسیہ تو ان کے خون کے پیاسے تھے اور ظلم و جور کی بنا پر ادریس مدینہ سے بھاگ کر مغرب پہونچے بربریوں نے ساتھ دیا کیوں؟ ظاہر ہے کہ بربریوں نے دیکھا ہوگا کہ ادریس آل رسول ہیں اور ان کی بیوی بربریہ قوم کی اس لئے ادریس کے ساتھ ان کو قدرتی طور پر ہمدردی ہوئی ہوگی اور اس ہمدردی کی غایت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ بربریہ کے بطن سے ابھی ادریس ثانی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ بربریوں نے شکم مادر پر تاج رکھکر ان کی تاجپوشی کا جشن بھی منا ڈالا! تاریخ اسلام نے آج تک ایسی نظیر نہیں پیش کی۔ اگر ادریس ثانی کسی علویہ یا عربی خاتون کے بطن میں ہوتے تو ظاہر ہے کہ ادریس اول کی وفات کے بعد بربری

خود اپنی حکومت قائم کر لیتے اور ان کو "جنین مسعود" کے ساتھ جسکے متعلق ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرد ہے یا عورت کوئی خاص ہمدردی نہ ہوتی، خاندان عباسیہ میں بھی ہم کو ایسی ہی ایک سیاسی فضا نظر آتی ہے، ہارون رشید کے بعد امین اور مامون کی معرکہ آرائیاں تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں امین زبیدہ ہاشمیہ کے بطن سے تھے اور مامون خیزران جاریہ (لونڈی) کے بطن سے تمام ہاشمیوں اور اکثر قریشیوں کو امین سے ہمدردی تھی مامون کو اکثر رشید نے بھی ذلیل کیا اور زبیدہ نے بھی۔ مامون اور زبیدہ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ تاریخ میں پایا جاتا ہے، امین احمد رازی لکھتے ہیں۔

> گویند کہ مامون روزے نزد خاتون زبیدہ رفت زبیدہ او را دلتنگ یافت گفت اے مادر بہر فرزند خویش محمد امین دلتنگ ہستی کہ او را کشتند گفت نہ لیکن از کردہ خود پشیمانم گفت چہ کردہ گفت اگر گویم دلتنگ شوی مامون گفت بگوے گفت روزے با پدرت شطرنج می باختم پدرت بہ زور اگفت عریاں شو وگر قصر طوا ان کن در ان الحاح نمودن ناچار عریاں کردم پس دیگر بار با او شطرنج باختم ببردم گفتم بمطبخ رو و بہ جاریہ خیزران کہ انجاست جماع کن دخیزران کنیزکے قبیح منظر بودہ پدرت ہر چند زاری کرد سودے نداشت و چنداں الحاح کردم کہ با او کرد و تو بہ وجود آمدی و رسید بہ من و بیسر من انچہ رسید[لہ]

مسطورہ بالا روایت سے مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید ایک ایرانی لونڈی خیزران کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، مامون اور امین کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی تو ایرانیوں نے مامون کا ساتھ دیا اس لئے سیاسی انقلابات کا مطالعہ کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ مامون کو فتح و نصرت جا۔ یہی کے بطن سے پیدا ہونے کے صدقہ میں میسر آئی ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ امین جو ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی تھے وہ شکست کھا کر مارے جاتے، اور مامون اسلامی دنیا کے عظیم الشان خلیفہ ہو جاتے ایرانیوں نے محض اس بنا پر ساتھ دیا کہ مامون کے جسم میں ماں کی طرف سے ایرانی خون شامل ہے مامون کو دنیا نے جس نگاہ احترام سے دیکھا اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ ان کی صاحبزادی ام الفضل سے حضرت امام علی الرضاؑ نے شادی کی۔

اب آئیے ذرا ائمہ معصومین کے مشجرات پر غور کریں دنیا جانتی ہے کہ سادات کرام حضرت امام حسن و حسین کی اولاد سے دنیا میں پھیلے، علامہ شیخ مفید امام حسنؑ کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

[لہ] ہفت اقلیم قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری، کے مصنف نے اسی سلسلہ میں رشید و مامون کے سوال و جواب کا بھی نہایت پُر لطف واقعہ لکھا ہے رشید نے غصہ میں مامون کو ایک دن حرامزادہ (ولد الزانیہ) کہدیا، مامون نے برجستہ تلمیح قرانی سے کام لیا اور کہا الزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک۔ مطلب یہ ہے کہ میری والدہ آپ کی اہلیہ ہیں اگر وہ زانیہ ہیں تو آپ خود بھی زانی اور مشرک ہیں۔

زید بن حسن ام الحسن اور ام الحسین کی ماں کا نام ام بشیر بنت ابی مسعود بن عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ ہے، حسن بن حسن کی والدہ کا نام خولہ بنت منظور الفزاریہ ہے، عمرو بن حسن، قاسم و عبداللہ یہ تینوں حضرات لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، عبدالرحمن بن حسن لونڈی سے تھے، حسن بن حسن ملقب بہ اشرم، طلحہ بن حسن اور فاطمہ بنت حسین تینوں اولاد ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمی سے پیدا ہوئیں ام عبداللہ، فاطمہ، ام سلمہ، رقیہ مختلف ماؤں سے پیدا ہوئیں۔

عمرو، قاسم، عبداللہ اور عبدالرحمن (جو لونڈیوں کے بطن سے تھے) کی اولاد کے حالات صحاح الاخبار میں نہیں ملتے لیکن خیر یہی کیا کم ہے کہ حضرت حسنؑ کی اولاد بھی لونڈیوں کے بطن سے ہوئی۔

حضرت حسینؑ کی تمام اولاد منکوحہ بیویوں سے تھی صرف حضرت امام زین العابدین جاریہ کے بطن سے تھے، علامہ شیخ مفید لکھتے ہیں:۔

وامه شاه زنان بنت يزدجرد بن شهريار بن كسرى ويقال ان اسمها كان شهربانويه وكان امير المؤمنين ولى حريث بن جابر الحنفي جانبا من المشرق فبعث اليه ببنتي يزدجرد بن شهريار بن كسرى فنحل ابنه الحسين شاه زنان منها فاولدها زين العابدين ونحل الاخرى محمد بن ابي بكر فولدت له القاسم ابن محمد بن ابي بكر فهما ابنا خالة[1]

آپ کی والدہ شاہ زناں" یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ کی صاحبزادی تھیں اور کہا جاتا ہے کہ آپکا نام شہربانو تھا حضرت امیر المومنین (علی) نے حریث بن جابر حنفی کو مشرق کی طرف حاکم بنا کر بھیجا تھا انھوں نے شہریار بن یزدجرد بن کسریٰ کی دو لڑکیاں جناب امیرؑ کی خدمت میں روانہ کیں آپ نے شاہ زناں کو اپنے صاحبزادے حضرت حسینؑ کے سپرد کیا اور اُن سے حضرت زین العابدین پیدا ہوئے۔ دوسری لڑکی محمد بن ابی بکر کو بخشدی جن سے قاسم بن محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔

شیخ مفید کی روایت لفظ بہ لفظ علامہ رفاعی سے ملجاتی ہے[2]، علی بن حسن الزواری امام زین العابدین کے متعلق لکھتے ہیں،

مادر آنحضرت را نام او غزالہ گویند نام او شاہ زنان بود دختر یزدجرد و غیر ازین نیز گفتہ اند[3]

یہ روایات بالا کے بعض پہلو "غایۃ الہمہ" میں مختلف نظر آتے ہیں مصنف لکھتا ہے،

ابو القاسم زمخشری درکتاب ربیع الابرار آوردہ کہ صحابہ در خلافت امیر المومنین عمرؓ چوں بندیان فارس

[1] الارشاد شیخ مفید۔ [2] صحاح الاخبار۔ [3] کشف الغمہ۔

به مدینه آوردند سه دختر از بنات یزدجرد در ان میان بود امیر المومنین عمرؓ حکم کرد تا بفروشند ایشان را امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ گفت با اولاد ملوک معامله مانند سائر الناس نباید کرد بیں قیمت ہر سہ دختر کردہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ گرفت یکے را به عبداللہ بن عمر داد و دیگرے را به پسر خود حسین و سوم را به محمد بن ابی بکر ازان دختر که به عبداللہ بن عمر داد و نامش "گیہاں بانو" بود سالم بن عبداللہ متولد شد وازاں که به امام حسین بخشید و نام او شہربانو بود امام زین العابدین به وجود آمد و از انکه به محمد بن ابی بکر صدیقؓ داد قاسم بن محمد تولد یافت[1]

مصنف غایۃ الملہ کے نزدیک یہ واقعہ عہد فاروقی میں ہوا علامہ رفاعی اور شیخ مفید نے اس کو حضرت علیؓ کے عہد خلافت کی طرف منسوب کیا ہے، حضرت امام زین العابدین ۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت علی ۳۵ھ میں تخت خلافت پر بیٹھے اس لئے معلوم ہوتا ہے رفاعی و شیخ مفید کی روایات کا وہ حصہ جس سے اس واقعہ کا حضرت علی کے عہد خلافت میں ہونا مستنبط ہوتا ہے، نامعتبر ہے اس کے بعد "غایۃ الملہ" کے مصنف تبصرہ کرتے ہیں

پیش ازین اہل مدینہ سریہ گرفتن (لونڈی سے ازدواجی تعلق رکھنا) را عیب می کردند چون این سہ بزرگ از سراری بہ وجود آمدند و در فقہ و ورع فائق شدند مردم را ترغیب سراری پیدا شد۔

ہر چند شہربانو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے عوام کہہ سکتے ہیں کہ لونڈی بننے کے بعد ان کے خاندانی اعزاز میں کوئی فرق نہیں آسکتا، لیکن مجھے دکھانا یہ ہے کہ حضرت حسین کی اولاد میں قریشی خون کے علاوہ دوسرا خون بھی شامل ہونا شروع ہوا اور یہی "مختالاً فخوراً" قسم کے حضرات کا دل دکھانے کے لئے کیا کم ہے آگے دیکھئے تمام ائمہ معصومین چونکہ امام زین العابدین کے خاندان سے تھے اس لئے جد امجد کے خون کے ساتھ اگر غیر قریشی خون شامل ہوگیا ہے تو پھر تمام آئندہ نسلیں عام نظریۂ نجابت کے مطابق مخلوط قرار پائیں گی کیونکہ کسی سید نے غیر برادری میں شادی کرلی ہو تو اس کی اولاد کو (خواہ اس کے بعد اس کی اولاد نے دوسرا خون شامل ہونے سے احتیاط کی ہو) عام مسلمان ذلیل نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پس آج شرافت کا مروجہ معیار حضرت امام زین العابدینؑ اور آپ کی اولاد امجاد کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے؟ لیکن میں یہاں آپ کو الجھن میں نہیں پڑنے دونگا اور آگے دیکھئے کہ حضرت امام زین العابدین کی تقریباً تمام اولاد بہ استثنائے حضرت امام باقر لونڈیوں کے بطن سے ہوئی علامہ رفاعی لکھتے ہیں:۔

---

[1] غایۃ الملہ مصنفہ محمد علیم کیانی۔

كان له خمسة عشر ولد ابو جعفر محمد الباقر امه فاطمة بنت الحسن ابن علي بن ابي طالب وابو الحسين زيد الشهيد وعمر الاشرف امهما ام ولد وعبد الله والحسن والحسين امهم ام ولد والحسين الاصغر وعبد الرحمن وسليمان لام ولد وعلي الاصغر وكان اصغر ولد ابيه وخديجة امهما ام ولد ومحمد الاصغر امه ام ولد وفاطمة وعلية وام كلثوم

آپ کے پندرہ اولاد تھی ابو جعفر محمد الباقر آپ کی والدہ فاطمہ بنت حسن بن علی بن ابی طالب تھیں، اور ابو الحسین زید شہید اور عمر الاشرف ان لوگوں کی والدہ لونڈی تھیں، عبد اللہ، حسن اور حسین یہ بھی لونڈی کے بطن سے تھے، حسین اصغر، عبد الرحمٰن، سلیمان ان کی ماں بھی لونڈی تھیں علی اصغر اور یہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ تھے اور خدیجہ لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئیں اور محمد اصغر اُن کی والدہ بھی لونڈی تھیں، اور فاطمہ، علیہ اور ام کلثوم (یہ سب حضرت امام زین العابدین کی صاحبزادیاں تھیں)

علامۂ رفاعی نے آخری تینوں صاحبزادیوں کی والدہ کا تذکرہ نہیں کیا لیکن شیخ مفید نے لکھا ہے۔

وفاطمة وعلية وام كلثوم وامهن ام ولد

اور فاطمہ، علیہ اور ام کلثوم کی مائیں لونڈی تھیں

یہاں پر ایک مسئلہ اور قابل غور ہے حضرت ابو جعفر امام باقر کی والدہ ہاشمیہ تھیں اس لئے نسابین نے ان کے متعلق نہایت فخر یہ جملے لکھے ہیں۔

فهو اول هاشمي ولد من هاشمين علوي من علويين

پس وہ پہلے ہاشمی ہیں جن کے ماں باپ دونوں ہاشمی تھے اور پہلے علوی ہیں جن کے باپ بھی علوی تھے اور ماں بھی علویہ تھیں۔

آج نجیب الطرفین کا جو معیار قرار دیا جاتا ہے وہ ہماری تاریخی روایات سے بالکل مختلف ہے، ظاہر ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ نہ قرشیہ تھیں نہ ہاشمیہ، وہ ایرانی تھیں آپ کے صاحبزادہ امام باقر کو (جن کی دادی عجمی الاصل تھیں) نجیب الطرفین بتایا جا رہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں لیکن بحث یہ ہے کہ ہمارے یہاں نجیب الطرفین تو ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکے مادری یا پدری سلسلہ میں کسی دوسرے خون کی آمیزش نہوئی ہو مثلاً دیکھا ماں اور باپ دونوں طرف سے سید تھے انھوں نے غیر قوم کی کسی عورت سے نکاح کر لیا مگر پیدا ہوے بکرنے ایک نجیب و شریف سیدانی سے بیاہ کیا اُن سے اولاد پیدا ہوئی اب ہماری سوسائٹی ایسے خاندان کو نجیب الطرفین تو کیا شریف بھی نہیں تسلیم کرتی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان بدترین قسم کی قومی سیہ کاری میں مبتلا ہو گئے اور کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اُن کی افتادگی و سراسیمگی انھیں عجیب و غریب تخیلات کی پیداوار ہے۔

امام باقر کی والدہ تو ہاشمیہ تھیں لیکن خود امام باقر کی شادی بی بی ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ سے ہوئی یعنی حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے کی صاحبزادی آپ کی زوجیت میں آئیں اور امام جعفر صادقؓ پیدا ہوئے کون کہہ سکتا ہے آپ کی ماں اور باپ دونوں قریشی نہ تھے لیکن قابل غور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کے نانا قاسم بن محمد کی

والدہ ایرانی تھیں اور حضرت علی کا عطیہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا اب یہاں خاندان رسالت میں مادری سلسلہ کے اندر دوسرا اختلاط ہوا حضرت امام جعفر صادق کے دادا (زین العابدین) کی والدہ بھی ایرانی اور آپ کے نانا (قاسم بن محمد) کی والدہ بھی ایرانی یعنی دو پشت میں اختلاط ہوا، امام جعفر صادق کہا کرتے تھے،

ولدنی الصدیق مرتین	حضرت صدیقؓ سے مجھے دوہرا نسلی علاقہ ہے۔

یہ اس لئے کہ آپ کے نانا قاسم بن محمد ابی بکر تھے اور آپ کی نانی اسماء بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکر تھیں اس لئے نانا اور نانی دونوں طرف سے آپ آل صدیق ہیں، حضرات شیعہ امام جعفر صادق کے اس فخریہ جملہ "ولدنی الصدیق مرتین" پر غور کریں اور سوچیں کہ بقیہ ائمہ معصومین موسیٰ کاظم، علی رضا، نقی، تقی، عسکری، مہدی (علیہم السلام) تمام حضرات کے اندر امام جعفر کی وساطت سے حضرت صدیق اکبر کا خون جاری اور ساری ہے یا نہیں؟ اگر حضرت صدیق اہل بیت کے دشمن تھے تو آل صدیق سے ایسا گہرا ارتباط اور ازدواجی تعلقات کیا معنی رکھتے ہیں؟

امام باقر کے صاحبزادہ حضرت امام جعفر صادقؑ تو ام فروہ بنت قاسم قریشیہ صدیقہ سے پیدا ہوئے تھے لیکن امام باقر کی اور اولاد بھی تھی جو لونڈیوں سے پیدا ہوئی تھی چنانچہ آپ کے صاحبزادہ و صاحبزادی علی و زینب لونڈیوں سے تھے اور آپ کی دوسری صاحبزادی ام سلمہ بھی لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔

امام جعفر صادق کے بعد امامت آپ کے صاحبزادہ حضرت موسیٰ الکاظم کو ملی آپ کے بارہ میں علامہ رفاعی لکھتے ہیں

امہ حمیدۃ البربریہ اخت صالح البربری وکانت تکنی ام ولد	آپ کی والدہ حمیدہ بربریہ ہمشیرہ صالح بربری تھیں اور آپ کی کنیت ام ولد تھی،

حسن الزواری لکھتے ہیں۔

مادرش ام ولد بود کہ او را حمیدہ بربریہ می گفتند و غیر از ین نیز گفتہ اند (کشف الغمہ)

آپ کے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے متعلق شیخ مفید فرماتے ہیں۔

وموسیٰ واسحٰق ومحمد لام ولد والعباس وعلی وفاطمہ لامہات اولاد شتی (الارشاد)	موسیٰ (الکاظم) اسحٰق اور محمد کی ماں ام ولد تھیں اور علی اسماء اور فاطمہ مختلف لونڈیوں کے بطن سے تھیں،

موسیٰ کاظمؑ کو خدا نے بہت کثیر الاولاد بنایا تھا اور آپ کی تمام اولاد لونڈیوں ہی کے بطن سے وجود میں آئی چنانچہ علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

وکان لابی الحسنؑ سبعۃ وثلاثون ولد ذکر و انثی منہم الامام علی ابن موسیٰ الرضا و ابراہیم العباس القاسم لامہات اولاد الخ (صحاح الاخبار)	اور ابو الحسن (موسیٰ کاظم) کے ۳۷ بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں ان میں علی بن موسیٰ رضا ابراہیم عباس اور قاسم کی مائیں لونڈی تھیں

آپ کے بقیہ صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

اسمٰعیل، جعفر، ہارون، حسن، احمد، محمد، حمزہ، عبداللہ، اسحٰق، عبیداللہ، زید، حسن، مفضل، حسین، سلیمان، فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ، رقیہ، حلیمہ، ام ابن، رقیہ صغریٰ، کلثوم، ام جعفر، لبابہ، زینب، خدیجہ، علیہ، آمنہ، حسنیٰ، بدیہہ، عائشہ، ام سلمہ، میمونہ، ام کلثوم، شیخ مفید اور علامہ رفاعی ان تمام حضرات کی ماں کو "امہات اولاد" (لونڈیاں) بتاتے ہیں اکثر سادات کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ کاظم تک پہونچتا ہے[51] آج اپنے نام کے ساتھ کاظمی لکھنے والے غور کریں اور عہد حاضر کے وضعی معیار شرافت کو دیکھیں کیا اُن کی غیرت اسے قبول کرتی ہے کہ اگر وہ کسی نامعلوم زمانہ سے ماں اور باپ دونوں طرف سے کاظمی مشہور ہیں تو اپنے دوسرے بھائی کی اولاد کو (جن کی مائیں ہند یا مسلمانوں کے نیچ طبقات سے متعلق ہوں) مخلوط النسل اور حقیر سمجھیں؟

امام موسیٰ کاظم کے بعد امامت آپ کے صاحبزادہ حضرت امام ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا کو ملی آپ کے متعلق علامہ رفاعی کا قول امام کاظم کے سلسلہ میں لکھا جا چکا، محمد علیم یحیائی افضلی الہ آبادی لکھتے ہیں۔

> مادر وے کنیز است، ہمچنیں مادران باقی ائمہ نیز کنیز بودہ اند مادر رضاؑ را مادر پدرش (حمیدہ بربریہ) خریدہ بود، از اشراف عجم و بہترین زنان بودہ در عقل و دین و بہ اسامی بسیار موسوم است از ان جملہ، ازدی، ونجمہ و سمان...... و در آخر سنش "تکتم" قرار گرفتہ مولاۃ خود حمیدہ را بغایت بزرگ می داشت و بہ حضورش گاہے نمی نشست[52]

علی بن حسن الزواری لکھتے ہیں کہ آپ کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں اور خیزران مرسیہ شقرائے نوبیہ اطازدی وغیرہ اسماء سے موسوم تھیں[53]

اسی طرح امام ابوجعفر محمد بن علی موسیٰ (محمد تقی) کی والدہ بروایت علی بن حسن الزواری لونڈی تھیں اور آپ کا نام سکینہ مرسیہ یا خیزران تھا۔ صاحبؒ "غایۃ الھمہ" نے خزران لکھا ہے، لیکن میر محمد باقر مجلسی اصفہانی فرماتے ہیں

---

[51] علامہ رفاعی لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کاظم نے اپنے بعد چودہ بیٹے چھوڑے ان میں بارہ صاحبزادوں کی اولاد اقصائے عالم میں پھیلی، اُن کے اسماء ہیں۔ علی رضا، ابراہیم، مرتضیٰ، محمد العابد، جعفر (ان کی اولاد کثیر ہے) زید النار، عبداللہ، عبیداللہ، حمزہ، (انکی اولاد درمیانی درجہ میں پھیلی) عباس، ہارون، اسحٰق اور اسمٰعیل (انکی اولاد قلیل ہے) حضرت جعفر ابن کاظم کو اکیس بیس اولاد ہوئی، آپ کی اولاد "رضیون" (رضوی) کہلاتی ہے (دیکھو صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار)

[52] غایۃ الھمہ فی ذکر الصحابۃ والائمہ

[53] کشف الغمہ

مادرش ام ولد است و نام او سبکہ است و ریحانہ و خیزران و مشہور آنست نوبیہ است و بعضی گویند مرسیہ است
(از ملت ماریہ قبطیہ) مادر ابراہیم فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام محمد تقی کے بعد آپ کے صاحبزادہ ابو الحسن علی ابن محمد بن الرضا معروف بہ امام نقی کرسئی امامت پر بیٹھے آپکی والدہ کا نام سمانہ مغربیہ تھا اور یہ بھی لونڈی تھیں اسی طرح امام ابی محمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی رضاؑ (جو امام حسن عسکری کے نام سے مشہور ہیں) کی والدہ ام ولد تھیں اور آپکا نام "سوسن" تھا باقر مجلسی سنبل اور غزالہ بتاتے ہیں آپ کے صاحبزادہ محمد بن حسن عسکری (معروف بہ محمد مہدی) تھے جن پر اثنا عشریہ کے عقیدہ کے مطابق امامت ختم ہو جاتی ہے، بقول صاحب کشف الغمہ آپ کی والدہ کا نام صیقل اور حکیمہ تھا آپ بھی لونڈی تھیں میر باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

مادرش ملیکہ دختر یشوعا ان فرزند قیصر روم بود از نسل شمعون الصفا وصی حضرت عیسیٰ ملقب نرجس (نرگس) خاتون
و بعضی گویند دختر زید علویہ

شیخ مفید فرماتے ہیں:-

وامہ ام ولد یقال لھا نرجس ۔ یعنی ۔ آپ کی والدہ لونڈی تھیں جن کو "نرگس" پکارا جاتا تھا

خواجہ معین الدین سنجری چشتیؒ کا نسب حضرت موسیٰ کاظمؑ تک پہونچتا ہے، وہی موسیٰ کاظم جنکی والدہ حمیدہ بربریہ (لونڈی) تھیں اور جن کے بعد بقیہ تمام ائمہ کی مائیں لونڈیاں تھیں امام علی رضا کی دادی لونڈی تھیں آپ کی والدہ (ازدی یا خیزران مرسیہ) کو آپ کی دادی نے خریدا تھا۔

امام رضا کے صرف ایک صاحبزادہ محمد تقی ہوئے محمد تقیؑ کے دو صاحبزادے علی ہادی اور موسیٰ مبرقع ہوئے انہیں "مبرقع" کی اولاد میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ تھے امام علی الرضا کی اولاد کے متعلق رفاعی لکھتے ہیں۔

ویقال لولدہ الرضویون، یعنی آپ کی اولاد "رضوی" کہلاتی ہے،

ہندوستان میں آج ہزاروں کی تعداد میں رضویہ موجود ہیں اور وہ امتیاز کے لئے اپنے نام کے ساتھ "رضوی" لکھتے ہیں چشم ما روشن کوئی اعتراض نہیں لیکن کیا وہ ہندوستان کے موجودہ نظریۂ نجابت پر غور کریں گے؟ اور پھر کیا وہ اپنی برادری کے اندر ان "خانماں برباد" رضویوں پر ایک نگاہ ڈالنے کی فیاضانہ سعی کر سکتے ہیں جن کو انکی ناعاقبت اندیشیوں

---

۵۱ تذکرۃ الائمہ میر باقر مجلسی۔

۵۲ تذکرۃ الائمہ۔

نے اپنی قومیت سے عضو معطل کی طرح کاٹ کر الگ کر دیا ہے صرف اس جرم پر کہ ـــــ کسی زمانہ میں ان کے آبا نے غیر قوم کی عورتوں سے شادی کرلی تھی !

تنزل کی خطرناک گھٹاؤں میں گھرے ہوئے ضعیف مسلمانو ! ان واقعات پر غور کرو اس وجہ سے نہیں کہ تاریخ کے ان صفحات سے اپنے تخیلات نسبی کا موازنہ کرکے خفت محسوس کروگے ، بلکہ اس لئے کہ ناروا انتخاب صناعی کی بنا پر جو تم نے خود کو گوشت کا ایک "مضغہ" بنالیا ہے اس پر پشیماں ہو اور پھر کوشش کرو کہ تمھاری قوم کے اندر وہی شیرازہ بندی وہی خلوص وہی اخوت ہوجائے جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی ہے -

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا (آل عمران) | اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم باہم دشمن تھے خدا نے تمھارے دل ملا دیئے اور تم نعمت خداوندی کی بدولت بھائی بھائی ہوگئے

آج مسلمانوں کی حالت بالکل یہودیوں کی سی ہوگئی ہے جن کے متعلق تیرہ سو سال قبل "تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتّٰی" (تم ان کو متحد خیال کرتے ہو حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے جدا ہیں) کہا گیا تھا مسلمانوں کی قومیت آج اسی آشفتگی اور پریشان حالی میں ہے انانیت اور خود پرستی نے ان کو منتشر کر دیا ہے ، ان کے قلوب ایک دوسرے سے پھرے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے سے ہمدردی باقی نہیں رہی ہر شخص اپنے فضل وخودی کے خبط میں مبتلا ہے ، علما کا گروہ جو کبھی اپنے کردار اور روحانی قدس سے قوم کو پیام زندگی دیتا تھا خود طرح طرح کے روحانی امراض میں مبتلا ہے ، نہ ان میں محبت ہے نہ خلق ہے نہ خشیت الٰہی ہے نہ تقوی ان کے اعمال آج سلف سے مختلف ہیں ان میں اب نہ کوئی سچا درد مند قوم پیدا ہوتا ہے نہ پاکباز رہبر دین ذوق تن آسانی اور طلب زر کی حوصلہ پیمائیوں نے ان کو عام شہریوں سے بھی فروتر بنا دیا ہے - اب ان کی وہی مجلسیں جن میں جانے کے بعد کبھی خدا یاد آتا تھا جذبات اسفل کی صحیح آئینہ داری کر رہی ہیں کیا ایسی قوم کی تباہی کسی سیاسی ونفسیاتی تحلیل کی محتاج ہے ؟ آج خلافت بھی موجود ہے اور مسلم لیگ بھی دینی تبلیغ کی بھی گرما گرمی ہے اور سیاسی تحریکوں کا جوش وخروش بھی لیکن کیا تھوڑی دیر کے لئے آپ اس مسئلہ پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ ان تمام مذہبی وسیاسی جمعیتوں کے باوجود مسلمان قعر مذلت میں کیوں گرے جاتے ہیں ؟ یقیناً ہر محب وطن اور رہبر دین کی عظمت ہمارے دل میں ہونی چاہئے اور ایک حد تک ہے ـ لیکن پھر بھی میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کی قومیت کی تعمیر نہ تبلیغ کانفرنس کے ذریعہ ہوئی تھی اور نہ نیشنل پارٹی کے ذریعہ بلکہ افراد کی پاک سیرت ، خلوص ورواداری ، خلق ومحبت نے ہم کو دنیا کی تمام قوموں کے سامنے ایک قلیل عرصہ میں ممتاز بنا دیا تھا - آج مذہبی یا سیاسی قیادت محض حصول جاہ اور طلب شہرت کے لئے کیجاتی ہے ، آپ اپنی روحانی دردمندیوں سے مجبور ہوکر عام جلسوں میں تقریریں نہیں کرتے بلکہ اپنی قوت خطابت اور آتش بیانیوں کی لوگوں سے داد لیتے ہیں اور اس طور سے گویا ملک کے اکثر قائدین عام ازیں کہ وہ سیاسی رہنما ہوں یا دینی مبلغ اپنی خود غرضی اور

اپنی عصبیت کی قربانگاہ پر قوم کی بھینٹ چڑھاتے جاتے ہیں۔ کیا رہنمایان ملت اسپر غور کریں گے کہ زبان سے چشمۂ بلاغت رواں کرنے سے زیادہ قوم کو آپکے مخلصانہ اخلاق اور پاکبازانہ طریقہ زندگی کی ضرورت ہے۔ اور آپ کی زحمت لب کشائی سے کہیں زیادہ آپ کی خموشی طرز فغاں قوم کو فائدہ پہونچا سکتی ہے"

مسلمانوں کی پستی و اضمحلال، انتشار و افتادگی کے کون سے اسباب ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو اسوقت بہت اہمیت رکھتا ہے، جہاں تک مینے غور کیا ہے، مسلمانوں کے قومی زوال کا سبب صرف ایک ہے، اگر ہمارے وطنی بزرگوں نے اپنی گوشہ نشین ان حرف سہنہ ولی کیں تو ممکن ہے ہماری نشاءۃ الثانیہ کا دور شروع ہوجائے۔ میرا خیال ہے صرف "مغایرت" نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے، اور یہ مرض نسلی عصبیت سے پیدا ہوا ہے جس کو مٹانے کے لئے اسلام دنیا میں آیا اور پیغمبر اسلام کی پاک زندگی اور آپ کی وسعت ہمدردی نے اپنے قلیل زمانہ بعثت میں وہ کر دکھایا جو دنیا کے اندر انسانیت کا کوئی دردمند نہیں کرسکا۔ شاید قدرت نے اسلام کے لئے سرزمین عرب کا انتخاب ہی اس لئے کیا تھا کہ وہاں نوع انسانی کے ساتھ مساوات و مواخات ناپید تھی اور نبی صلعم کو قریش میں مبعوث کیا تاکہ وہ عرب کے سب سے زیادہ مغرور قبیلہ کے اندر انسانیت کی محبت اور دردمندی پیدا کرکے دنیا کو اخوت کا پیام دیں۔

یہ تو قریب قریب ناممکن ہے کہ صدیوں کا پندار ہم سے یک بیک رخصت ہوجائے اس لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام قبایل بلا نسلی نزاع یگانہ حیثیت سے اپنی اصلاح کریں اس طور سے جب وہ متحد ہوجائیں تو پھر ہر قبیلہ کے سربرآوردہ اور عاقل لوگ اپنے اپنے اثر سے تمام قبایل کے اندر یگانگت پیدا کرنے کی سعی کریں۔ یاد رکھئے کہ جبتک مسلمانوں کے تمام قبایل (میری مراد قبیلہ سے "ذات" ہے) نسلی رشتہ میں منسلک نہوں گے مسلمان نہ کبھی ترقی کرسکتے ہیں اور نہ اس نظریہ سے الگ ہوکر انھوں نے کبھی ترقی کی ہے، تاریخ کے صفحات الٹ جایئے آپ کو اُسکے شواہد بکثرت ملیں گے، ادریس (دو ادریسہ مصر کا بانی) مامون الرشید وغیرہ کو جاہ و جلال اسی اصول کے تحت نصیب ہوا تھا۔

یک بیک تو یہ ہو نہیں سکتا اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ ہر قبیلہ عام ازیں کہ وہ سوسائٹی کے اندر معزز سمجھا جاتا ہو یا ذلیل اِن ارسمی قیود کو مٹادے، جنکے تحت قبیلہ کے وہ افراد خارج برادری سمجھے ہیں، جن کا مادری سلسلہ نسب غیر قبیلہ سے متعلق ہے، خصوصیت کے ساتھ شیوخ و سادات اسپر غور کریں، چونکہ ہندوستان کے اندر انھیں کو سب سے زیادہ شرافت کا ادعا ہے، اور وہ آئے دن اپنے قبیلہ کے مایۂ ناز فرزندوں کو برادری سے خارج کرکے دن بدن اپنے کو زیادہ کمزور اور افتادہ بنانے جاتے ہیں۔

عبدالمالک آروی

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو

۵۷۷ھ کا زمانہ ہے کہ ایک قافلہ صلاح الدین ایوبی کے لئے اسباب حرب و سامان رسد لئے ہوئے بیروت کے پاس سے گزرتا ہے اور وہاں کے فرنگی اُسے لوٹ لیتے ہیں۔ سلطان ایوبی سخت برہم ہوتا ہے اور یہ عزم لیکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ دشمن سے اس گستاخی کا انتقام لے گا اور بیروت و ساحل لبنان پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرے گا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی مصر و شام پر قابض ہوکر فرنگیوں سے ایک ایک کرکے بہت سے قلعے چھین چکا تھا اور اب اس کی نگاہ بیت المقدس پر تھی جہاں صلیبیوں کی قائم کی ہوئی حکومت پر بالڈوین چہارم اسوقت فرمانروائی کر رہا تھا۔

قافلہ کی غارت گری کے واقعہ سے اس کو ایک بہانہ ہاتھ آیا اور اس فرصت کو غنیمت جان کر اُس نے اپنی عساکر قاہرہ کو جمع کیا اور دفعۃً یلغار کر دیا۔ اُس کے بھائی "العادل" نے مصر سے تین جہاز بطور کمک کے روانہ کئے اور یہ دارا و عسقلان کی تسخیر کرتا ہوا بیروت پہونچا اور محاصرہ شروع کر دیا۔ لیکن ادھر بیت المقدس سے بالڈوین چہارم اہل بیروت کی مدد کے لئے آگیا اور صلاح الدین کو واپس آنا پڑا۔ صلاح الدین کی یہ واپسی ایسی نہ تھی کہ ہمیشہ کے لئے جنگ کا خاتمہ ہوجاتا، بلکہ اس قصے اس کے اندر عزم و استقامت، حرب و اقدام کی روح کو زیادہ قوی اور اس کی طاقت کو زیادہ وسیع بنا دیا۔

جس وقت وہ قاہرہ سے روانہ ہوا تھا تو اُس نے عہد کیا تھا کہ وہ اُس وقت تک چین نہ لیگا جبتک شام کے ایک ایک قلعہ پر اسلام کے جھنڈے کو لہراتا ہوا نہ دیکھ لے چنانچہ وہ سرزمین حلب سے لیکر صحرائے سینا تک اور ساحل دمشق سے لیکر بادیۂ شام تک ہر جگہ اپنی جرأت و پامردی کے سکے بٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا تاآنکہ ۵۷۹ھ میں اس نے حلب پر قبضہ کرکے دریائے اردن کو عبور کیا اور بیسان پر قبضہ کرکے فرنگیوں کے اس قلعہ کی طرف بڑھا جو سب سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا۔

یہ قلعہ شہر کرک کا تھا جو اپنی مضبوط شہر پناہ کے لحاظ سے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ مقام پہاڑیوں کے درمیان اس طرح واقع ہوا تھا کہ محاصرہ بہت دشوار تھا اور اس وقت تک یہاں کا قلعہ کسی سے سر نہ ہوسکا تھا۔

صلاح الدین نے اپنے بھائی "العادل" سے مصری عساکر کی کمک طلب کی اور پوری قوت کے ساتھ اُس نے کرک تک پہونچکر چاروں طرف منجنیقیں نصب کردیں فرنگیوں نے بھی پوری احتیاط سے کام لیا تھا اور کثیر ذخیرۂ حرب و سامان

رسد فراہم کرکے پوری عسکری قوت کے ساتھ مدافعت کا عزم کر لیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ سلطان صلاح الدین قلعہ کو سر نہ کرسکے گا اور اس طرف صلاح الدین روزانہ حملہ کرتا تھا اور محاصرہ میں شدت بڑھاتا جاتا تھا۔ خیر اس معرکۂ قتال کی داستان کو یہیں چھوڑیئے اور دیکھئے کہ قلعہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

قلعہ کے مشرقی برج میں آج غیر معمولی چہل پہل نظر آتی ہے اور لوگوں کی آمد و رفت بکثرت جاری ہے لیکن ہنگامہ کسی تدبیر جنگ سے متعلق نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ آنے جانے والوں کے لباس ایسے ہیں جو جشن مسرت کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ عورتیں، بچے، مرد، آ جا رہے ہیں، کسی کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار ہے، کوئی شمع لئے جا رہا ہے، کوئی رنگ برنگ کے فیتے اڑا رہا ہے۔ اسی جماعت میں چند راہبان بھی ہیں، جن میں سے بعض تسبیح لئے ہوئے ہیں اور بعض عود دان، خدام کی جماعت طباقوں میں قسم قسم کے کھانے اور شرابیں ادھر سے اُدھر لئے جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی نہایت مہتم بالشان جشن طرب برپا ہونے والا ہے۔ ہر چند سب کے چہروں سے آثار مسرت ظاہر ہو رہے ہیں لیکن کبھی کبھی خوف و کلدورت کی علامت بھی نظر آنے لگتی ہے کہ معلوم نہیں جنگ کا نتیجہ کیا ہو۔

آج یہاں تقریب نکاح ہونے والی ہے جس میں کونٹ ٹوروں، کونٹ رینو کی ربیبہ کے ساتھ رشتۂ ازدواج سے وابستہ کیا جائیگا۔ دولھا اُن چند نوجوانوں میں سے تھا جن پر اہل فرنگ نہ صرف بہ لحاظ حسب و نسب بلکہ بہ حیثیت شجاعت و مردانگی بھی فخر کرتے تھے، اور دلھن، اس کونٹ رینو کی بیٹی (ربیبہ) تھی جو اپنے دارالامارۃ الظاکیہ میں رہتا تھا اور قلعۂ کرک اسی کی حکومت میں شامل تھا۔

بعض کی رائے یہ ہوئی کہ یہ تقریب کرک کے علاوہ کسی اور جگہ عمل میں آئے تاکہ دولھا دلھن میدان کارزار سے دور رہکر لطف و مسرت کے دن بسر کرسکیں، لیکن کونٹ ٹوروں اس پر راضی نہیں ہوا اور اُس نے کہا کہ تیغ و تفنگ کی آوازوں سے زیادہ کوئی آواز اس کے لئے باعث مسرت نہیں اور اس لئے وہ اپنی شادی اس ہنگامۂ جنگ میں قلعۂ کرک کے اندر ہی کرے گا۔

غروب آفتاب سے قبل، شہر پناہ کا ایک دروازہ کھُلتا ہے خندق پر پل استوار کیا جاتا ہے اور چالیس آدمی اپنے سروں پر طباق لئے ہوئے قلعہ کے اندر سے نکل کر اہل عرب کے لشکر کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کے آگے ایک سوار ہے جو ہاتھ میں سفید جھنڈا لئے ہوئے ہے۔

جس وقت یہ سوار لشکر اسلام میں پہونچتا ہے تو صلاح الدین اُسے اپنے خیمہ کے اندر بلا کر آنے کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ:-

"اے آقا! مجھے کونٹ ٹورون کی ماں نے یہ خط لیکر بھیجا ہے اور اپنے بیٹے کی تقریب شادی میں کچھ تحائف روانہ کئے ہیں، اُمید ہے کہ قبول کئے جائیں گے"۔

صلاح الدین نے سکراتے ہوئے وہ خط لے لیا جس میں تحریر تھا:۔

"اے سلطان عرب - آج ہمارے چھوٹے سے شہر میں جشن طرب برپا ہے اور میرے بیٹے کونٹ ٹورون کی شادی ہو رہی ہے۔ اس لئے میں نے پسند نہ کیا کہ تم کو اس مسرت میں شریک نہ کروں۔

اے صلاح الدین، غالباً وہ زمانہ تم کو یاد ہوگا جب تم ہمارے محلوں میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے اور اپنی آغوش میں ایک چھوٹی سی لڑکی اینٹانٹ کو لیکر ادھر ادھر باغوں میں پھرا کرتے تھے وہی اینٹانٹ بڑھکر جوان ہوئی، شادی ہوئی اور ایک لڑکا اس سے پیدا ہوا جو آج اپنی قوم کا سردار ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اُسے دیکھو تو تم اس سے بھی ویسی ہی محبت کرو جیسی کہ اس کی ماں سے حالت طفلی میں کرتے تھے۔ وہ اینٹانٹ میں ہی ہوں اور کونٹ ٹورون میرا ہی بیٹا ہے۔

اس لئے اس تقریب کی خوشی میں کچھ کھانا اور شراب بھیجتی ہوں تاکہ تمھاری فوج بھی اس مسرت میں ہماری شریک ہو، اور اے سلطان عرب مجھے اُمید ہے کہ تم اس چھوٹی سی لڑکی کی یاد اپنے دل سے کبھی محو نہ کروگے جس پر تم نے کبھی اپنی انتہائی محبت و شفقت صرف کی ہے اور اس کی طرف سے یہ حقیر ہدیہ قبول کروگے"۔

جس وقت صلاح الدین یہ خط پڑھ چکا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے اور اُس نے سوار سے کہا اپنی ملکہ سے جاکر کہدو کہ صلاح الدین کبھی ان ایام کو نہیں بھول سکتا جب وہ اہل فرنگ کے قصور و محلات میں پیاری انٹانیٹ کو اپنی آغوش میں لیکر پھرا کرتا تھا۔ آج تک اس کے دل میں انٹانیٹ کی معصوم تبسم کے نقوش اسی طرح تازہ ہیں اور معلوم نہیں کتنی بار وہ ان ایام کی یاد سے بیقرار ہو ہو گیا ہے۔ میری طرف سے میری دلی دعائیں اس تقریب کے مسعود و مبارک ثابت ہونے کی پہونچا دو اور کہدو کہ میں نہایت فخر و مسرت کے ساتھ یہ ہدایائے محبت قبول کرتا ہوں اور اپنی فوج کو حکم دیتا ہوں کہ وہ بھی پوری مسرت کے ساتھ اس جشن میں شریک اور اس برج کے پاس بھی نہ جائے جس میں یہ تقریب مسرت آج ادا کی جا رہی ہے میری طرف سے اپنی ملکہ کو سلام پہونچا کر کہو کہ وہ انٹانیٹ کا آج بھی ویسا ہی سچا دوست ہے جیسا کل تھا"۔

سوار یہ پیغام لیکر واپس گیا اور ادھر صلاح الدین نے حکم دیا کہ ایک رات کے لئے جنگ ملتوی کر دی جائے۔ چنانچہ وہ رات قلعۂ کرک کی عجیب و غریب رات تھی کہ اندر اہل قلعہ مسرور و نشاط تھے اور باہر دشمن کی فوج بھی غرق مسرت نظر آتی تھی۔

یہ ہے وہ واقعہ جو ۵۷۹ھ یا ۱۱۸۳ء کی ایک رات میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلوص پرور اور محبت شناس دل کی وجہ سے ظہور میں آیا اور تعلقات دیرینہ کے احترام کی ایک بے نظیر یادگار صفحات تاریخ پر چھوڑ گیا۔

مسئلہ تاوان جنگ اور موجودہ اقتصادی مشکلات

گذشتہ جنگ عظیم نے جن اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سیاسئین یورپ کے روبرو رکھا ہے، ان میں سب سے پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ تاوان اور قرضہ ہائے جنگ کا ہے۔ جنگ عظیم میں ۸۰ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس کام آئے ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ زخمی ہوئے اور اربوں روپیہ کا سرمایہ ضایع ہوا ایک قوم دوسری قوم کی مقروض ہوگئی اور صنعت و تجارت کا پُرانا توازن درہم برہم ہوگیا۔ جنگ ہیجانی اور بحرانی کیفیات کے زیر اثر یہ سب کچھ ہوا وہ تو صرف ایک بلند نظر حکیم ہی سمجھ سکتا ہے مگر تنگ نظر سیاسئین اس کا الزام ایک دوسرے کے سر تھوپتے ہیں اور بمصداق "طویلے کی بلا بندر کے سر" یہ الزام نہایت آسانی کے ساتھ، جرمنی اور دیگر مفتوح اقوام کے سر عاید کردیا گیا ہے اور اس الزام کی پاداش میں انھیں تاوان جنگ کی ادائیگی کے لئے برابر مجبور کیا جارہا ہے۔

تاوان کے تعین میں بھی بڑی تنگ نظری سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا کوئی خیال اور لحاظ نہیں کیا گیا کہ مفتوح اقوام خصوصاً جرمنی میں کس قدر اہلیت (خوشحالی اور تنگ حالی دونوں زمانوں پر نظر کرتے ہوئے) ادائیگی تاوان کی ہے، علاوہ ازین اس کے سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی گئی کہ اس عہد اتحاد باہمی میں جب کہ تمام قومیں باہم دگر متعدد رشتوں سے وابستہ ہیں، ادائیگی تاوان کا اثر، خود فاتح قوم کی صنعت و تجارت پر کیا ہوگا۔ نیز اس بات پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ اس سلسلہ میں اگر ادائیگی کی اہلیت اپنے میں نہ پاکر، کوئی مفتوح قوم دیوالیہ ہوگئی تو اس کے اثرات بین الاقوامی کاروبار اور لین دین پر کیا ہوں گے۔ ایک جذبۂ انتقام و منافرت اور نشۂ قوت و اقتدار کام کررہا تھا۔ اور اسی کے ماتحت لایعنی اور بعید از قیاس مطالبات عاید کردیئے گئے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جنگ کے بعد سے، جرمنی تین مرتبہ دیوالہ سے قریب تر ہوگئی ہے اور ہر مرتبہ فاتح اقوام کو خود اپنی ذاتی صنعت و تجارت کی محافظت کے لئے، اُس کی امداد کے لئے دوڑنا پڑا ہے۔ جرمنی نے جو تاوان جنگ ادا کیا ہے، اس کی بھی بڑی دلچسپ صورت ہے۔ فاتح اقوام سے روپیہ لیکر انھیں میں آپس میں تقسیم کردیا ہے۔ تاوان جنگ کی ادائیگی کی توقع، اور عدم ادائیگی کی مایوسیوں سے تمام صنعت و تجارت پر جو بُرا اثر پڑرہا ہے، وہ موجودہ کساد بازاری اور عدم اعتماد سے عیاں ہے۔ یورپ کے مدبرین سنجیدگی سے اب اس پر غور کرنے لگے ہیں کہ آیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پُرانے تمام نقوش محو کردیئے جائیں اور از سر نو نئے اور سادہ صفحہ سے بین الاقوامی معاملات کی ابتدا کی جائے۔

تاوان کے حصہ رسد کا تعین مختلف اقوام کے درمیان جولائی سنہ ۱۹۲۰ء کی اسپا کانفرنس (Spa Conference)

کی رو سے اس طرح ہوا تھا۔

فرانس	۵۲ فی صدی
برطانیہ	۲۲ فی صدی
اٹلی	۱۰ فی صدی
بلجیم	۸ فی صدی
جاپان	۰٫۵ فی صدی
پرتگال	۰٫۷۵ فی صدی
باقیماندہ	۶٫۷۵ فی صدی
کل	۱۰۰

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء کے تاوان کمیشن کے مطابق تاوان کے کل مطالبہ کی رقم ۱۳۲ ملیرڈ گولڈ مارکس قرار پائی تھی اس سے قبل جرمنی نقد اور جنس کی شکل میں جو ۵ ملیرڈ گولڈ مارکس ادا کر چکا تھا وہ اس حساب میں شمار نہیں کئے گئے تھے۔

لندن کے نقشۂ ادائیگی (London Schedule of Payments) کے مطابق جرمنی کو یکم جولائی سنہ ۱۹۲۱ء تک تاوان کی ادائیگی کے لئے الف ب اور ج قسم کے ۱۲ ملیارڈ مارکس کے تمسکات کا اجرا کرنا چاہئے تھا۔ اور اسی سال کی یکم نومبر تک ۳۰ ملیرڈ مارکس کے تمسکات ایک قسم کے اور ۸۲ ملیرڈ مارکس کے دوسرے تمسکات دوسری قسم کے اجرا کرنا چاہئے تھے۔ خریداروں کو الف اور ب قسم کے تمسکات تو جس وقت چاہیں فروخت کئے جا سکتے تھے لیکن ج قسم کے تمسکات صرف اس وقت فروخت کئے جا سکتے تھے جبکہ کمیشن کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ جرمنی ان کے سود اور زر ادائیگی اصل (Sinking Fund) کا انتظام کرنے پر قادر ہے۔ تمام تمسکات پر سود ۵ فیصدی طے پایا تھا اور زر ادائیگی اصل ۱ فیصدی۔ جب تک ان تمسکات کی مکمل ادائیگی نہ ہو جرمنی کو سالانہ ۲ ملیرڈ گولڈ مارکس اور مال برآمدی قیمت کا ۲۶ فیصدی حصہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ جرمنی کو پہلی قسط کے طور پر فوراً ایک ملیرڈ مارکس سونے کی شکل میں یا بیرونی سکہ کی شکل میں یا تین مہینہ کے ٹریزری ڈرافٹ کی شکل میں ادا کرنا تھے۔ برلن میں ایک ضمانتی کمیشن (Guarantee Commission) کا تقرر ہونا قرار پایا تھا جس کے سپرد ادائیگی تاوان کی نگرانی تفویض کی گئی تھی۔

ایک ملیرڈ مارکس تو جرمنی نے کسی نہ کسی طرح فوراً ادا کر دیئے لیکن مقررہ سالانہ قسطوں کی ادائیگی میں اسے روز بروز دقت

محسوس ہونے لگی۔ اس کے پاس طیار مال ایسا نہ تھا جسے قرض کی ادائیگی میں وہ پیش کر سکتا۔ مجبوراً اُسے اپنے ملکی سکہ کے معاوضہ میں بیرونی سکہ خرید نا پڑا۔ ملکی سکہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور اس سے جرمن سکہ کی قیمت گرنا شروع ہوئی۔ جب ایک مرتبہ نوٹ چھپنا شروع ہو گئے تو ان کی کوئی حد و انتہا ہی نہ رہی اور جرمنی کی اقتصادی زندگی میں مکمل ابتری پیدا ہو گئی۔ جرمنی نے بار بار التوائے تاوان کی درخواست کی تاکہ وہ اپنی مالی حالت سدھار سکے اور تاوان جنگ کی ادائیگی کی اہلیت پیدا کر سکے مگر سب بے سود رہی۔

اگست ۱۹۲۲ء کے بالفور نوٹ (Balfour Note) کے ذریعہ سے برطانیہ نے اتحادیین کے قرضے اور اپنے حصۂ تاوان کو اس شرط پر معاف کرنے کا وعدہ کیا کہ فرانس بھی مسئلہ تاوان کا فیصلہ معقول اور معتدل انداز میں کرنے کیلئے رضامند ہو جائے۔ بونر لا (Bonar Law) نے برطانیہ کی طرف سے ایک شرط یہ رکھی کہ بلجیم اپنے حصۂ تاوان کی ادائیگی کے موقعہ پر اس بات کا دعوی نہ کرے تو اُس کا حق ادائیگی میں سب سے مقدم ہے۔ دوسرے فرانس اور بلجیم اس بات کی طرف سے مطمئن کر دیں کہ بنک آف انگلینڈ میں جو انکا سونا جمع ہے اُس سے وہ دستبردار ہونے کے لئے رضامند ہیں۔

جب جرمنی تاوان جنگ کی ادائیگی سے معذور رہا تو ۱۹۲۳ء میں روہر کے علاقہ میں جرمنی کی طرف سے فرانس کے قبضہ کے خلاف مقاومت مجہول کی صورت حال نمودار ہوئی اور حالت بہت ابتر ہو گئی۔

اس ابتری کو رفع کرنے کے لئے نئے تاوان کمیشن مقرر ہوا۔ اُس کے سامنے یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے رکھا گیا کہ ایسا پلین (طریقہ) اختیار کیا جائے کہ ــــــ جرمنی اپنے مالیہ کے توازن اور اپنے سکہ کے استحکام کو ضائع کئے بغیر تاوان ادا کر سکے۔ کمیشن نے اپنی تحقیقات اس مفروضہ نظریہ سے شروع کی کہ جرمنی اسیوقت تاوان ادا کر سکتا ہے جبکہ اُسے اپنی سیاسی آزادی اور معیشی استحکام و استقلال حاصل کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ کمیشن نے پوری تحقیقات کر کے جرمنی کے ذرایع دولت کی جانچ پڑتال کی اور ڈاز پلین (Dawes Plan) کے مطابق جرمنی کی املاک و جائداد و ذرایعہ دولت کی کفالت میں مندرجہ ذیل رہنی تمسکات کا اجرا کرنا طے کیا۔

۱۔ املاک ریلوے کی رہنی تمسکات قیمتی .... ۱۱ ملیرڈ مارکس طلائی

۲۔ جرمنی کی تمام صنعتوں کے رہنی تمسکات قیمتی .... ۵ ملیرڈ مارکس طلائی

۳۔ مخصوص سالانہ محاصل .... ۱½ ملیرڈ مارکس طلائی

ان مختلف ذرایع سے جن منافع کی اُمید تھی وہ حسب ذیل تھے :-

۱۔ ریلوے سے	۶۶۰	ملین مارکس طلائی
۲۔ صنعتوں سے	۳۰۰	" "
۳۔ محاصل انتقال سے	۲۹۰	" "
۴۔ کسٹم اور دیگر محاصل صرف سے	۱۲۵۰	" "
کل	۲،۵۰۰	" "

اس طرح جرمنی میں اسوقت کی تجارتی و مالی حالت کے مطابق جس قدر اہلیت ادائیگی تاوان کی تھی وہ ۲،۵۰۰ ملین مارکس سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔

جنرل ڈاز نے اس اہلیت ادائیگی کے مطابق سالانہ قسطیں مقرر کردیں اور جو نقشے ادائیگی تاوان کے لئے بنائے گئے تھے ان پر عملدرآمد یکم ستمبر ۱۹۲۴ء سے شروع ہوا۔ نئے انتظام میں مارک کو دوبارہ سونے کی بنیاد پر قائم کیا گیا اور جرمنی کا ساکھ بین الاقوامی منڈیوں میں پیدا ہوگیا۔ اور امریکہ جرمنی کو قرض دینے لگا۔ ستمبر ۱۹۲۴ء سے اپریل ۱۹۲۹ء تک —— پانچ سال سے بھی کم عرصہ میں امریکن سرمایہ داروں نے وہاں ... کے کاروبار میں ایک ارب اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ ڈالر لگائے اور سرمایہ سے فایدہ مرکزی جرمن گورنمنٹ، صوبہ کی حکومتوں، میونسپلٹیوں اور صنعتی کارخانوں نے حاصل کیا۔

اپریل ۱۹۲۹ء میں نیویارک اسٹاک ایکسچینج نے سرمایہ کے لئے زیادہ فایدہ مند امکانات امریکہ ہی دکھانا شروع کئے جس کی وجہ سے جرمنی سے روپیہ کھچنے لگا اور قرضوں کی تجدید نہ ہوسکی۔ اس سے دوبارہ جرمنی کی مالی حالت میں ابتری پیدا ہونا شروع ہوئی اور دنیا کے کاروبار پر بھی اس کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ جرمنی نے جب تک قرض کے لئے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو جواب یہ ملا کہ گو ڈاز پلین سے تاوان جنگ کی سالانہ قسطیں مقرر ہوگئی ہیں لیکن اس بات کا ابھی تک تعین نہیں ہوا ہے کہ جرمنی کو کل کس قدر اور کتنے سالوں میں تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا۔ اس لئے سرمایہ دار جرمنی میں اپنا روپیہ پھنسانا نہیں چاہتے۔ اور چونکہ جرمنی کو روپیہ قرض نہ دینے کے معنی یہ تھے کہ تمام دنیا کے کاروبار میں ابتری پیدا کی جائے اس لئے ایک بین الاقوامی جلسہ مشاورت منعقد کیا گیا اور ینگ پلین (Young Plan) معرض وجود میں آیا جس کی رو سے کل رقم تاوان جنگ کی ۲۷ ارب ۴۴ کروڑ ۱۱ لاکھ ۴۴ ہزار ۸ سو ... قرار پائی۔ اور یہ طے پایا کہ اس تاوان جنگ کی سالانہ قسطیں تقریباً تین نسلوں پر پھیلا دی جائیں۔ اس سے سرمایہ داروں کا اطمینان ہوا اور ستمبر ۱۹۲۹ء سے پھر قرض دیا جانے لگا اور جرمنی کا کام چل نکلا۔ امریکہ نے اپنے بچے ہوئے سرمایہ میں سے ۲۵ کروڑ ڈالر کی قیمت کے جرمن تمسکات خرید لئے اور امریکہ کے بنکوں نے تھوڑی مدت کے لئے ۷ کروڑ ڈالر مزید براں قرضوں میں لگا دیئے اس طرح ۱۹۲۴ء کے اخیر سے یکم جولائی ۱۹۳۱ء تک جرمنی کو نئے قرضے ۲ ارب ۱ کروڑ ڈالر کے پہلے قرضوں کے علاوہ اور دیئے گئے اور ان میں سے یا انہی کے ذریعہ سے جرمنی نے اپنے تاوان جنگ کے حساب میں ۲ ارب ۴ کروڑ روپیہ اپنے قرضخواہوں کو ادا کیا اور چونکہ یہ قرضخواہ خود امریکہ کے مقروض تھے اس لئے انھوں نے اس میں سے ۲ ارب سے کچھ کم امریکہ کو اپنی طرف سے ادا کردیا۔

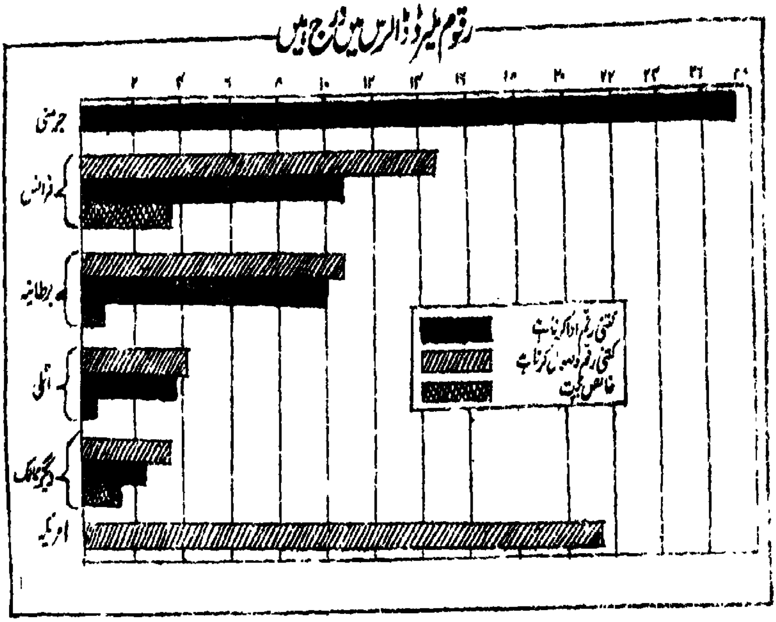
جولائی ۱۹۳۱ء میں جرمنی تیسری مرتبہ مالی مشکلات میں گرفتار ہوکر دیوالہ کے قریب تر ہوگیا۔ اس مرتبہ اس کا فوری سبب یہ تھا کہ آسٹریا کے بڑے بنک کریڈٹ انشالٹ کا دیوالہ نکل گیا تھا جس کا اثر جرمنی پر بھی پڑا۔ امریکہ، انگلینڈ اور فرانس کے بنکوں نے گھبرا کر قلیل مدت کے لئے جتنے قرضے جرمنی کو دیئے گئے تھے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور قرضوں کی تجدید سے انکار کردیا۔ یہ حالت دیکھکر بین الاقوامی

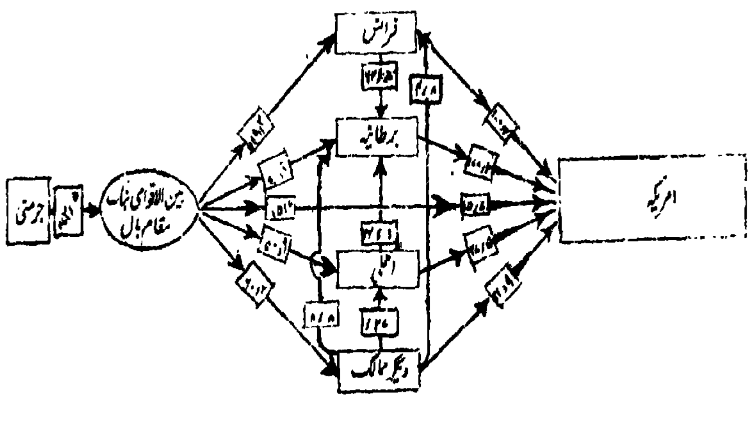
ایک سرکاری اعلان شایع کیا جس میں بہ وضاحت یہ امر ظاہر کیا کہ جرمن گورنمنٹ اپنی رعایا کے اوپر اس کی قوت برداشت سے کہیں زیادہ محصول عاید کر چکی ہیں اور اب اس کے صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ کی مالی حالت بہت ابتر ہے۔ دنیا کا اقتصادی نظام پاش پاش ہونے والا ہے اسلئے اسوقت یہ بات کی ضرورت ہے کہ جرمنی کو تاوان جنگ کی ادائیگی سے معاف کیا جائے۔ اس اعلان سے دوسرے الفاظ میں یہ نتائج نکلتے ہیں کہ اول تو جرمنی ———— تاوان جنگ کی قسطیں ادا کرنے سے معذور ہے یا اگر ادا کرسکتا ہے تو ادا کرنا نہیں چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر فوری مالی امداد جرمنی کو اس وقت نہیں دی گئی تو جتنے غیر ملکی سرمایہ داروں کے بیرونی قرضے ہیں ان کا نہ صرف سود مارا جائیگا بلکہ اصل بھی ضائع ہو جائیگا۔ اور کم مدت کے لئے جتنے قرضے امریکہ، انگلینڈ اور فرانس نے دیئے ہیں وہ واپس نہیں کئے جا سکیں گے۔ ۲۰ جون ۱۹۳۱ء کو پریسیڈنٹ ہوور نے امریکہ کی طرف سے جرمنی کی خستہ حالت دیکھ کر ایک سال کے لئے التوائے ادائیگی قرضہ کی اجازت دیدی۔ برطانیہ نے بڑے جوش سے اس التوا کا خیر مقدم کیا۔ لیکن فرانس نے ایک ماہ کی ڈھیل ——— ڈالدی اور اس کے بعد چھ مہینے کے لئے جرمنی سے تاوان جنگ کی وصولیابی ملتوی کی گئی۔ یہ مدت ختم ہوگئی ہے، بین الاقوامی مطالبات کے لئے جو کمیٹی بیس (B-asle) میں بیٹھی تھی وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی ہے ———— (Dis-armament conference) کے روبرو یہ مسئلہ پیش ہونے والا ہے اور اس کے فیصلہ سے امیدیں وابستہ ہیں۔

یہاں تک تو اس مسئلہ پر اسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے محض تاوان جنگ کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ مسئلہ بہت پیچ در پیچ ہے۔ دوران جنگ میں جنگ کو جاری رکھنے کے لئے مصروف پیکار قومیں مجبور ہوئی تھیں کہ سامان جنگ و رسد ایک دوسرے سے قرض لیں اور اس سلسلہ میں امریکہ کو اپنے غیر محدود قدرتی ذرایع دولت کی وجہ سے سب کو قرض پر اشیائ فراہم کرنا پڑی تھیں ———— وہ زمانہ سخت ضرورت کا تھا۔ اشیاء کی قیمتیں چڑھی ہوئی تھیں، سود کی شرح تیز تھی۔ امریکہ نے بھی دل کھول کر قرض دیا۔ برطانیہ نے اٹلی اور فرانس نے اپنی اپنی بساط کے مطابق قرض لیا بھی اور دیا بھی غرضکہ قرضے کی ایک بھول بھلیاں سی بن گئی۔

جب جنگ ختم ہوئی اور قرضوں کے تصفیہ کا وقت آیا تو اپنے اپنے سر پر قرض کا بھاری بوجھ دیکھ کر ہر قوم نے اس کی ادائیگی سے جان چرائی۔ اور جنگ کی وجہ سے جو نقصان جان و مال کا ہوا تھا اس کی تلافی کی خواہش کی۔ فاتح حلیف اقوام نے جنگ کی ذمہ داری کا سارا الزام جرمنی کے سر منڈھ کر اسے اپنے تمام اندرونی اور بیرونی قرضوں، جنگ کی پنشنوں اور اخراجات تعمیر نو کی ادائیگی کے لئے پابند کر دیا اور چونکہ جنگ کا محاذ، فاتح ممالک میں زیادہ تر فرانس کی سرزمین رہی، اس لئے فرانس کو تاوان جنگ میں سے حصہ رسد سب سے زیادہ ملا۔ آخری نتیجہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جرمنی کو صرف قرض ادا کرنا تھا اور امریکہ کو صرف وصول کرنا

اور باقی تمام ممالک کو ادا بھی کرنا تھا اور وصول بھی اس کی مکمل تعبیر اس وقت کی صورت حال کے مطابق ذیل کے دو نقشوں سے ہوتی ہے:—





برطانیہ ابتدا سے کہہ رہا ہے چنانچہ بالفور نوٹ (Balfour Note) میں بالوضاحت اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ اگر برطانیہ کو اس کے جنگی قرضوں سے بری کر دیا جائے تو وہ اپنی طرف سے تاوان کے حصہ رسد اور اپنے جنگی قرضوں سے دستبردار ہونے کے لئے طیار ہے۔ یہی حال اٹلی کا بھی ہے اور دوسرے ممالک بھی برضا و رغبت یا بادل ناخواستہ اس بات پر رضامند ہو جائیں گے۔ لیکن فرانس اپنے تاوان کے حصہ رسد کو چھوڑنے کے لئے کس طرح طیار نہیں ہے اور امریکہ کا یہ کہنا ہے کہ تاوان کا مسئلہ یورپ کے ممالک کا اندرونی مسئلہ ہے جس سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں تاوان جنگ نہیں مانگتا نہ اس کی مجھے ضرورت ہے۔ میں نے تو قرض دیا ہے اور قرض کی ادائیگی موجودہ نظام سرمایہ داری میں بہر حال ایک قرضدار کا فرض ہے آپ کو تاوان جنگ ملے یا نہ ملے مجھے قرض ملنا چاہیئے اور اگر آپ کا یہ عذر ہے کہ ہم میں ادائیگی قرضہ کی اہلیت نہیں ہے تو اول تو میں اسے تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہوں کیونکہ جب زائد از ضرورت فوجی مصارف اور مزدوروں کی منفعت اور دلداری کے لئے صرف کرنے کے واسطے آپ کے پاس روپیہ ہے تو قرض و سود کی ادائیگی کے لئے بھی نکل سکتا ہے۔ اور اگر حالت آپ کی فی الواقعی ابتر ہے اور دیوالہ سے قریب تر ہے تو حسب دستور، اپنے تمام ذرائع دولت، ضروری اخراجات اور قرضوں کی جانچ پڑتال اور موازنہ کا موقع ایک غیر جانبدار کمیشن کو دیجئے تاکہ وہ ایک قطعی رائے آپ کے متعلق دے سکے اور آئندہ کے لئے دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ آپ کی اصل حیثیت اب کس قدر رہ گئی ہے اور آئندہ کہاں تک آپ کو قرض دینا اور آپ سے معاملت کرنا قرین مصلحت ہے ... بے عزتی کو کوئی مقروض قوم سوائے جرمنی کے برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

ایک اور پیچ جو اس معاملہ میں پڑتا ہے وہ قرض کی ادائیگی کی صورت سے متعلق ہے۔ قرض یا تو مال وجنس کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے یا نقد طلائی کی شکل میں۔ اگر اول الذکر صورت اختیار کی جائے تو اس کا جو اثر ملکی صنعت و تجارت اور بے روزگاروں کی تعداد پر ہوگا وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ امتناعی محاصل سے اس غیر ملکی مصنوعہ مال کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ رہا نقد طلائی اور قابل قبول غیر ملکی سکوں کی شکل میں تو اس کیلئے ہر ملک کے واسطے ایک حد ہے کہ جس سے تجاوز کرنے سے ملک کا تمام نظام کرنسی متزلزل ہو جاتا ہے اور جس کے اثرات تمام عالم کے کاروبار پر پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں سونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ گردش کرتا رہے۔ لیکن اگر ایک طرف سے برابر ادائیگی ہوتی رہی اور دوسری طرف سے وصولیابی اور نئے قرضوں کا امکان مسدود کر دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سونا ایک یا دو ایسے ملکوں کے خزانوں میں، جو تاوان یا قرضہ سب سے زیادہ وصول کرتے ہیں مقفل ہو جائیگا۔ اور چونکہ تمام عالم کے سکوں کا دار و مدار اس زمانہ میں سونے پر ہے اس لئے ہر جگہ قلت زر کی وجہ سے سکوں کی تعداد میں کمی ہوگی جس سے قیمتیں گرنا شروع ہو جائیں گی اور عالمگیر کساد بازاری رونما ہو جائیگی اور بے روزگاری میں اضافہ ہو جائیگا۔ گری ہوئی قیمتوں سے ایک اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ قرضے جو بڑھی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں لئے گئے تھے ان کا بار زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے کیونکہ مال وجنس کی زیادہ مقدار پرانی رقم کے قرضہ کی ادائیگی کے لئے درکار ہوتی ہے

اس گورکھ دھندے کو سلجھانے میں دنیا اس وقت لگی ہوئی ہے۔ امریکہ اور فرانس کے خزانوں میں اس وقت دنیا کا ایک تہائی سونا منتقل ہے۔ آسٹریا، جرمنی اور انگلستان کے مالیہ کا توازن چونکہ امریکہ اور فرانس کے سرمایہ داروں کے لئے تشفی بخش نہیں تھا، اس لئے انھوں نے ان ملکوں کو ان کی حسب ضرورت، قلیل مدت کے قرضوں کے دینے سے انکار کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے اول آسٹریا مقررہ وقت پر اپنے قرضوں کے دینے سے قاصر رہا۔ آسٹریا سے یہ وبا جرمنی میں پہنچی کیونکہ آسٹریا اور جرمنی کے تجارتی تعلقات بہت قریبی تھے۔ جرمنی سے یہ مصیبت انگلستان میں منتقل ہوئی کیونکہ انگلستان نے اپنا بہت سا روپیہ جرمنی میں لگا رکھا تھا۔ انگلستان کو مجبوراً معیار طلائی سے دست بردار ہونا پڑا۔ امریکہ، فرانس، اور دیگر ممالک نے غیر ملکوں کے مال کے خلاف اتنا محاصل لگا رکھے ہیں جسکی وجہ سے مقروض قوموں کو اپنے قرض کے ادا کرنے میں بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ مجبوراً وہ قرضخواہ قوموں سے ہی قرض لیکر اپنا قرض ادا کرتی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ قرض بحالہ قائم رہتا ہے۔ اور مقروض قوموں کا جو مال قرضخواہ ممالک میں یا ان کی منڈیوں میں پہنچ جاتا ہے اس کی وجہ سے اُن کی صنعت پر بُرا اثر پڑتا ہے اور بے روزگاری بڑھتی ہے از اول تا آخر اس تمام مسئلہ میں متضاد اور مخالف شکلیں مجتمع نظر آتی ہیں۔ جرمنی سخت تکلیفیں اُٹھاکر اور محرومیاں برداشت کرکے تاوان اور قرضہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ قرض وصول کرنے والے اُس کی وجہ سے یا تو بے روزگاری بڑھاتے ہیں یا تمام عالم کے نظام مبادلہ کو درہم برہم کرتے ہیں۔ عالمگیر کساد بازاری رونما ہوتی ہے۔ پیداوار کی کثرت کے باوجود لوگ فاقہ کرتے ہیں۔ ہر قوم اپنی اپنی جگہ پریشان ہے، لیکن اپنی ہٹ دھرمی، تنگ نظری اور ذاتی وفوری نفع کی وجہ سے، مستقل اور عام نفع کو قربان کر رہی ہے

مسئلہ کے صحیح حل کے لئے ایک ناقابل انکار حقیقت کے اعتراف کی ضرورت ہے اور جب تک قومیں اُس کا اعتراف عملاً نہیں کریں گی اس وقت تک کسی بھلائی کی توقع فضول ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم جس مقصد کے حصول کے لئے لڑائی گئی تھی اس کے حاصل کرنے میں وہ ہر طرح ناکامیاب رہی جتنی جانیں ضائع ہوئیں، جس قدر مال کا نقصان ہوا، وہ بیکار ہوا اور جن قوموں نے اس لڑائی کو جاری رکھنے کے لئے قرضہ دیا ان کو بھی محض اس جنگ کی وجہ سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

قوموں کی یہ خواہش کہ وہ دوسری قوموں کو غلام بناکر ان کی محنت ومشقت کی گاڑھی کمائی سے اپنے عیش وآرام کے سامان فراہم کرسکیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ویسٹمنسٹر بنک کے صدر مسٹر بکٹ نے حصہ داروں کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ "سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ سے دنیا کی کثیر دولت ضائع ہوگئی تھی۔ لیکن جنگ کے بعد چند سالوں میں جو ایک بحران کی سی کیفیت رہی اس نے قوموں کے روبرو ایک خیالی فردوس کا نقشہ پیش کردیا تھا جسکے دھوکہ میں آکر انھوں نے تعمیر نو کے کام کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ اگر قوموں نے سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک کی مدت کو اُن مہمل اور بے شمار قوم کے جھگڑوں میں

ضائع نہ کیا ہوتا جن کے وصول کرنے کی انھیں ایک دوسرے سے توقع تھی اور اگر انھوں نے اس بات کو پیش نظر رکھا ہوتا کہ ضائع کی ہوئی دولت کو دوبارہ پیدا کرنے کے لئے سخت محنت اور کفایت شعاری کی ضرورت ہے اور بلندتر معیار حیات کا قائم رکھنا ان ملکوں کے لئے ناممکن ہے جو اپنی دولت ضائع کر چکے ہیں تو شاید ہم دس سال پہلے امن صحت کی حالت کو دوبارہ حاصل کر چکے ہوتے اور موجودہ مصیبت کا امکان فنا ہو گیا ہوتا۔ بیسیوں بین الاقوامی کانفرنسوں کے باوجود اور ان تمام مساعی کے ہوتے ہوئے جو جنیوا میں کی جا رہی ہیں، ایک عالمگیر جنگ، اسوقت بھی جاری ہے اور گو اب اس کا عمل صرف معیشی میدان میں محدود ہے لیکن اس کی تباہ کاریاں کسی حال میں گذشتہ واقعی جنگ سے کم نہیں ہیں

جنگ عظیم کے بعد سے، مفتوح اور کمزور قوموں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے تخیل پر لیگ کے زیر سایہ آزادی سے عمل کیا جا رہا ہے فاتح اقوام نے اس بات کی توقع کی کہ .... جنگ کیوجہ سے جو ان کو شدید نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں انکی تلافی مفتوح اقوام اپنی محنت کی کمائی سے کریں گی۔ اور اس بنیاد پر انھوں نے بہت بھاری مطالبات ان قوموں پر عاید کر دیئے۔ لیکن مطالبات عائد کرتے ہوئے یہ حقیقت بھلا دی گئی کہ کسی شخص و قوم پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں لادا جا سکتا۔ اور کوئی قوم مستقل طور پر دوسرے کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و آرام کے سامان مہیا نہیں کر سکتی۔ نتیجہ موجودہ عالمگیر پریشان حالی سے ظاہر ہے۔ اگر اس پریشان حالی کو رفع کرنے کے لئے کسی دوسری جنگ کا آغاز کیا گیا تو اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہوگا۔ اور اس تمام سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اس کے مظاہر کا ایک دن یہ نتیجہ ہوگا کہ تہذیب و شائستگی کی شاندار عمارت مسمار ہو جائیگی

محمد عاقل۔ ایم۔ اے (علیگ)

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی خدمت اردو کا ایک عجیب و غریب کارنامہ
"گلستاں" سے "بہار" کا قیاس

گالسوردی کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ——— مشتے نمونہ از خروارے

غالباً سال گزشتہ یا اس سے قبل میں نے نگار میں ہندوستانی اکاڈیمی اور اس کی خدمات اردو پر تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا تھا۔ اور انھیں میں سے ایک شاید گالسوردی کے ڈراموں کے متعلق بھی تھا۔ یہ میرے بعض محترم بزرگوں کو ناگوار ہوا اور انھوں نے اصولی گفتگو سے علحدہ ہو کر بعض ایسی ناخوشگوار بحثیں چھیڑ دیں کہ میں نے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے اکاڈیمی کے ارباب حل و عقد سے ایک سوال تو یہ کیا تھا کہ گالسوردی کے ڈرامے کیوں ترجمہ کے لئے تجویز کئے گئے اور دوسرے یہ کہ مترجمین کا انتخاب کن اصول پر کیا گیا ہے۔

ان سوالوں کا جواب دیا گیا یا نہیں اور دیا گیا تو کیا؟ میں اس وقت اس امر کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو پیشین گوئی میں نے ان ترجموں کے متعلق کی تھی وہ کس حد تک صحیح ثابت ہوئی اور مثلاً گالسوردی کے ایک ڈراما (Skin Game) کے ترجمہ (فریب عمل) کے محاسن پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ ڈراما "تین ایکٹ" پر مشتمل ہے اور ہر ایکٹ میں متعدد "سین" ہیں۔ اولیں ورق الٹتے ہی سب سے پہلی فروگزاشت تو نگاہوں کے سامنے یہ آتی ہے کہ نہ لفظ ڈرامہ کا ترجمہ کیا گیا اور نہ ایکٹ و سین کا، درانحالیکہ فاضل مترجم نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ انگریزی کا کوئی لفظ بغیر ترجمہ کئے ہوئے نہ بچ جائے خواہ وہ عبارت کو کتنا ہی مہمل و بے معنی کیوں نہ بنا دے اور جس کی مثالیں آگے آئیں گی۔ خیر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ یہ تینوں الفاظ اردو ہی کے ہیں جن کے ترجمہ کی ضرورت نہ تھی اور ایک سرسری نگاہ ترجمہ پر ڈال جائیے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک ناقص ترجمہ کی اس سے زیادہ مکمل مثال کوئی اور مل سکتی ہے۔ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں چند در چند غلطیاں نظر نہ آئیں۔ اور وہ بھی ایک قسم کی نہیں۔ زبان و محاورہ کی، ترتیب الفاظ کی، جملوں کی ترکیب کی اور (اگر فاضل مترجم صاف فرمائیں تو میں کہوں کہ) اخذ مفہوم کی اور لطف کی۔ صرف دو گھنٹے کی سرسری ورق گردانی سے بغیر کسی کاوش کے جو غلطیاں مجھے نظر آئیں ان کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ جن میں سے بعض آج کی اشاعت میں درج کی جاتی ہیں:-

صفحہ ۲ - "مل کریسٹ ایک گھومتی کرسی پر بیٹھا ہے اُس کو گٹھیا بائی کی شکایت ہے"	"گھومنے والی کرسی چاہیئے" گٹھیا کافی ہے۔ گٹھیا بائی - جہلا کی زبان ہے۔
،، ،، "اس ہارن بلور جیسے بیٹے اور کیوں بنائیے"	ہارن بلور کے بعد لفظ ہی ضروری ہے۔
،، ۳ - یہ نام تو پھر اور ناموں کو دیکھتے ہوئے اچھا ہے خرابی سے دور، کبھی تقدیر زد میں تو ہے	نام کا خرابی سے دور ہونا اور اس کا زد میں ہونا معلوم نہیں کیا مفہوم رکھتا ہے۔
،، ۴ - بڑا چیٹ پٹا امر ہے	چیٹ پٹا، بازاری لوگوں کا محاورہ ہے جس کیرکٹر کی زبان سے یہ لفظ ادا کیا گیا ہے وہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے بازاری عورت نہیں ہے۔
،، ۵ - بڑے میاں تو بڑے چھوٹے میاں سبحان اللہ	محاورہ یوں ہے: بڑے میاں تو بڑے میاں الخ۔
،، ،، "شوقین مزاج"	ارذال کا محاورہ ہے حالانکہ کہنے والی وہی معزز خاتون ہے
،، ۸ - جب تک یہ ایک بڈھا بھی دنیا میں رہیگا تو جوانوں کی زندگی وبال رہیگی۔	تو زاید ہے
ان کو کل کو کسی اونچے درخت پر چڑھا دینا چاہیئے۔ "پرانے چنڈول"	جاہلوں کا سوقیانہ محاورہ ہے جو اسی معزز خاندان کی لڑکی کے زبان سے ادا کرایا گیا ہے۔
،، ۹ - ان کے آپ جان کا خیال ہے۔	ابا جان چاہیئے۔ آپ جان کوئی نہیں بولتا
ملکہ الزبتھ کے زمانہ سے تو مستقل طور سے رہتے ہیں۔	مستقل طور پر لکھنا چاہیئے۔ تاکہ دو "سے" نہ جمع ہو جائیں
،، ۱۰ - آپ لوگوں کا یہ برتاؤ کیوں رہتا ہے۔	"برتاؤ ہے" کافی ہے۔ برتاؤ کے بعد "رہتا ہے" غلط ہے۔
،، ۱۱ - ہاتھ پیر مارنے لگیں	ہاتھ پاؤں چاہیئے۔ ہاتھ پیر غلط ہے۔
،، ۱۲ - تمھیں دیکھو کہ ہارن بلور وغیرہ کے جیسے لوگوں کو	وغیرہ کا لفظ بالکل بیکار ہے۔
جب میں نے شاگرد پیشہ ان کے ہاتھ بیچ کیا تھا جب اُن میں اتنی خود غرضی نہ تھی	دوسرا جب بالکل غلط ہے۔
،، ۱۳ - پہلے یہ لوگ گل کٹ طریقے جانتے ہی نہ تھے	گل کٹ بالکل مہمل ترکیب ہے یوں لکھنا چاہیئے تھا کہ "پہلے یہ لوگ ایسی گلا کاٹنے والی باتیں جانتے ہی نہ تھے"
،، ۱۴ - یہ سب بیل اسی کے بوتے ہیں	محاورہ بیج لینا ہے۔ علاوہ اس کے بیل کو مذکر لکھا ہے حالانکہ وہ

	بالاتفاق مونث ہے ۔
صفحہ ۱۷ - تین سال ایک جگہ رہتے ہوئے اور کبھی امی جان ۔"	رہتے ہوئے کے بعد "ہوگئے" ضروری ہے ۔
" ۱۸ - معانی کا تو انھوں نے سبق ہی نہیں سیکھا	"سبق ہی نہیں پڑھا" چاہئے سیکھا غلط ہے ۔
" ۱۹ - مجھے موج آگئی ہے	مجھے کا استعمال بالکل غلط ہے صرف "موج آگئی ہے" ہونا چاہئے ۔
کاگ کلائی بوتلوں کی کاگ	ترجمہ ہے "اس کلائی کا جس کی مدد سے کاگ کھولا جاتا ہے" ! "کاگ" مذکر ہے ۔
" ۲۱ - جیکسن صاحب اور ان کی بیگم آپ سے ملنا چاہتے ہیں	"ملنا چاہتی ہیں" ہونا چاہئے ۔ ہمیشہ آخری فاعل کے لحاظ سے فعل کی تذکیر و تانیث متعین کی جاتی ہے ۔
" ۳۷ - اپنا عندیہ دیدیں ۔	"عندیہ ظاہر کر دیں" ہونا چاہئے ۔ عندیہ دینا محاورہ نہیں ہے
" ۳۹ - ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جیسے سر پر چھوٹی ہوگی اس کی آواز میں عجیب بھناتا ہے نہ شمالی نہ اسکاٹلینڈ کی آواز معلوم ہوتی ہے ۔	ہوگی کے بجائے صرف ہو ہونا چاہئے بھناتا داد طلب ہے غالباً بھیانکپن کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔ دوسرا ٹکڑا بالکل مہمل ہے یوں ہونا چاہئے ۔ نہ اہل شمال کی آواز معلوم ہوتی ہے نہ اہل اسکاٹلینڈ کی ۔
" ۴۲ - وہ تو نہیں جن کی گنج سی ہوئی ہے ، زبان قینچی سی چلتی ہو بس بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیتی ہے	کہاں گنج اور کہاں بزم اور شعلہ نوائی !!
" ۴۴ - ضرور - وعدہ خلافی بدعہدی تو ان کا شعار ہی رہا ہے	ضرور کا استعمال کس قدر لغو طریقہ سے ہوا ہے ۔ وعدہ خلافی کے بعد اور کا آنا ضروری ہے ۔
" ۴۹ - باتیں مارنا شیخی کی اڑانا	دونوں محاورے غلط ہیں ۔ باتیں بنانا اور شیخی بگھارنا کہنا چاہئے
" ۵۱ - جن کو نوچ کھسوٹ نہیں کہتے تو اور کیا ؟	کیا کے بعد کہتے ہیں ضروری ہے
" ۵۲ - آپ ہی ہماری سدراہ ہیں	ہمارے لئے سدراہ چاہئے
" ۵۰ - خیر میں ہوں تو میرا ہی سہی ، میں خورشید صبح آپ ہیں آفتاب شام بقول کسی شاعر	فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے
" ۵۵ - چھوٹا آدمی ہو خواہ بڑا آدمی ہو وہ کوئی بھی دوسروں کا محتاج ہونا نہیں پسند کرتا ۔	کوئی بھی کے بعد ہو ضروری ہے ۔ نہیں لفظ پسند کے بعد آنا چاہئے

صفحہ ۵۶ - ڈھولوں کے اندر سواپول کے اور ہے ہی کیا ؟	"ہی" چاہئے
" ۶۱ - تو نہیں میں ان کو ٹھیک ہی کر دونگا۔	"تو نہیں جو ان کو ٹھیک نہ کر دوں" چاہئے
جب تک آپ ہمارے یہاں چلتے رہئے	کہنے والا اپنے ہی گھر میں ہے اس لئے چلتے کے بجائے آتے ہونا چاہئے
" ۶۴ - ہاتھ لانا یا، کیوں کیسی کہی	"ہاتھ لاؤ استاد کیوں کیسی کہی" ہونا چاہئے
" ۷۱ - اگر ابھی تک بولی ختم نہیں ہوئی جب تو ہم نے بھی لیں گے	جب کا استعمال غلط ہے - بھی کے بجائے ہی ہونا چاہئے
" ۷۴ - آپ لوگ اس کو جانیں کیا جو بیچ میں کترنے لگے۔	"بیچ میں کترنا" اردو کا محاورہ نہیں - اس موقعہ پر "دخل در معقولات کرنا" بولتے ہیں
" ۷۶ - ندگی زہر ہو جائے گی	بجائے زہر کے دوبھر چاہئے
" ۹۳ - کسی کو محض اس لئے متروک کر دیا جائے کہ وہ باہری ہیں	متروک آدمی کے لئے نہیں آتا - باہری بھی غلط ہے۔ "متروک کر دیا جائے" کے بجائے چھوڑ دیا جائے - اور باہری کے بجائے اجنبی چاہئے - ہیں بھی غلط ہے - ہے ہونا چاہئے
" ۹۸ - ستمبر کے مہینے کی دلخوش کن دھوپ	"دلخوش کن" غلط نہیں ہے - لیکن زیادہ تر ایسے موقعہ پر خوشگوار کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
" ۹۹ - یہ تو نہ اپنی ٹانگ لڑائیں گے	اڑائیں گے چاہئے۔
" ۱۰۰ - جیسے آخری بولی ہو چکے تو اگر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت ہو تو رومال ناک میں لگا لیں	نہایت الجھا ہوا جملہ ہے - یوں ہونا چاہئے - جیسے ہی آخری بولی ہو چکے تو رومال ناک پر رکھ لیں - اگر مجھے آگے بولی بولنے کی اجازت ہو۔
" ۱۰۶ - ہمانوں تو آج رہ رہ گئے	"رہ رہ گئے" - غلط ہے - صرف رہ گئے ہونا چاہئے
" ۱۰۸ - ان کو سلبٹ چرخہ کو دیکھئے	بالکل نیا لفظ ہے اور معلوم نہیں کس مفہوم میں لکھا گیا ہے۔
" ۱۱۱ - اک ذرا سا مزاج مفرح کر لیجئے	مزاج کا مفرح کرنا خدا معلوم کہاں کی زبان ہے
" ۱۳۴ - گھماسان دام تھا	گھمسان کی لڑائی تو سنی تھی لیکن دام اور وہ بھی گھماسان بالکل نئی چیز ہے !
" ۱۳۵ - یہ دام معمولی اچھے ہیں لیکن ایسی نایاب جائداد کے نایاب دام بھی ہونے چاہئے۔	بجائے غنیمت کے معمولی اچھے کا استعمال ہوا ہے - اور دام کے ساتھ نایاب بالکل بے معنی سی بات ہے۔
" ۱۳۶ - میری بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے اور جو ارکھی باک ہو جائے	یعنی ؟ !

صفحہ ۱۴۷	یہ آپ لوگوں کا میری بہو کے ساتھ برتاؤ ہی سبب ہے کہ کہ جو میں نے یہ جائداد خرید لی ہے	قربان جائیے تسلسل عبارت اور فصاحت ترجمہ کے !
" "	سنا جی ان معاملوں میں تم نہ پڑو یہ ہم ہی لوگ ٹھیک کریں گے۔	"ہمیں سے یہ ٹھیک ہوں گے" ہونا چاہیے۔
" ۱۵۰	نیم تبسم چہرہ	متبسم کے بجائے تبسم استعمال کیا گیا ہے
" ۱۵۱	عمارت بنائیے گا تو آپ جانئے گا پھر ہمارا قصور نہ دیکھئیگا	قصور دینا کوئی محاورہ نہیں "پھر ہمیں قصور وار نہ ٹھہرائیگا یا ہمیں دوکھ نہ دیجئے گا یا ہم پر الزام نہ رکھئے گا" ہونا چاہیے
" "	مجھے آپ دھمکاتے ہیں کہ یہ ہوگا وہ ہوگا اس کا میرے اوپر گدا بھی نہیں پڑتا	یعنی میرے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ گدا پڑنا بالکل مہمل ہے
" ۱۵۹	اور کچھ نہ ہوگا تو آپ لڑنے کی مدد تو کرتے	کرتے کے بجائے۔ کریں گے ہونا چاہیے۔
۱۶۶	سنڑی (انگا کا نام) واپس نہ لے لی تو ہم کاہے کے	ہم کاہے کے غلط ہے۔ ہمارا نام نہیں ہونا چاہیے
" "	ٹکنی ناچ نچاؤں جب تو بات ہے	یوں ہونا چاہیے ٹکنی کا ناچ نچایا ہو جب تو بات ہے
" ۱۷۱	یونہی نکال دینا ہو تو کہہ دیجئے	"نکالنا ہو تو یونہی کہہ دیجئے" ہونا چاہیے
" "	میں نے ایسی ایسی سرکاروں میں بندگی بجائی ہے جہاں ایک دم کے لیے ان باتوں کی گنجائش نہیں	ایک دم کے لئے کا استعمال کس قدر مکروہ طور پر ہوا ہے
" "	تم اپنی راہ نہ لو۔ اب بس زیادہ بات چیت نہیں	"زیادہ بات چیت کی ضرورت نہیں" چاہیے
" ۱۶۲	کنپٹیاں پڑی لپ لپ کرتی ہیں آج کچھ نہ کھاؤنگی	درد سر کی کیفیت کو پڑی لپ لپ سے ظاہر کیا گیا ہے یوں لکھنا چاہیے تھا کہ "کنپٹیاں پھٹی جا رہی ہیں"
" ۱۶۴	کان و کان خبر بھی نہ ہوگی۔	یہ کانوں کان کی خرابی ہے۔
" ۱۶۵	دو تین ٹکیے رکھے ہوئے ہیں	ٹکیہ مونث ہے اس لئے اس کی جمع ٹکیاں آتی ہے۔ یوں لکھنا چاہیے تھا:۔ دو تین ٹکیاں رکھی ہوئی ہیں۔
" ۱۶۹	کتنے ہی آدمی دوالیہ ہوتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے	تو زائد ہے اور ہوتے کے بجائے ہو جاتے ہونا چاہیے
" ۱۸۲	کس کس پریشانیوں	"کن کن" چاہیے
" ۱۸۳	جھگڑے کی شروعات تو انھوں نے نہیں کی	شروعات غلط ہے - ابتدا چاہیے
" ۱۹۲	ہماری شطرنج میں تم ایک مہرہ ہو اور تمہاری شہ مات ہوگی	یوں ہونا چاہیے:۔ ہماری شطرنج میں تھیں تو ایک مہرہ ہو جس سے

	شہ مات ہوگئی!
صفحہ ۱۹۳ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	ابتدائی سات سطریں بالکل مہمل ہیں
" ۱۹۴ ۔ یہ چالیں مجھ سے نہ کھیلو	چال کھیلنا محاورہ نہیں ہے۔ چال چلنا بولتے ہیں۔
" ۲۰۸ ۔ بوسہ کا چٹخارہ لیتا ہے۔	کس قدر مکروہ زبان استعمال کی گئی ہے
" ۲۱۱ ۔ لڑائی میں مٹھائی نہ پھلیگی	محاورہ لڈو بٹنا ہے۔ مٹھائی پھلنا بالکل غلط ہے
" ۲۱۵ ۔ کیچڑ نہ جھاڑیئے	کیچڑ جھاڑنا کوئی محاورہ نہیں
" ۲۲۱ ۔ صاحب کے نام چار ہزار پر انتقال نامہ ہوتا ہے	انتقال نامہ کوئی محاورہ نہیں۔ بیع نامہ ہونا چاہیے
" " میرے اوپر تو غار ہی کھائے ہے	"مجھ پر تو غار ہی کھائے بیٹھا ہے" ہونا چاہیے
" ۲۲۳ ۔ اب کھل جاؤ کیوں بھانڈا اکھڑواتی ہو	"پھوڑواتی ہو" یا پھوڑواؤگی ہونا چاہیے
" ۲۳۵ ۔ تو یہی حاصل تمھارے خاندان میں شادی کرکے	تو یہ ملا چاہیئے
" " ۔ ہائے رے یہ ہل کر سٹ لوگ	ہل کرائسٹ والے چاہیئے
" ۲۳۰ ۔ جو چٹکی کاٹے گا اس کو بچہ مارا جائے گا۔	یہ کوئی محاورہ نہیں۔ یوں ہونا چاہیئے "جو چٹکی کاٹے گا اس کے بکوٹے نئے جائیں گے
" ۲۴۲ ۔ ہمنے حلف لی ہے	حلف مذکر ہے۔ لیا ہونا چاہیئے
" " ۔ پہلے تو انکار کیا لیکن جب ہمارے گواہ کو دیکھا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔	"ہاتھ پاؤں پھولنا" خوشی کے محل پر بولا جاتا ہے۔ یہاں "حواس گم ہوگئے" چاہیئے
" ۲۶۵ ۔ میں جانتی تھی کہ سن گن ہورہی ہے	محاورہ: سن گن لینا ہے
" " ۔ وہ حلق نکلی خلق پھیلی	کسی بات کے پھیلنے کے متعلق محاورہ یہ ہے "ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی"
" " ۔ اب تو ہوگئی جو ہونی تھی ہوگی	اخیر میں بجائے ہوگئی کے ہونا تھی لکھنا چاہیئے
" ۲۶۸ ۔ کوئی پکی پھبتی ہوئی بات ہو جسے وہ جان لیں	یوں ہونا چاہیئے:۔ کوئی ایسی جچی تلی بات ہو کہ وہ یقین ہی کرلیں
" ۲۶۹ ۔ تم نے ہمارے لڑکے کی بیاہی زندگی پر جھاڑو پھیر دی	بچہ پہلے آگیا تھا، جھاڑو یہاں آگئی۔ یہ فقرہ مرد کی زبان کا ہے مترجم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جھاڑو پھیر دینے کا محاورہ صرف عورتوں کا ہے مرد کبھی استعمال نہیں کرتے۔
" " ۔ پٹخنی بتاؤنگا	پٹخنی دینا محاورہ ہے

صفحہ ۲۰۹ - بیچ گھر نوید دیا تھا	محاورہ ثبوت دینا ہے - نوید نہیں

الغرض یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں صرف زبان و محاورہ کی ہیں جو نہایت سرسری نگاہ سے ہر شخص کو نظر آسکتی ہیں۔ بعض بیانیہ روپیہ دیکر اکاڈمی نے خریدا ہے۔ یا ترجمہ کا حسن جملوں کی خوبی ترتیب عبارت کا تسلسل، مفہوم کی صحت سو اس کا ذکر ہی کیا کیونکہ اگر ان باتوں کو سامنے رکھا جائے تو پھر اس ترجمہ پر تنقید کا رنگ یہ نہ ہوگا کہ اس میں غلطیاں دیکھی جائیں بلکہ صحیح جملوں کا شمار کرکے چند صفحات میں ان کی فہرست دیدینا کافی ہوگا۔

آرڈر ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۳ سنہ ۱۹۳۲ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج ماتحت اوناؤ مقام اوناؤ

... بالغ ... رگھوبر سنگھ و شیو شنکر و ہردیال سنگھ نابالغان پسران حکم سنگھ قوم ٹھاکر ساکنان ساہ پور پرگنہ جھلوترا جگین تحصیل حسنگنج ضلع اوناؤ ... سنگھ وغیرہ مدعی

بنام

بنام ہردیو سنگھ و شیورام سنگھ پسران جیت سنگھ قوم ٹھاکر ساکنان ساہ پور پرگنہ جھلوترا جگین تحصیل حسنگنج ضلع اوناؤ . . . . مدعا علیہ

ہرگاہ مدعیان نے تمہارے نام ایک نالش بابت دعوی معات کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۱۳ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء بوقت ... بجے ... یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا ایسے ... شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جواب دہی دعوی مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے احضار ... واسطے قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوی کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت ... دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو۔

... ہو کہ اگر روز مذکور پر تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۳ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا

... اگر بیانات تحریری کی ضرورت ہو تو لکھنا چاہئے کہ تم کو یا فلاں فریق کو جیسی کہ صورت ہو حکم دیا جاتا ہے کہ بیان تحریری تاریخ ۲ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء گذرانو۔ وقت حاضری بدفتر سب جج اوناؤ ۱۰ بجے دن　　دستخط بخط انگریزی　　[مہر عدالت]

ایک خط

جو ایک خودکشی کرنے والے نوجوان کے سینہ پر ملا!

(عورت اور جذبات محبت کے بہترین شارح ڈی موپاساں کے قلم سے)

محترم خاتون! تو آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں یا تو اس موضوع کو سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث لانا نہیں چاہتا، یا یہ کہ میں ایک نہایت سخت جھوٹ سے کام لیکر آپ کو فریب دے رہا ہوں۔ آپ کو کبھی یقین نہیں آسکتا کہ کوئی انسان اس دنیا میں بغیر محبت کے بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ بیشک ہوگا، لیکن میں ایک ایسا انسان ہوں جس نے تمام عمر میں کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی۔

میں نے محبت کیوں نہیں کی اس کی وجہ کیا بتاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنے جذبات و محسوسات کو عقل و دانش سے کبھی آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ عقل محبت کی دشمن ہے اور محبت کو ہمیشہ اندھا ہونا چاہیئے۔
چناں چنیں کا جہاں گذر ہوا اور محبت ختم ہوئی۔ میں نے آج تک کسی عورت کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ سیکڑوں عورتوں کو دیکھا، مگر کسی سے محبت نہیں کی۔ آپ جس صنف سے تعلق رکھتی ہیں اس کے کسی رکن نے مجھے دیوانہ نہیں بنایا۔ میں کبھی آپ لوگوں سے مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کبھی محبت کی دردناک آہوں نے نہیں ستایا، میں نے فراق کی بےچین گھڑیاں کبھی بسر نہیں کیں اور میں دن رات خوش و خرم زندگی بسر کرتا رہا۔

—— ہاں میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔ اُمید و بیم میرے لئے ہمیشہ بے معنی الفاظ رہے کیونکہ میں نے کسی سے الفت کی راہ و رسم پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے محبت کیوں نہیں کی۔ میں نے کامل غور و خوض کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ میں عورت کا اتنا زبردست نقاد ہوں کہ کسی عورت کا اثر قبول ہی نہیں کر سکتا، طبیعت کی نکتہ چینی ہر عورت کو پُر عیب دکھاتی ہے اور مزاج کی برہمی — اُلفت کے احساسات قائم ہی ہونے نہیں دیتی!

—— خاتون محترم! آپ میری صاف گوئی پر ناراض نہ ہوں آپ کو معلوم ہے کہ ہر انسان میں دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک جسمانی دوسری روحانی، پس میں سمجھتا ہوں کہ "محبوب" کے لئے سب سے زیادہ ضروری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ دو شخصیتیں بیک وقت نہایت بلند پائی جائیں اور دونوں میں اس قدر ہم آہنگی و یک جہتی ہو کہ انسان اس ہستی سے محبت حقیقی و سچی محبت کرنے پر مجبور ہو۔ لیکن آپ سوچئے ایسا حسن اتفاق کب ہوتا ہے! آپ دیکھیں گی کہ ایک عورت جسمانی حیثیت سے تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ جوانی اور رعنائی کی تمام بے پناہ قوتیں اپنے میں پوشیدہ رکھتی ہے لیکن اخلاقی

لحاظ سے وہ بے بہا ادنیٰ ہے۔ ایک عورت اخلاقی حیثیت سے بہت خوبصورت ہوتی ہے مگر جسمانی پہلو سے قابل توجہ نہیں ہوتی اگر مرد محبت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اندھا ہو جانا چاہئے۔ الفت کی راہ میں بصارت گمراہی کی ضامن ہے! مرد کو اگر محبت کرتی ہے تو چاہئے کہ اپنی محبوبہ کی برائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرے اور ایک قوی جذبہ کے ساتھ عورت پر پروانہ کی طرح ٹوٹ پڑے اور مر جائے۔ مرد اگر اپنی محبوبہ کے ساتھ سنجیدہ معاملات پر بحث کریگا تو رومان زائل ہو جائیگا، محبت کی توہین ہوگی، دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں کے لئے آپ خود فکرمند رہئے لیکن عورت کو اس سے دور رکھئے۔ لیکن میں اندھا بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ دنیا کا مطالعہ کروں، مرد عورت کا اسی طرح مشاہدہ کروں جیسے وہ ہیں، اس طرح کہ محبوب دکھانا چاہے اور میں دیکھوں۔

خوبصورت لڑکیاں بالخصوص مایوس کن ثابت ہوتی ہیں، رہیں معمولی اور سادہ عورتیں تو ان سے کبھی مایوسی نہیں ہوتی کیونکہ آپ اُن سے کسی چیز کے متوقع نہیں ہو سکتے!

لیکن ایک عرصہ ہوا، میں نے یہ سمجھا تھا کہ میں محبت کرتا ہوں ——— ہاں، میں نے یہ "خیال" کرنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے! ——— صرف ایک ساعت کے لئے...... — ایک خوشگوار دن ——— ہاں، میں نے بھی کسی سے چند لمحے الفت کی ہے! ——— اگر آپ محبت کہنے پر مجبور ہوں لیکن آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تمام حالات و ماحول مجھے محبت کے جال میں پھنسانے کے لئے تیار تھے اور میں بے بس تھا، آپ جب واقعات سنیں گی تو میری تائید کریں گی اور میری بیچارگی کو معلوم کر کے "محبت" کرنا ایک مزوری فعل سمجھینگی میں اس واقعہ کے چند حقایق بیان کرتا ہوں۔

ایک دن شام کو میری ملاقات ایک جمیل لڑکی سے ہوئی، حسین و خوبصورت لڑکیاں ہر وقت اور ہر جگہ مل جاتی ہیں اسلئے اس لحاظ سے اس میں کچھ ندرت نہ تھی لیکن اس لڑکی کے متعلق یہ کہدینا نہایت ضروری ہے کہ وہ نہ صرف بہت حسین نہ صرف دلکش بلکہ ایک "حقیقت" تھی! جرأت و دلیری کے کام کرنے کی دیوانی تھی، ندرت و جدت اس کے ساتھ ساتھ تھی اس وجہ سے یہ لڑکی اور لڑکیوں سے کسی قدر متمیز کہی جا سکتی ہے۔

چنانچہ اس کی سب سے پہلی فرمائش یہ ہوئی کہ ایک رات ہم سمندر میں بسر کریں .... خود مجھے اس پر تعجب لیکن محض تفریح جان کر اس دعوت کو قبول کر لیا۔ جون کی رات تھی اور چاندنی۔ تمام کائنات ایک سیل نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی، ہم دس بجے کشتی میں بیٹھے۔ لڑکی بہت مسرور تھی، اور خوشی سے بار بار تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے چپو ہاتھ میں لئے اور کشتی آہستہ آہستہ روانہ ہوگئی۔ منظر بہت ہی دلفریب تھا۔ سمندر میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آتے تھے جن پر درختوں کا جھنڈ اور اُن میں چڑیوں کے چہچہے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ہماری کشتی

آہستہ آہستہ بہتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ سرکنڈوں کے جھنڈ سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور سیٹی کی سی آواز پیدا ہوتی تھی، بید کے درخت ہوا کے گزرنے کے بعد دیر تک لرزتے رہتے تھے۔ الغرض یہ رات اس قدر دلفریب، خوبصورت، خاموش، پرسکون تھی کہ ہم پر شباب کا نشہ مسلط ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندہ رہنے کا مقصد کیا ہے اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک پرسکون سمندر کی لہروں پر ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ رات کو کشتی میں جانا زندگی کا حقیقی مقصد کہا جاسکتا ہے!

میں سینہ میں جذبات کا ایک طوفان موجزن دیکھ رہا تھا، چاندنی نے مجھے بالکل مسحور کردیا تھا اور اپنے پاس ایک خوبصورت ——— اور تنہا ——— لڑکی کو پاکر میں کس منزل میں پہنچ گیا ہونگا اس کا اندازہ کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ لڑکی نے کہا "آؤ کچھ دور بہتے ہوئے چلیں، پتوار چھوڑ دو میرے پاس آجاؤ اور کشتی کو یونہی چھوڑ دو"۔

میں نے ایسا ہی کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی اس وقت میں منظور کرلیتا۔ "مجھے کچھ اشعار سناؤ!" لڑکی نے پھر ایک فرمائش کی اور میں نے ابتدا میں اس سے انکار کیا لیکن وہ اصرار کرتی رہی، واقعہ یہ ہے کہ وہ اشتعال جذبات کے لئے تمام قوتیں تمام بے پناہ ہتیار، جو اس کے پاس تھے استعمال کرنا چاہتی تھی، چاندنی رات، کنار دریا، شعر، رومان اور ایک حسین و نوخیز لڑکی کا قرب اب اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ میں اُسے چھیڑنا چاہتا تھا اس لئے ایک غزل شروع کی جس میں حسن کی بے چارگی اور عارضی زندگی، محبت کی سطحیت اور محبوبوں کی بے وفائی کا ذکر تھا، یہ غزل محض لوگوں کے جذبات محبت کی تذلیل و تضحیک کے لئے لکھی گئی تھی۔

لڑکی نے اپنا خوبصورت سر ہلایا گویا وہ ان اشعار سے لطف اندوز ہورہی تھی اور احساس کررہی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ یہ کس طرح کی لڑکی ہے۔ کیونکہ کوئی خاتون محبت و حسن کی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ - - - کس قدر حقیقت ہے!

لڑکی نے میرے اشعار پر معجزانہ تبسم سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا میں بہت ہی متعجب تھا، اصل یہ ہے کہ عورت اور نوجوان عورت کا سمجھنا بے انتہا دشوار ہے، حسن اور شباب ایک معمہ ہے!

———— — — — — ————

ہماری کشتی بہتی ہوئی چلی جارہی تھی چاندنی رات تھی اور لانبے لانبے درختوں کا سایہ سطح آب پر ایک عجیب اثر ڈال رہا تھا کشتی کبھی چاندنی میں تیرتی ہوئی اور کبھی تاریک قطعوں سے گزرتی ہوئی دور تک ہو چکی تھی۔ ایک جگہ اندھیرا آیا، کشتی بید کے نیچے سے گزر رہی تھی میں بے بس ہوچکا تھا۔ اپنا ہاتھ لڑکی کی کمر اور گردن حمائل کردیا اور اپنے لبوں سے اس کی گردن چومنا چاہتا تھا کہ میری رفیقہ نے مجھے علیحدہ کردیا ایک سخت درشتی کے ساتھ اور کہا "مجھ سے الگ رہو! تم تو سارا لطف برباد کئے دیتے ہو"۔ میں نے بڑی جدّوجہد کی کہ وہ میرے منشا کو سمجھ سکے، بہت کوشش کی کہ وہ مجھے پیشانی چومنے دے۔ لیکن اس نے بجلی کی طرح تڑپ کر مجھے علیحدہ کردیا۔ اور کہا "اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو اس وقت تمھیں پانی میں پھینکدیتی! امر و کس قدر

بے حس ہوتے ہیں۔ لطافت و نزاکت کو اپنی بہیمیت سے مجروح کرنے میں دریغ نہیں کرتے" لڑکی نے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا۔

میں اپنی حرکت سے کچھ اس قدر پریشان اور محجوب ہوگیا تھا کہ ایک لفظ منہ سے نہ نکال سکا۔

بہتی ہوئی چلی جارہی تھی اور کبھی کبھی مجھے رفتار قابو میں رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی لڑکی نے پھر باتیں شروع کردیں

اس نے کہا" میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں"

میں نے کہا۔" بیشک، آپ فرمائیں"۔

"وعدہ کیجئے کہ آپ بالکل خاموش رہیں گے اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جو مجھے دق کرے۔ اگر میں آپ کو اجازت دوں کہ" ...... میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہاں آپ کیا اجازت دیں؟ اگر میں آپ کو اجازت دوں کہ آپ کشتی کے اندر میرے قریب نہایت خاموشی کے ساتھ لیٹے رہیں اور کسی قسم کی شرارت نہ کریں، ہم لیٹے لیٹے ستاروں کو دیکھتے ہوئے دور تک چلے جائیں گے اور ایک ایسا خواب دیکھیں گے جس پر صدیوں کی مسرت قربان کی جاسکتی ہے"

میں اس انوکھی رومان کی داد دینے سے قاصر تھا، سمجھ رہا تھا کہ صورت حال حد سے زیادہ مضحکہ انگیز ہوتی چلی جارہی ہے لیکن پھر بھی میں نے جواب دیا۔ بہت اچھا! میں اس کا وعدہ کرتا ہوں' لڑکی نے کہا لیکن دیکھئے۔ اور خوب اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ کو میرے پہلو میں صرف لیٹنے کی اجازت ہوگی۔ اور آپ میرا بدن چھو بھی نہ سکیں گے" میں وعدہ کرتا ہوں" حقیقتاً میں میرا ذہن اس حسین معمہ میں گم ہوچکا تھا"

"اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو میں کشتی کو الٹ دونگی" لڑکی نے نہایت بیباکی سے کہا۔

آپ کو یہ بات بالکل طفلانہ حرکت معلوم ہوگی۔ لیکن خیر، مجھے واقعہ سنا لینے دیجئے، ہم کشتی میں لیٹ رہے۔ کشتی بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی آہستہ روی اور کنار دریا کے پار سے آنے والی ہلکی ہلکی۔ انسانی آوازوں نے ہم پر ایک خواب سا طاری کردیا ہم یونہی بہتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ معلوم نہیں اس وقت تک کہاں پہنچ گئے تھے۔

——— آہ! یہ وقت! میری زندگی کا بس یہی لمحہ تھا جس میں میں کسی ذی روح سے محبت کرنا چاہتا تھا! — اف میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سے اپنا دل لگانا چاہتا تھا، کسی کو اپنی ساری روح دیدینا چاہتا تھا —— اپنے افکار اپنا جسم، اپنا دل، اپنی زندگی غرض جو کچھ میرا تھا سب کچھ محبت کی مقدس قربان گاہ پر چڑھا دینا چاہتا تھا! دفعتہً میری رفیقہ نے ایک نہایت خفیف آواز میں کہا گویا کہ وہ بہت دور سے مجھے پکار رہی تھی ...... "ہم کہاں ہیں؟ —— ہم کہاں جارہے ہیں —— بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے زمین کو چھوڑ دیا ہے! کس قدر حسین و دلنشین ہے یہ خیال! کاش تم مجھ سے کچھ محبت کرتے!!"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں لڑکی کو کچھ جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوتا —— صرف محسوس سا ہو رہا تھا

کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں! لیکن باوجود اس احساس الفت کے میرے دل میں جذبات بہیمیت پیدا نہیں ہو رہے تھے! مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں بہت پُرسکون ہوں، اس کے پہلو میں لیٹنا نہایت سکون خیز اور حیات پرور ہے اور اس سے زیادہ کی مجھے خواہش نہیں۔ ہم خاموش بیٹھے رہے اور کشتی بہتی رہی تھوڑی دیر بعد لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس سے کھیلنے لگی۔ آہ! کس قدر لطیف و دلنواز حرکت تھی! اس وقت ہم پر ایک پُراسرار مسحورکن حیرت زا جذبہ مسلط تھا معلوم نہیں یہ غیر محسوس طاقت کیا تھی؛ ــــ شاید محبت اسی کو کہتے ہونگے!

رات ختم ہوگئی، پو پھٹنے لگی ــــ سپیدۂ صبح نمودار ہو رہی تھی کہ کشتی کسی چیز سے ٹکرائی اور لڑکی چونک کر اٹھ بیٹھی! - یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ تھا! میں متحیر تھا، آسمان پر سُرخ نارنجی اور سنہرے رنگ یکے بعد دیگرے بدلتے جا رہے تھے آفتاب کی زر بار کرنیں پھیل رہی تھیں - سطح آب میں آگ سی لگ رہی تھی کنارے ــــ ابھی ایک سیل آتشیں میں ڈوبتے ہوئے نظر آ رہے تھے میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے بھی اس نظارہ کے لطف میں شریک کروں، لیکن میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ میں لڑکی کے حسن میں گم ہوگیا۔ وہ اس وقت بھی بے انتہا حسین نظر آ رہی تھی...... اس کا چہرہ بھی صبح نور کی طرح نور و گلاب کی آمیزش سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا! اس کے رخسار، اس کا تبسم، ــــ لباس، غرض سب کچھ اس سیل رنگیں میں حد درجہ مسحورکن معلوم ہو رہا تھا، میں اُسے **شہزادی گل** سمجھ رہا تھا بلکہ **خود صبح نو!**

لڑکی آہستہ سے اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی ہوئی اٹھی اور مجھے اپنے لب پیش کر دیئے۔ میں آگے بڑھا مسرت اور تعجب سے لرزتا ہوا ــــ آہ! میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میں "فضائے نور" کو چومنے جا رہا ہوں ہاں ایک خواب سے ہم آغوش ہونے کے لئے جسکو قدرت نے ایک حسین لڑکی میں تبدیل کر دیا تھا! ــــ لڑکی نے مجھ سے کہا ــــ اوہ! دیکھنا تمہارے بالوں میں ایک تیتری پھنسی ہوئی ہے!" اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بار بار کیوں مسکرا رہی تھی: میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے سخت کاری ضرب لگائی ہو۔ تمام لطف ختم ہوگیا۔ میرا خواب آسمان سے پھر زمین پر آ رہا۔

بس یہ ہے میرا قصہ، میری داستانِ محبت۔ اگر آپ اسے محبت کہہ سکیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اسے احمقانہ و طفلانہ حرکت کہیں گی یا ایک چالاک لڑکی کی شرارت، مگر میں اُسے تو صرف محبت کہونگا۔ اس لڑکی نے مجھے جنس لطیف سے بالکل متنفر کر دیا اور جب آپ کسی چیز سے نفرت کرنے لگیں تو ضرور ہے، کبھی وہ چیز آپ کو بہت محبوب رہی ہوگی! اس کے بعد میں نے پھر کسی سے محبت نہیں کی!!!

یہ خط ایک خودکشی کرنے والے نوجوان کے سینہ پر رکھا ہوا ملا جو ایک عورت کے نام لکھا گیا تھا، ایسی عورت جو مردوں سے سخت متنفر تھی!

ظفر قریشی

مذاہب عالم میں اعضاء جنسی کی پرستش

مباشرت کا مذہبی تقدس

اور

اس کے آثار و نشانات

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ مضمون تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یہ بتایا جائیگا کہ "اعضاء جنسی کی پرستش" کا رواج کیوں ہوا اور کہاں کہاں اس کی اشاعت ہوئی۔ دوسرے حصہ میں یہ دکھایا جائیگا کہ دنیا میں "تعلق جنسی" یا "مباشرت" کو مذہبی حیثیت دے کر رائج کرنے کے کیا اسباب تھے اور کہاں کہاں کس حد تک اس کا رواج ہوا۔ تیسرے حصہ میں یہ بتایا جائیگا کہ "اعضاء جنسی" کی پرستش کے علامات کن کن نقوش سے ظاہر کئے جاتے تھے۔ اور اب بھی بعض متمدن ممالک و مذاہب میں اس کے رموز نشانات و آثار کن صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

نیاز

انسان کی ارتقائی حالتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد تمدن سے قبل انسان تین حالتوں سے گذر چکا ہے۔ سب سے پہلے وہ جب صرف شکار پر اس کی زندگی کا انحصار تھا، دوسری وہ جب اس نے چوپانی اختیار کی اور تیسری فلاحت و زراعت کی۔ پہلی دور میں جب صرف شکار اُسکا مشغلہ تھا، افزائش نسل کا مسئلہ اسکے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جسقدر کم حصہ داری ہونگے اسیقدر شکار زیادہ ملیگا۔ اور اسی لئے تعلق جنسی یا اعضاء جنسی کی کوئی اہمیت اس کے نزدیک نہ تھی۔

لیکن جب اس نے دیکھا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی دن شکار نہیں ملتا تو اس نے جانوروں کے بچے پکڑ کر پالنا شروع کئے اور اس طرح وہ بتدریج چوپانی حالت میں آگیا۔ پھر چونکہ چوپانی حالت میں مویشیوں کی نگہداشت اور ان کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک لے جانے کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے اُسے اپنا خاندان بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح سب سے پہلے تعلق جنسی کی اہمیت اسپر واضح ہوئی۔ جب انسان چوپانی حالت سے گذر کر زراعت کی طرف متوجہ ہوا تو اُسے اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ جب تک خاندان میں بہت سے آدمی نہ ہوں اس وقت تک چوپانی اور کسانی کے کام اچھی طرح نہیں چل سکتے تو انسان نے افزائش نسل کی طرف پوری توجہ کی اور اس کو ایک مذہبی فریضہ کی صورت دیدی کیونکہ

دنیوی باتوں کے مقابلہ میں انسان پر مذہبی باتوں کا زیادہ اثر ہوتا ہے - اور اس طرح بچے پیدا کرنا اور تعلقات جنسی کو وسیع کرنا گویا ہر مرد و عورت کا فرض قرار پایا۔ اور یوں اول اول اعضار جنسی کی اہمیت و پرستش اور اسی کے ساتھ تعداد ازدواج یا ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج پیدا ہوا اس امر کا ثبوت کہ جب تک انسان شکاری حالت میں رہا اس کے مذہب میں سوائے پرستش ارواح کے اعضار جنسی کی پرستش کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا تھا ان اقوام کے مطالعہ سے مل سکتا ہے جو ہنوز اسی شکاری حالت میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کی بعض قوموں (دڑاہ، یاہگان اور ٹسمانی) کو دیکھئے کہ وہ ابھی تک بالکل ابتدائی یعنی شکاری حالت میں ہیں لیکن ان کا مذہب صرف پرستش روح ہے - اور اعضار جنسی کی پرستش کا کوئی شائبہ تک ان کے مراسم مذہبی میں نظر نہیں آتا۔

یہ لوگ تعلقات جنسی کے مسئلہ میں اس قدر ناواقف ہیں کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اولاد کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو عورت کے پیٹ میں کوئی روح داخل ہو جاتی ہے - چنانچہ جب یورپین قومیں آسٹریلیا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے ان لوگوں کو بچہ پیدا ہونے کا اصلی سبب بتایا تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔

الغرض یہ امر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک انسان اپنے ابتدائی "دور صید و شکار" میں رہا، وہ تعلق جنسی کی طرف سے بہت بے پروا تھا اور اس نے اعضار جنسی کو کوئی اہمیت نہیں دی، لیکن جب اس نے چوپانی اور فلاحی شروع کی تو سب سے پہلے اس نے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ ارتباط زن و مرد تھا اور اس لئے اس دور کے تمام مذاہب میں آپ کو اعضار جنسی کی پرستش کے شواہد کثرت سے ملیں گے۔

مثلاً آپ افریقہ کی قوموں کو لیجئے کہ ان کے یہاں اعضار جنسی کی پرستش کس قدر رائج ہے۔

سر آر۔ برٹن (Sir. R. Burton) سرزمین داہومی (Dahomi) کی نسبت تحریر کرتے ہیں کہ وہاں ابتدا سے لیکر دارالحکومت تک کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں اعضار جنسی کی علامات موجود نہ ہوں اور ان کے سنگیں بت نظر نہ آئیں۔ عام طور پر تو یہ اعضار جسم انسانی سے بالکل علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کسی مشہور دیوتا کے بت سے اس کا الحاق کر دیتے ہیں ان کا سب سے بڑا دیوتا لگبا ہے۔ جو جذبات شہوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو احتلام ہوتا ہے۔ تو وہ اسی دیوتا سے منسوب کرتا ہے اور نئے بچے ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا ہے اور نذر چڑھاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ رات کو خواب میں جو حسین صورت مرد یا عورت دکھائی دیتی ہے وہ یا خود لگبا دیوتا کا نظر آنا ہے۔ اس دیوتا کا بت صرف مٹی کا اس طرح بنایا جاتا ہے گویا وہ اکڑوں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو برہنہ دیکھ رہا ہے۔ اس قسم کے بت تقریباً ہر مکان کے سامنے ایک چھوٹے سے چھپر یا سائبان کے نیچے بنائے جاتے ہیں۔

بعض سوڈانی قبائل میں عشق و محبت کی دیوی بھی ہوتی ہے جو عموماً ایک حاملہ عورت کی صورت میں بنائی جاتی ہے۔

اور اس کا سینہ بہت طویل اور عضو جنسی بہت بڑا بنایا جاتا ہے۔ الغرض ان ممالک میں ہر دو اعضائے جنسی کی پرستش وسیع پیمانہ پر موجود ہے۔

ایک سوڈانی قوم ہے جس کا نام یوروبا ہے ان کے یہاں اس دیوی کا بت اس طرح بنایا جاتا ہے گویا ایک عورت بیٹھی ہوئی اپنے بچہ کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے۔ اس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا بھی ہوتا ہے اور مندر کی دیواروں پر دونوں کے اعضائے جنسی بحالت اتصال دکھلائے جاتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا کام یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زن و مرد دونوں کے دلوں میں عشق و محبت پیدا کرتے ہیں، بانجھ عورتوں کو بارآور کرتے ہیں اور وضع حمل کے وقت تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ بعض مندروں میں جہاں اس قسم کی پوجا ہوتی ہے، عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو خاص تہواروں اور میلوں کے وقت بالکل آزاد ہوتی ہیں اور ان عورتوں میں جو داشتیاں ہوتی ہیں انھیں مذہبی حیثیت دیجاتی ہے۔

مغربی افریقہ کے اس حصہ میں جسے " SLAVE COAST " یا (ساحل غلاماں) کہتے ہیں افریقی لوگ مردانہ عضو جنسی کا نہایت شان و تجمل کے ساتھ بازاروں میں جلوس نکالتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی نوجوان لڑکی نظر آجاتی ہے تو اس کے جسم سے مس کر کے بہت عریاں مذاق کرتے ہیں

سر ہیری جانسٹن نے وادی دریائے کانگو کے لوگوں کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اپنے لکڑی کے مندروں میں بہت سے مادہ اور مردانہ بت ایسے رکھتے ہیں جن کے اعضائے جنسی بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان بتوں پر بھینٹ چڑھا کر ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں کے گھروں میں بھی یہ نشان چھتوں میں لٹکتا ہوا اور ہلتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ ایک اور یورپین سیاح نے وادی کانگو کی بانیزی قوم کا حال لکھا ہے کہ یہ لوگ مٹی سے اس قسم کے عضو بناتے ہیں۔ اور ان کو چڑیوں کے پروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ زنانہ عضو بھی بناتے ہیں اور ان دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان پر مرغوں کی بھینٹ بھی چڑھائی جاتی ہے کیونکہ مرغ بہت قوی خواہش کا جانور سمجھا جاتا ہے۔

ایک فرانسیسی فوجی افسر نے حال بیان کیا ہے کہ اس نے وادی کانگو میں ایک خاص تہوار دیکھا جس میں عضو جنسی کی خاص نمائش کی جاتی ہے اور تہوار میں ایک خاص تماشہ بھی کیا جاتا ہے جس میں ایک بڑا برہنہ بت بنایا جاتا ہے اور اس کے عضو کو کمانیوں کے ذریعہ سے حرکت دیجاتی ہے بعض مندروں میں ایسے دیوتاؤں کے پجاری مخنث ہوتے ہیں

نائیجیریا کی قوم اکوئی میں انجا نامی ایک دیوتا ہے جس کا تہوار بالکل لنگیا کی طرح منایا جاتا ہے ان لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس قسم کی بدمستیوں سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور فصلیں بھی اچھی پیدا ہوتی ہیں کسی زمانہ میں یہ لوگ ہر سال ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی قربانی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے یورپین اقوام کا اثر ہوا ہے بجائے عورت کے مرغ کی قربانی ہونے لگی ہے۔

یورپ کے غاروں سے بھی زمانہ قبل تاریخ کے جو بہت سے نقوش برآمد ہوئے ہیں ان میں تصویریں ننگی بھی ہیں جو سینگ

یا ہڈی پر کسی چقماقی آلہ کی باریک نوک سے بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں، جو عموماً بحالت نشست بنائی گئی ہیں۔ ان کی وضع قطع افریقی ہے اور یہ تصاویر وادی کانگو کے بتوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ان مردانہ تصاویر اور نسائی مجسموں کے اعضاء تو بہت بڑے بنائے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یورپ میں بھی اس قسم کی پرستش کا رواج پایا جاتا تھا۔

الغرض تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی پوجا کا عقیدہ تمدن کے اس درجہ میں پیدا ہوتا ہے جو آسٹریلوی اور افریقی درجوں کے درمیان ہے۔ انسان دیکھتا ہے کہ اس کی "روح" کس طرح اس کے جسم کو اپنا آلۂ کار بناتی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جب اس کا سایہ جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو گویا اس کی روح عالم ارواح کو چلی جاتی ہے۔ اس طرح گویا وہ جملہ حوادث و مناظر قدرت کی تشریح و توجیہ ارواح کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ وہ خورشید و قمر رعد اور باراں وغیرہ سب کے لئے ایک ایک روح یا موکل مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن کوئی روحِ خلاق عرصہ دراز تک اس کے ذہن میں نہیں آئی۔ جب کبھی کوئی بچہ پیدا ہوتا اور وہ اس واقعہ کی نسبت خیال آرائی کرتا تو سمجھتا کہ کسی انسان یا حیوان کی روح جسد خاکی سے علیحدہ ہو کر عورت کے اندر حلول کر گئی ہے جو از سر نو متشکل ہو کر معہ جسم خاکی پیدا ہوئی ہے۔ وہ بالکل ناواقف تھا کہ عورت سے بچہ پیدا ہونے میں مرد کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں منازل ارتقاء کی ان پست حالتوں میں انسان زراعت نہیں کرتا تھا نہ وہ مویشی پالتا تھا۔ اس کی تمام ضرورتیں قدرت خود بخود پیدا کر دیتی تھی۔ لہٰذا سامان خور و نوش کی کسی وحشی انسان کو قطعی فکر نہیں تھی علاوہ اس کے ایک بات یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا کی تمام پست قومیں گرم ممالک میں پائی جاتی ہیں۔ جہاں موسموں کا تغیر و تبدل چنداں نمایاں نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے لئے فصل بہار جبکہ تمام عالم میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تیسرے ارتقاء کی اس پست حالت میں باہمی جنگ و جدال کا قصہ بھی نہیں ہوتا نہ کوئی قبائلی یا قومی تنظیم ہوتی ہے اس لئے انسان عادتاً صلح کل و غیر جنگجو تھا اور اُسے زیادہ اولاد کی تمنا نہیں تھی۔

اس کے بعد جب انسان شکاری حالت سے گذر کر چوپائی یا کسانی حالت میں پہونچا تو اسے زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ گھر بار اور مویشیوں کی دیکھ بھال ہر چند عورتیں کر لیتی تھیں لیکن فسکار زراعت اور لڑائی کے لئے مردوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب مردوں کو تمنا ہوئی کہ بچے زیادہ پیدا ہوں اور عورت کا بانجھ پن لعنت سمجھا جانے لگا۔ افزائش نسل کے دیوتاؤں کی پوجا اور ان کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کی رسمیں ادا کرنا پڑیں کیونکہ قوم کا سردار تو جنگ کے لئے مرد چاہتا تھا اور مرد پیدا کرنے کے لئے عورتیں درکار تھیں اور یہیں سے اعضائے جنسی کی پوجا کا آغاز ہوتا ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے دنیا میں مباشرت کو مذہبی حیثیت دی گئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

الغرض پست اور جاہل اقوام کے نزدیک بہشت نام ہے کثرت ازدواج، کثرت اولاد فراوانی کاشت پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے تو انسان دوسری طرف راغب ہوتا ہے اور دوسری طرف راغب ہونے کا نتیجہ اولاد ہے اور اولاد پیدا ہوتی ہے

اعضائے جنسی کے اتصال باہمی سے لیکن چونکہ بعض اوقات سالہا سال گذر جاتے ہیں اور اولاد پیدا نہیں ہوتی اس لئے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی ضرورت پڑی جن کا تعلق افزائش نسل سے تھا اور اس طرح اعضائے جنسی کی پوجا شروع ہوئی۔

جن ممالک میں منگول نسل کی اقوام آباد ہیں وہاں تو اس قسم کی پرستش کا پتہ نہیں ملتا، لیکن جاپان میں بیشک کسی زمانہ میں اس کا رواج تھا چنانچہ انیسویں صدی میں جب جاپان کے دروازے دیگر اقوام کے لئے کھل گئے تو امریکن سیاح یہ بات دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ وہاں کھلم کھلا اعضائے جنسی کی نمائش و پرستش ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مذہب شنتو کے پرانے مندروں میں تو دیوتاؤں کے بت ایسے بنائے جاتے تھے جن میں مردانہ اعضائے جنسی پوری آمادگی کی حالت میں دکھائے جاتے تھے۔

ہندوستان کے جنوب اور جنوب مشرق میں جو جزائر ہیں اُن میں بھی یہ پوجا عام ہے۔ مثلاً مجمع الجزائر مربار میں سورج کا انسانی بت مع عضو جنسی کے بنایا جاتا ہے اور جب اس کا میلہ ہوتا ہے تو بڑے عیش و نشاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ماورا سے سماٹرا، جزائر نیاس کے باشندے اپنے مرے ہوئے اعزہ کی تصویریں اپنے مکانوں کی دیواروں پر کھینچتے ہیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں اور انھیں تصویروں کی پوجا کر کے وہ افزائش نسل کی التجا کرتے ہیں۔

جزیرۂ نیوگنی کی بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ تمام لڑکے اور بن بیاہے نوجوان مخصوص مکانات میں سوتے ہیں جو اسی کام کے لئے علیٰحدہ کر دئے جاتے ہیں۔ اور جن کی دیواروں پر ننگی تصویریں مع مختلف آسنوں کے بحالت اتصال منقوش ہوتی ہیں۔ بظاہر تو یہ رواج بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح گویا انھیں تجرد کی زندگی کا درس دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں وہ غیر فطری ذرائع سے اپنی خواہشیں پوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

جزیرۂ سیلی بیز میں بھی اس قسم کی پوجا بہت ہوتی تھی۔ یہاں عورتوں کے ایسے بت بنائے جاتے تھے جن کے سینے اور عضو جنسی کے ظاہر کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا جاتا تھا۔ مندروں کی دیواروں پر جو پتھر کے مردانہ بت بنائے جاتے تھے وہ بالکل عریاں اور بہت فحش ہوتے تھے۔ بعض مندروں میں مرد عورت بحالت اتصال دکھائے جاتے تھے۔ اس جزیرہ کے جنوبی علاقہ میں ایک خاص دیوتا افزائش نسل کا۔ کارینگ آلو واہے یہ بت بالکل عریاں بنایا جاتا ہے۔ اس کے مندر میں نوجوان عورتوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی ہے۔ بعض مندروں میں اس کے طلائی بت بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی جزیرہ میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جو ایک خاص دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ اس دیوتا کا جو نام ہے اس کے معنی ہیں "دیبیشینگ" پرانے زمانہ میں اس دیوتا کا بت نہایت عظیم بلند اور بالکل عریاں بنایا جاتا تھا جس کی پوجا نہایت فخر کے ساتھ کی جاتی تھی۔ جب ولندیزوں نے مداخلت کی تو یہ بت چھپا دیا گیا اور لوگ برسوں تک اس کی پوجا پوشیدہ طور پر کرتے رہے۔

جزیرۂ جاوا میں اس قسم کی پوجا بکثرت ہوتی ہے۔ وہاں کے بعض حصوں میں یہ عام رواج ہے کہ جب دھان کے پودوں میں بالیں نکلنے کو ہوتی ہیں تو کھیت کا مالک اور اس کی بیوی دونوں ننگے ہو کر کھیت کا طواف کرتے ہیں اور اسی کھیت میں ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے ہیں۔ قدیم یورپ میں بھی عمدہ فصل پیدا کرنے کے لئے اس طریق عمل پر کاربند ہونا پڑتا تھا

ایک سیاح نے اہل جاوا کی اس پرستش کا عجیب وغریب حال تحریر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ولندیزیوں کی ایک توپ جنگل میں رہ گئی۔ عوام میں یہ خیال پھیل گیا کہ یہ توپ یورپ کے کسی بت کا "عضو مخصوص" ہے اس خیال کے پھیلتے ہی مقامی پجاریوں نے چاروں طرف پروپیگنڈا کرکے عوام کو اس توپ کی پوجا کرنے کی ترغیب دی اور لوگ دور دور سے آکر اس پر چاول اور پھول چڑھانے لگے خصوصاً بانجھ عورتوں کا تو ہر وقت تانتا لگا رہتا تھا۔ یہ عورتیں زرق برق لباس پہنکر آتیں اور توپ پر گھوڑے کی طرح بیٹھ جاتیں۔ بعض اوقات دو دو عورتیں ایک ہی وقت میں ایسا کرتیں بالآخر عیسائیوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ اس "توپ دیوتا" کو وہاں سے اُٹھا لیا جائے۔

برہما کے بالائی حصہ میں بھی یہ رواج ہے کہ ہر سال فصل بہار کے وقت لوگ ایک بُت کا جلوس نکالتے ہیں جس کا عضو جنسی بہت نمایاں ہوتا ہے، اور جلوس والے بہت فحش قسم کا مذاق کرتے ہوئے اور گالیاں گاتے ہوئے ساتھ چلتے ہیں۔

مسٹر جوزف میک کیب جو ایک مشہور امریکن مصنف سیاح ہیں لکھتے ہیں کہ "یوکاتان" کے شمالی حصہ میں یوکسمل کے مشہور کھنڈر واقع ہیں۔ چند ماہ گذرے میں ان خرابوں کی سیر کرنے گیا۔ جس وقت جنگل سے نکل کر صاف جگہ میں پہونچا تو وہاں ایک چھوٹا سا بلند ٹیلہ دیکھا جہاں کسی زمانہ میں مندر بنا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں جہاں خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کا خرابہ ہے میں نے دو پتھر دیکھے جو چار یا پانچ فٹ لمبے تھے۔ یہ دونوں بلحاظ شکل وشباہت نہایت مکمل مردانہ عضو تھے۔ کسی زمانہ میں یہ دونوں مندر کے دروازہ پر دونوں جانب نصب تھے۔ اور یہ مند ——— ایک نہایت عظیم الشان اور متمدن شہر کے وسط میں واقع تھا۔ گویا اسوقت یہاں بھی اس قسم کی پوجا ہوتی تھی۔

امریکہ بھر میں جہاں جہاں اقوام مایا و پیرو کا تمدن پایا جاتا تھا وہاں کے مندروں کی خصوصیت انھیں اعضا کی پرستش تھی جن کے نشانات کثرت سے پرانے کھنڈروں میں اب بھی ملتے ہیں۔

امریکہ کی "منداں" قوم میں ایک سالانہ تہوار ہوتا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک مضحکہ انگیز بت کا جلوس نکالتے تھے جو بالکل عریاں ہوتا تھا اور ایک چوبی "عضو" رکھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بت کی جگہ ایک مرد لے لیتا تھا اور یہ عورتوں کے پیچھے دوڑتا تھا۔ جب وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی تھیں تو وہ خوبصورت لڑکوں کی طرف راغب ہوتا تھا جب وہ یہ حرکت کرتا تھا تو عورتیں اس کا پیچھا کرتی تھیں۔ اور اس کا چوبیں عضو ایک عورت توڑ لیتی تھی اور اُسے ہاتھ میں لیکر ایک تقریر کرتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ آج کے بعد سے حقیقی زندگی کی مالک ہے۔

قدیم ملک مصر میں بھی یہ پوجا نہایت شد ومد سے جاری تھی چنانچہ وہاں کے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیت" نے جو خداوند شر تھا اپنے بھائی "اُوسیریز" (خداوند خیر) کو قتل کرکے اس کی لاش کے مختلف ٹکڑے مختلف مقامات میں علحدہ علحدہ دبا دیئے۔ "اُوسیریز" کی بہن اور بیوی آئسیس نے نہایت جانفشانی سے تلاش کرکے ٹکڑے نکال لئے لیکن عرصہ دراز تک باوجود تلاش بسیار عضو جنسی نہ ملا۔ مجبور ہو کر لکڑی کا ایک عضو بنا کر لاش کے ساتھ دفن کیا۔ اس کے بعد یہ

ہوا کہ خصوصیت کے ساتھ مصری عورتوں میں اس پوجا کا بیحد رواج ہوگیا - اور رفتہ رفتہ تمام مصر اور افریقہ میں یہ رسم اس طرح پھیل گئی کہ مصر کے پجاریوں کو بھی یہ فحش رسم اپنے مذہب میں داخل کرنا پڑی - مشہور یونانی مورخ و سیاح ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ وہاں اوسیریز کا سالانہ تہوار نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا - عورتیں باجے گاجے کے ساتھ اوسیریز کا بُت لیکر نکلتی تھیں - بت کا قد دو فٹ کے قریب ہوتا تھا - اس کے عضو جنسی میں ڈورے بندھے ہوتے تھے جن کو کھینچنے سے اس میں عمودی جنبش پیدا ہوتی تھی - قدیم مصریوں میں پرستش کے اس عام ہونے کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک عالی مرتبہ مصری خاتون کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ ایک سانڈ بیل کا حنوط شدہ عضو بھی برآمد ہوا تھا -

مسٹر رانے - بیان کرتے ہیں کہ جنوبی اطالیہ کے شہر پاکستم میں جہاں یونانیوں کا اثر تھا - آئسیس کے مندر سے چار ہزار پتھر کے ٹکڑے مردانہ عضو کی شکل کے برآمد ہوئے تھے - ہندوں میں پرستاران شیو اب بھی "لنگ پوجا" کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں اور چونکہ اس سے ناظرین نگار واقف ہیں اس لئے تفصیل کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی -

مباشرت کا مذہبی تقدس

بیان ماسبق سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ اعضاء جنسی کی پرستش کہاں کہاں اور کس کس طرح پائی جاتی تھی اور اب بھی پائی جاتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک پہلو بحث کا یہ رہ جاتا ہے کہ اس طریق پرستش کا اثر عام اخلاق انسانی پر کیا ہوا اور اس سلسلہ میں عبادتگاہوں کے اندر کس کس طرح داد عیش و کامرانی دی گئی -

اس میں شک نہیں کہ اول اول اکثر قبائل میں یہی دستور تھا کہ شادی بیاہ اپنے ہی عاملہ و قبیلہ کے افراد میں کرتے تھے - نہ کسی غیر قوم کی بیٹی لیتے تھے نہ اپنی بیٹی اسے دیتے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اولاد کمزور پیدا ہونے لگی، اسی اثنا میں لوگوں نے دیکھا کہ اگر لڑکی کی شادی کسی غیر خاندان والے سے ہوجاتی ہے تو اولاد جسمانی و دماغی لحاظ سے ترقی یافتہ پیدا ہوتی ہے - پس بقاء قوم اور تقویت نسل کے خیال سے لوگوں کو غیر اقوام کے ساتھ وابستگی کا خیال پیدا ہوا - لیکن چونکہ اس میں بے غیرتی کی جھلک اور اخلاقی برائی تھی، اس لئے قوم کے بزرگوں اور مقتدایان دین نے بین الاقوامی طریقۂ ازدواج جاری کرکے جھگڑے پیدا کرنا تو مناسب نہ سمجھا لیکن ہر عورت کے لئے مذہبی فرض قرار دیدیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم ایک مرتبہ کسی اجنبی کو ملتفت ہونیکا موقع دے، پھر چونکہ اس کا تعلق مذہب سے قرار دیا گیا تھا اس لئے عبادت گاہوں ہی کو اس کا مرکز قرار دیا گیا اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ کسی دیوی کا مندر، تاکہ عورتیں جلد اس طرف مایل ہوسکیں - چنانچہ ڈاکٹر سنجر نے لکھا ہے کہ:-

"زمانہ میں کسی وقت ہر بابلی عورت کا قانونی فرض تھا کہ وہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مایلیتا دیوی کے مندر میں جاکر ۔۔۔ ہو جائے - ہیروڈوطس نے دوران سیاحت میں وہ معبد، میدان اور باغ دیکھا تھا جہاں اس قسم کی آزادی سے کام لیا جاتا تھا - یہ مقامات ہر وقت ایسی عورتوں سے بھرے رہتے تھے جن کے سر کے بالوں میں ڈوری بندھی ہوتی تھی -

(یہ گویا علامت تھی اس امر کی کہ ایسی عورت آزاد ہے) جب کوئی عورت اس مقررہ مقام میں داخل ہوجاتی تھی تو جب تک وہ اپنا فرض ادا نہ کرلیتی تھی اُسے باہر جانے کی ہرگز اجازت نہ تھی اور اس سلسلہ میں جو رقم وہ وصول کرتی تھی اُسے دیوی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ بعض عورتیں جو بدصورت ہوتی تھیں انھیں کوئی خریدار نہ ملنے کے باعث تین تین سال تک مندر کے احاطہ میں پڑا رہنا پڑتا تھا، اور جو عورت نوجوان، خاندانی، اور خوبصورت ہوتی تھی اُس کو چند منٹ سے زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، اسی عجیب وغریب رسم کا حال باروخ نبی نے بھی بیان کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس وقت اس کا رواج اس قدر بڑھ گیا تھا کہ روز کی گفتگو میں جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی تھی کہ تو اس قابل نہ تھی کہ "تیرے کمربند پر ہاتھ ڈالا جاتا" اسی قسم کا حال یونانی مورخ وسیاح استرابو (Strabo) نے بھی لکھا ہے۔ اور دیگر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر اعظم کے زمانہ میں اس قسم کی فواحش انتہا کو پہونچگئی تھی"۔

کلدانیہ میں جس دیوی کا نام مائلتا تھا وہی دیوی فنیقیہ۔ شام و قرطاجنہ میں استارہ کہلاتی تھی۔ یعنی صرف نام کا فرق تھا ورنہ ہر جگہ یہی تمام باتیں پائی جاتی تھیں۔ اور یہی فواحش ہر جگہ نظر آتے تھے

اسی قسم کی باتیں کلدانیوں۔ اور ان کے جانشین قدیم ایرانیوں میں بھی جاری تھیں۔ ان کے ہاں عشق ومحبت کی دیوی کا نام مترا تھا۔ اس دیوی کے تہواروں میں بیحد فحش ہوتا تھا۔

بابل میں جو معبد اس کے لئے مخصوص تھا اسے "بیت شجات" (Bit-Shagatha) یعنی "مقام وصل" کہتے تھے۔ بابل کے متعلق دیودورس سیقولس نے لکھا ہے کہ۔ "ملک کی ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ دیوی کے معبد میں جائے اور کسی اجنبی سے مواصلت چاہے۔ بہت سی عورتیں جو دولت مند اور عالی خاندان ہوتی ہیں وہ پردہ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر عورتیں یہ کرتی ہیں۔ کہ سر کے بالوں پر چاروں طرف قلادہ سا باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور اس طرح کی عورتیں کثرت سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ میدان میں ہر طرف سیدھے راستے بنا دئے جاتے ہیں جہاں عورتیں موجود رہتی ہیں۔ اجنبی مرد انھی راستوں سے گذرتے ہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ معبد میں جا بیٹھتی ہے وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جاسکتی جب تک وہ اپنے مقصد کو حاصل کرلے یعنی جب تک مرد اس کی گود میں سکہ ڈال کر اس سے ملتفت نہ ہولے۔ جو مرد کسی عورت کی گود میں سکہ ڈالتا ہے اسے یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں:۔ "میری دعا ہے کہ مائلتا دیوی تجھ پر اپنا فضل وکرم کرے" (یہ دیوی وہی ہے جسے یونانیوں میں ولیس کہتے ہیں) سکہ جو عورت کی گود میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو لیکن وہ عورت اس کے لینے سے انکار نہیں کرسکتی۔ الغرض سکہ لینے اور دیوی پر چڑھانے کے بعد وہ عورت اپنے خریدار کے ساتھ مندر سے باہر چلی جاتی ہے۔ جو عورت جمیل اور قتالہ ... ہوتی ہے اس کا خریدار بہت جلد پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن جو بدصورت ہوتی ہے۔ اسے بعض اوقات برسوں تک مندر ہی پڑا رہنا پڑتا ہے"۔

اول اول مصر میں اس قسم کی فحاشی کا رواج نہ تھا لیکن کلدانیوں اور دیگر مشرقی اقوام نے یہ مشغلہ وہاں بھی جاری کرا دیا - اور جاری بھی ہوا تو حد درجہ شدت کے ساتھ ! استرابو نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے بت کے لئے پجاری جمیل ترین لڑکیاں پسند کیا کرتے تھے - جو مندر میں کچھ دنوں خدمت کرنے کے بعد شادی بھی کر سکتی تھیں -

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اڈمنڈ دوپواۓ یوں تحریر کرتے ہیں کہ :- مصر میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو عیش و نشاط کے جملہ اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا تھا اور مرد و عورت باہم ملکر مندر کے اُن راستوں سے گزرتے تھے جو بالکل سنسان اور زمین دوز تھے ہیرو دوطوس نے لکھا ہے کہ بوبستیز میں ہر سال آئسس دیوی کا جو میلہ ہوتا تھا اس میں سات لاکھ جاتریوں کو عشق و محبت کے اسرار سے آگاہ کیا جاتا تھا - اس فحاشی سے دیویوں کے مندروں کو بیحد آمدنی ہوتی تھی - اور چونکہ اس "عشق آموزی" یا "اپدیش" دینے کا اختیار صرف پجاریوں کو حاصل تھا اس لئے تمام آمدنی وہ آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے !"

بعض فرقوں میں اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں دیوتا لڑکیوں سے اور دیویاں مردوں سے ملتفت ہو جاتی تھیں اسی طرح اب بھی ہو سکتا ہے - مصر قدیم کے شہر تھیبا (Thebes) کی نسبت ہیرودوطوس نے لکھا ہے کہ ہاں ہر رات ایک عورت مندر میں پلنگ پر لٹا کر اونچی لگا دیجاتی تھی - اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ رات کو کسی وقت دیوتا آئے گا اور اس سے ملتفت ہوگا - اسی طرح ملک لیسیا کے شہر پتارہ میں یہ رواج تھا کہ کسی نوجوان لڑکی کو دیوتا کے مندر میں بند کر کے قفل لگا دیا جاتا تھا - قطب شمالی کی رہنے والی ایسکیمو قوم میں اگرچہ فحاشی تو نہیں پائی جاتی لیکن بعض تہواروں کے موقعہ پر ان کے ہاں فحاشی ضرور ہوتی ہے - شمالی امریکہ کے دیگر قبائل میں سورج دیوتا کا جو سالانہ تہوار ہوتا تھا اس کی رسمیں عجیب دلچسپ طریقہ پر ادا کی جاتی تھیں - یعنی ایک شوہر دار عورت ننگی ہو کر زمین پر لیٹ جاتی تھی اور اپنا نفس دیوتا کے سامنے پیش کر دیتی تھی - بیان کیا جاتا ہے کہ دیوتا کا جو انسانی نمائندہ ہوتا تھا وہ عورت کی پیشکش کو قبول کر لیتا تھا - اسی طرح ملک نکاراگوا کے قدیم باشندے اور امریکہ کی ناچیز قوم فصل بہار کے زمانہ میں ایک دن کے لئے اپنی عورتوں کو ہر قسم کی آزادی دیدیتی تھی -

وسطی امریکہ کی پیپائل قوم کو ان کے مقتدایان دین یہ ہدایت کیا کرتے تھے کہ اگر عمدہ فصلوں کے پیدا ہونے کی تمنا ہو تو کھیت کے مالک کو لازم ہے کہ وہ اور اس کی بیوی تخم ریزی کے زمانہ میں چند روز تک ایک دوسرے سے علحدہ رہیں اور جب تخم ریزی سے فرصت ہو جائے تو ایام مقررہ منقضی ہونے کے بعد وہ پورے جوش کے ساتھ عیش و نشاط میں مصروف ہو جائیں - بعض مقامات میں اس کے لئے خاص آدمی مقرر کئے جاتے تھے - جزیرہ قبرص میں بمقام پافاس اور ملک شام میں بمقام بائبلوس میں فحاشی بہت بڑھی ہوئی تھی - مشہور یونانی جغرافیہ دان استرابو نے ایشیائے کوچک کے شہر انطاکیہ کی نسبت بیان کیا ہے یہاں کے معبدوں میں ہزارہا عورتیں رہتی تھیں اور حد درجہ آزادی کے ساتھ داد عیش دیجاتی تھی -

بحیرہ روم کے مشرقی سواحل پر جتنے ملک تھے ان میں وسعت کے ساتھ "دیوی ماتا" کا مذہب جاری تھا۔ جزیرہ کریٹ میں "دیوی ماتا" کے سوا کسی دوسرے دیوتا کا بت تھا ہی نہیں اور ملک فرجیہ میں بھی ایک بڑی دیوی "دیوتاؤں کی ماتا" کے نام سے پوجی جاتی تھی اور لوگ نہایت عقیدتمندی سے اس کے عضو جنسی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں دمیتر نام کی ایک دیوی تھی جو دراصل "دیوماتری" یعنی "دیوتاؤں کی ماتا" تھی۔ اسی طرح تمام مہذب اور متمدن ممالک میں ایک ہی دیوی مختلف ناموں سے پوجی جاتی تھی جس کے نام الیستار، استاریتھ، سائبلا، دمیتر، آلسیس، افرودیتہ تھے اور ان کے معبدوں میں انتہا درجہ کی فحاشی ہوتی تھی۔ شہر ایفی دس میں دیانا دیوی کا مشہور بت بالکل برہنہ ہی بنایا جاتا تھا۔ اور پافوس میں سیکڑوں عورتیں افرودیتہ کے نام سے دنیا بھر کے مردوں کی خواہشات پوری کرتی تھیں۔ اسی طرح اسکندریہ ہیلیوپولیس، بیبی نس وغیرہ۔ الغرض یونان میں ہر جگہ شدت کے ساتھ یہ تمام حرکات ناشائستہ پائے جاتے ہیں اور انسانی زندگی خواہش نفسانی کے لئے وقف تھی۔

تھسموفوریا کے نام سے دیمیتر دیوی کا ایک تہوار ہوتا تھا جس میں عورتیں آٹے کا عضو جنسی بناتی تھیں۔ اور اسکے ساتھ فحش مذاق کرتی ہوئی نکلتی تھیں۔ لیکن ان کے جلوس میں کسی مرد کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہی حال ہالوہتوار میں ہوتا تھا۔ اور سائراکیوز میں یہ رواج تھا کہ جب تھسموفوریا کا تہوار آتا تھا تو زنانہ عضو کی شکل کی میٹھی روٹیاں پکاکر دیوی کے استھان پر چڑھائی جاتی تھیں۔ قدیم رومیوں میں بانوس، لائبر، پریاپس، اور وینس کی پرستش ہوا کرتی تھی جنکا تعلق عشق و محبت سے۔ اول الذکر دیوتا کا تعلق میخواروں اور بدمستیوں سے تھا۔ دوسرا دیوتا وہی ہے جس کے نام سے انگریزی لفظ " LIBERTINE " یعنی عیاش یا شہوت پرست نکلا ہے وینس عشق و محبت اور عیش وعشرت کی دیوی تھی۔

پریاپس کا بت برہنہ بنایا جاتا تھا۔ اور جن لڑکیوں کی شادی ہونیوالی ہوتی تھی۔ یا جو عورتیں بانجھ ہوتی تھیں وہ اس بت کے عضو پر گھوڑے کی طرح ادھر ادھر ٹانگیں کرکے بیٹھ جاتی تھیں اور پھول چڑھاتی تھیں۔ سالانہ تہوار کے دن اس بت کو رتھ میں بٹھاکر عورتیں گاتی ہوئی بصورت جلوس نکلتی تھیں

جب وینس کا تہوار ہوتا تھا تو پریاپس کے بت کو باقاعدہ لے جاکر اس کے مندر میں پہونچایا جاتا اور وینس کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا تھا۔ سالانہ تہواروں کے موقعہ پر میٹھی ٹکیاں پکائی جاتی تھیں۔ جن پر اعضاء جنسی کی صورت ٹھپے لگاکر نئی دلہنوں اور شادی شدہ عورتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

یہ حالت تو قدیم زمانہ کی تھی لیکن تماشہ یہ ہے کہ بلاد یورپ میں دین مسیح کی اشاعت کے بعد بھی یہی فحاشیاں بدستور جاری رہیں۔ جس شہر کا نام کسی زمانہ میں بانوس تھا وہ اب کوکلیا کہلاتا ہے سنہ ۱۷۹۶ء میں ایک انگریزی سیاح مسٹر ڈی جی۔ ہوگریتھ نے لکھا ہے کہ اس علاقہ کے کسان ہر سال ایک روز افرودیتہ دیوی کے تباہ شدہ مندر میں محراب کے

وسطی پتھر پر تیل لگاتے ہیں اور پتھروں میں جو سوراخ ہوتے ہیں وہاں لغو حرکات کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عمل سے انکی بیویوں کا بانجھ پن جاتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کی پوجا میں عیسائی بھی شریک ہوتے ہیں۔

امریکہ کا سیاح جوزف میک کیب لکھتا ہے کہ میں نے ۱۹۱۰ء میں ویزہ (قدیم پایہ تخت ملک تھریس) کے گرد و نواح میں یونانی عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ ہر سال ایک مذہبی ڈرامہ کھیلتے ہیں۔ جس میں خاص ایکٹر کے پاس ایک بہت بڑا چوبی عضو ہوتا ہے۔ یہ شخص لڑکیوں کو پکڑنے دوڑتا ہے۔ اور جس کو پکڑ لیتا ہے گویا اُس سے شادی ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ مرد اور وہ لڑکی نہایت فحش طریقہ سے ناچتے ہیں۔ اور یہ حرکت کرتے ہوئے بازاروں میں نکلتے ہیں اور چندہ جمع کرتے ہیں۔ الغرض یہ تہوار انتہائی سیاہ ستیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ناروے اور سویڈن کے عام کھیل تماشوں میں اس قسم کے حرکات کی جاتی ہیں۔"

آئرلینڈ میں ایک عورت کا بت جو اپنے خاص حصہ جسم کی طرف اشارہ کرتی ہوئی دکھائی جاتی تھی۔ گرجا کے صدر دروازہ میں محراب کے وسطی پتھر کے بجائے نصب کرتے تھے۔ تاکہ شیاطین داخل نہ ہوں۔ اس کو قلطی زبان میں شیلانہ جگ کہتے تھے۔ ایسا ہی ایک پتھر چند سال گذرے ملک کارک کے کلانے گرجا کے صدر دروازہ میں نصب تھا۔ دوسرا پتھر شہر ڈبلن میں رائل آئرش کاڈیمی کے اندر پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کی اور تصویریں برطانیہ اور اسپین کے گرجاوں میں بھی تھیں۔ لیکن اصلاح مذہب کے زمانہ میں اس طرح کی اکثر تصاویر تباہ کر دی گئیں

ڈاکٹر ہارٹفورڈ نے لکھا ہے کہ اس قسم کی ایک تصویر ہیر فورڈشائر اور دوسری کارنوال میں ابھی تک موجود ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اس شکل کے پتھر ابھی تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دورسٹ شائر میں ایک پتھر چار فٹ لمبا موجود ہے۔ جو بالکل اصل کے مطابق ہے۔ اسی ملک میں ٹرنڈیل پہاڑی پر زمین کھود کر ۱۸۰ فٹ لمبی ایک دیوزاد تصویر بنائی گئی ہے جسے سرنی دیو کہتے ہیں یہ بت بالکل عریاں ہے۔ اور ہر سات برس کے بعد اس کو صاف کیا جاتا ہے۔

اطالیہ کے ملک ابروزائی میں بمقام آکسرنیا ہر سال سینٹ کاسماس اور سینٹ دانیال کے میلے ہوا کرتے تھے۔ ان میں شریک ہونے کے لئے بانجھ عورتیں اور اعضاء جنسی کی بیماریوں کے مریض دور دور سے آتے تھے۔ دکانیں موم کے بنے ہوئے اعضاء سے بھری ہوتی تھیں اور بانجھ عورتیں انھیں خرید کر گرجا میں چڑھاتی تھیں۔ امراض جنسیہ کے مریض ننگے ہو کر بادری کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور وہ متبرک تیل لگاتے تھے۔ جب بیسروں والٹیر نے ان کا بُری طرح مضحکہ اڑایا تو مجبور ہو کر ۱۷۸۰ء میں پاپائے اعظم کے ایک فرمان کے ذریعہ سے یہ مراسم بند کرا دیئے گئے۔

الاتری جو روم سے اور بھی زیادہ قریب ہے مکانات کی دیواروں پر اعضاء جنسی کی تصویریں کھنچی ہوئی موجود ہیں جو غالباً پہلے زمانہ میں تمام اطالیہ کے اندر عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ مگر اب یہ رسم ہو گئی ہے کہ ایسٹر سنڈے کے روز لوگ جا کر ان تصویروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو عورتیں اس سنگباری میں شریک ہوتی ہیں ان کے گلوں میں سونے کے بنے ہوئے اعضاء جنسی پڑے ہوتے ہیں۔ ان کی صورت عام طور پر ایسی ہوتی ہے گویا کسی شخص کی مٹھی بندھی ہے اور انگوٹھا

انگلیوں کے درمیان دبا ہوا کسی قدر باہر نکلا ہوا ہے' اس زیور کو عام طور پر دیہاتی پہنتے ہیں اور اس کا نام فیکو ہے۔ روما کے پورٹسائی عجائب خانہ میں ایک قربانگاہ کا ظرف ہے جس میں ایک عورت کی تصویر اس طرح کھدی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں مردانہ عضو لئے ہوئے ہے۔ مقام ترانی میں چند سال بیشتر تک کارنیوال کے موقعہ پر ایک عریاں بت نکالا جاتا تھا۔ جس کا نام مقدس عضو رکھا گیا تھا۔

۱۵۸۵ء میں جب پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں نے امبرورم فتح کیا تو انھوں نے تبرکات میں ایک دلچسپ چیز پائی جسکو بانجھ عورتوں نے شراب ملتے ملتے سُرخ کر دیا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جسے لامعلوم زمانہ سے پادری لوگ فوتین راہب کا عضو بتایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ راہب شہر لائنس کا اولین اسقف تھا۔ اور تمام علاقہ اسکا بیحد معتقد تھا اور ہر جگہ اسکے مخفی حصہ جسم کے مومی نمونے پائے جاتے تھے۔

جنوبی فرانس میں گرجاؤں کے اندر موم کے بنے ہوئے اعضا چھتوں میں مومی تبیوں کی طرح لٹکا کرتے تھے۔ میٹھی ٹکیاں جنپر اعضائے جنسی کا نشان بنا ہوتا تھا بکثرت فروخت ہوتی تھیں پُرانے زمانے کے جو پتھر کہیں کہیں نصب تھے وہاں بانجھ عورتیں جاکر اپنا جسم اُس سے مس کرتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ بھی سننے کے قابل ہے۔ کہ راہب فوتین کون بزرگ تھے۔ درحقیقت یہ ایک عریاں بت تھا جس کے معتقدین کی بہت کثرت تھی۔ جب عیسویت کا دور شروع ہوا تو پادریوں اور راہبوں نے دیکھا کہ اگر یہ بت توڑ دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ عوام کو ناگوار گزریگا بلکہ آمدنی کا ایک معقول ذریعہ بھی ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ اس لئے انھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس بت کو اصطباغ دیکر عیسائی بنا لیا اور اس کے متعلق ایک روایت گڑھ لی۔

سینٹ ٹرنر۔ بریٹنی میں سینٹ گاملز اور انجو میں سینٹ رینی سب اسی قسم کی فرضی ہستیاں تھیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے جن کا اسم مبارک سینٹ ارنود تھا۔ لیکن اُن کے بت پر کپڑا پڑا رہتا تھا۔ جو صرف بانجھ عورتوں کے لئے اٹھایا جاتا تھا۔ آرینج میں سینٹ یوٹروپیس کے گرجا کے اندر ایک چوبی عضو تھا جس پر چمڑا منڈھا رہتا تھا۔ لوگ اس کی بھی بت پوجا کرتے تھے۔ بائبل میں جو روایات اس قسم کے فحاشی کی درج ہیں ان کو ہم یہاں درج نہیں کرتے۔ ہر شخص انھیں دیکھ سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے عبرانیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ حلف اُٹھاتے تھے تو حلف پر پورا زور دینے کے لئے اپنے عضو پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے کیونکہ عضو مخصوص تمام جسم میں نازک ہونے کے علاوہ ایسی چیز بھی ہے جس پر انسان کی نسل کا انحصار ہے اور اپنی اولاد بہت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ قدیم زمانے کے لوگوں کے نزدیک یہ عضو افزائش نسل کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ مثلاً کتاب پیدائش کے باب ۲۴ آیۃ ۲ میں ابراہام اپنے سب سے مسن نوکر کو طلب کر کے کہتا ہے :- "میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنا ہاتھ ران کے تلے رکھ اور میں تجھ سے خداوند کی جو آسمان کا خدا ہے اور زمین کا خدا ہے قسم لونگا۔" اسی طرح اسرائیل نے کتاب پیدائش کے باب ۴۷ میں یوسف کو حلف دیتے ہوئے کہا ہے :-

"اور جب اسرائیل کے مرنے کا وقت پہونچا تب اس نے اپنے بیٹے یوسف کو بلا کر اس سے کہا کہ اب جو میں نے تیری نظر میں مہربانی پائی تو اپنا ہاتھ میری ران تلے رکھ دیجئے۔ اور مہربانی اور صداقت سے میرے ساتھ سلوک کیجئے۔ مجھکو مصر میں مت گاڑیو۔ میں اپنے باپ دادوں کے پاس سوؤنگا۔ تو مجھے مصر سے باہر لیجائیو اور ان کے گورستان میں گاڑیو۔"

بائبل کی ان آیات میں "ران تلے" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مراد خصیتین ہیں۔ کیونکہ عبرانیوں میں سب سے زیادہ پختہ حلف وہ ہوتا تھا جو خصیتین پر ہاتھ رکھ کر کیا جاتا تھا۔ واضح ہو کہ بائبل کے دو حصے ہیں ایک "Old Testament" یعنی عہد نامہ عتیق اور دوسرا "New Testament" یعنی عہد نامہ جدید اور "Testimony" (شہادت) اور "Testament" (معاہدہ) کا مادہ بھی وہی ہے جو "Testicles" (خصیتین) کا ہے۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد و پیمان یا حلف و قسم کے باب میں خصیتین کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ قدیم مصریوں میں بھی یہی رواج تھا کہ جب وہ قسم کھاتے تھے تو اپنے عضو کو اوپر اٹھا دیتے تھے۔ (باقی آئندہ)

اعتبارات

میں بہت کمسن تھا، جب مجھ سے کہا گیا کہ "ہاں ایک شہر ہے جہاں تعلیمات کتاب" کے موافق لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ "میں ضرور وہاں جاؤنگا اور اُس شہر کے برکات حاصل کرونگا"۔ یہ شہر بہت دور تھا اور ایک نہایت طویل سفر کی ضرورت تھی، لیکن میں چل کھڑا ہوا اور چلتا رہا یہانتک کہ سن وقوف کو پہونچ گیا۔

جب میں شہر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شہر کے تمام باشندوں کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی اور ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔

میں نے اپنے جی میں کہا "کیا اس شہر مقدس میں رہنے کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ ایک آنکھ اور ہاتھ غائب ہو"۔

اس شہر کے باشندے بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا آدمی ہے جو دونوں آنکھیں اور دونوں ہاتھ رکھتا ہے۔

وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ میں نے ان سے پوچھا "کیا یہی وہ شہر مقدس ہے جہاں لوگ تعلیمات کتاب کے موافق زندگی بسر کرتے ہیں"۔

اُنھوں نے کہا "ہاں یہی وہ شہر ہے"

میں نے پوچھا۔ "یہ تمھارا کیا حال ہے، تمھاری داہنی آنکھ اور داہنا ہاتھ کیا ہو گیا"۔

اُنھوں نے یہ سنکر میری لاعلمی پر افسوس کیا اور کہا "آؤ، ہمارے ساتھ چلو اور دیکھو"

"مجھے ایک ہیکل میں لے گئے جو وسط شہر میں قائم تھا۔ جب میں ہیکل کے اندر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں نکلی ہوئی آنکھوں اور کٹے ہوئے ہاتھوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "خدا کے لئے بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے، یہ کس ظالم وسفاک نے تمھارے ہاتھ کاٹ ڈالے، وہ کون بے رحم تھا جس نے تمھاری آنکھیں نکلوالیں"۔

یہ سنکر ان میں سے ایک معمر شخص میری طرف آیا اور بولا کہ "یہ ہم نے خود ہی ایسا کیا ہے۔ کیونکہ اللہ نے ہمیں اس شر پر غالب کیا جو ہم میں پیدا ہو رہا تھا اور اس لئے ہم نے اُسے بیخ و بن سے دور کر دیا"۔

یہ کہکر وہ مجھے قربانگاہ پر لے گیا اور اشارہ کر کے کہا کہ اس قربانگاہ کے اوپر جو آیت منقوش ہے اُسے پڑھو میں نے پڑھا۔ یہ لکھا ہوا تھا:—

"اگر تیری داہنی آنکھ تجھے شک میں مبتلا کرے، تو اُس کو نکال ڈال، کیونکہ بھلائی اسی میں ہے کہ ایک عضو جاتا رہے

اور سارا جسم آگ کی مصیبت سے بچ جائے۔ اسی طرح اگر تیرا داہنا ہاتھ تجھے شک میں مبتلا کرے تو اسے کاٹ ڈال کیونکہ بہتری اسی میں ہے کہ تیرا ایک عضو ہلاک ہوجائے۔ اور سارا جسم جہنم کی آگ میں نہ ڈالا جائے"۔

میں نے یہ آیت پڑھ کر دریافت کیا "کیا تمھارے شہر میں کوئی مرد عورت نہیں جس کی دونوں آنکھیں اور دونوں ہاتھ سالم ہوں"۔

انھوں نے جواب دیا "سوائے چھوٹے بچوں کے کوئی شخص ہم میں ایسا نہیں جسکے تمام اعضا سالم ہوں، لیکن جسوقت یہ بچے بھی بالغ و ذی شعور ہوں گے اور کتاب مقدس پڑھنے کے قابل ہوں گے تو یہ بھی ایسے ہی ہوجائیں گے"۔

یہ سنکر میں وہاں سے بھاگا کیونکہ میں اب بالغ و ذی شعور تھا اور کتاب مقدس پڑھنے کی بھی اہلیت رکھتا تھا

باب الاستفسار

عالمِ برزخ

(جناب سید علی حسین صاحب۔ مبارکپور)

عقائد اہل اسلام میں ایک عقیدہ عالم برزخ کا بھی ہے کہ وہاں روحیں رہتی ہیں اور قیامت تک رہیں گی گویا یہ ایک عالم اور ہے جس کا تعلق نہ اس دنیا سے ہے نہ آخرت سے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس عقیدہ کی اصلیت کیا ہے اور اہل اسلام میں کہاں سے آیا۔

(نگار) قبل اس کے کہ مسلمانوں کے اس عقیدہ سے گفتگو کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب قدیمہ کی تجسّس کر لی جائے کہ ان میں یہ خیال پایا جاتا تھا یا نہیں اور اگر پایا جاتا تھا تو کس مفہوم کے ساتھ۔

روح کے بقا کا خیال نہایت قدیم ہے حتیٰ کہ "مذاہب اخلاقی" کے وجود سے پہلے انسان اپنے عہد وحشت و بربریت میں بھی یہی یقین رکھتا تھا کہ موت کے بعد نہ صرف روح باقی رہتی ہے بلکہ اپنے پس ماندگان سے واسطہ رکھتی ہے۔ اور اس عقیدہ کا سبب "جذبۂ محبت" تھا یا جذبہ "خوف و احترام"۔۔۔ یعنی اگر کوئی عزیز و محبوب ہستی اُٹھ جاتی تھی تو انکا جذبۂ محبت مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو موجود مان کر اپنی تسلی و تسکین کریں اور اگر کوئی صاحب اثر و اقتدار ہستی اٹھ جاتی تھی تو انکا "جذبۂ خوف و احترام" مجبور کرتا تھا کہ وہ اس کی روح کو بدستور موجود مانیں۔ بعد کو جب "مذاہب اخلاقی" کی بنیاد پڑی، تو ان میں بھی بقاء روح کا خیال بدستور قائم رکھا گیا، کیونکہ عوام کے درستی اخلاق کا بہت کچھ انحصار اعتقاد معاد پر ہے۔ اور معاد کے لئے بقاء روح کا اعتقاد ضروری ہے ورنہ عذاب و ثواب کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ پھر چونکہ عذاب و ثواب کے لئے عوام کو سمجھانے کے لئے بالکل ایک دنیاوی بادشاہ یا حاکم کے فیصلہ و حکم کی طرح ایک عدالت گاہ کا ثابت کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے بعض مذاہب میں قیامت، یوم آخرۃ اور بعث و حشر کا خیال پیدا کیا گیا۔ یعنی اس دن کا جب تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور خدا کے سامنے محاسبۂ اعمال ہو کر سزا و جزا کی تعیین کی جائے گی۔ اور بعض مذاہب نے "من مات فقد قامت قیامتہ" کے اصول پر یہ بتایا کہ مرنے کے بعد ہی ہر شخص کا فیصلہ ہو جائیگا

اور قیامت کبریٰ کے عقیدہ سے گفتگو نہیں کی۔

پھر چونکہ عقیدہ اول کے مطابق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل اور مرنے کے بعد جو زمانہ ایک انسانی روح پر بسر ہوتا ہے وہ کس طرف شمار ہوگا اور اس کو کیا کہیں گے اسلئے اس خدشہ کے جواب میں ایک نئی چیز عالم برزخ کا خیال پیش کیا گیا اور اس کی مختلف صورتیں مختلف مذاہب میں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم مختصراً تمام اہم مذاہب کے اعتقادات اس باب میں درج کئے دیتے ہیں:۔

قدیم ایرانی عقیدہ

پیروان زردشت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اُس کی روح کو ایک پل پر سے لیجاتے ہیں جو کوہ البرز اور چکات دائتیہ کے درمیان واقع ہے جب روح اس پل کو عبور کر جاتی ہے تو اس کے اعمال بد و نیک کا حساب متہرا رشنو اور سروشس کے سامنے ہوتا ہے۔ اگر اُس شخص کے اعمال نیک اس کے اعمال بد سے زیادہ ہیں تو اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر اس کے اعمال بد نیک سے زیادہ ہوتے ہیں تو اسے دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو اس کو "دیدائتی" (آخری فیصلہ) کے دن تک جو جنگ ہورامزدہ اور اہرمن کے خاتمہ کے بعد ہوگا[۵۱] پڑا رہنا پڑے گا۔ جس مقام میں ایسی ارواح "فیصلۂ آخری" ٹھہریں گی اُسے "مسوانو گاتوس" کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو وندیداد باب ۱۹ گاتھا ۳۶ - نیز یشت باب گاتھا ۱ - نیز سیروزہ باب گاتھا ۳۰ - و باب ۲ گاتھا ۳۰)

گویا "مسوانو گاتوس" قدیم ایرانیوں کا برزخ ہوا - جہاں روح کا تزکیہ ہوتا ہے اس تزکیہ و تہذیب کے بارہ درجے[۵۱] ہیں۔ اور روح مذکوران مدارج سے گذر کر پوری طرح پاک و صاف ہو جاتی ہے اور اس قابل ہوتی ہے کہ اسے ہورامزدہ کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

قدیم مصری خیال

قدیم مصریوں میں تین نظریے تھے۔ (۱) مردہ کی روح چڑیا بنکر فضا میں اڑ جاتی ہے[۵۲]۔ (۲) مغرب کی طرف جا کر مردوں کی روحیں سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاتی ہیں۔ (۳) مردوں کی روحیں زیر زمین یعنی پاتال کو چلی جاتی ہیں۔ رات کے وقت پاتال میں روحوں کو بارہ گھنٹہ تک خداوند رع (آفتاب) کے درشن ہوتے رہتے ہیں[۵۳]۔

---

۵۱ کشمیری پنڈتوں میں یوم وفات سے بارہ دن بعد مردہ کی بارھویں کرائی جاتی ہے اور اس روز جس کی جو استطاعت ہوتی ہے مطابق حیثیت دان پن کرکے ایصال ثواب کرتا ہے۔ ممکن ہے زردشت کے بارہ درجوں ہندوؤں کی اس عقیدہ ---- کا بھی کوئی تعلق ہو

۵۲ عہد جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی خیال تھا کہ مقتول کی روح اگر قصاص نہیں لیا جاتا تو چڑیا بنکر فضا میں چیختی اور چہچہاتی پھرتی ہے جس کی آوازیں بوقت شب سنائی دیتی ہیں۔ ۵۳ ممکن ہے یہ تعبیر ہو اس امر کی کہ جب نصف حصہ زمین پر بارہ گھنٹہ کے لئے تاریکی چھا جاتی ہے تو دوسرے نصف حصہ پر بارہ گھنٹہ تک آفتاب نظر آتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ مرنے والے کے دل کو دربار اوسیرز میں تین شخص ایک بہت بڑی اور نہایت صحیح ترازو[51] میں تولتے ہیں۔ اسوقت یہاں تین محاسب[52] ہوتے ہیں۔ (۱) اوسیرز (۲) انوبیس (۳) اور تھوتھ۔ ترازو کے ایک پلہ میں دل اور دوسرے میں باٹ رکھے جاتے ہیں۔ پھر اگر مردہ کی نیکیاں زیادہ ہوتی ہیں تو اس کی روح کو ابدی مسرتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر بدیاں زیادہ ہوتی ہیں تو فوراً ایک مگرمچھ اس کی روح کو نگل جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ روح ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتی ہے۔ اگر نیکیاں اور بدیاں برابر ہوتی ہیں تو وہ روح تا فیصلۂ اوسیرز ایک پرند بنجاتی ہے جسے "با" کہتے ہیں اور وہ چڑیارات کے وقت قبرستانوں اور قبروں میں پھڑپھڑاتی ہے۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ قدیم یونانیوں کے عقیدہ میں تمام کائنات تین حصوں میں منقسم تھی۔ (۱) ملاء اعلیٰ۔ (۲) دنیا۔ (۳) اسفل السافلین۔ موخر الذکر مقام وہ ہے جہاں سب کی روحیں بعد از مرگ لیجائی جاتی ہیں۔ اس مقام کو یونانی زبان میں "ہاڈس یا ہیڈس (Hades) کہتے ہیں۔ یہاں جب روح پہونچتی ہے تو اس کے اعمال کا حساب کتاب تین[53] دیوتا کرتے ہیں۔ (۱) مینوس۔ (۲) رھادامنیتھوس۔ (۳) ایاکس۔ اگر وہ شخص نیکوکار ثابت ہوتا ہے تو اس کی روح کو بہشت "الزیم" (Elysium) میں پہونچا دیتے ہیں اور وہ بدکار ہوتا ہے تو اس کی روح تارتارس (Tartarus) میں پہونچا دیجاتی ہے جہاں اس پر عذاب ہوتا ہے۔ اگر اس کے نیک و بد اعمال برابر ہوتے ہیں تو اسکی روح کو ہیڈس (Hades) میں تزکیہ تہذیب کے لئے تا فیصلۂ پلوٹو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قدیم ہندوؤں کا خیال ہندو سناتن دھرم مذہب کے مطابق جب کوئی شخص مرتا ہے تو جمراج موکل آکر اس کی روح کو پاتال میں لے جاتا ہے۔ یہاں اس کے اعمال کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ تمام مردوں کی روحیں اسی مقام پاتال میں آخری فیصلہ تک کی جاتی ہیں۔ اگر مرنیوالے کے نیک کرم زیادہ ہوئے تو اسے سورگ لوک یا بیکنٹھ میں بھیجدیا جاتا ہے۔ اگر اعمال بد زیادہ ہوئے تو اس کا مقام "نرک" یعنی دوزخ ہوتا ہے۔ اگر اعمال نیک و بد برابر ہوتے ہیں تو وہ اسوقت تک "یونی چکر" میں رہتا ہے جب تک اُسے خوش اعمالیوں کے بدولت "موکش" (نجات ابدی)

---

[51] میزان کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی موجود ہے۔

[52] مجوسیوں کے یہاں بھی تین محاسب ہوتے تھے (۱) متھرا۔ (۲) رشنو اور (۳) سروش۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں تین محاسب دیوتا ہوتے ہیں۔ (۱) مینوس۔ (۲) رھادامنیتھوس۔ (۳) ایاکس۔ یہ بھی ترازو میں تولتے ہیں۔

[53] اسی طرح تین دیوتا قدیم مصریوں میں اور تین فرشتے قدیم ایرانیوں میں روح کا حساب کتاب لیتے تھے۔ رومن کیتھولک عیسائی فرقہ کے عقیدہ میں صاحب میزان میکائیل فرشتہ ہے۔

یا بد اعمالیوں کے طفیل "نرگ" حاصل نہ ہو جائے۔ گویا انسان کا بار بار جنم لینا بھی ایک معنی میں برزخ ہے۔

سناتن دھرمی ہندوؤں میں مُردوں کے ایصال ثواب کے لئے دان پُن کیا جاتا ہے۔ اور کرناگت بھی کھلائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو ارواح عالم برزخ ——— میں ہوں ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے۔ مردوں کے ایصال ثواب کے لئے "گیا" کی جاترا بھی کی جاتی ہے۔ اور اس طرح بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات جب کسی شخص پر سکرات موت شدید ہوتے ہیں تو تکلیف یا عذاب کم کرنے کے لئے اس شخص کو گائتری منتر پانی پر دم کرکے پلا دیتے ہیں

یہودیوں کا خیال یہودیوں اور قریب قریب تمام سامی النسل اقوام کا عقیدہ ایک ہی تھا بعض کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد روحیں آسمان میں رہتی ہیں۔ بعض یقین کرتے تھے کہ وہ اجرام سماوی میں رہتی ہیں اور غالباً انتقال کے بعد کسی روح کا مرتبہ ہوتا ہے ویسے ہی سیارے یا ستارے میں رہتا ہے۔ یہ خیال عموماً ان سامی النسل اقوام کا تھا جن پر بابل و آشوریا کے خیالات کا اثر پڑا تھا کیونکہ اہل بابل و اشوریا کا مذہب درحقیقت اجرام سماوی کی پرستش تھا اور ان کا سب سے بڑا معبود بعل شمس مردوخ یا مردوخ (آفتاب) کہلاتا تھا۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ روحیں زیر زمین رہتی ہیں۔ شاید ان لوگوں کا عقیدہ تھا جو ایرانی اور مصری خیالات سے متاثر ہوچکے تھے) مگر زیادہ عام عقیدہ عبرانیوں کا یہ تھا کہ تمام ارواح وہ نیکوکار ہوں یا بدکار ایک مقام پر رکھی جاتی ہیں جسے وہ "شیول" کہتے تھے۔ اس مقام پر حساب کتاب ہوتا تھا۔ جو لوگ نیکوکار ہوتے تھے۔ ان کو فردوس میں بھیجدیا جاتا تھا جہاں وہ دیدار باری تعالیٰ سے مشرف ہو کر ابدالآباد تک اسی کے حضور میں مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن جو لوگ بدکار ہوتے تھے ان کی روحیں عذاب و عقاب کے لئے جہنّہ (جہنم) میں ڈال دیجاتی تھیں جہاں ان پر روحانی اور جسمانی دونوں قسم کا عذاب ہوتا تھا۔ مگر چونکہ نہ ہر شخص پوری طرح نیک ہوتا ہے نہ کامل طور پر بد۔ اس لئے کم گنہگاروں کو ایک ایسے مقام میں رکھا جاتا تھا جو فردوس اور جہنم دونوں کے درمیان تھا یہ مقام "شیول" تھا جہاں گنہگاروں کو اُن کے گناہوں کی نسبت سے عذاب دیکر پاک و صاف کیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ دیدار خداوندی کے قابل ہو سکیں۔

بابلی و آشوری خیال بابل و آشوریہ دونوں میں مذہب انجم پرستی رائج تھا۔ ان کا سب سے بڑا معبود آفتاب تھا جسے آشوریہ میں آشور[1] (Assur) اور بابل میں بعل و مردوخ کہتے تھے ان دونوں کا عام عقیدہ یہ تھا کہ اپسو (Apsu) کے قریب زمین کے گرد ایک سمندر ہے اور وہاں ایک تاریک غار عظیم ہے۔ یہ تمام مردوں کی روحیں اسی غار میں لیجا کر رکھی جاتی ہیں جہاں وہ تاریکی اور گرد و غبار میں مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہاں ان کو ان کے گناہوں کی نسبت سے عذاب دیکر پاک و صاف کیا جاتا ہے۔

---

[1] ہندوؤں کا ایشور اور آشوریوں کا آشور غالباً دونوں ایک ہیں

پھر جس روح کی طرف دیوتاؤں کی نگاہ مہربانی ہوتی ہے اور جس کے گناہ بھی صاف ہو جاتے ہیں اسے اس برزخ سے نکال کر ایک نہایت خوبصورت اور دلآویز جزیرہ میں بھیجا جاتا ہے جہاں وہ ہمیشہ کے لئے عیش و مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی منظور نظر ارواح عموماً بادشاہوں کی روحیں ہوا کرتی تھیں۔ یہی باعث تھا کہ وہ لوگ اپنے نامور بادشاہوں کو درجۂ الوہیت دیدیا کرتے تھے۔

مسیحیوں کا اعتقاد رومن کیتھولک اور مشرقی کنائس کے اعتقاد میں روحوں کو کچھ عرصہ کے لئے عالم برزخ میں رکھ کر اس لئے پاک و صاف کیا جاتا ہے کہ وہ دربار ایزدی میں حاضر ہونے کے قابل ہو جائیں ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ روحوں کو ایصال ثواب سے فائدہ پہونچتا ہے۔ وہ مقام جہاں ان گنہگاروں کو عذاب دیا جائیگا۔ بقول بزرگان دین عیسوی زمین کے مرکز میں ہے اسے انگریزی زبان میں "ہیل" (Hell) کہتے ہیں۔ جو ترجمہ ہے عبرانی لفظ "شیول"[۱] (Sheol) یونانی لفظ "ہیڈس" (Hades) اور عبرانی لفظ "جہنہ" (gehenna) کا ایک جگہ لفظ "تارتارس" (Tartarus) کا ترجمہ بھی " Hell " کیا گیا ہے۔ مگر بائبل کے اردو ترجمہ میں ان جملہ الفاظ کا صرف ایک ترجمہ یعنی جہنم ہے۔

---

[۱] عبرانی لفظ "شیول" عہد نامۂ عتیق میں ۶۵ مرتبہ آیا ہے۔ جس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہیڈس (Hades) کیا گیا ہے مگر انگریزی زبان میں ۳۱ مرتبہ اس کا ترجمہ "جہنم" ۳۱ مرتبہ "قبر" اور تین مرتبہ "غار یا گڑھا" کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کے اصلی معنی "پاتال" یا تاریک اور عمیق غار کے ہیں۔ عبرانیوں کے نزدیک "شیول" کا مفہوم دراصل انسان کی گذشتہ زندگی کا ایک ظل موہوم تھا جس میں رہکر مردوں کے تمام تعلقات زندہ دنیا سے منقطع ہو جاتے تھے۔ اور اس طرح گویا "شیول" میں مردوں کی حالت ایک وجود ظلی سے تعبیر کی جاتی تھی۔

اسیری بابل کے زمانہ میں جب یہودیوں کے خیالات و معتقدات پر ایرانیوں کے عقیدۂ معاد کا اثر پڑا تو ان میں بھی حشر و نشر کا عقیدہ داخل ہو گیا مگر اس وقت یہود میں تین مختلف فرقے تھے۔ (۱) فریسی۔ (۲) صدوقی۔ (۳) ایثنی یعنی یونانی ان میں فریسی فرقہ عام طور پر مجوسی خیالات و معتقدات سے متاثر ہو کر حشر و نشر کا قائل ہو گیا۔ مگر صدوقیوں کا عقیدہ اپنے اسی پرانے مفہوم "شیول" پر قائم رہا۔ فرقہ سوم یعنی ایثنی (Essenes) یونانیوں کے اس عقیدہ پر قائم ہو گئے کہ روح لافانی ہے۔ نیز یہ کہ متقی و پرہیزگار لوگوں کی روحیں بعد مرگ نہایت اچھی حالت میں رہتی ہیں۔

اسی کے ساتھ "شیول" کے مفہوم میں حسب ذیل دو باتیں بھی داخل ہو گئیں۔ (۱) نیک بندوں کے لئے آغوش ابراہیم یعنی بہشت ہے اور (۲) خدا ناشناسوں کے لئے جہنم۔ عہد نامۂ عتیق کی پہلی سات کتابوں میں جو لفظ "شیول" گیارہ مرتبہ آیا ہے اس کا ترجمہ یونانی زبان میں "ہیڈس" (Hades) کیا گیا ہے۔ یہی لفظ عہد نامۂ جدید میں۔ (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۶۷)۔

بیان بالا سے یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ تقریباً تمام مذاہب قدیمہ میں کسی ایسی جگہ کا ہونا تسلیم کیا جاتا تھا جہاں مرنے کے بعد روحوں کو عذاب وثواب یا نتیجۂ اعمال کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا اور یہ انتظار بھی اعمال کے لحاظ سے کسی نہ کسی طرح عذاب وثواب سے متعلق ہوتا تھا۔

قرآن پاک اور برزخ کلام پاک میں لفظ برزخ تین جگہ آیا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے :۔

حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون ٭ لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انھا کلمۃ ھو قائلھا ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون

یہاں تک کہ ان میں سے ایک کو موت آئی اور اس نے کہا کہ اے خدا مجھے واپس کر دے تاکہ میں نیک اعمال کروں جو نہیں کئے تھے لیکن یہ صرف اس کا کہنا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے تو ایک حجاب ہے حشر کے دن تک۔

سورۂ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وھو الذی مرج البحرین ھذا عذب فرات وھذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا

خدا وہ ہے جس نے دو سمندر جاری کئے۔ ایک شیریں پانی کا دوسرا شور پانی کا اور ان دونوں کے درمیان حجاب حائل کر دیا۔

سورۂ رحمان میں ہے :۔

مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان

اُس نے دو سمندر جاری کئے جو ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن اُن کے درمیان حجاب ہے اور وہ باہم دگر مل نہیں سکتے۔

موخر الذکر دو آیتوں میں لفظ برزخ واضح طور پر لغوی حیثیت سے حجاب و پردہ یا آڑ کے مفہوم میں آیا ہے۔ کیونکہ دو سمندروں سے مراد یہاں بحر روم اور بحر احمر ہیں جن میں اول الذکر شیریں اور موخر الذکر شور ہے۔ یہاں موت یا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۲) گیارہ مرتبہ آیا ہے۔ مگر وہاں اس کا ترجمہ "جہنم" کیا گیا ہے علاوہ ازیں لفظ "جہنہ" کا بھی ترجمہ "دوزخ" یا "جہنم" کیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ عہد نامۂ عتیق میں "جہنہ" (gehenna) سے وادی (Hinnom) مراد ہے جو شہر یوروشلیم کے متصل واقع تھی اور چونکہ یہاں فتح یہود سے قبل مولخ (Maloch) کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور احاز (Ahaz) اور منشاہ (Manasseh) کے بتوں پر انسانی قربانیاں کی جایا کرتی تھیں اس لئے اس وادی کو یہودیوں نے ناپاک قرار دیا۔ اور بعد ازاں وہ مقام شہر بھر کا مزبلہ بنگیا تھا جہاں تمام شہر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ بعد ازاں اس گھورے میں آگ لگا دی جاتی تھی۔ جو آہستہ آہستہ ہمیشہ جلتی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس مقام کو مقام عذاب کی تصویر سمجھنے لگے "جہاں اُن کے ضمیر کے سوءِ ظن کی دکھراش تکلیف رفع ہوتی ہے، نہ آگ بجھتی ہے" یہی وادی عیق یعنی وادی ہنم یہودی ربیون کے نزدیک قعر دوزخ بنگئی تھی۔

بعد الموت کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

نیز اسی سورہ مومنون کی آیت سوال میں بھی ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ لفظ برزخ سے قبل لفظ دراِتھم آیا ہے جو ضمیر جمع کی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے جو جواب دیا ہے اس کا مخاطب وہی تنہا شخص نہیں ہے جس نے پھر دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو کی تھی بلکہ تمام وہ لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ یا اسلام کے دشمن تھے خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ۔ اس لئے یہاں بھی لفظ برزخ خصوصیت کے ساتھ کسی ایسے عالم یا مقام کے لئے استعمال نہیں ہوا جس کا تعلق عالم بعد الموت سے ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض بے بسی اور رکاوٹ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ برزخ کے لغوی معنے حجاب، پردہ، یا روک کے ہیں اور لغوی حیثیت سے علاوہ کوئی اصطلاحی معنے کلام مجید میں نظر نہیں آتے اس لئے اگر انسانی روح کے لئے کوئی عالم برزخ دیگر مذاہب قدیمہ کے اعتقاد کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری علمائے اسلام پر ہے قرآن پر نہیں اور نہ اسے صحیح ماننے پر کوئی مسلمان مجبور ہو سکتا ہے

مذہب اور انسان

ملا زمانے کو خلعتِ زندگی خداوندِ بحر و بر سے
تجلیوں کے لطیف چشمے رواں ہوئے خاکِ تیرہ تر سے

مگر ابھی تھی اتصالِ منزلِ حیات ناکامگار اب تک
دہانہ تھا جہل و ناشناسی کا راستوں پر غبار اب تک

جمود سا تھا فضا پہ طاری تجلیاں طالبِ نظر تھیں
ابھی تماشائے ہستی سیر موجیں جلالِ طوفاں سے بے خبر تھیں

ہمیں ابتدائے نقشہ تھی ہنوز ترتیبِ زندگانی
بھٹک رہی تھی زمیں کی تاریک وسعتوں میں حیاتِ فانی

چھیڑا نہ تھا بزمِ آب و گل میں حقیقتوں کا ترانہ اب تک
سوادِ فطرت نگاہِ رخشاں نہ تھی جبینِ زمانہ اب تک

بہار تھی صبح کا تبسم طرب کے غنچے کھلا رہا تھا
مگر بہ بارِ بوستاں میں عجیب کچھ انتشار سا تھا

اگرچہ روحوں میں کیف کی آرزوئے پنہاں مچل رہی تھی
شراب کے دلربا پرتو سے عقلِ روشن نہ ہو سکی تھی

دھواں جو پھیلا ہوا تھا ہر سمت رفتہ رفتہ سمٹ رہا تھا
زمانہ سرعت کے ساتھ اوراقِ زندگانی الٹ رہا تھا

یکایک اٹھا سحابِ رحمت برس گیا خاکِ بوستاں پر
گری ہی آخر تڑپ کے بجلی نشیمنِ طائرِ خزاں پر

رہا نہ وہ انتشار باقی کہ چھڑ گئے سازِ شادمانی
دوام کی حد سے متصل ہو گیا مقامِ حیاتِ فانی

مگر ابھی یادگارِ سابق فضا میں کچھ دائرے عیاں تھے
جو ابرِ تاریک چھا رہا تھا کہ ظلمت افگن نشاں تھے

انھوں نے چاہا کہ پھر زمیں کو حریمِ جرم و گناہ کر دیں
چراغِ عرفاں بجھا کے چھوڑیں جمالِ گیتی تباہ کر دیں

چلا تھا اک لختِ ابرِ گریاں کہ مہرِ رخشاں کو روند ڈالے
بڑھی تھی اک تربتِ خاک لرزاں کہ خار پائے ہوا نکالے

جما ہوا تھا ہجومِ غفلت کہ منتشر بزمِ ہوش کر دے
تلا ہوا تھا جنونِ باطل کہ سازِ عرفاں خموش کر دے

کیا تھا سیلِ رواں سے لڑنے کا عزم خاشاکِ ناتواں نے
دیا تھا کوہِ گراں کو پیغامِ جنگ ذراتِ پرفشاں نے

جلالِ صرصر کو روکنا چاہتا تھا صحرا کا ایک ذرہ
شکوہِ طوفاں کو لوٹنے جا رہا تھا شبنم کا ایک قطرہ

اصولِ فطرت سے گرمِ پیکار تھا حقیر و ضعیف انساں
لرز رہا تھا ضمیرِ گیتی میں شعلۂ جرم و سیلِ عصیاں

مگر جو روحیں تھیں پاک و طاہر وہ پھر بڑھیں گرمِ کار ہو کر
حیات نو بخش دی چمن کو تبسمِ نو بہار ہو کر

جبھی سے یہ جنگِ مستقل ہے بپا مقاماتِ خیر و شر میں
ہم ہیں اجزائے نور و ظلمت حدیقۂ عمرِ مختصر میں

مگر ہمیشہ جبینِ عالم جھکی ہے نیکی کے آستاں پر
رہا ہے "مذہب" کا ابر ہر سو گھرا ہوا عرصۂ جہاں پر

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

تقاضائے جوانی

منھ اندھیرے تھی جب آویزش سی مہر و ماہ میں
چھاؤں میں تاروں کی کچی نیند سے چونکی ہوئی
رنگ تھا اک شہپرِ پیا پائے بے پاپوش پر
چال اٹھلائی ہوئی گردن کا خم مستانہ دار
لیکن اس عالم میں بھی اے محوِ فطرت ہمنشیں
دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ اندازِ طرب
سچ ہے ایامِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون

مہترانی کل نظر آئی مجھے اک راہ میں
اک قدم پر جاگتی اک گام پر سوتی ہوئی
رخ پہ الجھن، ملگجی ساری کا پلو دوش پر
انکھڑیوں میں تنگ گلیوں کے تصور کا غبار
غم کا کوئی خارِ پیشانی کے پھولوں میں نہیں
اک خوشی سی انکھڑیوں میں ایک نے سی زیرِ لب
سرِ شبابِ روح پرور کا جھکا سکتا ہے کون

مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور
کوئی عالم ہو جوانی گنگنائے گی ضرور!

جوش (ملیح آبادی)

واردات

اک آنسو کھنچ کے آیا آنکھ سے یک قطرۂ خونِ دل سے — کہ نکلا آخری نغمہ شکستِ سازِ محفل سے
نزاعِ کفر و ایماں کیا برہمن کیا مسلماں کیسا — بہت آگے ہوں میں اب کارزارِ حق و باطل سے
ہے شب رنگیں سحر رنگین جہاں کے بام و در رنگیں — زمانہ رنگ پر ہے اک مری رنگینیِ دل سے
کہیں مستی میں نور و نار وابستہ نہ ہو جائیں — اٹھانا اپنے دامن کو بچانا شمعِ محفل سے
پرستش ہو جہاں ہر وقت اک شمعِ محبت کی — برہمن آج وہ مندر بنا خاکسترِ دل سے
مکاں پر نور ہو اور لامکاں معمور ہو جائے — اٹھا تو رخ سے پردہ میں اٹھاؤں خلوتِ دل سے
نہ پوچھو اب دماغِ آرزو کس آسماں پر ہے — اڑا لایا ہوں اک کیفِ تمنا اُن کی محفل سے
مسافر کا تخیل کیا تصور کیا تعین کیا — پھر آغازِ سفر ہوا انتہائے حدِ منزل سے
تبسم مستقل تجلی ترنم شعلۂ پیکر — کہیں اے غارتِ کونین یوں اٹھتے ہیں محفل سے
مرے ہونٹوں پہ جو نغمات بن بن کر چمکتی ہے — یہ ساغر کھنچ کے آئی ہے ابھی میخانۂ دل سے

ساغر نظامی

ہمنشین سے

دیکھ بپھری ہوئی گھٹاؤں کو — ولولہ آفریں ہواؤں کو
برقِ تاباں کا رقصِ مستانہ — شمع کا ضو میں عشقِ پروانہ
قعرِ دریا میں شورِ طوفاں کا — ذرہ ذرہ میں نورِ عرفاں کا
قلبِ شبنم میں جوششِ خودداری — ابرِ سرشار کی گہرباری
زندگی کیا ہے قصرِ ہمت ہے — جذبۂ سرمدی کی طاقت ہے

اٹھ! کہ دنیا ہے منتظر تیری — موت رقصاں ہے روح پر تیری
تیری کشتی فنا کے دھارے پر — یعنی مہلک قضا کے دھارے پر
بہہ رہی ہے گداز کی صورت — اشکِ ارماں نواز کی صورت
باغِ ہستی کا باغباں ہے تو — زندگانی کا پاسباں ہے تو
اٹھ کے شعلہ فشاں نواؤں سے — روح کی سرمدی صداؤں سے

برقِ خرمن کو مضمحل کر دے
نورِ ہستی میں منتقل کر دے

باقی صدیقی

جذبۂ بے اختیار

(۱) اے خوشا! پھر جانبِ شہرِ نگار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار

عشق کی معراج کا آغاز ہے
جذبِ الفت مائلِ پرواز ہے
بربطِ دل زمزمہ پرواز ہے
مرحبا! عزمِ حریمِ ناز ہے
کاروانِ آرزو ہے گرمِ کار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار

(۲) شامِ غم کی تیرگی روکے مجھے!
منتشر افتادگی روکے مجھے!
کائناتِ بیکسی روکے مجھے!
کون حائل ہے؟ کوئی روکے مجھے!
آج میں ہوں اور عزمِ کامگار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار

(۳) شمعِ ایقاں کی ضیائیں ساتھ ہیں
رہنما بکردنائیں ساتھ ہیں
عشق کی بھی صدائیں ساتھ ہیں
خضرِ امداد کی دعائیں ساتھ ہیں
ہے سحابِ الطافِ یزداں سایہ بار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار!

(۴) کھینچتی ہے چشمِ میگوں کی کشش
مشکبو زلفوں کے افسوں کی کشش
مستیٔ لبہائے گلگوں کی کشش
آفریں! اے قلبِ محزوں کی کشش
ہر قدم ہے بیخودی سے ہمکنار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار

(۵) عازمِ طورِ محبت ہے کلیم!
جانبِ گلشن ہے آمادہ نسیم!
عزمِ زاہد ہے سوئے خلدِ نعیم!
میں ہوں اور ہے یہ وہی فوزِ العظیم
میری قسمت ہے طوافِ کوئے یار
لے چلا ہے جذبۂ بے اختیار

(۶) ہے فرازِ عشق کی منزل قریب
موجِ آوارہ سے ہے ساحل قریب
ہے نگاہِ قیس سے محمل قریب!
محفلِ محبوب ہے اے دل! قریب
سامنے ہے وہ محبت کا دیار
مرحبا! اے جذبۂ بے اختیار

روشن صدیقی

تجلیات

جوانی کیف میں ڈوبی ہوئی مخمور مستانی
گرفتارِ فریب شوقِ بداندیش، دیوانی
مآلِ عشق سے ناآشنا، نادان سودائی
امنگوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی طغیانی

رواں ہے شوق کا بجرا سنہری جوباروں میں
بہا جاتا ہوں نورانی امنگوں کے خماروں میں
فضائے زندگی پر حسن کا سیلاب حاوی ہے
گھرا ہوں ماہ طلعت آرزوؤں کی بہاروں میں

سنائے مطربِ رنگیں نوا وہ کیف زا نغمے
کہ میرے دل میں حشرِ بیخودی کر دیں بپا نغمے
لبِ دریا ہے اور کیف آفریں ہے چاندنی شب کی
فضاؤں میں بہا دے روح پرور، جانفزا نغمے

تڑپ کر جاگ اُٹھیں مُردہ امنگیں اور تمنائیں
رگوں میں برق بن کر تلملا اُٹھا لہو میرا
اُمیدوں کا ہجوم ایوانِ دل میں جب ہوا داخل
خوشی سے جھلملا اُٹھا چراغِ آرزو میرا

عدم

مجھے معلوم نہ تھا

وقت مشکل سے کٹیگا، مجھے معلوم نہ تھا
چین دل کو نہ ملے گا، مجھے معلوم نہ تھا
اور بھی جس سے دلِ زار کو وحشت ہوگی
واسطہ اُس سے پڑے گا مجھے معلوم نہ تھا
میری بیتاب دعاؤں کا، تمناؤں کا
یہ صلہ مجھکو ملیگا، مجھے معلوم نہ تھا
کوئی ہمدم مرے ہمراہ مرے دوش بدوش
دو قدم چل نہ سکے گا، مجھے معلوم نہ تھا
صبر کرتا، نہ برآئی تھی، اگر دل کی مراد
صبر بھی ہو نہ سکے گا، مجھے معلوم نہ تھا
رات دن گردشِ پیہم سے گزرنا ہوگا
دل کا پیمانہ بنے گا، مجھے معلوم نہ تھا
جسکے ہونیکا نہ تھا کوئی بظاہر امکان
ایک دن ہو کے رہیگا، مجھے معلوم نہ تھا
دامنِ شوق مرے ہاتھ سے چھٹ جائیگا
اس قدر کوئی کھینچیگا، مجھے معلوم نہ تھا
دل میں تسکین کا ساماں نہ رہیگا کوئی
گھر یہ اس طرح لٹیگا، مجھے معلوم نہ تھا
داغِ دل، داغِ جگر، داغِ تمنا حیرت
مر کے بھی مٹ نہ سکے گا مجھے معلوم نہ تھا

حیرت بی اے

معلومات

جاپانی زبان انگریزی حروف میں

صدر جمہوریہ ترکیہ (مصطفےٰ کمال پاشا) نے بجائے عربی حروف کے لاطینی یا انگریزی حروف کا رواج دیکر ایسی عجیب و غریب مثال انقلاب ذہنی کی پیش کی ہے کہ اس سے قبل کوئی نظیر اس کی نہیں ملتی۔ اس وقت اس سے گفتگو نہیں کہ یہ طرزِ عمل درست ہے یا نہیں، اور اس میں کیا فوائد و نقصانات پائے جاتے ہیں، بلکہ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ دنیا میں اس واقعہ نے ایک ایسی مثال پیش کر دی ہے کہ ایشیا کے دوسرے ممالک بھی اب اس مسئلہ پر غور کرنے لگے ہیں۔

چنانچہ جاپان میں بھی یہ تحریک زیرِ غور ہے کہ بجائے جاپانی حروف کے لاطینی حروف رائج کئے جائیں۔ ہر چند جاپان کے لئے اس میں بہت دشواریاں ہیں، کیونکہ وہاں حروف کی تعداد بہت زیادہ ہے اور قواعد تلفظ بھی نہایت پیچیدہ ہیں، لیکن ان تمام دشواریوں کو دور کرنے پر پوری قوت کے ساتھ غور ہو رہا ہے اور غالباً مستقبل قریب میں ہم سُن لیں گے کہ جاپان نے بھی ترکی کی تقلید کر کے اس میں کامیابی حاصل کر لی۔

جاپانی لڑکی اور شوہر کی جستجو

یورپ کی تقلید میں جاپان کی لڑکیاں بھی اپنے لئے شوہر حاصل کرنے کی غرض سے اخبار میں اعلان شائع کرتی ہیں، لیکن یہ اعلان جن الفاظ میں اور جن جذبات کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے، وہ یقیناً ایک مغربی عورت کی ذہنیت سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

مغرب کی عورت صرف اپنی ان صفات کا ذکر کرتی ہے جن کا تعلق صرف "گوشت و خون" کی خواہشوں سے ہے اور ان کے عوض میں وہ زیادہ تر جاہ و ثروت کی طلبگار ہوتی ہے، لیکن جاپان کی لڑکی اپنے حسن و جمال کے ساتھ اپنے اخلاق کو بھی پیش کرتی ہے اور زیادہ تر اخلاق ہی کی طلبگار ہوتی ہے۔ ذیل کے ایک اعلان سے جو جاپانی اخبار میں شائع ہوا ہے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"میں نوجوان ہوں، جمیل ہوں اور نہایت دلکش۔ میرے بڑے بڑے بال میرے دونوں شانوں پر ایسے نظر آتے ہیں جیسے پہاڑ کی چوٹی پر سیاہ بادل۔ میرا قامت ایسا نازک، ایسا لچیلا ہے جیسے شاخِ بید۔ میری جلد ایسی نرم ہے جیسے ریشم۔

میرے پاس اتنی دولت بھی موجود ہے کہ میں زندگی کے تمام مصائب کو اُس شخص کے ساتھ راحت سے بسر کر سکوں، جو میرا شوہر بننے پر راضی ہو۔ اگر خوش نصیبی سے کوئی ایسا شخص مل گیا تو میں

مدت العمر کے لئے اپنا نفس اسکے سپرد کر دونگی میں ایک ایسا شخص چاہتی ہوں جو شریف ہو، نبیل ہو ذکی ہو
مہذب ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ اگر کسی میں یہ صفات موجود ہوں تو مجھ کو لکھیں میں اس کے
رنج و مسرت میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہوں تاکہ ہم دونوں ساتھ ہی شاہراہ حیات کو طے کریں
ساتھ ہی اتفاق قبر میں جائیں اور مرمر احمریں کی ایک ہی لوح ہماری قبروں پر قائم کی جائے

ہندوستان کی ایک خاص نظر بندی

ہندوستان کا ایک شعبدہ بہت مشہور ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ بازیگر رسی لیکر سامنے آتا ہے اور رسی کو اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے جو قائم ہو جاتی ہے۔ پھر اسی رسی پر ایک لڑکی چڑھتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ بعد کو وہ ٹوکرا یا صندوق کھولتا ہے اور وہ لڑکی اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔

اس شعبدہ کا ذکر سلاطین مغلیہ نے بھی کیا ہے اور اہل مغرب نے بھی نہایت حیرت و استعجاب سے اس کا حال اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ کیونکہ اس شعبدہ کی کوئی علمی توجیہ اس وقت تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کلکتہ پولیس کے افسر کرنل برنارڈ نے ایک کتاب لکھی ہے جسمیں اس شعبدہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ایک بار اس کے سامنے بھی یہ تماشا ہوا اور اُس نے کیمرا سامنے رکھ کر پلیٹ پر عکس لیا، لیکن وہ سخت متحیر ہوا جب اُس نے دیکھا کہ تصویر میں نہ کہیں رسی نظر آتی ہے اور نہ لڑکی بلکہ صرف بازیگر تنہا سامنے کھڑا ہوا ہے۔

کرنل مذکور کا بیان ہے کہ تماشہ شروع کرنے سے قبل بازیگر نے کوئی دوا سلگائی تھی اور غالباً اُسی نے حاضرین کے دماغ پر کوئی ایسا اثر کیا کہ ان پر نظر بندی آسانی سے ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ کسی ہندی بازیگر نے انگلستان میں بھی یہی تماشہ کیا لیکن وہاں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ وہاں اسے وہ چیزیں نہ ملی ہوں جن کا دھواں انسانی حس کو خیال کا مقناطیسی اثر قبول کرنے کا اہل بنا دیتا ہے۔

حال ہی میں ایک انگریز بودلیس نے بھی بالکل یہی تماشہ دکھایا اور جب تصویر لی گئی تو اُس میں لڑکی کا کہیں پتہ نہ تھا، لیکن رسی موجود تھی۔ بودلیس کا بیان ہے کہ یہ کھیل ایک نہایت ہی نادر ترکیب پر قائم ہے جس کی تفصیل وہ کسی دوسرے وقت بتائے گا۔

انسان کی قیمت

ماہرین علم الکیمیا کی تحقیق ہے کہ جسم انسانی جن مواد سے طیار ہوتا ہے اُن کی مجموعی قیمت کسی طرح تین روپیہ سے زائد نہیں ہوتی۔ آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کو لیجئے اور تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے جسم میں جس کا وزن ستر کیلوگرام ہے، چکنائی صرف اتنی پائی جاتی ہے کہ اس سے سات ٹکیاں صابون کی طیار ہو سکتی ہیں۔ کاربن کے حصہ اتنا ہے کہ اُس سے ۹۰۰۰ پنسلیں بن سکتی ہیں اور فاسفورس

مقدار سے ۲۲۰۰ سینکیں دیا سلائی کی ——— لوہے کا حصہ اتنا ہے کہ صرف ایک معمولی کیل اس سے بنا سکتے ہیں، چونا اتنا ہوتا ہے کہ ایک مرغی کے دربہ پر اس سے سفیدی ہو سکتی ہے۔ گندھک کی مقدار اس سے زیادہ نہیں کہ چند کیڑے ہلاک ہو سکیں، مگنیزیم اس سے بھی کم ہوتا ہے، ان سب کی قیمت چار شلنگ یا ایک ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتی جو تین روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔

جسم انسانی کی تعمیر کے لئے صرف ۱۶ مواد کیمیائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذکرۂ بالا اشیاء کے علاوہ نمک کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے، خون میں سوڈا بھی شامل ہوتا ہے اور کچھ اعصاب میں پوٹاس بھی ——— نٹروجن بھی پایا جاتا ہے۔ عضلات قلب میں چاندی کا کچھ جزو ہے اور جگر میں سیسہ کا۔

الغرض انسان نام اگر صرف اس کے جسم کا ہے تو اس کی قیمت ایک بکری کے بچہ سے زیادہ نہیں، لیکن اگر انسان سے مراد وہ قوت ہے جسے "نفخ روح" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو پھر اس کی قیمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جبکہ وہ اس حیثیت سے "خدا کا نائب و خلیفہ" ہے۔

دنیا کا طویل ترین انسان

امریکہ کا ایک شخص جس کا نام کلیفورڈ تامسن ہے اور جو حال ہی میں ہالی ووڈ کے سینما کمپنیوں میں کام کر رہا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے دراز قامت انسان ہے۔ اسکا قد ۸ فٹ ۷ انچ ہے اسی کے ساتھ اس کا جسم بھی بہت وزنی ہے یعنی ۳۲۵ پونڈ یا ۴ من ہے۔ اس کے سینہ کا دور ۴ فٹ ۴ انچ ہے، اور اسکا جوتا اور کپڑے خاص طور سے طیار کئے جاتے ہیں۔ یہ دو چار پائیوں پر سوتا ہے۔ عام انسانوں سے دونی غذا کھاتا ہے اس کی بیوی کا قد صرف ۵ فٹ ۱۳ انچ ہے۔

اس سے قبل ہالینڈ میں ایک شخص دادزون تھا جس کا قد آٹھ فٹ ۹ انچ تھا۔ اسی طرح آئرلینڈ کا ایک نوجوان اوبریان نامی تھا جس کا قد ۲۳ سال کی عمر میں ۸ فٹ آٹھ انچ تک پہونچ گیا تھا۔ اگر یہ اس قدر کمسنی میں نہ مرجاتا تو اطبا کا خیال ہے کہ ۹ فٹ تک پہونچ جاتا۔

آئرلینڈ میں ایک اور شخص کورنلیوس نامی تھا جس کا قد ۸ فٹ ۷ انچ تھا۔ اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی کہ اس کا جسم دفعتہً ۱۸ انچ بڑھ گیا اور یہی اس کی موت کا باعث ہوا کیونکہ یوں اچانک بڑھ جانے سے اس کے قلب کو صدمہ پہونچا

سفری کتب خانے

انگلستان میں بچوں کی دماغی و ذہنی تربیت کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ بچوں کے لئے مختلف ذوق کی کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں ایک بڑے موٹر میں رکھ کر گاؤں گاؤں لے جاتے ہیں۔ دو عورتیں اس کتب خانہ کی نگراں ہوتی ہیں۔ یہ موٹر جب کسی گاؤں یا قصبہ میں پہونچتا ہے تو بچوں کو ان کے ذوق کے لحاظ سے کتابیں چھانٹنے کا موقع دیا جاتا ہے اور ان کو اجازت ہوتی ہے کہ جو کتاب جی میں آئے دو ہفتہ کے لئے مستعار لے لیں۔ اگر کوئی کتاب کسی بچہ کی فرمائش کے مطابق موجود نہیں ہوتی تو دوسرے پھیرے میں مہیا

کردی جاتی ہے۔

کہربائی زندگی گزشتہ پچاس سال کے اندر برق و کہربائیت سے جس قدر کام لیا گیا وہ تاریخ ایجاد و اختراع کی حیرت انگیز داستان ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس سے کسی نہ کسی طرح بجلی کا تعلق نہ ہو اور ہماری کوئی اہم ضرورت ایسی نہیں جسے بجلی انجام نہ دیتی ہو۔ چنانچہ حال ہی میں اہل امریکہ نے بعض ایسے مکانات تیار کئے ہیں جن میں کسی خادم کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور تمام کام بجلی ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ شام کو بستر بچھانا، صبح کو بستر لپیٹنا، پانی گرم کرنا، داڑھی مونڈنا، غسل کرانا، کپڑے بدلوانا، کھانا پکانا، کھلانا، مکان صاف کرنا۔ الغرض تمام خدمات بجلی انجام دیتی ہے، جس کے لئے صرف ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس وقت دن کو کوئی مہمان آتا ہے تو خود بخود موٹر کا سایہ مکان کے اندر نمودار ہو جاتا ہے جس سے گھر والوں کو علم ہو جاتا ہے اور موٹر خانہ اپنے آپ کھل جاتا ہے جہاں مہمان اپنے موٹر کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اگر رات کو کوئی مہمان آتا ہے تو خاص قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور خبردار کر دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ خیر مقدم کا بینڈ بھی آپ ہی آپ بجنے لگتا ہے۔

مخصوص کاموں کے لئے مخصوص اوقات پر گھنٹی بھی آپ ہی آپ بجتی ہے۔ اور ضرورت کے وقت تمام چیزیں نکلی بٹن دبانے سے سامنے آجاتی ہیں۔

باورچی خانہ میں برتن دھونا، انھیں خشک کرنا، میز پر ان کو چن کر کھانا لانا، صاف رکابیاں بدلنا، پانی گرم کرنا، چار طیار کرنا، سب بجلی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کوئی انسانی ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ مطبخ کو ۲۹ آلات کہربائی سے آراستہ کیا گیا ہے جو اپنی خدمات علیحدہ علیحدہ انجام دیتے ہیں۔

کپڑے دھونے، ان کو تہ کر کے رکھنے اور پھر ضرورت کے وقت سامنے لانے کا کام بھی بجلی سے لیا جاتا ہے۔ ان مکانوں میں ریڈیو بھی لگا ہوا ہے جس کے ذریعہ سے مختلف اوقات میں تمام دنیا کی خبریں از خود پہونچتی رہتی ہیں اور مقررہ وقت پر گانا بھی سنا جا سکتا ہے۔

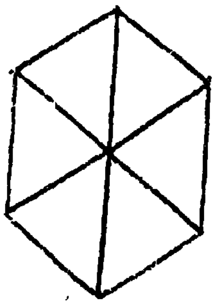
سونے کے وقت ایک خاص قسم کی نرم و شیریں موسیقی بھی اسی ریڈیو سے حاصل کی جاتی ہے تاکہ فوراً نیند آجائے۔ صبح بیدار ہونے کے وقت بھی ایک دلکش نغمہ اس آلہ سے پیدا ہوتا ہے اور کھانے کے وقت بینڈ بجانا بھی اسی کے سپرد ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان تمام آلات پر کسی طرح دو سو ڈالر (۶۰۰ روپیہ) سے زیادہ صرف نہیں ہوتا۔ اور ماہانہ مصارف ۱۵ - ۱۶ ڈالر (تقریباً ۵۰ روپیہ) سے آگے نہیں بڑھتے حالانکہ یوں ان تمام انتظامات کے لئے اگر ملازم رکھے جائیں تو اس سے چار چند صرف بھی کافی نہیں ہو سکتا۔

صفحۂ تفریح و انعام

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ۲ نمبر سوال غلط درج ہوا تھا۔ اس لئے اس ماہ کے سوالات میں اسے مکرر درج کیا جاتا ہے

سوال نمبر ۱ کا حل یہ ہے



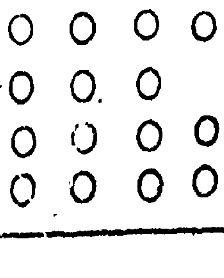
سوال نمبر ۳ کا حل یہ ہے:۔ باپ کی عمر ۳۶ سال۔ ماں کی عمر ۲۴ سال۔ بڑے لڑکے کی عمر ۹ سال اور چھوٹے لڑکے کی عمر ½ سال ہے۔

سوال نمبر ۴ کا جواب یہ ہے:۔ دو لٹر پانی اور دو لٹر الکحل کو جب ملائیں گے تو نتیجہ ۴ نہ ہوگا بلکہ ۳٫۸ لٹر ہوگا۔ (لٹر ایک فرانسیسی پیمانہ ہے)۔

جن طلبہ کے جتنے جواب صحیح ہیں ان کی فہرست اخیر میں دیدی گئی ہے اور انعامی کتابیں روانہ ہو چکی ہیں

اس ماہ میں پھر تین سوالات دئے جاتے ہیں:۔

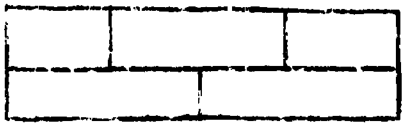
۱۔ پندرہ جھونپڑوں سے کیونکر ایک شخص اس طرح گزر سکتا ہے کہ صرف چھ خطوط مستقیم اُسے بنانا پڑیں۔ اور صرف پانچ مرتبہ اسے مڑنا پڑے



۲- ذیل کے ۱۶ خانوں میں ۱۶ ہندسے ہیں - کیا آپ ان کو ان خانوں میں اس ترتیب سے رکھ سکتے ہیں کہ جب کسی خط مستقیم سے شمار کریں تو مجموعہ ۱۸۰ ہو (خط مستقیم خواہ عمودی ہو یا افقی یا قطری) اسی طرح درمیان کے مربع کے چاروں ہندسوں کا مجموعہ ۱۸۰ ہو اور کناروں کے مربعوں میں جو ہندسے ہوں ان کا مجموعہ بھی ۱۸۰ ہو۔

۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸

۳- ذیل کی شکل پانچ مستطیلوں پر مشتمل ہے جو پندرہ خطوط مستقیم سے بنتی ہے ایک لکیر ایسی کھینچئے جو ہر خط کو قطع کرتی ہوئی گزر جائے اور دوبارہ اُس خط سے نہ گزرے:-



انعامات میں دس روپیہ سے لیکر ایک روپیہ کی کتابیں روانہ کی جائیں گی جنکی تعین منیجر کے اختیار میں ہوگی - جوابات ۱۰ اپریل تک آجانا چاہیئے۔

جن حضرات کے جوابات ۲۵ مارچ تک صحیح موصول ہوئے اُن کی فہرست حسب ذیل ہے -

۱- دو سوالوں کا صحیح جواب دینے والے

۱- سلطان الزماں صاحب زبیری درجہ ہشتم - مارہرہ
۲- رحمت شاہ صاحب ٹونک
۳- اشفاق حسین صاحب رضوی - سلطان پور
۴- [illegible] صاحب درجہ ہشتم - کلر سیداں
۵- سراج احمد رضا صاحب درجہ ششم - گونڈا
۶- عبدالمجید صاحب - بڑا دہرہ
۷- محمود الرحمان صاحب درجہ ہفتم کارنجہ
۸- محمد ارشد صاحب درجہ " "
۹- محمد ابراہیم صاحب " " "
۱۰- شفیق احمد صاحب درجہ دہم اجمیر
۱۱- اللہ رکھا صاحب اجمیر
۱۲- محمد الیاس صاحب متعلم فرسٹ ایر ہزاری باغ

۱۳ - بختیار حسن صاحب کلکتہ
۱۴ - احمد علی اکبر صاحب ۔ مومن آباد
۱۵ - امرناتھ صاحب لاہور
۱۶ - شاہ نجم الدین صاحب باکی پور
۱۷ - لیاقت حسین صاحب میرٹھ
۱۸ - محمد یونس صاحب الہ آباد
۱۹ - حامد علی صاحب جماعت دہم ہوشیار پور
۲۰ - مصطفےٰ احسن صاحب جماعت ہشتم بھاولپور
۲۱ - بشیر احمد صاحب بلند شہر
۲۲ - عبدالوہاب صاحب جماعت نہم گورکھپور
۲۳ - محمد فضل امام صاحب مونگیر
۲۴ - حفیظ الرحمان صاحب نگرا - چھپرا
۲۵ - محمد لطیف صاحب درجہ ہفتم - بادشاہاں
۲۶ - محمد اسمٰعیل صاحب مرچی گنج پٹنہ
۲۷ - عبدالرؤف صاحب فرخ آباد
۲۸ - بیدار بخت صاحب گجراتی
۲۹ - عبدالرشید صاحب گونڈا
۳۰ - محمد بشیر صاحب ۔ غازیپور
۳۱ - حشمت علی صاحب متعلم فرسٹ ایر رہتک
۳۲ - محمد بشیر صاحب سیالکوٹ
۳۳ - سعیدالدین صاحب منوری - الہ آباد

۲ - ایک سوال کا صحیح جواب دینے والے

۱ - سید محمد افضل شاہ صاحب درجہ ہشتم چک عبدالخالق
۲ - احمد خاں صاحب - کارنجہ اکولہ
۳ - زین العابدین صاحب - حیدرآباد (دکن)
۴ - سید ضمیر حسین صاحب درجہ ہفتم - پونڈری کرنال
۵ - عبدالباری صاحب - بریلی
۶ - شریف احمد صاحب جماعت عالم - میرٹھ
۷ - بشیر احمد صاحب جماعت ششم دہلی
۸ - عبدالجبار صاحب درجہ ہشتم جونسترہ - کیمبل پور
۹ - بتول بانو صاحبہ متعلم درجہ پنجم ۔ سلطانپور۔
۱۰ - محمد نثار قلیط اللہ خاں صاحب خالدی درجہ نہم جہانسی
۱۱ - محمد فرحت اللہ صاحب درجہ ہفتم سُتنا
۱۲ - زبیر احمد صاحب ۔ گیا
۱۳ - شرافت علی صاحب - آگرہ
۱۴ - محمد لیاقت علی صاحب الہ آباد
۱۵ - محمد مونس صاحب ۔ مظفر نگر
۱۶ - سید منظر عالم صاحب طالبعلم فرسٹ ایر بھاگلپور
۱۷ - عبدالحمید خاں صاحب درجہ نہم کہوتا - راولپنڈی

ابرؔ لکھنوی و سروش[1]

ابرؔ — عدوے دوست سے کب خواہش امداد کرتے ہیں — کہیں گلچیں سے ہم صیاد کی فریاد کرتے ہیں

سروشؔ — بندش بالکل مبتدیوں کی سی ہے۔ مضمون نہایت پست۔ حاصل کچھ بھی نہیں پہلے مصرع کی کب اور دوسرے مصرع کی کہیں نے نتیجہ ملتج نہ ہونے دیا۔ اور مطلع کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر آپ کیا کرتے ہیں۔

اعوانؔ — میرے نزدیک اعتراض بالکل مہمل اور لغو ہے۔ بندش کو سست کہدینا تو بالکل معمولی اور پیش پا افتادہ بات ہے اس کا ثبوت پیش کرنا بہت ضروری تھا کہ آخر بندش میں کیا سستی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس شخص سے جو ہمارے دوست کا دشمن ہے امداد کی کب خواہش کرتے۔ کہیں صیاد کی فریاد کر سکتے ہیں۔ مصرع ثانی میں گل سے اپنے محبوب کا۔ اور گلچیں سے دشمن کے محبوب کا اور صیاد سے اپنے دوست کا استعارہ کیا ہے۔ کیونکہ گل ہمارا محبوب ہے اور گلچیں گل کو آزار دینے والا ہے لہٰذا وہ اس کا دشمن ہوا۔ ایسی حالت میں ہم صیاد یعنی اپنے دوست کی اس سے کیا شکایت کریں۔

ابرؔ — سر محفل کہیں یوں شکوۂ بیداد کرتے ہیں — ہیں ساز نغمہ گر چھیڑ دو تو ہم فریاد کرتے ہیں

سروشؔ — مضمون کچھ برا نہ تھا۔ مگر طرز ادا شاعر کا حق ہے نہ کہ غیر شاعر کا۔ صرف لفظ چھیڑ کے لئے ساز و نغمہ کی ٹھونس ٹھاس کی گئی۔ اور لفظ گر نے اگرچہ معنوی قوت دی ہے۔ مگر ایسے محل پر صرف کیا گیا کہ بندش کی خامی ظاہر ہوئی شعر اپنی بندش کی مراعات لفظی کی وجہ سے بالکل مذاق سے گر گیا۔ اور ایک منافرت معنوی کا عیب بھی ہے یعنی

---

[1] ابر مرحوم کا نام نتھے آغا تھا۔ لکھنؤ سے پہلے ایک رسالہ معیار نکلتا تھا۔ وہ مرحوم کی ساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا اور آپ ہی اس کے مالک و مدیر تھے۔ آپ کی کوششوں سے ادبی ذوق لکھنؤ میں نہایت ترقی پر پہونچا اچھے کلام کے آپ عاشق تھے اور جس طرح ممکن ہوتا تھا ماہوار مشاعرے میں اہل کمال کو جمع کر لیتے تھے عربی کی بابت مجھے علم نہیں، ہاں آپ فارسی سے بقدر ضرورت زمانہ آگاہ تھے اردو میں شعر و سخن کا مشغلہ جاری تھا۔ قدیم رنگ کو قریب قریب آپ نے اور آپ کی پوری جماعت نے ترک کر دیا تھا اور ایک راستہ اختیار کیا تھا جس میں سوز و گداز کی جھلک اور مرثیہ کی شان بہت نمایاں تھی۔ آپ کے رنگ کلام کو جب مجموعی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نظر غائر اور تجزیہ کا متحمل نہیں ہے۔ چنانچہ آپ پر آپ کی زندگی میں اعتراض ہوئے جن میں سروش بھی ایک معترض ہیں۔ پہلے انھیں کے چند اعتراضات لکھتا ہوں۔ ابر مرحوم کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا

نغمہ کو فریاد سے مناسبت حقیقی نہیں۔

(مولف) میرے نزدیک شعر اچھا خاصہ ہے۔ اعتراض کی خامیاں ظاہر ہیں کہ معترض اپنے مافی الضمیر کو صاف ادا نہیں کر سکتا۔ کہیں کہتا ہے کہ مضمون کچھ بڑا نہ تھا۔ کہیں بندش سست کہی جاتی ہے۔ کہیں لفظ آگر کی داد دی گئی ہے۔ کہیں ارشاد ہے کہ صرف برمحل نہیں۔ اور جو اعتراضات اس شعر پر وارد ہو سکتے ہیں وہ نہیں کئے

ابر۔ یہ کیا اسرار ہے بیہوش ہو کر ہوش آتا ہے
خودی جب بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں

سروش۔ بہت اچھا شعر ہے اپنی معنویت کے لحاظ سے نہایت گرانقدر ہے۔ مگر دوسرے مصرع میں لفظ جب شرط واقع ہوا ہے۔ اور جزا ندارد۔ مصرع یوں ہونا چاہئے تھا۔ خودی جب بھول جاتے ہیں تو اس کو یاد کرتے ہیں لفظ خودی کی رعایت سے لفظ خدا کے تصرف نے علاوہ عیب مذکور کے نہایت کمزور بھی کر دیا۔

(مولف) دوسرے مصرع میں یقینی حرف شرط موجود ہے اور جزا نہیں ہے مگر میرے خیال میں اس طرح حرف شرط لاکر جزا کے حرف کو حذف کر دینا کوئی عیب نہیں ہے۔

ابر۔ ثواب حج اکبر ان کو گھر بیٹھے ہی ملتا ہے
کسی مسکین و بیکس کے جو دل کو شاد کرتے ہیں

معترض۔ پہلے مصرع میں لفظ (ہی) علاوہ اہل زبان کے ناک بھوں چڑھانے کے صرف برائے موزونیت ہے۔

(مولف) ہی۔ اگرچہ حصر کا کلمہ ہے اور بعض محل پر دوسرے معانی کا بھی اس سے افادہ ہوتا ہے مگر میرے نزدیک یہاں زاید ہے۔ جو صرف زور کلام بڑھا رہا ہے۔ اور وہ زائد جز و کلام میں اضافہ کرے ضروری اور معنی خیز الفاظ سے بھی اچھا ہوتا ہے۔

ابر لکھنوی و مرزا یاس عظیم آبادی

ابر۔ بوند ہی بھر سہی کیوں گر گئی پیمانے سے
سرخی اک کم ہوئی مجھ رند کے افسانے سے

یاس۔ بوند بھر کی بلاغت تعریف سے مستغنی ہے۔ اس خوش مذاقی پر معیار جہاں تک ناز کرے وہ کم ہے رند اس بات پر مچلا ہوا ہے کہ پیمانے سے کیوں گر گئی بوند ہی بھر سہی۔ مگر گری کیوں۔

(مولف) ظاہرا الفاظ شعر اچھے خاصے لکھنؤ کے مذاق کے ہیں۔ مگر غالباً مرزا یاس کے سامنے وہ رکیک اور مبتذل پہلو آگیا ہے۔ جو معناً اس شعر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر صاحب مذاق غور کرنے پر اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اس قسم کے

خیالات جن میں التباس معنوی پیدا ہو جائے ان سے صاحبان ذوق کو بچنا ضروری ہے

ابر۔ زندگی کا مری اک حصہ کچھ ایسا گزرا　　جب خیال آتا ہے خود مجھکو حیا آتی ہے

یاس۔ شاید یہ حصۂ زندگی حرام پورہ میں گزرا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر رنگ ہیپائی میں بالکل لت پت تھا اور اب اسکو اپنے افعال قبیح پر شرم آتی ہے۔

(مولف) واقعی مہمل اور رکیک شعر ہے

ابر۔ سنبھال نت کوئی چکر سا آ رہا ہے مجھے　　کہ دیکھ لی ہے جا کر نظر فزائے بہار

یاس۔ فزا کا قافیہ "ز" کی قید کے ساتھ دیا گیا تھا۔ یعنی فضا با لضاد نہیں نظم کر سکتے تھے فقط جانفزا یا جنوں فزا وغیرہ آ سکتا تھا۔ جناب ابر نے ز کی قید کے ساتھ نظم تو کیا مگر فزا کے وہ معنی لئے جو فضا کے ہیں جناب ابر کے علم و تجربہ کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ فزا بمعنی فضا استعمال کرنا خاص الخاص جناب ابر کا تصرف و اجتہاد ہے۔

(مولف) یقیناً مرزا یاس کا اعتراض صحیح ہے تمام کاملین نے اس حالت کو عیوب قافیہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہ تو بالکل ہی غلط ہے کہ فضا کے معنی فزا سے لئے جائیں۔ اس عیب کا نام اکفا ہے۔

ارشد[۱] تھانوی و شاہ دلگیر اکبر آبادی

---

[۱] جناب ارشد کا نام رشید احمد ہے۔ آپ قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں اب عمر تخمیناً چالیس بیالیس برس کی ہوگی۔ فارسی کی لیاقت بقدر ضرورت ہے عربی سے بالکل ناآشنا ہیں۔ شاعرانہ مشق سخن اچھی ہے اور نظم کے مختلف اصناف پر قادر ہیں نہایت زندہ دل نیک مزاج ملنسار سخن فہم بذلہ سنج ہیں۔ عرصہ سے بسلسلۂ ملازمت بھوپال میں ملازم تھے اب سنا ہے کہ کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ آپ وہاں سے چلے آئے۔ میرے دوست ہیں کبھی کبھی کرم فرماتے ہیں غریب خانہ پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔

شاہ دلگیر صاحب عرصہ تک رسالہ نقاد نہایت حسن و خوبی سے نکالتے رہے مجھ سے بھی سرسری طریقہ پر دو مرتبہ ملاقات ہوئی زیادہ حالات معلوم نہیں

۱۹۱۳ء میں جب ارشد کا مجموعہ نظم موسوم بہ حسن تخیل شائع ہوا تو غالباً ریویو کے لئے وہ رسالہ نقاد کے فاضل اڈیٹر کے پاس گیا جسکو دیکھکر موصوف نے بعض جگہ داد سخن فہمی دی اور بعض جگہ اعتراضات کئے۔ شاہ صاحب نے ارشد صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ "حضرت ارشد فطری شاعر ہیں اور مبدا فیاض نے جوہر شاعری انکی طبیعت میں ودیعت کیا ہے (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶)

ارشد۔ دنیا میں لیکن شہرت کا سہرا — کتنا ہی پیارا ہو اور اچھا

〃 کیسی ہی خوشبو دے وہ زیادہ — جس سے مشام عالم ہو تازہ

〃 آخر ہے اک دن مرجھانے والا — کیا وہ بچے گا فصل خزاں میں

دلگیر۔ ان اشعار کے پہلے۔ تیسرے اور چوتھے مصرع کا وزن زیادہ ہے۔ تقطیع کرنے سے ان تینوں مصرعوں میں (فا) بڑھتا ہے۔ دوسرا پانچواں اور چھٹا مصرع ٹھیک بحر میں ہے۔

(مولف) اعتراض صحیح ہے پہلا مصرع نا موزوں ہے اور اس میں دو حرف (فع) کی زیادتی ہے۔ چوتھے مصرع میں عالم کا لام غائب ہوتا ہے لیکن ظاہرا تیسرا مصرع صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس میں بھی زیادتی ضرور ہے۔

ارشد۔ ننھی ننھی تتلیوں کا جھونے پودوں پہ ہجوم — وہ لپٹنا پھول سے اُڑنا پھر آ کر بیٹھنا

〃 ہو چکا تھوڑی دیر میں خورشید تا نصف النہار — اور بڑے گھنٹے نے ٹن ٹن سے دیئے بارہ بجا

دلگیر۔ لفظ تیتری ہے۔ تتلی غلط ہے۔ دوسرے شعر میں ٹن ٹن سے غلط اور ٹن ٹن صحیح ہے۔

(مولف) میرے نزدیک شاہ صاحب کے دونوں اعتراض غلط ہیں۔ دلی میں تتلی۔ اور تیتری دونوں صورتوں میں بولا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں صرف تتلی کہتے ہیں۔ چنانچہ فرہنگ آصفیہ۔ اور لغات فیروزی۔ نور اللغات سب جگہ یہ لفظ موجود ہے۔ اور تینوں اسپارہ میں متفق الرائے ہیں۔ میرے خیال میں لفظ دراصل تیتری ہی تھا جس کو ثقالت کی وجہ سے تتلی بنا دیا گیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ٹن ٹن سے غلط ہے اور ٹن ٹن صحیح ہے۔ یہ بھی غلط ہے یہ جملہ بھی دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے چنانچہ یہ شعر مشہور ہے۔

کوا کوئی یوں گھر میں ترے وہم کو ہو گا — جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہو گا

یا خوف و ہراس کے وقت کہا جاتا ہے کہ کلیجہ دھک سے ہو گیا

ارشد۔ آہ یہ تو ہے مرے اغاز الفت کا سماں — آہ یہ تو ابتدائے عشق کی ہیں سنریاں

دلگیر۔ سینریاں مع یائے تحتانی ہونا چاہیئے۔ بغیر یائے تحتانی کے غلط ہے۔

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ ارشد صاحب نے یقینی غلطی کی ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۵) وہ واردات دل اور جذبات قلبی کو نظم کرتے ہیں اور اسی لئے انکی ہر نظم کم و بیش دل پذیر ضرور ہوتی ہے مگر فن شاعری کی تکمیل کے لحاظ سے وہ ابھی ایک اچھے استاد کی شاگردی کے ضرور محتاج ہیں۔ کیونکہ انکی اکثر نظموں میں زبان۔ محاورے اور فن کی ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو بغیر کامل الفن استاد کی اصلاح کے دور نہیں ہو سکتیں

ارشد۔ نارسائی مقدرسے مٹا جاتا ہے یہ — آہ شوق جبہ سائے آستان آرزو

دلگیر۔ شوق جبہ سائے بالکل مہمل ہے۔ شوق جبہ سائی آستانِ آرزو ہونا چاہئے۔ اور اس طرح مصرع درست نہیں ہوتا

(مولف) اعتراض غلط ہے۔ شوق کو جبہ سائی کا فاعل سمجھنا اور جبہ سائی کو اس کی صفت ماننا چاہئے معنی میں کوئی خامی نہیں ہے۔ یعنی وہ شوق جو آستانِ آرزو پر جبہ سائی کر رہا ہے دلگیر صاحب اس کو یائے مصدری ماننا چاہتے ہیں یہ ضروری نہیں۔ یوں نہ کہا یوں کہا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہونا چاہئے کہ میرا شوق آستانِ آرزو پر جبہ سائی کر رہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جبہ سائی کا شوق ہے۔ بات ایک ہی ہے مگر یہ میں اب تک نہیں سمجھا کہ شوق اگر آستانِ آرزو پر جبہ سائی نہیں کر رہا تو کیا چیز ہے۔

ارشد۔ اختر قسمت چمک جائے پھر آئیں میرے دن — نور افگن ہو وہی شمس النہار آرزو

دلگیر۔ یہاں پھر آئیں میرے دن خلاف محاورہ کیا گیا ہے۔ اس لئے پھر جائیں میرے دن لکھتے تو صحیح ہوتا۔

(مولف) اگر دن پھر جائیں محاورہ صحیح ہے تو مصدری صورت میں بھی دن پھیر جانا ہونا چاہئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے محاورہ ہے دن پھرنا۔ (لازم) اور دن پھیرنا (متعدی) دن پھرنا بھی دن پھرنے کا مرادف ہے اور صحیح ہے۔ دن پھر جانا دلی اور لکھنو کا محاورہ نہیں ہے اگر کہا ہو تو ہو۔

ارشد۔ یہ جانتا تھا کاتب قسام ازل نے — قسمت میں لکھا ہے مری آرام تمنا

دلگیر۔ یہاں آرام تمنا کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا۔ تمنا کا آرام کیا ہے۔ تمنا تو عاشقوں کے لئے باعث آلام ہے نہ کہ سبب آرام

(مولف) ظاہرا تو مہمل معلوم ہوتا ہے۔ مگر معترض کو سلسلہ کے لئے اور شعر بھی نقل کرنے کی ضرورت تھی صرف اس شعر سے کوئی صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔

ارشد۔ ناشاد و نامراد کی مت پوچھ سرگزشت — افتادۂ فتادۂ دل مت پوچھ سرگزشت

دلگیر۔ یہ شعر نظم "افسردۂ خاموش" کا ہے۔ علاوہ مت کے متروک ہونے کے افتادۂ فتادہ کے معنی سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔

(مولف) مت کا متروک کرنا نہ کرنا تو اختیاری ہے۔ مگر افتادۂ فتادہ غلط ہے۔

ارشد۔ حرف مروت رنگ وفا ہوں — خوگیر تسلیم و رضا ہوں

دلگیر۔ خوگیر کی بجائے خوگر ہوتا تو معناً صحیح ہوتا۔ اس خوگیر کی بھرتی سے مفہومِ شعر غلط ہوگیا۔

ارشد۔ دیں زراعت کو تجارت کو ترقی اتنی — روم سے شام سے ایران سے آئیں آڈر
روشنی بجلی کی او سلسلۂ ٹیلیگراف — کرکے قایم انھیں دکھلادیں ہم اپنا بھی ہنر

دلگیر۔ آڈر۔ اور ٹیلیگراف بالکل غلط لفظ استعمال کئے گئے ہیں جہلا کی زبان منظوم کرنا افسوس ناک ہے۔ آرڈر ٹیلیگراف ہونا چاہئے تھا۔

(مولف) آڈر اگرچہ اصل زبان میں غلط ہے۔ مگر اب ہندوستان میں اس نے ہند کی شان اختیار کرلی ہے یہ کسی صورت سے غلط نہیں ورنہ اس قسم کے ہزاروں الفاظ کو غلط کہنا پڑے گا ٹیلگراف غالباً غلط چھپا ہے۔ ورنہ نظم میں ٹیلی گراف بھی پڑھا جاسکتا ہے

ارشد۔ سوز دل لے ہمہ تن داغ بنا رکھا ہے — ہر نظارہ گیاں سر و چراغاں ہوں میں

دلگیر۔ اول تو نظارہ گیاں میں ہ نہیں ہے نظارگیاں ہونا چاہئے۔ مگر شاید یہ کاتب کی غلطی ہو۔ دوسرے نظارگیا دیکھنے والوں کے معنوں میں غلط ہے۔

(مولف) اگر (ہ) حقیقتاً کاتب کی غلطی ہے تو اعتراض بالکل غلط ہے نظارگی دیکھنے والے کے معنی میں اساتذہ کے یہاں پایا جاتا ہے مرزا غالب کا شعر ہے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن — وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھسے

پھر اگر نظارگی صحیح ہے تو جمع کیوں غلط ہے۔ شاہ صاحب نے کچھ توجہ نہیں فرمائی صرف اعتراض کردیا ہے میں اس کو مفصل عرض کرتا ہوں۔ نظارگی اگرچہ نظر کرنے والے کے معنے میں مشہور ہے۔ مگر شاید یہ نظر کرنے کے معنے میں جو نظارہ مبالغہ کا صیغہ ہے اسکی ہ کو گ سے بدل دیا اور یائے مصدری اس میں لادی اور یہی قاعدہ تمام اسمائے ذوات الہا میں جاری ہے جیسے بندہ اور بندگی۔ زندہ اور زندگی وغیرہ۔ نظارگیاں سے مختلف ہوکر نظارگاں ہوا۔ خاقانی تحفۃ العراقین میں پہلا شعر لکھتا ہے

مائیم نظارگان غمناک — زین حقۂ سبز و مہرۂ خاک

امیر خسرو۔ نظر در یار مشغول است و جاں در بار تن ہا — تو ای نظارگی دانی کہ من نظارۂ دارم

مرزا صائب۔ در دیدۂ نظارگیاں جمال تست — بے نور ہنوز خانۂ بے روزن آئینہ

احسن[۵] مارہروی و صبر رام پوری

احسن ۔ کچھ نہیں شک اس میں کہ سب ہیں مرے خیر خواہ خوف ہے لیکن نہ شاید ہو کوئی الزام خاص

صبر ۔ سب کے سب چہ معنی دارد ۔ سب کافی تھا ۔ سب کے ۔ برائے بیت ہے لفظ نہیں ۔ شک کے بعد ہونا چاہیے اہل زبان کے خلاف ہے ۔ عوام الناس اس طرح بولتے ہیں ۔ اس مصرع کو اس طرح بنا لیا جائے

شک نہیں کچھ اس میں مجھکو سب ہیں میرے خیر خواہ

(مولف) میرے نزدیک اس اعتراض کی بنا صرف ضرورت پر رکھی گئی ہے ورنہ کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے ۔ سب کے سب ۔ سب بولتے ہیں ۔ اور لکھتے ہیں ۔ ڈھونڈھنے پر سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں (نہیں شک) پر جو اعتراض ہے وہ صرف اس لئے کہ ایک تعقیدی صورت پیدا ہوگئی ہے حالانکہ کسی زبردست سے زبردست فصیح کا کلام بھی ایسی معمولی تعقید سے خالی نہیں ہوتا ۔ اصلاح بھی بالکل معمولی دیگئی ہے ۔ اس سے اگر مصرع یوں کہا جاتا کہ ۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہیں سب دل سے میرے خیر خواہ ۔ تو بہت اچھا تھا ۔

احسن ۔ دامان یار کی سی ہوا ہے کہاں نصیب تا کھُو اُڑ کے خاک جائے مری آسمان پر

صبر ۔ اب (کی سی) اور (کا سا) متروک ہیں ۔ پہلے شعرا نے البتہ نظم کیا ہے ۔ خلاف فصاحت ہے اس مصرع اس طرح بنا لینا چاہیئے ۔ دامان یار کی جو ہوا ہے کہاں نصیب

(مولف) میرے نزدیک اعتراض بالکل مہمل ہے ۔ اول تو یہی نہیں معلوم ہوتا کہ (کی سی) اور (کا سا) کے ترک کرنیوالے

---

[۵] احسن کا اسم گرامی علی احسن صاحب ہے ۔ قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے سجادہ نشین بھی ہیں ۔ آپ کے اسلاف نہایت ہی مشہور و معروف تارک الدنیا بزرگ تھے ۔ مرزا غالب کو بھی آپ کے اسلاف سے بہت عقیدت تھی چنانچہ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے بہت سے رقعے اس کے شاہد ہیں ۔ اور اپنا بیشتر وقت زبان و ادب اردو کی خدمت میں گزارتے ہیں ۔ عرصہ تک ایک رسالہ کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں ۔ نہایت نیک زندہ دل منکسر المزاج بزرگ ہیں عرصہ سے بسلسلہ ملازمت علیگڈھ کالج میں مقیم ہیں ۔ مجھ سے ملاقات ہے اور بہت عنایت فرماتے ہیں ۔

جناب صبر رامپوری کو میں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا ہے جبکہ وہ ہاپوڑ کے عظیم الشان مشاعرہ میں تشریف لیگئے تھے گو مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی لیاقت علمی کس پایہ کی ہے ۔ اور مشق سخن کہاں تک ہے ۔ پھر بھی تخلص کبھی کبھی کانوں تک پہونچتا رہا ہے ۔ آپ کا اسم گرامی محمد اسماعیل ہے تخلص صبر منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہیں ۔ جناب صبر او حضرت احسن کے معارضہ کی بنا یہ ہے کہ صبر صاحب نے (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ ہو)

کوان مناکو ارتیا۔ اور کتنے فصحا کے فتوؤں سے یہ طے کیا گیا کہ اب یہ ترکیب نہ بولی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ مومن غالب اور ذوق کی زبان آج تک مستند علیہ ہے کوئی سبب نہیں کہ مومن کے یہاں پوری ایک غزل جس کی ردیف (کا سا) ہے دیوان میں موجود ہے۔ جسکے دو شعر مجھے بھی یاد ہیں ؎

جاؤنگا کبھی جنت میں میں بجاؤں گا   اگر نہ ہوئیگا نقشا تمھاری گھر کا سا
دل اس حسین کو مومن نے دیا یا کہ جو ہے   محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

کی سی۔ کی، ردیف میں میر تقی میر کی ایسا غزل موجود ہے ؎ میں جو بولا کہا کہ یہ آواز۔ اسی خانہ خراب کی سی ہے۔ جو اصلاح دی گئی ہے وہ بھی بالکل غلط ہے ؎ داماں یار کی جو ہوا ہے کہاں نصیب۔ کہنا یوں چاہیئے کہ دامانِ یار کی جو ہوا ہے وہ کہاں نصیب۔ احسن صاحب کا شعر معناً بھی بہت بلیغ تھا۔ اس اصلاح نے معنویت کو خاک میں ملا دیا

احسن۔ سنتے ہی عرض وصل دیا صاف یوں جواب   گویا یہ بات رکھی تھی ان کی زبان پر

صبر۔ اس شعر میں نہ یوں کی خبر نکلی نہ پتہ کی۔ کیا جواب دیا اور زبان پر کیا بات رکھی تھی۔ لہٰذا شعر مہمل ہے۔

(مولف) معلوم ہوتا ہے کہ معترض صاحب نے شعر پر غور ہی نہیں فرمایا۔ ان کو شاید علم نہیں ہے کہ یوں کے معنی اس طرح کے بھی ہیں۔ جیسا کہ غالب کی ایک غزل میں جس کی ردیف (کہ یوں) ہے۔ مطلب شعر بہت صاف ہے۔ یعنی میرے وصل کی التجا پر انھوں نے اس طرح صاف جواب دیدیا جیسے یہ بات انکی زبان پر رکھی تھی۔

احسن۔ محدود دل ہی میں نہیں آہ شرر فشاں   پہنچی ہے اس چراغ کی لو آسمان پر

صبر۔ اس شعر کے مصرع آخر میں بجائے پر کے لفظ تک ہونا چاہیئے۔ یہ مصرع اس طرح ہونا چاہیئے تھا ؎

پہنچی ہے اس چراغ کی لو آسمان تک

(مولف) معلوم ہوتا کہ معترض صاحب زبان سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس جگہ پر۔ تک۔ ہی کے معنی میں ہے۔

احسن   احسن کے جان رسال کا گاہک نہیں کوئی   ہوں گے نثار وہ کسی نامہربان سے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹) احسن صاحب کے بعض محاورات دیکھے اور بر بنائے تحقیقات انپر ایراد کئے۔ جنکا جواب شاد میرٹھی نے دیا۔ اس کے بعد صبر صاحب نے اور اعتراضات کئے اور ایک رسالہ اغلاط احسن کے نام سے ۱۳۲۹ھ میں شایع کرایا تھا اسی اعتراضات انتخاب کرکے لکھے جاتے ہیں۔

صبر- جان بناں کا گاہک نہی ہوتا ہے جو نامہربان ہوتا ہے۔ اور جو مہربان ہوتا ہے وہ ترقی جان وبال جانتا ہے۔

(مولف) اعتراض کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی میرے نزدیک تو شعر کا مطلب صاف صاف ہے کہ کوئی نامہربان بھی ان کو نہیں پوچھتا۔ حالانکہ نامہربان کو انکا گاہک ہونا چاہیے۔

احسن- باقی رہا تھا ایک دم حضرت جلال کا

صبر- اس مصرع میں حاسے حطی تقطیع سے گر گئی ______

احسن- جس کو کہتے ہیں نہیں علمی زباں اردو زباں   کچھ نظر آتا نہیں ہے ان کو وہ ہیں سور داس

صبر- سور داس اندھے کو نہیں کہتے ہیں۔ بہت سے آدمی ایسے ہیں جو اندھے نہیں مگر ان کا نام سور داس ہے۔

جواب میرٹھی- خاص قوم ہنود میں عام دستور ہے کہ جو پابند مذہب شخص اندھا ہو جاتا ہے اسے سورداس کہنے لگتے ہیں۔ خواہ اس کا پہلا نام کچھ ہی کیوں نہو۔ اور اس خطاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایشور بھگت ایسا گزرا ہے جس نے محض اس خیال سے کہ اس کی آنکھیں اچھی چیزوں کی طرف مائل ہو کر دل کو یاد خدا سے معذور کر دیتی تھیں نیز بعض اوقات حسین عورتوں پر طبیعت ڈانواڈول ہو جاتی تھی اپنی آنکھوں کو سوئیوں سے پھوڑ ڈالا تھا اور اسی روز سے اس کا نام سورداس ہو گیا چنانچہ جا بجا سنسکرت و بھاشا میں سورداس کے معنے بھی اندھے ہی کے ہیں۔ ظن غالب ہے کہ جناب صبر کا تجربہ ابھی محدود ہے ورنہ اگر لفظ سورداس کی اصلیت معلوم ہوتی تو وہ ہرگز جناب احسن پر اعتراض کرنے کے لئے قلم نہ اٹھاتے۔

جواب الجواب صبر- اس شعر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت احسن خاص قوم ہنود سے ہمکلام ہیں کہ ہندوؤں کا عام قاعدہ مان لیا جائے۔ خاص قاعدہ ہے کہ جس لفظ کو اصطلاح میں لے لیا جاتا ہے اس کے لغوی معنی سے بحث نہیں کی جاتی ہے۔ عام طور پر بازاری لوگ سورداس یا حافظ جی اندھے کو کہتے ہیں۔ یہ مذاق کے طور پر اصطلاحیں بازاری لوگوں کی ہیں ان سے پرہیز کرنا بہتر ہے اس طرح دہرنا لگنا۔ کرنا۔ کرانا سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ جب خاص قوم ہنود کا ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے تو اور اقوام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور حضرت احسن کل اقوام سے ہمکلام ہیں کوئی اس کی تخصیص نہیں کی ہے۔ مہذب شاعری کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ بھی زبان دہلی کا محاورہ ہے تو پھر زبان دہلی کا کیا اعتبار۔

(مولف) سورداس، اندھے کے معنے میں مستعمل ضرور ہے۔ مگر طبقہ خواص اور شعراء میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کہیں ہو تو بھی وہ قابل سند نہیں۔

احسن- جس طرح ساغر کٹورا قدح پیمانہ گلاس

" اور باقی ہیں تو کیا جھیلا کر دنگی میں یونہی   آج کل جس طرح مجھ پر ہو رہی ہے مار دھاڑ

احسن — اک نجومی نے خبر دی تھی یہ ہم کو چند بار — دن ترے اچھے ہیں لیکن کچھ دنوں کر انتظار

" — اِن دنوں کے واسطے استعمال پر تھا انحصار — یہ اگر سچ ہے تو پھر کیا سوچ کیسی ہیر دار

" — غدر ستاون سے پہلے تھا نہ کچھ مجھکو ہراس

صبر — قدح بسکون دال بمعنی پیالے کے معنی میں استعمال فرمایا ہے محض غلط ہے۔ جو پیالے کے معنی میں ہے وہ بہ تحتین ہے بسکون دال بمعنی شگافتن اور طعنہ زدن آتا ہے ۔ مار دھاڑ کے آخر میں رائے ثقیلہ ہے یعنی (ڑ) رائے مہملہ نہیں جو بہار ہزار کا قافیہ کیا جائے ۔ یہ محض غلط ہے شعراء پر لکھدیا گیا ہے ۔ دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ دیر وار بمعنی تاخیر اہل زبان کے کلام میں کہیں نہیں ۔ اگر ہے تو بازاری محاورہ ہے جو قابل اعتبار نہیں ہے ۔ غدر ستاون درست نہیں سنہ ستاون کا غدر لکھنا چاہئے

(مولف) قدح بمعنی پیالہ بہ تحتین ہے ۔ احسن صاحب نے بہ سکون لکھکر سخت غلطی کی ہے ۔ یہاں صرف یہ کہنے کی گنجائش ضرور ہے کہ محمد بن قیس نے رسالہ المعجم فی اشعار العجم میں سیبویہ سے نقل کیا ہے کہ شعرائے عرب نے مواقع ضرورت اور مواقع اضطرار میں بضرورت شعر اس قسم کا تصرف جائز رکھا ہے جنکو جاراللہ زمخشری نے نظم کر دیا ہے ۔

ضرورت الشعر عشرۃ عدت جلتھا — وصل و قطع و تخفیف و تشدید

وقصر و مد و اسکان و تحریک — منع صرف و صرف منع ثم تدید

یعنی ضرورت شعر کے واسطے اس تصرف جائز ہیں ۔ وصل کر دینا ۔ قطع کر دینا ۔ تخفیف کر دینا ۔ مشدد کر دینا قصر کرنا ۔ مد کرنا ۔ ساکن کرنا ۔ حرکت لگا دینا ۔ منع صرف ۔ اور صرف منع ابطال الضرورت میں منشی ٹیک چند بہار نے تصرفات کی تین قسمیں لکھی ہیں ۔ تصرف لفظی ۔ تصرف معنوی ۔ تصرف لفظی و معنوی معاً ۔ اور تصرف لفظی کی بھی گیارہ قسمیں لکھی ہیں ۔ چار تحت تصرف باعراب اور سات تحت تصرف بحروف ۔ تصرف باعراب ۔ اسکان تحریک ۔ تشدید تخفیف ۔ طالب آملی نے کفن بر وزن قدح کو بہ سکون فا استعمال کیا ہے ۔

چوں شدش کار کفن و دفن بہ ساز — خلق گشتند از مزارش باز

کمال اسمعیل نے عرق بہ سکون را کو بتحریک را استعمال کیا ہے ۔

تو ہی کہ چشمۂ خورشید بارہا گشتہ است — ز شرم خاطر پاکت غرق میان عرق

خان آرزو نے داد سخن میں اس قسم کے تصرفات کی اہل قدرت کے لئے اجازت دی ہے ۔ یہ اور اس قسم کے اور بھی اقوال پائے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم دوسری زبانوں میں کوئی تصرف نہیں کر سکتے مگر انھیں الفاظ میں جنھیں کہ اساتذہ نے تصرف کیا ہے ۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ تصرف شدہ لفظ اساتذہ کا لوگوں کی زبان پر اسی طرح سے ہو ۔ ورنہ پھر استادوں کا تصرف بھی مقبول نہیں ہے ۔ یا یہ تصرف اس طرح جائز ہے کہ تصرف کی طرف اشارہ کر دیا جائے ۔ قدح کو عموماً بہ تحتین استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس لئے اسمیں تصرف جائز نہیں ۔

دوسرے اعتراض "آمد ھار" کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ اسکو بہار ہزار وغیرہ کے ساتھ قافیہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ متقدمین نے اسکو عیوب قافیہ میں شمار کرکے ناجائز کے قریب سمجھا ہے۔ اور اس کا نام اکفا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ عیب متقدمین کے کلام میں پایا جاتا ہے مگر عیب ہر حالت میں عیب ہے مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

عبرت۔	نہیں کوئی محل ہیں اس بت قزاق	بغیر از غمزۂ چشم ستم ناک
رنگین	سن کے یہ بات زاہد مے کش	بولا تم سب ہو پائے بند ہوس
میر سوز	کیا مجھے دے گا تراحاکم ملعون خبیث	کچھ تردد نہیں کہدے کہ لکھیں پرچہ نویس
مصحفی	دل چاہے پھر لینے کو بوسہ ترے لب کا	کیا کیجئے بے طرح پڑا اب تو یہ چسکا
عشرت	سو اس کی رائے پر وہ رائے چھوڑ	غرض اب مستعد بیٹھا ہے ہر طور
نگار	زمیں تک سر سے جو سر سے کا لڑا تھا	خدا کے نور کا وہ اک شجر تھا
سودا	ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار	رہے دو دو انت آگے سو ہیں اژدر
"	الغرض اس طرح سے کشتی لڑا	ڈال ٹیکا گلے کا پاؤں پر
حسن	اسیطرح مدت گئی جب اسے	چڑھی عشق کی گرمی تب اسے

احسن[1] سمبھی و سلیم کانپوری

لہ احسن صاحب قصبہ سمبھی ضلع اعظمگڈھ کے رہنے والے تھے۔ تقریباً ۴۵ - ۴۶ سال کی عمر تھی۔ کہ انتقال ہوا۔ آپ کا قیام زیادہ تر کانپور میں رہتا تھا۔ ایک عرصہ تک رسالہ زمانہ کے اڈیٹر بھی رہے۔ شاعر نہایت پختہ کلام تھے مگر طبیعت نہایت ہی خود پسند پائی تھی۔ کبھی کسی کے شعر کی تعریف نہ کرتے تھے بلکہ بجائے اس کے جا و بیجا تنقیدیں اور تبصرہ کیا کرتے تھے مجھ سے بہت ہی ایک سرسری سی ملاقات تھی۔

سلیم۔ کانپور کے رہنے والے ہیں۔ نوجوان ہیں۔ فقیر احمد نام ہے۔ فارسی ضرورت زمانہ کی موافق جانتے ہیں اور شاید کچھ مشرقی امتحانات بھی پاس کئے ہیں جس سے کہ اب کسی اسکول میں اردو یا فارسی پڑھانے پر مامور ہیں منکسر المزاج۔ ملنسار ہیں۔

نومبر ۱۹۲۵ء میں اناؤ میں رواں صاحب کی کوششوں سے ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ جس پر احسن صاحب نے مشاعرہ کے بعد کچھ خامہ فرسائی کی تھی اور وہ رسالہ زمانہ کانپور میں چھپی تھی۔ اوسی میں سلیم کے استاد بھائی مضطر کے کئی شعر پر بھی نکتہ چینی کی گئی تھی جس سے متاثر ہوکر جناب سلیم نے احسن پر کچھ اعتراض فرمائے تھے۔ اور جولائی ۱۹۲۶ء کے رسالہ لطریچر میں شائع ہوئے تھے۔

احسن۔ [illegible] جعفر علی خاں یارب   بزم معنی میں چھلکتا ہی رہے جام اثر

سلیم۔ یہ شعر ایک نظم [illegible] رسالہ زمانہ ماہ فروری ۱۹۲۳ء میں چھپا ہے۔ شعر کی بندش اور روانی کا تو ذکر ہی کیا مصرع اولیٰ میں تقطیع سے [illegible]

مولف۔ اعتراض بالکل [illegible] خود حضرت معترض نے جو میں کو مونث قرار دیا ہے یہ بھی بہت عجیب و غریب بات ہے

احسن۔ [illegible] کتنی [illegible]   [illegible] پردہ میں آخر زمزمہ [illegible]

سلیم۔ [illegible] دلکشی زیادہ [illegible] پسندی [illegible] مگر افسوس کہ آپ [illegible] کمزوریوں کی وجہ سے بیان [illegible] دلکشی [illegible] بندش میں قدر سست اور ڈھیلی ہے کہ مطلع کسی نو مشق کا شعر معلوم ہوتا ہے لفظی رعایتوں [illegible] کوئی خوبی نہیں۔

[illegible] اعتراض بالکل [illegible] معلوم [illegible] فرق [illegible] جو اس [illegible] زمانہ [illegible] اگر [illegible] معترض کا ذوق سلیم اس کو زیادہ پسند کرتا ہے تو [illegible] دلکشی [illegible] اعتراض [illegible] معترض کو بدنام کرنا [illegible] معنی نہیں رکھتے۔ [illegible] وہ بھی اس شعر میں نہیں ہیں جو قابل [illegible] اور یوں تو تمام اہل لکھنؤ کے لیے [illegible] کوئی نئی بات نہیں۔

اصغرؔ[1] و اثر

اصغر۔ اگر خوش [illegible] ہوں میں تو تو ہی ہے سب کچھ   جو کچھ کہا [illegible] ہو گیا محدود

اثر۔ دوسرے مصرع کی ترکیب غلط ہے۔ لفظ کہ کے قبل جو کچھ کہا کے بجائے "کچھ کہا نہیں" چاہئے تھا کچھ کہا [illegible]

---

[1] جناب اصغر گونڈہ کے رہنے والے ہیں اور موجودہ زمانے کے مایہ ناز شاعر مانے جاتے ہیں اُن کی شاعری میں حقایق و معارف کی چاشنی بہت زیادہ ہے۔ ایک بہت مختصر سا دیوان موسوم بہ نشاط روح شایع ہو چکا ہے۔

جناب مرزا جعفر علی خاں اثر ڈپٹی کلکٹر نے اصغر صاحب کے اکثر اشعار کی فیاضانہ داد دی جو مارچ ۱۹۲۶ء کے [illegible] مرقع میں شائع ہوئی۔ مگر اس کے ساتھ ہی کچھ عیوب بھی نظر آئے جنکو بربنائے حق گوئی آپنے چھپانا مناسب نہ سمجھا [illegible] مئی ۱۹۲۶ء کے رسالہ مرقع میں نشاط روح [illegible] کا دوسرا رُخ کے عنوان سے شایع ہوا۔ اس کا جواب کسی صاحب نے لکھا [illegible]

[illegible] ہو گیا۔ اگر مصرع اس طرح نظم ہونا مشکل تھا۔ دوسری صورت یہ بھی نہ بجائے "کہ" "سے" [illegible] لایا جاتا۔ سے [illegible] پوچھ رہا تو [illegible] نہ ہو [illegible] مگر یہ تو اب [illegible] "ترا" سے ٹکرا تا نہ پیدا کرنا۔ نہ پہلے مصرع میں بھی وجود ہے [illegible] کا ترک۔ یہی [illegible] صورت یہ بھی کہ تھا کہ نکالا مصرع کا زور [illegible] سے قائم رکھا جاتا۔ [illegible] ممکن تھا [illegible] اثر [illegible] مصرع [illegible] ترکیب پر غور کیجیے۔ زبان کا عیب [illegible] گیا۔ الفاظ [illegible] ایسی جگہ واقع ہوا ہے۔ اس کے بعد [illegible] لازم ہے۔ جس سے حسن کے محدود ہو جانے کی [illegible] کے ذریعہ [illegible] بھی پڑ جاتی ہے۔

[illegible] بلند ہے۔ اگر واقعاً دوسرے مصرع کی بندش [illegible] اثر صاحب نے جو اصلاح دی ہے [illegible] نقص ہے۔ اگر مصرع کو [illegible] جائے تو [illegible] ہو [illegible] تو پھر [illegible] کیا

[illegible] ہے انہیں اشعار کیوں مت کہئے   [illegible] پارہ ہائے خونِ آلود

[illegible] چیخ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں [illegible] خاص سلیقہ برتا جا دے شعر [illegible] [illegible] ہوتی مگر [illegible] پارہ ہائے جگر سوسو [illegible] تماشا ہو مگر جدت پسندی تڑپنے پر اچھل کود [illegible] علاقہ [illegible] تڑپ رہے ہیں جگر پارہ ہائے خوں آلود میں جبر اس کے کہ وہ [illegible] [illegible] میں ہے [illegible] کیا کچھ [illegible] ہے۔

[illegible] کچھ اصلاح فرمائی ہے ہر چند کہ وہ شاعر کے معانی [illegible] ادا کرنے سے قاصر ہے مگر [illegible] ہے اور [illegible] بھی ہے [illegible] کا مفہوم تھا کہ میرے اشعار کو میرے اشعار نہ سمجھئے بلکہ وہ جگر کے خون آلود [illegible] اچھل اچھل کر لب تک آ رہے ہیں۔ تڑپ اس جگہ وہ معنی پیدا کرنے سے مجبور ہے۔ تڑپنے میں [illegible] [illegible] قطع نہیں ہو سکتی جو اچھلنے سے ہو سکتی ہے۔ پھر بھی (تڑپ رہے ہیں) بُرا نہیں ہے۔

نہ میرے ذوقِ طلب کو ہے مدعا سے غرض   نہ گام شوق کو پروا ہے منزلِ مقصود

طلب کسی چیز کی ہوتی ہے یہ ممکن نہیں کہ طلب ہو اور مدعا نہ ہو۔ البتہ یہ امکان ہے کہ غرض مدعا سے مطلب نہ ہو۔ غالباً [illegible] میں تھا مگر مناسب الفاظ نہ ملنے سے خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔ دوسرے مصرع میں لفظ گام بھرتی کا ہے [illegible] رعایت سے لایا گیا۔ گام کو پروا ہونا یا نہ ہونا ایک بے معنی سی بات ہے۔ گام کے ساتھ (نہ) کا ادغام کا [illegible]

---

(۴) [illegible] کا جو [illegible] اثر صاحب نے تحریر فرمایا مگر [illegible] کی وجہ سے ان سب سے قطع نظر کر کے چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا

کو ناگوار ہے۔ یہی مضمون یوں نظم ہو سکتا تھا ؎ نہ میرے شوق کو ہے عرض مدعا سے غرض۔ نہ میرے ذوق کو پروائے منزل مقصود

(مولف) میرے نزدیک اصغر صاحب کا خیال یہ ہے کہ میرے دل میں ایک ذوق طلب ہے اور وارفتگی عشق ہے۔ لہذا کچھ مانگ رہا ہوں مگر نہیں معلوم کیا۔ وہ اصل مقصد و مدعا کیا ہے۔ اسی طرح میرا گام جادہ فرسائی کر رہا ہے مگر نہ معلوم کیوں اس لئے کہ منزل مقصود کی مجھے پروا نہیں ہے۔ بہت صاف اور بہت بلند خیال ہے جو جناب اثر کی اصلاح سے اس درجہ پر نہیں رہا جس پر یہی اصلی حالت میں تھا۔ رہا یہ کہ ذوق طلب بغیر کسی مدعا کے ممکن نہیں۔ یہ منطق ارسطو اور منطق شاعر کا فرق ہے دیکھئے غالب ایک جگہ کہتا ہے۔

بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

کوئی پوچھے اس کہنے والے سے کہ جب کوئی وعدہ ہی نہ تھا تو تو نے انتظار کس چیز کا کیا تھا۔

اصغر۔ چلوں میں جان حزیں کو نثار کر ڈالوں — نہ دیں جو اہل شریعت جبیں کو اذن سجود

اثر۔ چلوں بالکل بے جوڑ ہے۔ اور یہی حال جبیں کا ہے۔ اہل شریعت مجھے اذن سجود نہ دیں گے یا جبیں کو نہ دیں گے۔

(مولف) شعر بہ ظاہر اچھا خاصا ہے۔ —— مگر اعتراض بھی نادرست نہیں ہیں

اصغر۔ ذرا خبر نہ رہی عقل و ہوش دانیاں کی — یہ شعر پڑھ کے وہیں ڈالدی جبین سجود

اثر۔ جبیں ڈالنا اردو نہیں دوسرا مصرع یوں ہو سکتا تھا ؎ یہ شعر پڑھ کے جھکادی وہیں جبین سجود

(مولف) میرا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ اصغر صاحب نے ڈالدی جبین از راہ انکسار کہا ہے۔ مگر انکسار ہو یا افتخار ہو جب شعر کو غلط بنا دے اُس سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔

اصغر۔ یہ ڈر ہے ہر بُن مُو اب لہو نہ دے نکلے — کچھ ایسے زور پہ ہے آج کاوشِ جگری

اثر۔ "لہو نہ دے نکلے" غیر فصیح۔ لہو نہ دیدے۔ بولتے ہیں۔ پہلا مصرع یوں درست ہو سکتا تھا۔ یقین ہے بُن مو سے مرے لہو ٹپکے۔

(مولف) اعتراض صرف اس بنا پر ہے کہ جناب اثر لکھنؤ کی زبان کو مستند علیہ ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ اگر آپ نے لکھنؤ میں نہیں سنا تو وہ غلط ہو گیا۔ وہ محاورات جو ملک کی آبادی کے زیادہ حصہ میں رائج ہیں مگر لکھنؤ یا دلی میں نہیں ہیں ہرگز قابل ترک نہیں۔ اول تو دلی اور لکھنؤ کو خود کثرت کا اتباع کرنا چاہئے۔ اور اگر ایسا نہ کریں تو غلط نہ کہنا چاہئے آج زبان کی مرکزیت اہل جگہ کے لحاظ سے نہ ہونا چاہئے بلکہ من حیث الافراد ہو۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے۔ ؎

یہ ڈر ہے ہر بُن مو اب لہو نہ دے جائے۔

اصغر۔ فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

اثر۔ کسی چیز کی خو ہوتی ہے نہ یہ کہ آدمی کسی چیز کو خو کرتا ہے۔

(مولف) اعتراض اگر صحیح بھی ہو تب بھی شعر اپنی جگہ پایۂ ناز ہے۔

اصغر۔ زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

اثر۔ لفظ "مرا" کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ غیر فصیح ہونے کے علاوہ وسعت معنی میں مخل انداز ہے۔ ایک لفظ بدل دینے سے معنی میں اتنا تنوع پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ صورت میں جو مفہوم ہے وہ ایک کونے میں آجاتا ہے۔ شعر کو یوں پڑھیے

زاہد نے ابھی حاصل ایماں نہیں دیکھا رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

(مولف) اصغر صاحب نے مرا سے پورے مفہوم کو مقید کر دیا تھا جو اس اصلاح سے آزاد ہو گیا۔ یہ اصلاح یقینی قابل داد ہے

اصغر۔ ہم خستگان راہ کو راحت کہاں نصیب آواز کان میں ابھی بانگ درا کی ہے

اثر۔ آواز بھی۔ اور بانگ بھی۔ ایک یقیناً بے ہنگام ہے۔ حافظ نے بھی آواز اور بانگ نہیں ملایا ع اینقدر ہست کہ آواز درا می آید۔

(مولف) اعتراض صحیح۔ حضرت اصغر کو سہو ہوا۔ اگرچہ کہنے کو تو صائب نے یہ بھی کہا ہے ع

مرد چوں پیر شود حرص جواں میگردد خواب سنگ وقت سحرگاہ گراں میگردد

وقت بھی ہے۔ سحر بھی ہے۔ گاہ بھی ہے۔ مگر صائب اہل زبان تھا۔ اس کو کون کہے۔ اور کیا کہیے حافظ کا شعر جو اثر صاحب نے پیش کیا ہے اس کا مصرع ثانی شاید یوں ہے۔ ع اینقدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اصغر۔ دوڑتے پھرتے تھے جلوے انکی موج نور میں دور سے ہم راز شمع انجمن دیکھا کیے

اثر۔ جلووں کا دوڑنا کسی طرح اُن کے وقار و تمکنت کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ بریں دوڑتے پھرنے میں تغیر سمت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ شمع کی لو یا موج کی روانی اس کی منافی ہے۔ شعر میں یہ معنوی سقم ہے

(مولف) معنوی سقم کے علاوہ اس میں۔ راز شمع انجمن بالکل بے معنی سا ہے۔ راز دیکھا کیے اس میں شمع کے ساتھ انجمن

بھی بالکل بے جوڑ اور بے ضرورت رکھا گیا ہے۔

صغر۔ حسن کو یوں کون دیکھ سکتا تھا عریاں دیکھ کر ۔۔۔ کچھ غنیمت ہو گئے یہ پردہ ہائے آب و رنگ

اثر۔ کہنے والا اپنے نزدیک عرش کے تارے توڑ لایا۔ بدقسمتی سے ایک نہایت رکیک مضمون بھی شعر سے پیدا ہوتا ہے تشبیہ میرے امکان سے باہر ہے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔

(مولف) جتنا میاں متین۔ یہ بدقسمتی ہے اوسیقدر رکیک پہلو پیدا ہوتے ہیں اعتراض بالکل صحیح اور درست ہے حسن کو یوں کون دیکھ سکتا تھا عریاں دیکھ کر بہت مضحک پہلو پیدا کر رہا ہے۔

صغر۔ زبان بے نگہ رکھدی نگاہ بے زباں رکھدی ۔۔۔ ترے جلووں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھدی

اثر۔ دونوں ردیفیں غلط ہیں۔ نہ ہمت رکھی جاتی ہے نہ نگاہ۔ زبان رکھدی پر وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو تبصرہ میں امیر مینائی مرحوم کے اس مطلع پر کیا گیا ہے

هم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھدیا ۔۔۔ پھر کلیجا رکھدیا دل رکھدیا سر رکھدیا

جیسے (زبان) کی کمی تھی پوری ہو گئی۔

(مولف) میرے نزدیک اس شعر پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ شاعر رکھنے کو زبان یا نگاہ کے ساتھ محاورہ بنا کر نہیں پیش کرتا۔ بلکہ اس کا منشا یہ ہے۔ میرے شرح و بیان کی ہمت جو کچھ تھی وہ بیکار ثابت ہوئی اور مجبوراً میں نے سپر ڈالدی۔ ہمت اور نگاہ بے زبان اور زبان بے نگہ اُس کے سامنے پھینک دیں جسکا مطلب یہ تھا کہ یہ سب بیکار ہیں یہ شعر ہندی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے جس کا دوسرا مصرع مجھے یاد ہے کہ گرہ انین نین بن بانی۔ یعنی اے خدا میں تیری تعریف کیونکر بیان کروں۔ کیونکہ میری آنکھیں جنھوں نے تیرا جلوہ دیکھا ہے ان کے پاس زبان نہیں وہ اسکا آنکھو دیکھا بیان نہیں کر سکتی ہیں۔ اور زبان جو بیان کرنے پر مستعد ہے اس کے پاس آنکھیں نہیں کہ کما حقہ بیان کر سکے لہٰذا یہ دونوں بیکار ہیں۔ اسی طرح اس شعر کا دوسرا مصرع ہے کہ زبان بے نگاہ تھی۔ اور نگاہ بے زبان تھی لہٰذا شرح و بیان کی ہمت قطعاً بیکار ہو گئی۔ جو مطلع مثال میں پیش کیا گیا ہے جہاں تک مجھے یاد ہے وہ داغ کا مطلع ہے رکیک خیال والوں نے اسپر اعتراضات کئے ورنہ در اصل مطلع جواب نہیں رکھتا۔

صغر۔ ہائے وہ دن گزر گئے جوشش اضطراب کے ۔۔۔ نیند قفس میں آ گئی اب غم بال و پر کہاں

اثر۔ نیند ایک عارضی کیفیت ہے۔ جو قاطع غم نہیں ہو سکتی۔ لفظ غم سے اس کا تقابل بھی نہیں۔ نہ قفس والوں کو نیند آتی

شوکت علی کا نکاح اور عبدالماجد کی طلاق

دونوں کو اسلامی تعلیم سے تعلق نہیں ہے

شوکت علی صاحب نے اٹھاون سال کی عمر میں ایک انگریز لڑکی سے شادی کی ہے جس کا تمام ہندوستان میں چرچا ہو رہا ہے مجھے اُن کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر اس بات پر اعتراض ہے کہ وہ اپنے نفسانی شوق کو اسلامی تعلیم سے منسوب کر رہے ہیں اُنھوں نے نہایت بے حیائی سے اخباروں میں شائع کرایا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی میری طرح بڑھاپے میں شادی کی تھی اور اسلام کہتا ہے کہ جنت عورت کے قدموں کے نیچے ہے۔ مگر شوکت علی صاحب کی یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور اسلام سے ناواقف اور بے بہرہ ہونے کی علامت ہیں اسلام کی تعلیم میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ جنت عورت کے قدموں کے نیچے ہے بلکہ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ الجنة تحت ظلال السیوف۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ رسول اللہ نے اپنے نفس کی خواہش کے لئے بڑھاپے میں شادیاں کی تھیں کیونکہ حضرت نے عرب کے مختلف قبائل کی خانہ جنگی کو روکنے اور ان کو متحد کرنے کے لئے پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ برس کی چند بڑھیا عورتوں سے نکاح کئے تھے تاکہ وہ سب قبیلے رسول اللہ کی قرابتداری کی وجہ سے ایک دل ہو جائیں شوکت علی صاحب نے جو بیانات شائع کئے ہیں ان کی وجہ سے اسلام بدنام ہوگا اور رسول اللہ کی غیر قوموں کی نظروں میں تحقیر ہوگی اس واسطے ہر مسلمان کو شوکت علی صاحب کے بیانات کی جو ان میں شیطنت اور شرارت اور گستاخی بھری ہوئی ہے علی الاعلان تردید کرنی چاہئے خصوصاً اس بات کی کہ میری طرح رسول اللہ نے بھی بڑھاپے میں شادی کی تھی۔

اسی طرح عبدالماجد صاحب بی اے، اڈیٹر اخبار "سچ" نے بھی اپنے ایک نفسانی فعل کو اسلامی تعلیم سے منسوب کر کے اسلام کا [illegible] بڑا جرم کیا ہے۔ وہ [illegible] کرتے ہیں کہ [illegible] اسلام سے [illegible] بیوی [illegible] بچے بھی [illegible] کو دوسری شادی کی کچھ بھی ضرورت نہ تھی مگر انھوں نے [illegible] نکاح کیا اور [illegible] بیٹے [illegible] گھر میں [illegible] بغیر کسی معقول وجہ کے لڑکی کو طلاق دے دی [illegible] اور اب وہ [illegible] اپنی ایڑیاں رگڑ رہی ہے اور اس نے ایک دردناک [illegible] کے ذریعہ اپنی مظلومیت [illegible] قوم سے فریاد کی ہے مگر عبدالماجد صاحب جواب دیتے ہیں کہ طلاق دینا تو اسلامی تعلیم ہے۔ میں نے [illegible] کوئی ناجائز کام نہیں کیا۔

عبد الماجد صاحب جھوٹ بولتے ہیں اگرچہ وہ "سچ" اخبار کے اڈیٹر ہیں کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ جب چاہا بے وجہ اور بے قصور بیوی کو طلاق دیدی رسول اللہ کی سنت میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے یعنی حضور کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کسی بیوی کو طلاق دیدی ہو۔ بلکہ حضرت نے طلاق کو سب سے بڑا فعل فرمایا ہے۔ شوکت علی صاحب اور عبد الماجد صاحب نے اسلامی تعلیم کے غلط حوالے دیکر غیر مسلم قوموں کے سامنے اسلام کو ذلیل اور رسوا کرنے کی دانستہ شرارت کی ہے اور تمام مسلمان قوم کو حق ہو گیا ہے کہ ان دونوں سے باز پرس کیجائے اور سختی سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ دونوں اپنے قول سے توبہ کریں جو انھوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے شائع کیا ہے اور صفائی سے اقرار کریں کہ اسلام کو ان کے اس فعل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے نفس کی غلامی کی وجہ سے کیا۔

مسلمان اخباروں سے درخواست

میں ہندوستان کی اسلامی انجمنوں اور اسلامی اخباروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ذاتی تعلقات سے بے پرواہ ہو کر اسلام کی آبرو کے لئے ہر جگہ اعلان کر دیں کہ شوکت علی صاحب اور عبد الماجد صاحب کے افعال ذاتی ہیں اسلامی تعلیم کو ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور شوکت علی صاحب نے رسول اللہ کی ذات مقدس سے آپ کو تشبیہ دیکر اتنی بڑی گستاخی کی ہے جس کو کوئی مسلمان معاف نہیں کریگا اور عبد الماجد صاحب نے ایک بے گناہ معصوم پردہ نشین بے زبان لڑکی کو بے وجہ طلاق دیکر اور یہ کہکر کہ طلاق دینا اسلام کی تعلیم ہے علما اور اسلامی رہنماؤں پر ایک بڑی ذمہ داری عاید کر دی ہے اور مذہب سے ناواقف مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی تعلیم کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونیکا سامان کر دیا ہے اور تمام ہندوستان میں اس واقعہ سے ایک بےچینی پیدا ہو گئی ہے لہذا اسلامی انجمنوں اور اسلامی اخباروں کو فوراً اعلان کرنا چاہیئے کہ اسلام عورتوں پر ظلم کرنے والا مذہب نہیں ہے اور نفسانی اور ذاتی افعال کو اسلام سے منسوب کرنا انتہا درجہ کی شیطنت اور شرارت ہے۔

میں اپنے احباب اور اخوان طریقت اور سب مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہ اعلان پڑھتے ہی جمعہ کے دن مسجدوں میں جلسے کر کے شوکت علی صاحب اور عبد الماجد صاحب کے بیانات سے بیزاری کا اظہار کریں اور صفائی سے کہدیں کہ یہ ان دونو کا ذاتی فعل ہے اسلامی تعلیم کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تاکہ اسلام غیر مسلم قوموں کی نظر میں ذلیل و رسوا نہ ہو۔ اسلامی اخبارات سے یہ بھی درخواست ہے کہ وہ میرے اس اعلان کو شایع کر دیں تاکہ جس طرح شوکت علی صاحب اور عبد الماجد صاحب کے بیانات سب جگہ شائع ہوئے ہیں اسی طرح انکی تردید بھی ہر نظر سے گزر جائے۔ ضرورت ہے کہ جمعہ کے دن نماز سے پہلے یا نماز کے بعد یہ اعلان مسجدوں میں سنا دیا جائے۔ راقم حسن نظامی دہلوی ۲۶؍ اپریل ۱۹۳۲ء

(نگار) جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ اعلان تمام اکناف ہند میں مشتہر کیا ہے جو بہت توجہ کا مستحق ہے بظاہر نکاح و طلاق کا معاملہ ایسا اہم نہیں معلوم ہوتا لیکن اس مخصوص طلاق و نکاح میں بہت سے فتنے پوشیدہ ہیں۔ ہم آئندہ منفصل طور پر بتائینگے کہ عبد الماجد صاحب کا اپنے ایک نہایت گہرے دوست کی بیوہ کو صرف چند دن کے بعد بلا کسی سبب کے چھوڑ دینا اور اسپر استشہاد اسوۂ رسول اللہ کو پیش کرنا، مہر کی ادائی سے قبل ہی بالکل ناجائز طور پر رسید طلب کرنا اور متعدد بار اپنے اختلاف بیانی کر حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ حقیقتاً کس نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

جلد ۲۱ | فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۳۲ء | شمارہ ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۱	مئی سنہ ۳۲ء	شمارہ ۵

ملاحظات

اگر کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا ارتکاب نہایت بیباکی و دلیری سے کرتا ہے تو ایسے موقع پر ضرب المثل کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ

چہ دلاور ست دزدی کہ بکف چراغ دارد

یقیناً یہ ایک مضبوط کیرکٹر ہے گو معیوب سہی اور "احتساب وقضا" کے عالم میں خواہ وہ کتنی ہی سخت تعزیر کا مستوجب کیوں نہ ہو لیکن اقدام وجرارت کی فضا میں یہ سیرت انسان کو کسی دن ہنی بال و نپولین بنا دیتی ہے۔ مگر اسی "بغاوت و عصیان" کی دنیا میں ایک کیرکٹر اور بھی نظر آتا ہے جو "بے نقاب" ہو جانے کے بعد نہ اپنے مکروہ اعمال پر منفعل ہوتا ہے اور نہ ان کے ارتکاب کو جائز قرار دیتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے نہایت ہی ذلیل قسم کا جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ رکیک سخیف تاویلیں شروع کر دیتا ہے تاکہ اس کا جرم دوسرے پر عاید ہو جائے اور وہ اپنے معیوب خط وخال پر تقدس وطہارت کا پردہ ڈال کر پھر اپنی ساکھ کو قائم رکھ سکے۔ اس کا صحیح نام مکر و فریب ہے، دھوکا ہے، ریا ہے۔ اس کی مثالیں آپ کو نہ قمار خانوں میں ملیں گی نہ بادہ خواروں میں بلکہ بعض خانقاہوں کے زاویوں میں ملینگی

زاہدوں کی بعض اعتکاف گاہوں میں نظر آئیں گی اور اُن "مسیحین وصلیین" کے حلقہ میں نظر آئیں گی جنکی راہبانہ قمیص پنڈلیوں تک پہونچی ہوئی ہے اور جنکی پیشانیاں "سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود" کی سب سے نمایاں علمبردار ہیں۔

جہاں تک کسی شخص کی صورت اور اس کے خط وخال کا سوال ہے، کوئی گفتگو کرنا فضول ہے، کیونکہ اس کا تعلق علم قیافہ سے ہے اور ہو سکتا ہے کہ محض چہروں کی ویرانی وسوگواری ہی "مہبط انوار الٰہی" قرار دیجائے، لیکن جس حد تک ایک انسان کے وضع وقطع اور اس کے اعمال ومراسم کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے یہاں بعض ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں کہ اگر کبھی "زہد وورع" "طاعت وعبادت"، اتقاء وپرہیزگاری کا کوئی مجسمہ بنایا جانے والا ہو تو ان سے بہتر ماڈل (Models) میسر نہیں آ سکتا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں اس فن کی طرف لوگوں کو توجہ نہ ہو اور فطرت کے یہ عجیب وغریب "نمونے" یونہی بیکار پڑے رہیں۔

ملک کے ایک مشہور بزرگ عبدالماجد دریابادی ہیں ——— نبی آخر الزماں کی برگزیدہ ہستی کے متعلق اپنی کتاب فلسفۂ اجتماع میں فرماتے ہیں :—

(۱) دیکھو کہ ان کا ساہمہ تن مذہب شخص اپنی سطوت کے بقاء وتحفظ کے لیے ناگزیر انہ کیا کیا وسائل اختیار کرتا ہے ———

(۲) سرزمین حجاز میں ایک یتیم بچہ پیدا ہوتا ہے جسے مکتب کی معمولی تعلیم تک نصیب نہیں ہوئی ———

(۳) جس نے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ کو دنیا سے اس کی رسالت تسلیم کرانے اور قائدین عظام کی صف میں اُسے اس قدر ممتاز جگہ دینے میں اس کی تمام خصوصیات سے زیادہ مدد دی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوتا ہے :—

(۱) بیت اللحم میں ایک مجہول النسب بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی والدہ کی عصمت کو اہل وطن مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں

انبیاء عظام اور ظالم وجابر بادشاہوں کو ایک ہی صف میں جگہ دیتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں :—

۱- محمد، مسیح، بودھ، سکندر، سیزر، نپولین ..... وغیرہ صرف گنتی کے چند اشخاص اب تک دنیا میں ایسے پیدا ہوئے ہیں جو اول درجہ کے قائدین کے لقب کے مصداق ہو سکتے ہیں

لیکن دنیا انبیاء اکرام کے حضور میں ان تمام گستاخیوں، دریدہ دہنیوں، اور توہین واستہزا کو دیکھتی ہے، سنتی ہے اور گزر جاتی ہے، کیونکہ اب سے چند سال قبل پروپاگنڈا کے وہ اصول مرتب نہ ہوئے تھے جو اس وقت پائے جاتے ہیں ———

اس کے بعد ہی بزرگ ایک صوفی کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ ڈھول بج رہا ہے، قوالی ہو رہی ہے، تالیاں بج رہی ہیں کیفیت طاری ہے، آنکھ ناک جاری ہے ــــــ شریعت حقۂ اسلامیہ کے علمبردار اس لہو و لعب کو بھی دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے، کیونکہ ان کو ابھار کر کام لینے کا فن اُس وقت تک پوری طرح مدوّن نہ ہوا تھا۔

چند دن کے بعد ہی حضرت، قومیات کے ناخدا اور سیاسیات کے خدا بنکر، منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں جلسوں میں وہی قائدین سیاست کی سی سرگوشیاں، خطبہ و مقالات میں وہی اشتعال انگیز گرموشیاں، کسی سے ملیں تو صد درجہ شرمساری کا اظہار، گفتگو کریں تو ہر ہر طریق سے نمائش انکسار ــــ لیکن یہ راہ پر خطر تھی "معاملہ" دار و رسن "کا تھا، علاوہ بریں یہ بھی اندیشہ تھا کہ حیدر آباد کی وظیفہ خواری معرض خطر میں نہ پڑ جائے اس لئے بہت جلد رجعت فرمائی اور افسوس ہے کہ سوائے ایک آدھ مقامی مجالس کی صدارت کے کوئی نمایاں امتیاز حاصل کرنے تک طالع بیدار کی رسائی نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد صرف ایک ہی منزل ارتقا کی رہگئی تھی، یعنی مذہبیات کی قیادت اور روحانی ارشاد و ہدایت، سو بحمد اللہ آج کل آپ اسی لا دقیانوس کی شناوری فرما رہے ہیں اور اسی میدان کی "رستاخیز" میں مصروف نظر آ رہے ہیں۔ وہی بات بات میں آیات قرآنی سے استشہاد، ہر ہر فقرہ میں احادیث نبوی سے استناد، حق و صداقت کی حمایت میں وہی خونخواریاں اور اسلام کی غریب الوطنی پر ہر دم آنکھوں سے اشک باریاں، دوسروں کے تمام اخلاقی معائب کو ہمیشہ دہراتا اور جب خود ان کے خط و خال کو بے نقاب کیا جائے تو منہ میں کف لے آتا۔ پھر کون ہے جو ان حالات کے ماتحت آپ کے بلند اخلاق پر ایمان نہ لائے اور کس میں ہمت ہے جو حضرت کے خلاف زبان ہلائے۔ چنانچہ حال ہی میں جب ایک خاتون نے جن کو ہمارے محترم بزرگ کی مطلقہ ہونے کا فخر حاصل ہے ایک پمفلٹ کے ذریعہ سے اپنی دردناک داستان دنیا کو سنائی تو آپ کو پھر وہی کافر و ملحد نیاز یاد آگیا اور اس بوجھ کو اپنے سر سے یہ کہکر گرا دینا چاہا کہ یہ تو نیاز فتحپوری کا (انھیں کے الفاظ ہیں)

"انوکھا انتقام ہے اور محدثین کرام روایت سے قبل راوی کو جانچتے تھے اور راوی ضعیف یا مجروح
نکل آیا تو اس کی روایت سرے سے ناقابل التفات ٹھہر جاتی تھی"

گویا جو کچھ اس پمفلٹ میں لکھا گیا ہے خواہ وہ کتنا ہی درست ہو لیکن محض اس لئے ناقابل التفات ہے کہ اس کا راوی اصول حدیث کے مطابق ضعیف و مجروح ہے، مدعا یہ تھا کہ جس وقت دنیا مولانا کی زبان سے اصول حدیث کا یہ نظریہ سن لیگی تو خاموش ہو جائے گی اور پھر اُن کے زہد و ورع کے سامنے سر جھکا کر "سبوح قدوس ربنا و رب الملائکۃ والروح" کی تسبیح پڑھنے لگے گی ــــ لیکن اصول حدیث کے اس ماہر بے بدل، فن قضا و افتا کے اس علامۂ وحید العصر سے کوئی پوچھے کہ کیا حقیقتاً اس تاویل سے اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا ہے، کیا یہ کہکر واقعی وہ اپنے نفس لوامہ کو خاموش کر سکا ہے اور دنیا باور کرے یا نہ کرے ــــــ لیکن کیا وہ خود اپنی روح کو اس فریب میں مبتلا کر کے سکون بخشنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو میں نہایت خوشی سے اس الزام کو اپنے سر لینے کے لئے طیار ہوں، ورنہ کیا فائدہ کہ اس تہمت سے وہ اپنے نفس کے اضطرابات میں ایک اور حرکت مذبوحی کا اضافہ فرما رہے ہیں۔ وہ حضرات جنھوں نے اس پمفلٹ کو دیکھا ہے (اور جنھوں نے نہیں دیکھا وہ مولوی محمد رفیع صاحب نمبر ا منفورڈ گنج الہ آباد سے طلب کر کے دیکھنے کے بعد) سمجھ سکتے ہیں کہ اس پمفلٹ کو سوائے اُن خاتون کے کوئی دوسرا مرتب ہی نہ کر سکتا تھا۔ یا پھر کوئی ایسا شخص جو وہ تمام عقد و طلاق کے تمام جزئیات اور اندرونی حالات کا رازدار ہو۔ نہ کہ میں جسے کوئی دور کا علاقہ بھی اس خاندان سے نہیں ہے۔

اس پمفلٹ میں علاوہ ان تمام چھوٹے چھوٹے واقعات کے جو شادی و طلاق کے سلسلہ میں پیدا ہوئے حسب ذیل مراسلات کی نقلیں بھی دی گئی ہیں:—

(۱) سب سے پہلے عبدالماجد صاحب کا خط حبیب الرحمان صاحب (برادر خاتون) کے نام جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ایک شخص غائب کی صورت سے شادی کے لئے پیش کیا۔

(۲) پھر انھیں کا دوسرا خط جس میں صیغۂ غائب نے متکلم کی صورت اختیار کر لی اور صاف صاف اپنی خواہش کو ظاہر کیا

(۳) عقد کے تقریباً ایک ماہ بعد خاتون کی محبت بھری تحریروں کے جواب میں عبدالماجد صاحب کا عتاب نامہ جس میں اُنھوں نے اپنی شوہرانہ سطوت کا اظہار فرماتے ہوئے حکم دیا کہ "ہفتہ میں ایک بار خط آنا چاہئے" اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے میں باہر جا رہا ہوں تم اپنے میکہ چلی جاؤ"

(۴) عبدالماجد صاحب کا خط حبیب الرحمان صاحب کے نام جس میں انھوں نے خاتون پر ، سہارنپور چلے جانیکا الزام قائم کیا۔ (درآنحالیکہ خود عبدالماجد صاحب نے انھیں اپنے بھائی عبدالمجید صاحب کے پاس سہارنپور بھجوایا تھا)

(۵) خاتون کا تعلق خاطر سے مجبور ہو کر پھر عبدالماجد صاحب کو خطوط لکھنا اور ایک ماہ کے سکوت برہم کے بعد پھر عبدالماجد صاحب کا یہ جواب خاتون کے نام آنا کہ "تمھارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں یا کوئی تار ہوتے ہیں"۔

(۶) چار ماہ کے بعد خاتون کی دریاباد بلائے جانے کی خواہش پر عبدالماجد صاحب کا تحریر فرمانا کہ "ابھی موقع نہیں ہے جب موقع ہوگا بلا لونگا"۔

(۷) عبدالمجید صاحب (برادر عبدالماجد) کا خط حبیب الرحمان صاحب برادر خاتون کے نام کہ ——

"عبدالماجد صاحب کی پہلی بیوی کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اس لئے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپکی بہن کو الگ کر دیا جائے"۔

(۸) طلاق کے بعد خاتون کے ماموں محفوظ الرحمان صاحب کی تحریر حبیب الرحمان صاحب کے نام اظہار افسوس کیلئے۔

(۹) طلاق کے ایک ہفتہ بعد عبدالماجد صاحب کا خط خاتون کے نام جس میں اُنھوں نے بجائے اپنے کسی اور شوہر کی تلاش کا وعدہ فرمایا ہے۔"

(۱۰) حسیب الرحمان صاحب کا خط عبدالماجد کے نام شکایت کا

(۱۱) عبدالماجد کا جواب جس میں یہ لکھتے ہوئے کہ طلاق کوئی بڑی چیز نہیں ڈراتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دل شکنی کے خیال سے بیاں نہیں کی۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے اور آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کروں" گویا طلاق کا کوئی نامناسب سبب خود خاتون کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔

(۱۲) عبدالماجد کی تحریر خاتون کے نام جس میں تحریر نمبر ۱۱ کے الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مہر کی رقم (جو صرف اکیاون روپیہ تھی) تیار رکھی ہے صرف تمھاری رسید کا انتظار ہے"۔

(۱۳) مولوی حسین احمد صاحب (عبدالماجد کے پیر) کا خط خاتون کے نام جس میں اُنھوں نے عبدالماجد صاحب کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے خاتون کو صبر کی تلقین کی ہے۔

(۱۴) مولوی حسین احمد صاحب کا پھر دوسرا خط خاتون کے نام جس میں عبدالماجد کا اپنی والدہ ماجدہ کے حکم سے مجبور ہو جانا طلاق کا سبب بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "عبدالماجد مصارف روانہ کرتے ہیں مگر آپ کی طرف سے واپس ہوتے ہیں" درآنحالیکہ عبدالماجد نے طلاق کے بعد علاوہ مہر کی رقم کے ایک پیسہ بھی مصارف کے لئے روانہ نہیں کیا۔

(۱۵) مولوی حسین احمد صاحب کا خط حسیب الرحمان صاحب کے نام جس میں پھر عبدالماجد کی مجبوریوں کا افسانہ دہرایا گیا ہے۔

اس پمفلٹ کو خاتون نے ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے:۔

بہرحال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علماء دین و اکابر ملت کے سامنے رکھکر متمنی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت کلیم پوش تسبیح خوان صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر و فریب اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ نہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کئے جاتے کیونکہ عبدالماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے۔ دق و سل جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن گن رہی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جانگداز واقعہ سے میری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں"

اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ جس پمفلٹ میں ایسے پوست کندہ حالات درج ہوں جنمیں اتنے پرائیوٹ خطوط کی نقلیں شامل ہوں اور جو خود مطلقہ خاتون کے نام و دستخط سے شایع ہوا ہو کیا وہ کسی اور کے دماغ کا نتیجہ ہوسکتا ہے' پھر تماشہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی وہ خاتون محترم تمام اخبارات میں اس پمفلٹ کی تحریر و اشاعت کو اپنے آپ سے منسوب ہونیکا اعلان کرتی ہیں' لیکن عبدالماجد صاحب کا اصرار دنیا سے یہی ہے کہ نہیں یہ سب کچھ نیاز کا کرا دھرا ہے اور اس لئے قابل التفات نہیں' پھر کیا عبدالماجد کے نزدیک دنیا اس قدر احمق ہے کہ نیاز کا نام سنتے ہی وہ ان تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کردیگی' نکاح و طلاق کے واقعات کو بھی غلط ٹھہرادیگی اور اس واقعہ کو 'بوستان خیال یا طلسم ہوشربا' کے کسی داستان کا ٹکڑا باور کرکے پھر ان کے بلند اخلاق کا راگ گانے لگے گی۔ کسی عورت سے نکاح کرنا اور اسکو طلاق دیدینا' دنیا کی کوئی نئی بات نہیں جس پر دنیا حیرت کرے' روز ہر جگہ متعدد واقعات ایسے ہوتے ہیں اور کسی کو پرواہ بھی نہیں ہوتی' لیکن چونکہ یہ حرکت ایسے شخص سے سرزد ہوئی ہے جو خود رات دن اخبار سچ میں یورپ کے واقعات طلاق کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت و اخلاق پر آنسو بہایا کرتا ہے جو اپنے ارشادات و مواعظ کے پردہ میں گویا اپنی ملکوتیت و طہارت کا اعلان کیا کرتا ہے اور جو رشد و ہدایت کی خدمات گرانمایہ انجام دیتے ہوئے خود اپنے خضر طریقت ہونے کی حیثیت کا مبلغ ہے اسلئے دنیا کو اخلاقی حق حاصل ہے کہ وہ اُن سے باز پرس کرے اور پوچھے کہ یہ

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

کیا معنی رکھتا ہے ــــــ تھوڑی دیر کے لئے آپ ان تمام بیدردیوں اور تلخ تحریروں کو نظر انداز کردیجئے جو عبدالماجد کیطرف سے ایک خاتون کے حق میں استعمال کی گئیں یہ بھی فراموش کردیجئے کہ انھوں نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے جب دوسرا نکاح کیا تو کیوں تمام ماحول پر نگاہ نہیں ڈال لی' اور جب ایک بار عہد وفا کر لیا تھا تو اسپر استوار کیوں نہیں رہے۔ اسی کے ساتھ آپ ایکہزار روپیہ کے مہر کو بھی بھول جایئے اور اُس بقالانہ ذہنیت کو بھی نظر انداز کردیجئے کہ مہر ادا کرنے سے پہلے ہی پوری رقم کی رسید طلب کیجاتی ہے۔ لیکن اُن متضاد بیانات کو کیونکر دنیا بھول سکتی ہے جو اس سلسلہ میں عبدالماجد کی طرف سے دئے گئے' طلاق کے بعد جب خاتون کے اعزہ شکایت کرتے ہیں تو انھیں دھمکاتے ہیں کہ "سچائیوں کے اظہار پر مجبور نہ کیجئے" اور جب خود خاتون دریافت کرتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ "تہمتوں کی تردید میں جو کچھ میں لکھ بھیجوں' جھوٹی تہمت لگانے والے خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں گے" ـــــ اسی کے ساتھ جب مولوی حسین احمد صاحب دریافت کرتے ہیں تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ "والدہ ماجدہ کے حکم سے مجبور ہوگیا" تین آدمیوں کو علحدہ علحدہ تین سبب طلاق کے بتائے جاتے ہیں اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایسے سبب تلاش کئے جاتے ہیں جو اثر قائم کئے بغیر نہ رہیں۔ چونکہ خاتون کے اعزہ کی طرف سے اندیشہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں اس لئے انھیں تو دھمکی دیدی کہ "سچائی کے اظہار پر مجبور نہ کرو" ایک عورت کا نازک و معصوم دل چونکہ ہمدردی سے جلد متاثر ہوجاتا ہے اس لئے انھیں لکھدیا کہ تم پر تہمت لگانے والے خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں گے' اور مولوی حسین احمد صاحب کو سمجھانے کے لئے چونکہ کسی شرعی بہانہ کی ضرورت تھی اس لئے اُن سے کہدیا کہ "کیا کروں والدہ نے مجبور کیا" ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں سے کس سبب کو صحیح قرار دیں اور کس کو غیر صحیح۔ اگر والدہ کی برہمی اصل سبب تھا تو پھر سوال یہ پیدا

پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالماجد نے پہلے اپنی والدہ سے اجازت حاصل نہیں کی تھی اگر نہیں حاصل کی تو کیوں اور اگر حاصل کی تھی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایک بار اجازت دینے کے بعد پھر طلاق کے لئے مجبور کرتیں۔ قدیم وضع کی خواتین سے کبھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی سلسلہ میں اُنکی ایک صداقت بیانی اور ملاحظہ ہو اور وہ بھی خود اپنے پیر سے کہ "میں مصارف روانہ کرتا ہوں لیکن وہ نہیں لیتیں"۔ خاتون کا بیان ہے کہ سوائے مہر کی رقم کے ایک پیسہ بھی مصارف کے لئے روانہ نہیں کیا۔ جب پمفلٹ شایع ہو کر ملک میں تقسیم ہوا تو اڈیٹر صاحب پیشوا کو بھی بھیجا گیا۔ اُنھوں نے عبدالماجد صاحب سے اصل واقعہ دریافت کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ تمام سازش نیاز کی ہے۔ کیونکہ وہ خاتون تو ایک حرف نہیں پڑھ سکتیں"۔ یہ اور تازہ شگوفہ تھا جو عبدالماجد نے چھوڑا، حالانکہ وہ خاتون نہایت اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہیں اور اُنھوں نے خود بھی اڈیٹر صاحب پیشوا کو ان کے خط کے جواب میں عبدالماجد کے اس جھوٹ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اُس کی نقلیں دوسرے اخبارات میں بھی شائع کرائی ہیں۔

جسوقت یہ پمفلٹ میرے پاس آیا تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنی رائے کا اظہار نہ کرونگا اور بالکل خاموش رہونگا کیونکہ ملک کے اخبارات و رسائل اس کی نقل شایع کر رہے تھے، لیکن جب عبدالماجد نے خواہ مخواہ اس سلسلہ میں میرا ذکر چھیڑ دیا اور اپنے اوپر سے الزامات دور کرنے کے بجائے صرف "راوی و روایت" کی بحث میں پھنسا کر لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہا تو میں مجبور ہوا کہ اصل واقعات و حالات کو پیش کر دوں۔ امید ہے کہ عبدالماجد صاحب دریابادی معاف فرمائیں گے اور آئندہ اس مسئلہ میں پھر میرا نام لیکر مجھے مجبور نہ کریں گے کہ میں نگار کے قیمتی صفحات کو جنھیں اس سے زیادہ مفید کام میں صرف ہونا چاہیئے دوبارہ اس نوع کی گندہ داستان سے آلودہ کروں۔ حبیب الرحمان کی طرف سے جو خط عبدالماجد نے حقیقت میں شایع کرایا ہے اور جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ میں نے حبیب الرحمان صاحب کو کوئی خط لکھا تھا کہ واقعہ عقد و طلاق کے جزئیات سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

میں نہ حبیب الرحمان صاحب سے واقف نہ ان کا صورت آشنا اور نہ میں نے کبھی کوئی خط اُنھیں لکھا ـــ اگر وہ یا عبدالماجد سچے ہیں تو انھیں چاہئے کہ بجنسہ میرا خط شایع کریں، ورنہ یوں کذب و دروغ بافی، اور جھوٹی تاویلوں سے کہیں حقیقت پر پردہ پڑ سکتا ہے۔ اسوقت تک مرد نے عورت پر ہزارہا مظالم توڑے ہیں اور کبھی ظاہر نہیں ہوئے، اگر ان میں سے کوئی ایک طشت از بام ہو بھی جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اور مرد کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ کرے جبکہ وہ "قوامون علی النساء" کی سند رکھتے ہوئے اپنے پندار میں عورت کے ساتھ ہر ناروا سلوک کو جائز قرار دے سکتا ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ بھاگلپور کی ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ پٹنہ کے ایک عربی مدرسہ کے صدر مدرس نے بھی جو بڑے عالم و فاضل سمجھے جاتے ہیں اپنی سوتیلی ساس کو عقد سے تین ماہ گذرنے کے بعد اپنی لڑکی کے اصرار سے طلاق دیدی۔

یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء دین کے اور یہ ہیں داستانیں اُن کی خلوتگاہوں کی۔

نیاز

مذاہب عالم اور اعضاء جنسی کی پرستش

آثار و نشانات

گذشتہ بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ اعضاء جنسی کا تقدس یعنی قدرت کے قوائے تخلیقیہ کی پرستش انسان قدیم کے ادارۂ مذہبی میں داخل تھی، نیز اب بھی بعض قوموں میں کسی نہ کسی صورت سے اس کا رواج چلا آ رہا ہے۔ جو قومیں ترقی کر کے اپنے قدیم مراسم کو ترک کر چکی ہیں گو ان کے ہاں براہ راست اس قسم کی پرستش نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی بہت سی علامات اُن کی معاشرت و تہذیب اور موجودہ طریق عبادت میں ایسی نظر آتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی وقت ان کے ہاں یہ مخصوص پرستش ضرور پائی جاتی تھی۔ قدیم ترین اقوام و ملل میں تولید و تناسل ایک طرح کا مقدس فعل سمجھا جاتا تھا اور اسی لئے اعضاء جنسی کی علامتیں اور صورتیں بالکل نمایاں طور پر بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی بیشمار باقیات قدیم زمانہ کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی پرستش کا عقیدہ پہلے بہت عام تھا۔ بعد کو امتداد زمانہ کے ساتھ جب اُن علامتوں سے حجاب آنے لگا، تو ان میں تغیر و تبدل ہو گیا اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ انسان رفتہ رفتہ ان کی کھلی ہوئی پرستش سے منحرف ہو کر رموز علامتوں سے کام لینے لگا۔ اس زمانہ میں بھی اگر ان قوموں کی معاشرتی رسموں اور قدیم روایات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی روز کی زندگی میں پوشیدہ یا علانیہ متعدد علامتیں اسی طریق عبادت کی پائی جاتی ہیں۔

تاہم مصریوں، فینقیوں، پومپیائی والوں، یونانیوں اور بہت سی ایشیائی اقوام و ملل میں چونکہ مقدس مباشرت کا رواج بہت تھا اس لئے اعضاء جنسی کی پرستش بھی بکثرت پائی جاتی تھی چنانچہ ان کے کھنڈروں سے انکی حجری شکلیں بہت برآمد ہوئی ہیں اور اب بھی اُن کے عبادت خانوں میں اس قسم کی علامتیں یا صورتیں اکثر و بیشتر نظر آتی ہیں۔ کھیم[1] مصر قدیم کا نہایت مشہور دیوتا تھا اور اس سے جذبات محبت یا جذبات نفسانی منسوب کئے جاتے تھے۔ اس کے متعلق راسن نے اپنی تاریخ مصر قدیم میں لکھا ہے کہ اکو اس قدر فحش و حیا سوز صورتوں میں دکھایا جاتا تھا کہ الفاظ کے ذریعہ سے انکا اظہار نا ممکن ہے۔ زمانہ حال کے بعض ماہرین مصریات اس کی عریانی پر تاویلات کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی شرم انگیز عریانی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی اور نہ عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ ایسے دیوتا کی پرستش کا اخلاق انسانی پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے۔ قدیم اہل مصر کا خیال تھا کہ کھیم قدرت کے قوائے تخلیقیہ کا

---

[1] کھیم یا کامتف وہی دیوتا ہے جسے ہندوؤں کے یہاں "کام دیو" کہتے ہیں اور جو عشق و محبت یا تعلق جنسی کا دیوتا مانا جاتا ہے

مظہر اتم ہے اور اس کا بت دیکھنے سے دل میں اُس قانون قدرت پر عمل کرنے کی تحریک ہوتی ہے، جس کے ماتحت موالید ثلاثہ اپنا ہمجنس پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح قدیم یونان میں بآن بُت کے سلسلۂ پرستش میں صدہا قسم کی ناپاک رسمیں داخل مذہب ہو گئی تھیں اسی طرح مصر میں بھی کھیم کی پرستش کے سلسلہ میں سیکڑوں حرکات ناشائستہ سرزد ہوتی تھیں اس مقدس دیوتا کا بت معہ تمام اعضاء کے عریاں بنایا جاتا تھا۔ اور سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بکرے کی تمام خصوصیات شہوانی پائی جاتی ہیں، چنانچہ اس کے مندر میں ایک بکرا بھی رکھا جاتا تھا جسکا نام "کا متف" تھا۔ ہرچند قدیم زمانہ کے لوگوں میں یہ رواج عام تھا کہ وہ اعضاء جنسی کی تصویر چاندی یا تانبہ کی تختی پر کھدوا کر بطور تعویذ یا طلسم گلے میں ڈالے رہتے تھے۔ اور یقین کرتے تھے کہ اس تعویذ یا طلسم کے اثر سے اولاد زیادہ ہوگی۔ لیکن اس زمانہ کی عورتیں بھی بعض ایسے زیور استعمال کرتی ہیں جو حقیقتاً اعضاء جنسی ہی کی مرموز صورتیں ہیں، لیکن انھیں اس کا علم نہیں۔ ذیل میں ہم اُن بعض رموز و اشکال کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق حقیقتاً انھیں اعضاء سے تھا۔ لیکن لوگ اسکی اصلیت سے ناواقف ہیں۔

صلیب صلیب کا تعلق عموماً عیسائی مذہب سے سمجھا جاتا ہے اور عیسائی اس کو اپنے مذہب کی خاص علامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عیسائیوں کی بہت سی مذہبی رسمیں بجنسہ یا کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ قدیم مذاہب سے لی گئی ہیں اسی طرح صلیب بھی اُن میں آئی۔ غالباً یہ سنکر حیرت ہوگی کہ صلیب مسیح سے صدیوں قبل مصر قدیم میں مردانہ آلۂ جنسی کی مرموز شکل تھی، جیسا کہ وہاں کے تمام آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی نشان صلیب اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اب تک ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کا "لنگم" یونانیوں کا "فلس" رومیوں کا "پریاپس" اور عیسائیوں کی صلیب جسے وہ "حیات ابدی" کی نشانی سمجھتے ہیں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ اور ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔ قدیم مصر میں "T" وضع کی صلیب مسیحیت سے صدیوں پیشتر قوائے تخلیق کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اور چونکہ اسی قوت کے ذریعہ سے دنیا کا سلسلۂ تخلیق جاری رہتا ہے اسی لئے غالباً عیسائیوں نے صلیب کو "حیات ابدی" کی نشانی قرار دیا۔

تمام بڑے بڑے عجائب خانوں میں (مثلاً مٹروپولٹن میوزیم نیویارک (امریکہ)۔ برٹش میوزیم (لندن) یا لوورے (پیرس)) شعبۂ مصریات کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس عہد میں اعضاء جنسی کو ظاہر کرنے کے لئے کنایۃً بہت سی چیزوں سے کام لیا جاتا تھا اور انھیں میں سے ایک شکل "T" تھی لیکن اگر اس کو دستہ دار صلیب یعنی اس شکل + میں ظاہر کرتے تھے تو اس سے دونوں جنس کے اعضاء کا اتصال مقصود ہوتا تھا۔ چنانچہ وادی النیل (ملک مصر) کے آثار قدیمہ کی سیر کرنے سے آپ کو وہاں کے درو دیوار پر "تاؤ" (T) کی ہزارہا صورتیں کھنچی ہوئی یا کھدی ہوئی نظر آئینگی حتی کہ بعض بعض دیوتاؤں کے ہاتھ میں بھی تاؤ "(T)" ہوگا۔

دستہ دار صلیب کو قدیم کلدانیوں اور فینقیوں میں بھی بنگاہ تقدس و احترام دیکھا جاتا تھا۔ تاؤ (T) وضع کی صلیب کا استعمال مسیحیت سے پیشتر آئرلینڈ میں بھی پایا جاتا تھا۔ اور قدیم میکسیکانیوں میں بھی اس وضع کی صلیب کے مختلف نام تھے مثلاً، "شجرۃ الحیات" شجرۃ القوۃ۔ اور شجرۃ اللحم۔ قدیم حبش میں جو شکل تاؤ کی بنائی جاتی تھی وہ عام مسیحی صلیب کی

طرح تھی۔ مس الزبتھ ای گولڈا سمتھ نے قدامت صلیب کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:۔

صلیب عالم انسانی میں قدیم زمانہ سے استعمال ہوتی ہے اور مختلف اقوام وملل میں ایک مذہبی نشان تصور کی جاتی ہے تمدن انسانی کے ہر درجہ میں یہ چیز موجود رہی ہے۔ امریکہ کی قوم "انکا" صلیب کا بہت زیادہ احترام کرتی ہے۔ پٹاگونیا کے قدیم باشندے صلیب کا نشان اپنی پیشانیوں پر گود لیتے ہیں۔ قدیم انگلستان کے ڈرونڈ لوگ اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور عیسائیوں کے نزدیک تو یہ حیات ابدی کا نشان ہے۔ الغرض زندگی کا خیال صلیب کی علامت سے کبھی خالی نہیں رہا

مسٹر ہسلاپ تحریر کرتے ہیں کہ عیسائی دنیا میں گڈ فرائڈے کو جو صلیب نما وضع کی میٹھی روٹی کھائی جاتی ہے اور ایسٹر سنڈے کو جو رنگے ہوئے انڈے کھائے جاتے ہیں یہ سب رسمیں قدیم کلدانیوں سے لی گئی ہیں جن کے نزدیک یہ چیزیں ایک خاص مذہبی اہمیت رکھتی تھیں۔ میٹھی روٹیاں کلدانیوں میں "ملکۂ فلک" کی پوجا کے روز کھائی جاتی تھیں جس کا نام "ایسٹر دیوی" یا ایشتار یا استارتہ تھا۔ اور یہ تمام باتیں اسوقت بھی پائی جاتی تھیں جب سکراپس نے یونان کے دارالحکومت شہر ایتھنز کی بنیاد قائم کی تھی۔

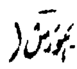
مثلث یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ عیسائیوں میں تثلیث کا خیال کیونکر آیا تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلث قدیم زمانہ میں ایک متبرک نشان سمجھا جاتا تھا۔ اور اعضار جنسی کی مرموز شکل متصور ہوتا تھا۔ اگر اس کی چوٹی نیچے ہوتی تھی جیسے  تو وہ نسائی عضو کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر اس کی چوٹی اوپر ہوتی تھی جیسے  تو اسے مردانہ عضو کی نشانی سمجھتے تھے اور دو مثلثوں کے میل سے جو چھ کونے کا ستارہ بنتا ہے جیسے  تو اس کو دونوں جنس کے اعضار کا اتصال سمجھا جاتا تھا، یہودیوں کے تمام معابد میں اس قسم کے ستارے بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور ان کی اصطلاح میں "مہر سلیمانی" کہتے تھے۔[1] قدیم عبرانیوں میں مثلث کی شکل زمین کے قوائے تخلیقیہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

چینیوں میں قدرت کی تخلیقی قوتیں دو سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام "یانگ" ہے جو مذکر قوت ہے۔ دوسری کا نام "ین" ہے یعنی قوت مونث۔ چینیوں کے عقیدہ میں انھیں دونوں قوتوں کے اتصال باہمی سے ایک تیسری جداگانہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے "جان" کہتے ہیں۔ چینی مذہب میں تثلیث کے اجزا آسمان یانگ اور ین ہیں۔ ان کے عقیدہ میں انہی تینوں چیزوں کے ملنے سے "قوت خلاق" پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کو ان کی اصطلاح میں "اتحاد قوائے ثلاثہ" بھی کہتے ہیں۔ بہت سی قدیم قوموں میں بجائے مثلث کے ترسول کا نشان ہوتا تھا۔ جو ان کے نزدیک مختلف قوموں کے اتحاد کا مظہر متصور ہوتا تھا۔ مثلاً کسی کے نزدیک آسمان۔ زمین اور پانی۔ کسی کے نزدیک آتش۔ آب، اور ہوا۔ کسی کے نزدیک شمس۔ قمر۔ اور زہرہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ بعض تعویذوں کو نقش سلیمانی کہنا اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ وہ تعویذ بھی تقریباً اسی طرح کے بنائے جاتے ہیں۔

پیروان زردشت کے نزدیک مثلث یا ترسول، آتش - نور اور اثیر کا مظہر تھا اور عبرانیوں کے نزدیک آتش - نور اور ہوا (یا روح) کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

قدیم مصریوں میں ہر مندر تین مورتوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ (۱) دیوتا - (۲) دیوی - (۳) ان کا دونوں کا ثمرۂ اتصال یعنی بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کی صورت میں ہوتے تھے۔ اور اس تثلیث کے اظہار کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک حلقہ میں مثلث کھینچ دیا جاتا تھا۔ جیسے  اس کے معنی سیت - ہورس (Horus) اور شو تھے اور ان تین معبودوں کی تشریح یہ کی جاتی تھی کہ ہورس برسات ہے اور سیت خشک سالی اور شو ہواؤں اور طوفانوں کا دیوتا تھا۔ شو کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلا دیوتا تھا جس نے زمینوں سے آسمانوں کو بصورت مثلث پیدا کر کے بلند کیا۔ اور اس کی تصویر بھی اس طرح دکھائی جاتی تھی کہ وہ ایک مثلث پر کھڑا ہوا ہے جس کے اندر سات زینے (یعنی سات آسمان) بنے ہوتے ہیں۔ یہ دیوتا دوسرے نسائی اور جنگجو دیوتاؤں کے درمیان ثالث اور حکم کا کام کرتا تھا۔

ایک تشریح مصری تثلیث کی یہ بھی تھی کہ نوت آسمان کا دیوتا ہے۔ سیب زمین کی دیوی ہے۔ اور شو فضا کا دیوتا ہے۔ لیکن قدیم مصریوں کی سب سے زیادہ مشہور تثلیث اوسیریز۔ آئسیس اور ان کے بیٹے ہورس پر مشتمل تھی اور اسی تثلیث سے غالباً مسیحی تثلیث لی گئی ہے۔ جس کا مفہوم ان کے یہاں باپ۔ بیٹا اور روح القدس ہے۔ لیکن ان تمام "مثلثات" کی اصل وہی اعضار جنسی یا قوائے شہوانی کی تعبیر ہے جو باعثِ وجودِ حیات ہے۔

مچھلی ڈاکٹر فرائڈ اور دیگر ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ مچھلی بھی قدیم اقوام و ملل میں عضو جنسی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اور ایک مقدس چیز سمجھ کر اس کی پرستش کی جاتی تھی چنانچہ بودھوں، مصریوں، بابلیوں، آشوریوں اور فنیقیوں کی مقدس تصاویر اور نقوش سنگتراشی میں مچھلی کی شکلیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

دو مچھلیاں اگر اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کی دم دوسرے کے سرے سے ملی ہو جیسے  اور اس پر بعد اسا ابھرا ہوا بنا ہو تو اسے عورت کا عضو جنسی سمجھا جاتا تھا۔ مصریوں میں جب آئسیس دیوی کی تصویر بنائی جاتی تھی تو اس کی گود میں اس کا بچہ ہورس بھی بناتے تھے لیکن اسی کے ساتھ دیوی کے سر پر ایک مچھلی بھی بنا دی جاتی تھی۔

ہندوؤں کے بت اردھاناری ایشوری کے سر پر بھی ایک بنت البحر یعنی جل کنیا کی صورت بنائی جاتی ہے یہ بت گویا برہما کا ہے اور ایسی حالت میں دکھایا جاتا ہے جبکہ وہ تکوین عالم کے کام میں مصروف تھا اُس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں حصہ زنانہ ہے اور اعضار جنسی دستہ دار صلیب سے دکھائے جاتے ہیں جو مردانہ و زنانہ اعضار کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔ چونکہ مچھلی بیشمار انڈے سے بچے دیتی ہے اس لئے قدیم زمانہ کے لوگ اسے افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔

بیضاوی یا اہلیلجی شکل بیضاوی شکل بھی ایک عام علامت ہے جس کے ذریعہ سے نسائی عضو جنسی کو عموماً ظاہر کیا

سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک لمبوتری جو گوشہ شکل سے 〈〉 بھی یہی معنی ظاہر کئے جاتے ہیں۔

ناظرین یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ گرجاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے عموماً زنانہ عضو جنسی کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بعض مذہبوں کے ماننے والے ایسے سوراخوں میں سے گذرتے ہیں جو پتھروں میں اس شکل کے بنائے جاتے ہیں جن سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ گویا وہ از سر نو پیدا ہوئے ہیں اور ایسے ہی معصوم و بےگناہ ہیں جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر پی انگز بینڈر رسٹون نے گرجاؤں کی طرز تعمیر پر بحث کرتے ہوئے اس کی جنسی یا شہوانی نوعیت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :- جب کوئی شخص کسی گرجا میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک دوہرے دروازہ کے ذریعہ سے داخل ہوتا ہے جو گویا بمنزلہ عورت کے شفرۂ کبیرہ (Labia majora) کے ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس شخص کو ایک اور دوہرے دروازہ میں جانا پڑتا ہے جو بمنزلہ شفرۂ صغیرہ (Labia minora) کے ہے جب وہ اندر یعنی اندام اندرونی (Vagina) میں پہونچتا ہے تو اسے اپنے سامنے قربان گاہ یعنی رحم (Womb) نظر آتا ہے اور قربان گاہ کے دونوں طرف اسے دروازے نظر آتے ہیں جو گویا نلے (Fallopian tubes) ہیں۔ قربان گاہ اُسے بپتسمہ دیا جاتا ہے یعنی رطوبت رحمی (Amniotic fluid) لگتی ہے اس کے بعد وہ گرجا سے باہر آتا ہے یعنی دوبارہ پیدا ہو کر نکلا ہے۔

قرون وسطیٰ کے بہت سے گرجاؤں کے صدر دروازوں پر نسائی عضو جنسی کی تصویر کھود دی جاتی تھی۔ اور اب بھی کلیسائے ڈمبلین کی کھڑکی پر جس کی نسبت رسکن نے لکھا ہے کہ وہ انگلستان بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے نسائی عضو کی تمام تفصیلات منقوش ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی یہ دستور تھا کہ جب ان کی کوئی اونٹنی مر جاتی تھی تو وہ اُس کے اندام کو کاٹ کر مکان یا خیمہ کے دروازہ پر لٹکا دیتے تھے۔ تاکہ خیر و برکت حاصل ہو اسیطرح قرون وسطیٰ کے یورپ میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ کسی مردہ گائے یا گھوڑی کا اندام کاٹ کر دروازہ پر آویزاں کر دیتے تھے۔ مگر اب اس کے بجائے گھوڑے کے نعل کا استعمال ہونے لگا ہے جو عورت کے عضو جنسی کی نشانی ہے۔

سانپ سانپ کو اکثر ممالک میں خواہشات نفسانی کا مکمل مظہر سمجھا گیا ہے۔ اور کوئی مذہب دنیا کا ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی صورت سے سانپ موجود نہ ہو۔ جذبات شہوانی کے علاوہ سانپ کو عقل و دانش کی علامت بھی سمجھا جاتا تھا اگر سانپ کی شکل اس طرح سے بنائی جائے کہ اس کی دم اُس کے منہ میں ہو جیسے تو اُسے غیر فانی ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسرائیلیات میں سانپ کو جذبات شہوانی کی علامت قرار دیا گیا تھا اور سانپ کی شکل قدیم اقوام و ملل میں اسی معنی کے لئے بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً قدیم یونانیوں میں جب طب یونانی کے ابوالآباء اسقلیبوس اور اس کی بیٹی ہائجیہ کے بت بنائے جاتے تھے تو ان کے سروں پر ایک سانپ کی تصویر ضرور بنائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر داں نے لکھا ہے کہ :- "بانجیہ نے ایک سانپ پال رکھا تھا۔ جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی یہ سانپ مندر میں رہتا تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتی تھی۔ جب کوئی مریض مندر میں آکر علاج کا خواہاں ہوتا تو یہ اسے حکم دیتی کہ مندر میں جاکر شگون لے کہ مندر کا سانپ تمھاری دی ہوئی غذا کس طرح قبول کرتا ہے۔ وہ شخص مندر میں داخل ہوجاتا تھا۔ مندر کے اندر کی حالت یہ تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کی بڑی تعداد وہاں رہتی تھی۔ جو اس شخص کو ہر طریقہ سے لبھاتی تھیں اور آخر کار وہ شخص کسی نہ کسی کے قبضہ میں آہی جاتا تھا۔ پھر اگر وہ اس دعوت شباب سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا، تو یہ حکم لگایا جاتا کہ شفا جلد ہوجائے گی ورنہ نہیں۔ ہر سال مقررہ دن میں ایک دوشیزہ برہنہ حالت میں مندر کے اس مقام پر غذا لے جاتی تھی جہاں سانپ پلے ہوئے تھے۔ اگر سانپوں نے وہ خوراک جلد اور شوق سے کھائی تو سمجھا جاتا تھا کہ یہ سال اچھا ہے" ورنہ نہیں۔

سانپ کی پرستش امریکہ کی قدیم آبادی میں بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اوہیو میں ابتک سانپوں کا ٹیلہ موجود ہے۔ اور قوم ازتیق کی ناگ پوجا کی یادگاریں وہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ناگ پوجا اور ناگ پنچمی سے ہر شخص واقف ہے آدم وحوا اور جنت عدن کے قصہ میں جو سانپ کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق قدیم مسیحیوں مثلاً جسٹن ([illegible]) اگسٹائن۔ عزلیفوری وغیرہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سانپ سے مقصود صرف جذبۂ شہوانی کا اظہار ہے۔ آئرلینڈ میں جب سنٹ پیٹرک نے مذہبی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے کوشش کی کہ ملک کے اندر سے سانپ نکلوا دئے جائیں کیونکہ وہاں قوائے تخلیقیہ کا اظہار سانپوں کی مورتوں سے کیا جاتا تھا۔

قدیم چین وجاپان کی روایات میں بھی سانپ کا عضو بڑی حد تک موجود ہے۔ اور چین کا تو قومی نشان ہی ابھی تک اژدہا ہے چونکہ سانپ کی صورت ایک طویل عضو جنسی کی طرح ہوتی ہے اس لئے اس کو ازدیاد نسل کی قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور اسکی انگوٹھیاں۔ تعویذ اور کڑے ابتک بعض ملکوں میں شوق سے پہنے جاتے ہیں۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ بعض دیوتا سانپ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جیوپیٹر آمون اسکندر اعظم کی ماں اولمپیاس سے سانپ ہی کے بھیس میں ملا تھا اور اس مواصلت سے سکندر پیدا ہوا۔ اسی طرح جیوپیٹر کاپیٹولینس بھی سیپیو افریقانس کا باپ بنا تھا۔ عہد قدیم میں بدکار اور مغلوب النفس عورت کو ناگن سے تشبیہ دینے کا رواج تھا۔ چنانچہ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو نیل کی ناگن کہنا اسی بنا پر تھا۔

بعض پھل اور پودے

قدیم اقوام وملل میں پھلوں اور پودوں سے بھی اعضائے جنسی اور جذبات شہوانی کی تعبیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یورپ میں ابھی تک سنترہ کے پھول کو شادیوں میں صرف اسی لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے دلہن بہت زیادہ صاحب اولاد ہوگی۔ اسیطرح انگور کو جذبات شہوانی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور شراب مقوی ومہیج چیز ہے۔

آشور کے دیوتا بعل سے شمشاد وصنوبر کا پھل منسوب تھا اور انجیر کو بھی عضو جنسی سے تشبیہ دیتے تھے۔ کیونکہ اسکا تنا

سہ شاخہ ہوتا ہے جو ترسول سے مشابہت رکھتا ہے جو ممالک سواحل بحیرہ روم پر واقع ہیں وہاں لوگوں میں انجیر کے درخت کی پوجا کی جاتی ہے

مصر قدیم اور دیگر ممالک مشرق میں کنول اور بعض دوسرے پھولوں کو ہمیشہ بنظر احترام دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ بین نائٹ لکھتے ہیں کہ:- کنول یا نیلوفر کو شمالی نصف کرۂ ارض کے جملہ ممالک میں مذہبی احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور بعض ممالک میں (مثلاً ہندوستان اور چین) یہی حال ہے۔ تاتاریوں، جاپانیوں اور ہندوؤں کی تمام مورتیاں کنول کے پھول پر قائم کی جاتی ہیں۔ اور اس پھول کو ہندوستان، تبت اور چین میں اب بھی متبرک سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا کنول سے پیدا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پھول عورت کے مخصوص حصۂ جسم کا مظہر ہے۔ لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ کنول کا پھول وشنو کی ناف سے پیدا ہوا تو خیال گذرتا ہے کہ یہ مردانہ عضو جنسی کی علامت ہے۔

درخت بلحاظ جمالیات دنیا میں بعض درخت نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں۔ ان کے سیدھے سڈول تنے، گنجان شاخیں اور پتے، خوبصورت رنگیں اور خوشبودار پھول، لذیذ اور خوبصورت پھل انسان کا دل لبھائے بغیر نہیں رہتے۔ اور بہت سے درخت سدا بہار ہوتے ہیں جنھیں دیکھکر بقائے ابدی کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض درختوں پر ہر سال خزاں آتی ہے ہر سال نئے پھول، پتے اور پھل نکلتے ہیں اور ہمیشہ یہی سلسلہ جاری رہتا ہے اس لئے قدما کے نزدیک درخت ابدیت کی نشانی تھی۔

آریا و سامی عقائد میں تین طلسمی درخت پائے جاتے ہیں۔ شجرۃ الحیاۃ۔ شجرۃ العلم۔ شجرۃ الجنۃ۔ ڈاکٹر ڈی الویلا لکھتے ہیں کہ ان کے عقاید کے مطابق ان درختوں کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:-

شجرۃ الحیاۃ سے ایک قسم کا رس پیدا ہوتا تھا جسکے پینے سے دوامی شباب حاصل ہو جاتا تھا۔ شجرۃ العلم میں یہ کمال تھا کہ وہ غیب یا آئندہ کی باتیں بتا دیتا تھا۔ شجرۃ الجنۃ کا تعلق روشن و منور اجرام سماوی سے تھا۔

قدیم ایرانیوں میں ہوما یا ہوم نامی ایک درخت ہوتا تھا جس کا رس ابدی زندگی بخش دیتا تھا۔ ایسا ہی ایک درخت قدیم ہندوؤں میں تھا جسے سوما یا سوم کہتے تھے اس کا رس بھی آبحیات تھا۔ یہ درخت گویا شجرۃ الحیات تھا۔

چین والوں کے نزدیک سات طلسمی درخت تھے جن میں ایک شجرۃ الحیوٰۃ بھی تھا۔ یہ ساتوں درخت کوہستان کون لون کے اطراف میں پیدا ہوتے تھے۔ اہل چین کے نزدیک یہ کوہستان بہشت ارضی تھا۔ جہاں سائی وانگ مو دیوی کی حکومت تھی۔ یہ شجرۃ الحیوٰۃ دس ہزار ہاتھ بلند تھا اور ایک ہزار ہاتھ اس کے تنہ کا دور تھا۔ یہ جڑ سے چوٹی تک نیلم اور زمرد کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تین ہزار سال میں ایک مرتبہ پھل آتا تھا۔ تاؤ مذہب والوں کے نزدیک یہ درخت شفتالو کا ہے اور اس مذہب والوں کے نزدیک شادی بیاہ کا درخت ہے۔

قدیم دنیا کے تمام متبرک اور مقدس درختوں میں ملک آشوریہ کا ایک شجرۃ الحیوٰۃ بھی تھا۔ پروفیسر لیارڈ کا خیال ہو

کہ یہ درخت آشتار دیوی کی پرستش سے تعلق رکھتا تھا۔ آشور یہ درخت اور اس کی پوجا کا رواج ممالک عرب وسط ایشیا ایشیائے کوچک اور ایران میں پہونچا

ممالک یورپ میں شاہ بلوط کے درخت کو متبرک سمجھا جاتا تھا جس کا باعث غالباً اس کی مضبوطی اور پائداری ہوگا علاوہ ازیں اس کے پھل کی صورت بھی ایسی ہوتی ہے گویا مردانہ و زنانہ اعضائے جنسی کا اتصال ہے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک شاہ بلوط کا درخت شجرۃ الحیوٰۃ سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان کی ڈرویڈ اقوام اس درخت کو بہت مقدس درخت خیال کرتی تھیں۔ شاہ بلوط کے جنگلوں ہی میں یہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کے باغ بناتے تھے اور یہی تقدس صنوبر کے درخت کو حاصل تھا۔ جو فصل بہار کے دیوتاؤں آٹیس اور دیونسوس وغیرہ سے منسوب تھا۔ اس کا پھل بھی شاہ بلوط کے پھل سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں برگد اور پیپل کے درخت متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی مندر ایسا نہ ہوگا جہاں برگد یا پیپل کا درخت نہ ہو۔ اُن کی شاخوں میں سے چونکہ دودھ نکلتا ہے اس لئے عورتیں ان درختوں کو خاص طور پر پوجتی ہیں۔

بیل جو قومیں سورج کو پوجتی تھیں یا پوجتی ہیں ان کے معتقدات میں بیل کو خاص تقدس حاصل ہے۔ بیل کو یہ لوگ قوتِ تناسل کا مظہر سمجھتی تھیں اور اب بھی اس کی عزت کا سبب یہی خیال ہے۔ منطقۃ البروج میں بھی ایک برج بیل کی شکل کا فرض کیا گیا ہے جسے انگریزی میں "Taurus" کہتے ہیں۔ اس کا موسم فصل بہار میں اپریل سے مئی تک ہوتا ہے۔ اور یہی زمانہ جوش شہوانی کا ہے۔

بیل سے قدیم مذاہب کو خاص تعلق رہا ہے۔ مثلاً قدیم مصریوں کے ہاں آپیس بیل تھا جسے خداوند اوسیریز کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں میں گوسالۂ سامری کی روایت موجود ہے۔ آشوریوں کے مندروں میں پر دار بیل بنائے جاتے تھے ہندوؤں میں مہادیو کا بیل نندا ابتک موجود ہے۔

آشوریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کی نسل بیل ہی سے چلی ہے۔ جاپان میں سانڈ بیلوں کو بنظر احترام دیکھا جاتا ہے۔ اور ہندوستان میں تو سانڈ بیل کو "راجہ" کہتے ہیں۔

قدیم مصریوں میں قوا مردانہ کو اوسیریز کہتے تھے اور اوسیریز کا اوتار آپیس بیل کو سمجھا جاتا تھا۔ اوسیریز کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک بچھیا کے پیٹ سے پیدا ہوا جسے چاند کی شعاع مخروطی یا بجلی کی چمک نے حاملہ کر دیا تھا۔

جب آپیس بیل مرجاتا تھا تو پجاری لوگ ملک بھر میں تلاش کر کے دوسرے بیل کا اسی طرح کا انتخاب کر لیتے تھے۔ شناخت کی چند خاص علامتیں ہوتی تھیں یعنی بیل کا رنگ سیاہ ہونا چاہئے۔ پیشانی پر سفید رنگ کا ایک مثلثی ٹیکا (علامت مرد) ہونا چاہئے۔ پہلو میں ایک سفید رنگ کا ہلال (علامت زن) ہونا چاہئے اور زبان کے نیچے کن سلائی کی وضع کی ایک سولی ہونی چاہئے۔

جب آپیس بیل مرجاتا تھا تو یہ یقین کیا جاتا تھا کہ اُس نے اپنا آسمانی چولا اختیار کر لیا ہے یعنی اوسیریز بن گیا ہے۔ اُس کے

بعد آپیس کی لاش کو حنوط کرکے بہت کچھ اظہار رنج وغم کے بعد ایک مقبرہ میں رکھدیا جاتا تھا۔ بعد ازاں دوسرا آپیس نہایت شان وشوکت کے ساتھ لایا جاتا تھا۔ عرصہ تک خاص خاص رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اول چالیس روز تک صرف عورتیں ہی اُسے دیکھ سکتی تھیں اور وہی اس کی خدمت اور پرورش کرتی تھیں۔ یہ حرکتیں ممفیس میں بہت ہوتی تھیں۔

بکرا مصر کی عورتیں صرف آپیس سانڈ ہی سے نہیں بلکہ مندلیس (Mendes) کے مقدس بکرے کی طرف بھی یہی خیال رکھتی تھیں۔ توریت کتاب احبار میں اس رواج کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:۔
"نہ تو کسی جانور کے ساتھ سوئیگا تاکہ خود کو اس کے ساتھ ناپاک کرے۔ اور نہ کوئی عورت کسی جانور کے نیچے لیٹے گی یہ بات خراب ہے"
قدیم آشوریوں میں بھی بکرے کو بنظر احترام دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ لوگ اس جانور کو قوت نفسانی کا مجسمہ سمجھتے تھے اور عورتیں معبدوں میں نہایت حیا سوز حرکات کی مرتکب ہوتی تھیں۔

گائے گائے کو قدیم اقوام میں دھرتی ماتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا جس طرح بیل مردکی علامت ہے اسی طرح گائے عورت کی نشانی ہے۔ گائے کا احترام مشرق کے تقریباً تمام ممالک میں کیا جاتا تھا۔ مصر میں گائے ہاتور۔ نوت آئسیس۔ نفتیس۔ اور دیگر معبودان قدرت سے منسوب تھی۔ ہندوستان میں اس کی پوجا اب تک ہوتی ہے۔

کچھوا قدیم اقوام میں کچھوا بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کچھوے کی مشابہت جو عضو جنسی سے ہے وہ دراصل اس کی گردن میں ہے۔ قدیم یونانیوں میں اسی مشابہت کی وجہ سے کچھوے کو عشق ومحبت کی دیوی وینس سے منسوب کیا جاتا تھا۔ قدیم یونانی فنون لطیفہ میں بعض اوقات وینس دیوی کو کچھوے کی پشت پر استادہ دکھایا جاتا ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی کچھوے کو افزائش نسل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم ہندوں، جاپانیوں اور امریکیوں میں کچھوے کا دخل تکوین کائنات میں بھی مانا جاتا ہے۔ مثلاً ہندو روایات میں ہاتھی کو جس کی پشت پر دنیا قائم ہے ایک کچھوے کی پشت پر استادہ دکھایا جاتا ہے اور جاپانیوں میں کچھوے کی پشت پر دیوتاؤں کا مسکن بنایا جاتا ہے جس کا مرکز ایک پہاڑ ہوتا ہے۔
امریکہ کی قدیم قوم سنیکا کا یہ اعتقاد تھا کہ "مادر فلک" کا جب ہبوط ہوا تو وہ ایک آبشار پر گری آبشار نے اس کو ایک کچھوے کی پشت پر سوار کردیا۔ امریکن قوم دلاویر میں ایک روایت ہے کہ "دنیا کا مرکزی درخت" ایک کچھوے کی پشت سے اُگا تھا۔ چینیوں کے روایات قدیمہ میں بھی کچھوے کو بہت کچھ دخل ہے۔

بلی مصر قدیم میں بلی کی بھی پوجا ہوتی تھی اور اُسے سورج کا نمائندہ خیال کیا جاتا تھا کیونکہ بلی کی آنکھوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کا رنگ سورج کے عروج وزوال کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ جانور عادتاً شب گرد ہے اور چوری چھپے اپنا کام کرجاتا ہے۔ اور رات ہی کے وقت سے عشق ومحبت کے راز ونیاز ہوتے ہیں۔ اس لئے اس جانور کو جذبات شہوانی کا مظہر قرار دیا گیا۔

مصریوں میں باست ایک گربہ نا دیوی تھی جس کے رتھ میں بلیاں جوتی جاتی تھیں۔ جب کبھی کوئی بلی مرتی تھی تو اس کی لاش کو حنوط کرکے ایک بکس میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا اور جو شخص کسی بلی کو مار ڈالتا تھا اُسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

شیر جن اقوام میں سورج کی پرستش ہوتی تھی ان میں شیر کو بھی بنظر احترام دیکھا جاتا تھا جس کا باعث وہی ہے جو بلی کے بارہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں شیر کو سورج کی حرارت سے منسوب کیا جاتا تھا۔ شیر کا قد و قامت چونکہ شاندار ہوتا ہے۔ اس کی رفتار میں ایک خاص دلفریبی ہوتی ہے اور قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ تمام حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے اسلئے قدمائے اُسے طاقت مردمی کا مجسمہ قرار دیا۔ قدیم مندروں کے دروازوں پر شیروں کی صورت تعمیر کی جاتی تھی۔ ہندوستان کے مندروں میں اب بھی شیروں کے مجسمے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ابوالہول سب سے زیادہ عجیب و غریب اور دلچسپ چیز مصری ابوالہول ہے اس عجیب الخلقت جانور کا سر اور چہرہ تو ایک خوبصورت عورت کا ہوتا ہے لیکن باقی تمام جسم شیر کا بنایا جاتا ہے گویا اس میں زنانہ اور مردانہ دونوں قوتیں موجود ہیں ابوالہول کے بت میں ایک دلچسپ استعارہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسی چیز نہیں ہے جسکے پھندے میں پھنس کر کوئی جان بچا لے جائے۔ کیونکہ وہ اپنی شکیل صورت سے فریفتہ کرکے انسان کو شیر کی طرح پھاڑ ڈالتی ہے۔

نیاز

تاریخ کا ایک گم شدہ ورق

(فطرت انسانی کی خون آشامی کی ایک حیرتناک مثال)

قیصر کالیگولا ۳۷ء میں تخت روما پر بیٹھا اور ۴۱ء میں ایک وفائی الاصل سردار کیریاس نے اُسے قتل کرکے ایک ستے اس خدائی قہر و عذاب کو دفع کیا جس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ کالیگولا نے صرف پانچ سال حکومت کی، لیکن اس مختصر مدت میں خونریزی و خون آشامی، سفاکی و درندگی کے ایسے ایسے نقوش اپنے بعد چھوڑ گیا کہ دنیا کی کوئی سلطنت اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

کالیگولا صورت شکل کے لحاظ سے جیسا حسین اور دلکش انسان تھا، ویسا ہی دل کے لحاظ سے وہ مکروہ و قابل نفرت تھا۔ اُسے اُسوقت تک نیند نہ آتی جب تک دن میں کم از کم ایک بار اپنے ہاتھ کو بے گناہ انسانوں کے خون سے رنگین نہ کر لیتا۔

ایک دن حسب معمول خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے منتظر و آمادہ بیٹھا ہوا ہے کہ دفعتہً اُسے کچھ خیال آجاتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ اُن چالیس امرا اور غلاموں کو اس کے سامنے ذبح کیا جائے جنھوں نے اُس کے خلاف سازش کی تھی۔ یہ سنکر ایک مقرب سردار نے کہا کہ "کیا مناسب نہیں کہ ان کی خطائیں معاف کرکے اہل روما کا دل ہاتھ میں لے لیا جائے" کالیگولا نے غضبناک ہو کر کہا "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمام اہل روما کا ایک سر ہوتا اور میں ایک ضرب میں اُسے ہمیشہ کے لئے قطع کرکے رکھدیتا"

جسوقت قیصر اپنی اس خون آشام تفریح میں مشغول ہوتا تھا تو باشندگان روما کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس کا ذکر کریں بلکہ صرف یہ کہدیا کرتے تھے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"

ایک روز کالیگولا، قونصل افرامیوس پر برہم ہوا اور محل کی کھڑکی سے اس کو سڑک پر اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی ہڈیاں چور چور ہوگئیں اور وہ مرگیا۔ لوگوں نے پوچھا، اے قیصر! اب کس کو اس کی جگہ قونصل مقرر کیا جائے، تو اس نے جواب دیا کہ "میں اپنے گھوڑے انسناتوس کو اس کی جگہ قونصل مقرر کرتا ہوں"

چنانچہ اس کے بعد بادشاہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی سڑکوں پر تفریح کے لئے نکلتا اور اہل روما کے سروں کو گھوڑے کی ٹاپ سے روندتا ہوا کچلتا ہوا گزر جاتا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسا کرتا اور لوگ یہ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"۔

ایک رات اس نے اپنی محبوبہ سے نشۂ شراب و محبت کے عالم میں کہا۔ "آج میں نے چار سرداران روما کو گرفتار کیا ہے جنکے متعلق مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ میرے خلاف سازش کر رہے تھے میں نے ایک کوڑا اعمرطے کا تیار کرایا ہے اور چاہتا ہوں کہ تو اپنے ہاتھ سے تیس تیس کوڑے سب کے سامنے ان کو مارے" —— اس نے کہا کہ "اے شہنشاہ اس خیال سے باز آ مجھے اس کام پر مجبور نہ کر کیونکہ اس سے اہل روما کو اور زیادہ نفرت بڑھ جائیگی"۔

بادشاہ یہ سنکر ہنسا اور بولا کہ "مجھے ان کی اور ان کی نفرت یا محبت کی کوئی پرواہ نہیں میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کسی امر میں نہیں کہ اہل روما کو میں اپنے سامنے خوف سے کانپتا ہوا دیکھوں"۔

آخرکار اس کی محبوبہ نے تیس تیس کوڑے امراء روما کی پشت پر مارے اور لوگ یہ دیکھکر وہاں سے یہ کہتے ہوئے واپس آئے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"۔

ایک دن اس کی دایہ جو بنیا آئی جس نے کالیگولا کو اپنی گود میں کھلایا تھا، دودھ پلایا تھا۔ اُس نے کہا —— "اے میرے بیٹے قیصر، میں چاہتی ہوں کہ تو میری بیٹی اسٹیلا کو مخصوص نظر عنایت سے دیکھے اور اس کے لئے سرداران روما میں سے کوئی شوہر تلاش کر دے کیونکہ اب وہ جوان ہوگئی ہے۔ جسوقت بادشاہ نے اپنی رضاعی بہن اسٹیلا کے حسن و شباب کو دیکھا تو بدحواس ہوگیا اور اس کی طرف دست ہوس دراز کیا۔ اس لڑکی نے انکار کیا۔ اس کی ماں نے کہا "یہ تو کیا کر رہا ہے کہیں آسمان نہ زمین پر پھٹ پڑے" لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور لڑکی اور اس کی ماں دونوں نے زہر کھا کر اپنی جانیں دیدیں۔ اس واقعہ کے بعد جب دایہ کا لڑکا بادشاہ کے پاس آیا کہ محاسبہ کرے تو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اُسے ذبح کرکے، لاش کو سڑک پر پھینکوا دیا جسے اہل روما نے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"۔

ایک دن قیصر اپنے تمام حاشیہ نشین سرداروں کو لیکر سیر و شکار کے لئے نکلا اور بحیرۂ نیمی تک پہونچ گیا۔ جسے اہل روما "آئینۂ دیانا" کہتے تھے، یعنی اُسے جیوپیٹر کی بڑی بیٹی ڈیانا (سیر و شکار کی دیوی) سے منسوب کرتے تھے جس کا ہیکل اسی جگہ ساحل پر قائم تھا۔

قیصر معبد دیاتا پر پہونچا، اپنے گھوڑے سے اتر کر اندر گیا اور پوجاریوں سے شراب طلب کی۔ اسی اثنا میں اسکی نگاہ ہیکل کے سب سے بڑے پوجاری پر پڑ گئی جو نہایت ضعیف تھا اور عصا کے سہارے سے ایک ایک قدم اُٹھاتا تھا قیصر نے پوچھا "تیری عمر کیا ہے" اُس نے کہا کہ "سو سال سے متجاوز ہے اور ساٹھ سال سے میں ڈیاتا کی خدمت کر رہا ہوں۔ بادشاہ یہ سنکر ہنسا اور بولا کہ "اس کی گردن جدا کر دو کیونکہ روما کے لئے یہ امر باعث عار و ننگ ہے کہ دیاتا کی خدمت ایسے ناکارہ ضعیف انسان کے سپرد کیجائے"!

چنانچہ اُسکی گردن کاٹ ڈالی گئی اور امرا باہم دگر سرگوشیاں کرنے لگے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"

بادشاہ کو یہ مقام بہت پسند آیا اور اپنے خادم توسیوس سے کہا کہ میں چند دن یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ توسیوس نے بادشاہ کے اس ارادہ کا ذکر سرداروں سے کیا اور انھوں نے فوراً دو نہایت خوبصورت کشتیاں بحر نابولی سے بحیرۂ نیمی میں طلب کریں اور بادشاہ کو اطلاع دی کہ اب وہ جتنے دن جی میں آئے آرام سے قیام کر سکتا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کشتیوں کی آراستگی میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھا جائے، چنانچہ تمام شاہانہ اسباب ان میں منتقل کیا گیا بجائے رسیوں کے سونے چاندی کی زنجیریں بنا کر ڈال دی گئیں، رنگیں فانوس جا بجا معلق کئے گئے اور چراغوں میں بجائے تیل کے عطر ڈالا گیا! کشتیوں کے جھروکے عورتوں کے قیام کے لئے مخصوص کئے گئے اور بادشاہ لطف و مسرّت سے رہنے لگا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے بادشاہ نے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ انسان پانی میں کس طرح ڈوبتا ہے" اور دریافت کیا کہ کتنے غلام کشتیوں میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ تیس غلام موجود ہیں، حکم ہوا کہ ان کو پانی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ وہ پانی میں پھینک دیئے گئے۔ اور اگر کوئی غلام اپنی جان بچانے کے لئے کشتی کا رخ کرتا تھا تو چپوؤں سے اس کو مار مار کر پھر بھگا دیتے تھے اور ہنستے تھے۔ ساحل پر جو لوگ جمع تھے وہ یہ منظر دیکھ رہے تھے اور آپس میں کہتے جاتے تھے کہ "بادشاہ آج سیر و تفریح میں مشغول ہے"!

تیبریہ کو ایک صبح اطلاع دی گئی کہ روما میں کچھ لوگوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی ہے۔ اس نے دو سرداروں کو متعین کیا کہ فوراً جاکر سازش کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے اور اس طرف حکم دیا کہ آج کی رات رقص و سرود میں بسر کی جائے چنانچہ کشتیوں کی تمام کنیزیں جمع کی گئیں اور اُنھوں نے اپنی اپنی زبانوں اور اپنے اپنے لحن میں مختلف گیت گانے شروع کئے انھیں نغموں میں ایک نہایت ہی حزین و ملول نغمہ بادشاہ کے کانوں تک پہونچا جو ایک نوعمر کنیز کے لبوں سے نکل رہا تھا بادشاہ نے اس کو قریب بلایا اور وہ کانپتی ہوئی پاس آئی۔

[redacted]

بادشاہ نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ مجھے بتا تیرا کیا نام ہے"

کنیز۔ میرا نام سیفا ہے۔

بادشاہ۔ تو کس ملک کی ہے

کنیز۔ مصر کی ہوں

بادشاہ۔ تیرا باپ کون تھا۔

کنیز۔ میرے باپ کا نام پروکلس تھا اور روما کے لشکر میں سپاہی تھا۔ اس نے ایک مصری عورت سے شادی کی تھی جب میرے ماں باپ مرگئے تو مجھے گرفتار کرکے بطور ہدیہ کے لئے یہاں لے آئے

بادشاہ۔ تجھے روما میں کون لایا۔

کنیز۔ محافظ دستہ شاہی کا ایک افسر لیبدوس مجھے لایا تھا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ لیبدوس کو بلایا جائے۔ جب وہ سامنے آیا تو اُسے خنجروں سے ہلاک کرکے پانی میں ڈالدیا گیا اور دیکھنے والوں نے مسکراتے ہوئے آپس میں کہا کہ "آج بادشاہ سیر وتفریح میں مشغول ہے"۔

بادشاہ نے اس مصری کنیز سے کہا کہ "پھر وہی گا جو ابھی تو گا رہی تھی" اور دوسری کنیزوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔
کنیز کی دلدوز آواز بلند ہوئی اُس نے گانا شروع کیا:۔

دنیا میں بہت سے سمندر ہیں
لیکن تو سب سے زیادہ خوبصورت سمندر ہے

دنیا میں بہت سے دریا ہیں
لیکن تو سب سے زیادہ حسین دریا ہے

میری ماں تیرے کنارے گایا کرتی تھی
میرا بھائی تیرے ساحل پر کاشت کیا کرتا تھا
اے سب سے سمندروں سے زیادہ حسین سمندر
اور اے سب سے دریاؤں سے زیادہ دلکش دریا

یہ گاکر کنیز خاموش ہوگئی اور قیصر کی آنکھ سے آنسو ڈھلک پڑا

بادشاہ نے پوچھا۔ "اے لڑکی تو نے کس سمندر کا ذکر کیا"۔

کنیز "بحر اسکندریہ"

بادشاہ۔ اور دریا کونسا ہے۔

کنیز۔ "دریائے نیل"

بادشاہ۔ یہ گیت تجھے کس نے سکھایا؟

کنیز۔ میری ماں نے

بادشاہ۔ مجھے بھی یہ گیت یاد ہے۔ میری دایہ جونیا بھی تیری ماں کی طرح مجھے گود میں لیکر یہی گیت گایا کرتی تھی، لیکن میں نے جونیا کو ہلاک کر ڈالا"

یہ کہکر بادشاہ پر دفعۃً ایک سکوت طاری ہوا اور چہرہ پر ضمحلال پھیر رات کے سکون میں بادل کی گرج کی طرح وہ چیخ اٹھا کہ "آئینہ دنیا ناب مکدر ہوگیا ہے اس لئے اس جگہ کو فوراً چھوڑ دیا جائے، لیکن جانے سے قبل یہاں کوئی یادگار چھوڑنا ضروری ہے"۔ چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ سب لوگ کشتیوں سے اتر کر خشکی پر آجائیں اور کشتیوں میں سوراخ کردیا جائے تاکہ وہ تمام سامان کے ساتھ وہیں غرق ہوجائیں"

یہ حکم دیکر بادشاہ نے کنیز سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں تجھے قصر شاہی میں سب سے زیادہ معزز مرتبہ پر پہونچاؤنگا اور تجھے اپنے باغ کا بہترین پھول بنا کر رکھونگا"

یہ سنکر کنیز زار زار رونے لگی، کیونکہ حقیقتاً وہ اس وعدۂ انعام سے خوش نہ تھی اور وطن سے دور رہکر اُس کی زندگی نہایت تلخ گزر رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت کہ لوگ کشتیوں سے بھاگ بھاگ کر نیرو کے پیچھے پیچھے ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ دونوں سردار واپس آئے جو سازش کرنے والوں کو گرفتار کرنے گئے تھے اور عرض کی کہ قیصر کے دشمن گرفتار کر لئے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کتنے تھے۔ جواب ملا کہ "نو مرد تھے اور ایک عورت؟" بادشاہ نے دریافت کیا کہ "ان باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ سرداروں نے کہا کہ "ان کو ذبح کردیا گیا"

بادشاہ نے کہا "تم نے خوب کیا، لیکن اہل روما نے یہ دیکھکر کیا کہا"

سردار۔ "انھوں نے کہا کہ خدا قیصر کی عمر میں برکت دے"

قیصر ساحل پر ایک بلند جگہ بیٹھا ہوا ہے اور کشتیوں کے ڈوبنے کا منظر سامنے ہے۔ دفعۃً ایک کشتی کی طرف سے آواز آئی کہ :- "اے حسین ترین سمندر، اے جمیل ترین دریا"

بادشاہ چونک پڑا اور اس نے مصری کنیز کو آواز پہچان کر پوچھا "وہ کہاں ہے"؟ سب لوگ یہ سنکر خاموش رہے کیونکہ وہ کشتی سے باہر نہ آئی تھی اور ڈوب جانے ہی کے لئے وہاں رہ گئی تھی۔

آہستہ آہستہ کشتیاں ڈوب گئیں اور اُنھیں کے ساتھ مصری کنیز کا وہ گیت بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ جو بادشاہ کے کان میں اب بھی گونج رہا تھا

بادشاہ کی آنکھ سے دوسرا آنسو ٹپکا اور لوگ یہ کہکر خاموش ہوگئے کہ: "آج بادشاہ سیر و تفریح میں مشغول ہے"۔

نیاز

عہد نامۂ عتیق (توریت) کی روایات کا ماخذ اصلی

۱- آفرینش آدمؑ اور ان کے جنت سے نکلنے کی داستان
۲- طوفان نوحؑ اور برج بابل کی حقیقت
۳- موسیٰؑ کے احکام عشرہ کی اصلیت
۴- یونسؑ اور مچھلی کے واقعہ کی تحقیق

اس مضمون کا اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس مجموعہ کو "توریت مقدس" کہا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے - اور اس میں جو بڑے بڑے اہم واقعات (مثلاً عنوان بالا) بیان کئے گئے ہیں ان میں کہاں تک واقعیت پائی جاتی ہے اور یہ روایتیں کہاں سے لی گئی ہیں

ہر چند یہ روایتیں کم و بیش مسلمانوں کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اس وقت ہمیں ان سے کوئی بحث نہیں اور نہ ہم اس طرف کوئی توجہ کریں گے کہ اہل اسلام میں کیا روایات پائی جاتی ہیں اور کیا نہیں بلکہ ہماری تحقیق صرف "توریت مقدس" تک محدود رہے گی اور اسی کی روایات پر ہم تنقیدی نگاہ ڈالیں گے - اگر اس سلسلہ میں کسی طرف سے کوئی مضمون تائید میں یا تردید میں موصول ہوا تو ہم نہایت مسرت سے اسے نگار کے صفحات میں جگہ دیں گے کیونکہ ہمارا مدعا صرف تحقیق حق ہے اور بالکل علمی و تاریخی حیثیت سے ہم موضوع پر قلم اٹھا رہے ہیں -

امید ہے کہ ناظرین نہایت غور سے اس سلسلہ کا مطالعہ کریں گے -

نیاز فتحپوری

تمہید قبل اس کے کہ ہم اصل موضوع کو شروع کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور تمہید ناظرین کو یہ بتا دیں کہ عہد نامۂ عتیق کیا ہے، عہد نامۂ جدید کسے کہتے ہیں - بائبل کس چیز کا نام ہے توریت سے کیا مراد ہے اور اب علوم جدیدہ کے ماہرین اور علمائے مسیح کا ان کی نسبت کیا خیال ہے -

پیروان دین مسیح عام طور پر آج تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ چھیاسٹھ صحائف کا وہ مجموعہ (جس میں ۳۹ صحائف عہد نامۂ عتیق

کہلاتے ہیں اور ۲۷ صحائف عہد نامۂ جدید) اور جسے عرف عام میں "بائبل" (Bible) کہتے ہیں، مقدس کتب کا ایک اصلی اور مربوط سلسلہ ہے، جس میں خدا نے اپنی مشیت کا اظہار فرمایا ہے، مگر اب جوں جوں طبیعیات، فلکیات، کیمیا، آثار قدیمہ، طبقات الارض وغیرہ کی تدوین ہوتی جاتی ہے اور علوم کی روشنی سے بنی نوع انسان کے دل و دماغ منور ہوتے جاتے ہیں یہ راز بھی منکشف ہوتا جاتا ہے کہ کتب مقدسہ کی حقیقت کیا ہے۔ ان میں جو مختلف قصص و روایات نظر آتے ہیں ان کا اصلی ماخذ کیا ہے، عبرانیوں کے دل میں یہ خیالات کہاں سے پیدا ہوئے، اور یہ صحائف وقتاً فوقتاً کس طرح اور کن حالات میں لکھے گئے۔ ان کی تاریخ تصنیف یا تالیف کیا ہے۔ اور ان کے مصنفین کون ہیں۔

۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ امریکہ کی ریاست مغربی ورجینیا کی مجلس قانون ساز میں علم الارتقاء کی تردید کرتے ہوئے ایک پرانے خیال کے مسیحی مسٹر ولیم جیننگس برایان نے یہ فرمایا تھا کہ بائبل نظریۂ ارتقاء کی تردید کرتی ہے، اور چونکہ یہ نظریہ خدا کے الہام کے خلاف ہے اس لئے مردود ہے اور ہمیشہ مردود رہیگا۔ مسٹر برایان نے یہ بھی فرمایا کہ چونکہ "قائلین ارتقاء اس بات کو غلط اور جھوٹ سمجھتے ہیں کہ آفرینش عالم دفعۃً عمل واحد سے رونما ہوئی اس لئے نظریۂ ارتقاء کی وجہ سے بائبل پر لوگوں کا ایمان ضعیف ہوتا جاتا ہے اور جب لوگ ارتقاء کو ایک حقیقت یقین کر لیتے ہیں تو وہ انبیاء و اولیا کے معجزہ و کرامات کے منکر ہو جاتے ہیں اور وہ کسی طرح نہیں مانتے کہ یسوع دوشیزہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور دوبارہ آسمان سے نازل ہوں گے۔ اس لئے ہر چند ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ وہ اساتذہ جن کو سرکاری محاصل سے تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ اپنے طلبہ کو دین مسیحی کی تعلیم دیں۔ مگر ہم اس بات پر ضرور اصرار کریں گے کہ وہ سائنس یا فلسفہ کی آڑ میں طلبہ کو کوئی ایسی تعلیم ہرگز نہ دیں جو ایمان باللہ، ایمان بالکتاب کی بیخ کنی کرے، یا جس سے مسیح ابن اللہ کی وقعت زائل ہو جائے"

مسٹر برایان کی اس تقریر سے اس خوف کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے جو اہل کلیسہ کو علوم جدیدہ کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اب تحقیقات جدیدہ صرف ان روایات ہی کی منکر نہیں ہے جو توریت میں نظر آتی ہیں بلکہ سرے سے وہ اسی کی منکر ہے کہ یہ روایات حضرت موسیٰ یا ان کے ابتدائی جانشینوں کو معلوم تھیں

مسٹر برایان اور ان کے بہت سے ہم خیال لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بائبل کی تمام روایات مشیت ایزدی کے موافق بذریعہ الہام حاصل ہوئی ہیں اور اس سے قبل ان کا کہیں وجود نہ تھا، حالانکہ اب تحقیق جدید اور اکتشافات اثری نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ توریت میں جو محیر العقول روایات پائی جاتی ہیں وہ بنی اسرائیل کے وجود سے صدیوں قبل دیگر اقوام و ملل میں بھی پائی جاتی تھیں۔ نیز یہ کہ خود بنی اسرائیل نے بھی "صحف موسیٰ" کا نام کبھی نہ سنا تھا۔ اور یہ صحائف موسیٰ کی وفات سے صدیوں بعد وجود میں آئے ہیں۔

بائبل کیا ہے

عہد نامۂ عتیق (old testament) میں جو صحائف شامل ہیں وہ در اصل ایک مجموعہ ہیں قدیم عبرانیوں کی رزمیہ نظموں، غزلوں، گیتوں، روایتوں، کہاوتوں، وعظوں، مختصر افسانوں

اور ڈراموں کا جنھیں تاریخ سے بہت کم یا بالکل لگاؤ نہیں ہے۔

عہد نامۂ جدید کے لکھنے والوں نے بائبل کے صحائف کو "اسکرپچرس" (Scriptures) کے نام سے موسوم کیا ہے جس کے معنی محض "تحریریں" یا "کتابیں" ہیں اور بعض اوقات اُن کو "مقدس تحریریں" یا "کتب مقدسہ" بھی کہا گیا ہے۔ لفظ بائبل یونانی ہے جس کے معنی ہیں "کتابیں" قدیم و جدید عہد ناموں کے مجموعہ کا یہ نام یسوع ناصری کی ولادت سے چار سو برس بعد تک نہیں رکھا گیا تھا۔

قدیم زمانہ کے عیسائی جن کی زبان یونانی تھی انھیں "صحائف عہد نامۂ عتیق" اور "صحائف عہد نامۂ جدید" کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ پولوس نے پرانی کتابوں کا نام عہد نامۂ عتیق رکھ دیا تھا تاکہ اس سے اناجیل مسیح کو ممیز کیا جا سکے۔ اُس کے بعد ان قدیم عیسائیوں نے جن کی زبان لاطینی تھی اس کا ترجمہ "ٹسٹمنٹ" (Testament) کر لیا جس کے معنی وصیت کے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب بائبل کے دو حصے "عہد نامۂ عتیق (Old Testament) اور "عہد نامۂ جدید" (New Testament) کہلاتے ہیں۔

یسوع کے زمانہ میں یہ "کتب مقدسہ" دو صورتوں اور دو زبانوں میں تھیں۔ یعنی ایک مجموعہ عبرانی زبان میں تھا اور دوسرا یونانی میں اسی کو "سبع صحف توراۃ" (Septuagint) کہتے تھے۔ بعد ازاں اس کا ترجمہ فلسطینی یہود کی زبان یعنی آرامی (Aramaic) میں کیا گیا اور اس کا عام نام تارگم (Targum) رکھا گیا اس کے بعد بائبل کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ قرون وسطیٰ میں مغربی کلیسا کے اندر رائج رہا۔ اسی لاطینی ترجمہ سے سنہ ۱۳۸۲ء میں وکلیف نے انگریزی زبان میں پوری بائبل کا ترجمہ کیا۔ الغرض عہد نامۂ عتیق کا کوئی عبرانی نسخہ نویں صدی عیسوی سے قبل کا اور عہد نامۂ جدید کا کوئی اصلی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے قبل کا نہیں پایا جاتا۔

پنج کتب موسیٰ (Pentateuch) کو بزمانۂ یسوع یہودی لوگ "ناموس موسیٰ" یا "توراۃ" کہا کرتے تھے اس کا ترجمہ سنہ ۲۸۵ ق م میں حسب الحکم بطلیموس فلاڈلفس یونانی زبان میں ہوا۔ صاف ظاہر ہے کہ موسیٰ کی لکھی ہوئی کسی عبرانی بائبل کا نام لاطینی زبان میں تجویز ہو سکتا تھا۔ کیونکہ موسیٰؑ کے زمانہ میں لاطینی زبان کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ بائبل میں چار کتب موسیٰؑ کا نام یونانی ہے یہ کیونکر ممکن تھا کہ موسیٰؑ اپنے زمانہ میں اپنی کتابوں کا نام یونانی زبان میں رکھتے جبکہ ان کے زمانہ میں یونانی زبان کا نام بھی کہیں سننے میں نہ آتا تھا۔ عبرانی بائبل میں ہر کتاب کا نام اس کے ابتدائی لفظ یا چند الفاظ پر رکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کا نام موسیٰ کی پہلی کتاب الموسوم بہ کتاب "پیدائش" ہو

لہ کہتے ہیں کہ بائبل کی کتابوں کو ابواب یا فصلوں کی صورت میں اسٹیفن لینگٹن مقف اعظم کینٹربری نے سنہ ۱۲۰۰ء میں تقسیم کیا۔ اور آیات کے نمبر سب سے پہلے ربی اسحاق ناتھن نے اپنی عبرانی قاموس (۱۴۳۷ تا ۱۴۴۷ء) میں ڈالے

عبرانی زبان میں اس کتاب کا نام ایک عبرانی لفظ "برشیث" (Bereshith) ہے جسکے معنی "ابتداء" کے ہیں۔ دوسری کتاب کا نام "ویلہ شموث" (Vaeleh Shemoth) ہے جسکے معنی ہیں "پس یہ نام ہیں" وقس علیٰ ہذا۔ اسی طرح پنج کتب موسیٰ کی پہلی یا کسی دوسری کتاب میں موسیٰ کا نام نہیں آیا ہے بائبل میں ایک کتاب کا نام "نمبرس" (Numbers) یعنی گنتی ہے۔ اور دوسری کا نام "دوتر ونمی" (Deuteronomy) یعنی "استثنا" ہے ان میں پہلا نام لاطینی اور دوسرا یونانی ہے۔

یسوعؑ کے زمانہ کے یہودی باستثنا کاہنوں اور علماء کے عبرانی زبان کی کتب مقدسہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی زبان بول سکتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں عبرانی ایک مردہ زبان ہو گئی تھی۔ یسوعؑ اور اس کے مریدوں کی زبان آرامی تھی۔ اور اس کا تعلق عبرانی زبان سے ایسا ہی تھا جیسا انگریزی کا جرمن زبان سے یا اطالوی کا لاطینی سے۔ لہٰذا عہد نامہ جدید میں "عبرانی زبان" کے جو الفاظ آئے ہیں ان کا مطلب آرامی زبان کے موافق لیا گیا ہے جسے اس زمانہ کے عبرانی بولتے تھے۔

اب یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتابیں جنھیں اس وقت عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں کہاں سے آئیں؟ انھیں کس نے لکھا؟ اور وہ کب لکھی گئیں؟ ان سوالوں کا جواب دینا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر کے مصنفین کا نام معلوم نہیں اور نہ ان کی تصنیف یا تالیف کا زمانہ یقینی ہے۔ مگر چونکہ گذشتہ صدی کے اندر قدیم عبرانی کتب کے متعلق بہت کچھ تحقیق کی جا چکی ہے اس لئے تنقید عالیہ کی روشنی میں ان کتب کے زمانۂ تصنیف اور ان کی تاریخی ترتیب کا قابل اعتماد طور پر اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور جو روایات ان کتب مقدسہ میں بھری پڑی ہیں ان کے ماخذ کی نسبت تو کسی قسم کا شبہہ مطلق باقی نہیں رہا۔

پنج کتب موسیٰ کس نے لکھیں؟

تنقید عالیہ ہم کو بتاتی ہے کہ توراۃ کی پانچوں کتابیں کم از کم دو آدمیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک شخص یہووائی (Jehovist) تھا اور دوسرا شخص "الوہیمی" (Elohist) اور ان دونوں مصنفوں نے قدیم مصنفوں کی کتب سے مواد لیکر اپنی کتابیں تالیف کیں۔

یہ امر بھی قطعی یقینی ہے کہ وہ دستاویزات جنھیں "پنج کتب موسیٰ" کہتے ہیں ۹۰۰ ق م سے پیشتر نہیں لکھی گئی تھیں اور سلیمانؑ کے زمانہ میں (۹۵۵ لغایۃ ۹۲۵ ق م) کوئی عبرانی بھی ان کتب کے ناموں سے واقف نہ تھا۔ قدیم ترین عبرانی "تحریریں" وہ ہیں جو بعض ظروف گلی کے ٹکڑوں پر بحروف سیاہ لکھی ہوئیں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ ٹکڑے یا ٹھیکرے سامریا کے ان خرابوں میں سے برآمد ہوئے ہیں جن کی نسبت یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ احاب (Ahab) کے محل کے کھنڈر ہیں جن کا زمانہ مسیح سے ساڑھے آٹھ سو برس پیشتر ہوا ہے۔ ان ٹکڑوں کا انکشاف ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ نیلی

حروف تہجی کی قدیم ترین صورت کا انکشاف ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا۔ اور یہ فنیقی کتبہ زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ برس قبل مسیح کا ہے۔ یہی وہ حروف تہجی ہیں جن پر عبرانی، یونانی، رومی اور انگریزی حروف کی بنیاد قائم ہے۔ یہ کتبہ موسیو مونتے اور دوسنت مشہور فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ نے ایک مقبرہ میں اس مقام پر دریافت کیا تھا جہاں ساحل بحیرۂ روم پر کسی زمانہ میں مشہور قدیم شہر بائیلوس آباد تھا۔ یہ کتبہ ایک تابوت پر کندہ تھا۔ اور صاحب تابوت رعمسیس دوم فرعون مصر کا ہمعصر تھا۔ یہ مقام فلسطین کے شمال میں اس علاقہ کے اندر واقع ہے جو کبھی فنیقیوں کے قبضہ میں تھا۔ درحقیقت اس جگہ دو بادشاہوں کے مقبرے تھے جن کا زمانہ حضرت سلیمان سے پیشتر گذر چکا تھا۔ اور ملک موآب (Moab) میں جو پتھر فنیقی حروف کے کتبہ کا برآمد ہوا تھا۔ وہ ۹۰۰ سال قبل مسیح کا ہے۔ اس لئے یہ رائے قائم کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ "پنج کتب موسیٰ" اس زمانہ سے ۲۰۰ برس بعد لکھی گئی تھیں۔

بائبل کے بہت سے علماء کا قول ہے کہ کتاب المیثاق (جو موجودہ بائبل میں کتاب خروج کے باب ۲۰ تا باب ۲۳ ہے) سب سے پرانی عبرانی کتاب ہے اور وہ لوگ اس کتاب کی تاریخ تحریر ۱۲۵۰ برس قبل مسیح یعنی عبرانیوں کے خروج مصر سے کچھ عرصہ بعد کی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گلیڈن کا خیال ہے کہ غالباً یہی پارے خود موسیٰ کے لکھے ہوئے ہیں یہی خیال بعض دیگر علماء فضلاء کا ہے۔ "پنج کتب موسیٰ" کے بقیہ حصص کی نسبت کوئی فاضل شخص یہ یقین نہیں کرتا کہ خود موسیٰ کی یا زمانۂ موسیٰ کی لکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ مشہور ولندیزی فاضل پادری ڈاکٹر ہے نیبرٹ لکھتے ہیں کہ:۔

توریت بھر میں بجز احکام عشرہ کے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حقیقتہً موسیٰ سے تعلق رکھتی ہو۔۔۔۔ ان کتابوں کے مصنفین نے یہ ترکت کی کہ اپنے تمام قصوں کا مرکز موسیٰ کو بنا کر یہ کتابیں لکھیں اور پھر انھیں موسیٰ کے نام سے منسوب کر دیا۔ (ملاحظہ ہو نیبرٹ صاحب کی کتاب "بنی اسرائیل کا مذہب" مطبوعہ شہر بوسٹن ۱۸۸۲ء صفحہ ۹) جس قدر تحقیق و تدقیق کے ساتھ توراۃ کا مطالعہ نیٹال کے فاضل اجل پادری رائٹ ریورینڈ جان ولیم کولنسو عالم دینیات نے کیا ہے، اس قدر کسی دوسرے شخص نے ہرگز نہ کیا ہوگا۔ پادری صاحب موصوف اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "پنج کتب موسیٰ یا توراۃ" میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا موسیٰ سے کوئی تعلق ہو۔ دراصل انگریزی ترجمہ میں توراۃ کا نام "پنج کتب موسیٰ" لکھا گیا ہے۔ اور مسیحی کلیسا کے مشہور بزرگان قدیم کی تقلید کی گئی ہے۔ جن میں سے باستثنا اجیروم اور غالباً اوریجن ہر شخص عبرانی زبان سے بہت کم واقف تھا اور اس کی تنقید تو مطلق نہ جانتا تھا۔

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اسیری بابل سے قبل بنی اسرائیل کے قبضہ میں کوئی مقدس کتاب نہ تھی۔ ہاں بعض احکام شریعت تحریری صورت میں اور چند تاریخی کتابیں ان کے پاس ضرور ہوں گی۔ اور غالباً قدیم زمانہ کے چند نوحے بھی عہد داؤد میں قلمبند کر لئے گئے ہوں گے۔ (تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح) اور شاید حضرت سلیمان کے زمانہ (۹۵۵ تا ۹۲۵ ق م) کی بھی کچھ امثال تحریر کر لی گئی ہوں۔ بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح سے پیشتر

کی بعض پیشگوئیاں بھی بصورت تحریر موجود تھیں۔ مگر ڈاکٹر فیرش اور اس زمانہ کے اکثر علماء و فضلاء کا یہ قول ہے کہ ان کتابوں کو الہامی بنانے کا خیال کسی کے دل میں نہ آیا تھا۔ سب سے پہلے شخص عزیر (Ezra) تھے جنھوں نے پانچوں کتابوں کا (سنہ ۴۴۴ ق م) بنی اسرائیل میں رواج دیا اور یہی ——— سنہ ۴۵۸ ق م میں ان تحریروں کو بابل لائے تھے عزیر کے ابتدائی زمانہ میں کوئی دوسری کتاب جو بشتر سے موجود تھی اس قدر مستند نہیں سمجھی جاتی تھی جس قدر کہ پنج کتب تورات۔ الغرض عزیر کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا "توراۃ" کو الہامی کتاب سمجھا جانے لگا۔

تالمود ایسی بہت سی کتب کا مجموعہ ہے جس میں یہودی روایات درج ہیں ان کتب میں ایک کتاب موسوم بہ "پرقہ ابت" (Pirke Aboth) یعنی "اقوال بزرگاں" بھی ہے۔ اور یہ کتاب تالمود کی قدیم ترین کتب یا صحیفوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطابق عزیر نے اپنی قوم کی کتب مقدسہ کو خدا کے حکم سے از سر نو قلمبند کیا اور انھیں "خدا کی روح کی دی ہوئی کتابیں" بتاکر اپنی قوم میں جاری کیا۔ یہودیوں کو یقین تھا کہ جب سنہ ۵۸۶ ق م۔ میں بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس (یروشلم) فتح کرکے ہیکل سلیمانی کو نذر آتش کردیا۔ اور بہت سے یہودیوں کو گرفتار کرکے بابل لے گیا۔ اس وقت یہودیوں کے اصلی مخطوطات بھی آگ میں جل گئے تھے۔

مگر اب معلوم ہوا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے میں عزیر نے کوئی جدت نہیں کی۔ بلکہ انھوں نے صرف یہ کیا کہ "پنج کتب موسیٰ" جو پہلے سے موجود تھیں ان کو لیکر آزادانہ طور پر مرتب کردیا یعنی جو باتیں ان کو پسند نہ تھیں وہ نکال دیں اور ان کی جگہ اپنی طبیعت کے موافق اور باتیں اضافہ کردیں۔ عزیر کے بعد بھی ان میں بہت کچھ قطع و برید اضافہ و تحریف ہوتی رہی یہانتک کہ سنہ ۲۸۰ ق م میں بھی ایسا ہی ہوا جبکہ ان کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا گیا تھا۔

"پنج کتب موسیٰ" یونانی ترجمہ سے قبل بھی کئی بار مرتب کی گئیں اور ہر مرتبہ ان میں ترمیم و تحریف کی گئی۔ سب سے پہلے ان کتابوں کو سنہ ۷۲۲ ق م میں مرتب کیا گیا جبکہ بنی اسرائیل کو سارگون دوم شاہ آشوریہ (۷۲۲ لغایتہ ۷۰۵ ق م) مغلوب کرچکا تھا۔ اس وقت بنی اسرائیل کی سلطنت کا دارالحکومت شہر سامریہ تھا جہاں سے کئی ہزار ممتاز و سربرآوردہ یہودیوں کو اسیر کرکے آشوریہ میں لیجایا گیا اور ان کی جگہ بابل، آشوریہ اور ایران کے بہت سے آدمی لاکر آباد کئے گئے۔ اس اسیری اور میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبرانیوں نے دیگر ممالک والوں کی روایات "پنج کتب موسیٰ" میں داخل کردیں۔ اور چند خیالات و واقعات وہ بھی شامل کردیئے جو صرف بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس صورت میں یہ پانچوں کتابیں سنہ ۶۲۱ ق م تک رہیں جبکہ ایک کاہن مسمی خلقیاہ نے وہ احکام لکھے جو آج کل کتاب استثنا میں باب ۱۲ یعنی ۱۲ سے لیکر باب ۲۶ تک اور باب ۲۸ میں درج ہیں۔

جب یوشع بن امون بادشاہ ہوا تو اس کو "توریت" والی جماعت نے اپنے زیر اثر کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلقیاہ کی لکھی ہوئی شریعت کو پہلی مرتبہ یہودیا میں جاری کیا گیا اور اس کے بعد ہی خلقیاہ کی کتاب کو "توراۃ" کے محرر اول کی

کتاب میں شامل کر دیا گیا۔ اور اس میں چند ایسی عبارتوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا جن کا تعلق یوشع بن نون جانشین حضرت موسیٰ سے تھا۔

خلقیاہ کا دعویٰ تھا کہ اسے "شریعت موسوی کی کتاب" دستیاب ہوئی ہے جو خود حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی ہے حالانکہ لطف یہ ہے کہ اس میں خود موسیٰ کی وفات اور تجہیز و تکفین کا حال بھی درج ہے۔

اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو فن تحریر معلوم تھا۔ اگر حضرت موسیٰ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے بھی تھے تو وہ مصری یا فنیقی حروف لکھ پڑھ سکتے ہوں گے اور تاریخ الالسنہ کے ماہر خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ یوشع بن آموں اور اس کا میر منشی صافن کسی ایسی کتاب کو ہرگز نہیں پڑھ سکتے تھے جو اُن کے زمانہ سے آٹھ سو برس پیشتر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس واقعہ پر پادری رینان نے خوب لکھا ہے کہ خلقیاہ کاہن کا کتاب توریت پانا یقیناً ایک متقیانہ فریب تھا۔

ڈاکٹر لائمین ایبٹ (Lyman Abbot) کا خیال ہے کہ توریت کی کتاب استثنار قبل مسیح ۶۹۰ اور ۶۴۰ کے درمیان کسی وقت لکھی گئی تھی۔ اور یہ کتاب ۶۲۱ قم میں واقعی خلقیاہ کو ملی تھی ڈاکٹر گلیڈن کا خیال بھی یہی ہے کہ واقعی خلقیاہ کو بعض پرانی کتابیں ملی تھیں مگر اس نے ان میں کہیں کہیں ترمیم اور کہیں اضافہ کر دیا تھا۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر گلیڈن تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"یسوع اور اس کے حوارئین سے ہمیں ان کتب قدیمہ کی تصنیف کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ کا توراۃ کے پانچوں پارے لکھنا یہ ایک قدیم روایت تھی جو مسیح کے زمانہ کے یہودیوں میں ایک زمانہ سے چلی آتی تھی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے حضرت موسیٰ سے بذریعہ الفاظ خطاب کیا اور حضرت موسیٰ کے الفاظ کو قلمبند کر لیا۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ جب اہل کلدانیہ نے یہودیوں پر حملہ کیا تو ان کی تمام کتب مقدسہ نذر آتش ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد عزیر نے ان تمام کتابوں کو اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ لیا۔ دوسری روایت اسی بارہ میں تھی کہ ایک روز عزیر کو ہاتف نے ندا دی کہ تم پانچ زود نویس کاتبوں کو ساتھ لیکر ایک کھیت میں جاؤ چنانچہ وہاں پہونچکر عزیر کا منہ کھل گیا اور پھر وہ چالیس روز تک بند نہ ہوا اور وہ لگاتار لکھواتا رہا حتی کہ ۲۰۴ کتابیں اسی طرح لکھوا دیں مگر اس سے قبل اس نے ایک لبریز جام پی لیا تھا جس کا رنگ آتشیں تھا...... اور جب وہ یہ جام چڑھا گیا تو اس کے دل سے سمجھ بوجھ کی باتیں نکلنے لگیں اور اس کے دماغ میں عقل و دانش پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کی طاقت نے اس کے حافظہ کو قوی کر دیا تھا"

الغرض اس قسم کے افسانے یہودیوں میں بہت مشہور تھے۔ اور کلیسائے مسیح کے پرانے بزرگ مثلاً آرینیاؤس، ترتولین، اور آغسطائین وغیرہ بھی ان کو صحیح باور کرتے تھے۔ مگر ان کا اعتقاد بھی اس وقت متزلزل ہو جاتا تھا جب وہ کتاب پیدائش کو آفرینش عالم کا صحیح واقعہ سمجھنے پر مجبور ہوتے تھے چنانچہ سینٹ آغسطین (۴۳۵ لغایة

۳۴۰ء) [illegible] نے بھی جو بزرگان کلیسا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے، یہ کہدیا تھا کہ آفرینش عالم اور ہبوط آدم کے قصے تمثیلی داستانیں ہیں۔

اوریجن (Origen 185-254 A.D) جو بہت ممتاز ماہر مذہب خیال کیا جاتا ہے کہتا ہے کہ:- "کون شخص اس قدر احمق ہوگا، جو سمجھے کہ خدا نے باغبان کی طرح عدن میں درخت لگائے تھے؟ حالانکہ کتاب پیدائش باب ۲ آیت ۸ میں لکھا ہوا ہے کہ "خداوند خدا نے عدن میں مشرق کی طرف ایک باغ لگایا اور اس میں رکھا آدم کو جسے اس نے بنایا تھا زمین کی مٹی سے"۔

اس کے ساتھ ہم یہ بھی دریافت کر سکتے ہیں کہ کون ایسا صاحب عقل و فہم انسان ہے جو یہ سمجھے گا کہ ایک ہی "علیم بالغیب" مصنف کتاب پیدائش کے باب ۱ آیت ۲۷ میں تو یہ لکھے کہ "خدا نے پہلے روز انسان کے نر و مادہ دونوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اور پھر اسی کتاب کے باب ۲ آیت ۷ میں لکھے کہ "خداوند خدا نے زمین کی خاک سے تنہا آدم کو بنایا" اس کے بعد کی آیت ۲۲ میں یہ الہام ہو کہ "اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا"۔

بات یہ تھی کہ مٹی کی چیزیں بنانے کا فن عہد قدیم میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ اول اول وہ لوگ صرف ایسی چیزیں مٹی سے بناتے تھے جو ان کی ضرورت کی ہوتی تھیں۔ پھر انسانوں اور بعد ازاں دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں بھی مٹی سے بنانے لگے۔ پروفیسر کلیفورڈ ایچ فار لکھتے ہیں کہ جب ان قدیم زمانہ کے کاریگروں کا خیال زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تو ان کی قوت شعور نے ان میں یہ عقیدہ پیدا کیا کہ خود انسان کو بھی کسی اعلیٰ ہستی نے ازل میں مٹی ہی سے بنایا تھا۔ یہی پروفیسر فار اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اہل بابل اپنے سب سے بڑے دیوتا کو "نغل" یا "بغل" کہا کرتے تھے۔ جس کے معنی ہیں "کمہار" کے۔ اور اہل مصر بھی اپنے بڑے دیوتا کو "خنوم" کہا کرتے تھے اس مصری لفظ کے معنی بھی "کمہار" کے ہیں۔ عبرانیوں میں انسان کو "آدم" کہتے ہیں۔ اور "ۃ" ان کے یہاں علامت تانیث ہے۔ مگر "آدمۃ" کے معنی ان کے یہاں مٹی کے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود عبرانی زبان ہی اس عقیدہ کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔

ہماری رائے میں پروفیسر فار کا خیال اصولاً صحیح ہے مگر وہ حقیقتاً صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عبرانی زبان میں جو قصہ آفرینش آدم کا پایا جاتا ہے وہ خود عبرانیوں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے ہم آگے چلکر یہ بتائیں گے کہ روایات توراۃ کا اصلی ماخذ کیا ہے۔

آفرینش و ہبوط آدم

توریت میں آفرینش عالم کے متعلق جو بیان دیا گیا ہے اس میں اس قدر تناقض و اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہرگز کچھ صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ ہم یہاں

دں کی تفصیل پیش نہیں کریں گے کیونکہ وہ ایک طرح ہمارے موضوع سے علیحدہ بھی ہے اور اس کا ذکر یہاں مفید و دلچسپ نہیں ہو سکتا۔

ہمارا اصل موضوع سخن یہ ثابت کرنا ہے کہ توریت کی روایتوں کا اصلی ماخذ کیا ہے اور اس لئے ہمیں توریت کی روایات کے تناقض سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

سب سے پہلے آفرینش آدم سے لیکر واقعہ یہودا تک کی تمام ان تفصیلات کو لیجئے جو توریت میں پائی جاتی ہیں اور جن سے تقریباً ہر مسلمان واقف ہے۔ یعنی خدا کا چھ دن میں کائنات کی مختلف مخلوقات کو پیدا کرنا، ساتویں دن آرام کرنا، آدم و حوا کی پیدائش، باغ عدن میں انکا قیام، شجر ممنوعہ کے پاس نہ جانے کا حکم، سانپ کا اغوا اور پھر آدم کا اس درخت کے پاس جا کر پھل کھانا، وغیرہ وغیرہ۔

توریت کو الہامی کتاب ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ تمام واقعات دریعہ وحی، خدا کی طرف سے بتائے گئے ہیں دوسرے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ سے قبل کسی کو ان حقیقتوں کا علم نہ تھا۔ حالانکہ جسوقت ہم آثار قدیمہ اور باقیات عہد عتیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے سب یا اکثر اعتقادات ایسے ہیں جو حضرت موسیٰ سے بہت قبل دنیا میں پائے جاتے تھے اور یہ خیالات غالباً ایران اور دیگر مشرقی ممالک سے سرزمین فلسطین میں آئے۔ کیونکہ جب آشوریوں نے فلسطین کو فتح کیا اور غیر ملکی لوگ وہاں آباد ہوئے تو اپنے ساتھ وہ تمام افسانے بھی لائے جو اُن کے یہاں رائج تھے۔ چنانچہ افسانۂ عدن ہی کو لیجئے جو مصر، جنوبی ہندوستان، چین، ایران، کلدان، فنیقیہ اور قدیم میکسیکو تک میں بیان ہوتا تھا۔

فرنکلن نے اپنی کتاب "بدھ مت والے اور جینی" میں لکھا ہے کہ "ہمارے اولین والدین (آدم و حوا) کے ہبوط کے واقعہ کی ایک نہایت دلچسپ تصویر پتھر پر کھدی ہوئی ملک نوتبہ میں مقام اِپسا مبول کے ایک شاندار مندر میں سیاح ولسن نے دیکھی تھی۔ سیاح موصوف بیان کرتے ہیں کہ اس غار میں آدم و حوا کی تصویر ٹھیک زندگی کی سی ہے۔ جو باغ عدن میں بتائی جاتی ہے اس میں سانپ کو درخت کے گرد لپٹا ہوا نہایت خصوصیت کے ساتھ دکھایا ہے۔ ایسی ہی ایک تصویر کرنیل کو میس بھی لائے تھے۔ یہ تصویر جنوبی ہندوستان کے ایک مندر میں یک سنگین دیوار پر کندہ تھی۔ اس تصویر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہمارے آدم و حوا بہشتی درخت کے نیچے کھڑے ہیں۔ اور درخت کی گنجان شاخوں میں لپٹا ہوا ایک سانپ چھپا ہے جو اپنے منھ میں اس درخت کا پھل لئے ہوئے آدم و حوا کو کھانے کی ترغیب دے رہا ہے۔"

مجوسیوں میں جو باغ عدن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ ایرانیوں کے خدائے خیر ہورامزدا نے سب سے پہلے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لئے آرام و راحت کے جملہ سامان بہم پہونچائے۔ جس طرح بائبل کی کتاب

پیدائش کے مطابق ایلوہیم نے تکوین عالم کے کام کو چھ دن میں ختم کیا تھا اسی طرح ہورامزدا نے تکوین کے کام کو چھ اوقات میں درجۂ تکمیل تک پہونچایا اور مرد و عورت کو اس نے بھی چھٹے روز پیدا کیا ــــ مرد کا نام اُس نے "آدمہ" اور عورت کا نام "ایوہ" (Evah) رکھا تھا۔ ساتویں دن ہورامزدا نے آرام کیا۔ یہ دن سنیچر یعنی زحل کا تھا۔ قدیم ملک اترودریہ (اطالیہ) کی روایت آفرینش بھی قریب قریب مجوسیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے۔ ڈاکٹر طامس انمان لکھتے ہیں کہ ایرانیوں کے ساتھ میل جول ہونے سے پیشتر عبرانیوں کے یہاں ہفتہ کا دن یوم السبت نہیں مانا جاتا تھا۔ دیگر قومیں اس دن کو اپنا مقدس دن خیال کرتی تھیں۔ چنانچہ انھیں دیگر اقوام و ملل کے لوگوں سے لیکر عبرانیوں نے بھی یہ رسم اختیار کر لی۔

مجوسیوں کی روایت میں لکھا ہے کہ اہرمن نے ہورامزدا کے خلاف بغاوت کی اور وہ دنیا کی تمام برائیوں کا بانی "خدائے شر" بن گیا۔ (بائبل میں اسی کا نام "شیطان" رکھا ہے) ایک خاص قسم کا پھل کھاکر اہرمن نے اپنی ہیئت سانپ کی سی بنالی۔ اور زمین پر لوگوں کو بہکانے لگا۔ وہ لوگوں کو عیش پرستی، انتقام، ظلم و ستم، دروغگوئی اور افترا پردازی وغیرہ کی ترغیب دیتا تھا۔ سب سے پہلے مرد و عورت کو ایک عجیب و غریب درخت "ہوم" (یہی سنسکرت میں "سوم" ہے) کا پھل کھلاکر اُس نے اُن کے دلوں میں بُرے خیالات پیدا کر دیئے جس کے باعث وہ گرا دیئے گئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے جانوروں کو مارا اور اُن کی کھالوں سے اپنی تن پوشی کی۔ ہورامزدا اور اہرمن کی اس جنگ کی وجہ سے اب دنیا کے ہر حصہ میں خیر و شر پائے جاتے ہیں۔ مگر مجوسیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایک زمانہ وہ آئیگا جبکہ پرستاران ہورامزدا کو فتح حاصل ہوگی، اہرمن مغلوب ہوگا۔ اس وقت امن و صلح، اخوت اور مسرت دنیا میں پھر قائم ہو جائیگی۔

اہل میدیا (Media) اور ایرانیوں میں تقریباً سنہ ق م ایک نبی بنام زردشت (زرتشترا) مبعوث ہوا۔ جس نے ایران کے قدیم مذہب کی اصلاح کی۔ اس کے زمانہ کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ عہد سائرس (Cyrus) سے لیکر جو ۵۵۰ برس قبل مسیح گذرا ہے، اسکندر اعظم کے ہاتھوں ایران فتح ہونے تک تمام مغربی ایشیا میں دین زردشتی ہی کا غلبہ تھا۔ تکوین عالم کے متعلق مجوسیوں کے یہاں جو کچھ روایات ہیں ان کا علم ہم کو خاص طور پر پارسیوں کی کتاب "ژندا وستا" سے حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فان بولین لکھتے ہیں کہ:- بائبل کی کتاب پیدائش کے قصوں اور ژند کے بیان میں نہایت ہی گہرا تعلق اور مطابقت پائی جاتی ہے۔

مسٹر جارج اسمتھ نے (جن کا تعلق برٹش میوزیم کے شعبۂ قدیمیات مشرقیہ سے ہے) ایسی آشوری الواح گلی کھود نکالی ہیں جو ۵۰۰ اسے لیکر دو ہزار سال قبل مسیح کی ہیں یعنی حضرت موسیٰ کی پیدائش سے بھی صدیوں قبل کی ان الواح گلی پر آفرینش عالم، ہبوط آدم، برج بابل، انتشار اقوام و ملل اور طوفان نوح کا حال بالکل ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ خط میخی کے یہ کتبے مکمل نہیں ہیں۔ یعنی ان قصص کا کچھ اہم حصہ ضائع ہوگیا ہے۔ یعنی جس حصہ میں درخت سانپ اور طوفان نوح کے حالات درج ہیں اس کا کچھ ٹکڑا ضائع ہوگیا ہے مگر سرزمین بابل سے بعض ایسے جواہرات دستیاب ہوگئے ہیں جن پر باغ عدن کے واقعات کی تصویریں کندہ ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں انکی روایات میں شامل تھیں۔

بائبل کی کتاب پیدائش میں جس "شجرۃ الحیوٰۃ" کا ذکر ہے وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ خداوند آنو (Anu) کا مقدس باغیچہ تھا۔ جس کی نگہبانی ایسی تلوار کے ذریعہ سے ہوتی تھی جو چاروں طرف گھومتی تھی۔ اس مقدس درخت کی تصویر مع "محافظ فرشتوں کے" مسٹر اسمتھ نے ایک آشوری استوانہ سے نقل کرکے اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر دی ہے اور اسی صفحہ پر ایک دوسری تصویر بھی ہے جس میں دو آدمی درخت کے ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھل توڑنے کے لئے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ ان آدمیوں میں جو عورت ہے اس کی پشت پر سانپ کی تصویر کھنچی ہوئی ہے۔ اصلی تصویر برٹش میوزیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مسٹر اسمتھ لکھتے ہیں کہ:- ہم خوب جانتے ہیں کہ ان قدیم کتبوں میں اس قسم کی تصویریں خیالی یا اتفاقی نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ واقعات گذشتہ یا مفروضہ واقعات کے مناظر ہیں اور یہ واقعات ان کی قدیم روایات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہبوط آدم کا جو قصہ بائبل کی کتاب پیدائش میں دیا گیا ہے وہی قصہ قدیم زمانہ کے اہل بابل کو بھی معلوم تھا۔

جو آشوری کتبے مسٹر اسمتھ نے برآمد کئے ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو آشور بانی پال (۶۶۸ لغایۃ ۶۲۶ ق م) کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ الواح کلی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اصلی نہیں ہیں، بلکہ قدیم الواح کی نقلیں ہیں اور بھی زیادہ پرانی ہونگی۔ اہل آشور یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لٹریچر ان کے یہاں بابلی ذرائع سے آیا تھا اور خط میخی کے ان کتبوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ:- ۲۵۰۰ اور ۱۵۰۰ ق م کے درمیانی زمانہ میں اہل بابل بھی انھیں عقاید کے ماننے والے تھے جو بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کئے گئے ہیں۔

مسٹر پیر پانٹ مارگین کے پاس قدیم کتبے یا نقوش کے ٹکڑے ایسے موجود ہیں جن میں طوفان نوح کا حال درج ہے۔ اور یہ اکیس سو برس قبل مسیح کے ہیں۔ مگر ان ٹکڑوں کی نسبت بھی یہ خیال ہے کہ وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اور زیادہ قدیم کتبوں کی نقلیں ہیں۔

۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ موسیو امیلی بات نے نینوا کے قریب ایک ترکی گاؤں خورس آباد میں کھدائی شروع کی۔ یہاں مزدور کھودتے کھودتے بہت جلد ایک آشوری محل کے کھنڈر تک پہونچ گئے جو کسی زمانہ میں شاہ سارگون دوم (۷۲۲ لغایۃ ۷۰۵ ق م) کا قصر شاہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ایک جوشیلے نوجوان انگریز مسمی آسٹن ہنری لیارڈ نے نمرود کے بڑے ٹیلے کے نیچے قدیم شہر قلاہ کھود نکالا۔ اس کے بعد اس نے وہ قصر شاہی

برآمد کیا جو نینوا میں سناخریب (۷۰۵ لغایتہ ۶۸۱ ق م) نے تعمیر کیا تھا۔ اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ سنگ موسیٰ کی چند لوحیں برآمد ہوئی تھیں جو اس وقت ییل یونیورسٹی کے مجموعہ میں داخل ہیں۔ ان کی سطح پر ایک پیغام باستانی ایسے رسم الخط میں تحریر ہے جو مسیح سے غالباً ۲ ہزار سال پیشتر رائج تھا۔

۱۹۲۴ء میں خرابۂ شہر کش میں جو عراق کی ایک قدیم سلطنت کا پایہ تخت تھا لکھی ہوئی اینٹیں دستیاب ہوئی تھیں اور ایک بہت بلند برج کے باقیات نمودار ہوئے تھے جس کی تعمیر جدید جیسا کہ اینٹوں کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے زائد از چار ہزار سال قبل ہوئی تھی۔ توقع کی جاتی ہے کہ جب اس تعمیر کے تمام حصوں کو صاف کیا جائیگا تو سات ہزار برس قبل مسیح کے زمانہ کی لکھی ہوئی تاریخ برآمد ہوگی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج غالباً وہی ہے جو قدیم روایات میں برج بابل کے نام سے پکارا گیا ہے اور اس کا تعلق طوفان نوح سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ نیز شمس اللونہ کی مہری اینٹیں بھی برآمد ہوئی ہیں جو بابل کے اول خاندان شاہی کا ساتواں بادشاہ تھا۔ (اس کا زمانہ ۲۰۸۰ لغایتہ ۲۰۴۳ ق م ہے) ان اینٹوں کی تحریر کا ترجمہ بھی کر لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسی خاندان شاہی کے دوسرے بادشاہ شمس الایلو (۲۲۱۱ لغایتہ ۲۱۷۶ ق م) کی سلطنت کے زمانہ کی بھی منقوش اینٹیں برآمد ہوئی ہیں ایک قدیم مندر بھی برآمد ہوا ہے جو شمس الایلو بادشاہ نے جنگ کے دیوتا ایل بابا کے نام پر بنا ہوا تھا۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ اب کھودتے کھودتے مزدور مٹی کی اس تہ تک پہونچ گئے ہیں جہاں سے قدیم ترین بابلی تمدن کی باقیات برآمد ہونگے اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسے آثار دستیاب ہوں گے جن سے عراق کی قدیم ترین تاریخ پر روشنی پڑیگی۔

بہت عرصہ ہوا پروفیسر اگناز گولڈزیہر نے اس امر کے نہایت قوی ثبوت پیش کئے تھے کہ عبرانیوں نے آفرینش عالم کے حالات اہل بابل قدیم سے لئے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے یہ بات ظاہر کی تھی کہ "بورے" (Bore) اور "یوسر" (Yoser) یعنی "خالق" کی صفات کا خیال سب سے پہلے ان عبرانیوں نے ظاہر کیا تھا جو اسیر ہو کر بابل گئے تھے یا جو وہاں بحالت اسیری پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح باغ عدن کا قصہ جو تاریخ آفرینش کا ضمیمہ ہے، خاص بابل میں لکھا گیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ توریت کی کسی دوسری کتاب یا عہد نامۂ عتیق کے کسی دوسرے صحیفہ میں کتاب پیدائش کے قصہ کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ مسٹر لنکان لکھتے ہیں کہ:۔ عبرانی کی قدیم کتب مقدسہ میں ہبوط آدم کے قصہ کا مطلقاً کہیں ذکر نہیں آیا، آدم، حوا، سانپ، عورت کا اپنے شوہر کو ورغلانا وغیرہ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا اسرائیلی کتب میں کہیں بھی ذکر نہیں پروفیسر جان نسکے تحریر کرتے ہیں کہ:۔ باغ عدن میں سانپ کا قصہ معہ تمام اپنی تفصیلات کے آریہ قوم سے لیا گیا ہے۔ شیطان کے "خالق شر" ہونے کا خیال صرف بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں آتا ہے اور یہ کتابیں اس وقت تصنیف ہوئی تھیں جبکہ یہودیوں میں ایرانی خیالات بکثرت رائج ہو گئے تھے ——— (باقی آیندہ) نیاز

چور فرشتہ

عزیز—— اگر فرشتے واقعی ایسے ہی حسین وجمیل ہیں جیسا کہ نقاشوں کے مُوقلم ظاہر کرتے ہیں یا جس طرح معابد و کنائس کے دیواروں پر منقوش نظر آتے ہیں تو اے پیاری نسیمہ اس میں کلام نہیں کہ تو فرشتہ ہے۔

نسیمہ—— اے پیارے عزیز! اگر خدا ویسا ہی حسن وجمال والا، ویسا ہی حکمت و فراست والا اور ویسا ہی قوت و جبروت والا ہے جیسا کہ میں نے اساطیر الاولین میں پڑھا ہے تو اس میں شک نہیں کہ تو میرا خدا ہے۔

عزیز—— اے نسیمہ تو میری محافظ فرشتہ ہے جو میری رنج و راحت، میرے نوم و بیداری میں ہر وقت میرے ساتھ ہے اگر تو نہ ہوتی تو میری زندگی ریگزار کی طرح سنسان ہوتی اور روح ویرانہ کی طرح وحشتناک۔ یہ تو ہی ہے جس نے صرف اپنے تبسم سے میری حیات کو یکسر باغ و بہار بنا دیا۔"

نسیمہ—— اے عزیز، تو ہی میرا معبود ہے کیونکہ تو ہی نے سب سے پہلے میرے قلب میں محبت کی شعاعیں پیدا کر کے اُسے فنا ہونے سے بچا لیا اور اس لئے اے میرے خدا! اے میرے معبود! میں اس قلب کو تیری ہی محبت کی قربانگاہ پر چڑھاتی ہوں اور اس ہدیۂ حقیر کے قبول کئے جانے کی متمنی ہوں۔"

عزیز—— اے نسیمہ حقیقت یہ ہے کہ تو ایک پاک فرشتہ ہے۔

نسیمہ—— اے عزیز، یہ واقعہ ہے کہ تو میرا معبودِ قلب و روح ہے۔

یہ تھی دو محبت کرنے والوں کی گفتگو جو دس قبل شادی سے پہلے باغ کے ایک کنج میں ہو رہی تھی۔

عزیز، کالج کا ایک طالب علم تھا اور اپنے والدین کی تنہا اولاد۔ جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو باپ نے اُسے اپنے کاروبار میں داخل کر کے دفتر کا انچارج کر دیا۔

اسی دفتر میں ایک نوجوان لڑکی نسیمہ بھی کام کرتی تھی، جو بہت حسین و سلیقہ مند تھی اور جس سے عزیز کا باپ ایسی محبت کرتا تھا جیسے وہ اسی کی لڑکی ہو۔ عزیز و نسیمہ کی یکجائی نے آہستہ آہستہ اُن کے دلوں میں وہ کیفیت پیدا کر دی جس کا نام محبت رکھا جاتا ہے اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد دس سال پورے لطف و مسرت، عیش و راحت کے گزر گئے اور زندگی کی کسی تلخی سے انھیں واسطہ نہ پڑا۔ خدا نے ایک بچی بھی عنایت کی جو بہت پیاری اور خوبصورت تھی اور باوجود صغرسنی کے بہت ہوشیار تھی، والدین کی اہلی، معیشت اور روحانی مسرت کا تنہا مرکز یہی لڑکی تھی اور اسی کو دیکھ دیکھ کر دونوں جیتے تھے۔

ہر چند عزیز اپنے والد کی وفات کے بعد بہت بڑی دولت و جائداد کا مالک ہوگیا تھا لیکن نسیمہ خود ہی گھر کا سارا کام انجام دیتی تھی اور کوئی خادمہ کو اُس نے نہ رکھا تھا۔ لیکن جب دس سال تک مسلسل کام کرنے کے بعد اس کے قوا میں کچھ اضمحلال پیدا ہوا تو مجبوراً ایک خادمہ بھی اس نے رکھ لی جس کا نام صبیحہ تھا۔

بدقسمتی سے یہ خادمہ نوجوان بھی تھی اور حسین بھی۔ دوسری طرف عزیز فطرتاً کمزور ارادہ کا جذبات سے مغلوب ہوجانے والا انسان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز اس کی طرف مائل ہونے لگا اور غریب نسیمہ کو کچھ تو اس اعتماد کے بنا پر جو اپنے شوہر پر تھا اور کچھ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کی وجہ سے، اس طرف مطلق توجہ نہ ہوئی۔

ایک دن نسیمہ گھر کے لئے ضروری اشیاء خریدنے بازار گئی اور عزیز کو تنہا گھر میں چھوڑ گئی، یہ پہلی تنہا فرصت تھی جو عزیز اور خادمہ کو میسّر آئی۔ لڑکی اپنی ماں کے واپسی سے قبل مدرسہ سے لوٹی تو سیدھی باپ کے کمرے میں چلی گئی، دیکھا کہ عزیز خادمہ کو آغوش میں لئے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے کہ:- "اے صبیحہ، اس میں شک نہیں کہ تو فرشتہ ہے فرشتہ!"

غریب لڑکی کچھ نہ سمجھ سکی کہ اس فقرہ کا کیا مطلب تھا اس لئے جب نسیمہ بازار سے واپس آئی تو اس نے پوچھا کہ:- "اے ماں، مدرسہ میں مجھ کو بتایا گیا ہے کہ فرشتے اُڑتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟"

نسیمہ:- "ہاں، بیٹی فرشتے اُڑتے ہیں جبھی تو وہ کبھی آسمان پر نظر آتے ہیں اور کبھی زمین پر۔"

بیٹی:- "اگر ایسا ہے تو پھر ہم صبیحہ کو کبھی اُڑتے ہوئے کیوں نہیں دیکھتے؟"

ماں یہ سنکر ہنسنے لگی اور بولی کہ "کیا تمھاری استانی نے تم کو بتایا ہے کہ صبیحہ اڑ سکتی ہے؟"

بیٹی:- "لیکن صبیحہ تو فرشتہ ہے اس لئے اُسے اڑنا چاہئے!"

نسیمہ:- "تم سے کس نے کہا کہ وہ فرشتہ ہے۔ وہ تو ہماری تمھاری طرح ایک انسان ہے۔"

بیٹی:- "میں نے اباجان کو یہ کہتے سنا تھا، وہ اس کو گود میں لئے بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تو فرشتہ ہے!"

یہ سنکر نسیمہ کی وہ کیفیت ہوئی جیسے دفعتہً بجلی گر پڑے، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر، آہستہ آہستہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

دوسرے دن جب لڑکی مدرسہ سے واپس آئی تو دیکھا کہ ماں بستر پر بیمار پڑی ہوئی ہے اور خادمہ موجود نہیں ہے۔

اس سے پوچھا کہ "صبیحہ کہاں گئی" - ماں نے جواب دیا کہ "اے بیٹی وہ فرشتہ تھی اس لئے اڑ گئی"

یہ ہے واقعہ اُس فرشتہ کا جو عزیز و نسیمہ کے امن و سکون کو چرا کر جرم و معصیت کی فضا میں اڑ کر چلا گیا۔

اس کے بعد عزیز و نسیمہ میں پھر کبھی اتحاد پیدا نہیں ہوا اور ان کی تمام مسرتیں ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گئیں یہاں تک کہ اُن کی بیٹی بھی آخر کار بیمار پڑی اور مر گئی

نیاز

بچہ

(جرمنی کے مشہور شاعر فرڈریک ہیبل کے خیالات)

ماں مر گئی اور لوگوں نے اس کے بستر مرگ کو باغ کے بہترین پھولوں سے آراستہ کیا۔

بچہ جو تابوت کے پاس کھیل رہا تھا کبھی کبھی یہ اہتمام دیکھ لیتا تھا اور حیران تھا۔ دفعتہً اس کی نگاہ ایک نہایت خوبصورت پھول کی طرف مائل ہوئی جو ماں کے سنہرے بالوں میں لگا ہوا تھا اور پھر اس گلدستہ کو دیکھا جو سینہ پر رکھا ہوا تھا اور جس میں طرح طرح کے رنگین و معطر پھول نظر آرہے تھے۔ اُس نے مسکرا کر ماں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا:-

"اے ماں، ایک پھول اس گلدستہ کا مجھے دیدے، بڑا اچھا پھول ہے، میں اس سے کھیلوں گا"

لیکن جب اُس نے دیکھا کہ نہ ماں کے ہاتھ کو حرکت ہوئی نہ اس کی زبان کو تو اُس نے کہا "ابھی ماں سو رہی ہے لیکن جب وہ جاگے گی تو ضرور یہ پھول مجھے دیگی"

یہ کہکر بچہ نے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ باہر چلا گیا اس ڈر سے کہ کہیں ماں جاگ نہ جائے۔

بچہ گھڑی گھڑی دروازہ تک آتا تھا اور رو رو کر سب سے پوچھتا تھا کہ "آج میری ماں کیوں ابھی تک سو رہی ہے"

دولت کی غیر مساوی تقسیم اور اس کا اثر تمدن انسانی پر

جس وقت ہم دنیا کی تقسیم دولت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کوئی راجہ و مہاراجہ ہے جس کے قبضہ میں سینکڑوں میل رقبہ، سینکڑوں کوٹھیاں اور مکانات، بے شمار سواریاں، لاتعداد فرنیچر اور ہزاروں قسم کے اسباب تفریح و دلچسپی موجود ہیں۔ تو دوسری طرف ایک خاندان برباد گدا گر نظر آتا ہے جس کو جسم ڈھانپنے کے لئے ایک کثیف و بوسیدہ کپڑا بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور جس کے لئے کسی وقت کا فاقہ گویا روز ازل سے مقدر ہوچکا ہے۔ یہ اختلاف و تفاوت نہایت سطحی نگاہ رکھنے والے شخص کو ہر وقت نظر آسکتا ہے۔ لیکن چونکہ ماہرین اقتصادیات ہر مسئلہ کا مطالعہ بامعان نظر کرتے ہیں۔ اس لئے اس موضوع کے متعلق جو اعداد و شمار ہیں اُن کے ذریعہ سے دستیاب ہوسکتے ہیں وہ اس مضمون میں پیش کئے جائیں گے

سب سے اوّل ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ دنیا کے ذخیرۂ دولت کی تقسیم کس انداز پر ہوئی ہے اور یہ دو طرح پر ممکن ہے۔ اوّل ترکہ و ورثہ کے اعداد و شمار سے اور دوسرے براہ راست املاک و جائداد کا محاسبہ کرکے۔ پھر چونکہ ذخیرۂ دولت دو قسم کی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے ایک وہ جو ضروریات انسانی کے پورا کرنے میں براہ راست کام آتی ہیں اور جن سے کوئی آمدنی حاصل نہیں کی جاتی اور دوسری وہ جو دولت کی پیداوار میں معاون ہوتی ہیں اور جنھیں "سرمایہ و املاک" وغیرہ کی اصطلاحوں سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ سے "لگان" اور "سود" کی شکل میں آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ "زمین" اور "سرمایہ" کی تقسیم کس انداز پر ہوئی ہے۔ تاکہ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکے کہ ان ذرائع سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کے منافع سے آبادی کا کس قدر حصہ کس تناسب سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہاں تک تو بلا کسی قسم کی محنت کئے ہوئے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس کی تقسیم کے متعلق بحث کی جائیگی۔ اسی کے بعد ایسی آمدنی کے متعلق بحث کی جائے گی جو محنت سے کمائی جاتی ہے اور اس کے اعداد و شمار درج کئے جائیں گے

تمام دنیا کے متعلق اس قسم کے اعداد و شمار ابھی تک جمع نہیں کئے جاسکے ہیں۔ البتہ چند مہذب ممالک کے متعلق ہمارے پاس مفصل معلومات موجود ہیں۔ ہم اس مضمون میں مثال کے طور پر جزائر برطانیہ کے متعلق جو اعداد و شمار دستیاب ہوسکے ہیں۔ ان سے بحث کریں گے۔ ان کے ذریعہ سے، دنیا کی تقسیم دولت کا جو عام طریقہ ہے اُس کا کم و بیش اندازہ کیا جاسکتا ہے

—— ۱۱ ——

۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۸ء کا سالانہ اوسط نکالنے سے ممالک متحدہ برطانیہ کے متعلق جو اعداد و شمار ترکہ و ورثہ کے دستیاب ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

ترکہ جو ۶ لاکھ ۸۳ ہزار آدمیوں نے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے لئے چھوڑا

غریب اور بہت زیادہ غریب آدمی

	تعداد اموات	ترکہ قیمتی
بقدر رقم ترکہ چھوڑ کر مرنے والے کہ جن سے حلفیہ بیان لینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی	۵,۹۲,۲۹۴	ایک کروڑ پونڈ
دیوانہ کی حالت میں مرنے والے	۱,۶۷۰	—
سو پونڈ سے کم چھوڑ کر مرنے والے	۱۵,۹۵۶	۹ لاکھ پونڈ
سو اور پانسو پونڈ کے درمیان چھوڑ کر مرنے والے	۳۴,۲۷۵	اکروڑ پونڈ
پانسو اور ہزار پونڈ "	۱۰,۴۰۴	۸۶ لاکھ پونڈ
میزان	۶,۵۴,۶۰۳	۲ کروڑ ۹۵ لاکھ

امیر اور بہت زیادہ امیر

کمسنی میں بغیر جائداد کے مرنے والے	۷,۵۰۰	—
ہزار اور دس ہزار پونڈ کے درمیان چھوڑ کر مرنیوالے	۱۶,۹۱۰	۶ کروڑ ۲۱ لاکھ پونڈ
دس ہزار اور دس لاکھ "	۳,۹۸۰	۱۷ کروڑ ۵۹ لاکھ پونڈ
لکھ پتی مرنے والے	۷	اکروڑ ۱۸ لاکھ پونڈ
میزان	۲۸,۳۹۷	۲۵ کروڑ ۹۷ لاکھ پونڈ
میزان کل امیر و غریب =	۶,۸۳,۰۰۰	۲۹ کروڑ ۲۵ لاکھ پونڈ

۱۷۰ آدمی ہر سال تمام ذاتی قرضوں اور مطالبات کی ادائیگی کے بعد ایک لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ فی کس کا ترکہ چھوڑ کر مرتے ہیں۔ ۸۰ آدمی ۲ لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ فی کس چھوڑ کر ۲۶ آدمی ۵ لاکھ پونڈ فی کس کا ترکہ چھوڑ کر اور ۷ آدمی ۲۵ لاکھ فی کس ترکہ چھوڑ کر۔

اس طریقہ پر ایک اوسط سال میں ۲۶ آدمی جو ترکہ اپنی اولاد کے لئے چھوڑ کر مر جاتے ہیں۔ وہ مالیت میں اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو ۵۴,۶۰۰ غریب آدمی اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ چند امیر جو ترکہ مر کر چھوڑ جاتے ہیں وہ تمام اُن املاک و جائداد کے مساوی ہوتا ہے جو تمام غربا کی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔ غربا کے پاس جو سامان ہوتا ہے اُسے جائداد کے نام سے موسوم کرنا بالکل استہزا و تمسخر معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سامان مشتمل ہوتا ہے۔ فرنیچر کی کچھ لکڑیوں، ٹوٹے ہوئے برتنوں اور بوسیدہ مکانوں پر اور نقد کی شکل میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بیماری کی تنخواہ، بے روزگاری کے منافع، اور سیونگ بنک، ٹریڈ یونین، فرنڈلی سوسائٹی وغیرہ کے حساب میں جمع ہوتا ہے

اموات کے متعلق اعداد و شمار سے اندازہ لگانے کے بعد اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر مرنے والے مالک جائداد کے مقابلہ میں تیس زندہ مالک جائداد موجود رہتے ہیں تو ہم زندہ مالکان جائداد کی تعداد کا تخمینہ محاصل ترکہ سے کر سکتے ہیں۔ اس قسم کا ایک تخمینہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

جائداد	متوفی		زندہ		اوسط مالیت جائداد فی کس
	اشخاص	اُن کی ملکیت	اشخاص	اُن کی ملکیت	
۵۰۰ پونڈ سے کم مالیت کی	۵۰,۲۲۵	۱ کروڑ ۹ لاکھ پونڈ	۱۵ لاکھ ۷ ہزار	۳۳ کروڑ ۷ لاکھ	۲۱۶ پونڈ فی کس
۵۰۰ پونڈ سے زیادہ مالیت کی	۳۱,۳۰۱	۲۶ کروڑ ۸۳ لاکھ	۹ لاکھ ۳۹ ہزار	۸ ارب ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ	۸ ہزار ۱۵۷ پونڈ فی کس
میزان	۸۱,۵۲۶	۲۷ کروڑ ۹۲ لاکھ	۲۴ لاکھ ۴۶ ہزار	۸ ارب ۳۷ کروڑ ۹۰ لاکھ	۳ ہزار ۴۲۴ پونڈ

مندرجہ بالا ۹ لاکھ ۳۹ ہزار اشخاص میں سے جن کے پاس ۸ ارب ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ کی جائدادیں ہیں ۲ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۲۰ آدمی تو ایسے ہیں جن کے پاس ۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ کی جائدادیں ہیں۔ اور باقی ماندہ ۶۵ لاکھ ۲۶ ہزار ۹۱۰ اشخاص کے پاس ۷ ارب ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ کی جائدادیں ہیں۔ پھر ان ۶ لاکھ ۲۶ ہزار ۹۱۰ اشخاص میں سے ۵ لاکھ ۷ ہزار ۳ سو کے پاس ایک ارب ۸۶ کروڑ ۳۰ لاکھ کی جائدادیں ہیں۔ اور باقی ماندہ ۱ لاکھ ۱۹ ہزار ۶۱۰ اشخاص کے پاس پانچ ارب ۵ کروڑ ۸۰ لاکھ کی جائدادیں ہیں

ان اعداد و شمار کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مٹھی بھر آدمی ملک کی تمام املاک و جائداد پر قابض ہیں۔ ۱۱ لاکھ آدمیوں کا ایک گروہ جس کے ساتھ اگر اُس کے افراد خاندان کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ تمام قوم کی تعداد کا مشکل سے

بلے حصہ بن سکتا ہے تمام ممالک متحدہ برطانیہ کی ½ دولت پر قابض ہے۔ ملک کے سرمایہ پر جو اس قلیل جماعت کو اجارہ حاصل ہے اس کا اثر آمدنی کی اس غیر مساوی تقسیم پر بھی ہوتا ہے جس کا تذکرہ آیندہ کیا جائے گا۔

ممالک متحدہ برطانیہ کی کل املاک و جائداد کا جب براہ راست حساب لگایا جاتا ہے تو اس سے جس تخمینہ پر ہم پہنچتے ہیں وہ مندرجہ بالا تخمینہ سے بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ محاصل سے بچنے کے لئے لوگ صحیح حالت اپنی جائداد کی نہیں بتلاتے بہرحال یہ تخمینہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) حکومت کی املاک جس میں سے حکومت کے اندرونی اور بیرونی قرضے مہیا کر دئے گئے ہیں . . . . ۵۵ کروڑ ۸۰ لاکھ

(۲) افراد کی وہ املاک جو ممالک متحدہ برطانیہ کے اندر پائی جاتی ہیں . . . . دس ارب ۵۶ کروڑ ۷۰ لاکھ

(۳) افراد کی وہ املاک جو ممالک غیر میں ہیں . . . . دو ارب ۶۴ کروڑ ۷۰ لاکھ

میزان . . . . تیرہ ارب ۷۶ کروڑ ۲۰ لاکھ

مندرجہ بالا حساب سے فی کس تین سو پونڈ کی دولت ہر شخص کے حصہ میں آتی ہے اور خاندان کو اگر پانچ افراد پر مشتمل سمجھ لیا جائے تو فی خاندان پندرہ سو پونڈ کی دولت حصہ میں آتی ہے۔ لیکن اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے غریبوں کو کس قدر حقیر حصہ رسد اسی دولت میں سے پہونچتا ہے۔ اور جو حصہ انھیں ملتا ہے۔ اس کا استعمال "سرمایہ" کے طریقہ پر یعنی آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے کے لئے کس قدر دشوار اور ناممکن ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے پاس اس قدر کم دولت ہے وہ اپنی خدمات کو فروخت کرتے وقت کوئی ایسا سودا نہیں کر سکتے جسکو منصفانہ کہا جائے اور ذاتی ملکیت رکھنے والے چند افراد ذرائع پیداوار دولت یعنی مشینری فیکٹری وغیرہ پر قبضہ رکھنے کی وجہ سے تمام قوم پر حکومت کرتے ہیں

اب ہم سلطنت متحدہ کے رقبہ کی تقسیم کے متعلق جو اعداد و شمار ہمیں مل سکے ہیں انھیں درج کرتے ہیں۔ انگلستان میں ایسا رقبہ جس پر کل قوم کا تصرف ہو بہت حقیر ہے تمام تر رقبہ انفرادی ملکیت کے زیر اثر ہے کل رقبہ ۱۸۸۳ء میں ۷ کروڑ ... لاکھ ایکڑ تھا جس میں سے تقریباً تمام ہی ذاتی و انفرادی ملکیت میں شامل تھا۔ لیکن مالکان کی تعداد کثیر نہ تھی۔ زمیندار تو بہت سے تھے۔ لیکن بڑے زمینداروں کی تعداد مختصر تھی۔ ابتدا میں ہم صرف انگلینڈ اور ویلز کے اعداد و شمار دیں گے۔ بعد ازاں کل ممالک متحدہ برطانیہ کے

انگلینڈ اور ویلز میں زمینداروں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر ایسے زمیندار شامل تھے

جن کے پاس زمین بہت کم تھی۔ لیکن انگلینڈ کا کثیر رقبہ ۳۸ ہزار اشخاص کی ملکیت میں تھا۔ اس کا تجزیہ مندرجہ ذیل طریقہ پر کیا جاسکتا ہے

تعداد اشخاص	رقبہ	رقبہ فی کس
۳۸ ہزار ۲۱۴	دو ارب ۷۴ کروڑ ۷۳ لاکھ ۸۴۸ ایکڑ	۷۱۹ ایکڑ فی کس
۹ لاکھ ۳۴ ہزار ۷۹۷	۵۵ لاکھ ۲۶ ہزار ۵۰۲ ایکڑ	چھ ایکڑ فی کس

پھر آخرالذکر ۹ لاکھ ۳۴ ہزار ۷۹۷ چھوٹے زمینداروں میں ۷ لاکھ ۳ ہزار ۲۰۹ کے پاس ایک لاکھ ۵۱ ہزار ۱۴۸ ایکڑ رقبہ تھا جس کا اوسط ایک ۔ دو فی کس سے بھی کم بیٹھتا ہے

—— تمام ممالک متحدہ برطانیہ کے متعلق اعداد وشمار حسب ذیل ہیں:-

—— کل رقبہ . . . . . ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ

رقبہ جو ۵۲ ہزار اشخاص کی ملکیت میں ہے ۔ ۴ کروڑ ۴ لاکھ ۲۶ ہزار ایکڑ اس ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ پر جو لگان ادا کیا جاتا ہے وہ بھی بہت کثیر ہے۔ ذیل میں لگان وکرایہ کے اعداد وشمار درج کئے جاتے ہیں۔

ممالک متحدہ برطانیہ کے لگان وکرایہ کا تخمینہ

زرعی زمینوں سے	۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ
مکانوں فیکٹریوں دکانوں وغیرہ سے	۵ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ
کھیل وشکار کی جگہوں سے	۲۰ لاکھ پونڈ
کانوں اور معدنوں سے	۷۰ لاکھ پونڈ
دیگر زمینوں سے	۶۰ لاکھ پونڈ
میزان	۱۰ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممالک متحدہ برطانیہ کی زمینوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو خراج افراد قوم کو ادا کرنا پڑتا ہے اس کی رقم ۱۰ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ۲ ہزار ۵۰۰ آدمی انگلینڈ اور ویلز کے تین چوتھائی حصے کے

مالک ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس دس کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ کی آمدنی میں سے زیادہ تر حصہ انھیں کو ملتا ہے۔ لگان کی یہ آمدنی آمدنی ملک کی کل آمدنی کے مقابلہ میں کم معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے ممالک میں جو انگلستان کی طرح زیادہ تر صنعت و تجارت پر انحصار نہیں کرتے اور جنھیں زراعت کے لئے زیادہ زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ لگان کا تناسب بہت زیادہ ہوگا۔

"سرمایہ" اور "زمین" اور ان کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اُن کی غیر مساوی تقسیم دکھلانے کے بعد تمام آمدنیوں کی تقسیم کے متعلق بلالحاظ اس کے کہ وہ محنت سے حاصل ہوتی ہیں یا بلا محنت غور کرینگے جیسا کہ آگے تفصیل سے ظاہر کیا جائیگا ممالک متحدہ برطانیہ کی کل سالانہ آمدنی ایک ارب ۸۴ کروڑ پونڈ ہے اس میں سے لگان کی رقم صرف دس کروڑ ۶۰ لاکھ ہے۔ اس دس کروڑ ۶۰ لاکھ میں سے ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ان کاشتکاروں سے حاصل کیا جاتا ہے جن کا سالانہ منافع لگان کے علاوہ ایک کروڑ ۷۰ لاکھ اور دو کروڑ ۶۰ لاکھ کے درمیان ہوتا ہے۔ شہروں کی کثیر آبادی سے جہاں ہر قسم کی تجارتی و صنعتی سرگرمیاں نظر آتی ہیں زمیندار صرف ۵ کروڑ ۷۰ لاکھ پونڈ حاصل کرسکتے ہیں

اب آئیے اس بات پر غور کیا جائے کہ "سرمایہ" کے مالک سود اور منافع کی شکل میں کس قدر حصہ قومی آمدنی کا بلا محنت کئے ہوئے صرف "انتظار" کے معاوضہ میں حاصل کرلیتے ہیں۔ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے کہ کس طرح ایک ارب ۸۴ کروڑ پونڈ کی سالانہ آمدنی میں سے ۴۲ کروڑ ۸۴ لاکھ پونڈ ایک چھوٹے سے گروہ کے پاس جن کی تعداد صرف ۲ لاکھ ۹۰ ہزار ہے اور جن کی تعداد ان کے افراد خاندان کو شامل کرتے ہوئے کسی طرح ۱۴ لاکھ سے زیادہ نہیں ہوسکتی پہونچ جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بڑے زمیندار بھی اسی گروہ میں شامل ہیں اور اس گروہ کی آمدنی میں برطانیہ کی زمینوں کے لگان کا زیادہ تر حصہ شامل ہے۔ لیکن اگر ہم اس تمام لگان کو بھی شامل کرلیں تب بھی ۳۲ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ اس آمدنی میں سے ایسے بچتے ہیں جن کی ذیل دتشریح محض زمین کے لگان سے نہیں کی جاسکتی اور جو پر تصرف قوم کے صرف چند افراد کو حاصل ہے

اس حقیقت کی تشریح ہمیں سرمایہ کے اسی اجارہ میں نظر آتی ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے۔ ملک کی جمع کی ہوئی دولت قوم کے اسقدر مختصر افراد کے ہاتھوں میں ہے کہ باوجود شرح سود کی ارزانی کے علاوہ قومی آمدنی کا ایک کثیر حصہ پر تصرف صرف چند اشخاص کو حاصل ہوجاتا ہے

اس طرح پر ممالک متحدہ برطانیہ کے متعلق کم از کم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں زمین کا اجارہ دولت کی غیر مساوی تقسیم پر اسقدر زیادہ اثر انداز نہیں ہے جسقدر کہ سرمایہ کا اجارہ۔ موخر الذکر اجارہ کی وجہ سے افراد قوم کی اتنی ہی مختصر تعداد کو جتنی کہ بڑے زمینداروں کی ہے۔ اس قدر منافع حاصل ہوجاتے ہیں جن کے مقابلہ میں زمینوں کے لگان کی رقم نہایت حقیر نظر آتی ہے۔ متعدد مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کی بیلنس شیٹ دیکھنے سے یہ حقیقت ہم پر صاف طور پر عیاں ہوجاتی ہے ہم یہاں نمونہ ایک کمپنی کے بیلنس شیٹ کا تذکرہ کریں گے۔ یہ سنہ ۱۹۰۴ء کا حساب ہے۔ جو تجارت کے لئے سرد بازاری کا

سال تھا۔ اس کمپنی میں سرمایہ داروں اور منتظمین میں مکمل تفریق تھی۔ کیونکہ کمپنی کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ تھا جن کا سرمایہ تھا بلکہ اس غرض کیلئے تنخواہ دار منیجر اور منیجنگ ڈائرکٹر مقرر کئے گئے تھے۔ اس لئے سرمایہ کی خالص آمدنی کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کمپنی کو کسی اعتبار سے بھی مخصوص حالات کا مالک نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ کمپنی بالکل عام کمپنیوں کی مانند تھی۔ اس کمپنی کا جاری کیا ہوا سرمایہ دس لاکھ پونڈ تھا۔ جو کمپنی کے حصوں پر مشتمل تھا اور اس سرمایہ میں غیر حصہ داروں سے قرض لے کر کوئی اضافہ نہیں کیا گیا تھا۔ نفع و نقصان کے حساب (Balance sheet) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی نے سال بھر میں ۴ لاکھ ۱۱ ہزار پونڈ کا مال فروخت کیا۔ کل خرچ سالانہ پیداوار کے حاصل کرنے میں ۲ لاکھ ۱۸ ہزار پونڈ کا ہوا۔ اس لئے منافع کی سال بھر کی بچت ۱ لاکھ ۹۳ ہزار پونڈ کی ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قسم کے اخراجات کے بعد جس میں مزدوروں کی مزدوری، ملازمین کی تنخواہیں۔ کرایہ مکان، اشتہار وغیرہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ پیداوار جس کی لاگت صرف ۲ لاکھ ۱۸ ہزار پونڈ تھی تقریباً دوگنے داموں پر فروخت ہوئی۔ ۲۰ فی صدی منافع تقسیم کیا گیا۔ اور ۹۳ ہزار پونڈ سرمایہ محفوظ کے طور پر جمع رکھا گیا۔ جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے اشیاء کے پیدا کرنے میں محنت کی انھیں کیا ملا تو ہم پر ظاہر ہوتا ہے کہ ۲ لاکھ ۱۸ ہزار پونڈ میں سے ایک حصہ انھیں بھی ملا اور غالباً یہ حصہ ۱ لاکھ پونڈ سے زیادہ نہ رہا ہوگا اس ایک لاکھ پونڈ میں ہر قسم کی محنت کی اجرت شامل ہے۔ منیجر فورمین وغیرہ کی دماغی محنت بھی اور مزدوروں کی جسمانی محنت بھی۔ اس کے مقابلہ میں سرمایہ داروں کی قلیل جماعت کو محض "انتظار" کرنے کے معاوضہ میں بلا کسی قسم کی دماغی اور جسمانی محنت کئے ہوئے ایک لاکھ ۹۲ ہزار پونڈ ملا

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مندرجہ بالا مثال کوئی ایسی مثال نہیں ہے جسے مستثنیات میں شامل کیا جا سکے۔ ہم ممالک متحدہ برطانیہ کی رجسٹری شدہ مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے متعلق کچھ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں ایسی کمپنیوں کی تعداد ۴۵ ہزار بار۔ کی گئی تھی۔ اور ان کا ادا شدہ سرمایہ دو ارب دس کروڑ پونڈ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں ایسی کمپنیوں کی تعداد جن پر انکم ٹیکس عاید کیا گیا ۲۷ ہزار، ۹۳ تھی اور انھوں نے اپنے منافع کی مقدار ۲۹ کروڑ دس لاکھ بیان کی۔ اس ۲۹ کروڑ دس لاکھ میں سے معمولی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے منافع معلوم کرنے کے لئے ہمیں چند رقوم منہا کرنا پڑیں گی۔ کیونکہ اس میزان میں ریلوے کمپنیاں، کچھ بنک اور واٹر ورکس بھی شامل ہیں۔ جن کی رجسٹری مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے رجسٹرار کے یہاں نہیں ہوتی۔ اس ذیل میں، ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ منہا کرنے کے بعد ۲۲ کروڑ ۶۰ لاکھ بچتے ہیں اور یہ منافع ہے ۲ ارب ۱۰ کروڑ کے سرمایہ پر۔ اس سرمایہ میں بہت سی ایسی کمپنیاں بھی شامل ہیں جو کمپنی کے حصوں کے علاوہ قرض کے حصے (Debentures) بھی جاری کرتی ہیں۔ مگر جہاں ایک طرف اس سرمایہ میں قرض کے حصے شامل ہیں دوسری طرف ایسا سرمایہ بھی شامل ہے جو فی الحقیقت سرمایہ نہیں ہے۔ اور اس کا تناسب قریب قریب ½ کے ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے اصطلاح (WATER) ہے جس کا اردو میں ترجمہ "بنام سرمایہ" کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کمپنی کے نام کی قیمت (Goodwill)

ترقی دینے والوں کے منافع (promotion profit) انڈر رائٹرس کمیشن (Under writers Commission) بونس شیئرز (Bonus share) اور دیگر اسی قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ اس لئے قرض کے حصوں کو اس برائے نام سرمایہ کے مساوی سمجھا جائے تو کچھ مناسب نہیں ہے۔ اب مزدوروں کی مزدوری، منشیوں اور افسروں کی تنخواہ، تجارتی قابلیت کا انعام بصورت منیجروں اور مینیجنگ ڈائرکٹروں کی تنخواہ کے نکالنے کے بعد، پیٹنٹ کے مالکوں کو رائلٹی اور زمینداروں اور مالکان مکان کو لگان و کرایہ ادا کرنے کے بعد ۲۲ کروڑ ۶۰ لاکھ کا منافع بچتا ہے۔ جس کا تناسب ممالک متحدہ برطانیہ کی تمام کمپنیوں کے اصلی اور برائے نام دونوں سرمایوں کو شامل کرتے ہوئے دس فی صدی کے قریب پڑتا ہے۔ یہاں اس بات کے بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بہت سے خوابیدہ شرکا (Sleeping partners) کو ایک بڑی رقم غیر اکتسابی منافع (Unearned Increment) کی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ان کے حصوں اور دستاویزوں کی قیمت بلا اُن کی ذاتی کوشش کے اسٹاک مارکٹ میں بڑھ جاتی ہے

جس کمپنی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے ایک پونڈ کے حصوں کی قیمت ۱۹۰۵ء میں ۶ پونڈ فی حصہ ہو گئی جس کے معنی یہ ہوئے کہ کمپنی کے موجودہ یا گزشتہ (اگر انھوں نے اپنے حصہ منتقل کر دئے) حصہ داروں نے نہ صرف خوب اچھا سود اپنے سرمایہ پر حاصل کیا بلکہ بلا کسی محنت کے اُن کے سرمایہ میں چھ گنا اضافہ ہو گیا۔ ابتدائی حصہ داروں کو منافع ۳۰ فی صدی ملا اور بعد کے حصہ داروں کو جنھوں نے ایک پونڈ کا حصہ ۶ پونڈ دے کر خریدا منافع ۵ فی صدی کے قریب ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ کمپنی کا منافع بہت کثیر ہے اور اس لئے مزدوروں کی تنخواہ بڑھنا چاہیئے تو نئے سرمایہ دار جواب دیتے ہیں کہ ہمیں تو منافع کثیر نہیں ملا ہے۔ ہمیں تو اپنے سرمایہ پر صرف ۵ فی صدی مل رہا ہے۔ اس لئے ہم مزدوری کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح پر کمپنی کی کامیابی کے باوجود اس سے منافع مزدور پیشہ جماعت نہیں اٹھا سکتی۔ ذیل میں ہم نمونہ کے طور پر چند کمپنیوں کے متعلق اعداد و شمار درج کرتے ہیں:۔

کمپنی کا نام	حصوں کی ابتدائی قیمت	منافع	حصوں کی قیمت ۱۹۰۵ء
برٹش گیس لائٹ کمپنی	۲۰ پونڈ	۱۰ فیصدی	۱۴ پونڈ
ایس ویچ گیس لائٹ کمپنی	۱۰ "	۱۱ "	۲۸ "
ایسٹ بورن گیس کمپنی	۱۰ "	۱۵ "	۲۸ "
ہیرو گیٹ گیس کمپنی	۱۰۰ "	۱۶ "	۲۴۰ "
ایلڈرشاٹ گیس اینڈ واٹر کمپنی	۱۰ "	۱۱½ "	۲۳ "
پورٹ سی آئی لینڈ گیس لائٹ کمپنی	۵۰ "	۱۲ "	۱۲۷ "
یوریبین گیس لائٹ کمپنی	۱۰ "	۱۱ "	۲۳ "

بورنیتھ گیس اینڈ واٹر کمپنی	۱۰ فیصدی	۱۴ فیصدی	۳۰ پونڈ
وانڈورڈ گیس اینڈ کوک کمپنی	۱۰ ″	۱۳½ ″	۲۷۶ ″

مندرجہ بالا تمام مثالوں میں مزدوروں کی اُجرت، اُن لوگوں کے منافع کے مقابلہ میں جو محض "انتظار" کرتے ہیں کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح پر مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے کاغذات ہمارے سامنے ایک بہت اچھی تصویر موجودہ تقسیم دولت کی پیش کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے دیکھنے کے بعد اس امر پر تعجب نہیں ہوتا کہ دولت کی تقسیم میں اس قدر تفاوت کیوں ہے۔ ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ چند افراد، سرمایہ پر اجارہ رکھنے کی وجہ سے اپنے لاکھوں ہم جنسوں پر زبردست تفوق و برتری رکھتے ہیں نیز یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ تقسیم دولت مختلف نوع کی خدمات کی اصلی قدر کے ذرا بھی مطابق ہے۔ کیونکہ کمپنیوں کے کل منافع میں سے انکم ٹیکس عاید کرتے وقت دماغی محنت کا معاوضہ منہا کر دیا جاتا ہے اور ہم پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ دماغی قابلیت چاہے وہ انتظامی ہو یا ایجاد کرنے والی اور جسمانی محنت صنعت و حرفت میں سب سے زیادہ انعام کی مستحق نہیں ہوتیں بلکہ سرمایہ محض سرمایہ ہونے کی حیثیت سے اس پیداوار کا جو دماغی اور جسمانی محنتوں کو زمین پر صرف کرکے حاصل کی جاتی ہیں ایک زبردست حصہ ہضم کر لیتا ہے۔ زمیندار کا حصہ اس میں شک نہیں کافی ہوتا ہے لیکن ایک تجارتی و صنعتی ملک میں زمیندار سے کہیں زیادہ سرمایہ دار کو پہنچتا ہے

یہاں تک ہم نے "سرمایہ" اور زمین اور ان کے اجارہ کے ذریعہ سے جو آمدنی افراد کو ہوتی ہے اس کی غیر مساوی تقسیم سے بحث کی اب ہم تمام آمدنیوں کی تقسیم کے متعلق بلالحاظ اس کے کہ وہ محنت سے حاصل ہوتی ہیں یا بلا محنت کچھ اعداد و شمار پیش کریں گے

سب سے اوّل ہم اس آمدنی سے بحث کریں گے جس پر سنہ ۱۹۰۸ء میں انکم ٹیکس عاید کیا گیا تھا یعنی ۱۶۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی۔ اس قسم کی جو آمدنی فی سنہ ۱۹۰۸ء میں زیر تبصرہ رہی وہ حسب ذیل تھی:۔

(۱)	منافع جو زمین، مکانات، ریلوے اور کانوں کی ملکیت سے حاصل ہوئے . . .	۲۶ کروڑ ۹۹ لاکھ پونڈ
(۲)	منافع جو زمین کے قبضہ و استعمال سے حاصل ہوئے	۱ کروڑ ″ ۷ لاکھ
(۳)	منافع جو ہندوستان نو آبادیوں اور غیر ملکی حکومتوں کی دستاویزات سے حاصل ہوئے	۴ کروڑ ۵۰ لاکھ
(۴)	منافع جو صنعت، تجارت، تعلیمی و ادبی و دیگر سرگرمیوں سے حاصل ہوئے (اس میں غیر ملکی منافع بھی شامل ہیں)	۵۶ کروڑ ۵۶ لاکھ
(۵)	تنخواہیں جو حکومت، میونسپلٹیوں اور کمپنیوں کی ملازمت سے حاصل ہوئیں	۱۰ کروڑ ۹۶ لاکھ
	کل آمدنی کا میزان	ایک ارب ایک کروڑ

اس میں سے واقعی آمدنی ظاہر نہ کرنے والے رقمات منہا کرو	اٹھارہ کروڑ ۵۹ لاکھ
باقی بچے ہوئے	۸۲ کروڑ ۴۱ لاکھ
اس میں جمع کرو	
(الف) ۶ کی آمدنی کا اندازہ لگانے میں جو کمی ہوئی یعنی	۶ کروڑ پونڈ
(ب) غیر ملکی منافع جو انکم ٹیکس کی زد سے محفوظ رہے	۲ کروڑ ۵۰ لاکھ
میزان	۹۰ کروڑ ۹۱ لاکھ

اس کے بعد اب کل قومی آمدنی کا حساب درج کیا جاتا ہے

قومی آمدنی ۱۹۰۸ء میں

(۱) اشخاص جن کی آمدنی ۱۶۰ پونڈ سے زیادہ ہے	۹۰ کروڑ ۹۰ لاکھ
(۲) اشخاص جن کی آمدنی ۱۶۰ پونڈ سے کم ہے	
(الف) اشخاص جو چھوٹی تنخواہیں حاصل کرتے ہیں اور چھوٹے کاروبار کرنے والے . . .	۲۲ کروڑ ۲۰ لاکھ
(ب) مزدور پیشہ جماعت	۷۰ کروڑ ۳۰ لاکھ
کل میزان	ایک ارب ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ

ان اعداد و شمار کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انکم ٹیکس کی حدبندی سے قومی آمدنی کی تقسیم دو مساوی حصوں میں ہوجاتی ہے۔ ۱۹۰۸ء میں ایک ارب ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ کی کل آمدنی میں سے ۱۶۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں کو ۹۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ملا۔ اور ۱۶۰ پونڈ سالانہ سے کم آمدنی رکھنے والوں کو ۹۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ملا۔

۱۹۰۸ء میں برطانیہ کی آبادی ۴ کروڑ ۵۴ ہزار تھی۔ اور کل آمدنی ایک ارب ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ تھی۔ اس حساب سے اوسط سالانہ آمدنی فی کس ۴۰ پونڈ ہوتی ہے۔ اور اگر اس قومی آمدنی کو مساوی طور پر تمام افراد قوم میں تقسیم کیا جائے۔ اور ایک خاندان کو ۵ افراد خاندان پر مشتمل سمجھ لیا جائے تو ہر خاندان کی آمدنی ۲ سو پونڈ سالانہ ہونی چاہیے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک ارب ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کی تقسیم کس طرح پر ہوتی ہے؟ ذیل کے اعداد و شمار اس کی وضاحت کریں گے:۔

	تعداد	آمدنی
امارت		
اشخاص جن کی آمدنی ۷۰۰ پونڈ سالانہ اور اس سے زیادہ ہے اور ان کے خاندان	۲۰۰۰۰۰ × ۵ ـــــ ۱۰ لاکھ	۶۳ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ
خوش حالی		
اشخاص جن کی آمدنی ۱۶۰ پونڈ سالانہ اور ۷۰۰ پونڈ سالانہ کے درمیان ہے اور ان کے خاندان	۸۲۰۰۰۰ × ۵ ۴۱ لاکھ	۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ
غربت		
اشخاص جن کی آمدنی ۱۶۰ پونڈ سے کم ہے اور ان کے خاندان	۳ کروڑ ۹۱ لاکھ	۹۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ
میزان	۴ کروڑ ۴۵ لاکھ	ایک ارب ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ نہ صرف تمام قوم کی نصف آمدنی سے آبادی کا ۱۲ فیصدی طبقہ متمتع ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ممالک متحدہ برطانیہ کی ایک تہائی آمدنی پر آبادی کے [illegible] حصہ کو پورا تصرف و اختیار حاصل ہے۔ جو کسی طرح اصولاً درست نہیں۔

محمد عاقل ایم۔ اے

کشش

(۱)

آدمیوں کا ایک سیلاب نظر آتا تھا "مہاتما گاندھی کی جے!" کے ہزاروں فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے، موٹر میں سے ڈاکٹر ہارون بے اختیار کھڑا ہو گیا، انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگا ——— "وہ دیکھو! وہ ہیں مہاتما جی، پنڈت مدن موہن مالویہ ہاتھ دیے ہوئے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کیسی بلا کی چمک ہے۔ اوہ! کتنے دبلے ہیں، گویا مدت کے بیمار ہوں!"

اس وقت ڈاکٹر ہارون اضطراری کیفیت کے ماتحت موٹر کا اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر اگلی نشست پر بے ساختہ کھڑا ہو گیا تھا۔ سلیمہ نے موٹر چلانا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ موٹر بانی کا لائسنس اسے نہیں ملا تھا، تاہم ایسے مختصر وقت میں وہ اپنی ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔

ابھی اسٹیرنگ وہیل ہاتھ میں لئے سلیمہ کو چند لمحے گزرے تھے کہ مجمع میں سے چیخ سنائی دی "ارے! ہوشیار! ہوشیار!" ڈاکٹر ہارون کی نظر مہاتما جی کی طرف سے اسٹیرنگ وہیل کی جانب منعطف ہوئی اور اس نے بڑی پھرتی سے بیٹھ کر اسٹیرنگ وہیل لے لیا۔ لیکن انھیں چند لمحات میں ایک المناک حادثہ رونما ہو گیا۔ "سنبھالو! سنبھالو!" کے نعرے بلند ہونے لگے اور آن واحد میں موٹر کار کے قریب لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ بیچارہ ایک قلی موٹر کی زد میں آ گیا تھا۔ اگلے پہیوں نے اس کو کچل دیا تھا اور زردی چھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی جو اپنے مجروح شوہر کی حالت پر درد انگیز بین کر رہی تھی۔ سب کی آنکھوں کے سامنے قضا کا فرشتہ اپنی کارفرمائیوں میں مصروف تھا۔ سلیمہ یہ نظارہ دیکھ کر کانپ اٹھی، دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا لیں اور کار کی پچھلی نشست پر جا کر پڑ گئی۔ ڈاکٹر ہارون نے موٹر پیچھے ہٹائی، پھر مجروح قلی کا سر اپنے زانو پر رکھ کر دیکھ بھال کرنے لگا۔ اسے معلوم کرنے میں زرا دیر نہ لگی کہ قلی بہت طرح مجروح ہوا ہے، اس کا بچنا محال ہے، اور وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ حسب دستور امبولینس اور پولیس کے کارکن موقع واردات پر پہونچ گئے، زخمی کو ہسپتال پہونچایا گیا، ڈاکٹر ہارون کی موٹر ضبط کر لی گئی۔ اور اسے فہمایش کی گئی کہ کل مع اپنی ہمراہی خاتون کے منصف حوادث کے اجلاس میں حاضری دینی پڑے گی۔

ڈاکٹر ہارون نے پہلے اس امر پر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ الزام اسی کے سر ہے، لیکن جب مجمع میں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ عورت چلا رہی تھی تو اس کی پریشانی پھر عود کر آئی۔ اور اس پر ایک گونہ سراسیمگی طاری ہو گئی۔

تشویش کے عالم میں اس نے موٹر کو اپنے گھر کی سمت چلانا شروع کیا۔

کھادی کو مقبول عام بنانے کے لئے سابرمتی آشرم کے قائدِ اعظم ———— مہاتما گاندھی آج دہلی تشریف لائے ہیں، ان کا پیغام سننے، ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کی خاطر مخلوق امنڈی چلی آرہی ہے، مرد، عورت، بچے بوڑھے، جوش اور شادمانی کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عین اسی وقت اپنے گھر کی سمت واپس جانے والے یہ دونوں میاں بیوی ———— ڈاکٹر ہارون اور سلیمہ ———— بہت ہراساں اور چپ ہیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ بہت دن کے بعد آج میاں بیوی کو ایک ساتھ سیر کے لئے نکلنے کا موقع ملا تھا، لیکن خبر نہیں کس منحوس ساعت میں انھوں نے باہر قدم رکھا تھا کہ یہ افسوس ناک سانحہ رونما ہوا۔

———— دونوں پاس پاس بیٹھے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے خیالات میں مستغرق، وہ کیا کہیں اور کیا بات چیت کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ہارون نے اپنی بیوی کی جانب نظر کی اور پھر بے اختیار کہنے لگا ———— "ارے سلیمہ! رو رہی ہو، بھی!"

سلیمہ نے اب اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا، جوش گریہ سے اس کے آنسو نہیں تھمتے۔ اس نے رقت آمیز لہجے میں یہ بھی کہا ———— "میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں مجھے خدا کے لئے فیروز پارک پہنچا آئیے"!

ہارون متعجب ہو کر کہنے لگا ———— "کیوں، کیوں، فیروز پارک کیوں؟ آخر ہم گھر کیوں نہ چلیں؟"

سلیمہ نے کہا ———— "نہیں نہیں، ماں کے پاس جاؤں گی۔ میرا جی معلوم نہیں کیسا ہو رہا ہے"

ہارون نے دریافت کیا ———— "تو کیا ابھی؟"

سلیمہ نے جواب دیا ———— "ہاں ابھی!"

ہارون نے افسردہ دلی کے ساتھ کہا ———— "کیوں سلیمہ! مصیبت کے وقت تم میرا ساتھ چھوڑنا پسند کرتی ہو"،

سلیمہ نے خفیف ہو کر کہا ———— "یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں مجھے فیروز پارک پہنچا دیجئے۔ میرا جی بگڑ رہا ہے۔ میں صرف دو دن وہاں رہنے کی اجازت چاہتی ہوں"۔

ہارون تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا ———— "سلیمہ! جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب اماں کے پاس جانے سے کیا حاصل اماں کیا کریں گی۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اپنے گھر چلیں، دونوں ایک تسلی دیں۔ اور اگر ماتم ہی کرنا مقصود ہے تو ایک ساتھ بیٹھ کر خوب سینہ کوبی کرلیں۔ کہو کیا رائے ہے؟"

سلیمہ نے اس کی پوری بات سنی کہ نہیں، البتہ اس نے بے ساختہ ہارون کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ پھر درد انگیز آواز سے کہنے لگی ———— "کیا اس آدمی کی جان بچ سکتی ہے؟ جلدی بتاؤ میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ وہ بوڑھیا جو وہاں

رہی ۔۔۔ رو رہی تھی، اس کی بیوی تھی یا رشتہ دار۔ ہائے اس کی آواز کیسی دردناک تھی۔ اب تک میرے کانوں میں اس کے رونے کی آواز گونج رہی ہے، اور . . . .

سلیمہ اپنی بات ختم کرنے کے پہلے ہی چلا چلا کر رونے لگی۔

ہارون چونک اٹھا۔ وہ غور کرنے لگا کہ یہ عورت ۔۔۔ سلیمہ ۔۔۔ مخلوق کی کتنی غم گسار ہے۔ ایک نازنین جس کی پرورش شہرت اور تنعم کے گہوارے میں ہوئی ہے، مصیبت زدہ قلی اور اس کے لواحقین کے لئے ہمدردی کے آنسو بہا رہی ہے! وہ کتنی حوصلہ مند ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں موٹر چلاتے ہوئے ذرا نہیں جھجکی، اور اب محض چند ساعتوں کے بعد ایک کمسن سادہ لوح، لڑکی کی طرح زار وقطار رو رہی ہے! لیکن اب رونے سے کیا ہو سکتا ہے۔ آج اس کی آنکھوں سے گو اتنے طوفان جاری ہوں کہ ہزاروں سمندر بن جائیں، پھر بھی وہ حادثہ نہیں مٹ سکتا۔

سلیمہ نے اپنے شوہر کو خاموش دیکھ کر پھر کہا ۔۔۔ ۔۔۔ "ہاں بتاؤ۔ وہ زندہ ہو جائے ایسی کونسی تدبیر ہے؟"

ہارون سمجھ گیا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جانے میں عافیت ہے۔ اسی واسطے وہ سلیمہ کی گریہ وزاری میں زیادہ مخل نہیں ہوا آنسوؤں کی ایک دھار قلب کی آگ کو بجھا دیتی ہے۔ آدمی اسی ساحل پر نہا کر سکون خاطر حاصل کرتا ہے۔ آج سلیمہ کا نسوانی دل بھی اسی دریا میں نہا کر پاک وصاف ہو رہا ہے!

ہارون کو سب سے بڑا ایس وپیش یہ ہے کہ فیروز پارک کا ماحول سلیمہ جیسی پاک سیرت لڑکی کے حسب حال نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسی جگہ سے ہارون کو یہ دُرِ بے بہا ملا ہے، لیکن وہاں کی امیرانہ طرز معاشرت تکلفات اور تصنع سے مملو ہے دل کیا چیز ہے، وہاں کا کوئی باشندہ نہیں جانتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ شادی کے بعد سے برابر ہارون کی یہ سعی بلیغ رہی کہ سلیمہ فیروز پارک کی فضا سے بالکل علیحدہ رہے۔ اسے یہ تجربہ بھی اپنے سہ سالہ دور تاہل میں ہو چکا ہے کہ سلیمہ جب تک اس کے ہاں رہتی ہے بڑی خلیق، بڑی ہمدرد اور نیکیوں کا مجسمہ بن جاتی ہے، لیکن فیروز پارک کی فضا میں پہنچتے ہی اس کی حالت بدل جاتی ہے

(۲)

آج سر محمود کی طبیعت بہت اداس ہے۔ نازوں کی پالی ہوئی ان کی اکلوتی لڑکی سلیمہ تین دن سے بیمار ہے۔ اسے بڑے زور کا بخار آتا ہے اور بے ہوشی کے دورے ہوتے ہیں۔ خواب میں وہ بڑاتی بہت ہے۔ وہ رہ رہ کر چلانے لگتی ہے ۔۔۔ "ہاں میرے سرتاج بتاؤ، اس آدمی کو کیسے زندہ کیا جائے؟" ڈاکٹر اور حکیم تھوڑی تھوڑی دیر میں اسے دیکھنے آتے ہیں۔ خود سر محمود کے سر میں درد ہے۔ تمام کوٹھی میں اُداسی پھیلی ہے۔

جو احباب روزمرہ سر محمود کے ڈرائنگ روم میں چائے، کیک، بسکٹ، اور قیمتی سگار، کی طلب میں جمع ہوتے ہیں، آج بھی موجود ہیں۔ البتہ جہاں ہمیشہ قہقہے بلند ہوتے تھے، چائے کی پیالیوں اور کیک کی طشتریوں کی جھنکار سے کمرہ گونج اٹھتا تھا، وہاں آج بہت آہستہ آہستہ بات چیت ہو رہی ہے۔ سب جج بہادر ہاشمی صاحب مزے لے لے کر چائے پی رہے

ہیں، اور دھیرے دھیرے خان بہادر سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ ہائی کورٹ کے مشہور بیرسٹر مسٹر سلیمان صاحب خانہ کے سامنے ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔

نواب صاحب فرماتے ہیں — "کیا وہ ہسپتال جاتے وقت راستہ ہی میں جاں بحق ہو گیا؟"

خان بہادر نے جواب دیا — "نہیں، یہ غلط افواہ ہے۔ وہ کچھ دیر ہسپتال میں بھی زندہ رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بے وقوف کو موٹر کے سامنے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ اخبار والے اور بے طرح سر پیٹ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب مطمئن طریقے سے موٹر کی سواری کوئی کاہے کو کر سکے گا!

مسٹر سلیمان نے آہستہ سے کہا — "خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ متوفی کے پسماندگان ضرور قابل رحم ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ سلوک کرنا چاہئے۔ کیوں خان بہادر صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟

خان بہادر نے ناک بھوں چڑھا کر مسٹر سلیمان کی تجویز پر اظہار نفرت کیا اور پھر سر محمود کی طرف مخاطب ہو گئے — — کیوں سر محمود! لڑکی کا کیا حال ہے؟"

سر محمود نے انتہائی پریشانی کا اظہار کیا اور بولے — "ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ رات کو بھی بہت بے چینی رہی۔ اسے اپنی صحت سے زیادہ مقدمے کا خیال ہے۔

خان بہادر نے منہ بنا کر کہا — "اونہہ! تم بھی یونہی ہو۔ مقدمے کا کیا خیال۔ کیا کوئی سنگین واردات ہوئی ہے؟ ایک معمولی قلی تھا۔ ہارن بجانے کے باوجود اس نے موٹر کے سامنے آنے کی جرأت کی، اپنی غلطی سے مر گیا۔ اگر زیادہ ضرورت ہوئی تو پسماندگان کی مٹھی گرم کر دی جائے۔ سب معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

نواب صاحب نے آہستہ آہستہ منہ چلاتے ہوئے کہا — "اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

سر ششدھر کہنے لگے — "اونہہ، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ سلیمان! تم بھی تو کچھ بولو۔ تم تو قانون کے پتلے ہو منصف حوادث کا یہ فقرہ سنا "غفلت اور لاپرواہی سے آدمی مار ڈالا گیا!" لیکن اس پر مستزاد یہ ہے کہ سلیمہ کے نام موٹر چلانے کا لائسنس نہیں ہے۔"

خان بہادر گرج کر کہنے لگے — "سلیمہ کا قصور کہاں سے آیا۔ وہ تو پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ تمہارے داماد نے خلیل سے خود کہا ہے کہ وہ سب الزام اپنے سر لے گا۔ اور پھر سلیمہ کو موٹر چلانا کب یاد ہے"

اسی وقت سر محمود کا لڑکا حامد نوجوان بیرسٹر اپنے دوست خلیل احمد کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ خلیل احمد خان بہادر کا لڑکا ہے اور ہائی کورٹ کا نیا وکیل ہے۔ وہ ڈاکٹر ہارون کا بھی گہرا دوست ہے۔ چنانچہ اسی کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے کہ سر محمود نے اپنی چہیتی بیٹی سلیمہ کے ساتھ ہارون کا عقد منظور کیا تھا۔ خلیل اور ڈاکٹر ہارون ایک ساتھ پڑھتے تھے۔

ان دونوں کو اندر سے آتا دیکھ کر سب کے سب بے تحاشا پوچھنے لگے — کیا حال ہے؟ نیند اچاٹ ہو گئی؟"

حامد نے کہا ـــــــ جی نہیں۔ سو رہی ہے۔ اب طبیعت سنبھل رہی ہے۔ بہت کچھ افاقہ ہے۔ ہاں خان بہادر "سلو" کے موٹر چلانے کی نسبت کیا کہتا ہے ؟"

خان بہادر کہنے لگے ـــــــ یہی خلیل کہتا ہے کہ ہارون عدالت میں اظہار دے گا کہ موٹر میں چلا رہا تھا "

خلیل نے کہا ـــــــ جی ہاں ہارون نے اسی طرح کہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر بدقسمتی سے سچ کہنے کا موقع آیا تو بادل ناخواستہ واقعہ بیان کرنے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔"

حامد نے جوش کے ساتھ کہا ـــــــ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ وہ میری بہن کی خاطر دروغگوئی بننے لگا۔ بہ مروت اس میں نہیں ہے۔ ہمارے تمام احسانات کا عوض وہ نالائق یہی دیگا۔ کہ عدالت میں کہہ گزریگا کہ ہم دونوں سامنے بیٹھے چلا رہے تھے۔ ہم دونوں برابر تقصیروار ہیں۔ اگر وہ اقبال نہ کرے تو کیسے گا۔ ہاں آپ نے کچھ اور سنا؟ اس قلی کی بیوہ نے مقدمہ دائر کر دیا ہے!"

خان بہادر کو یہ سنکر اتنا غصہ آیا کہ وہ آپے میں نہیں۔ تب کر بیچ کر بولے ـــــــ مقدمہ؟ اور کس پر؟ پھر ایک قلی کی طرف سے؟ اللہ اللہ کیا زمانے کی نیرنگی ہے!" خان بہادر نے غیض کے مارے میز کانپنے لگی، چائے کا چمچ، پیالہ، اور طشتری سے جھنکار پیدا ہونے لگی۔

نواب صاحب فرمانے لگے ـــــــ واقعی کیا شان ایزدی ہے۔ ایک ذلیل قلی اور نالش فریاد کرے

حامد نے کہا ـــــــ نہیں یہ نہ فرمائیے۔ اب قلی ذلیل نہیں رہے،

خلیل نے کہا ـــــــ ٹھیک ہے۔ کل تھوڑی دیر کے لئے عدالت پولیس میں گیا تھا۔ میں نے بھی یہی سنا ہے کہ مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔

مسٹر سلیمان بیرسٹر نے کہا ـــــــ بالکل صحیح۔ کل میں نے بھی حادثے کی تفصیل اور مقدمہ دائر ہونے کی خبر سنی تھی۔

خان بہادر کو اب تک اعتبار نہیں ہوتا تھا کہ ایک ذلیل قلی ایسے شریفوں کے نام نالش دائر کرے۔

حامد نے کہا ـــــــ خان بہادر چچا! در اصل نالش دائر ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اس کے بھائی کو سمجھا کر معاملہ ٹھنڈا کیا جائے، لیکن اس بد معاش نے کچھ لینا منظور نہیں کیا۔ حرام زادہ نرم ہی نہیں ہوتا، کہتا تھا ـــــــ دلی کی بیگم صاحبہ کو جیل نہ بھیجا ہو تو نام نہیں!"

نواب صاحب اور مسٹر سلیمان ایک زبان ہو کر کہنے لگے ـــــــ "ایں! افوہ! آزادی کی جے!"

خان بہادر نے جو باتیں کبھی خواب میں بھی نہ سنی تھیں وہ آج سن رہے ہیں۔ وہ ایک دم حواس باختہ ہو کر کہنے لگے ـــــــ اب مزدور طبقہ لال پیلی آنکھیں دکھانے لگا۔ یہ سوائے بالشویت کے اور کچھ نہیں ہے! یہ سب بالشویکی سازش ہے!"

مقصود تمام گفتگو خاموشی اور متانت سے سن رہے تھے۔ بولے ـــــــ "مجھے اور کوئی فکر نہیں۔ صرف یہ اندیشہ ہے کہ آیا لڑکی و داماد ملزم گردانے جائیں گے؟"

خان بہادر مارے جوش کے اٹھ کھڑے ہوے اور خطاب کیا ——— ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، سر محمود تم کس خیال میں ہو۔ مجال ہے جو ایسا ہو جائے۔ تم ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور تمھاری لڑکی اور داماد اگر ملزم گردانے گئے تو برٹش راج عبث ہے اور ہم سب بھی عبث ہیں!

جس وقت ڈرائنگ روم میں یہ گرم مباحثہ ہو رہا تھا، سلیمہ اسی وقت بیدار ہو گئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے رٹ لگا رہی تھی ——— میرے سرتاج! تمھارے قدموں پہ سر رکھتی ہوں اسے زندہ کر دو

(۳)

پیشی کے دن علی الصباح قلی کی عورت اپنے بھائی کے ہمراہ ڈاکٹر ہارون کے گھر آئی۔ اس نے ڈاکٹر ہارون کے پاؤں پکڑ لیئے، اور کہنے لگی ——— بابو جی سنیا ناس مت کرو۔ دیکھو سب رہ جائے گا۔ سچ ساتھ جائے گا۔ آج میرے مقدمے کی پیشی ہے۔ بابو جی میں عدالت میں تم کو قسم دوں گی کہ موٹر کون چلا رہا تھا"

ڈاکٹر ہارون کانپ اٹھا۔ اس کی ذہنی اذیت کا ٹھکانا نہیں رہا۔ پہلے وہ جو کچھ بھی اظہار دیتا، لیکن اب اس نے عزم کر لیا کہ میں سوا سچ کے کچھ نہ کہوں گا۔ بے شک آدمی کے ساتھ سچ جاتا ہے۔ حق و صداقت کو ہمیشہ فتح حاصل ہوتی ہے۔

عدالت میں جب ہارون کے اظہار ہوئے تو سننے والے انگشت بدنداں ——— تھے کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ پہلے جسقدر دروغ بیانی اور حق پوشی کے اس نے منصوبے باندھے تھے وہ سب رہ گئے، اور اس کی زبان سے صداقت کے سوا ایک کلمہ بھی جھوٹ کا نہ نکلا۔

سلیمہ بیمار تھی۔ لہذا کمیشن پر اس کے اظہار لئے گئے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر کے بھی اظہار ہوئے۔ سلیمہ نے اپنے اظہار میں انھیں باتوں کا اعادہ کیا جو اسے طوطے کی طرح رٹائی گئی تھیں۔

ہارون کی راست گوئی سے قلی کی بیوی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب، سلیمہ اور متعدد گواہوں کے بیانات زیادہ وقیع سمجھے گئے۔ منصف صاحب نے فیصلہ صادر کیا کہ قوانین شارع عام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قلی موٹر کی زد میں آگیا۔ لہذا اپنی موت کا وہ آپ سبب ہوا۔ البتہ سلیمہ نے بغیر لائسنس موٹر چلائی، اس واسطے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ نیز جرمانے کا کچھ حصہ قلی کی بیوہ کو دلانے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔

مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد ہارون اپنی سسرال گیا۔ سر محمود، خان بہادر، اور جملہ ہم جلیس موجود تھے۔ ہارون کو دیکھتے ہی حامد نے غضبناک تیور سے دیکھ کر کہا ——— "ڈیم! کاوارڈ! منہ دکھاتے بھی شرم نہ آئی؟"

سب چپ چاپ سنتے رہے۔ کسی نے حامد کو اپنے بہنوئی کی تذلیل سے منع نہیں کیا۔

ہارون کی جرأت اور بے باکی میں مطلق فرق نہ آیا۔ اس نے فی الفور گرج کر کہا ——— "جو لوگ اپنے گھر کی لڑکیوں کو

جھوٹی شہادت دینا سکھائیں وہی کاؤ ارڈ (بزدل) ہیں نہ کہ میں! راستہ چھوڑ دو میں سلیمہ کو لینے آیا ہوں۔

ہارون نے اندر جانے کے لئے اور ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر حامد نے تیز ہو کر کہا ——— "نہیں مانتے۔ ٹھہر جاؤ۔ اگر تم نے اب قدم بڑھایا تو ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دوں گا! تم کمینے ہو۔ اپنی بیوی سے دغا کرنے میں بھی تمہیں باک نہ ہوا۔ ایسے مبتذل آدمی کے ساتھ میری بہن کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا! بدمعاش ———"

جب سر محمود نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ طول کھینچ رہا ہے تو وہ دونوں کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "ارے! یہ کیا ہے؟"

خان بہادر فوراً بول اٹھے ——— "سر محمود یہ تمھاری ناانصافی ہے۔ حامد کا اس وقت کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے۔ جسے اپنی بیوی، اپنے اہل و عیال سے متعلق اپنے فرائض کا احساس نہ ———"

بات کاٹ کر ہارون نے کہا ——— "اپنی بیوی سے متعلق فرائض کا احساس کرانے کی میں نے کسی سے استدعا نہیں کی ہے۔ آپ بالکل خاموش رہئے"

پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اندر چلا گیا۔

اسے دیکھتے ہی سلیمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لیکن وہ نازک ہاتھ ان آنسوؤں کو باز نہ رکھ سکے جو رخساروں پر جمع ہوتے اور پھر نیچے بہتے تھے۔

ہارون کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ مریضہ کے بستر کے قریب پہونچ کر فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر گلوگیر آواز سے کہنے لگا ——— "ہاں ٹھیک ہے۔ سلیمہ بہت ٹھیک ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ میں سنگدل ہوں۔ ظالم ہوں۔ میں نے تمھیں مصیبت میں پھنسا دیا۔"

سلیمہ نے ہاتھ اپنی صورت پر سے نہیں ہٹائے۔ وہ کہنے لگی ——— "اب میں کیا کہوں۔ تم نے میرے کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ تم نے میرے خلاف جھوٹی گواہی دی! میں اب منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اب خدا کے لیے مجھے مت ستاؤ" . . . . . پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہارون گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غور کرنے لگا۔ آیا سچ مچ میری عالی خاندان، میری تعلیم یافتہ، سلیمہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے ہیں؟ کیا درحقیقت یہ بہن اپنے بھائی کا پرتو ہے؟ لیکن یہ وہی سلیمہ تھی۔ جو بیماری کے عالم میں چلاتی تھی "میرے سرتاج! اس آدمی میں دوبارہ جان ڈال دو!" وہی سلیمہ آج مجھے خاطر میں نہیں لاتی۔

ہارون نے اور ایک مرتبہ سلیمہ کی نازک کلائیاں اپنے ہاتھ میں لیں، اور نرم لہجہ میں گویا ہوا ——— "سلیمہ کیا یہ تمہارا آخری جواب ہے!"

سلیمہ نے جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائیاں اپنے شوہر کی گرفت سے آزاد کر لیں اور چلا کر کہنے لگی ——— "خدا کے لئے مجھے

دق نہ کرو، میں تمھارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں کبھی نہ جاؤں گی کبھی نہ جاؤں گی "

یہ کہتے کہتے اس پر غشی طاری ہوگئی۔

خادمہ اور نرس فوراً کمرے میں آگئیں۔ حامد علی آگیا جو پوشیدہ طور سے سب گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ہارون کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا ——— "احمق! اب تو اپنے کانوں سے سن لیا تو نے ———"

ہارون نے فوراً اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولا ——— "آپ جیسے راست باز اور صداقت شعار انسانوں میں رہ کر سلیمہ یہ سبق نہ حاصل کرتی تو تعجب ہوتا۔ میں اسی خوف سے اسے یہاں سے لے جانے کی نیت سے آیا تھا۔ لیکن خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب انشاء اللہ آپ کے گھر میں ہرگز قدم نہ رکھوں گا۔ کیا شرافت اسی کا نام ہے کہ جرم کرکے عقوبت جرم سے بچنے کے لئے دروغ بافیوں سے کام لیا جائے، جھوٹی شہادت دی جائے؟ آپ کی جھوٹی دنیا آپ ہی کو مبارک "

ہارون پھر نہ ٹھہرا۔ باد تند کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۴)

پہلے پہل جب میں زیارت کرنے گیا تو مہاتما جی نے محبت بھرے الفاظ میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو میرے دل میں اُتر گئیں۔ بس مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ دل کا حال جان لیتے ہیں۔

سابرمتی آشرم کے شفاخانے میں ڈاکٹر ہارون میٹھا ہوا زخمیوں کے لئے کپڑے کی پٹیاں درست کرکے تہ پر تہ رکھتا جاتا تھا اور یہ الفاظ اپنے پاس بیٹھے ہوئے نوجوان سے کہہ رہا تھا۔ وہ نوجوان خلیل احمد تھا۔

خلیل احمد نے مسکرا کر پوچھا ——— " ہاں مہاتما جی نے کیا کہا تھا؟"

ڈاکٹر ہارون نے جواب دیا ——— "کیا کہا تھا۔ بس یہی فرماتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب! گھر میں جھگڑا کرکے تو نہیں آئے۔ دیکھو یہ قومی کام ہے۔ اس میں تمھیں تن، من، سے مصروف ہونا پڑے گا۔ اور اگر اپنا من دہلی میں چھوڑ آئے ہو، اور تن یہاں کام میں لگانے کا خیال ہے۔ تو تمھارا ابھی واپس چلا جانا بہتر ہے۔ " مہاتما جی کی باتیں سنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے کیا خوب ارشاد فرمایا کہ میں اپنا من دہلی میں چھوڑ آیا ہوں "

بلا قصد ایک ٹھنڈا سانس اس نے لیا اور چپ ہوگیا۔

وہ کچھ دیر ساکت رہا اور پھر پوچھنے لگا ——— " خلیل بھائی، تم بمبئی میں کب تک ٹھہروگے؟ گھر میں تو سب خیریت ہے ——— تمھارے گھر میں؟ "

خلیل کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے کہا ——— " ہاں معلوم ہوگیا۔ مہاتما نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم اپنا من دہلی میں چھوڑ آئے ہو۔ لیکن پھر یہ ڈھٹائی کیوں ہے؟ "

" کیسی ڈھٹائی؟ میں نہیں سمجھا "

اخاہ! ہاں اب کاہے کو سمجھو گے۔ اب تو تارک الدنیا بن گئے ہو! ارے احمق، اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھیں جس کا خیال رہتا ہے، جس کے پاس تم اپنا من چھوڑ آئے ہو، اس کی خبر کیوں نہیں لیتے؟"

یک بیک ہارون کی صورت متغیر ہو گئی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ایک لمحے کے بعد وہ کمال آہستگی سے کہنے لگا ——— "جو ساتھ رہنا نہ چاہے، جس کے علوم تبت سے اس غریب الوطن کو کچھ نسبت نہ ہو، اس کا ناحق ذکر کرتے ہو"

خلیل نے ہنس کر کہا ——— "دیکھو، میں نے ابھی اس کا تذکرہ صریح الفاظ میں تو نہیں کیا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ خود تمھارا من اسی کی یاد میں مصروف ہے۔ اس کے سوا کوئی اور بھی دہلی میں تمھارا ہے یا نہیں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا ——— خلیل بھائی اور کون ہے۔ ایک پھوپھی تھیں انھیں بھی میں بھوپال پہونچا آیا ہوں"

خلیل نے جوش کے ساتھ کہا ——— "بس اور کوئی نہیں ہے۔ احباب، آشنا، اپنے بیگانے، ارے سب ہی تو ہیں۔ پھر اگر ایسی زندگی بسر کرنے کا خیال تھا تو شادی کیوں کی تھی۔ آج کل وہ سب بمبئی میں ہیں۔ سلیمہ تمھارے لئے بہت بے تاب ہے۔ وہ بھی بمبئی میں ہے۔ اسے تمھارا انتظار ہوگا۔ اب زیادہ پاؤں نہ پھیلاؤ۔ سیدھے میرے ہمراہ بمبئی چلو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ آٹھ مہینے کی مفارقت نے سلیمہ کی حالت میں یہ کیسا اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ تو مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھی، آج کیوں طلب کر رہی ہے؟

خلیل نے پھر کہا ——— "بھائی ہارون جلدی بتاؤ کیا منشا ہے۔ کتنی دور دراز کی مسافت قطع کر کے میں آیا ہوں آج عدالت میں کمائی کے دن ہیں لیکن تمھاری خاطر سب کچھ چھوڑ آیا۔ لیکن آج تم مجھ سے ایسے منحرف معلوم ہو رہے ہو گویا ہم زندگی بھر جو ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ہیں، ہر کام میں شریک رہے ہیں، وہ تمام واقعات ماضی ہیچ تھے! آج تم نے سنیاس کیا لے لیا، ہم سب کو فراموش کر دیا۔ اچھا بتاؤ چلنا ہے؟

ہارون نے کہا ——— "فرض منصبی۔ کیا فرض منصبی سے غافل ہونے کا سبق دیتے ہو؟"

خلیل جھلا کر کہنے لگا ——— "بس رہنے دو تمھارا فرض منصبی۔ اٹھو چلو۔"

ہارون نے استقلال کے ساتھ کہا ——— "نہیں بھائی اپنا فرض منصبی ختم کئے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

خلیل بولا ——— "خیر اگر ایسے نہیں چلنا منظور ہے تو عارضی طور پر ایک دن کے لئے چلو۔ سب سے ملاقات کر لو۔ اور واپس آ جاؤ"

اسی وقت ایک صاحب پکارتے ہوئے آئے کہ ——— "ڈاکٹر ہارون! آپ کو کارلا کے کیمپ میں جانا ہوگا"

دفعتاً ان کی نظر خلیل کی اجنبی صورت پر پڑی۔ ہارون ان کا مافی الضمیر سمجھ گیا۔ اور کہنے لگا ——— "یہ میرے دوست ہیں۔ دہلی کے باشندے ہیں۔ مجھ سے ملنے یہاں تشریف لائے ہیں۔ یہ وکیل ہیں۔"

وہ مسرت کا اظہار کر کے کہنے لگے ——— "اس آشرم کے ناچیز خادموں کی آپ نے بہت عزت افزائی کی۔

میں آپ کا ممنون ہوں۔"

خلیل نے کہا ——— "یہ آپ کی نوازش ہے۔ میں تو ایک معمولی دنیادار ہوں۔ آپ جیسے بزرگوں نے جو قربانیاں کی ہیں وہ بلاشبہ قابلِ قدر ہیں۔ میں اپنے بخت پر نازاں ہوں کہ آپ کی ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ البتہ میری ایک درخواست ہے۔ اگر آپ سے ہو سکے تو میرے دوست ڈاکٹر ہارون کو دو چار روز کی رخصت ———"

وہ فوراً بول اٹھے ——— "رخصت! آپ کے دوست کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے اپنی مرضی سے یہ نیک کام اختیار کر رکھا ہے۔ فرضِ منصبی سمجھ کر اسے انجام دیتے ہیں۔ دو چار روز کی رخصت میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے، لیکن سر دست ان کا جانا نہ ہوگا۔ کیونکہ فرائض ان کے ذمے عائد کئے جاچکے ہیں۔ اور اب وقت پر دوسرا آدمی نہیں پہونچ سکتا۔" پھر وہ ہارون کی طرف مخاطب ہوے ——— "جاؤ ڈاکٹر ہارون، باپوجی سے مل لو، پھر اپنے مہمان کو آشرم اچھی طرح دکھادو۔ اور اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آج اسی آشرم میں ماحضر تناول "

خلیل کہنے لگا ——— "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ کیا ہرج ہو سکتا ہے۔ میں ضرور یہیں کھانا کھاتا اگر مجبور ہوں، مجھے اسی وقت جانا ہے۔ اب انھیں تو لے جا نہیں سکتا "

انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ——— "اب اس وقت تو معاف فرمائیے گا۔ اگر آپ پہلے کہتے تو کچھ بند و بست ہو سکتا، اب انھیں اپنے فرضِ منصبی کو انجام دینا ہی پڑے گا۔ فرضِ منصبی کا معاملہ ہے۔ مادرِ وطن کا کام ہے۔ . . . ."

وہ اور زیادہ نہ ٹھہر سکے۔

ان کے جانے کے بعد خلیل نے دریافت کیا تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو ہارون نے بتایا کہ یہ شیامل بھائی لال جی، بمبئی کے کروڑپتی تاجر اور احمد آباد و بمبئی کے تین کپڑے کے کارخانوں کے مالک ہیں۔

خلیل کو یہ معلوم کرکے بہت حیرت ہوئی

(۵)

خلیل نے جاتے وقت، ہارون کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا تھا، جسے چاک کرنے سے پہلے ہی، ہارون نے روشِ تحریر دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ یہ سلیمہ کا خط ہے۔

ریل میں بیٹھتے ہی خلیل کے دل میں ہزاروں خیالات موجزن ہونے لگے۔ میں کون سی دنیا میں جاکر پھنس گیا تھا۔ کیسی عجیب جگہ ہے۔ بس ایک سامری ہے جس کے سحر نے وہاں کی کایا پلٹ دی ہے۔ کیسے کیسے آدمی ۔ اس کے ایک افسوں سے، گرویدہ اور مسحور ہو گئے ہیں۔ شیامل بھائی لال جی، کپڑے کی تجارت کے شہنشاہ، کروڑپتی، تین کارخانوں کے مالک، آشرم میں ایک معمولی انسان کی سی، نہایت سادہ اور جفاکشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں!

ہارون، وہ ہارون جو میرے اشاروں پر چلتا تھا، جو مجھ سے جدا ہونا پسند نہ کرتا تھا، آج دیس چھوڑ کر اس پردیس

میں پڑا ہے۔ مجھ سے زیادہ، اپنی بیوی سے زیادہ، اسے اپنے فرض منصبی کا خیال ہے!

پھر اس نے آشرم کی زندگی سے اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنی معاشرت، کا مقابلہ کیا، لیکن انجام کار، اس نے بخیال خوشی یہی تصور کیا کہ اس خطے میں ادراک پر اسی ایک سامری فسوں سازی کا غلبہ ہے، اور کچھ نہیں۔

جب وہ بمبئی میں اپنے جائے قیام پر پہنچا تو دیکھا کہ حامد صحن میں ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور سلیمہ آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ ایک کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ حامد نے جب سنا کہ ہارون اپنے فرض منصبی سے مجبور تھا۔ اور نہ آسکا، تو اس نے اپنے ہونٹ کا ٹکڑا دانت پیس کر غصے کے ساتھ کہا ــــــ "دیکھو خلیل میں نہ کہتا تھا کہ وہ نہ محض بے وقوف بلکہ مبتذل ہے۔ جو شخص ادنےٰ اعلےٰ طبقہ کے قلیوں سے اسقدر ہمدردی کا اظہار کرے اس کی دنائت میں کیا مشبہ؟"

یہ گفتگو سلیمہ کے سامنے ہو رہی تھی، پہلی مرتبہ جب اس نے سنا کہ وہ نہیں آیا تو اس کا چہرہ اتر گیا، اور اسنے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ خلیل نے محسوس کیا کہ اس عورت کے جذبات اب برانگیختہ ہو رہے ہیں، اس کی نسوانی تمکنت کو صدمہ پہنچا ہے، جسے وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے، اسے جو شکست ہوئی ہے، اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی!

جب حامد کی صلواتیں حد سے تجاوز کر گئیں تو سلیمہ نے کہا ــــــ "بھائی، بس، بہت کہہ چکے"

ممکن تھا کہ حامد غصے میں اور کچھ بکتا، لیکن خلیل اس کا ہاتھ پکڑ کر چائے پینے کے بہانے سے باہر لے گیا اور کہنے لگا ــــ "حامد! تم ہارون سے زیادہ بے وقوف ہو۔ تم سلیمہ کے سامنے گالیاں دینے بیٹھے۔ واہ خوب آدمی ہو۔ معلوم نہیں کہ اس کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ اس سے ہمدردی درکنار، الٹا اس کے جذبات کو پامال کرتے ہو۔ تم عورت کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔"

(۶)

یہ کیا ماجرا ہے؟ آیا نظر اسے قبول کر سکتی ہے۔ کرلا کے ہسپتال میں ایک مجروح کے سرہانے سلیمہ! اور پھر نرس کا لباس پہنے ہوئے! قریب تھا کہ ہارون کا اس نے قفس کو پر زمین پر گر پڑتا، اس کے ہاتھ ایسے لرز رہے تھے، اس کا دل بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ سلیمہ، عیش و تمول کی آغوش میں جس کی پرورش ہوئی۔ جس کی نازبرداریوں کے لئے دولتمند ماں باپ نے کوئی کوتاہی نہ کی، وہ لاڈلی اکلوتی سلیمہ اور معمولی نرس کا کام کرے! "عقل سلیم اسے نہیں قبول کرتی۔ خود ہارون کو اول اول فریب نظر کا گمان ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بالکل خاموش اور نقش حیرت بنا کھڑا رہا تھا، پھر چند قدم آگے بڑھائے تھے اور کانپتی ہوئی آواز میں پکارا تھا ــــــ "سلیمہ! سلمیٰ!"

شادی کی پہلی رات میں ہارون نے سلیمہ کو جس طرح پکارا تھا۔ آج کی پکار بھی اسی کے مماثل تھی۔

سلیمہ نے پلٹ کر دیکھا۔ پہلے اسے خیال ہوا کہ کوئی اجنبی پکار رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دہلوی نازنین کی ہنسی سے کہا ــــــ

"کسی غیر عورت سے بلاسبب گفتگو کرنے سے آپ کے فرض منصبی کو نقصان تو نہیں پہنچا ڈاکٹر ہارون!"

ہارون کے دل پر گویا ایک چوٹ سی لگی۔ لیکن اس نے زہرخند سے یہ الفاظ ادا کئے کہ "سلیمہ فرض منصبی بے شک ایک چیز ہے،" پھر اس نے چاہا کہ بے اختیار سلیمہ سے لپٹ جائے، تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور جھنجلا کر کہنے لگی ——— "دیکھتے نہیں ہو میں اپنے فرض منصبی پر ہوں!"

ہارون خفیف ہوکر، کچھ چوٹ کھاکر، ناراضگی کے بطور دوسرے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

جس دن سابرمتی ندی کے کنارے سارابائی اور سلیمہ گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے ٹہل رہی تھیں، سلیمہ نے آنکھوں میں آنسو بھرکر اپنی سرگزشت سارابائی کو سنائی تھی۔ سارابائی بمبئی کے ایک لکھ پتی تاجر کی بہن ہیں۔ قومی خدمت کا شوق انھیں سابرمتی آشرم میں کھینچ لایا ہے۔ وہ اب تک کنواری ہیں۔ چرخہ کاتتی ہیں۔ کھدر پہنتی ہیں۔ زخمیوں کی تیمارداری کرتے جب وہ کارلا کے ہسپتال میں گئی تھیں تو سلیمہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی روز سے ان کا سلیمہ کا بہناپا قائم ہوگیا ہے۔

سارابائی نے سلیمہ کی آپ بیتی سنکر اس کے آنسو اپنے رومال سے خشک کئے، اسے گلے سے لگالیا۔ اور کہنے لگیں ——— بہن سلمیٰ تو کیسی پاگل ہے! تیرے شوہر آدمی نہیں فرشتے ہیں۔ وہ اگر میرے سامنے ہوتے میں ان کے قدموں کی خاک اپنے سر پر رکھتی۔ انھوں نے مقدمے میں سچ کے اظہار سے کام لیکر تجھے بھی جھوٹ کی ناپاکی سے بچالیا ہے۔ سلمیٰ اناداں لڑکی! تجھے چاہئے ان کے پاؤں دھو دھو کر پیئے"

اسی دن سے سلیمہ کی کایا پلٹ ہوگئی۔

ایک دن سلیمہ نے کارلا کے ہسپتال جانے کے لئے باپو سے اجازت حاصل کی۔ سارابائی اس کے ہمراہ جانے والی تھیں۔ اسی دن ڈاکٹر ہارون کارلا سے آشرم میں آئے۔

ڈاکٹر ہارون نے سلیمہ کو دیکھ کر آواز دی ——— "سلیمہ، سلمیٰ!"

سلیمہ دروازے کی طرف پشت کئے ہوئے چرخہ کات رہی تھی، اسے اپنا کام پورا کرکے کارلا جانا تھا۔ جونہی اسکے کان میں ہارون کی آواز آئی، اس نے موٹر کو دیکھا، چرخہ چھوڑکر سروقد تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، فی الفور دونوں ہاتھ جوڑکر آنکھیں بندکرکے وہ کہنے لگی ——— "بخشدیجئے! میرا قصور معاف. . . . . . !"

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، اس لئے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

ہارون نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کردئے۔ اور مسکرا کر کہا ——— "کون؟ میں، تم مجھے بخش دوگی؟"

بخشوں؟ دونوں کے لب باہم ملتے ہوئے نظر آئے۔

(تلخیص) حسن عزیز جاوید

اعتبارات

میں نے ایک آذرکدہ دیکھا۔ جس کے وسط میں میز پر کرۂ زمین رکھا ہوا تھا۔ ساکن، سنگین اور بے حس۔ اور اس کے چاروں طرف چار مجسمے سنگ مرمر کے قائم تھے جنکی نگاہیں کرۂ ارض پر جمی ہوئی تھیں۔

ایک مجسمہ ترکستان کے اس فرماں روا اعظم کا تھا جس کی تلوار سے ہمیشہ آگ کی چنگاریاں نکلتی تھیں، دوسرا یونان کے اس قائد اکبر کا تھا جس کے گھوڑے نے ایک عالم کو پامال کرکے رکھدیا تھا، تیسرا روما کے اس فرماں روا کا تھا۔ جو آگ کی لپٹوں میں بھی خاص موسیقی محسوس کیا کرتا تھا، چوتھا کسی مذہبی قائد و رہنما کا تھا، ہاتھ میں عصا، انگلیوں پر تسبیح، لانبی داڑھی، طویل عبا، جھکی ہوئی کمر اور چہرہ شکنوں سے بھرا ہوا۔

ایک مجسمہ نے کرۂ زمین سے مخاطب ہوکر کہا ——— "کیا تو پھر ایک بار مجھے اپنے اوپر حکمرانی کی اجازت دے سکتا ہے"

کرۂ زمین "کوئی حرج نہیں، میری پیٹھ اس بار کو پھر سنبھال لے گی۔

دوسرا مجسمہ "مجھے بھی ایک بار اپنی فضا میں آنے کی اجازت دے۔

کرۂ زمین "مناسب ہی، آپ بھی آئیے میں پھر اس تلخ تجربہ کو برداشت کرلوں گا۔

تیسرا مجسمہ "تو کیا میں محروم رہوں گا؟

کرۂ زمین "آپ بھی سہی، میں جسمانی غلامی کو ایکبار اور گوارا کرلوں گا"

چوتھے مجسمے نے اپنی مرتعش آواز سے پوچھا "اور میں؟"

کرۂ زمین یہ سنکر کانپنے لگا اور بولا کہ "معاف فرمائیے، ذہنی غلامی ایک بار سے زیادہ قابل برداشت نہیں"

ایک شام میں تصوف کی ایک کتاب پڑھتا ہوا سوگیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ دفعتہً ایک دیوانہ میرے پاس آیا جس کے بال اُلجھے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔

آتے ہی مجھ سے سوال کیا "تم کون ہو"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم"
بولا "میں بتاؤں"
میں نے کہا "ہاں بتاؤ"
بولا "تم میرے بندے ہو، میں تمھارا خدا ہوں"
میں نے کہا "ہو سکتا ہے"
غضبناک ہو کر بولا "کیسے ہو سکتا ہے۔ تم میرے خدا ہو، میں تمھارا بندہ ہوں"
میں نے کہا "ممکن ہے"
بولا "نہیں یہ بھی غلط ہے، تم میں ہو، میں تم ہوں"
میں نے کہا "اگر تم تم ہوتے اور میں میں تو کیا ہوتا"
بولا "کہ نہ پھر خدا خدا ہوتا، نہ بندہ بندہ"

میری آنکھ کھلی تو سر درد کر رہا تھا۔ اور دماغ بےکار تھا۔

نیاز

باب المراسلہ

(و۔ ا۔ بلگرامی)

آپ کا غالب نمبر پاکر آنکھوں کے سامنے بہت سی مٹی ہوئی تصویریں زندہ ہوگئیں۔ وہ یہ کہ حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی مرحوم اور میر امامی بلگرامی مرحوم اور غالب مرحوم تینوں ہم مکتب تھے۔ فرخ آباد کے مدرسہ میں تینوں ساتھ پڑھتے تھے میر امامی گویا تھ ضلع آرہ سے اور حضرت صاحب عالم صاحب مارہرہ سے اور غالب دلی سے فرخ آباد پہونچے تھے۔ میر امامی شیعہ تھے۔ حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ تھے اور رہے۔ اور غالب نے تبدیل مذہب کیا اور شیعہ ہوے۔ مگر شیعہ سنی ہونا وہ نہیں تھا جس کو بدقسمتی سے آج ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ بعد المشرقین ہے۔ بہرکیف کہنا یہ ہے کہ یہ تینوں ہم مکتب زندگی بھر ایک دوسرے سے شیر و شکر رہے۔ غالب اور حضرت صاحب عالم دونوں سے آپ واقف ہیں۔ مگر میر امامی کون تھے اون کو اس مطلع میں دیکھ لیجئے۔ مثنوی مرزم اد کا آغاز یوں فرماتے ہیں:—

لو ائم خامہ و لفظ است لشکر یہ میداں آدم اللہ اکبر

نعت کا ایک مصرعہ یوں ہے:۔ "یکے از معجزاتِ او علیؑ بود"۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آنحضرت کا یہ کھلا ہوا معجزہ تھا کہ علیؑ کا ایسا کفش بردار اون کو نصیب ہوا۔ اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علی نے جو کچھ پایا وہ صدقہ تھا آنحضرت کا۔

یہ مثنوی جس کا ذکر ہوا میر امامی نے مارہرہ بھیجی اور حضرت صاحب عالم صاحب کو لکھ بھیجا کہ ہم کو مطلع پر ناز ہے۔ وہاں سے جواب آیا کہ تمھاری مثنوی بہت اچھی ہے مگر مطلع ناقص ہے۔ وہ یوں کہ میدان میں تن تنہا ایک سپاہی کھڑا ہے اور غرور اس کو یہ ہے کہ ہم سپاہی نہیں بلکہ پوری فوج ہیں۔ "(لفظ است لشکر)" یہ نقص دور کرنے کے لئے مصرعہ یوں ہونا چاہئے:۔ "لوائم خامہ و الفاظ لشکر"۔

میر امامی نے جواب دیا کہ میری فوج اور آپ کی فوج میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میری فوج نہایت آراستہ پیراستہ۔ اور آپ کی فوج پریشاں حال اور بالکل تباہ۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ میری فوج کا میمنہ اور میسرہ قلب کی پوری حفاظت کر رہا ہے اور ایک منٹ کے لئے غافل نہیں ہوتا۔ (ل ف ظ = لفظ) "ف" قلب ہے اور دائیں بائیں اوس کے دونوں محافظ ہیں۔ برخلاف اس کے آپ کی فوج میں پریشاں حالی کا عالم یہ ہے کہ الف اور ظ جو میمنہ میسرہ کی خدمت پر مامور ہیں اون کو قلب سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ "الفاظ"۔

بہرکیف یہ حضرت صاحب عالم صاحب جنکا ذکر اوپر ہوا یہ نانا تھے صفیر بلگرامی کے .... صفیر بلگرامی کی پیدایش مارہرہ میں ہوئی۔ چنانچہ انقلاب زمانہ نے مکانوں کی صورت بدل دی مگر وہ کوٹھا جس پر اون کی ولادت ہوئی تھی مارہرہ میں اب تک محفوظ ہے۔ آمدم برسر مطلب۔ صفیر نے غالب کی شاگردی چاہی اور اس کے لئے وہ آرہ سے اپنے نانا کے پاس مارہرہ گئے اور ان سے سفارشی خط لے کر دلی گئے۔ تحفہ کے لئے مارہرہ کے آم ساتھ لیتے گئے۔ غالب نے اون کو اپنا مہمان کیا۔ اور چندے وہیں قیام رہا۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن صبح کو صفیر سلام کے لئے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ غالب بہت مضمحل ہیں اور پلنگ سے اٹھتے ہیں۔ خیریت پوچھی تو جواب ملا کہ کسل ہے اور بدن میں بہت درد ہے۔ صفیر نے پاؤں دبانا چاہا۔ غالب نے کہا کہ آپ سید زادہ ہیں۔ ہم ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتے۔ صفیر نے اصرار کیا تو غالب نے فرمایا کہ ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ تم اُجرت پر پاؤں دابو۔ صفیر نے کہا کہ ہم کو یہ قبول۔ اوس اجرت کو ہم برکت سمجھ کر لیں گے۔ چنانچہ اس شرط پر اونھوں نے پاؤں دابنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غالب نے فرمایا کہ اب بس۔ صفیر نے اجرت مانگی۔ غالب نے فرمایا کہ "واہ صاحب! پیسے کیسے؟ آپ نے پاؤں دابے ہمنے پیسے دابے!" یہ واقعہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔ مگر نگار ص ۱۷۶ پر نظر پڑی تو دیکھتے ہیں کہ یہی واقعہ میر مہدی مجروح سے منسوب ہے۔ عبدالباری صاحب آسی سے ہم سے مراسلت نہیں ورنہ اون سے دریافت کرتے کہ اون کا ماخذ کیا ہے۔ اگر ہم غلطی پر ہوں تو ہم قبول کرلیں گے اور اگر وہ غلطی پر ہوں تو تصحت فرمالیں کیونکہ مزید تحقیقات سے بات ہمیشہ سلجھ جایا کرتی ہے۔ ہم چشم دید گواہ ہیں۔ مگر اپنے گھر کی بات ہے اس لئے یاد رہی۔ صفیر جب دلی گئے تھے تو مارہرہ کے آم تحفۃً لیتے گئے تھے۔ اس واقعہ کی تصدیق اسی رسالہ میں موجود ہے۔ ص ۹۲۳ :۔

" صاحب عالم نے یاد دلایا کہ آپ نے مارہرہ کا ارادہ کیا تھا۔ اوسی کے جواب میں اونھوں نے چودھری عبدالغفور کو یہ لکھا. . . :۔ شیخ محی الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں . . . . . "

اسی سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اُردوے معلے میں جتنے خطوط چودھری عبدالغفور کے نام ہیں روئے سخن اون کا حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ مگر بہت کم خطوط شایع ہوئے۔ باقی انقلاب زمانہ کے سپرد ہوگئے۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب عالم نے لکھ بھیجا کہ سن ولادت میرا لفظ تاریخ سے نکلتا ہے (۱۲۱۱ ہجری) آپ کا سن ولادت کیا ہے؟ غالب نے جواب دیا۔

ہاتف غیب اس طرح چیخا
اُنکی تاریخ۔ تیرا "تاریخا"

"تاریخا" کے عدد ۱۲۱۲ ہجری ہوئے۔ یعنی ایک برس حضرت صاحب عالم صاحب سے غالب چھوٹے تھے۔
۷۳ برس کی عمر پائی۔ اور ۱۲۸۵ میں انتقال کیا۔ (۱۲ + ۷۳ = ۸۵)۔
تاریخ وفات کا واقعہ یوں ہے کہ اپنے مرنے کی تاریخ شاگردوں کو لکھ بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ صفیر بلگرامی کے
پاس اسی مضمون کا خط آیا تو جواباً اونھوں نے یہ لکھ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد "غین" کی ہے دعا — خدا کرے مرا غالب جئے "ہزار برس"

مختصر یہ کہ رسالہ نگار پاکر عجیب عجیب تصویریں سامنے آگئیں۔ خیال آگیا کہ جو واقعہ ہم کو معلوم ہے وہ آپ کو لکھ دیں۔

باب الاستفسار

عزیز لکھنوی کی شاعری

(جناب شاد صابری صاحب - کراچی)

میں حضرت عزیز کی قادر الکلامی وبلند پروازی کا بیحد معترف تھا اور آپ کو بھی آٹھویں دور کے ممتاز شعراء میں تصور کرتا تھا۔ لیکن آج آپ کے مجموعۂ کلام موسومہ "گلکدۂ عزیز" کے مطالعہ نے میرے عقاید وخیالات پر پانی پھیر دیا۔ میں نے آپ کے کلام میں ایسی ایسی غلطیاں پائیں جنکی توقع ایک مبتدی سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ جی چاہتا ہے کہ چند اشعار سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آپ کی راے طلب کروں اگرچہ جانتا ہوں کہ میری یہ جسارت حضرت عزیز کے بعض متوسلین ومعتقدین کو سخت ناگوار ہوگی۔

(۱) - دم نہ لینے پائے تھے ہم چھیڑ دی اک استاں قبر میں کیا خاک حاصل ہو تن آسانی تجھے

"دم نہ لینے پائے تھے ہم" ایک پورا فقرہ ضمیر جمع متکلم کے ماتحت ادا کرکے ردیف "مجھے" سے بے اعتنائی اختیار کیگئی جو صریح غلط ہے۔ اگر یہ تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیا جائے کہ کاتب کی غلطی سے مصرعۂ اولی میں بجائے "میں" کے "ہم" لکھا گیا تو "دم نہ لینے پاے تھے" کے متعلق کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے

(۲) - عمر گزری ہے بشکل خانہ ویرانی مجھے کیا ہوا ہستی سے حاصل جز پشیمانی مجھے

حضرت عزیز کے مصرع اولیٰ میں "مجھے" بمعنی "میری" استعمال کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ اساتذہ کے ہزارہا اشعار میری نظر سے بھی گزرے لیکن آجتک "مجھے" بمعنی "میری" دیکھنے میں نہیں آیا۔ بھلا خیال تو کیجئے "مجھے عمر گزری ہے" کہیں بولا جاتا ہے۔

(۳) - زنجیر اک کے ہلتے ہی سب گرد برد تھا صحرا جو ایک دفتر اوراق گرد تھا

"اوراق گرد" کوئی صحیح ترکیب نہیں۔ دامن گرد، چادر گرد، آج تک یہی تشبیہات دیکھنے میں آئی ہیں معلوم ہوا۔ کہ

"گرد" کے مختلف حصے کرکے ہر حصے کو ایک ورق کہنا بھی نادرست نہیں ہو سکتا۔

---

(۴)　حقارت سے نہ دیکھو ساکنانِ خاک کی بستی　کہ اک دنیا ہی ہر ذرہ ان اجزائے پریشاں کا

جب تک "ساکنانِ خاک کی بستی" کے ساتھ "کو" کا اضافہ نہ کیا جائے مفہوم ادا نہیں ہو سکتا از روئے قواعد یہاں علامت مفعول یا حرف جار کا استعمال ضروری ہے۔

---

(۵)　اپنی قسمت کو نہ روؤں چارہ گر کی کیا خطا　اک مرض پیدا ہوا جب دوسرا کچھ کم ہوا

مفہوم یہ ہے کہ جب چارہ گر کی چارہ گری سے ایک مرض کم ہوتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں قصور تقدیر کا ہے بیچارے چارہ گر کی کیا خطا۔ لیکن مصرع ثانی بالعکس کہا گیا یوں کہنا چاہئے تھا ع

دوسرا پیدا ہوا جب اک مرض کچھ کم ہوا

---

(۶)　گو بشبِ فراق میں، میں سر سے تا قدم　آئینۂ تحمل ایذائے درد تھا

مصرع اولے میں دو "میں" کا اجتماع آپ اپنی داد ہے۔ "سر سے تا قدم" کی ترکیب غلط ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر، "سر سے قدم تک" یا "از سر تا قدم" کہنا چاہئے تھا۔

---

(۷)　کسی کے وعدے پہ اتنا جو انتظار کیا　ارے یہ کونسا دل تھا جو اعتبار کیا

سبحان اللہ "جو" کی تکرار کے کیا کہنا ہیں

---

(۸)　اللہ رے تصورِ جاناں کی ہیبتیں　رُخ اپنا آئینہ میں جو دیکھا تو زرد تھا

حضرت عزیز کی شاعری کے قربان جایئے، کیا آپ کا محبوب کوئی جن بھوت تھا جس کی تصویر کے دیکھنے سے آپ کا چہرہ زرد ہو گیا۔

(**نگار**) پہلے شعر میں "شتر گربہ" کا عیب آپ نے ظاہر کیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مصرعہ میں ہم اور دوسرے میں مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرے شعر میں "مجھے" بھی غلط استعمال ہوا ہے۔ اس کی جگہ "میری" ہونا چاہئے۔

تیسرے شعر میں اوراق گرد پر آپ کا اعتراض ہے اور یقیناً صحرا کو "دفتر اوراق گرد" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ صحرا میں کوئی کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جس سے کنایتہً یا مجازاً دفتر کا مفہوم پیدا ہوتا ہو اور نہ گرد کو دیکھ کر کسی کا خیال اوراق کی طرف جا سکتا ہے۔

چوتھے شعر پر جو اعتراض ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیونکہ دیکھنا ایسا متعدی فعل ہو جس کے مفعول کے لئے لفظ کو کا استعمال صرف اس وقت ضروری ہوگا۔ جب مفعول کوئی انسان ہو۔ یعنی "زید دیکھو، احمد دیکھو" کہنا غلط ہوگا۔ لیکن "چاند دیکھو۔ کتاب دیکھو" صحیح۔ پھر چونکہ اس شعر میں مفعول لفظ ہستی واقع ہوا ہے جو انسان نہیں ہے، اس لئے اس کے بعد کو کا اضافہ ضروری نہیں"

پانچویں شعر میں بھی آپ نے اچھی بات پیدا کی ہے اور اعتراض نادرست نہیں ہے، اسی طرح چھٹے شعر میں سر سے تاقدم کہنا نامطبوع ہے۔

ساتویں شعر میں جو کی تکرار حقیقتاً اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور آٹھویں شعر میں بھی تصور جاناں سے ہیبت پیدا ہونیکا خیال واقعی وہی مفہوم پیدا کرتا ہے جو آپ نے ظاہر کیا۔

یہاں تک تو میں نے آپ کے صرف اعتراضات سے گفتگو کی ہے اور بڑی حد تک میں اُن سے متفق ہوں، لیکن آپ نے جو نتیجہ اس سے نکالا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کیونکہ اگر کسی شاعر کے کلام میں چند شعر ایسے نظر آجائیں جن میں کچھ اسقام پائے جاتے ہیں تو ان کو دیکھ کر یہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ آپ کے "عقاید وخیالات پر یوں دفعتہً پانی پھر جائے" اور اسے ممتاز شعرا کی صف سے نکال باہر کر دیں۔

حیرت ہے کہ ایک شاعر کو چند اشعار کے نقایص کی بنا پر صف شعرا سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور ان اکثر شعروں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے جو اس نے اچھے لکھے ہیں۔

کیا آپ مہربانی فرماکر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ گلکدۂ عزیز میں کتنے شعر ایسے ہیں جن میں کوئی نقص نہیں اور اگر کوئی شعر ایسا بھی ہو جسے آپ بہترین فکر شعری سے تعبیر کر سکیں تو اس سے بھی مطلع فرمائیے، لیکن اگر آپ صرف تخریبی پہلو کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو پھر استقصار کامل کر کے تمام ان اشعار کی فہرست مرتب کیجئے جو عزیز کو آٹھویں دور کے ممتاز شعرا کی صف سے علیحدہ کرنے کا مستوجب بناتے ہیں، میں نہایت شوق سے انھیں "نگار" میں اپنی رائے کے ساتھ درج کر دوں گا۔

ماہ آیندہ میں

جن معموں کے حل کے ساتھ ہم کے ٹکٹ نہ آئیں گے ان پر توجہ نہ کی جائے گی۔

منیجر

مطالعۂ قدرت

اک شام کہ شام بیکسی تھی ہر نبض دماغ تھک چکی تھی
فکروں سے خیال مضمحل تھا میں اور الم نصیب دل تھا
آلام کے نقش ابھر رہے تھے اجزائے سکوں بکھر رہے تھے
ہر جنبش دل پیام غم تھی ہر سانس فسانۂ الم تھی
غم روح کو کھائے جا رہا تھا ہر سمت دھواں سا چھا رہا تھا

القصہ بہت ملول تھا میں
آخر اک سمت چل دیا میں

کچھ دور فضائے دشت میں تھا اک چشمۂ نرم رو سبک پا
خودرو غنچے مہک رہے تھے سبزہ، پودے، لہک رہے تھے
بہتے کی وہ دلکشا روانی پھولوں میں وہ نور شادمانی
شاداب کلی چٹک رہی تھی صحرا کی جبیں دمک رہی تھی
روحوں کو یہاں جگا رہے تھے نمناک ہوا کے نرم جھونکے
چڑیاں پیہم چہک رہی تھیں کلیاں یکسر پھبک رہی تھیں
فطرت نے یہاں بہم کئے تھے راحت، جلوے، شراب، نغمے
عشرت کا پیام دے رہے تھے پانی، سبزہ، طیور، پودے
نورس غنچوں کا وہ ترنم خوشبو، نرمی، ضیا، تبسم
دلکش پھولوں کی وہ صباحت خوبی، نزہت، مہک، لطافت
دیکھا جو یہ حسن، یہ ہوائیں معلوم ہوا، کہ جی گیا میں
پھر تازہ، لہو رگوں میں دوڑا دل نے تسکیں کا بھید پایا

چھلکی مے لالہ گوں سبو میں
غم بہ گیا سیل رنگ و بو میں

ہمدم دنیا کی تلخ آہیں ؛ سونی آنکھیں، بجھی نگاہیں

سینے میں خلش، جگر میں کاوش حسرت کا ہجوم، غم کی بارش
یہ رنج کی ناشگفتہ صبحیں یہ درد کی بے نشاط شامیں
یہ روح میں تلخیوں کا احساس ہستی اک موت، زندگی یاس
انجامِ نگاہ سطح بیں ہے احسانِ حیات کم نہیں ہے

دنیا کو نشاط کی خبر دے
بابِ فردوس باز کر دے

اے محوِ غرورِ عقلِ انساں! اسرارِ سکون و جوشِ طوفاں!!
دھندلا ہے ابھی جمالِ گیتی تنقیص میں ہے کمالِ گیتی
حکمت کی یہ عقل آزمائی دولت کا یہ درسِ خود نمائی
یہ جوشِ حصولِ عزت و جاہ یہ ذوقِ نشاط و فکرِ جانکاہ
انساں کی شرحِ ناتمامی عشرت، عبرت، خودی، غلامی
وابستۂ آب و رنگِ باطل مجروح ضمیر و سطح بیں دل
عسرت کی ذلیل بے نوائی دولت کا تجملِ خدائی
دنیا کا نظام اور کچھ ہے فطرت کا پیام اور کچھ ہے
بیکار نہیں یہاں کوئی شے ذہراب کی موج و لرزشِ نے
ہر چیز اگرچہ دلنشیں ہے ان میں تسکینِ دل نہیں ہے
حکمت کا غرور، منظرِ خواب دولت کا سرور نقش بر آب
ہر موجِ طرب، دواں نہیں ہے ہر خوابِ سکوں، گراں نہیں ہے
محرومِ سرور ہیں شرابیں آئینۂ جہل ہیں، کتابیں
دانش، افسانۂ جنوں ہے ہستی، بیگانۂ سکوں ہے
فانی گلشن، بہار باطل سارے نقش و نگار باطل
دانش مغرور، علم خود بیں راحت دھوکا، فریبِ تسکیں

غافل! نظارۂ حقیقت
پنہاں ہے تہِ نقابِ فطرت

علی اختر از حیدرآباد دکن

ایک آرزو

بے حجابانہ در آ، روح کو مضطر کر دے　　شعلۂ ہجر کو آ، بادۂ احمر کر دے
آشناؤں میں بھرتا ہوا، پھر طرفہ خروش　　دل کو پھر منصبِ شورش پیمبر کر دے
آتشِ یاس کو دیتا ہوا، پیغام اُمید　　ایک ہنگامہ سرِ بالش بستر کر دے
عالمِ عشق کو پھر نہد گلِ ارزانی کر　　ذرۂ شوق کو پھر خسرو خاور کر دے
شوق کو عالمِ محسوس سے بیگانہ بنا　　عشق کو وسعتِ کونین سے باہر کر دے
تجھے اپنے لبِ گلرنگ کی خوشبو کی قسم　　شامِ ہجراں کی ہواؤں کو معطر کر دے
موجۂ چشمۂ حیواں کے تصدق، ای زلف　　میرے شانوں پہ رواں مرہم و کوثر کر دے
ایک ہی دور میں اے نرگسِ میخانہ فروش　　فتنۂ ہوش کو غرقِ مئے و ساغر کر دے
صحنِ گیتی کا بہ یک ناز مٹا پست و بلند　　سطحِ عالم کو بہ یک عشوہ برابر کر دے
ناز کو بخش سرِ پرسشِ اربابِ نیاز　　خار کو زینتِ آغوشِ گلِ تر کر دے
آتشِ تشنگیٔ جاں کو بنا آبِ خضر　　زنگِ آئینۂ ہستی کو سکندر کر دے
شوق کو ناز سکھا، عشق کو برنائیٔ حسن　　جسم کو جان بنا، خاک جوہر کر دے

آشنا رو، کتابی کی کوئی آیتِ ناز
جوشِ وارفتہ کو شاعر سے پیمبر کر دے

جوش (ملیح آبادی)

شرمیلی آنکھوں والے سے

صورتِ شوخ، نگاہیں چنچل، آنکھوں میں دنبالے سے
ہرنی بھی شرما جائے اس بانکی چتون والے سے!

دل میں کون چبھوتا رہتا ہے یہ ہر دم بھالے سے
مل جائے تو پوچھوں اس شرمیلی آنکھوں والے سے!

دل سے اکثر ایسے باتیں ہوتی ہیں تنہائی میں
جیسے کوئی سیکھ رہا ہو عقل کسی متوالے سے!

روئے ناز کے گرد سنہرا آنچل ایسے چمکا ہے
جیسے چاند کے گرد نظر آتے ہیں اکثر ہالے سے!

اول اول ہوتے ہیں یہ قاتل، شوخ، ستمگر بھی:
کیسے سیدھے، کیسے سچے، کیسے بھولے بھالے سے!

بجلی ہے یہ موجِ تبسم اے دل یوں مدہوش نہ ہو
ناگن بن کر ڈستے ہیں یہ گیسو کالے کالے سے!

جاتے جاتے روک کر ایسے باتیں کرتا ہوں
جیسے کوئی وقتِ آخر لینے لگے سنبھالے سے!

تاروں کی چشمک یہ عروسِ سحر تبسم کرتی ہے
سورج کسبِ نور کیا کرتا ہے اسی اجالے سے!

دیوانہ ہے دیوانہ طالب کو عبث سمجھانا ہے!
عشق کی ٹھوکر کھا کر بھی سنبھلا ہے کوئی سنبھالے سے!

طالب باغپتی

محبت

محبت — اک تپش ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے

ہر ایک جلوہ ہے میرے لئے کشش تیری
ہر اک صدا مجھے تیرا پیام ہوتی ہے

جو راہ اہلِ خرد کے لئے ہے لامحدود
جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

شرارِ آتشِ نمرود سے بھی ہے بدتر
وہ آرزو — جو ہوس کی غلام ہوتی ہے

کچھ اس میں مرد و ضور کی نہیں تخصیص
یہ رسم "شہرِ محبت" میں عام ہوتی ہے

خدایا! ہو رہے ایوانِ آرزو کی خیر
سنا ہے عشق کی تعمیر خام ہوتی ہے

یہ کائنات ہے جس کے لئے سراپا گوش
تری ہی بات وہ اک خوش کلام ہوتی ہے

نمازِ عشق کا آتا بھی ہے جو ہوش کبھی
تو بیخودی مری بڑھ کر امام ہوتی ہے

وہ مرگ — مرگِ محبت ہے جس کا نام روش
چراغِ راہِ حیاتِ دوام ہوتی ہے

روش صدیقی

ساقی سے خطاب

اٹھ اے ساقی نشے میں ڈوب کر مستی سے لہرا کر
تڑپتی بجلیوں کا خون لا افلاک سے جا کر

ستاروں کی سنہری تابشوں کو جام میں بھر لا
سرورِ ماہ طلعت بادۂ گلفام میں بھر لا

اٹھا لا آگ خورشیدِ جہاں افروز کے دل کی
چرا لا بزمِ گردوں سے جوانی ماہِ کامل کی

افق سے آتشیں جلووں کو کر تحلیل ساغر میں
فروزاں کر شفق کے نور کی قندیل ساغر میں

طلسمِ آب و گل کو منتقل کر دے حقیقت میں
ملا دے حسنِ رنگا رنگ کو انوارِ وحدت میں

نگاہوں میں سے عرفاں کا کیفِ سرمدی بھر دے
اٹھا دے سامنے سے نیلگوں افلاک کے پردے

لباسِ معرفت لا اور پہنا دے مجھے ساقی
الوہیت کے میخانے میں پہنچا دے مجھے ساقی

عدم

معلومات

ہومر اور مصطفیٰ کمال

یونان کے مشہور شاعر ہومر کے متعلق بہت اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ وہ خرافیات یونان کی ایک فرضی ہستی ہے اور بعض کا گمان ہے کہ وہ حقیقتاً ایک شاعر تھا اور الیڈ کی رزمیہ داستان اس نے لکھی تھی۔

مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی کی رائے ہے کہ ہومر یونانی الاصل نہ تھا بلکہ وہ ترکی الاصل تھا، ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس کا نام عمر تھا جو بعد کو ہومر ہو گیا تھا۔

رہا یہ امر کہ ایک ترک نے یونانی زبان میں کتاب کیوں لکھی۔ سو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ کیونکہ بہت سے ترکوں نے دوسری زبانوں میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور لسانیات کی جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی زبان کے بہت سے الفاظ ترکی زبان سے لئے گئے ہیں۔

ایک عجیب دعویٰ

انگلستان کے قانونی عجائب میں سے ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ بہت قدیم قوانین پر عملدرآمد تو ترک ہو گیا ہے لیکن ان کو منسوخ نہیں کیا گیا، اس حقیقت سے حال ہی میں ایک عورت نے وہاں عجیب فائدہ اٹھایا۔

یہ ایک نا کتخدا لڑکی تھی جو کسی وکیل کے دفتر میں ٹائپ کرنے کی خدمت پر مامور تھی، اس نے ایک سینما کمپنی پر ۲۵ ہزار ڈالر ہرجانہ کا دعوے کیا۔ کیونکہ یہ سینما کمپنی اتوار کے دن بھی تماشہ کرتی ہے جو حسب قانون ۱۷۸۱ء ممنوع ہے اور جس کے خلاف ہر شخص کو دعوے دائر کرنے اور معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

——عدالت میں اس مسئلہ پر بہت گفتگو ہوئی۔ اور آخرکار سینما کمپنی کو یہ معاوضہ ادا کرنا پڑا۔

ماں محبت کیوں کرتی ہے

ڈاکٹر مرناک نے اپنے ایک خطبہ میں طلبہ کو بتایا کہ ماں کی محبت اپنے بچہ سے نتیجہ ہے مادہ مگنیزیا کا جو غذا میں پائی جاتی ہے۔ اگر یہ مادہ اس کی غذا سے جدا کر دیا جائے تو وہ اپنے بچہ سے محبت کرنا چھوڑ دے۔ یہ کہنا کہ ماں فطرت کی طرف سے بچہ کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور ہے درست نہیں۔ اس طرح کی تمام فطری خواہشیں نتیجہ ہیں بعض مواد کیمیاوی کے تفاعل کا جو انسان و حیوان کے اجسام میں پائے جاتے ہیں

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس کا تجربہ چوہوں پر کیا اور بالکل صحیح پایا۔ یعنی جس وقت اس نے چوہیا کی غذا سے مادۂ گمنیز یا جدا کر دیا اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف سے التفات بالکل ترک کر دیا۔

ہر چند انسانی غذا سے یہ مادہ جدا کرنا دشوار ضرور ہے لیکن محال نہیں اور اگر کسی وقت یورپ نے جو پیدائش اولاد کا زیادہ حامی نہیں ہے اس پر عمل شروع کر دیا نوعِ انسانی پر اس کا کیا اثر ہوگا؟

پانی اور سونا

اس وقت تک جتنا سونا جہازوں کے ڈوبنے سے سمندر کی تہ میں جمع ہو چکا ہے، اس کا اندازہ بھی کروروں پونڈ تک پہونچتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی سمندر کے پانی میں خود اتنی مقدار سونے چاندی کی پائی جاتی ہے کہ اس کا اندازہ محال ہے۔ کیونکہ غریب سے غریب انسان بھی روئے زمین کا روزانہ کافی مقدار سونے چاندی کی پانی کے ذریعے کھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۷۲ء میں انگلستان کے ایک ماہر کیمیا نے دریافت کیا کہ سمندر کے فی مکعب پانی میں دس ملیگرام چاندی اور بیس ملیگرام سونا پایا جاتا ہے۔ اور اگر کسی طرح سمندر کے پانی سے یہ دونوں دھاتیں علیحدہ کر لی جائیں تو ۱۳۲۳ ملین مکعب کلومیٹر پانی سے ۱۳۰۰۰ ملین ٹن چاندی اور ۴۰۰۰ ملین ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کو دنیا کی ساری آبادی پر تقسیم کر دیا جائے۔ جو ۵۰۰ ملین کے قریب ہے تو ہر شخص ۲۸ ٹن سونے اور ۹ ٹن چاندی کا مالک ہو سکتا ہے۔

وہم و ہذیان کا فرق

جرمنی کا پروفیسر مانڈل اپنی فکرِ باطن کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ایک مرتبہ کوئی عورت اس کے پاس آئی اور دریافت کیا کہ وہم و ہذیان میں کیا فرق ہے۔ پروفیسر مذکور نے کہا کہ "اس کا جواب یوں تو بہت تفصیل کا محتاج ہے، لیکن مختصراً آپ یوں سمجھئے کہ اس وقت آپ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ اس وقت میں اپنے سامنے ایک فرشتہ کو دیکھ رہا ہوں، تو میرا یہ کہنا ہذیان ہوگا۔ لیکن اگر کہوں نہیں بلکہ صرف دل ہی دل میں ایسا سمجھ لوں تو یہ سمجھنا وہم ہوگا۔

صحت کی بیماری

فرانس میں ایک شخص ہے جس کی عمر اس وقت ۵۰ سال کی ہے اور وہ یوم ولادت سے تا ایں دم کبھی کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوا۔ اس کی ضخامت کا یہ عالم ہے کہ جہاں بیٹھ جاتا ہے۔ پتھر کی چٹان کی طرح اس کو ہلانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کا وزن ۹ من کے قریب ہے۔ اس کے سینہ کا دور ساڑھے تین گز اور کمر کا دور چار گز ہے۔ ران کی لپیٹ ۱½ اور شانہ کی ایک گز ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت وہ دنیا میں سب سے زیادہ فربہ انسان ہے۔ اس کے بیٹھنے کے لئے لوہے کی کرسی جو بالکل مسہری کی طرح چوڑی چکلی ہوتی ہے۔ خاص طور پر تیار کی جاتی ہے اور اس کے ایک کوٹ پتلون میں تین آدمی اچھی طرح سما سکتے ہیں،

اقتدارِ نسائی کی سرزمین

جزیرہ سونارا میں بعض قبائل ایسے موجود ہیں جہاں مرد کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کی حیثیت گھر میں وہی ہوتی ہے جو ایک جانور کی یا اسباب

ضرورت و معاشرت کی۔ جب تک شادی نہیں ہوتی وہ ماں اور بہن کی حکومت میں چاکرانہ زندگی بسر کرتا ہے اور جب شادی ہو جاتی ہے تو بیوی اس کو اپنا غلام بنا کر لے جاتی ہے۔ حال میں ایک سیاح نے اس جزیرہ کا سفر کر کے وہاں کے ایک قبیلہ مینانگ کا بوس کا حال لکھا ہے کہ "اتفاق سے میرے ہی سامنے وہاں ایک شادی ہوئی اور میں نے دیکھا کہ عورتیں نہایت بیش قیمت لباس میں ملبوس ہیں سونے کے جڑاؤ زیوروں سے ان کے جسم کا ہر حصہ آراستہ ہے اور نگلیوں کی ایک ایک پور میں اتنی انگوٹھیاں ہیں کہ ہاتھ ہلانا دشوار ہے، لیکن فدوی شوہر معمولی مزدوروں کا سا لباس پہنے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ جلسہ چھ دن تک قائم رہا۔ اور ایک بار بھی اس غریب کو کسی صحبت میں شریک نہیں کیا گیا۔ آخری دن اس کو بڑا عرب کے ساتھ کھانا کھلا کر گھر بھیج دیا گیا۔ تاکہ وہاں وہ اپنی بیوی کی اجازت کا انتظار کرے"

کیا وہ عورتیں جو اپنے حقوق کے لئے آج آسمان و زمین سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ سماترا کے ان مجبور و بیکس مردوں کی طرف نگاہ نہ کریں گی جن پر ان کی بہنیں خدا معلوم کب سے یہ انتقام لیتی چلی آ رہی ہیں۔

قسمت کا چکر

کیا آپ نے کبھی ایسا سنا ہے کہ کوئی شخص کسی جلسہ سے اٹھ کر اپنی گھر کی طرف روانہ ہو اور تین مہینے تک گھر پہونچنے میں لگ جائیں حالانکہ گھر دو فرلانگ سے زیادہ دور نہ ہو۔ یقیناً یہ ایسی بات ہے جس کا یقین کرنا دشوار ہے۔ لیکن شہر سانگان میں ابھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔

دو بہنیں ایک رات ..... میں گئیں اور جب آدھی رات گئے واپس آنے لگیں تو انھوں نے کہا کہ آج گرمی بہت ہے چلو سمندر کے کنارے کنارے ہوا کھاتی چلیں۔ جب وہ ساحل پر پہونچیں تو وہاں چاندنی اسقدر پر لطف تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے ایک کشتی میں بیٹھ گئیں اور منظر کا لطف حاصل کرنے لگیں۔ ہوا سرد تھی، رقص نے انھیں تھکا دیا تھا اس لئے وہیں لیٹ گئیں اور لیٹتے ہی سو گئیں۔

صبح کو جوان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کشتی بیچ سمندر میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے اور کوئی صورت نجات کی معلوم نہیں ہوتی۔ اتفاق سے ایک جہاز اس طرف سے گزر رہا تھا۔ اس کے کپتان نے دوربین سے دیکھ کر ایک کشتی بھیج کر ان کی جان بچائی۔ اور اپنے جہاز میں بٹھا لیا۔ جہاں ان کو مطبخ میں کام کرنے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ یہ جہاز اسباب تجارت لئے ہوئے جا رہا تھا۔ اور تین ماہ تک اسے واپس نہ آنا تھا، اس لئے ان کو مجبوراً اتنے زمانہ تک وہیں رہنا پڑا۔ اور جب تین مہینے کے بعد وہ گھر واپس آئیں تو انھوں نے کان پکڑے کہ اب کبھی وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر نہ چلیں گی۔

تفریحات

اس ماہ کے سوالات حسب ذیل ہیں :-

(۱) آئرلینڈ کا ایک شخص کسب معاش کے لئے امریکہ گیا وہاں اسے ہالینڈ کا ایک شخص مل گیا جو خود روزی کی فکر میں تھا۔ ان دونوں نے مل کر ایک قطعہ زمین لیا اور اسے کھودنا شروع کیا۔ اتفاق سے انھیں ایک صندوق زمین میں مدفون ملا جس میں کچھ ڈالر اور کچھ سکے تانبہ کے تھے۔ ہالینڈی نے کہا کہ میں اس کا مالک ہوں، کیونکہ سب سے پہلے میں نے اس کو دیکھا، آئرلینڈ والے نے کہا کہ میں اس صندوق کا مالک ہوں۔ اور میرے چچا نے مجھے دیا تھا۔ اس کے اندر ایک ہزار ڈالر تھے۔ لیکن میں نے اس کا بڑا حصہ صرف کرکے باقی کو مدفون کر دیا تھا۔ لیکن بعد کو میں وہ جگہ بھول گیا تھا۔

ہالینڈی نے کہا اگر یہ صحیح ہے تو تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے کتنا چھوڑا تھا۔ اور اگر تم بتا دو تو بیشک تم اس کے مالک ہو۔ آئرلینڈ والے نے جو ایک نگاہ ڈال کر معلوم کر چکا تھا کہ ۵۰ ڈالر سے زیادہ کی رقم نہ ہوگی کہا کہ ہاں میں بتا سکتا ہوں قلم کاغذ لو اور جو میں بتاتا ہوں اس کو لکھتے جاؤ۔ اس نے قلم کاغذ لے لیا۔ اس نے کہا :-

"جس وقت میرا چچا مرا تو اس نے ایک ہزار ڈالر چھوڑے۔ اس میں سے ۷۴۹ ڈالر اور ۲۵ سنٹ میں نے اپنی ماں کو بھیجے۔ اس لئے جو رقم اس وقت صندوق میں باقی رہ گئی ہے اس میں یہ رقم اضافہ کرو۔ اور جو نتیجہ نکلے اسے ایک ہزار ڈالر سے گھٹاؤ اور جو باقی رہے اسے ۳۷۵ ڈالر ۲۵ سنٹ سے منہا کر دو کیونکہ میں نے اتنی رقم خرچ کی تھی پھر جو باقی بچیگا۔ وہ وہی رقم ہوگی جو صندوق میں ہے"

—— ہالینڈی نے اس پر عمل کیا تو بالکل صحیح پایا —— کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آئرلینڈ والے نے جو کچھ کہا وہ واقعہ تھا۔ یا صرف حساب کا دہوکا تھا۔ اگر حساب کا دھوکا تھا تو کیا تھا؟ ۱۰۰ سنٹ کا ایک ڈالر ہوتا ہے

---

(۲) ایک کتا اس فکر میں ہے کہ گیارہ ہڈیوں کو زمین میں دفن کرے۔ لیکن ڈرتا ہے کہ کہیں ان کی جگہ نہ بھول جائے۔ اس لئے وہ زمین پر ایسے سیدھے خط کھینچنا چاہتا ہے۔ کہ ہر ہڈی اپنی جگہ چاروں طرف خطوط سے گھر جائے اور اسے ڈھونڈھنے میں دقت نہ ہو۔

اس نے پہلے چاروں طرف چار خط تو کھینچ لئے ہیں۔ اب بتاؤ کہ باقی خطوط کم سے کم کتنے اور کس طرح کھینچے جا سکتے ہیں۔ کہ ہر ہڈی دوسرے سے بذریعہ خطوط علیحدہ ہو جائے اور ہر طرف سے محصور۔



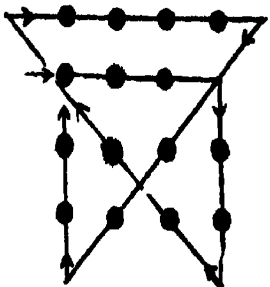
پہلو کے نقشے کی نقل کر کے آپ خطوط کے تعین کر سکتے ہیں۔

(نوٹ) سوال اول کا صحیح جواب دینے والے جذبات بھاشا کی ایک جلد پائیں گے، سوال دوم کا صحیح جواب دینے والے فراست الید کی دونوں سوالوں کا صحیح جواب دینے والے دونوں کتابوں کے مستحق ہونگے لیکن جواب کے ساتھ چار آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں، کیونکہ آیندہ کتابیں بیرنگ نہ روانہ ہوں گی۔

۲۵ مئی تک جو جواب موصول ہونگے وہی قابل غور ہوں گے۔

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے جواب ذیل میں درج ہیں:۔

(۱)

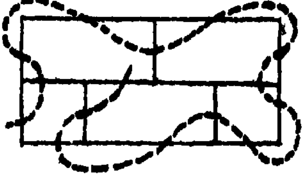


اس کا جواب دینے والوں نے یہ غور نہیں کیا کہ چلنے والا اپنے مکان سے چلیگا اور وہیں واپس آئیگا۔

(۲) سوال نمبر ۲ میں ہندسوں کی ترتیب اس طرح بھی ہو سکتی ہے:۔

۷۸	۳۴	۵۶	۱۲
۵۶	۱۲	۷۸	۳۴
۳۴	۷۸	۱۲	۵۶
۱۲	۵۶	۳۴	۷۸

(۳) سوال نمبر ۳ میں حسب ذیل طریقہ پر بھی خط کھینچا جا سکتا ہے۔



البتہ قفس سے خوگر ہونے کے بعد چین آجاتا ہے۔ مگر ایسا چین جس کے پردے میں ہزاروں اضطراب انگڑائیاں لیتے ہیں۔ دوسرا مصرع یوں پڑھئے۔ اور شعر کی بلاغت پر غور کیجئے۔ چین قفس میں آگیا اب غم بال و پر کہاں

(مولف) شاعر کا مقصد صرف یہ ہے یہ اب میں خوگر قفس ہو گیا حتے کہ نیند آنے لگی۔ اب کہاں تک بال و پر کا غم رہتا۔ افسوس وہ زمانہ بھی گذر گیا کہ بال و پر نہ تھے۔ مگر غم بال و پر موجود تھا۔ اب وہ بھی نہیں۔ اگر دوسرے مصرع کو یوں پڑھیں کہ چین قفس الخ تب بھی کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ شاید اس طرح زیادہ موزوں ہو ؎

ہائے وہ دن گزر گئے جوشش اضطراب کے ہو گئے خوگر قفس اب غم بال و پر کہاں

اصغر ؎ صرف اک سوز تو مجھ میں ہے مگر ساز نہیں میں فقط درد ہوں جس میں کوئی آواز نہیں

اثر۔ کسی درد میں بالذات آواز نہیں ہوتی۔ تخصیص بے کار ہے۔ فقط درد سے معلوم ہوتا ہے کہ درد کی کوئی قسم ہے۔ دوسرا مصرع عجز نظم کی ایک افسوسناک مثال ہے کاش یوں ہوتا ؎

میں وہ نغمہ ہوں کہ جس میں کوئی آواز نہیں

(مولف) بندش یقیناً بہت ڈھیلی اور نہایت معمولی ہے خیال بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ مگر اعتراض بھی قریب قریب ویسا ہی ہے۔ فقط درد سے مصنف کوئی تخصیص نہیں کرتا بلکہ وہ حصر و انحصار کے لئے فقط کا لفظ لایا ہے۔ یعنی میں صرف درد ہوں جس میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ معترض صاحب کا اعتراض ہے کہ " معلوم ہوتا ہے درد کی کوئی قسم ہے "۔ میرے نزدیک مصنف کا خیال یہ ہے کہ میں صرف درد ہوں مجھ میں کوئی آواز نہیں۔ اس پر فاضل معترض نے اصلاح بھی دی ہے کہ ؎

میں وہ نغمہ ہوں کہ جس میں کوئی آواز نہیں

مگر معنی میں اشکال پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ نغمہ تو خود ایک آواز کا نام ہے۔ نغمہ میں آواز نہ ہونا یعنی چہ۔ اگر شعر کو بدلنا ہی مقصود ہے تو یوں بدلا جائے ؎

سوز ہی سوز ہے اب مجھ میں کوئی ساز نہیں اور جو ہے ساز تو اُس ساز میں آواز نہیں

اصغر ؎ میری محرومی کے اندر سے یہ دی اُسنے صدا قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

اعتراض۔ محرومی کا اندر باہر کیسا۔ یہ مطلب پردہ سے ادا ہو سکتا تھا

(مولف) اعتراض بہت صحیح ہے۔ اور اصلاح سے شعر میں چار چاند لگ گئے۔

ڈاکٹر[۱] اقبال و حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی

اقبال ؎ آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے   گلشن ویمر میں ترا ہمنوا خوابیدہ ہے

خواجہ صاحب۔ دلّی میں آرامیدہ ہے۔ اور ہم نوا خوابیدہ ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس کو کون سی زبان سمجھیں۔ اُردو یا فارسی

(مولف) حکیم صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اُردو نام ہے تمام زبانوں کے مجموعہ کا۔ اوس میں فارسی بھی شامل ہے۔ عربی بھی، سنسکرت بھی، انگریزی بھی، ترکی بھی، جرمنی بھی، پھر جب یہ صورت ہے تو کیونکر یہ حق باقی رہتا ہے کہ فرمایا جائے کہ ہم حیران ہیں کہ اس کو اُردو زبان کہا جائے یا فارسی۔ کیا آرامیدہ اور ہمنوا خوابیدہ سے شعر فارسی ہو گیا۔ تو داغ کے اس شعر کو کیا کہا جائے ؎

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں   میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں

ہمارے نزدیک تو یہ اُردو کا نہایت فصیح شعر ہے۔ اگر یہ شعر اُردو سے خارج ہونے کے قابل ہے تو اقبال کا شعر بھی اسی قابل ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص کی اُردو ہر حال میں اردو ہے اور ایک کے یہاں فارسی کا ایک لفظ بھی آئے یا ایک ترکیب بھی مستعمل ہو تو اسکو اُردو سے خارج کر دیا جائے۔ میر انیس۔ ناسخ۔ آتش جو لکھنؤ کے مایۂ ناز شعراء میں سے ہیں۔ سب کے سب اس طرح کے الفاظ لائے ہیں مگر وہ سب کے سب اہل زبان ہیں اور ان کی شاعری مسلم ان کی زبان سند اقبال غریب چونکہ لاہور کے رہنے والے ہیں اس واسطے اُن کی زبان مردود و مطرود ہے کیا خوب ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد   صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

میں نہیں جانتا کہ اقبال کے ان الفاظ میں سے کون سا لفظ نامانوس ہے۔ خوابیدہ۔ آرامیدہ۔ ہمنوا۔ گلشن۔ یہ سب

---

[۱] آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں امرتسر دولت خانہ ہے۔ مگر عرصہ سے لاہور میں قیام ہے۔ اور وہیں بیرسٹری کرتے ہیں۔ اس وقت تقریباً بیتالیس چھیالیس سال کی عمر ہوگی۔ آپ کی بہت سی کتابیں جن میں جواب شکوہ۔ بانگ درا وغیرہ بھی شامل ہیں طبع ہو چکی ہیں اور خاص مقبولیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

حکیم خواجہ شمس الدین صاحب لکھنؤ کے ایک قابل طبیب ہیں۔ اُردو سے آپ کو ہمدردی اور دلچسپی ہے۔ شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔

لکھنؤ کا ہر فرد زبان اُردو کا دعوے دار اور موروث اصلی بننے کا آرزومند رہتا ہے۔ اسی بنا پر حکیم صاحب بھی اہل زبان ہونے کے متمنی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے ڈاکٹر اقبال کی اُردو پر اعتراضات کئے ہیں۔

علیحدہ علیحدہ ہمارے یہاں کے شعراء نے استعمال کئے ہیں پھر آخر کون سا گناہ ہے۔ کہ اس شعر پر حکیم صاحب کو فارسی کا گمان ہوتا ہے

اقبال ؎ نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری　خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

خواجہ صاحب۔ اس میں فارسی مصدر شنیدن کو مصدر کی حیثیت سے لائے ہیں۔ حالانکہ کسی زبان کے مصادر کا دوسری زبان میں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ مرزا غالب نے بھی یہ بے احتیاطی کی ہے ع

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

(مولف) یہ مسئلہ آج حکیم صاحب سے معلوم ہوا کہ کسی زبان کے مصدر کا دوسری زبان میں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ خیر یہ تو علم ہو ہی گیا۔ مگر کاش حکیم صاحب یہ بھی تحریر فرما دیتے کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔ یا کون سی کتاب میں لکھا ہے۔

غالب نے اگر غلطی سے ایک جگہ یہ بے عنوانی کی تھی کہ مصدر کو بجنسہ لکھ گئے تھے۔ تو متعدد جگہ اس غلطی کا ارتکاب کیوں کیا۔ چنانچہ دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

اسی طرح حکیم مومن خاں کے یہاں بھی کئی جگہ مصدر کا استعمال ہوا ہے

اقبال ؎ تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار　لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

خواجہ صاحب۔ تا فارسی میں بولتے ہیں۔ اردو میں تاکہ ہونا چاہئے

(مولف) کاش کہ یہ فرمایا ہوتا کہ زیادہ ترفصیح یہ ہے کہ تا۔ کے بعد۔ کہ۔ کا بھی استعمال کیا جائے۔ ورنہ وہ غیر فصیح شمار کیا جائے گا۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا ہوا اور نہ آئندہ ایسا ہونا چاہئے۔ شاید حکیم صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے۔ کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر مرزا اسد اللہ غالب نے بھی آپ کے مقرر کردہ قانون کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے اور اس قانون شکنی کے سب سے پہلے مجرم وہی ہیں۔ لہٰذا یہ تمام الابلا۔ بھی غالب ہی کے سر ہے ملاحظہ فرمائے۔

؎ تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا　سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

مشکل یہ ہے کہ اس شعر کو فارسی کا شعر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہاں اتنی گنجائش ہے کہ غالب پر سہو کا الزام لگا دیا جائے۔ کہ شاید بھول کر یا غلطی سے ایسا کہہ دیا ہو۔ اچھا اگر یہاں غلطی سے ایسا کہا ہے تو اس کا کیا علاج ہے ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

اقبال ؎ جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر اُن کو تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

خواجہ صاحب۔ اُردو میں "تپش آمادہ تر از خون زلیخا" بے جوڑ سی ترکیب معلوم ہوتی ہے۔

(مولف) اول تو یہ فرمانا کہ اُردو میں بے جوڑ سی ترکیب معلوم ہوتی ہے۔ عجیب بات ہے۔ اس واسطے کہ لکھنے والے نے یہ ترکیب لکھ کر ہرگز یہ دعوےٰ نہیں کیا ہے کہ یہ ترکیب اب اُردو ہو گئی۔ دوسرے حکیم صاحب نے تجزیہ کرکے یہ بھی نہیں بتایا کہ اگر بے جوڑ ہے تو بے جوڑ ہونے کا سبب کیا ہے۔ یوں تو ہر اچھے سے اچھے شعر کو کہا جا سکتا ہے کہ غلط ہے۔ مہمل ہے۔ مگر جب تک کوئی سبب نہ بتایا جائے صرف یہ فرما دینا مقبول نہیں ہے۔ دیکھئے غالب کے دو شعر ؎

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

بعض الفاظ پر خط کھینچ دیے گئے ہیں۔ ان کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور دیکھئے کہ یہ گناہ بھی غالباً پہلے غالب ہی سے ہوا ہے۔

اقبال ؎ پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں

خواجہ صاحب۔ کسی کو پیار کرنا بولتے ہیں۔ کسی سے پیار کرنا محاورہ نہیں ہے۔ البتہ پیار اور اخلاص ساتھ کہیں تو بولیں گے۔ مثلاً۔ آج کل اُن سے انکا رپیار اور اخلاص بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر جہاں خالی پیار کا لفظ ہے تجھے ہونا چاہئے۔

(مولف) حکیم صاحب شاعر کے منشا کو نہیں سمجھے۔ پیار انھوں نے محبت کے معنی میں لیا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے شمع پروانہ تجھ سے محبت کیوں کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ فرمائیں کہ پیار بمعنی محبت غلط ہے۔ مگر ڈاکٹر اقبال کا مقصد یہاں یہی ہے۔ اور اس لحاظ سے صحیح ہے۔ اگر یوں کہا جاتا کہ ع

پروانہ تجھ کو کرتا ہے اے شمع پیار کیوں

تو کو اور کر کے اجتماع سے تنافر پیدا ہو جاتا۔ لہٰذا شاعر نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرکے شعر کو تنافر سے بچا لیا

اقبال ؎ وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اُسے میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانہ کے لئے

خواجہ صاحب۔ تاڑا کی جگہ تاکا ہونا چاہئے۔ تاڑنا بوجھنے کو کہتے ہیں۔

(مولف) تاڑنا۔ قریب قریب تاکنے کے مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے۔ بھانپنے کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحب فرہنگ آصفیہ تاڑنے اور تاڑ جانے کے اتنے معنے لکھے ہیں۔

تاڑنا۔ تاڑ جانا۔ بھانپنا۔ جان لینا۔ سمجھ جانا۔ دوسرے کی مدد کے بغیر صحیح قیاس لگانا۔ پالینا۔ قیافہ سے جاننا۔ علامات سے پہچاننا۔ (گنوار) نکالنا۔ دھتکارنا۔ ہنکانا۔ جیسے اوسے گھر سے تاڑ دیا۔ (پورب) اڑنا۔ دوسرے کے بٹ جانچنا۔ (ہندو) مارنا پیٹنا۔ جسمانی سزا دینا۔ تنبیہ کرنا۔ ڈانٹنا۔ دھمکانا۔

یہاں اقبال کی مراد ہے دیکھنے اور انتخاب کرنے سے۔ یا یوں سمجھئے کہ کہتے ہیں میں نے جس شاخ کو تاڑا۔ اور دیکھا کہ میں اسپر آشیانہ بناؤں گا۔ اسی کو آسمان نے توڑ دیا۔

اقبال ؎ گیند ہے تیری کہاں چینی کی بلی ہے کدھر

خواجہ صاحب۔ گیند مذکر ہے

(مونف) حکیم صاحب نے اپنی معلومات کو صرف لکھنؤ تک محدود رکھا ہے۔ حالانکہ لاہور دہلی سے زیادہ قریب ہے۔ اور اقبال وہیں کے روزمرہ اور وہیں کی اردو سے زیادہ متاثر ہیں۔ دہلی میں گیند کو مونث بولتے ہیں۔

اقبال ؎ گودی میں کھیلتی ہیں اوس کے ہزاروں ندیاں

خواجہ صاحب۔ گودی متروک ہے۔ گود مستعمل ہے۔ اور ندیاں بھی غلط ہے۔ مشدّد ہونا چاہئے۔

(مولف) سخت تعجب ہے کہ حکیم صاحب کس بنا پر ایسے قطعی احکام صادر فرما دیتے ہیں کہ فلاں لفظ متروک ہے۔ اور فلاں کے بجائے فلاں مستعمل ہے۔ حالانکہ متروک ہونا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے کسی کو مستثنیٰ نہ کیا جا سکے اور جس کے بعد کہنے والے کے شعر کو لغو اور مہمل قرار دیدیا جائے۔ متروک کے متعلق تو یہ ہے کہ کوئی لفظ کسی کو ثقیل یا بُرا معلوم ہوا اس نے چھوڑ دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا اتباع کیا۔ انھوں نے بھی واجب الترک قرار دے لیا۔ اور بعض نے اوس کو اسی طرح فصیح سمجھا۔ اور برابر استعمال کرتے رہے۔ تو وہ لوگ جو اس لفظ کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس بات کے مجاز کیونکر ہو سکتے ہیں کہ دوسروں پر اس وجہ سے اعتراض کریں کہ انھوں نے اس لفظ کو ترک نہیں کیا ہے یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ البتہ ایسے الفاظ جن پر بالاجماع اہل قلم کے دستخط ہو گئے ہوں۔ یا وہ ملک کے اس سرے تک کہیں لکھا ہی نہ جاتا ہو۔ چنانچہ گود۔ اور گودی۔ یہ دونوں لفظ اس وقت تک ملک کے ہر گوشہ میں رائج ہیں اور بے تکلف بولے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے اون میں سے ایک کو اپنے لئے متروک کر لیا ہے تو وہ دوسروں سے نہیں کہہ سکتا کہ تم بھی چھوڑ دو۔ چنانچہ یہی لفظ مولوی محمد اسماعیل صاحب شاگرد مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب نے استعمال کیا ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کچھ پرانے شاعروں میں نہیں ہیں۔ بلکہ حال ہی میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں ؎ یہی سورج زمیں تھے ماں باوا مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا

ع — آندھی آتی تھی جھونکے آتے تھے — گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے

اقبال ع — اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ میں ہوتا ہے گزر روز تمہارا

خواجہ صاحب۔ مکڑا۔ غلط ہے۔ زعنکبوت کو کڑی کہتے ہیں

(مولف) فصیح کڑی ہی ہے۔ مگر اکثر جگہ تحقیر کے ساتھ مکڑا بھی بولتے ہیں۔ اور غالباً دلّی میں دونوں طرح کہتے ہیں

اقبال ع — لیکن مری کُٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے یہاں تم نے کبھی پاؤں نہ رکھا

خواجہ صاحب۔ ہم لوگ کٹیا سے ناآشنا ہیں۔ پنجاب والے کوٹھری کو بولتے ہیں

(مولف) کٹیا، کوٹھری کو نہیں کہتے۔ بلکہ کٹی کا بگڑا ہوا ہے۔ کٹی فقیروں کی جھونپڑی کو کہتے ہیں۔

حکیم صاحب نے کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن وہ بیکار بحث ہیں لہذا چھوڑتا ہوں

امیدؔ[1] و معترضین

اُمید ع — نظارگی حسنت ہر شعلہ نمی باشد — ایں برق تجلائے موسائے دگر دارد

خواجہ عزیزالدین مرحوم۔ برق تجلائے میں ی غلط ہے

جواب امید۔ میرے شعر میں جو برق تجلائے کی ی کو خواجہ عزیز صاحب ناجائز فرماتے ہیں اور آپ مجھ سے توجیہ

---

[1] ابوالکمال سید محمد علی اُمید امیٹھوی۔ آپ امیٹھی ضلع سلطانپور کے رہنے والے ہیں۔ اور ابتدائے عمر میں وہیں زیادہ تر قیام رہا ہے آپ نے فارسی کی ابتدائی کتب اپنے وطن میں پڑھیں اس کے بعد بہ سلسلۂ ملازمت آپ لکھنؤ میں تشریف لے آئے۔ اور یہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور یہیں آپ کی شادی بھی ہوئی۔ یہیں آپ نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی تکمیل کی اور کچھ عربی کی کتب بھی پڑھیں۔ آپ کی شاعری بھی یہیں شروع ہوئی اور یہیں عروج ہوا۔ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوئے اور بڑے بڑے شعرا سے معرکے اور مجادلے رہے۔ اودھ پنچ کی آخر عمر میں آپ اس کے نامہ نگار بھی رہے۔ آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور دونوں زبانوں میں ایک محقق کی شان رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک آپ اُن شعرا میں سے ہیں جو شاعر سے زیادہ سخن فہمی کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ اول درجہ کے نقاد اور ظریف ہیں۔ بہت مخلص انسان ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اب آپ کا سن تقریباً پچاس پچپن برس کا ہے پھر بھی آپ کو تمام درسیات ستحضر ہیں آپ کے معترضین کا تذکرہ بھی یہاں نہایت ضروری ہے۔ جن میں ایک تو خواجہ عزیزالدین صاحب تھے جو لکھنؤ کے ایک باکمال

وتاویل چاہتے ہیں۔ تو واضح ہو کہ پہلے خواجہ صاحب سے آپ کو استفاضۃً عدم جواز کی دلیل پوچھنا چاہیئے پھر مجھ سے۔ اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب فارسی کے مسلم الثبوت استاد ہوتے ہوئے میرے اور آپ کے بھی اوستاد ہیں۔ اور مجھ سے اور آپ سے زیادہ فارسی جانتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ غزل اون کی نظر سے نہیں گذری۔ مگر میرے نزدیک اس تے کو ناجائز کہنا غلطی ہے۔ کیونکہ موسیٰ کے ساتھ جب دگر کی قید لگی ہے تو برق تجلائے میں اظہار عظمت کے لئے تی کا الحاق کیا قباحت رکھتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس کو برق تجلی لکھا تھا۔ لیکن موزوں برق تجلائے ہی کیا تھا۔ اور یہی آپ کو خط لکھتے وقت قلم سے نکل گیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ برق تجلائے صحیح ہے۔ اگر استادی خواجہ صاحب کے پاس کوئی دلیل ہو تو تسلیم کر لینے میں چارہ نہ ہوگا۔ مجھے سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر یاد آگیا۔ بوستاں میں آپ نے بھی پڑھا ہوگا ؎

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ سخن گفت با عابدے کلۂ

بھلا حضرت سے پوچھئے کہ یہ دجلۂ میں تے کیسی ہے۔ ایک صاحب دجلۂ اور کلۂ کا قافیہ مکروہ قرار دے کر حلّہ فرماتے ہیں لیکن معنی اور ترجمہ حاشیہ پر یہی لکھے ہیں۔ کہ بغداد کے مشہور دریا یا نہر کا نام ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر دجلہ اور برق تجلائے کی تی میں کیا فرق ہوگا۔ ع

جز دلے مرہون داغ فرقت وگرد ملال۔ دلے کی تی تحقیری ہے۔ اور میرے ذوق اور مولانا رعب کے خاص

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۴) فارسی داں تھے۔ بارہ چودہ برس ہوئے کہ انتقال کیا۔

دوسرے علی حسین صاحب تھے جو لکھنؤ کے ایک قدیم وضع کے بزرگ اور نہایت پابند وضع انسان تھے۔ فارسی کے ایسے خوش فہم اور ایسے محقق میری نظر سے نہیں گزرے۔ تمام درسی کتابیں سال بھر میں ایک مرتبہ دہرا لیتے تھے۔ باوجود کبرسنی جوانی کی تمام شوخیاں موجود تھیں اور اس قدر زبردست ظریف تھے۔ کہ آج جواب نہیں ملتا۔ فارسی کی تمام درسیات برزبان اور مستحضر تھیں پھر بھی بغیر کتاب دیکھے کبھی جواب نہ دیتے تھے۔ ہر دوست کے سچے ہمدرد تھے۔ کتابوں کے اتنے بڑے قدردان تھے کہ کبھی کسی مخلص سے مخلص دوست کو بھی ہوا نہ دیتے تھے۔ اور تمام سال اون کی نگہداشت اور حفاظت میں گزر جاتا تھا۔ ہر اتوار کو نخاس جاتے اور کتاب کی تلاش میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں پھرتے رہتے۔ شاعر تھے مگر صرف قصیدہ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ میرے دوست تھے کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ پانچ چھ برس ہوئے کہ انتقال کیا۔

حکیم برہم صاحب۔ اخبار مشرق گورکھپور کے اڈیٹر تھے۔ اور اسقدر پابند وضع ملنسار بزرگ تھے کہ شاید زمانہ اب ایسے لوگ پھر نہ پیدا کرے۔ جسکے ساتھ جو وضع مقرر کی تھی وہ آخر تک قائم رہی قریب ڈیڑھ برس کے گزرا کہ انتقال کیا۔

صفدر۔ آپ مرزاپور کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں لکھنؤ میں سکونت اور بود و باش اختیار کر لی تھی۔ نہایت بھولے سادہ مزاج نیکدل اور میرے خاص دوستوں میں تھے۔ قریب یکسال کے ہوا کہ انتقال کیا خدا مغفرت کرے۔ ان سب حضرات کے امید صاحب سے معاصرانہ معارضے ہوئے۔ جن میں بعض بذریعہ خط وکتابت طے ہوئے

انداز کے موافق ہے۔ یہ مصرع مولانا رعب کا ہے۔ سنئے جب صفت میں خاص قسم کی ترکیب پائی جائے۔ تو موصوف میں ی کا لانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ "حکیمے سخن بر زباں آفریں" گو مطابع کے جدت پسند مصححوں نے بغیر حق کے بھی لکھ کر داد صحت دی ہے

دوسرا مصرع اور انھیں کا بوستاں میں ملاحظہ فرمائیے ع " قدیمے نکو کار نیکی پسند " مرزا غالب کی مثنوی کا شعر ہے ؎

سپاسے دوئی سوز کثرت ربائے　　سپاسے دل افروز بینش فزائے

دوسرے مصرع میں ی کی تخفیف وہی مصحح کی قواعد داں طبیعت کا خاصہ ہے۔ ورنہ یہاں بھی سپاسے ہے۔ یہ اشعار کلیات غالب میں دیکھئے باقی اس بحث پر گفتگو ملاقات پر اٹھا رکھئے۔

(مولف) خواجہ عزیز صاحب کا اعتراض اس حیثیت سے بالکل صحیح ہے کہ (ی) برق تجلائے میں کوئی معنی نہیں دیتی۔ اور امید صاحب جو یائے تعظیمی و احترامی قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے اور اس حیثیت سے یہ جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر مستحسن یہ ہے کہ اس کو زاید قرار دیا جائے جیسا کہ امید صاحب نے سعدی کے بعض اشعار میں پیش کی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ " ایں برق تجلائے ہست کہ موسائے دگر میدارد " بہر صورت اس کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ اس نظائر کثرت سے کلام اساتذہ میں موجود ہیں۔

اسی قسم کا ایک اعتراض ابوالبرکات ملا منیر لاہوری نے عرفی کے اس شعر پر کیا تھا ؎

بعہد جلوۂ حسن کلام من اندوخت　　قبول شاہد نظم کمال نقصانے

مفرحے کہ من از بہر روح ساز دہم　　نہ انوری دہد و نے فلان و بہمانے

منیر کا اعتراض تھا کہ قصیدہ کے بہت شعروں کے آخر میں (ی) زائد اور بے معنی ہے۔ مگر یہ اعتراض صحیح نہیں چنانچہ افضل الدین خاقانی کے اس شعر میں ؎

بھر ناسازی دور ساز و دل برنا خوشی خوش کن　　کہ آیت زیر کاہ است و کمالت عین نقصانے

یائے زائد درمیان کلمہ میں بھی آتی ہے۔ اور مختلف جگہوں میں

رہا امید صاحب کا یہ جواب کہ ؎

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ　　سخن گفت با عابدے کلۂ

قابل تسلیم نہیں۔ اس لئے کہ دجلہ عموماً نہر ندی کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس کو یائے تنکیر مانا جائے گا۔ اور اس صورت میں صحیح ہوگا

امید ؎ ماشمع شبستانِ خلوت چو ہمائیم افسانۂ ما لیک بہر انجمنے ہست

حکیم برہم مرحوم۔ مولانا آپ کے شعر کا ترجمہ کیا اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے۔ کہ اگرچہ میں مثل ہما کے خلوت نشین ہوں۔ لیکن میرا افسانہ ہر مجلس میں ہے۔ اگر یہ ترجمہ درست ہے تو شمع شبستانی کا ٹکڑا بیکار ہے۔ اور شمع کا افسانہ ہر انجمن میں کیونکر ہو سکتا ہے۔ دوسرے ما۔ کی ضمیر دو جگہ نظم ہوئی ہے۔ حالانکہ ضمیر واحد متکلم پھر بھی باقی ہے۔ شعر میں اگر بجائے ما کے گو ہوتا۔ تو اچھا تھا۔ اگرچہ مطلب پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ شتر گربہ بھی ہے ما کے ساتھ ہمائیم کیسا۔

جواب امید صاحب۔ یا مظہر العجائب۔ حکیم صاحب۔ ترجمہ۔ اور شعر کے معنی مطلب دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ بھلا اب کس کو جرأت ہو سکتی ہے کہ اس کے خلاف معنی مطلب بیان کرے۔ اصلاح کا شکریہ قبول فرمائیے۔ ضمیر واحد متکلم کی داد کون دے سکتا ہے ؎ وائے بر جان کسے کو شاعری دارد شعار

تاہم گزارش ہے کہ ترجمہ مہمل۔ اصلاح بیہودہ۔ معنی مطلب غتر بود۔ ضمیر واحد متکلم محض غلط۔ شتر گربہ بالکل افترا اور بہتان۔

سنئے ترجمہ۔ ہم (اگرچہ) (مقدر) مثل ہما کے شمع شبستان خلوت ہیں۔ لیکن ہمارا افسانہ ہر انجمن میں ہے۔ میرے خیال میں اس ترجمہ کے بعد معنی اور مطلب بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

گو بعض حروف شرط خلاف کلام اساتذۂ فارس ہے۔ یہ لالہ بھائیوں کی فارسی ہوگی۔ خدا مجھے اس بلا سے مامون رکھے۔ ضمیر کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب دو جگہ (ما) کی ضمیر جمع متکلم موجود ہے۔ تو ہمائیم کو ہمایم آپ کیوں پڑھتے ہیں۔ اور شتر گربہ کی تہمت کیوں تراشتے ہیں۔ عینک لگا کر میرے عریضہ پر ایک نظر ڈالئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے کس عالم میں میرے شعر پر غور فرمایا ہے۔ استادی مولانا رعب مرحوم کا ایک شعر بعینہ اس مضمون کا ملاحظہ فرمائیے۔ رہی یہ بات کہ کون شعر کس کا ترجمہ ہے یا کون کس سے مشتق ہے خدا بہتر جانتا ہے

؎ اگرچہ مثل عنقا شمع بزم گوشہ گیری ہوں مگر سن لیجئے قصہ سر ہر انجمن میرا

(مولف) میرے نزدیک حکیم صاحب نے بالکل غلط معنی بیان کئے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ خلوت گویا ایک شبستاں ہے جس میں ہم شمع کی طرح موجود ہیں۔ مگر ہمارا ذکر ہر جگہ موجود ہے۔ امید صاحب کا جواب بالکل صاف اور صحیح ہے۔

امیر[1] و ناطق

امیر ؎ چھ گئی گورخ جو بالی کی بگڑ کر بولے ہاتھ ٹوٹیں ترے مشاطہ مرے کان گئے

---

[1] حضرت منشی امیر احمد مینائی مرحوم بہت مشہور ہستی تھے۔ ان مفصل سوانح تمام تذکروں میں موجود ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں مختلف

ناطق - پہلا عیب تو اس میں یہ ہے کہ جہاں شعر میں معشوق کا بیان اس طرح آجائے، کہ جس سے صاف تانیث نکلتی ہو۔ جس طرح بالی اور مشاطہ کے بیان سے یہاں نکل آئی، تو صیغہ ایسا استعمال کرنا چاہئے جس میں تذکیر اور تانیث دونوں سے اجتناب ہو۔ کیونکہ تانیث معشوق کے لئے اردو اشعار میں لائی نہیں جاتی اور تذکیر کا بیان برا معلوم ہوگا۔ نثر میں یہ عبارت یوں ہوگی۔ کہ اُن کی بالی کی گونج بوقت آرایش الجھ گئی تو یوں بولیں۔ اس عیب کو دور کرنے کے لئے یہ مصرع یوں ہونا چاہئے ع گونج بالی کی جو الجھی تو یہ جھنجھلا کے کہا۔

ہم ثاقب کی طرح یہ نہیں کہتے کہ کان ٹوٹنے کے محل استعمال میں کان گئے نہیں بولتے۔ جس طرح کان پھوٹنے کے محل استعمال میں کان گئے بولتے ہیں۔ اسی طرح کان ٹوٹنے کے محل استعمال میں بھی بولتے ہیں۔ لیکن ہمیں جو اس شعر پر دوسرا اعتراض ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہم ثاقب سے یہ پوچھتے ہیں کہ چھ گئی گونج جو بالی کی کے ساتھ کان گیا بولیں گے یا کان گئے اس محاورہ کا درست استعمال امیر ہی کے انداز میں یوں ہوگا ؎

بال بالوں میں جو الجھے تو یہ جھنجھلا کے کہا ہاتھ ٹوٹیں ترے مشاطہ مرے کان گئے

(مولف) کم از کم اس بات کا میں قایل نہیں ہوں کہ زیور کا ذکر سنکر کسی شعر کو معشوق کی تانیث کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس لئے کہ دواوین اساتذہ لکھنؤ میں بیشتر اور دواوین اساتذہ دہلی میں کمتر شعر اس قسم کے پائے جاتے ہیں۔ مگر مولانا کا دوسرا اعتراض ایسا ہے کہ اوسکا کوئی جواب نہیں۔ اس لئے کہ شاعر ایک بالی کا ذکر کرتا ہے۔ اور ایک بالی کے الجھنے سے کہنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ مرا کان گیا۔

امیر کی اصلاحوں پر اعتراضات

ریاض ؎ ہنگام نزع گریہ یہاں بیکسی کا تھا آپ ہی بتائیں کون یہ موقع ہنسی کا تھا

اصلاح " " تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

اعتراض ناطق - تخیل یہ تھا کہ عاشق حالت نزع میں ہے۔ چاروں طرف کوئی نظر نہیں آتا۔ اس لئے اپنی اس بیکسی کو دیکھ کر رونا آگیا۔ اتفاق سے معشوق آنکلا اور طنزاً کہا کہ مصیبت سے گھبرا کر روتے ہو مرد کا تو یہ کام ہے۔ کہ ہر حالت میں خندہ پیشانی رہے۔ یہ اس کے جواب میں شعر پڑھتے ہیں۔ بالکل درست شعر تھا۔ مگر استاد نے تم ہنس پڑے لکھ کر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۷) شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دیں جن کو ثاقب نے شہاب ثاقب کے نام سے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ اوسی رسالہ میں داغ دہلوی پر بھی کچھ اعتراضات کئے ہیں۔ اس پر جناب مولانا سید ابو الحسن صاحب ناطق گلاوٹھوی نے ایک تبصرہ کر کے ان اصلاحات اور بعض اشعار پر تعریض کی ہے۔ مولانا ناطق زباندانی میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اردو فارسی عربی انگریزی کے ایک متبحر عالم ہیں۔ ہر رنگ اور ہر صنعت شعر میں آپکا کلام موجود ہو۔ نظموں میں خصوصیت سے آپ کو وہ دستگاہ حاصل ہے کہ اسوقت ہندوستان میں کم لوگ ایسے ہونگے جو آپکا مقابلہ کر سکیں۔

شعر کو بگاڑ دیا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معشوق وہیں موجود تھا۔ ایسی حالت میں گریہ بیکسی کیسا۔ اس شعر میں اگر ضرورت اصلاح تھی تو پہلے مصرع میں۔ کیونکہ "گریہ یہاں" کی ترکیب روانی کے منافی ہے۔ اسے درست کرتے اور دوسرے مصرع میں "کون یہ کو" یہ نکال دیتے۔ مگر منشی صاحب نے اس طرف خیال نہیں کیا۔ یہاں یوں اصلاح ہوتی ہے

گریہ بوقت نزع یہاں بیکسی کا تھا　　تم ہی کہو یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

(مولف) مولانا نے ریاض کے اس شعر پر دو اعتراض کئے ہیں (گریہ یہاں) اور مصرع ثانی میں (کون یہ) یہ دونوں اعتراض درست ہیں۔ لیکن اصلاح میں اگر بوقت کی ب نکل جاتی تو شعر چاروں جولوں سے درست ہو جاتا فرض کیجئے

رونا ہم اخیر یہاں بےکسی کا تھا　　تم کیوں ہنسے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

مولانا کا اعتراض ہے کہ تم ہنس پڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ معشوق وہاں موجود تھا۔ اس لئے بےکسی کے جھگڑے ہی کو دور کر دیا گیا

ریاض
لے اڑے گیسو پریشانی مری　　آئینے لے بیٹھے حیرانی مری

اصلاح۔
لے اڑے گیسو پریشانی مری　　آئینے لے بھاگے حیرانی مری

اعتراض ناطق۔ لے اڑے، لے بیٹھے۔ لے بھاگے۔ تینوں محاوروں کا ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ریاض نے لے اڑے کے ساتھ لے بیٹھے لکھا تھا۔ لیکن استاد نے لے بھاگے بنا دیا۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ شاگرد نے درست محاورہ استعمال کیا تھا یا استاد نے درست اصلاح دی۔ گیسو کے لئے اڑنا درست تھا۔ کیونکہ گیسو کی صفت اڑنا بھی ہے۔ لیکن دوسرے مصرع میں جو منشی صاحب نے لے بھاگے بنا دیا تو اس میں تقابل ہو گیا کہ ایک اڑ رہا ہے اور ایک بھاگ رہا ہے۔ لیکن بھاگنا آئینہ کی صفت سے بعید ہے۔ اس لئے جب لے بیٹھنا بھی اسی ضلع کا لفظ تھا تو استاد کے لئے مناسب نہیں تھا۔ کہ شاگرد نے جو آئینہ کی صفت کا درست استعمال کیا تھا اس کو بگاڑ دیتے

شاہزادہ ولی الدین فدا
تو پچھتاؤ گے ویران کرکے خانۂ دل کو　　یہ وہ کعبہ نہیں جو گر کے ہو تعمیر کے قابل

اصلاح امیر
تو پچھتاؤ گے ڈھا کر ہمارے خانۂ دل کو　　"　　"

ویران کرنے سے بھی ڈھانے ہی کا مفہوم نکلتا ہے کیونکہ شاگرد نے دوسرے مصرع میں گر کے لکھ کر اسے صاف کر دیا تھا۔ اس شعر میں خانۂ دل کی تعمیم تھی۔ جو لفظ تو کے مقابلہ میں استعمال ہو کر یا تو بیان عام ہو گیا تھا۔ یا اطلاق واحد علی الواحد۔ اور ہر طرح درست تھا۔ شاگرد نے پہلے مصرع میں خانہ لکھا تھا۔ وہ خود بخود ہی خانہ کعبہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے بجز اس کے کہ گر کے رہے ہو محل استعمال میں گر کے ہو لکھا تھا شعر میں زبان اور بیان کا کوئی عیب نہیں تھا۔ استاد نے جو اصل عیب تھا اوس کی طرف تو کوئی خیال نہیں کیا۔ اصلاح جو دی تو اس طرح کہ ڈھا کر ہمارے کعبہ دل کو

بنادیا۔ جس سے تعمیم دل کی تخصیص ہوگئی۔ اب سارے بتوں کا شکوہ ایک انھیں کے دل پر ٹوٹ پڑا جو شاگرد کے مقصد تخیل کے منافی ہے۔ لفظ کعبہ کی بے ضرورت تکرار ہوگئی ظاہر ہے کہ اس طرح شعر کو بنایا نہیں بلکہ بگاڑ دیا۔ اس شعر میں تخیل بھی جو کچھ ہے وہ درست نہیں کیونکہ بتوں کو جن کی پہلی صفت یا نسبت کافری کی ہے۔ ان کو خانہ کعبہ کو ڈھا کر پچھتانے سے کیا واسطہ۔ اور اس کی تعمیر کرنے کی پھر کیا ضرورت۔

زاہد سہارنپوری ؎ گیا جو وقت اسے سمجھو گیا پھر کر نہیں آتا — نہ پاؤ گے نہ پاؤ گے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈو

اصلاح امیر ؎ گیا جو وقت وہ پھر کر نہیں آتا نہیں آتا — نہ پاؤ گے نہ پاؤ گے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈو

اعتراض ناطق۔ نہیں آتا کے بجائے مناسب طرز بیاں یہ تھا کہ جو وقت چلا جاتا ہے وہ پھر کر نہیں آتا۔ یہاں یوں اصلاح ہوتی۔

؎ گیا جو وقت وہ کیا پھر کے آتا ہے، نہیں آتا — نہ پاؤ گے کہیں جاؤ کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈو

(مولف) دوسرا مصرع جس انداز سے بنایا گیا ہے وہ استادی کی ایک شان اپنے دامن میں لئے ہے۔ البتہ پہلا مصرع جو بطور سوال جواب کے ہے وہ ایک ذرا روانی سے دور ہے۔ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا ؎

گیا جو وقت وہ پھر کر نہ آیا ہے نہ آئے گا — نہ پایا ہے نہ پاؤ گے کہیں جاؤ کہیں ڈھونڈو

زاہد ؎ بدن میں آگ بھڑک جائے جس سے وہ شے لا — دوآتشہ کوئی کھنچوا کے ساقیا مے لا

اصلاح امیر ؎ بدن میں آگ بھڑک جائے جس سے وہ شے لا — دوآتشہ کوئی سرجوش ساقیا مے لا

منشی صاحب نے یہ اصلاح دے کر وجہ اصلاح میں زاہد صاحب کو لکھا تھا کہ ترکیب ذرا تیز ہو گئی۔

اعتراض ناطق۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح ترکیب کیونکر تیز ہو گئی۔ دوآتشہ کے ساتھ لفظ سرجوش آ کر حشو ہو گیا کیونکہ دوآتشہ کا استعمال سرجوش ہی کے لئے ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس اصلاح سے اصل شعر بہتر تھا فی الحقیقت اس شعر میں ایک دوسرا عیب تھا۔ جس کی طرف منشی صاحب کا خیال طبعاً متبادر نہ ہو سکا۔ حضرت جلال لکھنوی جو منشی صاحب کے ہمعصر اور لکھنؤ کے مایہ ناز استاد تھے۔ اور جن کی فطری زبان بھی اردو ہی تھی لفظ بدن کو بغیر فارسی ترکیب کے استعمال کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کی تحقیق کے مطابق یہ زنانہ استعمال کا لفظ ہے۔ جسے عورتیں ایک خاص عضو کے معنی میں بولتی ہیں۔ اس شعر کو درست کرنے کی ضرورت تھی ؎

جگر میں آگ بھڑک جائے جس سے وہ شے لا
دوآتشہ مرے ساقی مرے لئے مے لا

ندا ہم ؎ مست دو دہوشش سے امید ہدایت ہے عبث رہتا کب ہو صدائے جرس جام شراب

صلاح امیر ؎ کیا خرابات نشینوں سے ہدایت کی اُمید " "

عتراض ناطق ۔ اصلاح شعر نفس شعر سے یقیناً بہتر ہے۔ اور وجہ اصلاح بھی درست لیکن جام شراب کے لئے صدائے جرس کا استعمال شعر میں کوئی صورت ندا پیدا کرنے کے بغیر کیونکر درست ہو سکتا ہے

(مولف) اوّل تو جرس سے جام شراب کی تشبیہ ہی مہمل ہے۔ دوسرے اوس میں صدا پیدا کر دینا اور قیامت ہے۔ یہ ایک عیب ہے کہ ایشیائی شاعری میں مشبہ بہ کے تمام لوازم کا بھی ساتھ ہی ساتھ ذکر کر دیتے ہیں۔

حکیم برہم ؎ درباں سے پوچھتا ہے یہ دشمن کہ سچ بتا کل تک یہاں پڑا تھا وہ بیمار کیا ہوا

اصلاح امیر ؎ درباں سے پوچھتا ہے یہ عیسیٰ نفس بتا کل تک یہاں پڑا تھا جو بیمار کیا ہوا

اعتراض ناطق ۔ بیمار کی توضیح کی بھی ضرورت تھی اور درباں کی بھی۔ بتا نہ صرف یہ کہ بے ضرورت ہے بلکہ بغیر لفظ اکرہ کے بھدا بھی ہے۔ اور روانی کے بھی منافی۔ یہاں یوں اصلاح کی ضرورت تھی ؎

درباں سے اپنے پوچھ رہی ہے مری اجل کل تک یہاں پڑا تھا جو بیمار کیا ہوا

(مولف) امیر کی اصلاح میں جیسا بے ضرورت اور بھونڈا لفظ عیسےٰ نفس ہے اور کوئی نہیں۔ اسیر معترض صاحب نے اتنی ہی توجہی کہ اپنے شعر میں صاف کر دیا۔ اگرچہ ان کے یہاں بھی خیال بدل گیا۔ پھر بھی شعر بہتر ہو گیا۔

برہم ؎ پھولوں میں غیر کے تو نہیں وہ چلا گیا باسی گلے کا ہار ترے یار کیا ہوا

اصلاح امیر ؎ پھولوں میں غیر کے تو نہیں مل گیا کہیں اُترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا

اعتراض ناطق ۔ پھولوں سے مراد غالباً لکھنوی اصطلاح کے مطابق تیجہ یا سوم ہے جسے کھینچ تان کر اس طرح اس معنی میں لیا جاتا ہے۔ کہ فاتحہ خوانی کے بعد متوفی کی قبر پر پھولوں کی ایک چادر چڑھانے کی رسم بھی پیدا کر لی گئی ہے۔ اب اگر یہاں وہی چادر مراد لیں۔ تو نہ استاد کا طرز بیان درست ہے نہ شاگرد کا۔ اور اگر نفس سوئم میں مل جانا سمجھا جائے تو یہ بھی ایک نئی اور غیر مانوس بات ہوگی۔ اس سے تو چلا جانا ہی بہتر تھا۔ البتہ دوسرے مصرع کو جو بنایا ہے وہ درست ہے۔ لیکن جب مصرع اول ہی کچھ نہیں تو اس سے کیا فائدہ۔ سچ پوچھئے تو تیجے کے لئے پھولوں کا استعمال ہنود کی اصطلاح ہے۔ کیونکہ مُردے کی جلی بھوئی ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ اور چونکہ مُردے کو جلا دینے کے بعد تیسرے روز اس کی راکھ کو دریا برد کرتے اور ہڈیوں کو تیرتھ میں پہونچانے کے لئے سمیٹا جاتا ہے۔ اس لئے تیجے کے دن کو پھولوں کا دن کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ نے بھی اسی اصطلاح کو لیا ہے۔ اور ہندوانی پھولوں کی عدم موجودگی کی مجبوری کو گلہائے باغ

کی آور داور جادر سے دور کردیا۔ اس لئے اگر غور سے دیکھئے تو اوّل تو یہ اصطلاح ہی لغو ہے۔ اور تیجہ کے معنی میں پھولوں کا استعمال غلط۔ البتہ غیر کا مذہب ہندو سمجھ لیا جائے تو پھر اصطلاح درست ہوجائے گی۔ یہاں درست اصلاح یوں ہوتی ہے ؎

کسکا نصیب بنکے گل آرزو کھلا ۔۔۔ اترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا

(مولف) پھولوں سے مراد درد ستوم ہی ہوتا ہے۔ خواہ یہ رسم اہل ہنود سے سیکھی ہو یا عرب سے آئی ہو۔ مگر یہاں جس صورت سے حکیم برہم صاحب نے استعمال کیا تھا وہ زیادہ صحیح تھا۔ امیر مرحوم کی اصلاح کچھ دلپذیر نہیں ہے۔

عابد سہسوانی ؎ ۔۔۔ دل کیا دیا ہے پہلو سے نقد وفا دیا ۔۔۔ ہم خود بگڑ گئے مگر ان کو بنا دیا

اصلاح امیر ؎ ۔۔۔ دل کیا دیا خزانۂ نقد وفا دیا ۔۔۔ " " "

اعتراض ناطق۔ ہم خود بگڑ گئے مگر اُن کو بنا دیا۔ اگر لکھنؤ کی بازاری زبان سے قطع نظر کر لی جائے تو ایک اچھا محاورہ ہے۔ مگر اس کا محل استعمال یہ نہیں۔ کیونکہ خزانۂ نقد وفا دے کر خود بگڑ جانے کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ ہم بیوفا ہوگئے۔ یا یوں کہو کہ جنس وفا سے معرّیٰ ہوگئے۔ یہاں اس طرح لکھنے کی ضرورت تھی ؎

دل دیدیا خزانۂ نقد وفا دیا ۔۔۔ کیا پوچھتے ہو اب کہ تمھیں ہمنے کیا دیا

یا پھر اس طرح ؎ ۔۔۔ مقدور سے بھی راہ وفا میں سوا دیا ۔۔۔ ہم خود بگڑ گئے مگر اون کو بنا دیا

(مولف) ناطق صاحب کے اعتراض بالکل درست ہیں۔ اور اس شعر کی اصلاح نمبر ۲ بے بدل ہے

میر انیس[1] و نسّاخ

انیس ؎ ۔۔۔ حق نما ہے تو جہاں میں ہر یہی آئینہ ۔۔۔ اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

اعتراض۔ یہ قوافی جائز نہیں ہیں۔ قرینہ کو دانا، بینا کا قافیہ سمجھنا غلطی ہے۔

جواب۔ یہ قدما کا طریقہ تھا۔ اور میر انیسؔ کا ابتدائی کلام قدماء کے استعمال کے موافق ہے

مولانا شبلی۔ اس جواب پر اسقدر اور اضافہ کرنا چاہیئے کہ گو متاخرین نے اس کو ترک کردیا۔ لیکن کلام کی وسعت

---

[1] میر انیس لکھنؤ کے اون مشاہیر میں سے ہیں جنکے کمال مرثیہ گوئی کی وجہ سے کم وبیش ہندوستان کا ہر ذوق رکھنے والا شخص ان کو بنظر عزت واحترام دیکھتا ہے۔ گو وہ صرف مرثیہ ہی کے قادر الکلام استاد مانے گئے ہیں پھر بھی مرثیہ نگاری میں اونکی ہمہ گیر طبیعت نے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ پورا میدان سخن ان کے قبضہ میں آگیا ہے۔ غلطی رہ جانا خواص بشری میں سے ہے۔ اون سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور معترض نے اعتراضات

کے لئے یہ سختیاں اٹھا دینی چاہئیں۔ شاعری سے وصل و ہجر کے سوا اور بھی کام لیتے ہیں۔ اور وہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ قافیہ میں وسعت پیدا کی جائے۔ ورنہ شاید یورپ کی طرح سرے سے قافیہ ہی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

(مولف) یہ عذر کہ متقدمین ایسا کرتے تھے لہذا انھوں نے بھی ایسا کیا قابل قبول نہیں۔ اس لئے کہ گو متقدمین کے یہاں اس قسم کے قوافی پائے جاتے ہیں مگر حقیقتاً اس سے جواز ثابت نہیں ہوتا ممکن ہے کہ جن کو مثال میں پیش کیا جائے اون سے بھی غلطی ہوئی ہو۔

انیس ؎ عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ دو جہاں ۔ تم جا کے اس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں

اعتراض نساخ ۔ مصرعہ ثانی میں اعلان نون کی سخت ضرورت ہے

جواب ۔ متقدمین کے یہاں ایسا ہوا ہے۔

(مولف) پہلے مصرعہ میں اگر جہاں کے نون کو ظاہر کیا تو اس میں اعلان نون بعد عطف و اضافت کا اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ جو ناجائز ہے۔

انیس ؎ لپٹوں گلے سے میں پدر ناتوان کے ۔ سینے سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

اعتراض ۔ پدرِ ناتوان کا نون بعد اضافت کے ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ جائز نہیں۔

جواب ۔ یہ شعر میر انیس کا الحاقی ہے۔

جواب مولانا شبلی ۔ میر صاحب کے یہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یا تو میر صاحب کی غلطی تسلیم کرنی چاہئے۔ یا یہ کہنا چاہئے کہ یہ بھی میر صاحب کی توسیعات شعری میں داخل ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۲) گئے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبد الغفور صاحب نساخ نے میر انیس اور مرزا دبیر کے بہت سے اغلاط لکھ کر ایک ر . لہ کی صورت میں ترتیب دئے تھے بعد کو شاگردان ناسخ میں سے کسی نے تطہیر الاوساخ کے نام سے اوس کے جواب میں رسالہ لکھوا کر شعلۂ طور کانپور کے مطبع میں چھپوایا تھا مگر زمانہ کے استداد نے نساخ کو بھی ناپید کر دیا اور تطہیر الاوساخ کے بھی ورق اڑا دئے۔ شبلی مرحوم نے موازنہ میں ادن اعتراضوں میں سے چند نقل کر دئے ہیں۔ میر انیس کی مختلف سوانح عمریاں چھپ چکی ہیں۔ یہاں اون کے حالات کو بسط کے ساتھ لکھنا موزوں نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس مولوی عبد الغفور نساخ مرحوم بھی کچھ میرے تعارف کرانے کے محتاج نہیں اون کے تذکرے، اون کی تصانیف بہت کافی ہیں۔ وہ کلکتہ کے ایک رئیس اور اودھی طرف ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قابلیت ان کی اعتراضات سے معلوم کیجئے

مؤلف۔ اگرچہ بانکل ادن بھی ایطائے خفی کی مثالیں مل جائیں گی مگر حقیقتاً جائز نہیں۔

انیس ؎ گویا کہ تھا شبیہ الم سر بسر نشاں ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پرنور او رنشاں

اعتراض۔ اس شعر میں سر بسر قافیہ اور کا ہے جو بالکل غلط ہے۔

جواب۔ مصرعِ ثانی اصل میں یوں ہے ع ڈوبا تھا خوں میں پنجہ پر نور در فشاں

انیس ؎ ناگاہ بڑھی فوج ہوا جنگ کا ساماں اور گھٹنے لگی طاقت جسمِ شہِ مرداں

شہزادے پہ جب پڑنے لگا تیر کا باراں تلوار اسلم گر کے کہا یا شہِ مرداں

اعتراض۔ یہ قافیہ شایگاں ہے۔ کیوں کہ شہ مرداں مکرر آیا ہے۔

مجیب۔ یہ شعر بھی غلط چھپا ہے۔ دوسرے مصرع میں شہ مرداں کے بجائے شہ ذیشاں تھا۔

مولانا شبلی۔ اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔ اور اگر اس کو وسعت دی جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو نہایت آسانی سے دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ یوں نہیں یوں تھا۔ اس شعر میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے کیونکہ شہ مرداں سے ایک جگہ امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں۔ لیکن جہاں قافیہ واقعی شائگاں ہے وہاں بھی تاویل کی ضرورت نہیں۔ جو اساتذہ کثیر الکلام ہیں اور جنکو سیکڑوں قسم کے مضامین ادا کرنے پڑتے ہیں وہ اس قسم کی قیدوں کی پابندی نہیں کرتے۔

(مؤلف) مولانا شبلی کا یہ فرمانا کہ اعتراض غلط ہے۔ صحیح نہیں کیونکہ شہ مرداں کے مفہوم کو کسی طرف پھیر لیا جائے۔ مگر شہ مرداں کے جو معنی ہیں وہی رہیں گے۔ اور عدم شایگاں کی شرط ایک لفظ ہونے میں یہ ہے کہ لفظ کے معنی قطعاً بدل جائیں مثلاً رباعی شاہ ابو سعید ابو الخیر۔

؎ از ہجر تو ای نگار اندر نارم ہر سوزم ازیں درد دوی برنارم

تا دست بگردن تو اندر نارم آغشتہ بخوں چو دانۂ اندر نارم

مصرع اولےٰ میں نار بمعنی آگ۔ دوسرے میں نیارم کا مخفف۔ چوتھے میں انار کے معنے ہیں۔ تیسرے مصرعہ کا قافیہ اتفاقی ہے قافیہ نہ سمجھئے۔

انیس ؎ رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر

〃 〃 یہ کہہ کے بس عورات سے عریان گئے سر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

جلد ۲۱ فہرست مضامین جون سنہ ۳۲ء شمار ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۱	جون ۳۲ء	شمارہ ۶

ملاحظات

عبدالماجد دریابادی بے نقاب

یہ عنوان ہے اس پمفلٹ کا جسے مولوی عبدالرحمان نگرامی مرحوم کی بیوہ اور عبدالماجد دریابادی کی مطلقہ خاتون نے شایع کیا ہے اور جو اس ماہ کی اشاعت میں تمام و کمال کسی جگہ نقل کر دیا گیا ہے۔

اس کے مطالعہ کے بعد قدرتاً دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عبدالماجد نے نکاح کیوں کیا اور دوسرے یہ کہ طلاق کیوں دی۔۔۔ سوال اول کا جواب، جو خود ان کی تحریر سے مستنبط ہو سکتا ہے یہ ہے کہ نکاح اُنھوں نے محض اس دوستی کی بنار پر کیا تھا جو عبدالرحمن مرحوم سے ان کو تھی، لیکن طلاق کا کوئی صحیح سبب متعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو تحریر عبدالماجد نے خاتون کے اعزہ کے نام روانہ کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص راز ہے جس کو وہ انھیں کی دل شکنی کے خیال سے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور جو تحریر اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کے نام بھیجی ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی والدہ کے حکم سے مجبور ہو کر طلاق دی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ

طلاق کوئی ایسی بُری چیز نہیں کیونکہ خود رسول اللہ نے بھی بار ہا طلاق دی ہے۔

اس لئے اب تحقیق طلب امر ایک تو یہ ہے کہ واقعی یہ نکاح بر بنائے ہمدردی کیا گیا تھا یا نہیں، دوسرے یہ کہ طلاق دینے کے جو مختلف و متضاد اسباب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط اور تیسرے یہ کہ اپنے اس مکروہ فعل کو جائز قرار دینے کے لئے جو تہمت عبدالماجد نے رسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر رکھی ہے اس کی کیا حقیقت ہے۔

امرِ اول :

خاتون نے جو تفصیلی داستان نکاح و طلاق کی بیان کی ہے اور جو واقعات انھوں نے تحریر کئے ہیں اُن کے دیکھنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا کہ عبدالماجد کا اپنے آپ کو نکاح کے لئے پیش کرنا واقعی بر بنائے ہمدردی تھا، اور اگر ہمدردی اسی کا نام ہے تو شاید ہی اس سے بہتر لفظ، شقاوت و بیرحمی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی اور مل سکے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ

——— چونکہ عبدالماجد واقف تھے کہ وہ ایک ایسی عورت سے نکاح کر رہے ہیں جو اُن کی پختگی عمر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جوان ہے، وہ اس کو بھی جانتے تھے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے مشکل ہی سے خاتون کے اعزہ نکاح پر راضی ہو سکیں گے، اسی کے ساتھ چونکہ اُن کی سخاوت اپنے دوست کی بیوہ کے ساتھ اظہار ہمدردی میں ایک دن روپیہ سے زیادہ صرف کرنے کی بھی اجازت نہ دے سکتی تھی، اس لئے انھوں نے سمجھا کہ وہ ان تمام دشواریوں کے دور کرنے میں اگر کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف "روحانیات و اخلاقیات" کے نمائش سے۔ ورنہ یوں تو ظاہر ہے کہ ان میں کوئی خصوصیت ایسی نہ تھی کہ کوئی جوان العمر عورت اپنی زندگی کو اُن کے جذبۂ "تیر افشانی" پر قربان کر دیتی —— چنانچہ انھوں نے "نفسیات" کے ترکش کا وہ تیر جو بہت کم خالی جاتا ہے استوار کیا اور زرگرامی مرحوم کے ایک "سچے وفادار دوست" ہونے کی حیثیت سے اس شریف خاتون کے دل پر چلا ہی دیا، جس کا اخلاق اس مظاہرہ سے متاثر ہو جانا بالکل ناگزیر تھا ——

پھر غریب خاتون صرف اس لئے متاثر نہیں ہوئیں کہ عبدالماجد نے غیر معمولی صداقت و خلوص کا اظہار کیا تھا بلکہ اُن کے تاثر کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ واقعی عبدالماجد کو ان کی شکل و شمائل، "قطع و برید، تحریر و تقریر سے بڑا" پہنچا ہوا" آدمی سمجھتی تھیں اور کبھی ایک لمحہ کے لئے ان کے دل میں یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ کھادی کا اتنا لمبا کرتہ پہننے والا، کھدر کی گاندھی ٹوپی کو پورے قلندرانہ انداز سے سر پر منڈھ لینے والا، فرط انکسار سے چلنے میں ہر وقت شکستہ چپل سے خاک بسر رہنے والا، بیشمار نمازیں پڑھنے والا، رمضان میں اپنے پیر کے پاس جا کر اعتکاف کرنے والا، رسول کے عشق میں ہر وقت آہیں بھرنے والا، اخلاق و انسانیت کے لئے مغرب و اہل مغرب کو ہمیشہ کوستے رہنے والا، بات بات میں قال اللہ و قال الرسول کی صدا اپنے خشک روزہ دار حلق سے نکالنے والا۔ کبھی کوئی حرکت ایسی کر سکتا ہے جو اسلامی عہد و پیمان، مذہبی صداقت و خلوص اور انسانی حمیت و غیرت کے خلاف ہو —— لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ!

لیکن ایک ماہ سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ چہرہ کا ملمع اترنے لگا، اخلاق کی جھوٹی تلعی سیاہی دینے لگی نمائش زہد و ورع کے صحیح خط وخال نمودار ہونے لگے، اور عبدالماجد کا بطون جسے انھوں نے خدا جانے کن کن ترکیبوں سے اس وقت تک چھپا رکھا تھا، اُن کی تلخ تحریروں سے، ان کی جھڑکیوں سے اور ان کی خشونتوں سے آخر کار خاتون پر کھلے بغیر نہ رہا ــــ اللہ اللہ، وہی شخص جو شادی سے قبل خاتون کے لئے یکسر لجاجت وانکسار تھا، سراپا فدویت وعجز تھا، شادی کے صرف ایک ماہ بعد خاتون کی محبت بھری تحریروں کا جواب اس انداز میں دیتا ہے کہ "اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ہے ۔ ہفتے میں ایک بار سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، تمھارے خطوط کوئی تار تو ہوتے نہیں کہ فوراً جواب دیا جائے"!

حقیقت یہ ہے کہ تھیٹر میں کسی معمولی سے معمولی ایکٹر کے چہرہ کا غازہ بھی اتنی جلدی نہیں اُترتا اور ایک بازاری بہروپیا بھی اپنے مصنوعی خط وخال کو اس قدر جلد دھو دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء!

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ انقلاب ایسا سریع انقلاب کیوں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ عزیزوں نے مخالفت کی ہو اور ــــ وہ مخالفت ناقابل برداشت ہوگئی ہو۔ ممکن ہے کہ عبدالماجد کی والدہ نے بھی زجر و توبیخ سے کام لیا ہو۔ لیکن یہ مخالفت وہی تھی جو نکاح سے قبل بھی پائی جاتی تھی اور والدہ کی برہمی بھی وہی تھی جس کی پروا نہ کرتے ہوئے پہلے شادی رچائی گئی تھی۔ پھر اب شادی کے بعد اس مخالفت کا اثر کیوں قبول کیا گیا۔ اس برہمی کا رعب کیوں چھا گیا۔ کیا عبدالماجد کسی روایت، کسی اثر کسی قول اور کسی فقہی فتاوی کی کتاب سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ بیوی کو طلاق دینے کے لئے اعزہ کی مخالفت کافی وجہ ہوسکتی ہے ــــ اور پھر اسے بھی جانے دیجئے آیئے تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ عبدالماجد نے طلاق محض مجبور ہوکر بادل ناخواستہ دی اور وہ خاتون سے بدستور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس صورت میں وہ اپنی ان تحریروں کی کیا تاویل کریں گے جن میں وہ غریب خاتون کو جھڑکتے تھے اور انکی محبت کا جواب اپنی بیزاریوں سے دیا کرتے تھے۔ کیا ان کی پرائیوٹ تحریروں پر بھی اُن کے اعزہ نے سنسر بٹھا دیا تھا اور کیا وہ پوشیدگی وعلیحدگی میں بھی خاتون کے ساتھ محبت وہمدردی کا سلوک نہ کرسکتے تھے ــــ حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ جوش محبت جس کی بناء پر شادی کی گئی تھی نہ خلوص وایثار سے متعلق تھا نہ پاس وفا و دستداری سے بلکہ وابستہ تھا اسی کیفیت سے جسے خود خاتون نے "نفس پرستی" سے تعبیر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ عبدالماجد کی عمر کا انسان اس جوش کو زیادہ سے زیادہ اُسے ایک ہی ماہ تک قائم رکھ سکتا تھا۔

ــــ جب تک ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تھی، نہ اعزہ کی مخالفت حائل ہوئی تھی نہ والدہ کی برہمی، لیکن جب جذبات سرد ہوگئے، مقصود نفس حاصل ہوگیا، اور چڑھی ہوئی اُتر گئی تو آنکھ کھلی، لیکن چونکہ اب کوئی،

" ناآسودہ تمنا " جوش کو قائم رکھنے والی موجود نہ تھی، اس لئے علیحدگی کے بہانے ڈھونڈھنے لگے، بات بات میں جھڑکنے لگے، یہاں تک کہ خاتون کو پہلے تو ترکیب سے سہارن پور بھیجدیا اور پھر اس کے بعد تحریری طلاقنامہ ——

اگر عبدالماجد نے واقعی یہ سب کچھ حالات خانگی سے مجبور ہو کر کیا تھا اگر وہ حقیقتاً ان شدائد و مصائب کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو شادی کے سلسلہ میں رونما ہوئے۔ اور اگر ان کا خاتون کو علیحدہ کرنا فی الاصل اُن کی دلی خواہش کے خلاف تھا تو وہ بغیر طلاق دئے ہوئے بھی ان گتھیوں کو سلجھا سکتے تھے اور اگر طلاق بھی دی تھی تو اس کے بعد اپنی تحریروں سے، اپنی ہمدردیوں سے بہت کچھ تلافی خاتون کی دل شکنی کی کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ خاتون کی محبت بھری تحریروں کا جواب ایسے ظالمانہ و غدارانہ لب و لہجہ میں دینا اور اکیاون روپیہ بھر کی ذلیل رقم ادا کرنے سے قبل یہ مطالبہ کرنا کہ پہلے رسید بھیجدو —— گویا وہ ایک ماہ تک لطف مواصلت حاصل کرنے کا معاوضہ کیاون روپیہ کو بھی زیادہ سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی بہانہ ملے تو وہ بھی نہ ادا کروں؛ دنیا اس رند بادہ خوار کو بُرا کہتی ہے جو شراب پیتا ہے اور کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ مگر ان پیران کمر پیشہ کی طرف سے بیخبر ہے جو شراب تو نہیں پیتے لیکن انسانوں کا خون جن کے منھ لگا ہوا ہے۔ ہم اس تارک صوم و صلوۃ کو بُرا بھلا کہتے ہیں، جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر تنہائی میں کبھی آنسو بھی بہا لیتا ہے، مگر ان زاہدان شب زندہ دار کے حال سے غافل ہیں جو نماز پڑھتے ہوتے ہیں۔ درانحالیکہ اُن کی بڑی بڑی آستینوں میں نفس پرستی و خود غرضی کے سیکڑوں بت چھپے ہوتے ہیں

عبدالماجد نے ۸، اور ۱۵، اپریل کے سچ میں مسئلہ طلاق پر جو گفتگو کی ہے اس کو اپنے پندار میں وہ ایسی مسکت اس درجہ مدلل اور اتنا زبردست نتیجہ تحقیق سمجھتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کے بعد گویا کسی کو یہ جراءت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ عبدالماجد کے اس فعل کو بُرا قرار دے۔ لیکن یہ بھی خدا کی شان ہے کہ ایک مجرم جس چیز کو اپنی صفائی میں پیش کرتا ہے وہ خود اس کے جرم کا ثبوت بنجاتی ہے اور جو ہاتھ لکڑی کاٹنے کے لئے اُٹھتا ہے، وہ خود اُس کے پاؤں کو مجروح کر دیتا ہے۔

اگر سورۂ نساء میں واقعی خدا نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:-

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا	ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے رہو، اگر وہ تمھیں ناپسند بھی ہوں کیا عجب ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کر رہے ہو اور اللہ اسی میں بہت سی بھلائی رکھدے۔

اور اگر اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے احکام القرآن (ابن عربی) اور احکام القرآن للجصاص میں وہ عبارتیں پائی جاتی ہیں جنکا مفہوم یہ ہے کہ " بیوی کے ساتھ باوجود ناپسندیدگی کے بھی نباہ کرتے رہنا چاہیے "، تو ہمیں حیرت ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کا بڑا زبردست متبع سمجھتا ہے کیونکر طلاق دینے میں اس قدر جری ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ ناپسندیدگی

کی حالت میں بھی بیوی کو طلاق دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

اگر حضرت ابوموسیٰ وغیری کی روایت سے واقعی یہ حدیث پائی جاتی ہے کہ:۔

تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات

(یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دیتے رہو کیونکہ خدا لذت چکھنے والوں اور لذت چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔)

تو کیا عبدالماجد اپنے آپ کو اس "لذت چش" جماعت سے علیحدہ کر سکتے ہیں، جبکہ کوئی معقول وجہ خاتون کو علیحدہ کرنے کے ان کے پاس نہ تھی۔

اچھا اب آئیے "طلاق اور مابعد الطلاق" کے حالات پر غور کریں اور دیکھیں کہ عبدالماجد نے اس باب میں کس حد تک احکام خداوندی کی تعمیل کی ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا

(اور اگر تم لوگوں کو میاں بیوی کے درمیان رنجش کا اندیشہ ہے تو ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور دوسرا حکم بیوی کے خاندان سے مقرر کرو)

کیا جس وقت عبدالماجد کو اپنی بیوی کی طرف سے بیزاری پیدا ہوئی تھی، یعنی جس وقت اول اول ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو جلد جلد خط لکھنے پر ڈانٹ بتائیں، تو کیا انھوں نے باہمی مصالحت کے لئے آیت متذکرۂ بالا کی ہدایت کے موافق اپنے خاندان اور بیوی کے خاندان سے کوئی حکم مقرر کر کے شقاق کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

سورۂ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن[1] واحصوا العدۃ واتقوا اللہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ

(جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے زمانہ تک انھیں چھوڑ رکھو اور عدت کا شمار رکھو خدا سے ڈرو اور ان کو ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، سوا اس صورت کے کہ وہ کوئی بات کھلی ہوئی بیحیائی کی کر بیٹھیں)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم

(یعنی ان کو اپنی حیثیت کے مطابق رہنے کا مکان دو اور نفقہ بھی ادا کرو کیونکہ فقہا نے "من وجدکم" میں نفقہ کو بھی شامل کیا ہے)

لیکن کیا عبدالماجد نے طلاق کے بعد ایام عدت بسر کرنے کے لئے خاتون کو اپنے گھر میں بلا کر رکھا اور اگر وہ وقت طلاق عبدالماجد کے گھر میں نہ تھیں تو کیا مطلقہ کا نفقہ انھوں نے ادا کیا۔ عبدالماجد نے اس سخت شرعی الزام کے دور کرنے کے لئے اپنے پیر کو تو سمجھا دیا تھا کہ "مصارف روانہ کئے جاتے ہیں"، لیکن غریب کو کیا خبر تھی کہ کسی وقت اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل

[1] "فطلقوھن لعدتھن" کا ترجمہ عبدالماجد نے کیا ہے "تو ان کی عدت سے پہلے طلاق دو" یہ ہے آپ کا مبلغ علم اور یہ ہے آپ کی عربی دانی۔

جائیگی۔ اور خود خاتون اس امر کا اعلان کریں گی کہ عبد الماجد کا اپنے پیر کو یہ خبر دینا بالکل جھوٹ ہے اور انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی نفقہ کی صورت سے ادا نہیں کیا۔

اب آپ خاتون کے پمفلٹ کو ایک بار پڑھکر تمام جزئیات پر نگاہ ڈال جائیے اور ملاحظات میں یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اسپر غور فرمائیے۔ کیا دنیا کا کوئی شخص جس میں کچھ بھی عقل موجود ہے یہ کہہ سکتا ہے کہ عبد الماجد نے محض لذت نفس کے لئے شادی نہیں کی تھی اور کیا یہ طلاق اسی قسم کی طلاق نہتھی جو "ذواقین" کی طرف اسے دکہاتی ہے

اب اس سلسلہ میں دو باتیں بحث کے قابل اور رہجاتی ہیں ایک تو یہ کہ جب خاتون نے علماء دیوبند سے خط و کتابت کی تو انھوں نے کیا جواب دیا اور دوسرے خود رسول اللہ کے طلاق دینے کے واقعات جنھیں عبد الماجد نے اپنے خطوط میں اور سچ کے صفحات میں بیان کیا ہے۔

مولوی اشرف علی نے تو خیر اپنی مصلحت کوش فطرت کی بنا پر خاتون کی تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن مولوی حسین احمد صاحب کی اس تحریر سے جو عبد الماجد کے پیر بھی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں مجبور کرے تو بیوی کو طلاق دیدینا ضروری ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عبد الماجد کو بھی ان کی والدہ نے مجبور کیا تھا یا نہیں کیونکہ واقعات و حالات سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ عبد الماجد کی غرض تو نکاح و طلاق سے کچھ اور ہی تھی جس سے ان کی والدہ کی خوشی یا برہمی کو کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اصولاً یہ مسئلہ ضرور غور طلب ہے کہ ماں کے کہنے سے کسی شخص کے لئے کوئی نازیبا حرکت کرنا زیبا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ہر چند اس کا جواب ہر شخص کا ضمیر خود دے سکتا ہے اور عقل انسانی آپ فیصلہ کر سکتی ہے کہ معصیت و ترک معصیت کا یہ فلسفہ کس حد تک قابل قبول ہے۔ تاہم ایک سرسری نگاہ اسپر بھی ڈالنا ضروری ہے اسی کے ساتھ عبد الماجد نے رسول اللہ کے واقعات طلاق پر جو خامہ فرسائی کی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔

عبد الماجد نے خاتون کو ایک تحریر میں لکھا تھا کہ:—

> "رسول اللہ صلعم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہ کی طلاق واپس لی ہے، باقی دو بیویاں ایسی ہوئی ہیں جن میں طلاق دیکر واپس نہیں لی ہے، شرعاً یہ کوئی ایسی بُری بات نہیں"

سچ میں عبد الماجد صاحب مسئلہ طلاق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:—

> "حضور کا حضرت حفصہ کو طلاق دینا اور پھر اسے واپس لینا مشہور و معلوم واقعہ ہے ——— ام المومنین حفصہؓ کی طلاق تو آپ نے واپس بھی لے لی لیکن اُن کے علاوہ حضور نے کم از کم دو بیویوں کو بھی طلاق دی جو قائم رہی اور واپس نہیں لیگئی ایک کا نام عمرہ بنت یزید کلابیہ اور دوسری کا اسما بنت نعمان کندیہ تھا"

اس بیان سے عبد الماجد کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ:—

(۱) رسول اللہ نے جناب سودہ کو طلاق دی اور واپس لی۔ (۲) رسول اللہ نے جناب حفصہ کو طلاق دی اور واپس لی۔

۴۔ رسول اللہ نے عمرہ بنت یزید اور اسماء بنت نعمان کو طلاق دی اور واپس نہیں لی۔

سچ میں اُنھوں نے جناب سودہ کی طلاق کا ذکر کہیں نہیں کیا بلکہ صرف اپنے خط میں جو خاتون کے نام بھیجا گیا تھا ذکر کیا ہے۔ بہرحال اب گفتگو حسب ذیل مسائل پر کرنا ہے:۔

۱۔ اسلام کی رو سے ایک شخص کا اپنی بیوی کو طلاق دیدینا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلعم نے امہات المومنین و ازواج مطہرات میں کسی کو طلاق دی یا نہیں۔ اور اگر دی تو کن حالات کے ماتحت اور اُسکو اب کوئی شخص استشہاد پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔

ان مسائل پر تفصیل کے ساتھ آئندہ ماہ کے نگار میں گفتگو کریں گے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سچ کا پرچہ نمبر ۱۹ مجھے موصول ہوا۔ اس میں عبدالماجد نے خود اپنے واقعہ نکاح و طلاق کو سامنے رکھکر ایک ضمیمہ اُس مضمون طلاق کا شائع کیا ہے جو سچ نمبر ۱۴ و نمبر ۱۵ میں نکل چکا ہے۔ عبدالماجد مطمئن رہیں کہ آئندہ ماہ کے نگار میں اصل و ضمیمہ دونو کو سامنے رکھ کر گفتگو کرونگا اور ان کی کوئی دلیل ایسی نہ ہوگی جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

اسی سچ نمبر ۱۹ میں اُنھوں نے ایک مختصر سا مقالہ بعنوان "بارگاہ نیاز میں" نگار ماہ مئی کے ملاحظات کو دیکھ کر سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس مقالہ میں عبدالماجد ایک طرف یہ بھی لکھتے جاتے ہیں کہ وہ میری تحریروں کا کوئی جواب نہ دیں گے، لیکن اسی کے ساتھ پورا اسکا کام سیاہ کرنے کے بعد بھی مطمئن ہوتے نظر نہیں آتے۔ کیا ایک تیشہ در انشاء زمیں "کے مقابلہ میں جب ایک "پیشہ ور نمازی" جواب دینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو کیا اسی طرح کی مذبوحی حرکات اس سے سرزد ہونے لگتی ہیں۔

عبدالماجد نے اپنی ذات کو کیوں اس قدر اہم سمجھ لیا ہے کہ میں انکے متعلق کوئی مضمون لکھ کر اپنا وقت ضائع کرونگا مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا اسلام میں کسی عورت کو نکاح کر کے بلاوجہ چھوڑ دینا ایسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی ہے جیسی عبدالماجد ظاہر کر رہے ہیں، یا حقیقت اسکے خلاف ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں عبدالماجد کا نام بار بار آنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم کو ایک طلاق دینے والے کی حیثیت سے پیش کر کے اپنے فعل طلاق کو جائز قرار دینے کی جرات و گستاخی انھیں کی طرف سے ہوئی ہے۔

سچ نمبر ۱۹ کے صفحہ ۲ پر صوبہ اودھ کے کسی وکیل کے خط کا اقتباس دیا گیا ہے جسمیں مولانا اسلم جیراجپوری کے ایک مضمون "حجر اسود" کا حوالہ دیتے ہوئے انکی گستاخانہ انداز تحریر کی شکایت کی گئی ہے۔ عبدالماجد صاحب مکتوب نگار کی حمیت دینی کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جناب اسلم جیراجپوری کی عام بیباکیوں اور گستاخ نگاریوں کے پردے ان صفحات میں بارہا فاش کئے جاچکے ہیں" میں سمجھا تھا کہ عبدالماجد کا جوش دینی یہ سنکر ابل پڑے گا اور جس طرح انھوں نے نگار کے مقالات کو کچھ اپنی کم علمی و کم فہمی کی بنا پر اچھی طرح نہ سمجھکر اور کچھ محض انتقاماً عبارتیں مسخ و مجروح کرنے کے بعد پروپاگنڈا کیا تھا، اسی طرح مولانا اسلم جیراجپوری کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیں گے۔ لیکن وہ تو ایک "آہ" بھر کر رہ گئے۔

اس موقعہ پر غالب کا ایک مشہور لطیفہ یاد آگیا کہ ایک مرتبہ غالب کے اس مصرعہ پر "بہ وادئی کہ دراں خضر را عصا خفت ست" امام بخش صہبائی نے اعتراض کیا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ میرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا جو یہ کہہ گیا ہے کہ

"دلے بہ حملۂ اول عصائے شیخ بخفت"

نیاز

عہد نامۂ عتیق (توریت) کی روایات کا ماخذ اصلی

مسلسل

طوفانِ نوح[1]

منجملہ دیگر داستانوں کے جو حسب روایت توریت، موسیٰ پر بذریعہ "وحی" نازل ہوئیں، ایک یہ بھی تھی کہ

"جب روئے زمین پر آدمی بہت ہوگئے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو "خدا کے بیٹوں" نے "آدمیوں کی بیٹیوں کو" دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں۔ اور ان میں سے جو پسند آئیں ان کو اپنی بیوی بنالیا۔ اس مواصلت سے جبابرہ پیدا ہوئے جنھوں نے بہت فساد پھیلایا، تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا" (کتاب پیدائش باب ۶ آیات ۱-۶)

(نعوذ باللہ) گویا خدا اسقدر معذور و مجبور تھا کہ وہ پہلے ہی یہ بات نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی بنائی ہوئی مخلوق دنیا میں کیا کیا حرکتیں کرے گی۔

الغرض جب خدا نے دیکھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا نتیجہ بہت خراب نکلا تو "وہ بہت دلگیر ہوا" اس نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ انسان کو مار ڈالے کہا کہ

"میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا ہے، روئے زمین سے مٹا ڈالوں گا۔ نہ صرف انسان کو بلکہ حیوانوں کو بھی پرندوں کو بھی حشرات الارض کو بھی، کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں" (پیدائش باب ۶ آیۃ ۷)

بہر حال جب کتاب پیدائش کے بیان کے مطابق انسان نے دنیا کو ظلم سے بھر دیا (پیدائش باب ۶ - آیۃ ۱۲) تو خدا نے انسانوں کو غرق کردینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور نوح کو حکم دیا گیا کہ

"تو اور تیرے بیٹے اور تیری بیوی اور تیرے بیٹوں کی بیویاں تیرے ساتھ کشتی میں جائیں گے۔ اور سب جانوروں میں سے ہر جنس کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ کشتی میں لے تاکہ وہ بچے رہیں۔ اسی طرح پرندوں اور حشرات میں سے بھی ہر ایک دو دو جوڑے لے اور تو اپنے پاس کھانے کی چیزیں جمع کرتا کہ وہ تیری اور ان کی خوراک ہوں۔"

(پیدائش، باب ۶ آیات ۱۸-۲۲)

---

[1] یہاں ہم حضرت نوح کے وہ حالات نہیں بیان کرتے جو توریت میں نظر آتے ہیں اور جو ایک نبی کی شان کے بالکل منافی ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح کو تمام مخلوقات میں سے دو دو جوڑے لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور ساری دنیا کو تباہ کرنا مقصود نہ تھا۔

لیکن کتاب پیدایش باب ہفتم آیات ۱ تا ۴ میں یہی واقعہ ان الفاظ میں درج ہے کہ:-

> اور خدا نے نوح سے کہا کہ تو اپنے خاندان سمیت کشتی میں آ۔ کیونکہ میں نے تجھی کو اپنے حضور میں اس زمانے کے درمیان صادق دیکھا۔ سب پاک جانداروں میں سے سات سات نر و مادہ اور ان میں سے جو پاک نہیں ہیں دو دو جوڑے اپنے پاس لے اور آسمان کے پرندوں میں سے جو پاک ہیں سات سات جوڑے لے تاکہ تمام زمین پر ان کی نسل باقی رہے۔ کیونکہ سات دن کے بعد میں زمین پر چالیس دن اور چالیس رات پانی برساؤں گا۔ تمام موجودات کو جنھیں میں نے بنایا زمین پر سے مٹا دوں گا۔"

یہاں ہر چیز کا جوڑا جوڑا لینے کا حکم نہیں بلکہ سات سات کا حکم ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات کو تباہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

> دوسرے مہینے کی سترہویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی۔ اسی دن نوح اور سام اور حام اور یافث نوح کے بیٹے اور نوح کی بیوی اور اس کے بیٹوں کی تینوں بیویاں کشتی میں داخل ہوئیں۔ اور تمام جانور جوڑے جوڑے کشتی میں داخل ہوئے۔ اور خدا نے اس (نوح) کو باہر سے بند کر دیا۔" (کتاب پیدایش باب ۷، آیات ۱۱ تا ۱۶)

یہاں پھر "جوڑے جوڑے" نوح کے پاس آتے ہیں۔ اس اختلاف بیان کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کتاب پیدایش کے یہ قصے لکھے ہیں اس کے سامنے دونوں قسم کی قدیم داستانیں تھیں لیکن ان میں وہ ربط پیدا نہ کر سکا۔

کشتی میں بند کر دینے اور "دوسرے مہینہ کی سترہویں تاریخ" کے بارہ میں ڈاکٹر بونویک کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال قدیم مصر کی روایات سے عبرانیوں میں آیا ہوگا کیونکہ ہر سال ماہ اتھر کی سترہویں تاریخ کو مصر قدیم کے پوجاری اپنے بڑے دیوتا اوسیریز کے بت کو ایک مقدس کشتی میں بند کر دیا کرتے تھے۔ اور جس زمانہ میں نوح کا کشتی میں بند ہونا بتایا جاتا ہے، وہ اتھر ہی کا مہینہ ہوتا ہے اور وہی تاریخ پڑتی ہے" لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ طوفان نوح اور برج بابل کا قصہ عبرانیوں نے بابلیوں کا یا کلدانیوں سے لیا تھا۔ نہ کہ مصریوں سے۔

چنانچہ مسٹر بارنگ گولڈ پادری کا بھی یہی خیال ہے کہ

> جب یہودیوں کو اسیر کرکے بابل لے جایا گیا تو وہاں انھوں نے بہت سی پرانی اور کلدانی روایتیں سنیں۔ اور اپنے مذہبی لٹریچر میں داخل کر لیں۔"

مسٹر جارج اسمتھ نے نینوا کے کھنڈر سے جو کتبے ۱۸۷۲ء میں برآمد کئے تھے۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طوفان کا قصہ اہل بابل کو اڑھائی ہزار برس مسیح سے بیشتر معلوم تھا۔

اور کلدانی مورخ بیروسوس نے طوفان کا جو حال لکھا ہے وہ بھی کتاب پیدایش کے بیان کے مطابق ہے۔ اور اس کتبہ

کے بھی مطابق ہیں جو مسٹر اسمتھ نے برآمد کیا ہے۔

دونوں قصوں میں "ایک متقی و پاکباز آدمی" کو خداوند کی طرف سے مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک ایسا طوفان آنے والا ہے جو تمام بنی نوع انسان کو غرق کر دے گا۔ اور دونوں قصوں میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کشتی یا جہاز بنائیں اور اس میں جانور اور پرندے، وغیرہ بھی معہ سامان خور و نوش کے رکھ لیں۔ دونوں قصوں میں لکھا ہے کہ کشتی سے ایک پرندہ تین مرتبہ باہر بھیجا جاتا ہے، اور تیسری مرتبہ واپس نہیں آتا۔ دونوں قصوں میں کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہرتی ہے۔ اور کشتی سے باہر نکلنے کے بعد دیوتاؤں کو قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ بیروسوس کے قصہ کا ہیرو زیسوطروس (Xisuthrus) ہے جو ملک کا دسواں بادشاہ تھا۔ اور کتاب پیدائش کے ہیرو نوحؑ ہیں، جو دسویں سردار قبیلہ تھے۔ پھر جس طرح زیسوطروس کے تین بیٹے (۱) زیروفانوس (۲) طیطن (۳) یافتوستیھس بتائے جاتے ہیں اسی طرح نوحؑ کے بھی تین بیٹے تھے (۱) حام (۲) سام (۳) یافثؑ (ان میں سے یافتوستیھس اور یافثؑ دونوں کی شخصیت غالباً ایک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش کی اس روایت کا ماخذ قدیم کلدانی یا بابلی روایات ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ ممکن ہے یہ روایت قدیم مصریوں سے لی گئی ہو، لیکن ایسا کہنا درست نہیں کیونکہ قدیم مصریوں میں طوفان کے متعلق کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی —— کیونکہ ٹھیک اسوقت، جبکہ بقول بائبل طوفان نوحؑ نے تمام روئے زمین کو غرق کر دیا تھا۔ بادشاہ فرعون خوفو اپنا ہرم اعظم تعمیر کرا رہا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم مصریوں کی کتاب مقدس "کتاب الموتیٰ" میں طوفان کا حال درج نہیں ہے

مسٹر جارج اسمتھ نے جو مٹی کی تختیاں زمین سے برآمد کی ہیں ان میں سے ایک لوح پر حسب ذیل روایت دربارہ طوفان کندہ ہے۔

(۱) سطح زمین زیر آب ہو گئی۔ اس نے روئے زمین کی تمام جاندار چیزوں کو ہلاک کر دیا۔ شدید طوفان جو لوگوں پر نازل ہوا وہ آسمان تک پہونچا۔ بھائی نے بھائی کو نہ دیکھا اور آدمیوں نے ایک دوسرے کو نہ پہچانا آسمانوں میں دیوتا طوفان سے خوف کھا رہے تھے۔ انھوں نے پناہ کی جگہ تلاش کی اور وہ انو دیوتا کے آسمان پر چڑھ گئے۔ دیوتا کتوں کی طرح (حرف مٹ گئے ہیں) سجدہ میں گر پڑے۔ چھ دن اور رات گزرے۔ ہوا طوفان اور سیلاب نے غلبہ کر لیا۔ ساتویں دن طوفان اور سیلاب

---

[1] اگرچہ بعض بعض جگہ دونوں بیانات کچھ مختلف ہیں لیکن یہ اختلاف اہم نہیں ہے اور یوں بھی ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی کسی روایت کو بیان کرے گی تو اس میں کچھ نہ کچھ "زیب داستان" کے لئے ضرور اضافہ کر دے گی۔

[2] ہندوؤں کی روایات قدیمہ میں بھی منوجی کشتی کے ذریعہ سے بچتے ہیں اور ان کے بھی تین صاحبزادے تھے۔ (۱) سام (۲) کام (۳) پرایاپتی ان میں "سام" کا نام تو بجنسہ وہی ہے اور تیسرا نام پرایاپتی یافث سے بہت ملتا جلتا ہے۔

بند ہوا۔ جس نے زلزلہ کی طرح ہلاکت ڈال دی۔ سکون ہو گیا۔ سمندر کو اس نے خشک کر دیا۔ اور ہوا اور بارش ختم ہو گئی۔ میں نے سمندر پر تلاطم دیکھا۔ اور تمام بنی آدم ہلاک ہو گئے۔ لاشیں پانی پر نرکلوں کی طرح تیرتی تھیں۔ میں نے کھڑکی کھولی اور میرے منہ پر روشنی پڑی۔ وہ گزر گئی۔ میں بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ میں نے ایک فاختہ بھیجی اور وہ چلی گئی۔ فاختہ گئی۔ اور وہ واپس آ گئی۔ میں نے ایک ابابیل بھیجی اور وہ چلی گئی اور واپس آ گئی اور اسے ٹھہرنے کو کہیں جگہ نہ ملی۔ اور وہ واپس آ گئی۔ میں نے ایک کوّا بھیجا اور وہ روانہ ہو گیا۔ کوّا گیا اور اس نے پانی اترا دیکھا اور اس نے کھایا۔ اور وہ تیرا اور آوارہ ہو گیا۔ اور واپس نہ آیا۔ میں نے جانوروں کو ہر سمت روانہ کیا اور میں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قربانگاہ بنائی۔

افسوس ہے کہ اس کتبہ میں سے ۵ سے ۱۰ تک کی سطریں ضایع ہو گئی ہیں ——— اگر وہ طریا گم نہ ہو جاتیں تو یقیناً یہ معلوم ہو جاتا کہ کشتی کس طرح بنائی گئی تھی۔ اور کس طرح زیسوطروس اور اس کے تین بیٹوں کی جانیں بچی تھیں۔ کلدانی مورخ بیروسوس نے جو روایت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ زیسوطروس کو خواب میں کلدانی دیوتا کرونوس نظر آیا۔ اور آنے والے طوفان سے مطلع کیا۔ زیسوطروس نے ایک بہت بڑی کشتی بنائی جس میں اس نے اپنے اہل و عیال اور اپنے دوستوں، اور زمین کے تمام جانوروں اور پرندوں کے نمونے کشتی میں رکھے۔ وغیرہ وغیرہ یہی بیان قریب قریب کتاب پیدایش کا ہے۔ اور اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کلدانی یا بابلی روایات سے لیا گیا ہے۔

بُرجِ بابل

بائبل کی کتاب پیدایش باب ۱۱ آیات ۱-۹ میں لکھا ہے کہ

"تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی۔ اور جب وہ پورب سے روانہ ہوئے تو انھوں نے سنعار کے ملک میں ایک میدان پایا۔ اور وہاں رہنے لگے آپس میں کہا کہ آؤ ہم اینٹ بنائیں اور آگ میں پکائیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنائیں اور ایک برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہونچے۔ اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روے زمین پر پریشان ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا۔ اور خداوند نے کہا دیکھو لوگ ایک ہی ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے۔ اب وہ یہ کرنے لگے۔ سو وہ جس کام کا ارادہ کریں گے اس سے نہ رک سکیں گے۔ آؤ ہم اتریں اور ان کی بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔ تب خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روے زمین پر پراگندہ کر دیا۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے۔ اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا۔ اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روے زمین پر پراگندہ کر دیا۔"

بائبل کی اس "الہامی" روایت کا ماخذ بھی بابلی روایت ہے۔ بیروسوس مشہور کلدانی مورخ نے بھی قریب قریب یہی بیان درباره برج بابل لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

زمین کے پہلے باشندے اپنے زور و قوت پر گھمنڈ کرتے ہوئے دیوتاؤں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے اور انھوں نے اس مقام پر جہاں اب شہر بابل ہے ایک برج بنانا شروع کیا جس کی چوٹی آسمان تک پہونچی تو ہواؤں نے دیوتاؤں کی مدد کی، اور انہوں نے اس سر بفلک برج کو اکھاڑ پھینکا۔ نیز ان لوگوں میں اختلاف لسانی پیدا کر دیا۔ اس وقت تک ان تمام آدمیوں کی ایک ہی زبان تھی۔ کہتے ہیں کہ اس برج کے کھنڈر اب بھی بابل میں موجود ہیں"

اب سوال یہ ہے کہ برج کی حقیقت کیا ہے۔ اس باب میں جوزیفس کا قول یہ ہے کہ یہ برج نمرود نے بنوایا تھا۔ اور دیودورس کا بیان ہے کہ اس برج کو اہل کلدانیہ نے رصدگاہ کی صورت سے بنایا تھا۔ اور اس کا نام "ہفت منازل سیارگاں" رکھا تھا۔

اس رصدگاہ کی منزلیں علی الترتیب آفتاب، قمر، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد سے منسوب تھیں لیکن بادشاہ بخت نصر کے عہد کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ برج شہر بورسیپا (بابل) کا برج تھا۔ اور اس نے اس کے پشتے خام اینٹوں سے اور احاطہ خشت پختہ سے بنایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان بیانات میں "اختلاف لسانی" کا کہیں ذکر نہیں

"اختلافات لسانی" کے بارہ میں قدیم ارمن روایت بے شک عبرانی روایت سے ملتی ہے اور قدیم میکسیکو میں بھی ایسی ہی ایک روایت دربارہ "اختلاف السنہ" پائی جاتی تھی۔ اور وہ لوگ اسی سلسلہ میں اپنے ملک کا برج چولولا دکھایا کرتے تھے۔ میکسیکو کی روایت یہ تھی کہ طوفان سے سات نفر دیوزاد بچے تھے۔ ان میں سے ایک دیو نے جس کا نام زیلہوا تھا، آسمان پر حملہ کرنے کے لئے چولولا کا برج تعمیر کیا، مگر دیوتاؤں نے اس برج کو آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ اور بنانے والوں کی بولی میں اختلاف ڈال دیا۔ اسی قسم کی ایک روایت شمالی ہندوستان کی تھارو قوم میں بھی پائی جاتی ہے جو مغولی نسل سے ہے۔ مشہور انگریزی سیاح ڈاکٹر لوِنگسٹن کا بیان ہے کہ ایسی ہی روایت دربارۂ اختلاف السنہ افریقہ کے قبایل میں پائی جاتی ہے جو جھیل نگامی کے سواحل پر آباد ہیں اور قدیم استھونیہ میں بھی ایسی ہی ایک روایت مشہور تھی۔ اسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی اس قسم کی روایت دربارۂ اختلاف السنہ پائی جاتی ہے۔

جارج اسمتھ کی آثاری تحقیق سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں برج بابل کا جو حال لکھا ہے۔ وہ بائبل کے بیان سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ ان کتبوں میں درج ہے کہ

"بعض لوگوں نے ایک شخص کی سیادت میں جس کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ اور جس نے تمام دیوتاؤں کے باپ سے کفر کیا تھا بابل میں ایک ٹیلہ یا پہاڑی کی وضع کا ایک برج تعمیر کرنا شروع کیا۔ لیکن ہواؤں نے ان کا کام خراب کر دیا۔ اور انو دیوتا نے اس ٹیلہ پر چھوٹے بڑے تمام لوگوں میں گڑبڑ ڈال دی۔ ان کی بولی بھی بدل دی۔ اور ان کے صلاح و مشورہ میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ بعل دیوتا تمام دیوتاؤں کا باپ ہے جس کا غیظ و غضب ان نابکار معماروں پر مشتعل ہوا۔ اور وہ دیوتا انو ہی جس نے ان لوگوں کو ہلاک کیا"

اب رہی یہ بات کہ برج بابل کہاں تھا۔ اس کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ بابل میں تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج وہاں تھا جہاں آج کل میر نمرود کا ٹیلہ پایا جاتا ہے۔ یہ نواح بابل میں شہر خاص سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بمقام بورسیپا واقع ہے۔ اور اسے "ہیکل ہفت انوار" کہتے تھے۔ سر ہنری رالنسن نے جب اس برج کا معائنہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک مٹی کے چبوترے پر اینٹوں سے سات منزلیں تعمیر کی گئی تھیں۔ اور ہر منزل کا رنگ جداجدا تھا۔ اس برج کی بلندی اس وقت بھی میدان سے ۱۵۳ فٹ بلند ہے۔ برج مذکور عرصہ دراز سے نامکمل چلا آتا تھا۔ حتیٰ کہ بادشاہ بخت نصر نے اس کی مرمت کر کے اسے درجۂ تکمیل تک پہونچایا۔

ان تمام روایات و بیانات سے ایک شخص اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ برج بابل دراصل ایک رصدگاہ تھا۔ جس میں ہیئت داں لوگ رصد کیا کرتے تھے۔ اس رصد کو آسمان پر حملہ یا خدا کی دشمنی سے تعبیر کیا گیا۔ چونکہ وہ قدیم رصدگاہ عرصہ دراز سے نامکمل چلی آتی تھی۔ اس لئے یہ روایت پیدا ہو گئی کہ چونکہ بانیان برج نے خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اس لئے وہ ہلاک کر دیئے گئے اور برج نامکمل رہ گیا۔ عراق کے میدانوں میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، اور اسی کو اختلاف السنہ کہا گیا۔

مصنفین بائبل نے لفظ بابل کو عبرانی مصدر "بَبَل" سے مشتق سمجھا ہے جس کے معنی ہیں "پراگندہ کرنا"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آشوری لفظوں "باب" اور "ایل" سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "خدا کا دروازہ"

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی روایات میں دیوتاؤں کے رہنے کا مقام میرو پربت بتایا جاتا ہے۔ اس پہاڑ کی نسبت بھی یہ خیال تھا کہ وہ سات درجوں کا ہے۔ اور ہر درجہ اپنے زیریں درجہ سے تقدس میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر ہندو مندر برج بابل کی طرح سات درجوں کے تعمیر کئے جاتے تھے۔ میرو پربت کے درجۂ اعلیٰ میں "برہما" کا مقام تھا۔ اور ہیرودوطوس نے لکھا ہے کہ برج بابل کے ساتویں ہی درجہ میں بیلوس دیوتا رہا کرتا تھا" یہ مماثلت بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

احکامِ عشرہ

ہمارا مقصد یہاں یہ نہیں ہے کہ ہم ان احکام عشرہ کی نوعیت پر بحث کریں۔ بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان احکام کے متعلق "موسیٰ کی دوسری کتاب الموسوم بہ خروج" میں جو روایت پائی جاتی ہے اُس سے گفتگو کریں۔ کتاب خروج باب ۱۹ آیۃ ۹ میں لکھا ہے کہ

"خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ دیکھ میں اندھیری بدلی میں تجھ پاس آتا ہوں تاکہ لوگ سنیں جب میں تجھ سے باتیں کروں اور ابد تک تیرے معتقد رہیں۔ اور موسیٰ نے لوگوں کی باتیں خداوند سے کہیں"۔ . . . . . . "اور تیسرے دن وہ لوگ تیار رہے کہ خداوند تیسرے دن سارے لوگوں کی نظر میں کوہ سینا پر اتریگا" (آیۃ ۱۱) اور پھر خدا نے اپنے قول کو اس طرح نبایا کہ "خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا" (آیۃ ۱۸) . . . "اور پہاڑ کی چوٹی پر موسیٰ کو بلایا" (آیۃ ۲۰) . . اس کے بعد تمام حکم

پیش بندیاں اس بارہ میں کر کے کہ کہیں کاہن اور دیگر بنی اسرائیل حدیں توڑ کر خداوند پاس اوپر نہ آئیں" (آیۃ ۲۴)۔
موسیٰ پھر پہاڑ کی چوٹی پر گئے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو مندرجہ ذیل احکام عطا فرمائے:۔ (۱) میرے حضور تیرا دوسرا خدا نہ ہو۔ (۲) تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت، جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں اور باپ دادوں کی بدکاریاں ان کی اولاد پر جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں، تیسری اور چوتھی پشت تک پہونچاتا ہوں۔ پر ان میں سے ہزاروں پر جو مجھے پیار کرتے اور میرے حکموں کو حفظ کرتے ہیں رحم کرتا ہوں (۳) تو خداوند اپنے خدا کا نام بیفائدہ مت لے کیونکہ جو اس کا بیفائدہ لیتا ہے خداوند اسے بیگناہ نہ ٹھہرائے گا۔ (۴) تو سبت کا دن پاک رکھنے کے لئے یاد کر۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنے سارے کام کاج کر لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے اس میں کچھ کام نہ کر۔ تو نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی، نہ تیرا غلام نہ تیری لونڈی نہ تیری مواشی اور نہ تیرا مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو۔ کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین، دریا اور سب کچھ جو ان میں ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اس لئے خدا نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ (۵) تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو (۶) تو خون مت کر (۷) تو زنا مت کر۔ (۸) تو چوری مت کر۔ (۹) تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دے۔ (۱۰) تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔ (خروج باب ۲۰ آیات ۱-۱۷)

یہ احکام عشرہ کس طرح دئے گئے۔ اس کی کیفیت کتاب خروج کے باب ۳۱ آیۃ ۱۸ میں اس طرح لکھی ہے:"

اور خداوند نے جب وہ موسیٰ سے کوہ سینا پر اپنا کلام ختم کر چکا، شہادت کی دو لوحیں دیں اور وہ سنگین لوحیں خدا کی انگلی سے لکھی ہوئی تھیں۔"

موسیٰ یہ لوحیں لے کر قوم کے پاس آئے تو ان کو گوسالہ پرستی کرتے دیکھا اور۔

جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور گوسالہ اور راگ ناچ دیکھا تو موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے وہ لوحیں اپنے ہاتھوں سے پھینک دیں اور پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں (خروج باب ۳۲ - آیۃ ۱۹)

جب یہ سب کچھ ہو چکا اور خدا کی عطا کردہ لوحیں یوں ضائع ہو گئیں تو

خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنے لئے پہلی لوحوں کے مطابق دو لوحیں پتھر کی تراش اور میں ان لوحوں پر وہ باتیں جو پہلی لوحوں پر تھیں جنھیں تو نے توڑ ڈالا ہے لکھوں گا۔ اور صبح کو تیار ہو جا۔ اور سویرے کوہ سینا پر آ۔ اور میرے آگے وہاں پہاڑ کی چوٹی پر حاضر ہو۔ پر تیرے ساتھ کوئی آدمی اوپر نہ چڑھے اور سب پہاڑ میں کوئی شخص نظر نہ آئے۔ بھیڑ بکری اور گائے بیل بھی

پہاڑ کے سامنے چرنے نہ پائیں۔ تب اس نے پہلی لوحوں کے مطابق دو لوحیں پتھر کی تراشیں اور صبح کو سویرے جیسا کہ خداوند نے اسے فرمایا تھا وہ دونوں لوحیں اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے کوہ سینا پر چڑھا۔" (خروج باب ۳۴ آیات ۱-۴)

یہ ہے احکام عشرہ کے متعلق بائبل کی روایت۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس روایت میں بھی کوئی عبرانی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ جب صحف موسیٰ لکھے گئے تھے اس سے قرنوں پیشتر اسی قسم کی روایات یورپ اور ایشیا دونوں جگہ قومی بہادروں اور قانون سازوں کے بارہ میں رائج تھیں۔

مثلاً بیکس معنی کے عطا کردہ احکام دو سنگین لوحوں پر لکھے ہوئے تھے۔ جو حضرت موسیٰ سے بہت قبل پایا جاتا تھا۔ اسی بیکس کے متعلق بیان کیا جاتا تھا کہ اس نے بحر احمر کو عبور کیا۔ پتھر پر عصا مار کر پانی کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ اور درخت لبلاب کی ایک شاخ نے کر اسے سانپ بنا دیا تھا۔ اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ کو فرعون کی بیٹی نے دریائے نیل سے ایک ٹوکرے کے اندر سے اٹھایا تھا، اسی طرح عالم شیر خوارگی میں ایک صندوق کے اندر سے جو دریائے نیل میں تیر رہا تھا، بیکس کو بھی نکالا گیا تھا۔ الغرض ان دونوں روایتوں میں اسقدر یکسانیت ہے کہ سوائے نام کے اور کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

علاوہ اس کے موسیٰ کے پیدا ہونے سے قرنوں پیشتر (تقریباً ۲۸۰۰ ق۔م میں) شمالی بابلستان میں عقادہ کے لوگوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی تھی کہ "بادشاہ سارگون اول کی ماں نے جو خاندان شاہی کی ایک شاہزادی تھی۔ اسکی ولادت پوشیدہ رکھنے کے لئے اس کو ایک ٹوکرے میں رکھ کر جس پر خوب رال لگا دی گئی تھی، دریا میں چھوڑ دیا۔"

یونان کے شاعروں کے ابوالآبا "آرفیوس" کے متعلق بھی یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس کے پاس ایک عصا تھا جس کے ذریعہ سے وہ معجزے دکھایا کرتا تھا۔ اور اپنی فوج کو لئے ہوئے بحر احمر سے سوکھے پاؤں گذر گیا تھا، اور جہاں جہاں وہ جاتا تھا۔ شراب، دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہو جاتی تھیں۔

حضرت موسیٰ کو جو الواح سنگین کا ملنا توریت میں بیان کیا گیا ہے بالکل وہی زردشت کے متعلق بھی قدیم ایرانیوں کے لٹریچر میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی روایت ہے کہ ایک دن جبکہ وہ (زردشت) ایک بلند پہاڑ پر عبادت کر رہا تھا، خداوند اس پر ظاہر ہوا اور اس نے، بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کے درمیان، اس کو کتاب شریعت "ہورامزدا" بذریعۂ الہام نازل فرمائی۔ اس کتاب کو قدیم فارسی زبان میں "ژندواوستا" (زندہ کلام) کہتے تھے۔

جزیرۂ کریٹ کا مقنن مینوس بھی کوہ دکتا کی چوٹی پر چڑھا تھا۔ جہاں اس کو "ذیوس" یونانیوں کے خدا نے احکام شریعت دیئے تھے۔ اور وہ ان احکام کو لے کر پہاڑ سے نیچے آیا تھا۔۔۔۔ ان بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ توریت میں حضرت موسیٰ کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ حضرت موسیٰ سے بہت قبل دوسری قوموں میں بھی مختلف بزرگوں کی نسبت بیان کیا جاتا تھا، اور توریت میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی

یونس اور مچھلی

بائبل کی کتاب "صحیفہ یونس نبی" میں بیان کیا گیا ہے کہ

"وہ حسب تعمیل "کلام خداوند" نینوا کو جا رہا تھا۔ اور نبی یونس کو اسی کہنے پر طوفانی سمندر میں ڈال دیا گیا (صحیفہ یونس باب ۱ آیہ ۱۲) مگر خدا نے نہ چاہا کہ یونس کو نینوا نہ جانے کی وجہ سے سمندر میں غرق کر دے۔ پس خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ وہ یونس کو نگل جائے اور یونس تین شب و روز مچھلی کے پیٹ میں رہا" (صحیفہ یونس باب ۱ آیہ ۱۷) پھر یونسؑ نے "پاتال کے بطن میں سے چلایا" (یونس باب ۲ آیہ ۲) اور نجات کے لئے دعا مانگی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان کے باشندے بھی اپنے دیوتا ہرقلیس کے متعلق یہی روایت بیان کرتے تھے کہ "یافہ کے قریب (جہاں یونس کو مچھلی نے نگلا تھا) اس کو ایک مچھلی نے نگل لیا تھا۔ اور وہ تین دن تین رات اسکے پیٹ میں رہا۔ دونوں روایتوں میں صرف اسقدر فرق ہے کہ یونسؑ تو مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم نکل آئے تھے۔ مگر ہرقلیس کے سر کے بال گل گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو برنارڈ ڈی مونٹفاکن کی کتاب "L'Antiquité expliquée" جلد اول صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ پیرس ۱۸۲۲ء)

ڈاکٹر گاڈفرے ہگنس کا بیان ہے کہ یونسؑ اور مچھلی کی داستان یونانی دیوتا ہرقلیس کی داستان کا ایک حصہ ہے جو "ہرقل نامہ" میں بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو کتاب Anacalypsis) جلد اول صفحہ ۶۳۸ - نیز ٹائلر صاحب کی کتاب "قدیم شائستگی (Primitive Culture) جلد اول صفحہ ۳۰۶ مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء)

عرصہ ہوا جرمنی کے مشہور سر برآوردہ پروفیسر دینیات روز میولر نے لکھا تھا کہ صحیفۂ یونس میں جو معجزہ درج ہے وہ محض ایک تمثیل ہے جس کی بنیاد ایک قدیم فنیقی روایت پر قائم ہے کہ "ہرقلیس ایک حسینہ ہزیونی کو کسی عظیم الجثہ خونخوار بحری جانور سے بچانے کے لئے اس کے منہ میں کود پڑا تھا۔ اور تین دن تین رات اس کا پیٹ پھاڑتا رہا۔"

ہرقلیس اور یونسؑ کی طرح کا ایک قصہ ہندوؤں کی کتاب "سوم دیو بھاٹہ" میں بھی درج ہے (ملاحظہ ہو ٹائلر صاحب کی کتاب "بنی نوع انسان کی قدیم تاریخ" (Early History of Mankind) صفحہ ۳۴۴ ، ۳۴۵)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات درحقیقت تمثیلی ہیں جن سے مراد آفتاب کا طلوع و غروب ہے یا بالفاظ دیگر رات کا آفتاب کو نگل لینا اور صبح کو اگل دینا

قدیم زمانہ کی بہت سی قوموں میں آفتاب کو "جوناہ" کہا کرتے تھے۔ قوم باسک میں آفتاب کا نام "جونا"، "جون" یا "جوَنا" تھا۔ ٹروجن قوم بھی آفتاب کو "جونا" کہتی تھی۔ اور پارسیوں میں آفتاب کا نام "جوناہ" تھا۔ ناروے اور سویڈن میں آفتاب کو "جان" کہتے ہیں۔ الغرض یونسؑ ہوں یا ہرقلیس یا کوئی اور ، ان سب سے مراد "آفتاب" ہے

اور مچھلی سے مراد "زمین" ہے۔ چنانچہ جزائر بحر جنوبی کی روایات قدیمہ میں زمین کو ایک بہت بڑی مچھلی ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔۔۔۔ اب رہا تین دن اور تین رات "مچھلی" کے پیٹ میں رہنا سو اس سے مراد غالباً ۲۲ دسمبر سے ۲۵ دسمبر تک کا زمانہ ہے۔ جب آفتاب سب سے نیچے کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ اس منزل سے گزر جاتا ہے (ملاحظہ ہو گولڈ زیہر کی کتاب HEBREWS MYTH[illegible] صفحات ۱۰۲/۱۰۴)

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا تھا ؎

قرصِ خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہانِ ماہی شد

ایثار

فسانہ

ایک صدی بلکہ اس سے بھی پہلے کا واقعہ ہے۔ جب معاشرت و تہذیب کے اصول یہ نہ تھے اور دنیا کچھ اور تھی ــــــ گرجا کا گھنٹہ باقاعدہ وقفے کے ساتھ اپنی حزین و دردناک آواز بلند کر رہا تھا، لوگ جوق در جوق چلے جا رہے تھے، دکانیں بند ہو رہی تھیں، مکان مقفل کئے جا رہے تھے۔ اور قصبہ کی ساری چہل پہل سمٹ کر اُس ایک عمارت کی طرف منتقل ہو رہی تھی جو آبادی سے کچھ دور بلندی کے اوپر قائم تھی ــــــ یہ بہت قدیم گرجا تھا۔ اور جو روایات قرب و جوار میں اس کے متعلق مشہور تھیں وہ بہت عجیب و غریب تھیں، چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ اس گرجا کے پادری ہمیشہ ولی ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ صحیح معنے میں عیسیٰ کی تعلیمات کا درس دیا ــــــ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت بھی یہاں کا پادری اس حیثیت سے سارے قصبہ میں مشہور تھا۔ اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے، حالانکہ ابھی وہ بالکل نوجوان تھا۔

سپاہیوں کا ایک دستہ ہاتھوں میں ترسول نما علم لئے ہوئے گزرا، تماشائی سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے اور اس جلوس کو دیکھنے لگے۔ جو گورنر کے گزرنے کے وقت ہمیشہ ترتیب دیا جاتا تھا ــــــ یہ بھی گرجا جا رہا تھا ــــــ تھوڑی دیر کے بعد گورنر جو ایک ضعیف العمر لیکن قوی الاعضا انسان تھا، ہات میں عصائے حکومت اور کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے گزرا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ کوئی مکان کھلا ہوا تو نہیں ہے، کوئی لہو و لعب میں تو مصروف نہیں ہے۔ کیونکہ عبادت کے دن اُس زمانہ میں کھیلنا اتنا ہی معیوب تھا۔ جتنا اس وقت کھیل کے وقت کسی کا سنجیدہ بن جانا ــــــ

(۲)

للی نے بھی گھنٹے کی آواز سن کر گرجا جانے کی تیاری شروع کی، وہاں کا خاص ملبوس نکالا، آئینہ کے سامنے اس کی شکنیں دور کرنے لگی اور بالوں میں پھول ڈالنے لگی ــــــ آئینہ ٹھیک اس کھڑکی کے محاذ میں لگا تھا۔ جو سڑک کی طرف کھلتی تھی، آفتاب کی شعاع نے کھڑکی کی راہ سے آئینہ پر اپنی روشنی ڈالی اور اُس کا عکس کھڑکی سے ہو کر سڑک پر پہونچا، جہاں اس وقت گورنر گزر رہا تھا ــــــ اُس کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور وہ اسی جگہ ٹھیر کر دیکھنے لگا کہ یہ کس کا مکان ہے جس کی کھڑکیاں ابھی تک بند نہیں ہوئیں اور وہ کون ہے جو گرجا جانے کے لئے باہر نہیں نکلا ــــــ للی آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر کناری (چڑیا) کے پنجرہ کے پاس گئی، ہاتھ ڈال کر نکالا، اور اس کے سر پر نرم نرم ہاتھ پھیر کر اس کی چونچ اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر پیار کی باتیں کرنے لگی ــــــ

وہ چاہتی تھی کہ پھر پنجرہ میں ہاتھ ڈالکر اپنے بند کردے کہ گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اور چڑیا کھڑکی سے باہر اُڑ گئی ——— لِلی بیتابانہ دوڑی، باہر جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر ڈھونڈھتی پھری، شاخوں سے ٹکرائی، کانٹوں سے دامن اُلجھایا، گری پڑی، لیکن وہ ناشکر گزار طائر پھر ہاتھ نہ آئی ——— گورنر نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اور غضب آلود چہرہ لئے ہوئے اپنے نائب سے یہ کہتا ہوا گزر گیا کہ "عبادت کے دن یہ لہو و لعب ہرگز معافی کے قابل نہیں ہے"۔ ایک سپاہی نے بڑھکر دروازہ پر صلیبی نشان سفید کھریا سے بنایا۔ اور سب لوگ گزر گئے۔ لِلی بدستور اسی اُلجھن میں گرفتار ہوئی۔ اور گرجا کا گھنٹہ سنکر چونک پڑی۔ یہاں تک کہ گھنٹہ کی آواز بند ہوگئی۔ یہ خموشی گویا اس امر کا اعلان تھا کہ اب انتظار کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ لِلی نے گھبراکر چڑیا کی جستجو ترک کی اور بھاگتی ہوئی گرجا کی طرف چلی۔ قصبہ میں سناٹا تھا، سڑکیں خالی پڑی تھیں، گرجا کے سامنے دو سپاہی گورنر کے باڈی گارڈ کے مسلح کھڑے تھے۔ اور دروازہ بند تھا، لِلی نے ڈرتے ہوئے، سہمتے ہوئے، کانپتے ہوئے، ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور اس طرح دبے پاؤں چلی جیسے وہ چوری کرنے جا رہی ہو ———

کلیسا کا درمیانی ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور نوجوان راہب انجیل مقدس ہاتھ میں لئے ہوئے وعظ کہہ رہا تھا۔ لوگ نہایت خلوص و صداقت کے ساتھ اس کی آسمانی باتوں کو سُن رہے تھے ——— لِلی قریب کی بنچ پر ایک جگہ خالی دیکھ کر آہستگی سے بیٹھ گئی، لیکن راہب نے جس کی نگاہ دروازہ میں داخل ہوتے ہی اس پر پڑ چکی تھی، لِلی کی طرف اشارہ کرکے بآواز بلند حکم دیا کہ "یہ لڑکی سامنے لائی جائے"۔

لِلی نازک اندام لِلی، کمزور بیل کی طرح ذرا سے جھٹکے سے تھرتھرا جانے والی لِلی کانپتی ہوئی آگے بڑھی اور اشک آلود آنکھوں سے راہب کی طرف دیکھنے لگی ———

لِلی اُن لڑکیوں میں سے تھی، کہ اگر ان کے اعضا پر علیحدہ علیحدہ نگاہ ڈالی جائے تو وہ معمولی سی زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی دلکشی ناقابل انکار ہوتی ہے ——— قصبہ کے اندر اسی سن و سال، اسی قد و قامت، اسی نقشہ و ساخت کی بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جنھیں راہب نے دیکھا ہوگا لیکن لِلی بالکل پہلی لڑکی تھی جس کی طرف سے جلد نگاہ پھیر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ برابر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ اپنے تمام جسم کے ساتھ اس کے دل میں سمائی جا رہی ہے۔ کتابی چہرہ، باریک کترا ہوا نقشہ، پنکھڑی سے ہونٹ، رسیلی آنکھیں جن میں اس وقت آنسوؤں نے اور بھی موتی کوٹ کر بھر دئے تھے، یہ سب وہ باتیں تھیں، جنھوں نے اسکی رعنائی، فطری دل کشی اور موسم شباب کے ساتھ مل کر، مقدس راہب کو بھی کچھ دیر تک یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ "کیا قانون کی گرفت سے ایسا معصوم حُسن بھی آزاد نہیں ہو سکتا"۔

——— اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑا، اس کا تقدس کانپ اٹھا۔ اور بمشکل اس نے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹاکر بآواز بلند کہا کہ "بیشک جو گناہ کرے گا اس کو سزا دی جائے گی، عبادت کے دن کھیل کود میں مصروف رہنا۔ کلیسا کا دروازہ بند ہوجانے کے بعد اس کو کھٹکھٹانا، جرم ہے اور خدا اس گستاخی کو معاف نہیں کرے گا"

—— راہب یہ کہہ کر منبر سے اُتر آیا، انجیل بند کر کے میز پر رکھدی اور ایک کونہ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

(۳)

شاہراہ پر، نازک اندام للّی کے نازک ہاتھ پاؤں ایک کاٹھ میں ڈال دئیے گئے تھے۔ جس پر یہ اعلان کندہ تھا کہ:

"یہ ہے سزا اُس کی جو عبادت کے دن، عبادت سے منھ چرائے"

عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، جوان سبھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔ اور اس کو دیکھتے جاتے تھے، لیکن کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کے لبوں کو، جو تمازت آفتاب کی وجہ سے خشک ہو رہے تھے، پانی سے تر کردے، اس کے بال پریشان تھے، لباس بے ترتیب تھا، چہرہ زرد اور آنکھیں اشک آلود تھیں، وہ دل ہی دل میں سخت محجوب و منفعل تھی، کہ کیوں اس نے ایک بے دفا چڑیا کے لئے مذہبی قانون کا پاس نہیں کیا۔ اسی حال میں گھنٹوں گزر گئے۔ اور اس کی حالت شدت تشنگی سے متغیر ہونے لگی ——

یہ وہ وقت تھا جب راہب گرجا سے نکل کر لوگوں کی تیمارداری، مزاج پرسی اور مذہبی تلقین کے لئے نکلا کرتا تھا —— ہرچند وہ اُس لمحہ کو نہیں بھولا تھا۔ جب للّی ایک گناہ گار کی حیثیت سے اس کے سامنے لائی گئی تھی اور جب خود اس کے دل میں اوّل اوّل ناویل گناہ کا جذبہ پیدا ہوا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ للّی کہاں اور کس عالم میں ہے۔ وہ اسی خیال میں منہمک سڑک سے گزر رہا تھا۔ کہ دفعۃً اس کی نگاہ ایک ہجوم کی طرف گئی اور جب وہ قریب پہونچا تو معلوم ہوا کہ لوگ للّی کی بے بسی و بے کسی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں —— وہ بیتابانہ، بے اختیارانہ آگے بڑھا، اس کی نڈھال گردن کو ہات پر سنبھال کر پانی پلایا اور پھر اس کے ہات پاؤں کاٹھ سے نکال کر گھر تک پہونچانے گیا —— لوگوں نے دیکھا اور کہا "راہب کس قدر رحم دل ہے —— وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ایک گنہگار سے بھی وہی محبت ہے جو اوروں سے" ——

لوگ اپنی اپنی راہ چلے گئے اور للّی، راہب کی معیت میں اپنے گھر پہونچی، جہاں اس کا گم شدہ طائر پنجرہ پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا —— للّی نے بڑھ کر اس کو پکڑ لیا، پیار کیا اور تمام وہ مصائب بھول گئی جن میں گھنٹوں مبتلا رہی تھی — اس نے مسکرا کر راہب سے کہا "میں گرجا دیر میں گئی تو وہ سب کچھ ہوا جس کے خیال سے ایک انسان کو شرم کرنا چاہئے۔ لیکن میں اس چڑیا کو باوجود اس کے کہ اسی نے مجھے ذلیل و رسوا کیا، پیار کرتی ہوں —— اے راہب، مجھے بتا کہ انسان کے دل میں انتقام کا جذبہ کون پیدا کرتا ہے —— کیا خدا ایسا کرتا ہے، مجھے اس کا یقین نہیں"

راہب جو للّی کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش کو اپنے دل و دماغ میں منقوش کرتا جا رہا تھا۔ یہ سنکر بیتاب ہو گیا اور جب اس نے دیکھا کہ زیادہ قیام اسے بالکل بے قابو کر دیگا، تو اس نے سر جھکا کر —— "ہاں ——" کہا اور فوراً دروازہ سے باہر نکل کر چلا گیا ——

(۴)

چند دن گزر گئے، للّی تنہا زندگی کے مشاغل معیشت میں مشغول رہی۔ اور راہب گرجا کے اندر صرف اس کوشش میں

کہ وہ للی کے خیال کو کیونکر اپنے دل سے نکالے اس نے رات دن انجیل اپنے سامنے کھلی رکھی، گھنٹوں مسیح کے بت کے حضور میں التجائیں کیں، دعائیں مانگیں، کہ وہ اُس عہد پر استوار رہے جو اس نے دس سال قبل ملک کے سب سے بڑے گرجا میں کیا تھا ——— اور جب اس نے ایک نوع کا سکون محسوس کر لیا تو پھر باہر نکلا۔ وہ انجیل ہات میں لئے، جھاڑیوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اُسے ایک لڑکی کی جھلک نظر آئی جو چشمہ پر کپڑے دھو رہی تھی ——— یہاں کا ایک قانون یہ بھی تھا کہ کوئی عورت اپنے چھوٹے کپڑے نہ علانیہ دھو سکتی تھی، نہ کسی کو دکھا سکتی تھی ——— راہب کو خیال آیا کہ ممکن ہے کوئی عورت اس قانون کو توڑ رہی ہو، اس لئے وہ آگے بڑھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی للی ہے اور حقیقتاً قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے ——— راہب بڑھا اور للی اس کو دیکھ کر گھبرا گئی، کپڑا دونوں ہاتھوں سے پشت کے پیچھے چھپا لیا۔ اور حد درجہ معصومانہ انداز سے اس کو دیکھنے لگی ——— وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی تھی۔ اور راہب سب سے زیادہ اس کی اسی ادا سے گھبراتا تھا، کیونکہ اس کی ہر نگاہ اس کے لئے ایک ایسا مہلک پیام تھی کہ مشکل ہی سے وہ اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ کبھی ایسا محسوس کرتا کہ للی کی آنکھوں سے سیاہ بیدار شعلے نکل نکل کر سیدھے اعماق قلب تک پہونچ رہے ہیں۔ اور کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زبردست سیلاب میں اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ للی نے اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا ہو اور اس کے جسم میں سنسنی سی نہ پیدا ہوئی ہو ——— اس نے للی کی طرف سے نگاہ ہٹا کر کہا "للی، مجھے دکھاؤ یہ کون سا کپڑا ہے" ——— للی برابر دیکھتی رہی اور کپڑا اسی طرح چھپائے رہی ——— راہب نے اس کی کلائیاں اپنے ہات میں لے کر کہا "کیا تم نہیں دکھاؤ گی" ——— للی کے اعصاب، حسین راہب کے گرم ہاتھوں کے مس سے ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس نے بے اختیارانہ وہ کپڑا سامنے کر دیا جیسے وہ چھپائے ہوئے تھی ——— یہ اس کی چھوٹی قمیص تھی جو رات کو استعمال کی جاتی ہے ——— راہب کا خیال فوراً اس قمیص کو دیکھ کر للی کے اس مینائی جسم کی طرف گیا جس سے وہ مس ہوتا رہتا تھا، اور صحیح معنے میں وہ ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگی جس کی حکومت میکدہ و خانقاہ دونوں جگہ یکساں ہے، اس نے بے اختیارانہ للی کی دونوں کلائیاں اپنی طرف کھینچنی شروع کیں، اور للی جسے راہب کے حسن و شباب نے پہلے ہی دن اپنا بنا لیا تھا، اس کی طرف اس طرح کھنچنے لگی جیسے گھاس کا تنکا کہربا کی طرف کھنچتا ہے ——— چہرے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، آنکھیں باہم تبادلۂ صہبا میں مصروف تھیں۔ اور مرتعش لبوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا کہ دفعتہً راہب چونکا اور اس نے فوراً للی کے دونوں ہات چھوڑ کر منھ موڑ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا چلا کہ "للی، دیکھو تم قانون و مذہب کی مخالفت نہ کرو، جاؤ اس کپڑے کو کہیں چھپا دو پھر دوبارہ ایسی جرأت نہ کرنا" ———

للی جس کی بیتابی کا وہی عالم تھا جیسے کسی کے خشک لبوں تک لاکر جام ہٹا لیا جائے، راہب کے پیچھے دوڑی اور سامنے جا کر اس کو روک لیا ——— اس نے منھ پھیر کر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہا کہ للی پھر سامنے آ گئی ——— راہب نے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو"۔ للی نے کہا صرف یہی کہ میں اسی طرح گناہ کرتی رہوں اور تم اسی طرح مجھے سزا سے ڈراتے رہو" ——— اس مرتبہ للی نے راہب کی کلائیاں پکڑ لیں اور اس نگاہ سے اس کی طرف دیکھا، جس کا جواب سوائے اس کے کوئی نہ ہو سکتا تھا کہ آنکھ بند کر کے اس کی قوت کا اعتراف کر لیا جائے۔

راہب کے لب پہلے للّی کی آنکھوں تک، پھر اس کے لبوں تک اور وہاں سے اس کی مرمریں لانبی گردن تک پہونچے اور اس کو اپنی آغوش میں کھینچ کر آخر کار اس نے، اس کے قلب و روح نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اگر عبادت کسی لذت روحانی کے لئے کی جا سکتی ہے تو گناہ سے زیادہ عبادت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(۴)

مہینوں گزر گئے اور کوئی قابل ذکر واقعہ ان دونوں کی زندگی میں پیش نہیں آیا ــــ ایک بار رات دن میں دونوں کو مل کر تھوڑی دیر بات کر لینا لازم تھا۔ اور ان پوشیدہ ملاقاتوں کی لذت سے دونوں اپنی اپنی جگہ سرشار رہتے تھے ــــ

ایک دن صبح کو راہب بہت خوش خوش للّی کے گھر آیا۔ اور بولا کہ میں گورنر کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں ــــ للّی نے گھبرا کر اسے دیکھا اور جدائی کے خیال سے پریشانی اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگی ــــ جس کو محسوس کر کے راہب نے کہا کہ "میں تنہا نہیں جاؤں گا، بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہوگی۔ اور آج ہم تم دونوں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو جائیں گے"

یہ سن کر للّی کا وہ عالم ہوا جیسے اس پر بجلی گری ہو اور راہب کی آغوش سے علیحدہ ہو کر اس طرح سہمی ہوئی پیچھے کی طرف ہٹنے لگی جیسے اس کے جسم کا اتصال جلائے دے رہا ہے ــــ راہب متحیر ہو گیا۔ اور مطلقاً نہ سمجھ سکا کہ شادی کے ذکر سے للّی پر یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی ــــ اس نے پوچھا، بار بار پوچھا کہ کیا تم شادی پر آمادہ نہیں ہو اور للّی نے آخر کار کہہ دیا کہ "نہیں، میں شادی نہیں کر سکتی" اور بکس سے نکال کر وہ انگوٹھی دکھا دی جو اس سے قبل رسم ازدواج کے وقت اس کے ہاتھ میں پہنائی گئی تھی، اس نے کہا کہ "چند سال ہوئے، میرے والدین نے میری مرضی کے خلاف ایک ڈاکٹر سے شادی کر دی تھی، جو مجھے یہاں لے آیا تھا، لیکن چند مہینے رہنے کے بعد وہ کسی کام سے دوسرے شہر گیا۔ اور پھر وہاں سے واپس نہیں آیا۔ اور نہ اس کی کوئی خبر معلوم ہوئی ــــ یقیناً تم مجھے ملامت کرو گے اور میں اس کی مستحق ہوں، مگر میں نے تم پر یہ حال اس خوف سے ظاہر نہیں کیا کہ شاید تم ملنا چھوڑ دو اور اس کو میں کسی طرح برداشت نہ کر سکتی تھی"

راہب دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اور پھر حد درجہ سوگوار و مایوس حالت میں اٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس نے للّی کو ملامت نہیں کی، اس نے برہمی کا اظہار نہیں کیا، لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ زندگی میں شاید یہ پہلا موقعہ اس کے لئے اس قسم کی تکلیف کا پیدا ہوا ہے۔ وہ دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا اور پھر دفعتاً اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

(۵)

تین ماہ بعد ــــ صبح کا وقت ہے۔ گورنر کے مکان کے سامنے جو میدان ہے آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، سپاہی وردیاں پہنے میدان کے اس حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ جہاں ایک بلند چبوترہ پر سولی قائم کی گئی ہے ــــ گورنر بالاخانہ پر مع سرداروں کے بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف ہے۔ اور اس وقت کا منتظر ہے کہ مجرم کو سولی کے چبوترہ تک زنداں سے نکال کر

لایا جائے ۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اس کو خبر معلوم ہوتی ہے کہ راہب بادشاہ کے پاس سے واپس آ رہا ہے۔ اور گورنر صدر دروازہ کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔۔۔۔ راہب اندر داخل ہوتا ہے اور اپنی کامیابی کی خوشخبری سناتا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ مفصل گفتگو کرے، گورنر اس سے کہتا ہے کہ "تمہارا اس وقت آنا بہت برمحل ہوا ہے، کیونکہ ایک مجرم سولی پر چڑھایا جانے والا ہے، اور ضرورت تھی کہ پہلے اس سے تفصیل جرم معلوم کی جائے، کیونکہ حسب قانون اس کے ساتھ کسی اور کو بھی اس سزا میں شریک ہونا ضروری ہے" ۔۔۔۔ اسی وقت نیچے میدان میں ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور راہب نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا تو حیرت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا ۔۔۔۔ اس نے دیکھا کہ سپاہی للی کو کشاں کشاں لئے آرہے ہیں اور اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی ہے جو گھڑی گھڑی ہمک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کی گردن سے چمٹا جا رہا ہے۔ تمام واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے، اور یہ دیکھ کر کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کے سامنے اس کا کردہ باطن بے نقاب ہو اس کا دل کانپنے لگا ۔۔۔۔ وہ بے اختیارانہ وہاں سے دوڑا۔ اور مجمع کو چیرتا ہوا کسی نہ کسی طرح للی کے پاس پہونچا۔ چلا تو اس جذبۂ بے اختیار سے تھا کہ جاتے ہی اس کو اپنی آغوش میں لے لیگا۔ اور سب پر اصل راز کو ظاہر کر دے گا، لیکن وہاں پہونچ کر پھر اسے اپنے راہبانہ تقدس کا خیال آیا اور اس نے اپنی اسی شفقت کے ساتھ جو ہر شخص پر صرف ہوتی تھی۔ للی کی طرف توجہ کی ۔۔۔۔ وہ اس وقت چبوترہ پر پہونچ چکی تھی۔ اور اس سے دریافت کیا جا رہا تھا کہ وہ اس بچہ کے باپ کا نام بتائے تا کہ اُسے بھی اسی کے ساتھ سولی پر چڑھا جائے۔ لیکن وہ ساکت و خاموش تھی، اور کسی طرح اپنی گود سے اس بچہ کو علٰحدہ نہ کرتی تھی جسے سپاہی چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

راہب دوڑتا ہوا۔ للی کے پاس گیا تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ راہب کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ احساس کی یہ اولین کیفیت دور ہونے کے بعد، راہب نے اشاروں ہی اشاروں میں للی سے کہا کہ اب حقیقت کے چھپانے کا وقت نہیں ہے لیکن للی نے اسی ایثار سے کام لے کر جو ایک محبت کرنے والی عورت کی زندگی ہے۔ اس کو منع کیا کہ وہ اپنے وقار و احترام کو صدمہ نہ پہونچائے ۔۔۔۔ راہب نے کہا " اے للی اگر تجھ سے محبت کرنا واقعی کوئی گناہ تھا، تو اس سے زیادہ ثواب کا کام دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا اعتراف کروں "

لیکن للی اس پر راضی نہ ہوئی، اس نے کہا کہ " اس وقت تک ہم نے اپنے تعلق کو جس طرح چھپایا وہ یقیناً ایک بڑا جھوٹ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے بولے، لیکن اس "جھوٹ" کے بعد اب ایسا سچ بولنا جس سے تین جانیں ہلاکت میں پڑ جائیں، اس جھوٹ سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے "

راہب کے سامنے اس وقت سوال اپنے تقدس کے حفاظت کا نہ تھا۔ بلکہ للی اور اس کے معصوم بچہ کا تھا ۔۔۔۔ اس نے دل میں کہا " اگر دنیا میں ایک بار جھوٹ بولنے کے بعد، انسان ساری عمر جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جائے تو یہ اس کے جرم کی پاداش ہے اور یہ سزا اُسے بھگتنا چاہیئے " ۔۔۔۔ وہ یہ سوچ کر گورنر کے پاس گیا اور کہا کہ " خدا کے احکام کے مطابق اس عورت

اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی، جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ بچہ کا باپ کون ہے" ——— گورنر نے پوچھا کہ پھر کیا تدبیر ہے" ——— راہب نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا ——— "کیا تم میں کوئی شخص ایسا ہے جو اس بچہ کا باپ ہونے کا اقرار کرے اور دس سال تک قید میں رہ کر اس عورت اور اس کے بچہ کی پرورش و نگہداشت کا ذمہ دار بنے۔"

یہ سنتے ہی مجمع سے نفرت و احتراز کی آواز بلند ہوئی اور لوگ رلّی کو دیکھ کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگے جیسے کہ وہ کوئی زہریلی ناگن ہو" ———

دیر تک انتظار کرنے کے بعد راہب پھر اٹھا اور بولا کہ " اے گورنر، اے شہر کے معززین، سن لو کہ میں اس بچہ کا باپ ہوں اور رلّی میری بیوی ہے"

یہ سنکر ہجوم میں عجیب طرح کی بے چینی پیدا ہوئی، لیکن جس وقت راہب یہ کہنے کے بعد نیچے اترا اور رلّی کا ہاتھ پکڑ کر قید خانہ کو لے چلا، تو سب دم بخود تھے اور کہہ رہے تھے کہ ——— "راہب کے تقدس کی انتہا ہو گئی"

کلیسہ اب دوسرے راہب کے سپرد ہے اور جو رات دن اپنے تقدس کا سکہ بٹھانے کے لئے خدا کے احکام لوگوں کو سنایا کرتا ہے۔ لیکن سب کی نگاہیں ایک دوسرے کی طرف اس طرح اٹھتی ہیں گویا کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے اور اس مقدس راہب کی یاد کرکے ایک ٹھنڈی سانس بھر لیتے ہیں، جس نے ایک آوارہ، لڑکی کے لئے اپنی عزت، وجاہت اور اپنے اقتدار و احترام کو خاک میں ملا دیا"

نیاز

دولت کی غیر مساوی تقسیم

اور اس کا اثر تمدن انسانی پر

(گذشتہ سے پیوستہ)

جن اعداد و شمار کے متعلق گذشتہ مہینہ کے "نگار" میں بحث کی جا چکی ہے اور اُن سے جو نتائج پیدا ہوئے تھے، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) ف ۱۹۰۸ء میں ممالک متحدہ برطانیہ کی کل آبادی کا ۱/۷ حصہ ملک کی ۶/۷ املاک و دولت پر قابض تھا۔ اوسط مالیت جائداد فی کس تین سو پونڈ تھی۔ لیکن دولت کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے ایک کثیر حصۂ آبادی کے پاس جو سامان پایا جاتا تھا وہ کسی حالت میں دولت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ چند بوسیدہ مکانات، ٹوٹے ہوئے برتن، زنجیر کی گھن لگی ہوئی لکڑیاں اور اُجرت، تنخواہ یا پنشن وغیرہ کا مختصر اندوختہ بصورت نقد کبھی بھی دولت کہے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا اور نہ اس سامان کو "سرمایہ" کی طرح استعمال کر کے آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس آبادی کو لامحالہ "سرمایہ دار" جماعت کا دست نگر بننا پڑتا ہے۔ اور انھیں کے اشارہ چشم و ابرو پر اپنی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔

(۲) ف ۱۹۰۸ء میں انگلینڈ اور ویلز میں، زمینداروں کی تعداد صرف دس لاکھ تھی۔ لیکن اس میں زیادہ تر ایسے زمیندار شامل تھے جنکے پاس رقبہ بہت کم تھا — اور انگلینڈ اور ویلز کا ایک کثیر رقبہ ۳۶ ہزار اشخاص کی ملکیت میں تھا جن کی تعداد کل برطانوی آبادی کے ۱/۱۰۰۰ حصہ سے بھی کم تھی۔ پھر چونکہ بغیر زمین کے دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا — اس لئے زمینداروں کو ان کا کرایۂ زمین دینے کے لئے آبادی کا کثیر حصہ مجبور تھا۔ اور اس لیے اُس سال دس کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ زمین کے استعمال کی اجازت دینے کے معاوضہ میں ان زمینداروں کو وصول ہوا اور اس رقم میں سے بھی زیادہ تر روپیہ ان ۲ ہزار ۵۰۰ آدمیوں کے حصہ میں آیا جو انگلینڈ اور ویلز کے تین چوتھائی حصہ کے مالک تھے۔ زمین کے اس اجارہ اور خراج کی اس بھاری رقم سے جو قوت و اقتدار اس جماعت کو دیگر افراد قوم پر حاصل ہے اُس کا بیان آگے چل کر کیا جائے گا۔

(۳) "سرمایہ" اور "زمین" کے مندرجہ بالا اجارہ کی وجہ سے ہی بڑی حد تک مختلف طبقوں کی آمدنیوں میں تفاوت پیدا ہوا اور وہ صورت حال نمودار ہوئی جس سے ف ۱۹۰۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق نہ صرف یہ ہوا کہ قوم کی نصف آمدنی ۱/۹ آبادی کا بارہ

فی صدی حصہ قابض ہوگیا ـــ بلکہ ½ حصۂ آبادی کو ½ حصۂ آمدنی پر مکمل تصرف و اختیار حاصل ہوگیا - اور باقیماندہ کثیر آبادی گرسنگی کی سطح پر رہ کر ایام گزاری پر مجبور ہوگئی - اور اس میں ذرا سی بھی سکت باقی نہ رہی کہ اپنے حقوق کی حفاظت، اور اپنی زندگی کے راہ عمل کے انتخاب میں ذرا بھی ہاتھ پاؤں ہلا سکے -

اب اس حصۂ مضمون میں ہم یہ دکھلانے کی سعی کریں گے کہ املاک، دولت، "سرمایہ" اور آمدنی کی، اس غیر مساوی تقسیم کا نتیجہ تمدن انسانی پر کس شکل میں ظاہر ہوتا ہے - چونکہ ممالک متحدہ برطانیہ کے اعداد و شمار نمونے کے طور پر ہمارے پیش نظر ہیں اس لئے ہم بڑے پیمانہ سے اس حصۂ مضمون کے لئے بھی ثبوت فراہم کریں گے - سب سے اوّل ہم اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ممالک متحدہ برطانیہ کی تمام آمدنی اور ذخیرۂ دولت پر صرف چند افراد کو مکمل اقتدار حاصل ہونے سے، اس ملک کی قومی ترقی پر بہت زبردست اثر پڑ رہا ہے - اس اقتدار کے معنی یہ ہیں ـــ کہ آبادی کا ایک کثیر حصہ بلکہ کل قوم صرف اُن راہوں پر گامزن ہوکر ترقی کر سکتی ہے - جن کے تعین کا اختیار آبادی کے صرف ایک عشر عشیر حصہ کو حاصل ہے - ملک پر صحیح معنوں میں حکومت، دولت ـ کیا کرتے ہیں - اور ویسٹ منسٹر (Westminster) کی برائے نام حکومت محض اُن کے احکامات کو خفیف سی رد و بدل کے ساتھ عملی جامہ پہناتی رہتی ہے - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دس لاکھ افراد، ملک کی ایک تہائی آمدنی پر اختیار رکھتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے ہیں کہ ان دس لاکھ افراد کو آبادی کے ایک تہائی حصہ یعنی ایک کروڑ ۵۰ لاکھ افراد کی زندگی پر مکمل حکومت حاصل ہے - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ۵۰ لاکھ آدمی ملک کی نصف آمدنی پر قابض ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے ہیں کہ یہ ۵۰ لاکھ آدمی ملک کی نصف آبادی کی قسمتوں کے مالک ہیں کیونکہ دولت اور آمدنیوں کے صرف سے اشیاء کی مانگ زیادہ ہوتی ہے اور اسی نسبت سے مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

تمام سلسلۂ روزگار دولت اور آمدنیوں کے صرف کرنے کے طریقوں سے وابستہ ہے - اور انھیں طریقوں پر تمام تر، افراد قوم کے مشاغل، ان کے اخلاق اور سیرتوں کا انحصار ہوتا ہے - اگر دولت اچھی اور مفید چیزوں کے حاصل کرنے میں صرف کی جاتی ہے - تو مزدور شریف پیشوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اگر دولت و آمدنی بری اشیاء کی فراہمی کے لیے وقف ہو تو اس صورت میں محنت کرنے والے گمراہ، ذلیل اور خوار ہو جاتے ہیں -

اگر امراء کی محدود جماعت کی ذاتی نفس پرستیوں اور تعیشات کے اثرات صرف اُن ہی تک محدود ہوتے تو قومی نقطۂ نگاہ سے یہ بات کچھ زیادہ لائق اعتنا نہ ہوتی - مگر بدقسمتی سے یہ اثرات ایک ساکت و پُرعفونت تالاب کی مانند نہیں ہیں جن سے بچ کر ہم نکل سکتے ہیں بلکہ یہ ایسے گندے دریا کی مانند ہیں جو قوم کی ایک کثیر حصہ آبادی کے درمیان سے ہوکر گذرتا - اور اپنے راستہ کی ہر چیز کو ناپاک اور غلیظ کر دیتا ہو - یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ایماندار مزدور اُن برائیوں کی نقل کرنے سے باز رہے جو بے فکری اور بے کاری سے پیدا ہوتی ہیں - لیکن اس کا انتہائی بلند اخلاقی معیار اُسے اپنی مردانگی کو ایسی بیکار چیزوں کے پیدا کرنے میں ضائع کرنے سے جن کی پیداوار اُس کی آمدنی کا واحد ذریعہ ہیں اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا - اس کو چاہے اس بات کا علم ہو یا نہ ہو لیکن یہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ اس کے گاڑھے پسینہ کی پیدا کی ہوئی اشیاء محض ایک آنی اور وقتی لذت اور سرائی کیفیت کے حاصل کرنے کے معاوضہ

میں صرف کردی جاتی ہیں۔ اور اس کے ہاتھوں کی لاثانی مہارت کے نمونے ایک غیر ملکی شخص کے پاس اُن نکمی گردیدہ زیب اشیاء کی قیمت کے طور پر چلے جاتے ہیں جو کسی امیر کے دل کو اپنی طرف ذراسی دیر کے لئے لبھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ساؤتھ ویلز کا وہ نادر دخانی کوئلہ جو معدنوں کے شکم سے، خون اور آنسوؤں کی قیمت ادا کرکے سطح زمین پر کھینچکر لایا جاتا ہے وہ فرانس کو صرف ریس کی موٹروں کے بدلے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر شہد کے چھتے میں چند ایسے کاہل اور نکمے بھی ہوتے جنھیں کل جماعت کی محنت پر کوئی اختیار نہ ہوتا تو یہ بات کچھ زیادہ قابل ملامت نہ ہوتی۔ لیکن جب ان نکموں میں سے ہر ایک اپنے اخراجات اور صرف دولت کے ذرایع سے، ہزاروں مزدوروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی قدرت رکھتا ہے تو یہ تمام قوم کے لئے سخت فکر و اندیشہ کی بات ہے۔

مزدوروں کے گروہ میں ایک طبقہ تو وہ ہے جس کے متعلق آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی صرف امرا کی خدمت کے لئے وقف کئے ہوئے ہے۔ مثلاً خدمتگار، سائیس، باغبان، خانساماں، قیمتی کپڑے سینے والے درزی، قیمتی فرنیچر بنانے والے کاریگر، ہوٹلوں کے ملازم، شہروں اور تفریحی مقامات میں امرا کے مکانات کے قریب بہت سے اسی قسم کے رہنے والے اشخاص، بہت سے تاجر، اُن کے معاون و مددگار، اور دوسرے کام کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک طبقہ مزدوروں کے گروہ میں ایسا ہے۔ جس کے متعلق اتنی ہی آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غربا کی خدمت ان کا ذریعہ معاش ہے۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے دکاندار، پرچونی والے، ایسے مزدور اور منشی جو غربا کی انجمنوں، اداروں، کتب خانوں، میونسپلٹی کے ٹرموے، پبلک باغات اور دوسری اسی قسم کی خدمات پر مامور ہیں۔ لیکن ان دونوں طبقوں کو چھوڑ دینے کے بعد اکثر پیشہ وروں کے متعلق اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک خاص پیشہ ور غربا کی خدمت پر مامور ہے یا امرا کی سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر صنعت و تجارت کو چاہے وہ کسی قدر مفید عوام الناس کے لئے کیوں نہ بیان کی جائے، اپنی پیداوار کا بہترین حصہ، امرا کے جام تعیش کے بھرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کے ۱۳ لاکھ معمار، ۱۴ لاکھ دھاتوں کا کام کرنے والے انجنیر اور جہاز بنانے والے، ۱۳ لاکھ کپڑے بننے والے، ۱۳ لاکھ کپڑا سینے والے اور تمام دوسرے اشخاص جو بظاہر "مفید" صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ اُن سب کو اپنی پیداوار کا ایک کثیر حصہ امرا کے اسباب تعیش میں ضایع کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنی پیداوار کا صرف ایک قلیل حصہ وہ غربا کی ضروریات کے پورا کرنے میں پیش کر سکتے ہیں۔ امیر نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ اپنے احکام جاری کرتے ہیں۔ اور صنعت و تجارت کو ان کی تعمیل اور بجا آوری کے لئے دوڑنا پڑتا ہے۔ برکشائر کی وہ اینٹیں جن سے زراعتی مزدوروں کے لئے اگر جھونپڑے تعمیر کئے جاتے تو سینکڑوں خاناں برباد اشخاص کو سردی اور بارش کی تکلیف سے نجات ملتی سرے (Surrey)، روانہ کی جاتی ہیں تاکہ وہاں ایک بھدا اور بے ڈھنگا دیہاتی محل، فن تعمیر کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھکر، گلستان انگلستان کی پیشانی کو داغدار کرنے کے لئے تعمیر کیا جا سکے۔ لنکاشائر کی محنت اور کلیولینڈ (Cleveland) کے عرق پیشانی کے معاوضہ میں، سونڈن کا فر (fur) اس آدمی کے دمویر

گیارہویں، بارہویں، وسیع کمرۂ خواب کی چھت پوشی کے لئے منگایا جاتا ہے۔ جس کے یہاں اس کی اولاد سے زیادہ کمرے ہیں۔ اور مہمانوں سے زیادہ ملازم۔ اس کے مقابلہ میں ہمیں مردم شماری کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان اور ویلز میں سنہ ۱۹۰۱ء میں ۳۲ لاکھ ۱۶ ہزار ۵۲۲ مکانات ایسے تھے جن میں کمروں کی تعداد پانچ سے کم تھی۔ ان مکانات میں ۱۵۹۶۶۶۴ تو ایسے تھے جن میں صرف چار کمرے تھے۔ ۷۷۹۹۹۲ ایسے تھے جن میں صرف تین کمرے تھے، ۶۵۶۲۰۳ ایسے تھے جن میں صرف دو کمرے تھے اور ۲۵۱۶۶۰ ایسے تھے جن میں صرف ایک کمرہ تھا۔ پھر جب ہم مشین پر کام کرنے والوں، بجلی کے کاریگروں، کپڑے بننے والوں کرگھوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی محنت پر غور کرتے ہیں تو گو بظاہر یہ سب ایسے پیشوں میں مصروف نظر آتی ہیں جن سے عامۃ الناس کو فائدہ پہونچنے کی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُس دولت میں سے جو وہ پیدا کرتی ہیں کثیر حصہ صرف چند محدود اشخاص کی آسائشوں میں اضافہ کرتا ہے۔ اور ایک قلیل و حقیر حصہ ان لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے جن کی تعداد اسقدر کثیر ہے کہ اگر انہیں کل قوم کے نام سے موسوم کیا جائے تو ہر طرح مناسب ہے۔ صرف روئی کی صنعت کی مثال لیجئے۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۵۸۲۰۰۰ مزدور (۱۷۲۰۰۰ مرد ۴۱۰۰۰۰ عورتیں) قوم کی ابتدائی ضرورت کی چیزوں کے پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ۱۶۰۰۰۰۰۰۰ ہنڈریڈ ویٹ روئی خام کے ذریعہ سے ۱۲ کروڑ پونڈ کی مالیت کا کپڑا تیار کرتے ہیں۔ لیکن اس کی ذرا سرگزشت تو سنیئے۔ کیا اس کو، کپڑے پیدا کرنے والے لوگوں کے ہم قوم استعمال کرتے ہیں؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے نہیں۔ ۱۲ کروڑ پونڈ کی مالیت کے کپڑے میں سے ، ۱۰ کروڑ کا کپڑا غیر ممالک کو برآمد کر دیا جاتا ہے اور صرف ۲ کروڑ کی مالیت کا کپڑا ملک کے ۴ کروڑ ۰۴ لاکھ آدمیوں کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیس چالیس لاکھ پونڈ کا کپڑا باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ فی کس صرف دس شلنگ کا سوتی پارچہ ممالک متحدہ برطانیہ کی آبادی کے حصہ میں آتا ہے۔ پھر کیا سچ ہو سکتا ہے کہ ممالک متحدہ برطانیہ کی آبادی کو ہر سال صرف دس شلنگ فی کس نئے سوتی کپڑے بنانے کی ضرورت ہوتی ہو؟ یہ ظاہر ہے کہ یہ بات سچ نہیں ہو سکتی سوت سے قمیض، بنیان، بلاؤز، رومال، موزے، پلنگ کی چادریں، تولیہ، جھاڑن، لیسیں، لیس دار پردے، تکیوں کے غلاف، مرسرائیز کپڑے رنگدار چھپے ہوئے کپڑے اور سینکڑوں ہزاروں دوسری قسم کے کپڑے بنتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کی آبادی کا کثیر حصہ اس قدر غریب ہے کہ سالانہ صرف دس شلنگ فی کس کا سوتی کپڑا وہ اپنی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے خرید سکتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کی ضروریات کم ہیں۔ ضروریات تو کثیر ہیں لیکن اُن کے ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برطانیہ کی روئی کی صنعت کو لاکھوں گٹھے خام روئی کے اور درکار ہوتے جس کے ذریعہ سے اول تو وہ اپنے ملک کی پوری مانگ کو مہیا کرتا۔ اور بعد ازاں غیر ملکوں کو اپنی دوسری ضرورتکی چیزیں حاصل کرنے کے لئے برآمد کر سکتا۔ یہی صورت حال کم و بیش اونی کپڑے کی بھی ہے۔ سرد ملک ہونے کی وجہ سے اس کی مانگ کی ترقی کا امکان اور بھی زیادہ ہے جوتوں کی صنعت پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ میں سنہ ۱۹۰۶ء میں، جب کہ لیسٹر Leicester نارتھمپٹن Northampton اور دوسری جگہوں میں جوتے کے کاروبار میں سرد بازاری کی شکایت کی جا رہی تھی۔ اور

بے روزگاری کی شکایت عام تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ لیسٹر کے لئے اب جوتوں کے علاوہ کسی اور دوسری صنعت تلاش کرنے کی ضرورت ہوگی، برطانیہ میں کم سے کم ۱۰۹۰۰۰۰۰ جوڑی جوتوں کی کھپت ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ ۷۰ لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ گھرانوں کو جوتا خریدنے کے ذرائع کی کمی کا احساس تھا، تیس چالیس ہزار امیر گھروں کے آدمی اُن ذرائع کو لغویات اور مہملات میں ضائع کر رہے تھے اور مزدوروں کو حکم دے رہے تھے کہ جوتوں کی تجارت چھوڑ کر، اُن صنعتوں کی طرف توجہ کریں جن سے اُنکے اسباب تعیش حاصل ہو سکیں۔

مردم شماری کے اعداد و شمار سے، عیش پرستی کا اندازہ لگایا جانا ممکن ہے۔ ورنہ ہمیں ۔۔۔۔۔۔۔ اُن لاکھوں آدمیوں کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی جو نام کو تو مفید پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اُن کی محنت امرا کی خاطر، بالکل برباد اور ضایع ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۸ر فروری ۱۹۰۵ء کو کنگس بنچ ڈویژن میں ایک لکھ پتی نے جو سرمایہ داروں کے حلقہ میں کافی معروف تھا، ویسٹ اینڈ کے ٹھیکہ داروں کے ایک فرم پر، ایک مقدمہ ہرجانہ کا دائر کیا۔ مقدمہ کے واقعات یہ تھے۔ کہ جولائی ۱۹۰۳ء میں اس نے ایک پارٹی دی۔ جس میں ناچ اور طعام شب کا بندوبست کیا اور مدعا علیہ کو گروسوینر اسکوائر ([illegible]) میں ایک عارضی کمرۂ طعام شب اس موقعہ کے لئے بنانے کا حکم دیا۔ اس کی ہدایات یہ تھیں کہ "خرچ کی بالکل پروا نہ کی جائے"۔ اس عارضی عمارت میں بجلی لگائی گئی جس کی وجہ سے یا کسی اور سبب کی بنا پر، مکان میں آگ لگ گئی اور یہ عارضی مکان، اپنے مقررہ وقت سے چند گھنٹے پیشتر جل کر ضایع ہو گیا۔ اس کی بنیاد پر ہرجانہ کا دعوےٰ کیا گیا جو خارج ہوا اور جوری نے ٹھیکہ داروں کے مطالبۂ محنت کو بحال رکھا۔ ہمیں اس مقدمہ کے واقعات اور فیصلہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ اس عارضی کمرۂ طعام شب کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اور جس کے لئے خرچ کی طرف سے بے پروا رہنے کا حکم تھا، وہ اعداد و شمار کے رجسٹروں میں، پیشے کے کن خانوں میں درج کئے جاتے ہیں۔ ہمیں بلا کاوش کے یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ ان لوگوں کا اندراج ان خانوں میں ہے۔ جن کے پیشے مفید تصور کئے جاتے ہیں مثلاً

عمارت کے ٹھیکہ دار   بجلی کے ٹھیکہ دار

بڑھئی۔ نقاش۔ آبرسانی نہر کے کام کرنے والے

مزدور وغیرہ وغیرہ

واقعہ یہ ہے کہ ان معزز پیشوں کی محنت و مہارت، لکھ پتی سرمایہ دار کے حکم سے بالکل ضایع و برباد کر دی گئی۔ وقت، محنت اور میٹیریل کے اسی قدر صرف کے بعد جس قدر کہ اس عارضی کمرۂ طعام کی تعمیر میں صرف ہوا، یہ بالکل ممکن تھا کہ یہ لوگ دو تین خاندانوں کے لئے، آرام دہ اور خوبصورت گھر بنا دیتے جو ان کی تمام زندگی کے لئے کافی ہوتے۔ اگر انھیں ایک امیر کی وقتی خواہش کی تعمیل اور ایک غریب خاندان کی فراہمی مکان کی سعی میں انتخاب کی آزادی ہوتی تو یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ وہ کس بات کو پسند کرتے لیکن انھیں انتخاب پر اختیار نہیں تھا۔ اگر تحقیق کی جائے گی تو یہ ثابت ہوگا کہ وہ اُمرا کے گھروں میں اس قسم کے کام

کرسنانے کے لئے ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ عامۃ الناس کی منفعت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اُن کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ صرف چند امرا کی سنک یا وقتی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنی عمریں گذار دیتے ہیں۔ اس طرح یہ سرمایہ دار (الف) مزدور (ب) کو اپنی مہارت و محنت برباد کرنے کا حکم دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ (ج) اور (د) مزدوروں کو یہ حکم دیتا ہے کہ جب تک (ب) اپنی مہارت و محنت ضائع کرتا رہے۔ اور اپنی طرف سے، معاوضہ میں اُن کے لئے کوئی مفید چیز بنانے سے معذور رہے، وہ اُس کے گذر اوقات کا بندوبست کریں۔

اسی قسم کی ایک دوسری مثال ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک مقدمہ نے پبلک کی توجہ اپنی طرف بہت زیادہ مائل کرلی تھی۔ اس میں ویسٹ اینڈ کی ایک کپڑے تیار کرنے والی کارخانہ دار پر جرمانہ اس جرم کی پاداش میں کیا گیا تھا کہ وہ کپڑے سینے والی لڑکیوں کو غیر قانونی اوقات میں کام کرنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔ اوس کی طرف سے عذر یہ پیش کیا گیا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ ایک امیر خاتون، بہت کم مہلت دینے کے بعد ایک ــــ ایسی فراک کے تیار کرنے کا حکم دیتی تھی جسے وہ اسکاٹ (ascot) میں پہن سکے۔ اس مقدمہ پر اخبارات میں بہت تنقید و تبصرہ کیا گیا۔ اس کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ اُسی زمانہ میں ایک ڈرامہ کھیلا جارہا تھا جس میں اسی قسم کے ایک واقعہ کا خاکہ اُڑایا گیا تھا۔ تنقید کے انداز میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ تھی۔ وہ یہ تھی کہ تبصرہ کرنے والے وضع پرست خاتون کو اس وجہ سے ملامت کرتے تھے۔ کہ وہ عین وقت کے وقت فراک سینے کی فرمایش کرتی تھی۔ اور اُسے کاریگروں کی بے آرامی اور تکلیف کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں تھا۔ لیکن جرم کی سنگینی فی الحقیقت اس بات پر ختم نہیں ہوتی۔ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُسے اس قسم کے فراک تیار کرانے کی ہی کیا حاجت تھی یہ جرم نہ تو فیکٹری اور ورکشاپ کے قانون کی زد میں آسکتا ہے نہ کسی اور قانون کے۔ مگر دنیا کے امیر ترین ملک میں، وسیع ترین افلاس و تنگ حالی کا بنیادی سبب دراصل یہی چیز ہے۔ کیونکہ یہ مخصوص اسکاٹ فراک جس کی قیمت پچاس گنی سے کم نہیں ہوسکتی اور جو صرف ایک دفعہ پہننے کے بعد علیحدہ کردینے کے لئے تیار کرایا گیا تھا۔ ہمارے سامنے مکمل نمونہ زندگی کی اس گمراہی اور محنت کے اس اسراف کا پیش کرتا ہے جو قومی آمدنی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم سے معرض وجود میں آتا ہے۔ ہر ایسے مخصوص اسکاٹ فراک کے معاوضہ میں جو ایک امیر عورت پہنتی ہے۔ چاہے وہ قانونی اوقات میں بنایا جائے یا غیر قانونی اوقات میں، سیکڑوں غریب عورتیں نیم برہنہ پھرنے کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اور لاتعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں جو زبردست البرٹ ہال خیراتی بازار منعقد کیا گیا تھا، اس میں ایک خطاب یافتہ امیر خاتون ایک ایسا پُر تکلف لباس پہن کر آئی تھی۔ جس کی تیاری کی تکمیل گزشتہ شب کو رات کے گیارہ بجے، اُن نوجوان عورتوں نے کی تھی جن کی مالی حالت اس قدر سقیم تھی کہ بہترین تندرستی و بہترین خوش قسمتی بھی اونھیں چند سال کے بعد، بیماری اور کمزوری کی حالت میں دربدر بھیک مانگنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کو اگر دیکھا جائے تو عارضی کمرۂ طعام شب کے کاریگروں کی طرح یہ لڑکیاں بھی ایسے پیشوں میں مصروف سمجھی جائیں گی۔ جن سے عوام کو منفعت حاصل ہوتی ہے

لیکن فی الواقع ان کو اُجرت جس کام کی ملتی ہے وہ یہی ہے۔ جس کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ " خالی بنیا کیا کرے، اِس کوٹھی کا ناج اُس کوٹھی میں دھرے"

جب امرا، غریبوں کے اسباب حیات کو ضائع کریں گے تو ظاہر ہے مفید کاروبار کو زوال ہونے لگے گا۔ ایک امیر مفید اشیا کی ایک محدود مقدار اپنے صرف میں لا سکتا ہے۔ اس کے بعد، دولت کی افراط کی موجودگی میں، اسے دوسری تفریحوں کی حاجت ہوتی ہے۔ اور احکامات صادر ہونا شروع ہوتے ہیں اور فرمائشوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ جن کی وجہ سے غیر مفید روزگاروں کو فروغ ہوتا ہے۔

اب آیئے دوسری طرف غربا کی حالت کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ وہ اشیا کی فراہمی پر کیا صرف کرتے ہیں۔ لندن میں مسٹر چارلس بوتھ (Mr. Charles Booth) نے اور یارک نے مسٹر راؤنٹری (Rowntree) نے ہمارے لئے کافی مسالہ اس کے متعلق فراہم کر دیا ہے۔ مسٹر بوتھ نے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ۳۰،۷ فی صدی یعنی تقریباً ایک تہائی آدمی لندن میں افلاس کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یارک میں جسے ایک زراعتی شہر کہا جا سکتا ہے اور اور جو لندن کی طرح صنعتی اور تجارتی مرکز نہیں ہے۔ مسٹر راؤنٹری کی تحقیق سے پتہ ثابت ہوا کہ ۷،۲۳۰ آدمی یعنی ۱۵½ فی صدی حصہ مزدور پیشہ جماعت کا اور دس فیصدی کُل یارک شہر کی آبادی کا حصہ " ابتدائی افلاس کے خط " سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس " ابتدائی افلاس کے خط " کا تعین پانچ افراد کے ایک ایسے خاندان سے ہوتا تھا جس کی آمدنی فی ہفتہ ۲۱ شلنگ ۸ پنس تھی اور جسے لگان یا کرایہ مکان کے طور پر ۴ شلنگ فی ہفتہ ادا کرنا پڑتے تھے۔ مسٹر راؤنٹری کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی تعداد جو اس خط سے محض برائے نام ہی اوپر تھے۔ یارک شہر میں ۱۲،۰۷۲ تھی۔ اس طرح کُل تعداد حاجتمندوں کی ۲۰،۳۰۲ یعنی ۲۸ فیصدی ہوتی ہے۔ مسٹر راؤنٹری نے مندرجۂ ذیل تین عنوانوں کے ماتحت اخراجات کی تقسیم کر کے " ابتدائی افلاس کے خط " کو مقرر کیا تھا۔ (۱) طعام (۲) لگان یا کرایہ (۳) پوشش، ایندھن اور دیگر ضروری اشیا۔ طعام میں انھوں نے ایسی غذائیں منتخب کی تھیں جن میں گوشت اور مکھن شامل نہ تھا اور چا ہفتہ میں صرف ایک بار رکھی تھی۔ یہ نظام خوراک اپنی کمی کے اعتبار سے اُس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جو انگلستان اور ویلز کے خیرات خانوں میں غربا کو دیا جاتا ہے۔ امداد باہمی والے اسٹوروں کی کمترین قیمتوں کے مطابق اس غذا کی لاگت ایک جوان اور بالغ کے لئے ۳ شلنگ فی کس اور بچوں کے لئے ۲¼ شلنگ فی کس ہوتی تھی۔ اِس طرح کُل خاندان کے لئے غذا کی لاگت فی ہفتہ ۱۲ شلنگ ۹ پنس ہوتی تھی۔ لگان و کرایہ ۴ شلنگ تھا۔ ان دو مدات کا خرچ اس حساب سے ۱۶ شلنگ ۹ پنس ہوا۔ بقیہ ۴ شلنگ ۱۱ پنس کپڑوں، ایندھن اور تمام دیگر ضروریات کے لیے وقف تھے۔

—— نقشہ کی شکل میں ان اعداد کو مندرجۂ ذیل طریقہ پر ظاہر کیا جا سکتا ہے:——

مسٹر راؤنٹری کے " ابتدائی افلاس کا خط "

	شلنگ	پنس
طعام پر خرچ	۱۲	۹
لگان کرایہ و محاصل	۴	۰
کپڑے جس میں جوتے بھی شامل ہیں	۲	۳
ایندھن	۱	۱۰
روشنی، اکھڑا دھونے کا سامان، فرنیچر، برتن وغیرہ وغیرہ	—	۱۰
کل	۲۱	۸

مندرجہ بالا نقشہ سے ظاہر ہوگا کہ شراب، تنباکو، اخبار، ڈاک کے ٹکٹوں اور دیگر ناگزیر اخراجات کے لئے کچھ بھی رعایت نہیں رکھی گئی۔ لیکن پھر بھی یارک کے ۱۵ فیصدی آدمی " ابتدائی افلاس کے خط " کے نیچے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جوتوں، کپڑوں، بنیانوں، ٹوپیوں، فرنیچر، شیشہ کے ظروف، چینی کے ظروف، برتنوں، پردوں، دھونے کے سامانوں، تیلوں اور گیسوں۔ ان سب ضروری اور ناگزیر چیزوں کے لئے صرف ۳ شلنگ ایک پنس فی ہفتہ یا یوں سمجھئے ۸ پونڈ سالانہ (یعنی ۲۴ شلنگ فی کس سالانہ) کا خرچ رکھا گیا۔ یہ معلوم کرکے ہمیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں رہتا کہ ۴۴،۰۰،۰۰۰ برطانوی آبادی کے لئے صرف ۲ کروڑ مالیت کے کپڑے کی مانگ لنکاشائر سے کی جاتی ہے۔

شہری مزدوروں کے اخراجات کے متعلق بورڈ آف ٹریڈ (Board of Trade) نے سنہ ۱۹۰۴ء میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے تھے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

جن کی آمدنی فی ہفتہ	تعداد خاندانوں کی	اوسط تعداد اولاد کی جو مکان پر رہتی تھی	اوسط ہفتہ وار آمدنی کا	اوسط مصارف غذا کے	غذا کے مصارف کے بعد آمدنی کی بچت
۲۵ شلنگ سے کم تھی	۲۶۱	۳/۱	۲۱ شلنگ ½۴ پنس	۱۴ شلنگ ¾۴ پنس	۶ شلنگ ¾۱۱ پنس
۲۵ شلنگ اور ۳۰ شلنگ کے درمیان	۲۸۹	۳/۳	۲۶ شلنگ ¾۱۱ پنس	۱۷ شلنگ ¼۱۰ پنس	۹ شلنگ ½۱ پنس
۳۰ اور ۳۵ شلنگ کے درمیان	۴۱۶	۳/۲	۳۱ شلنگ ½۱۱ پنس	۲۰ شلنگ ½۹ پنس	۱۱ شلنگ ۲ پنس
۳۵ اور ۴۰ شلنگ کے درمیان	۳۸۲	۳/۴	۳۶ شلنگ ¼۶ پنس	۲۲ شلنگ ½۳ پنس	۱۴ شلنگ ¾۲ پنس
۴۰ شلنگ سے اوپر	۵۹۶	۴/۴	۵۲ شلنگ ½ پنس	۲۹ شلنگ ۸ پنس	۲۲ شلنگ ½۴

جب ہم شہروں کے مزدوروں کا مقابلہ دیہاتی مزدوروں سے کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اُن بیچاروں کے پاس مکان پر صرف کرنے کے بعد اور بھی کم آمدنی بچتی ہے جس سے وہ اپنی دیگر تمام ضروریات اور آرام کی اشیاء کو فراہم کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۴۴۴۵۰۰۰۰ کی کل آبادی میں ۲ کروڑ اشخاص ممالک متحدہ برطانیہ میں ایسے ہیں جن کی کل مانگ اوپر اور نیچے پہننے جانے والے کپڑوں، ٹوپیوں، جوتوں، فرنیچر، چینی اور شیشہ کے ظروف، لوہے اور دیگر دھاتوں کے برتنوں اور دوسری آرام دہ اشیاء کے لئے نہایت کم ہے۔ مختصر آدمیوں کا زیادہ حصہ کھانے اور پینے کی اشیاء میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور مکان کا کرایہ، زمین کا لگان، ایندھن اور روشنی کا خرچ نکالنے کے بعد اُن کی سالانہ بچت صرف چند شلنگ کی ہوتی ہے۔ اور اس لئے ہمیں متعجب نہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ سوتی اشیاء کے لئے ملک کی اندرونی مانگ کیوں اسقدر کم ہے اور لیزلیسٹر کا میئر ([illegible]) کیوں اس بات کے لئے مضطرب ہے کہ زاید از ضرورت مزدوروں کے لیے کسی اور صنعت کو تلاش کیا جائے۔

مندرجۂ بالا تمام واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دولت کی تقسیم میں جو غلطی ہے اسی سے وہ غلطی رونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے آبادی کی تقسیم مفید اور غیر مفید، شریف اور غیر شریف پیشوں میں ہوتی ہے۔ برطانیہ کی آبادی کا بہت قلیل حصہ مکانات، سوتی اشیاء، جوتوں اور دیگر لازمی اور ضروری اشیاء کی فراہمی میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس کی آبادی کا بہت کثیر حصہ یا تو براہ راست اسباب عیش و تفریح کی پیداوار میں لگا ہوا ہے یا ایسے ضروری اشیاء کی پیداوار میں لگا ہوا ہے۔ جس کے تبادلہ میں غیر ممالک سے اسباب عیش حاصل کئے جا سکیں۔ جب کہ برطانیہ کے لاکھوں آدمی ضروری اشیاء اپنے لئے فراہم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں اسی وقت آبادی کا ایک قلیل حصہ تعیشات میں غرقاب نظر آتا ہے جس قدر محنت کی جاتی ہے اس سے مادی مسرت اور آرام سب کو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اسقدر محنت ضائع ہوتی ہے کہ آبادی کے صرف ۱/۴ حصہ کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

اب آئیے تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی دیکھ لیں۔ یعنی سرمایہ اور زمین کے چند ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے مزدوروں کو اور کیا نقصانات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ سب سے اوّل ہم بے روزگاری کو لیتے ہیں۔ جب ہم بے روزگاری، مزدوروں کی آمدنی اور سرمایہ داروں کے منافع کے اعداد و شمار کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں فوراً یہ بات معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ منافع کے اعداد میں ممالک متحدہ برطانیہ میں برابر ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۸ء تک بیشی نظر آرہی ہے۔ مزدوروں کی آمدنی میں بھی بیشی ضرور ہے لیکن وہ نسبتاً بہت کم ہے اور کبھی بیشی ہے تو کبھی کمی۔ اسکے مقابلہ میں مزدوروں کی جو ضرورت کی اشیاء ہیں اُن کی قیمتوں میں بھی برابر اضافہ نظر آتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو بیشی آمدنی میں ہے اس کی کسر اشیاء کی قیمتوں کی زیادتی میں نکل جاتی ہے اور فی الحقیقت مزدوروں کی واقعی آمدنی میں بجائے اضافہ کے ہمیں کمی نظر آتی ہے۔ ذیل میں ہم ۱۹۰۰ء کو ۱۰۰ تصور کر کے سرمایہ داروں کے منافع، مزدوروں کی آمدنی، اور ضروری اشیاء کی گرانی کے نسبتی فرق کو ظاہر کرتے ہیں:-

	منافع سنہ ۱۹۰۰ء کے مقابلہ میں فی صدی	اجرت سنہ ۱۹۰۰ء کے مقابلہ میں فی صدی	ضروری اشیا کی قیمتیں سنہ ۱۹۰۰ء کے مقابلہ میں فی صدی
سنہ ۱۸۹۳ء	۸۶٫۸	۹۰٫۱	—
سنہ ۱۸۹۵ء	—	۸۹٫۱	۹۳
سنہ ۱۹۰۰ء	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
سنہ ۱۹۰۸ء	۱۱۲٫۵	۱۰۱	۱۰۹

کساد بازاری کے سالوں میں اُجرت کے نرخ میں کمی کے علاوہ مزدور پیشہ جماعت کو دو اور طریقوں پر مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ (۱) کم وقت کام کرنے کا یعنی " short time " کی وجہ سے اور (۲) برخاستگی اور علیحدگی کی وجہ سے۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک کے ایسے مزدوروں کے اعداد و شمار دیکھنے سے جو کسی مزدوروں کی انجمن کے رُکن ہیں۔ اور اس لئے جن کے ساتھ ناانصافی کرنے کی ہمت سرمایہ داروں کو ذرا کم ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سالوں میں ہر مہینہ کے آخر میں ۲٫۷ فیصدی سے لے کر ۹٫۵ فی صدی تک ایسے مزدور تھے جنھیں بے روزگاری کی وجہ سے اپنی انجمنوں سے امداد لینا پڑی۔ اس میں وہ لوگ شامل نہ تھے۔ جنھیں بیماری، اسٹرائک کی حالت میں امداد دی گئی۔ شارٹ ٹائم یعنی کم وقت کام کرنے کے اعداد و شمار نہیں رکھے گئے، لیکن جو اعداد و شمار ہیں اُن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کساد بازاری کے دنوں میں نہایت بے دردی سے مزدوروں کو نقصانات برداشت کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اور خوشحالی کے ایام میں بھی ایک کافی تعداد بے روزگاروں کی باقی رہتی ہے۔ جن کے پاس کوئی ذریعہ اپنے گذر اوقات کا نہیں ہوتا۔

مگر جب ہم سرمایہ داروں کے منافع کے اعداد و شمار کے متعلق جزئی تفصیلات کی جانچ اندرونی محاصل کے کمشنروں کے ریکارڈس سے کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح کساد بازاری کے ایام میں بھی منافع کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اور کس طرح کساد بازاری کی تمام مصیبتیں ان لوگوں کے سر تھوپی جاتی ہیں جو برطانوی آبادی کے ایک کثیر حصہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ان سالوں میں جب کہ منافع کافی کثیر دکھلایا گیا ہے خفیف سی کساد بازاری کے آثار پر فوراً لاکھوں مزدور بے شرمی اور بے دردی کے ساتھ علیحدہ کر دیئے گئے اور اسی کا کوئی خیال نہ کیا گیا کہ ان کی گذر اوقات کا کیا ذریعہ ہوگا۔

بے روزگاری کے ان اعداد و شمار کے بعد جو مزدور کی سالانہ اُجرت کو اس کی ظاہرا اُجرت کے مقابلہ میں گھٹا دیتے ہیں۔ اب ہم دیگر ایسے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن سے مزدوروں کی آمدنی پر اثر پڑتا ہے یعنی اتفاقی حادثات اور بیماریاں

جو محض ایک خاص پیشہ میں کام کرنے کی وجہ سے مزدوروں کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اور جن کا یا تو کوئی معاوضہ نہیں ملتا یا ملتا ہے تو اُن کے نقصان کے مقابلہ میں بہت حقیر ہوتا ہے۔ یہ اعداد و شمار صرف ان کارخانوں کے متعلق ہیں جن کا معائنہ کارخانوں کے انسپکٹر نے کیا۔ لیکن چونکہ انسپکٹر کم ہیں اور کارخانے زیادہ اس لئے زیادہ تر اس میں کارخانہ داروں کے دئیے ہوئے اعداد و شمار ہی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

فیکٹریوں اور ورکشاپوں میں جو اتفاقی حادثات سنہ ۱۹۰۸ء میں ہوئے انکا نقشہ

نوعیت نقصان	تعداد
مہلک نقصانات	۱۰۴۲
ہاتھ یا بازو کا نقصان	۱۲۶
ہاتھ کے حصہ کا نقصان	۳۳۰۴
ٹانگوں اور پاؤں کے حصہ کا نقصان	۷۸
ہڈی ٹوٹنے سے نقصان	۱۶۸۰
بینائی کو نقصان	۴۴
سر اور چہرے کو نقصان	۵۱۰۹
جلنے اور جھلسنے سے نقصان	۵۶۱۷
دوسرے نقصانات	۲۴۹۰۲
کل نقصانات	۴۱۹۰۱

فیکٹریوں اور ورکشاپوں میں پیشہ کی وجہ سے امراض سنہ ۱۹۰۸ء

بیماری	تعداد مریضاں	تعداد اموات
سیسے کا زہر	۶۴۶	۳۲
پارہ کا زہر	۱۰	—
فاسفورس کا زہر	۱	—

سنکھئے کا زہر	۲۳	۱
اینتھراکس	۴۷	۷
سیسے کا زہر مکانات رنگنے والوں میں	۲۳۹	۴۴
میزان	۹۶۶	۸۴

سنہ ۱۹۰۸ء میں کوئلے کی کانوں اور دوسری کانوں میں جو اموات اتفاقی حادثات اور کانوں کے پھٹ جانے سے ہوئیں۔ اُن کی تعداد ۱۳۴۷ ہے اور زخمی ہونے والے اشخاص کی تعداد ۱۴۸۰۶۰ ہے۔ ان اعداد میں ۱۴۴ ایسے بچوں کی اموات بھی شامل ہیں جو زمین کے نیچے نیچے کام کرتے ہوئے مارے گئے۔ ان معدنوں میں جس قدر لڑکے لڑکیاں اور عورتیں کام کرنے کے لئے رکھی جاتی ہیں اُن کی تعداد سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۳۴۴۲۲ لڑکے اور ۱۴۵۸ لڑکیاں بیان کی گئی تھی۔ ریلوے کی وجہ سے جو حادثات ریلوے ملازموں کو ہوتے ہیں ان کا اوسط فی ہفتہ مجروحوں کا ۲۵۰ اور ہلاک ہونے والوں کا ۱۰ ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم مندرجہ بالا تمام حادثات و امراض کا خلاصہ درج کرتے ہیں:-

صنعتی حادثات اور امراض کے متعلق اعداد و شمار سنہ ۱۹۰۸ء میں
تعداد ان مزدوروں کی جنھیں نقصان پہونچا یا فوت ہوئے۔

	مارے گئے یا مرض کی وجہ سے مرگئے	زخمی ہوئے یا بیمار رہے
فیکٹریوں اور ورک شاپوں میں حادث	۱۰۴۲	۱۲۱۱۱۲
معدنوں اور کانوں میں حادثات	۱۰۴۳	۱۴۸۰۶۷
ریلوے کے حادثات	۴۳۲	۲۴۱۸۱
جہازوں کے حادثات :-		۳۷۸۱
(۱) تجارتی جہازوں پر	۹۹۹	۳۹۲
(۲) ماہی گیری کی کشتیوں پر	۲۱۲	۳۷۸۱
انجنیرنگ ورکس میں حادثات	۳۲	
پیشوں کے امراض	۸۴	۹۹۶
میزان	۴۲۳۸	۲۹۹۷۲۷

شہر ڈنڈی (Dundee) کے کارخانوں میں کام کرنے سے بچوں کی جسمانی ترقی پر جو اثر پڑا وہ ذیل کے نقشے سے ظاہر کیا گیا ہے :-

عمر	قد		وزن	
	ڈنڈی میں	عام طور پر	ڈنڈی میں	عام طور پر
گیارہ سے بارہ تک	انچ	انچ	پاؤنڈ	پاؤنڈ
(۱) لڑکے	۵۰	۵۳٫۵	۹۲٫۸	۷۲
(۲) لڑکیاں	۵۱٫۵	۵۳٫۰	۹۳٫۰	۶۹٫۱
چودہ سے پندرہ				
(۱) لڑکے	۵۴٫۰	۵۹٫۰	۷۰٫۵	۹۲٫۰
(۲) لڑکیاں	۵۵٫۷	۵۹٫۷	۷۷٫۵	۹۹٫۱

دق اور پھیپھڑے کے امراض سے جو اموات شہر بلفاسٹ (Belfast) میں ہوتی ہیں اُن کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سنہ ۱۹۰۲ء کی رپورٹ میں وہاں کے میڈیکل افسر نے کہا کہ ۲۹۱۱ اموات ان اسباب سے ہوئیں۔ اور اس کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ لوگ ایسے پیشوں میں مصروف ہیں جہاں انھیں غیر تندرست ماحول میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر ارتقائے تمدن کے معنی اس دورِ جمہوریت میں، عامۃ الناس کی جسمانی، دماغی، اخلاقی، جمالیاتی اور روحانی ترقی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں، تو پھر مندرجۂ بالا واقعات اور حالات کی روشنی میں ہمیں بتلایا جائے کہ کس قدر حصۂ آبادی کے لئے دولت کی موجودہ غیر مساوی تقسیم نے ان ترقیوں کے مواقع کو فراہم کیا ہے؟ کتنے آدمی ایسے ہیں جو بہیمیت کی سطح ذرا بلند ہو کر محض شکم پروری کو (اُن لوگوں سے قطع نظر کرکے جنھیں شکم سیری بھی حاصل نہیں ہے) اپنا مدعائے حیات بنانے کے مجبور نہیں ہیں؟ کتنے ایسے خوش نصیب ہیں جنھیں اپنی زندگی کو بہتر اور مکمل بنانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے جو اپنی جسمانی ترقی و نگہداشت کے ساتھ ساتھ علم و حقیقت، حسن و تناسب، رنگ و بو اور نغمہ و کیف کی روحانی اور اخلاقی لذتوں اور مسرتوں سے بہرہ ور ہو کر اپنی حیات میں تنوع اور تکمیل پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مارشل، جس نے اقتصادیات کے ماہرین کی صفِ اوّل میں جگہ پائی ہے۔ افلاس اور اُس کے عواقب اور نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "غریبوں کی ہلاکت کا سب سے بڑا سبب خود ان کی غربت ہے" افلاس کے معائب بیان کرتے ہوئے جارج برنارڈ شا، George Bernardshaw. حیات اور موجودہ ادارہ ہائے انسانی کا بے پناہ مبصر، ایک جگہ کہتا ہے کہ جب ہم ایک شخص

مفلس دیکھتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہوتے بھی وہ مفلس ہے تو ہوا کرے تو ہم اُن عواقب کو فراموش کر دیتے ہیں، جو ہماری اس بے توجہی اور لاپرواہی میں پوشیدہ ہیں۔ ہم جب ایک شخص کو مفلس رہنے دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اُسے کمزور، جاہل، امراض کا سرچشمہ، بدصورتی اور گندگی کی ایک زندہ تصویر بننے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم اُسے اس بات کا پروانہ دیتے ہیں کہ وہ کمزور ہڈی والے بچوں کی نسل بڑھائے۔ وہ بازار میں اپنی محنت کی اُجرت کم طلب کرے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس طریقہ پر کم اُجرت قبول کرنے پر مجبور کرے۔ وہ ہمارے صحت بخش شہروں کو اپنے غلیظ اور کم حیثیت مکانوں کے ذریعہ سے زہر اور جراثیم کا مخزن بنا سکے۔ اس کی لڑکیوں کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو گندے امراض میں مبتلا کر سکیں۔ اور اس کے لڑکے اپنے باپ کے افلاس کا انتقام اس طرح لیں کہ قومی مردانہ خصوصیات کو، مدقوق شکلیں بنا کر، بزدلی، شقاوت، منافقت، سیاسی نااہلیت اور ظلم اور کمی خوراک کے اور جسقدر بھی دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں ان سب میں تبدیل کر دیں۔"

ایک دوسری جگہ شا (Shaw) یہ سوال کرتا ہے کہ کیا افلاس ایک جرم ہے؟ اور اس کا جواب خود ہی دیتا ہے۔ سنگین ترین جرم۔ تمام دیگر جرائم اس کے مقابلہ میں محاسن ہیں۔ تمام دیگر بے عزتیاں اس کے سامنے عروج و عزت کے اعلے مراتب ہیں۔ افلاس بڑے بڑے شہروں پر ایک بلا کی طرح مسلط ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہیبت ناک بائیں پھیلتی ہیں۔ جو لوگ اس کو دیکھ، سن یا سونگھ سکتے ہیں۔ اُن کی روحیں فوراً مُردہ ہو جاتی ہیں۔ جسے ہم جرم کہتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ وہ صرف اسی قدر ہے کہ کہیں قتل ہو گیا۔ کہیں چوری، کہیں دھول دھپا ہو گیا کہیں گالی گلوج۔ ان سب کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہوتا۔ یہ زندگی کے معمولی امراض اور حادثات ہیں۔ لیکن لکھوکھا غریب، ذلیل، گندے، نیم گرسنہ، نیم برہنہ جو اشخاص ہیں وہ ہمارے جسم و روح کو برابر زہر دیتے رہتے ہیں۔ وہ ہیئت اجتماعی کی مسرتوں کو فنا کر ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادیوں کو قربان کر دیں اور ایسی غیر فطری سختیوں اور بے رحمیوں کی تنظیم کریں۔ کہ جن کی وجہ سے وہ ہمارے خلاف سر نہ ابھار سکیں۔ اور ہمیں بھی اپنے ساتھ قعر مذلت میں نہ گھسیٹ لیں۔ جرائم سے صرف بیوقوف ڈرتے ہیں۔ ہم سب کو جس چیز کا خوف ہے وہ افلاس ہے۔"

محمد عاقل ایم۔ اے۔ (علیگ)

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

(ایک شاعر کی الہامی پیشین گوئی)

ستمبر ۱۹۳۱ء کی اٹھارہ تاریخ ہے۔ طرابلس کے ایک قصبہ میں اطالوی افسران فوج کی ایک جماعت مصروف مشورہ ہے کہ عمر المختار کو جس نے طرابلس میں لواء حریت و استقلال بلند کیا تھا۔ اور جو بعد کو گرفتار ہو کر ان کے ہاتھ آگیا تھا۔ کیا سزا تجویز کی جائے۔

آخر کار، سزا تجویز ہو گئی، حکم سنا دیا گیا۔ اور یہ طرابلسی نوجوان مجمع عام میں بندوق کا نشانہ بنکر اپنے وطن پر قربان ہو گیا۔ یہ واقعہ بظاہر تاریخ کا بہت معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اندرون طرابلس عربی میں اسی واقعہ کے بعد اطالوی اقتدار پوری طرح قائم ہو سکا۔

اچھا اب آپ ولادت مسیح سے چھ صدی قبل کے زمانہ میں چلے جائیے۔ جب یونان کا سب سے بڑا شاعر و کاہن ارسطو زندہ تھا (یہ ارسطو اس ارسطو سے مختلف ہے جو حکیم و فیلسوف کے لقب سے مشہور ہوا)۔

ملک کے چند نوجوانوں نے مشورہ کیا کہ "ہیکل ڈلفی" میں جا کر دیوی کے سامنے نمایش کریں اور وہاں کاہنوں کے سردار سے التجا کریں کہ وہ مستقبل کے حالات بتائے۔

چنانچہ وہ ہیکل کے سب سے بڑے کاہن کے پاس گئے جس کا نام ارسطو تھا۔ اور جس کی شہرت ایک شاعر و کاہن کی حیثیت سے اس وقت تمام اکناف یونان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کی التجائیں سنکر معبد ڈلفی کا رخ کیا۔ اور مراسم عبادت کرنیکے بعد یہ وحی اس پر نازل ہوئی کہ:-

"اے ارسطو، اپنے احباب و اعزہ، اپنے ارادتمند اور ہی خواہ لوگوں کو جمع کر اور بحری سفر اختیار کر کے جنوب کی طرف جا اور وہاں جدید یونانی حکومت کی بنیاد ڈال"

چنانچہ ارسطو مع اپنے رفقاء کے ایک بڑی کشتی میں سوار ہوا۔ اور اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر راتوں کی تاریکی میں سمندر کے طوفانوں سے گزرتا ہوا۔ جنوب کی طرف نکل گیا۔ ایک زمانہ تک اسی بیم و رجا کی حالت میں سفر کرنے کے بعد کشتی شمالی

افریقہ کے کسی ساحل پر بعد دو مصر کے قریب پہونچ گئی - اور یونانی نوجوانوں کی یہ جماعت یہیں اتر پڑی، انھوں نے یہاں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام سیرنیا رکھا - اور اس طرح گویا ایک جدید سلطنت یونانی کا تخم انھوں نے بودیا - یہ واقعہ ۶۲۱ سال قبل مسیح کا ہے -

---

اس جماعت نے ارسطو کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے اُس کی اطاعت کا حلف اٹھایا - اور باتوس اس کا نام رکھا - ان لوگوں نے ارسطو سے یہ بھی درخواست کی کہ اب وہ شعر و شاعری ترک کر کے ان کے لئے قوانین وضع کرے -

لیکن یہ بادشاہ شاعر اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہا - اور جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ

" اے عزیزو، میں نے ایک خواب دیکھا ہے، اسے سن لو، میں نے دیکھا کہ دیوتا اپولون دفعتہ مجھ پر ظاہر ہوا - اور میرے ہاتھ میں ایک سبز شاخ دے کر بولا کہ اے ارسطو اب تو جلد مرنے والا ہے، اور جس سلطنت کی بنیاد تو نے ڈالی ہے وہ یونانیوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی - اس لئے سب کو جمع کر کے اطلاع دیدو کہ حکومت سیرنیا اُن کے ہاتھ سے نکل کر اہل روما کے پاس جائے گی، پھر اس پر ایک شرقی مغربی حکومت قابض ہوگی، اس کے بعد دوسری شرقی حکومت کے اقتدار میں چلی جائے گی، پھر تیسری شرقی حکومت کا تصرف قائم ہوگا - اس کے بعد پھر چوتھی شرقی حکومت کا زمانہ آئے گا ——— چنانچہ یہ پیشین گوئی جو خواب میں مجھ کو بتائی گئی ہے، تمام و کمال تم کو سنائے دیتا ہوں "

ارسطو یہ خواب بیان کر کے مرگیا -

ارسطو کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ اہل روما کی فتوحات تمام عالم پر ایک سیلاب کی طرح بڑھنے لگیں - اور افریقہ کی سلطنت سیرنیا بھی ان کے ہاتھ آگئی - اہل روما کے زمانہ میں اس سرزمین نے جس میں ترقی کی وہ اہل نظر سے مخفی نہیں

اس کے بعد اہل روما کا جب زوال شروع ہوا تو بازنطینی حکومت نے جو شرق و غرب کے گوشہ میں قائم تھی - اس پر قبضہ کیا، لیکن یہ قبضہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا - اور عربوں کی فوجوں نے تمام افریقہ، مصر، سیرنیا، ٹیونس، الجزائر، مراکش اور اندلس پر پرچم اسلامی لہرادیا ——— یہ دوسری پیشین گوئی تھی - ارسطو کی جو صحیح نکلی - عربوں نے اس پر قابض ہو کر اس کا نام قیروان رکھا تھا -

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت وسیع ہوئی تو عربوں کی جگہ انھوں نے لے لی - اور قیروان ولایت عثمانیہ میں میں شامل ہوگیا - یہ تیسری پیشین گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی -

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت ضعیف ہوئی تو اطالیہ نے طرابلس الغرب کے نام سے اپنی نو آبادی قائم کرنا شروع کی اور چاہا کہ سیرینایا قیروان تک اہل قیروان نے حکومت اطالیہ کا مقابلہ کیا۔ پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت قائم کریں۔ چونکہ دولت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اطالیہ کی اس خواہش کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اور قیروان کو خود وہیں کے باشندوں کے سپرد کرکے واپس آگئی۔

ہر چند اس کے بعد کامل دس سال تک اہل قیروان نے حکومت اطالیہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار وہاں اطالوی اثر قائم ہو ہی گیا۔ اور اس طرح یہ چوتھی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ تیسری بار مشرقی حکومت کے بعد پھر اہل روما کی حکومت وہاں ہوگی۔

اب صرف آخری پیشین گوئی باقی رہ گئی ہے کہ اہل روما کے پاس سے پھر یہ سلطنت کسی مشرقی حکومت کے پاس جائے گی۔ اب دیکھئے کہ یہ مشرقی حکومت کون ہے ؟

نیاز

شمیم

جناب فیاض علی صاحب بی۔ اے (علیگ) کا مشہور ناول جس میں جذبات فطری کی عکاسی معاشرت حاضرہ کی مصوری۔ نفسیات وحیات انسانی کی نقاشی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ زبان کی حلاوت۔ انداز بیان کی لطافت تحریر کی شوخی آمیز سنجیدگی۔ اور خیالات کی دل آویز ندرت کے لحاظ سے یہ ناول آپ اپنی مثال ہے۔ قصہ اسقدر دلچسپ اور جادو اثر ہے۔ کہ بغیر ختم کئے اوسے چھوڑنا محال ہے۔

دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صد ہا روپیہ صرف کرکے تیار کی گئی ہیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

(فرمایش کے ساتھ ۱۱ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔)

صحابیات

جس میں عبادت کی اٹھارہ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

منیجر نگار لکھنؤ

علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقائق

سیاروں میں امکان آبادی پر علمی گفتگو

کہا جاتا ہے کہ جس کائنات سے ہمارا تعلق ہے اس کا سمجھنا ایک شئے محال کا سمجھنا ہے۔ تاہم چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کرۂ ارض آباد ہے، اس لئے یہ غور کرنا کہ ہمارے ساتھ جو دیگر سیارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں ان میں بھی آبادی ہے یا نہیں۔ اور جس طرح ان جھلملاتے سیاروں کی رنگا رنگ روشنی سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اسی طرح وہاں کی آبادی ہمارے سیارہ کی تنویر سے لطف اٹھاتی ہے یا نہیں، بالکل فطری امر ہے۔

تقریباً دو ہزار چار سو برس گذرے کہ یونان کے حکما عظام میں سے ایک شخص حکیم اناکساغورث (Anaxagoras) نے یہی سوال کیا تھا کہ :— "کیا ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں ؟" اور ہر چند اس قسم کا ال اس وقت کرنا نہ صرف خطرناک بلکہ "ملحدانہ" سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ تمام اجرام سماوی دیوتاؤں اور دیویوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ بایںہمہ اناکساغورث نے جرأت و جسارت سے کام لے کر یہ سوال اٹھایا۔ اور خود ہی اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حکیم دیموقریطس (Democritus) نے بھی جرأت سے کام لے کر یہی بیان کیا کہ اس لانہایت فضا میں صرف ہماری ہی دنیا کا وجود نہیں ہے بلکہ بے شمار سیارے ایسے موجود ہیں جو دور دراز کے نظامہائے شمسی کے ارکان ہیں اور ان میں ایسی مخلوق آباد ہے جو ہم سے اعلےٰ عقل و فہم کی مالک ہے۔ لیکن چونکہ دیموقریطس ملک آلوتیا میں رہتا تھا جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر یونان کی ایک خوشحال اور آزاد خیال نوآبادی تھی، اس لئے اس کے اس بیان پر کوئی جرم قائم نہیں کیا گیا۔ البتہ حکیم اناکساغورث کی حالت بالکل جداگانہ تھی۔ وہ آزاد خیال آلوتیہ میں نہیں بلکہ ایتھنز میں رہتا تھا۔ اس لئے اسے فوراً پابزنجیر کرکے بحیثیت ملزم عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ مقدمہ چلا، جرم ثابت ہوا اور مجرم کے لئے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا گیا۔ لیکن ابھی اناکساغورث قید خانہ کے اندر پڑا ہوا شمشیر جلاد کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسے فرار ہو جانے کا موقعہ مل گیا، ۱۶۰۰ء میں راہب جیوردانو برونو کے متعلق بھی اسی قسم کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا۔ اور کامل سات سال تک محبوس رکھنے کے بعد راہب مذکور کی نسبت مقدس عدالت کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ پاپائے اعظم کے قصر کے نیچے اس ملحد کو زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ وہ زندہ جلا دیا گیا۔ لیکن جہاں وہ جلایا گیا تھا اسی جگہ "ملحد" کی ایک شاندار یادگار قائم ہے جس نے حقیقت و صداقت کی قربانگاہ پر اپنی جان قربان کی تھی۔ اس

مظلوم راہب پر علاوہ الحاد کے ایک الزام یہ بھی عاید کیا گیا تھا کہ دنیائے ارضی کے علاوہ کائنات میں اور بہت سے سیاروں کو بھی آباد بتاتا تھا۔ لیکن آج ہم کسقدر خوش قسمت ہیں کہ نہایت آزادی کے ساتھ بھروہی پرانا سوال اُٹھاتے ہیں کہ "کیا سیارے آباد ہیں؟" اور ہمارا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

اس وقت ہر شخص جانتا ہے کہ کرۂ زمین اور آٹھ دوسرے بڑے بڑے سیاروں تک روشنی و حرارت پہونچنے کا کوئی ذریعہ سوائے آفتاب کے نہیں ہے۔ جس کے گرد علاوہ نو بڑے بڑے سیاروں کے ۲۶ اقمار (satellites)، تقریباً ایک ہزار "سیارچے" (asteroids) بے شمار شہاب ثاقب لاتعداد دُمدار ستارے، گردش کرتے رہتے ہیں۔ آفتاب ایک روشن و منور کرُہ ہے جسکا قطر ۸۶۵۰۰۰ میل ہے یعنی زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا۔

زمین کے قطر کا اوسط ۷۹۱۶ میل ہے۔ رقبہ انیس کرور ستر لاکھ مربع میل اور حجم دو کھرب ساٹھ ارب مکعب میل اور اس کا وزن ۶۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن ہے (ایک ٹن = تقریباً ۲۸ من) زہرہ کا وزن زمین کے وزن سے باندازہ [illegible] زیادہ ہے۔ اور عطارد کا وزن زمین کے وزن کا صرف ۱/۲۰ ہے۔ وزن و حجم کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی سیارہ کا وزن ایک مقررہ مقدار سے کم ہوگا تو ہم سمجھیں گے کہ (بذریعہ کشش ثقل) ایسا کرُہ ہوا کی اپنی گرفت میں رکھنے کے قابل نہیں ہے جو ذی الارواح کے تنفس کے لئے ضروری ہے۔ یہی باعث ہے کہ چاند جسکا وزن زمین کے وزن کا صرف ۱/۸۰ ہے۔ اپنے لطیف ذرات ہوا زایل کرچکا ہے اور ناقابل آبادی ہوگئی ہے۔ یہی حال کرُہ مریخ کا ہے۔ کیونکہ وہ کرُہ زمین سے بقدر ۱/۹ کم ہے۔ مگر مشتری، زحل، یورانوس اور نیپچون کے متعلق یہ سوال نہیں ہوتا۔ اور یورانوس تو اتنا بڑا سیارہ ہے کہ اگر وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا تو اس کے اندر پندرہ کرۂ زمین سما سکتے تھے۔

عطارد جسکا مدار آفتاب سے بہت قریب ہے تمام سیاروں سے چھوٹا سیارہ یعنی اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ اور مدار آفتاب سے اس کا اوسط فاصلہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے یعنی جو فاصلہ آفتاب اور کرۂ زمین کے درمیان ہے۔ اس سے یہ فاصلہ بقدر ۵/۸ کے کم ہے۔ اس لئے اس پر حرارت آفتاب کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

زہرہ جس کا مدار عطارد و زمین کے درمیان واقع ہے آفتاب سے چھ کرور ستر لاکھ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ جو زمین کے فاصلہ سے بہ اندازہ [illegible] قریب ہے۔ اس لئے اس سیارہ کی سطح پر ہماری زمین سے تقریباً دو چند طاقت شمسی کا نزول ہوتا ہے۔ مگر چونکہ زہرہ اس طاقت شمسی میں سے بقدر ۹۰ فیصدی واپس کر دیتا ہے، اس لئے اس کی سطح پر زمین سے زیادہ گرمی نہ ہوتی ہوگی۔

سیارۂ مریخ کا قطر زمین کے نصف قطر سے کچھ یونہی یعنی تقریباً ۲۰۰ء۴ میل زیادہ ہے - اور جس کا مدار اس کے مرکز کو دورہ موڑ ہے ۰۰۰۰ء۱۴۱۵ میل (یعنی ہماری زمین سے ۵۰ فیصدی زیادہ) ہے - اس لئے حسب اصول ریاضیات فلکی اس سیارہ کو بہ نسبت زمین کے طاقت شمسی کا ۴/۹ حصہ ملتا ہے

سیارۂ مشتری ہمارے نظام شمسی کا ایک عظیم الشان سیارہ ہے - یہ زمین سے حجم میں تیرہ سوگنا بڑا ہے ، اور آفتاب سے ۴۸ کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے - یہ فاصلہ زمین و آفتاب کے فاصلہ کا پانچ گنا ہے -

زحل اور آفتاب کے درمیان اس سے دوچند فاصلہ (یعنی ۸۸ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہے) زحل اور یورانوس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جسقدر زحل اور آفتاب کے درمیان - اس کے بعد اگر ہم نیپچون تک پہونچنا چاہیں تو ہم کو ایک ارب میل کا فاصلہ اور طے کرنا پڑے گا - کیونکہ یہ سیارہ آفتاب کے گرد ۰۰۰۰۰۰۰ء۹۰۷ء۲ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے - اس عدد کو اگر دو سے ضرب کر دیا جائے تو ہمارے نظام شمسی کا قطر معلوم ہو جائے گا -

مگر ابھی اس قیاس کے قوی اسباب موجود ہیں کہ مدار نیچون سے آگے بھی ابھی کچھ سیارے اور موجود ہیں - اگر صحیح ہے - تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نیچون کے آگے سب سے پہلا سیارہ زمین و آفتاب کے فاصلہ سے بقدر چوالیس گنا دور ہوگا - ان سیاروں کا علم اتفاق سے ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں ممکن نہیں - کیونکہ پہلے ہی سیارہ کی حرکت فلکی سورج کے گرد ۲۹۰ سال میں ختم ہونی ہوگی - اور ان کی حرکت اسقدر سست ہوگی کہ فوٹو کے پلیٹ پر بھی کوئی نشان نہ چھوڑ سکے گی - خود نیچون آفتاب کے گرد ۱۶۵ سال میں ایک گردش کرتا ہے - اور اس کی رفتار فلکی ۳۷ء۳ میل فی سکنڈ ہے - یہ سیارہ ۱۸۴۶ء سے پہلے دریافت نہ ہو سکا -

---

ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب سے نیچون کا اوسط فاصلہ ۰۰۰۰۰۰۰ء۹۰۷ء۲ میل ہے یعنی اگر ہم ٹرین یا موٹر میں ایک میل فی منٹ کی رفتار سے سفر کریں - اور مسلسل اسی رفتار سے چلتے رہیں تو پانچ ہزار سال میں اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکیں گے -

اگر ہم اپنا یہ سفر جاری رکھکر قریب ترین "ثابت" تک پہونچنا چاہیں - (جن ستاروں کو ثوابت کہا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت یکجگہ قائم نہیں ہیں - بلکہ نہایت تیز حرکت کرتے رہتے ہیں) تو قریب ترین "ثابت" الف قنطورس (alpha Centauri) کے ساڑھے چار کروڑ برس پہونچیں گے - اور ایک شعاع نور کو جو ۱۸۶۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے ۳ء۴ سال درکار ہوں گے -

اس کے بعد کا بعد ستارہ ۶ء۱۱ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے - تیسرا ۹ء۷ سال نور کے فاصلہ پر ہے - اور اس کے بعد الا جسے "شعریٰ یمانیہ" یا "کلب اکبر" (Dog Star یا Sirius ") کہتے ہیں وہ ہے

۸۰ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔ الغرض بہت کم ثوابت ایسے ہیں جو زمین سے چار کھرب میل کے اندر واقع ہوں ہمارے تمام نظام شمسی کے چاروں طرف ایک وسیع و تاریک خلا محیط ہے جو اس دائرہ سے جو سیارۂ نپچون سورج کے گرد ایک بار طوف کرتا ہے۔ آٹھ کھرب گنا بڑا ہے۔

اس نظام شمسی سے آگے ایک ارب اور تین ارب میل کے درمیان اور بہت سے آفتاب لانہایت فضا کے اندر بے حد تیز رفتاری سے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جو متعدد سیارے اپنی جلو میں رکھتے ہیں۔

امریکہ کے سب سے بڑے ہیئت داں سائمن نیوکومب (Simon Newcomb) نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ فضا میں بے شمار دنیائیں ایسی ہیں جن میں نہ صرف ذوی الارواح بلکہ ناطق مخلوقات آباد ہیں۔" اور ڈبلو۔ ڈبلو کیمبل مہتمم رصد خانہ لک (Lick) کا قول ہے کہ "یہ فرض کرنا معمولی امکانات کے بھی خلاف ہے کہ صرف ہمارا ہی سیارہ ذوی الارواح سے آباد ہو۔"

ڈاکٹر سی۔ جی ایبٹ ڈائرکٹر رصد خانہائے واشنگٹن فرماتے ہیں کہ:۔ "یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ روشن ستاروں کے ساتھ ساتھ اجرام تاریک کی بھی تعداد کثیر ایسی ہو جن کا وجود ہم اپنی طاقتور دوربین (Telescopes) اور آلۂ طیف نما (Spectroscope) سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں خدا کی ذی حیات مخلوق آباد ہو"

مسٹر گاریٹ پی سرویس نے خوب لکھا ہے کہ "کسی سیارہ کے اندر زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ سیارہ منازل ارتقا طے کرتے ہوئے۔ اس حد تک پہونچ جائے کہ اس میں طبیعی اور کیمیاوی قوتیں عمل کرنے لگیں۔ پھر ظاہر ہے۔ کہ ایسی کائنات میں جس کے اندر بے شمار اجرام موجود ہوں۔ خدا معلوم کتنے سیارے ایسے ہوں گے جو ارتقا کے ان منازل کو طے کر چکے ہوں گے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ سوائے کرۂ ارض کے کسی اور سیارہ میں آثار حیات نہ پائے جائیں"

۱۸۶۴ء میں سر ولیم ہگنس نے جو کسی زمانہ میں رائل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ بھی تھے مشاہدات طیفی کے ذریعہ سے بتایا تھا کہ اکثر کیمیاوی عناصر جو ہم کو اس دنیائے ارضی میں معلوم ہیں، وہی دور دراز فاصلوں پر واقع ہونے والے ستاروں کے اندر بھی موجود ہیں۔ اور اس طرح گویا ایک جدید دنیا کی بنیاد پڑی جس کا نام "طبیعیات النجوم" (Astrophysics) ہے۔ سر ولیم کا قول تھا کہ:۔ جو ستارہ جھلملاتا ہے سمجھ لو کہ اس میں کیمیاوی عناصر موجود ہیں"

ڈاکٹر سی فرماتے ہیں کہ:۔ کائنات کی اس لامتناہی وسعت میں اجرام کا وجود اگر آبادی سے خالی مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صرف ایک کرۂ ارض میں مخلوقات ذوی الارواح کا پایا جانا۔ قدرت کی غلطی ہے جو اس سے ایک عام قانون کے خلاف ہوئی ہے۔

ہر چند سائنس کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ حیات کیونکر پیدا ہوتی ہے، مگر ہم اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ جس کیمیائی

سے وہ ہماری چھوٹی سی دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسری دنیاؤں کے اندر بھی ظاہر ہوتی ہوگی!
— آیندہ ہم نظام شمسی کے ہر سیارہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ وہاں آبادی کا امکان ہے یا نہیں

نیاز

مطالعہ

ایک ہفتہ وار جریدہ ہے جو ام۔ حسن لطیفی بی۔ اے کی تحریر وادارت میں لودھیانہ سے جاری ہوا ہے۔ اور آج (۱۶ مئی) تک اسکے پانچ نمبر شایع ہو چکے ہیں۔ اس جریدہ کو "سولو جرنلزم" کے اصول پر جاری کیا گیا ہے۔ سولو جرنلزم کا ترجمہ لطیفی صاحب نے "تنہا نگاری" کیا ہے یعنی اگر کسی رسالہ یا جریدہ کو صرف "تحریر وادارت" کی طرف سے تمام و کمال مرتب کیا جائے تو اسے فن صحافت کے اُس شعبہ سے متعلق کیا جائے گا۔ جسکا نام تنہا نگاری یا "سولو جرنلزم" ہے۔ یہ جریدہ بڑے صفحات پر شایع ہوتا ہے اور باوجود اسکے کہ اس میں تنقید، تاریخ، لسانیات و حکمیات بھی کچھ ہوتا ہے لیکن زبان و انشار کے لحاظ سے میں اس کو صرف ادبیات کا رسالہ سمجھتا ہوں۔ جناب لطیفی حال ہی میں لندن سے فن صحافت کی تکمیل کرکے واپس آئے ہیں۔ اور سن وسال کے لحاظ سے آپ کا شمار "عرفی" کی طرح قبل از قبل پختہ ہو جانے والی (Precocious) ہستیوں میں سے ہے۔ جو تجربہ کے سوا سب کچھ اپنے پاس رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جناب لطیفی مغرب سے واپس آکر کوئی رسالہ یا اخبار انگریزی زبان کا جاری کرینگے۔ لیکن اُن کو جو فطری دلچسپی اردو ادبیات سے ہے وہ آخرکار ضرورت و مصلحت سب پر غالب آئی اور انھوں نے وہ چیز پبلک کے سامنے پیش کی جو ممکن ہے ایک حیثیت سے نئی معلوم ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ جناب لطیفی ولایت جانے سے قبل بھی اس کو پیش کر سکتے تھے۔ یہ جریدہ اخباری حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ صرف ایسے مقالات کا حامل ہوتا ہے جنھیں صرف "خطابت تحریری" میں شامل کیا جا سکتا ہے، اور جن پر رائے زنی کرنے والے صرف اسی طبقہ میں مل سکتے ہیں جو خود تبصرہ و نقد کی کافی اہلیت رکھتا ہے۔ لطیفی صاحب، خواہ وہ نظم لکھیں یا نثر، ہر جگہ اپنے آپ کو اسقدر بداہت کے ساتھ نمایاں کر دیتے ہیں۔ کہ ایک نقاد بشرطیکہ آنکہ وہ "ادب و نقش" کا بھی کافی ذوق رکھتا ہو، ان کے ادبیت کے "حُسنِ دشوار" کا نہایت آسانی سے اندازہ کر سکتا ہے۔ "حسن و جمال" کی ایک قسم تو وہ ہے جس کے جلوہ کا مفہوم "لنترانی" کے سوا کچھ نہیں ہوتا، دوسرا وہ جو "لب بام" ہر شخص کو ہر جگہ نظر آ سکتا ہے۔ پھر میں یہ تو کبھی نہ چاہوں گا کہ لطیفی صاحب کی ادبیت کا حُسن، "حُسن لب بام" ہو کر رہ جائے، مگر اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ موسیٰ کی طرح صدائے "دور باش" پر جان دیدینے والے بھی اب دنیا میں موجود نہیں ہیں کاش کہ وہ اپنے قلم کی "والہانہ" روش میں کچھ اور اعتدال پیدا کر سکتے اور اسقدر بلند سماوی انشا (Ethereal Literature) کا معجزہ پیش کرکے اپنی "ریعان صحافت

پر ایمان لانے کے لئے لوگوں کو مجبور نہ کرے۔

جن حضرات نے آپ کے مجموعہ مضامین "لطیفیات" کا مطالعہ کیا ہے۔ اور جو آپ کی نظموں کو دیکھ چکے ہیں۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ قدرت نے آپ کو کسقدر "برق وش" ذہانت عطا کی ہے لیکن میری رائے میں صحافت کے لئے ذہانت کی اسقدر ضرورت نہیں، جتنی "متانت" کی ہے۔ کسی کتاب کے پیش کرتے وقت ہمارا خطاب ایک مخصوص حلقہ سے ہوتا ہے، ایک متعین دائرۂ خیال کے اندر رہتا ہے، لیکن ایک رسالہ یا جریدہ خواہ وہ "تنہا نگاری" کا نتیجہ ہو یا "انجمن نگاری" کا تربیت جمہور سے متعلق ہوتا ہے۔ اور اس لئے اس میں زیادہ تر وہی باتیں ہونا چاہئیں جنکو سمجھنے والے اس کثیر اور سننے والے بھی کثیر۔ اگر عقلاء نے آپکو "شناس خلق" کرنا چاہے تو اوسے اپنا آشیانہ کی بلندی ضرور کم کرنا پڑے گی ——— میں یہ لکھ تو رہا ہوں اور اس خلوص و نیازمندی کی بنا پر لکھ رہا ہوں جو مجھے لطیفی صاحب کی بارگاہ میں حاصل ہے، مگر اسی کے ساتھ ڈر بھی رہا ہوں کہ اگر انھوں نے یہ سب کچھ سنکر، جواب میں صرف "عالم ہمہ افسانۂ ماست" کہدیا، تو میں "خون دو عالم" اپنی گردن پر "لینے کے سوا اور کیا کرسکوں گا ———

مجھے معلوم ہے کہ ان کے وطن میں ان کے بہت سے مخالفین پیدا ہوگئے ہیں اور لطیفی صاحب نے نہایت پامردی سے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن بہتر ہوتا اگر وہ اپنے جریدہ کو اس نوع کے بیانات سے پاک رکھتے۔

۱۴ مئی کے "مطالعہ" میں بھی اس نوع کی "تلخ نگاری" موجود ہے، جو یقیناً لطیفی صاحب ایسے خوش ذوق و بلند فطرت انسان کے لئے بہت گری ہوئی بات سمجھی جائے گی اس جریدہ میں یقیناً مواد بہت کم ہوتا ہے اور اس کا بڑا سبب غالباً دشواری طباعت و کتابت ہے جسکا انتظام لودھیانہ میں نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر فی الحال قلم کو اور خفی کر دیا جائے، مکاتبات کے لئے پورا ایک صفحہ وقف نہ کیا جائے، اور اعلانات و اشتہارات کو جریدہ کے حجم سے علیحدہ کر دیا جائے تو کچھ تلافی ہوسکتی ہے۔

گزشتہ دو اشاعتوں سے "یحییٰ ابن عقب" کے کچھ شعر عربی کے عنوان پر نظر آتے ہیں جنکا پوری "معتقدانہ تمہید" کے ساتھ جناب لطیفی نے تعارف کرایا ہے۔ ان اشعار میں، ظہور مہدی، خروج دجال، نزول مسیح اور فتنۂ یاجوج ماجوج کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ حیران ہوں کہ ان اشعار کو "تنہا نگاری" کے کسی جریدہ سے کیا واسطہ ہوسکتا ہے۔ اور اس قسم کی پیشین گوئیوں پر ایک ہفتہ وار جریدہ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایمان لانا کیوں ضروری قرار دیا جائے۔ اگر یہ اشعار محض سعادت و برکت حاصل کرنے کیلئے درج کئے جاتے ہیں تو ہمکو منتظر رہنا چاہئے اسوقت کا جب کسی دن ان اشعار کی جگہ، دلائل الخیرات، قصیدۂ بردہ، دعائے "گنج العرش" کے حرز جاں بنانیکا مطالبہ لطیفی صاحب کی طرف سے کیا جائے

انچہ می بینیم، بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب!

اُمید ہے کہ لطیفی صاحب میری اس تحریر کو محض مخلصانہ مشورہ کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اور ضرورت سے زیادہ ذکاوت حس سے کام لیکر مجھے شرمندہ نہ کریں گے ———

نیاز

عبدالماجد دریابادی بے نقاب

(ایک مظلوم خاتون کی دردناک داستان)

میری شادی تیرہ سال کی عمر میں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم سے ہوئی تھی۔ شادی کے چھٹے سال مولانا موصوف کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اور میری گود میں دو سال کی ایک بچی بھی تھی جس کا نام آصفہ ہے۔ شوہر کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد میرے والدین کو میرے نکاح ثانی کی فکر ہوئی۔ مختلف جگہوں سے پیام بھی آئے لیکن کوئی قابل اطمینان نہ تھا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو بہت سی کتابوں کے مصنف اور اخبار " سچ " کے مالک اور اڈیٹر ہیں۔ میرے مرحوم شوہر کے بظاہر سچے دوست بنے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم لوگ ان کو نہایت نیک خصلت سلیم الطبع اور بزرگ جانتے تھے۔

میری بیوگی کے کچھ عرصے کے بعد مولوی عبدالماجد اور میرے بڑے بھائی منشی حبیب الرحمٰن صاحب کے درمیان میری شادی کی بابت خط وکتابت شروع ہوئی۔ اور انھوں نے میرے عقد ثانی کے لئے سخت سے سخت تقاضا کیا جس کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں ضرورت نہیں۔

اس کے بعد عبدالماجد کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے لکھا " ڈرتے ڈرتے ایک صاحب کا نام پیش کرتا ہوں ایک صاحب ایک بیوی رکھتے ہوئے دوسری بیوی کے خواستگار ہیں اگر آپ لوگ منظور کریں تو بہتر ہے " اُس وقت میرے والد مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے ایسے رشتے کو کسی طرح گوارا نہ کیا۔

ہمارے یہاں کے انکار پر عبدالماجد نے میرے بھائی کو کئی مرتبہ لکھا کہ اپنی بہن (یعنی مجھ کو) کو میری بیوی سے ملادت کئے ہم لوگوں سے جو اُن کے تعلقات تھے اس کے موافق یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی اور نہ مجھے کچھ شبہ تھا کہ میری تقدیر کچھ اور رنگ لائے گی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ گئی۔ اور ان کی والدہ، بیوی اور بہن سے خاتون منزل میں مل آئی۔ وہاں کسی قسم کی کوئی ایسی گفتگو نہیں ہوئی جس سے مجھے کچھ عبدالماجد کے دل کا حال معلوم ہوتا۔

ان لوگوں سے ملے ہوئے مجھے مشکل سے دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ عبدالماجد کا ایک طول طویل چار صفحہ کا خط بھائی صاحب کے نام آیا جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ " آپ کی بہن اور میری بیوی سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں کچھ الفاظ والدہ آصفہ (یعنی میں) نے ایسے استعمال کئے جن کا میرے دل پر گہرا اثر پڑا، وہ یہ کہ زندگی کے ساتھی سبھی ہوتے ہیں، لیکن مرنے

کے بعد سچے اور وفادار دوست بھی نا آشنا ہو جاتے ہیں" ان لفظوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ اور میں اب سب سے پہلے اپنا ہی نام پیش کرتا ہوں۔ میرے دو بچیاں ہیں۔ چھوٹی مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جس طرح میری دو آنکھیں ہیں اسی طرح دو بیویاں ہوں گی۔ آصفہ سلمہا کو بہ مسرت اپنی تیسری بچی کی جگہ رکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں ایک غریب آدمی ہوں، بمشکل بے شام تک دال روٹی کھا سکتا ہوں لہٰذا امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں رکھ سکتا۔ غصہ ور بھی ہوں، تاہم اُن کے ساتھ نہ کروں گا، میرے میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہیں کہ لوگوں کو رشک آتا ہے۔ میری اہلیہ بیمار بھی رہتی ہیں۔ عقد ثانی مسنون بھی ہے"

یہ خط پڑھ کر بھائی صاحب نے مجھ سے شادی کی بابت رائے لی، میں نے انکار کر دیا لیکن بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ نے سمجھا بجھا کر راضی کیا چنانچہ اکتوبر ۳۰ء میں میں عبدالماجد کی نفس پرستیوں کا شکار بنی۔ یہ شادی میرے سسرال والوں سے پوشیدہ طور پر دریاباد میں ہوئی تھی کیونکہ وہ لوگ غیر خاندان ہونے کی وجہ سے اس شادی کے سخت مخالف تھے۔ مہر صرف اکیاون روپے تھا شادی کا ہونا تھا کہ عبدالماجد کے رجسٹری خطوط بکثرت نگرام آنے لگے جن میں یہی لکھتے رہے کہ جلد بھیجئے میں اعلان کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں گا۔

چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ مع اپنی بچی آصفہ کے دریاباد گئی وہاں اعلان کے ساتھ دوبارہ پھر نکاح ہوا۔ میرا قیام تقریباً ایک ماہ عبدالماجد کے یہاں دریاباد میں رہا۔ اب میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

میرے دریاباد جانے کے دوسرے ہی روز میرے مرحوم شوہر کے چچازاد بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب میری لڑکی آصفہ سلمہا کو نگرام لے جانے کی غرض سے دریاباد پہونچے اُن کو دیکھ کر آصفہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسکے اس طرح کے رونے پر میری جو حالت تھی۔ اس کا میری ہی جیسی مصیبت زدہ عورت اندازہ کر سکتی ہے۔ میں نے اپنے غمگین اور درد بھرے دل کو سنبھالا۔ اور اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد عبدالماجد کی اجازت سے میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں دریاباد سے سندیلے آئی، کیونکہ اعزہ اور سسرال والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہم لوگوں کو وطن (نگرام) چھوڑنا پڑا۔ اور سندیلہ میں جہاں میرے بڑے بھائی ملازم ہیں سکونت اختیار کرنی پڑی یہیں سے ۲۹ نومبر ۳۰ء کو میری چھوٹی بہن کی شادی بحمد اللہ ہو گئی۔

سندیلہ میں تقریباً ڈھائی ماہ مجھے رہنا پڑا۔ اس عرصے میں عبدالماجد کے خطوط میرے پاس بہت کم آتے تھے۔ میری طبیعت اکثر گھبرائی رہتی تھی۔ اس وجہ سے میں اور بھی جلد جلد خط بھیجا کرتی تھی۔ عبدالماجد نے مجھے لکھا۔ " اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ہفتے میں ایک بار خط آنا چاہئے" عبدالماجد کی اس تحریر سے مجھے رنج ضرور ہوا، لیکن کیا کر سکتی تھی خاموش ہو گئی۔ اسکے بعد عبدالماجد نے للعہ کرایہ بھیج کر مجھے لکھا "کہ اپنے بھائی کے ساتھ دریاباد چلی آؤ" چنانچہ میں جنوری میں وہاں پہونچ گئی، دو ہفتہ کے بعد عبدالماجد نے مجھ سے کہا کہ " میں باہر (حیدرآباد) جا رہا ہوں تم اپنے میکے چلی جاؤ" یہ الفاظ سُن کر مجھے صدمہ ہوا اور میں نے کہا کہ میں ابھی سندیلہ نہیں جاؤں گی کیونکہ مجھے آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔

عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید، سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ انھوں نے بھی اس سے پہلے مجھے سہارنپور بلایا تھا۔ اس لئے عبدالماجد نے مجھے سہارنپور بھیجدیا۔ دو مہینے میں سہارنپور رہی۔ اس درمیان میں عبدالماجد کے خطوط اُن کے بھائی عبدالمجید کے پاس تو برابر آیا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ ان کی بے رُخی سے جو کچھ خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد میرے بھائی صاحب نے مجھے بلانے کے لئے عبدالماجد کو خط لکھا۔ عبدالماجد نے بھائی صاحب کو جو جواب دیا قابل ملاحظہ ہے۔ " میں نے تو مہینہ سوا مہینہ ہوا جب ہی والدہ آصفہ سے سندیلہ جانے کو کہا تھا۔ لیکن انھوں نے خود ہی عذر کیا اور سہارن پور چلی گئیں " گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ میں بغیر ان کی اجازت کے سہارنپور گئی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ عبدالماجد نے خود ہی مجھے سہارنپور بھجوایا تھا۔ سہارنپور سے ماہ مارچ میں عبدالمجید صاحب مجھے راستہ میں سندیلے چھوڑتے گئے یہاں ایک ماہ تک عبدالماجد کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا۔ میں روزانہ خطوط بھیجتی رہتی تھی۔ خدا خدا کرکے ایک خط آیا جس کے الفاظ یہ تھے۔ " تمھارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں: کوئی تار ہوتے ہیں " اس کو دیکھ کر میرا دل مرجھا گیا ——— وہ خرچ کے لئے دس روپیہ ماہوار مجھے برابر بھیجتے رہے۔ جب سندیلہ آئے ہوئے مجھے چار ماہ ہوگئے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے مجبور ہوکر خود ہی لکھا کہ میں دریاباد آنا چاہتی ہوں۔ اس کے جواب میں عبدالماجد نے لکھا۔ " ابھی موقعہ نہیں ہے جب موقع ہوگا بلا لوں گا " ماہ جون میں عبدالمجید صاحب نے میرے بھائی صاحب کو ایک گھنٹہ کے لئے سہارنپور بلایا۔ جولائی میں بھائی صاحب گئے تو اُن سے کہا کہ " عبدالماجد تو کچھ بولتے نہیں، ان کی بیوی (عفت) کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپ کی بہن کو الگ کردیا جائے " بھائی صاحب یہ الفاظ سُن کر حیران رہ گئے۔ ان کی عجیب حالت ہوئی۔ عبدالمجید کو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سندیلہ واپس آئے یہاں آکر تمام واقعہ بیان کیا۔ کیا بتاؤں یہ الفاظ سنکر میری والدہ محترمہ کا کیا حال ہوا۔ اور اپنی حالت میں تحریر ہی نہیں کرسکتی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے پھر خیال ہوا کہ ممکن ہے انھوں نے مجھے علیحدہ مکان میں رہنے کے لئے کہا ہو۔ غرض میں اپنے درد بھرے دل کو طرح طرح سے تسلی دیتی رہی۔

اس کے چند ہی روز کے بعد طلاق نامہ آگیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مجھے اندھیری فضا میں پھینک دیا ہے۔ میری نظروں میں تمام عالم سونا ہوگیا۔ چاروں طرف گہری تاریکیاں نظر آنے لگیں۔

باوجود اعزہ کے شدید اختلاف کے جو خطوط تعزیت میں آئے۔ ان میں سے ایک خط میرے حقیقی ماموں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب کا ملاحظہ کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔

نورچشمہ میاں حبیب الرحمٰن صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

دعا! خدا کرے خوش رہو، آباد رہو، کل علی گڑھ سے عزیزی فرید سلمہ کا خط بزبانی انجمن سلمہا حالات سندیلہ سے پُرغم والم موصول ہوا"

کل سے اس وقت تک کئی بار تم کو خط لکھنے بیٹھا۔ لیکن قلم نے یارا نہ دیا کہ تم کو کیا لکھوں۔ آہ، یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ ایک صاعقہ تھی، جس نے تن بدن کو جھلسا ڈالا۔ ابتداً تم لوگوں کی کوتاہ فہمی اور تمھارے عورتوں کی رائے کے پابند ہونے نے معاملہ کو ایک ناگوار اور ذلت آمیز طریقے سے تکمیل کو پہونچایا، اب اس نااہل اور ناخدا ترس انسان نے اس خاندان کی عزت و افتخار پر زبردست کاری ضرب لگائی ہے۔ اگرچہ اس وقت ہمارے آپ کے رسمی تعلقات تلخ ہیں۔ لیکن قدرتی واسطے کسی کے توڑے نہیں ٹوٹتے۔ اس ناگوار خبر نے کل گھر بھر کو بے چین بنا دیا ہے یقیناً کل روز قیامت یہ ظلم کا معاملہ رب العزت کے حضور پیش ہوگا۔ پھر میاں ماجد دیکھیں وہاں کیا جواب دے کر سرخروئی حاصل کریں گے۔ ظلم کی ٹہنی ہری نہیں ہوتی۔ ان کو خدا کے غضب سے ڈرنا چاہئے تھا۔ آہ۔ ثم آہ

ایسی نامبارک حالت میں ظاہر ہے کہ اہل معاملہ کا کیا حال ہوگا۔ اور ان کی پریشانی کا اثر اس معصوم بچہ پر کیا پڑتا ہوگا جو ایک کو اس واقعہ سے متاثر پاکر اس کے قلب نازک کی کیا کیفیت ہوگی۔ یہ نقشہ ہر وقت ہم لوگوں کے پیش نظر ہے۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کی صحت پر اس کا ناگوار اثر پڑے گا۔ والدعا فقط

محمد محفوظ الرحمٰن عفی عنہ

از نگرام ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء

طلاق نامہ پہونچنے کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد عبدالماجد کا ایک خط میرے نام آیا، اس میں لکھا تھا۔ "میں عرصے تک تمھاری خدمت جاری رکھوں گا۔ اور میرا ارادہ ہے کہ تمھارا ہاتھ کسی شریف کے ہاتھ میں دے دوں گا۔" یہ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، لیکن کیا کر سکتی تھی، خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس کے بعد بھائی صاحب نے عبدالماجد کے پاس خط لکھا جس کا مختصر مضمون یہ ہے "کہ آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کی، ہم لوگوں پر ظلم کیا۔ اور بالکل ذبح کر دیا۔ اور زندہ درگور کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ باوجود اعزہ کی شدید مخالفت کے ایسا کیا گیا تھا، صرف والدہ رافت سلمہا کی صحت کے خیال سے ایسا کرنا کسی طرح آپ کو مناسب نہ تھا۔ کہ ایک مجبور و لاچار ہستی کو پامال کر دیا گیا۔ شریعت میں یہ فعل نہایت قبیح اور مبغوض ہے۔ اس کا آپ نے کچھ خیال نہ کیا،،
اس کے جواب میں عبدالماجد کا جو خط بھائی صاحب کے پاس آیا، بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے

بسم اللہ

دریاباد ۱۴ جولائی ۳۱ء

منشی حبیب الرحمٰن صاحب! وعلیکم السلام۔

آپ کے دو خط ملے ایک بھائی صاحب کے نام، دوسرا خود میرے نام۔ میں چار روز کے بعد ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں۔ اس لئے جواب آج سے قبل لکھنا ممکن نہ ہوا۔

آپ کو رنج و صدمہ ہونا قدرتی ہے۔ اور ایسی مغلوبیت کی حالت میں، انسان ایک بڑی حد تک عنداللہ و عندالناس

معذور ہوجاتا ہے۔ لیکن اس ممانعت کے لئے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں۔ بار بار ہم لوگوں کو گردن کاٹنے، ذبح کرنے، قتل کرڈالنے ظلم کرنے، بدعہدی کرنے، تلوار چلانے کا مجرم قرار دینا، والدہ رافت سلمہا کی علالت کی بحث چھیڑنا۔ یہ سب ان حدود سے تجاوز کرجاتا ہے۔
اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ آیندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے
—— صورت حال جو آپ نے تحریر کی ہے۔ وہ تمام تر خلاف واقعہ ہے۔ آیندہ اس قسم کے خطوط لکھکر مجھے مجبور نہ کیجئے، کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کروں۔

اپنے اعزہ کی جو شکایتیں آپ نے لکھی ہیں ممکن ہے صحیح ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ ان معاملات سے ہمارا کیا واسطہ؟ اور ہم لوگ بجز زبانی ہمدردی و اظہار تاسف کے اور کیا کرسکتے ہیں؟

جو کچھ کیا گیا ہے آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں بڑی حد تک، آپ لوگوں کی بہتری اور بھلائی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے یہ مسئلہ آپ کو کسی نے غلط بتادیا ہے کہ طلاق ہر صورت میں عند اللہ مبغوض ہے۔ طلاق تو خود حضور انور صلعم نے دی ہے۔ اور صحابہ کرام نے بہ کثرت طلاقیں دی ہیں مطلقہ کے ساتھ نکاح بھی ان حضرات نے بہ کثرت کئے ہیں اسے عیب تو ہماری موجودہ سوسائٹی نے بنادیا ہے، جس میں عقد بیوہ، تعداد ازدواج وغیرہ بھی داخل عیوب ہیں۔ شریعت نے جس طلاق کو ناپسند کیا ہے وہ وہ ہے جو شوہر بلاوجہ معقول عورت کو ستانے کے لئے یا محض اپنی نفس پرستی کے لئے دیتا ہے نہ کہ وہ طلاق جس کا مقصد یہ ہو کہ زن و شوہر دونوں ایک دوسرے کی صحبت ناموافق سے آزاد ہوجائیں، یہ تو عین رفع ظلم ہے نہ کہ ظلم —— آپ نے جس جذبۂ ہمدردی کا واسطہ دلایا ہے یہ اسی کا تقاضا ہے۔ جو افتراق و قطع تعلق پر مجبور کررہا ہے۔ ظلم اگر مقصود ہوتا تو اس کی متعارف صورتیں دوسری ہیں، جن سے آپ بھی ناواقف نہیں ہوسکتے۔

عبدالماجد

یہ خط دیکھ کر مجھے اور بھی صدمہ ہوا کہ واللہ اعلم وہ کون سی سچائیاں ہیں، اور اسباب افتراق کی خدا جانے کیا تفصیل ہے۔ میں تو بالکل بے قصور ہوں، مجھ سے کوئی ایسی شدید خطا سرزد نہیں ہوئی کہ یہ نوبت آئی اس کے بعد میں نے خود ایک خط لکھا کہ آخر مجھے دنیا کیا کہے گی۔ اور خدا جانے میرے متعلق لوگوں کا کیا گمان ہو۔ عبدالماجد نے میرے خط کا جو جواب دیا بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ

دریاباد ۲۱ر جولائی ۱۹۳۱ء

والدہ آصفہ سلمہا۔ وعلیکم السلام۔

کئی دن ہوئے خط ملا تھا۔ اللہ کی مشیت میں جو ہوتا ہے، وہی ہوکر رہتا ہے۔ بندہ کا کام یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیش آئے، اس پر صبر کرے۔ تم نے لکھا کہ لوگ تم پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے۔ ان تہمتوں کی تردید میں جو کہو میں لکھ بھیجوں گا بی

تہمت لگانے والے خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں گے۔ میں نے کئی دن ہوئے تمہارے بھائی کو لکھا تھا کہ تکمیل ضابطہ کے لئے مہر کی کل رقم کی رسید میرے پاس بھیجدیں تو بقیہ رقم فوراً بھیج دوں۔ رسید ابھی تک آئی نہیں۔ رقم تیار رکھی ہے صرف تمہاری رسید کا انتظار ہے۔

رسول اللہ صلعم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہؓ کی طلاق واپس لی ہے، باقی دو بیویاں ایسی اور ہوئی ہیں جنھیں طلاق دے کر واپس نہیں لی ہے۔ شرعاً یہ ایسی کوئی بری بات نہیں ہے۔ صرف ہمارے موجودہ رواج نے اسے اتنا بُرا بنا رکھا ہے جیسے دوسرے عقد کو بُرا سمجھ لیا گیا ہے

عبدالماجد

جو خط عبدالماجد کا میرے بھائی صاحب کے نام ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں میں خطاوار ہوں۔ اور اگر افتراق کی تفصیل اور سچائیاں ظاہر ہوں تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے ہفتہ بھر ہی کے بعد میرے نام جو خط آیا ہے اس سے میں ہر قصور سے بالکل بری الذمہ قرار دی جاتی ہوں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ صحیح بات عبدالماجد کے نزدیک پہلی ہے۔ یا دوسری ——— ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہؓ کا بیویوں کو طلاق دینا۔ یہ میری تسلی کے لئے لکھا گیا ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے لئے طلاق مبغوض نہ ہوگی، دنیاوی رسمیں بُری سہی مگر شریفوں کے جذبات کے موافق جیسی ہیں ہیں ——— عبدالماجد نے مہر کے روپیے بھی بھائی صاحب کے پاس روانہ کئے تھے۔ لیکن میں نے واپس کردئے ——— اسکے بعد میں نے تھانہ بھون مولانا اشرف علی صاحب کے پاس اور دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد صاحب کے پاس خطوط بھیجے۔ کیونکہ عبدالماجد مولانا اشرف علی صاحب کے معتقد اور مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں۔ ان حضرات کے پاس خطوط بھیجنے کی غرض صرف یہ تھی کہ ممکن ہے اس مصیبت قبیحہ سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے تو میرے خط کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مولانا حسین احمد صاحب نے جو خطوط مجھے اور بھائی صاحب کو تحریر فرمائے وہ نقل کئے جاتے ہیں۔ اصل خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔

محترمہ سلمکم اللہ تعالےٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کا والا نامہ حسرت اور رنج سے بھرا ہوا پہونچا نہایت زیادہ قلق اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالےٰ آپ کی دستگیری فرمائے آمین میں مولانا عبدالماجد صاحب کو لکھ رہا ہوں مگر وہ فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے بہت سی باتوں کا وہم وگمان بھی نہ تھا جو کہ بعد از عقد پیش آئیں۔ وہ آپ کے کسی معاملہ میں بدخلقی وغیرہ کے شاکی نہیں ہیں۔ انھوں نے نکاح سے پہلے مدت دراز تک فکر وغور اور جد وجہد جاری رکھا کہ کوئی مناسب اور زینیا موقعہ ہاتھ آجائے۔ جہاں پر آپ کا عقد ثانی ہوجائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تب انھوں نے ارادہ کیا تھا۔ کہ میں خود ہی عقد کرلوں۔ اور جیسا کہ انھوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ اسی ارادے میں پختہ تھے۔ مگر عقد کرتے ہی ان پر چاروں طرف سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھاٹی اسقدر دشوار گزار ہوگی۔ بالآخر وہ صبر نہ کرسکے۔

اور یہ حادثہ پیش آیا۔ خط و کتابت و خط میں جو آخری جواب ہوگا۔ میں پھر پیش کروں گا ـــــ محترمہ من قسمت کی بات کوئی نہیں جانتا۔ راضی بہ تقدیر رہنا چاہئے۔ اللہ تعالے سے دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ آپ کے لئے بہترین صورت کردے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جئے والسّلام ۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دوسرا خط ملاحظہ ہو

محترمہ سلّمکم اللہ تعالے السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ آپ کا والانامہ باعث سرفرازی ہوا تھا۔ چونکہ میں تقریباً دو ماہ سے پھوڑے پھنسی وغیرہ میں مبتلا ہوں۔ ادھر مشاغل تدریس وغیرہ سے فرصت نہایت کم ہوتی ہے۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مولانا عبدالماجد کا والانامہ آیا تھا، وہ اپنی انتہائی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں ان کو اس قسم کی مجبوریوں کا خیال تک بھی نہ تھا۔ جہاں تک مجکو ان کے پہلے کلمات سے اور اب کے کلمات سے پتہ چلتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کو آپ سے پہلے بھی ہمدردی ہی نے مجبور کیا تھا کہ عقد کریں۔ ان کی ہرگز نیت نہ تھی کہ خدانخواستہ وہ جدا کریں گے۔ مگر یہ واقعات اعزہ واقارب اور خصوصاً والدہ ماجدہ وغیرہ کے احکام کے ایسے پیش آئے کہ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ کار ہی نہ رہا۔ مجکو بھی سخت افسوس ہے کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا۔ اور ان کو بھی بہت ہی زیادہ رنج اور الم ہے۔ مگر تقدیرات الٰہیہ میں کس کا چارہ ہے۔ آپ کے لئے اگر خوش قسمتی مقدر ہوتی تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کا انتقال کیوں ہوتا۔ مالک قضا وقدر نے جس طرح چاہا مقرر فرمایا، کسی کا اس میں کیا اختیار ہے۔ آپ نے بہت بڑا جہاد کیا تھا کہ نکاح ثانی قبول فرمایا۔ اب یہ دوسرا جہاد پیش آیا۔ اللہ تعالے آپ کی دستگیری فرمائے اور دین و دنیا میں آپ کی نامرادی اور خوش کامی کی صورت ظہور میں لائے اب بجز صبر و شکر کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں مصارف روانہ کرتا ہوں مگر آپ کی طرف سے واپسی ہوتی ہے[1] اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ وہ جو کچھ اخراجات کے لئے روانہ کریں قبول فرمالیا کریں۔ کیا عجب ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر آپ کی اس قسم کی خبرگیری فرماتے رہیں۔ آپ کو اب بجز صبر کے کیا چارہ ہے۔ میں اللہ تعالے سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کریم و کارساز آپ کی پردۂ غیب سے اعانت فرمائے۔ آمین

از دیوبند ۹ ربجا دی الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

---

[1] بالکل غلط ہے، صرف مہر کے روپئے جس کو رقم کے لفظ سے مولوی صاحب نے تعبیر کیا ہے روانہ کئے تھے۔ وہ میں نے واپس کردئے تھے۔ عبدالماجد نے طلاق کے بعد میرے پاس ایک پیسہ نہیں بھیجا۔

اسی سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس جو مولانا حسین احمد صاحب کا خط آیا وہ بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

محترم المقام جناب فیض مآب منشی حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، والانامہ باعث سرافرازی ہوا۔ میں نے مولانا عبدالماجد صاحب سے اس امر میں خط وکتابت کی۔ یوں تو اسرار کا جاننے والا خالق کون ومکان ہی ہے مگر جہاں تک ان کی پہلی اور اب کی تحریرات اور زبانی گفتگو میں بتلاتی ہیں ان کی نیت بد نہ تھی۔ اور اس عقد ثانی میں ان کو محض ہمدردی اور خبرگیری ہمشیرہ محترمہ کی مقصود تھی، اسی کے ساتھ ساتھ عقد ثانی کا اجرا بھی منظور تھا۔ اگرچہ انھوں نے اس امر میں مستقبل کی دشواریوں کو سوچا سمجھا تھا۔ مگر ان کو اندازہ میں غلطی ہوئی۔ جسقدر وہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے متعلق ان کا گمان تھا کہ میں تحمل کرلوں گا، مگر خلاف امید ان کو اسقدر مشکلات کا سامنا ہوگیا۔ جن کو تحمل کرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ اور پھر بھی ایک عرصہ تک وہ برداشت فرماتے رہے۔ مگر جبکہ بالکل ہی مجبور ہوگئے۔ اسوقت بجز اس صورت مکروہہ کے کوئی مفر ان کو نظر نہ آیا۔ انھوں نے اپنی قدیم سسرال والوں کے جور وجفا کو برداشت کیا۔ اور اعزہ واقارب کے طعنوں اور تشنوں کو جھیلا۔ قریب کے رشتہ داروں کی سہی مگر والدہ ماجدہ کے احکام کا ٹال دینا سخت دشوار اور دین ودنیا کی بربادی کا باعث تھا۔ جناب کو معلوم ہے کہ حکم شرعی کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ اگر والدین بلا سبب بھی لڑکے کو حکم کریں تو اس پر ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی عزیز اہلیہ سے جدائی اختیار کرلے۔ اگرچہ انھوں نے عقد سے پہلے اپنی قدیمی اہلیہ اور والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی وغیرہ کو راضی کرلیا تھا مگر بعد از عقد یہ سب کچھ دنوں میں بدل گئے۔ اور ایسی ایسی مشکلات ان کے سامنے آگئیں کہ ان کے موجود ہوتے ان کا اپنے وطن اور گھر بار میں رہنا۔ اور زندگی بسر کرنا دشوار تر بلکہ تقریباً محال ہوگیا یہ سب بھی جھیل جاتے اگر والدہ ماجدہ کا حکم نہ ہوتا۔ میں مولوی صاحب موصوف کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے اس امر کے متعلق بہت زیادہ رد وقدح کی، اور نوشت وخواند کی نوبت آچکی ہے۔ ادھر آپ کی مشکلات بھی واقعی اور بہت زیادہ رنجدہ ہیں۔ افسوس یہ تقدیری معاملات ہیں ان میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح آپ نے ایک ایسے ہونہار قابل بھائی کی نوجوانی کی موت پر صبر کیا اور یہی وہ مصیبت تھی جو کہ تمام مصائب کی سرچشمہ بلکہ تمام خاندان کے لئے ایک ناقابل تلافی مصیبت تھی تو پھر اس مصیبت پر بھی صبر فرمائیں۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں مولوی صاحب موصوف دروغگو، مکار، شہوت پرست نہیں ہیں مگر تقدیری معاملات کے سامنے بڑوں بڑوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔ اور جن باتوں کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ ان کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وجود خالق کا اقرار کرنا مشکل ہوجائے ـــــ آپ کی عالی ظرفی اور شرافت کا مقتضیٰ یہی تھا جو جناب نے کیا کہ ایسی گندگی کو اچھالنے سے پرہیز فرمایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔ اور آپ کی مشکلات کو دور فرمائے۔ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسّلام

از دیوبند ۱۹، جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

میری حالت شدت رنج و غم سے بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی، مجھ میں بالکل سکت نہ رہی، ہاتھ پیر اور بقیہ تمام جسم ٹھنڈا ہو گیا لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا علاج ہوا - میں اپنی اس ردی حالت سے ذرا سی بھی متفکر نہ تھی - میری دلی تمنا یہی تھی کہ موت آ کر جلد میرے مصائب و آلام کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے علاج سے مجھے قدرے سکون ضرور ہوا - لیکن اب چار پانچ ماہ سے میری حالت روز بروز بالکل ردی ہوتی جاتی ہے، اُٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور ہوں - اب چارپائی پر سے ہلنے کی طاقت بھی نہیں ہے، ابتدا میں دق جیسی کیفیت تھی، حرارت قائم ہو گئی تھی، کھانسی بیحد تھی مگر اب چار پانچ روز سے بلغم کے ساتھ کچھ خون کی آمیزش ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن بظاہر کوئی امید نہیں - خداوند کریم سے میری دلی تمنا یہی ہے کہ مجھے جلد از جلد ان دنیاوی مصائب سے نجات دے۔ اور اپنے حبیب پاک نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ایمان کے ساتھ اپنی اس ادنیٰ کنیز کو آغوش رحمت میں لے کر خاتمہ بالخیر کرے - آمین یارب العالمین!

ان تمام واقعات میں سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ عبدالماجد اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو تو طلاق کی وجہ بتاتے ہیں کہ والدہ نے مجبور کیا - اور میرے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی، ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کر دوں۔" حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تحریروں میں سے ایک بھی سچی نہیں لیکن عبدالماجد نے یہ چال چلی کہ ادھر تو اپنے پیر کو بھی خوش رکھنا چاہا - اور ادھر میرے اعزہ کو ایسا خط لکھا، جس سے وہ ڈر جائیں، اور اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں۔ دوسرا جھوٹ انھوں نے اپنے پیر سے یہ بولا کہ وہ مصارف روانہ کرتے ہیں - لیکن میں واپس کر دیتی ہوں - حالانکہ یہ بھی بالکل غلط ہے - علاوہ اس کے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کیا پہلے نکاح کے وقت عبدالماجد ایسے مدعی زہد و اتقا نے اپنی والدہ سے اجازت نہ لی تھی، یقیناً لی پھر نکاح کے بعد ان کی مخالفت کیسی - اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو رنار اضی والدہ جو سبب بتایا وہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ بہر حال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علماء دین و اکابر ملت کے سامنے رکھ کر متمنی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت، گلیم پوش، تسبیح خواں صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر و فریب اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں - اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں جنکا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ نہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کئے جاتے کیونکہ عبدالماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو کچھ مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے - دق - سل جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن گن رہی ہوں - لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جانگداز واقعہ سے دوسری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں اور ملک کو بتائیں کہ ایسے لوگوں سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار۔

زندہ در گور - ظ - بیوۂ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم

مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۳۲ء نگرام ہاؤس - نظیر آباد - لکھنؤ

انتظام علی صاحب

کس ماحول میں پیدا ہوئے، کس گردو پیش میں پرورش پائی، کس سوسائٹی کے زیر اثر ان کی تعلیم ہوئی۔ اور اُن کے خیالات وجذبات میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیر ہوا، ان باتوں کا ہمیں علم اور نہ جاننے کی ضرورت۔ ہم تو صرف اسقدر جانتے ہیں، اور فسانہ کے لحاظ سے اتنا ہی جاننا چاہئے کہ معاشیات و اقتصادیات میں انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اور اس شان کے ساتھ کہ جب وہاں سے نکلے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی سودیشی بھنڈار کے اشتہار یا کارخانہ پارچہ بافی کے ٹریڈ مارک ہیں۔ یعنی تکمیل معاشیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات کا مطالعہ بھی آپ نے جس نقطۂ نظر سے کیا وہ بھی ویسا ہی ویران وسنسان اور اسی طرح کا بے آب ورنگ تھا۔

یوں تو فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرنے کی ذلت آپ نے کبھی گوارا نہیں کی لیکن سنا ہے کہ اول اول اتنی بیگانگی بھی نہ تھی۔ چنانچہ موسیقی کے ذکر کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ اُس موذن کا ذکر ضرور کر دیتے جو محلہ کی مسجد میں اذان دیتا تھا۔ اور فرماتے "اچھے اتار چڑھاو کے ساتھ اذان دیتا ہے" —— "اتار چڑھاؤ" ان کے نزدیک موسیقی کی گویا ایسی نازک و دقیق اصطلاح تھیں کہ وہ ان کے علم پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ شعر و شاعری کے سلسلہ میں جب وہ کبھی اظہار خیال فرماتے تو شاید اس لئے کہ ساری دنیا غالب کی تعریف کرتی ہے ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوگی وہ بھی ہمیشہ غالب ہی سے ابتدا کرتے اور اسی پر انتہا۔ اور مجھے خود تو تجربہ نہیں لیکن دوسروں سے معلوم ہوا کہ جب کبھی رات کی تنہائی میں جذبات کا جوش وخروش ناقابل ضبط ہو جاتا تو غالب کا یہ مصرعہ دیر تک گنگنایا کرتے کہ

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

پورا شعر وہ بھی نہیں، کیونکہ ان کی توجہ کا مستحق تو چار گرہ کپڑا ہی ہو سکتا ہے۔

بہر حال اوائل عمر میں وہ کیا تھے اور کیا ہیں۔ اس سے بحث فضول ہے۔ ہمیں تو فراغت تعلیم کے بعد اُن کی زندگی کے صرف اس پہلو سے بحث کرنا ہے جسے ازدواجی یا اہلی پہلو سے موسوم کیا جاتا ہے۔

انگریزی میں ایک فقرہ ہے "Freaks of nature" اس کا ترجمہ آپ خواہ "فلتات فطرت" کیجئے یا "نادرات فطرت" صاف اُردو میں، اُسے میں "قدرت کا کھلنڈراپن" کہتا ہوں —— یعنی ——

اب آپ غور کیجئے کہ ایک بھینس بچہ جنتی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ معمولی اعضا رکھتا ہو، بجائے ایک سر کے دو سر نظر آتے ہیں بھینس کا مالک افسردہ و ملول ہو جاتا ہے۔ لیکن قدرت ہنستی ہے کہ اس نے تو گوالے سے گویا " فراموش کہکر " اپنا کھیل پوری طرح کھیل لیا۔۔۔ ایک عورت درد زہ میں مبتلا ہے، گھر والے انتظار کر رہے ہیں کہ اب جیتا جاگتا بچہ پیدا ہونے والا ہے، لیکن وہاں بجائے کسی انسانی بچہ کے سانپ کے بہت سے بچے کلبلاتے ہوئے نکل پڑتے ہیں۔ عورتیں گھبرا کر بھاگ جاتی ہیں، لیکن قدرت خوش ہے کہ اس نے گویا " ہو " سے کر کے سب کو ڈرا ہی دیا۔

پھر قدرت کے یہ کھیل صرف حیاتیات (Biology) ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں کبھی کبھی اس کھلنڈرے پن سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ انتظام علی کا نکاح بھی انھیں "ملاعبات قدرت" میں سے تھا کہ بیوی ملی انھیں وہ جسے کوئی دور کی نسبت بھی ان کے ذوق سے نہ تھی ۔۔۔۔ یعنی یہ جس چیز سے جتنا بھاگتے تھے۔ اسیقدر وہ اس جانب ملتفت تھی۔ اور ان کو جس طرف جتنا میلان تھا اتنا ہی ادھر تنفر تھا، یہ اگر موسیقی کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے تو اس کا یہ عالم تھا کہ دیگچی بھونتے وقت بھی گنگنانا بند نہ ہوتا، یہ اگر پیسہ کی کھیلیں خریدتے وقت پہلے ایک من لوہے کا بھاؤ دریافت کرتے تھے تو اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ایک من آٹا تولنے پر اگر بیس سیر بھی کم " نکلے تو " اونھ " کہہ کے ٹال دیا جاتا تھا۔۔۔۔۔!

شعر و شاعری میں انھیں لے دے کے صرف ایک شعر " چار گرہ کپڑے " والا خدا جانے کس طرح یاد رہ گیا تھا۔ اور اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر پڑھ دینا ضروری۔

انتظام علی نے اپنی عمر میں شاید ہی کوئی مضمون لٹریچر کا کسی موضوع پر پڑھا ہو۔ اور ادھر ادبیت کا زور کہ جب تک رات کو دو تین رسالے نگاہ سے نہ گزر جائیں نیند آنا دشوار۔

وہ کسقدر بے چین رہتی تھی کہ اپنے لکھے ہوئے مضامین انھیں سنائے، اور داد لے۔ لیکن اس طرف عالم احتراز کہ کھانا کھایا اور فوراً باہر کہ مبادا کوئی ذکر ایسا چھڑ جائے۔

ان حضرت کے نزدیک شادی کا مقصود سوا اس کے کچھ نہ تھا۔ کہ نظام تمدن میں مفید حصہ لینے کے لئے مرد کو ایک رفیق کار میسر آجاتا ہے اور بیگم کا نظریہ یہ تھا کہ ازدواج نام ہے ایک ایسے شخص کی فراہمی کا جو روپیہ کے ساتھ اپنا دل و دماغ بھی غلامی کے لئے پیش کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔

الغرض یہ تھا دونوں کا رنگ طبیعت جسے قدرت نے ملا کر اپنی تفریح کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ شادی کے چند دن بعد تک تو ان دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ کعبہ کی طرف کون جا رہا ہے اور ترکستان کی راہ کس نے اختیار کی ہے، لیکن جب چند دن کے بعد اجنبیت میں کچھ کمی ہوئی۔ اور نسبتاً بے تکلفی پیدا ہو چکی تو سب سے پہلے بیگم ہی کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ دیکھیں انتظام علی صاحب صرف " انتظام علی " ہی انتظام علی ہیں یا ان میں کچھ ذوق شعری بھی پایا جاتا ہے۔

ہر چند وہ شادی سے قبل ہی ان کا غیر شاعرانہ نام سنکر کھٹک گئی تھی کہ ایسا بنیوں کا سا نام رکھنے والا آدمی کیا ادبی ذوق رکھ سکتا ہے، لیکن اس نے یہ سمجھ کر تسکین کرلی کہ ممکن ہے کوئی اچھا تخلص رکھ کر اس کی تلافی کرلی گئی ہو۔

اس جستجو میں سب سے پہلے بیگم نے انتظام علی صاحب کی لائبریری اور ان کے کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ الماری میں کوئی ایک کتاب بھی اُردو فارسی کی نہیں ہے۔ اور انگریزی میں بھی صرف وہی کتابیں ہیں جنکا تعلق تجارت، زراعت، مالیات، میزانیات، سرمایہ، دولت، اور مزدوری وغیرہ سے ہے۔ وہ حیران تھی کہ یہ کوئی آدمی ہے یا ٹھیکہ دار کہ سوائے اس قسم کی کتابوں کے کوئی اور کتاب ہی نظر نہیں آتی۔ کاغذات اُلٹ پلٹ کے دیکھے لیکن وہاں بھی کوئی جھلک امید کی اسے نظر نہ آئی۔ بعض بعض کتابوں پر ان کا نام بھی درج تھا۔ لیکن نہایت احتیاط سے صاف صاف ایک ایک حرف لکھا ہوا تھا۔ وہ دل میں ہنسی کہ "انتظام علی" بھی کوئی ایسا نام تھا جسے اتنی احتیاط سے لکھا جاتا۔ اور پھر یہی نہیں کہ صرف "انتظام" لکھدیا جاتا۔ علی کا لفظ ضروری تھا۔ گویا یہ نہ لکھا جاتا تو کوئی اور ان کتابوں پر دعوے کر بیٹھتا ——

ایک دن انتظام علی صاحب کالج سے (جہاں وہ آج کل لکچرار کی خدمت پر مامور تھے) بہت خوش خوش واپس آئے، کیونکہ زراعت پیشہ طبقہ کے متعلق جو مقالہ انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کی خوبی کا حکومت نے اعتراف کیا۔ اور خود گورنر نے ملاقات کے لئے ان کو طلب کیا تھا۔ گھر میں آئے تو سخت بیتاب تھے کہ کوئی اُن سے پوچھتا۔ اور وہ بتاتے کہ ان کی محنت کی کیا داد ملی ہے، ادھر بیوی ان کو غیر معمولی طور پر مسرور دیکھ کر یہ سمجھی کہ آج میاں غالباً شاعری کی جون میں آئے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹتے ہی یہ سوال کر بیٹھی کہ "آج آپ بہت خوش ہیں، کیا کوئی اچھا شعر قلم سے نکل گیا ہے"

انتظام علی صاحب جن پر اس وقت نشۂ اقتصادیات پوری طرح مسلط تھا، شعر کا نام سنکر اس طرح چونک پڑے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چونک کر بولے —— "شعر! خوب کہی، شعر و شاعری بھی ایسی چیز ہے۔ جس پر کوئی انسان توجہ کرے"۔

یہ سنکر بیگم صاحب کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ لیکن بہت ضبط سے کام لیا۔ اور بولیں کہ "یہ جو تمام دنیا میں ہزاروں لاکھوں شاعر پیدا ہوئے، سب بیکار ہی تھے۔ اور زمانہ بھی نہایت احمق تھا کہ ان کے کلام کی قدر کی"۔

انتظام علی — "یہ بھی کوئی دلیل ہوئی؟ محض کسی چیز کا پیدا ہو جانا اس کے مفید ہونے کا ثبوت نہیں۔ مچھروں مکھیوں کی پیداوار شاعروں سے زیادہ ہے۔ لیکن بتایئے کہ سوائے ملیریا اور بیماریاں پھیلانے کے ان سے کیا فائدہ ہے۔ رہا قدر کرنا، سو ان کی قدر کرنے والے بھی وہی ہیں۔ جو شاعر ہوتے ہوتے رہ گئے"۔

بیگم۔ (بگڑ کر) جب کوئی کام کسی سے بن نہ پڑے تو یوں ہی کہنا چاہئے۔ سچ ہے جب آنگن ہی ٹیڑھا ہو تو ناچنے والا کیا کر سکتا ہے؟

انتظام علی ـــــ تم بھی کیا باتیں کر رہی ہو۔ شعر اور کسی سے بن نہ پڑے۔ یہ بھی گویا ریاضی کا کوئی مسئلہ ہو گیا، علم الکیمیا کا کوئی معمہ ٹھہرا کہ ہر شخص اس کے سمجھنے یا حل کرنے کا اہل نہیں۔ چند الفاظ ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیئے اور کوئی بھلی سی بات کہہ دی شعر ہو گیا۔

بیگم ـــــ شعر کی یہ تعریف آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص کہہ سکتا ہے جو قدرت سے خاص دماغ لیکر آیا ہو۔ اور جذبات انسانی کے اظہار پر پوری قدرت رکھتا ہو۔

انتظام علی ـــــ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں اس سے بحث نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ اور اس تعلیم سے سوائے نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔ حالات کا اقتضاء تو یہ ہے کہ پیوند لگا لگا کر کپڑے کا استعمال کیا جائے۔ اور ادھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریبان کا چاک ملا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کسان کی دہقانوں کو کب تک کوئی رفو کریگا۔ اور ان کی اس غیر مہذب و مسرف تعلیم کا اثر لنگ پر کیا ہوگا"۔

بیوی۔ (ہنسکر) ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینا چاہئے۔ کہاں شاعر کا چاک گریباں اور کہاں آپ کا یہ اقتصادی رفو۔ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر نکل جائے۔

انتظام علی ـــــ کس کے کپڑے۔

بیوی۔ (غصہ سے) اپنے اور کس کے۔

انتظام علی ـــــ غنیمت ہے میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔

یہ تھی سب سے پہلی گفتگو شاعری کے متعلق جو میاں بیوی میں ہوئی۔ اور جس نے ہمیشہ کے لئے بیوی کو شوہر کی طرف سے مایوس کر دیا۔

انتظام علی شاعر نہ سہی لیکن بہر حال ایک فاضل شخص تھے، نفسیات انسانی سے بے خبر نہیں تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بیوی کا کیا رنگ ہے۔ اور اچھی طرح واقف تھے کہ اس لحاظ سے وہ کوئی دلجوئی اس کی نہ کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بیوی بہت محبت کرنے والی ہے، نہایت مطیع و وفا شعار ہے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اس کے ذوق کی رعایت کر سکیں۔

اس گفتگو کے چند دن بعد شام کو کامل ایک گھنٹہ تنہائی میں بیٹھ کر انھوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور سوچتے رہے۔ کہ اگر کبھی کبھی وہ اپنی طبیعت کے خلاف محض بیوی کو خوش کرنے کے لئے شعر و ادب کے ذکر کو بھی گوارہ کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ کیونکہ یوں بھی اصولاً جب گھر میں کسی چیز کی "طلب" ناگزیر ہو جائے تو اس کی فراہمی ضروری ہے۔

انھوں نے فوراً اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے بازار سے دیوان غالب کا نہایت مکلف اڈیشن منگوایا۔ اور سبت

پہلے وہ غزل نکالی جس کا ایک شعر انھیں عرصہ سے یاد تھا۔

انھوں نے ہر ہر شعر کو بار بار پڑھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھیں ہر مرتبہ اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا۔ نہ انکی سمجھ میں یہ آیا کہ " در و دیوار سے بیابان کیونکر ٹپک سکتا ہے " نہ " جوہر آئینہ " کا " مژگاں " بننا ان کی عقل میں آیا۔ نہ " عید نظارہ " کا صحیح مفہوم ان کو معلوم ہو سکا۔ اور نہ " داغ تمنائے نشاط " کا مطلب ان کے ذہن نشین ہوا۔ البتہ جب وہ مقطع پر پہونچے تو دماغ کی تشویش کچھ کم ہوئی۔ اور دیر تک اس کو پڑھتے رہے:۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

سوچتے سوچتے انھوں نے کتاب کو ایک طرف رکھدیا۔ اور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئے۔ کبھی وہ پنسل کی نوک کو زبان پر رکھ کر اور پھر ایک لفظ لکھ کر دیر تک سوچتے۔ کبھی چھت کو دیکھ کر انگلیوں کو میز پر ہارمونیم کی طرح دیر تک چلاتے رہتے۔ اور پنسل سے کوئی نشان کاغذ پر بنا دیئے۔

کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے، الغرض پورے ایک گھنٹہ تک اسی طرح کی عجیب و غریب حرکتیں کرنے کے بعد، ان کے چہرے پر آثار مسرت ظاہر ہوئے۔ اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا۔ اسے ایک کاغذ پر صاف کیا۔ اور احتیاط سے جیب میں رکھ کر اس شان سے صحن میں چہل قدمی فرمانے لگے، گویا نپولین کو کوئی نئی تدبیر دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کی سوجھ گئی ہے۔

شام کو گھر میں گئے تو بہت خوش خوش تھے، بیوی بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ لیکن کسی خیال میں محو تھیں۔ انھوں نے جاتے ہی دیوان غالب پیش کرتے ہوئے کہا کہ " بیگم آج میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شاعری نہ ایسی بری چیز ہے نہ ویسی مشکل۔ جرمنی کا چھپا ہوا نیا اڈیشن غالب کا مجھے بہت پسند آیا۔ اسے تم اپنی لائبریری میں رکھ لو۔ "

بیوی نے مسکراتے ہوئے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اور دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی کہ " واقعی نہایت پاکیزہ چھپا ہے۔ شکریہ "

انتظام علی ـــ " غالب اچھا شاعر تھا "

بیوی ـــ " ہوگا، مجھے کیا معلوم؟

انتظام علی ـــ (حیرت سے) ہوگا۔ کیوں کیا شاعری سے تمھیں دلچسپی نہیں رہی "

بیوی ـــ " جی نہیں "

انتظام علی ـــ خوب، یہ عجیب بات ہے کہ جب میں نے غزل کہنا شروع کی تو تمھیں شاعری سے دلچسپی جاتی رہی ابھی ضد ہے تو (جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے) اتنی محنت میں نے یوں ہی فضول کی "

بیوی ۔۔۔ (حیرت سے) آپ اور غزل!

انتظام علی ۔۔۔ "کیا تم مذاق سمجھتی ہو۔ یہ دیکھو۔ میری پہلی کوشش ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ ناکامیاب نہیں رہی۔ پہلا شعر ۔۔۔ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا۔ اچھا مطلع سنو۔

ہم نہیں وہ جنھیں آتا ہی پریشاں ہونا　　مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

بیوی ۔۔۔ (مسکراکر) سبحان اللہ کیا کہنا۔

انتظام علی (خوش ہوکر) اچھا دوسرا شعر سنو۔ اسی سلسلہ کا ہے!۔

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب　　نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

بیوی ۔۔۔ تو یوں کہئے، کہ آپ نے قطعہ فرمایا ہے۔

انتظام علی (حیرت سے) اسے قطعہ کہتے ہیں۔ اچھا آج قطعہ سن لو، کل غزل بھی سُن لینا۔ تیسرا شعر سنو۔ اس میں میرا نام بھی ہے۔

کیوں دہاں تم گئے بیکار کو اے انتظام　　کس نے تم سے کہا وہاں جاکر یا بجولاں ہونا

بیوی جو اس وقت تک اپنی ہنسی کو روک رہی تھی مقطع سنکر بالکل بے اختیار ہوگئی۔ انتظام علی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ یہ ہنسی کا کیا موقع ہے۔

بیوی (ہنستے ہوئے) آپ کا آخری شعر تو تقطیع سے بالکل گر گیا۔

انتظام علی (سنجیدگی کے ساتھ) تقطیع سے گر گیا!۔ تو کیا ہوا۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی۔ شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اور تم نے تو دیگچی گرا کر ہر دفعہ کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔

یہ تھی دوسری صحبت شعر و سخن جو انتظام علی صاحب کے گھر میں منعقد ہوئی اور ہنسی مذاق پر ختم ہو گئی۔ بیوی سمجھتی تھی کہ جو کچھ ہوا صرف مذاق تھا۔ اور انتظام علی صاحب نے قصداً محض تفنن طبع کے لئے غزل کہی تھی۔ لیکن ادھر بیوی کی یہ بات چوٹ کی طرح دل پر لگی کہ "مقطع تقطیع سے گر گیا" اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ غزل گوئی کی طرف توجہ شروع کردی۔ یہاں تک کہ صبح ہوئی اور غزل سنانے بیٹھ گئے، دوپہر ہوئی اور دوسری غزل سامنے کردی، یہاں تک کہ سونے سے قبل روزانہ تین چار غزلوں کا تیار کرلینا۔ اور بیوی کو سنانا۔ ان کے فرائض میں داخل ہوگیا۔ بیوی حیران تھی کہ اس بلا کو کس طرح دور کرے۔ اور ان کی غزلیں سن سن کر جو نفرت شاعری سے اس کو ہوتی جارہی ہے۔ اس کا کیا علاج کرے۔ وہ اب ہنس بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ انتظام علی صاحب کو ناگوار ہوتا تھا، وہ منع بھی نہ کرسکتی تھی کہ یہ بھی گویا ایک قسم کی مخالفانہ تنقید تھی۔

ایک دن حسب معمول صبح ہی صبح انتظام علی صاحب ہاتھ میں غزل لئے ہوئے مردانخانے سے اُٹھ کر اندر آئے تو دیکھا کہ بیوی جوکی پر نماز پڑھ رہی ہیں۔ یہ وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس ارادہ سے کہ سلام پھیرتے ہی یہ اپنا وظیفہ شروع کردیں گے، لیکن بیوی نے نماز ختم کرتے ہی فوراً "عقد انامل" پر اسماء الٰہی کا ورد شروع کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ رحل سے قرآن شریف اٹھا کر اس کو کھولنے لگیں۔

انتظام علی صاحب کو بہت حیرت تھی کہ خلاف معمول بیوی نے نماز کیا سمجھ کر شروع کردی۔ کیونکہ آج تک کبھی کسی قسم کی عبادت میں ان کو مشغول نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے، لیکن جب بیوی نے کلام مجید سنبھالا تو یہ سمجھے کہ جلد فارغ ہونا مشکل ہے۔ اور باہر چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر اندر آئے تو بیوی بدستور کلام مجید کی تلاوت میں مصروف تھیں، دیکھ کر پھر چلے گئے۔ الغرض دس بجے تک کوئی دس مرتبہ انھوں نے غزل سنانے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام ہوئے۔ جب کھانا کھا کر کالج جانے کا وقت آگیا تو بیوی فارغ ہوئیں اور سیدھی باورچی خانہ جاکر کھانا نکالنے میں مصروف ہوگئیں۔

۴ بجے شام کو انتظام علی صاحب زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ واپس آئے۔ کیونکہ اب بجائے ایک کے دو غزلیں سنانا تھیں، لیکن گھر پہونچ کر انھیں سخت مایوسی ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ بیوی پھر مصروف تلاوت ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں باہر واپس گئے۔ اور خادمہ کو بلاکر پوچھا کہ "کیا بیگم نے آج دن بھر تلاوت کی ہے"۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ابھی ابھی عصر کی نماز کے بعد بیٹھی ہیں تو خاموش ہوگئے۔ اور شام کی غزلگوئی ملتوی کردی۔

مغرب کے وقت تک کئی بار انھوں نے دیکھا کہ بیوی فارغ ہوئیں یا نہیں۔ لیکن انھیں برابر اسی طرح خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت میں منہمک دیکھ کر یہ بھی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اور پھر انھیں نہ معلوم ہوسکا کہ عشا کے بعد کس وقت تک وہ مصلے پر بیٹھی رہیں۔

انتظام علی سمجھتے تھے کہ ایک آدھ روز میں بیوی کا یہ جوش تسبیح و تہلیل ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب مسلسل کئی دن تک انھوں نے یہی عالم دیکھا تو گھبرائے کہ بیوی بڑھتے بڑھتے کسی دن ترک دنیا نہ کردیں۔ اور آخر کار ایک رات سوتے وقت موقعہ پاکر انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ "یہ نماز روزہ کا دورہ آپ پر کب تک پڑتا رہے گا"

بیوی۔ (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے—خوب، آپکے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔

انتظام علی— نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسوقت تک تو تم نے کبھی بھول کر بھی کوئی سجدہ نہ کیا تھا، پھر اب جو اس کا خیال آیا۔ تو کیوں اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی جوکی پر تیمم کرنے کی مٹی کا تودہ بنی بیٹھی ہیں۔

بیوی — "لاحول ولاقوۃ، چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ نماز روزہ کے ساتھ مذاق کیسا؟
انتظام علی — "مذاق میں تو نہیں کر رہا، تمھیں کر رہی ہو۔ میں نماز کو منع نہیں کرتا، تلاوت سے نہیں روکتا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے، تمھاری بھی عجیب باتیں ہیں۔ نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کا نام نہ لیا اور عبادت پر آئیں تو اس شان کے ساتھ کہ گھر کو مسجد و خانقاہ بنا کے رکھدیا۔
بیوی — (تنک کر) خیر ہوگا، آپ کو اس سے کیا، میں نے نماز نہیں پڑھی تھی تو خدا کا گناہ کیا تھا، اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے کسی کو کیا؟
انتظام علی — "مجھے یہ کہ جس دن سے آپ نے نماز شروع کی ہے۔ صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں سنانے کا موقع ملے تو اور کہوں۔ مجھے تو اس سال پورا دیوان ختم کرنا ہے۔ آخر یہ کام کیسے چلے گا،
— بیوی نے اس اندیشہ سے کہ کہیں فوراً غزلخوانی نہ شروع ہو جائے، کوئی جواب نہ دیا۔ اور کروٹ لے کر اس طرح سانسیں لینے لگیں جیسے نیند سے مغلوب ہوں۔
انتظام علی صاحب نے ایک آدہ مرتبہ آواز بھی دی لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو خاموش ہو کر خود بھی لیٹ گئے۔

کامل ایک ہفتہ اسی حال میں گزر گیا کہ انتظام علی صاحب جب اندر آتے ہیں۔ بیوی نماز و تلاوت میں مشغول ہوتی ہیں اور جب یہ کوئی ذکر اس قسم کا چھیڑتے ہیں تو وہ ٹال جاتی ہیں۔
ایک دن انھوں نے یہ ترکیب کی کہ رات کو چپکے سے اٹھکر بیوی کا مصلا اور تسبیح و قرآن سب چھپا دیا صبح کو جب وہ اٹھیں اور وضو کر کے نماز کے ارادہ سے چوکی پر گئیں تو وہاں صفایا تھا۔ خادمہ کو آواز دی۔ اور پوچھا کہ مصلا کہاں گیا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور بیوی کو غصہ آگیا — جب بات زیادہ بڑھتی دیکھی تو انتظام علی صاحب بیوی کا تمام اسباب عبادت لئے ہوئے سامنے آئے اور کہا کہ "بیگم یہ ہے۔ آپ کا تمام عاشور خانہ، لیکن خدا کے لئے یہ بتا دو کہ یہ چلہ کتنے دن تک قائم رہے گا۔ تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر نکل جاؤں،
— بیوی اس ادا کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ سچ سچ کہوں گی تو آپ کو ناگوار ہوگا۔
انتظام علی صاحب نے اس جگہ بیوی کی جا نماز، تسبیح اور قرآن مجید سب کو سر پر رکھ کر کہا کہ "قسم لے لو جو کچھ کہوں"
— بیوی نے کہا کہ "وعدہ کیجئے آج سے آپ نہ کبھی کوئی شعر کہیں گے۔ نہ مجھے سنائیں گے"۔
انتظام علی صاحب (حیرت سے) لاحول ولاقوۃ، میں تو یہ سب کچھ تمھاری خوشی کے لئے کرتا تھا۔ تم نہیں پسند

کریں، تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضائع کروں۔"

بیوی ــــ "ہاں میری خوشی ہو چکی، اب میری مرضی یہی ہے کہ آیندہ کے لئے آپ اس سے توبہ کیجئے۔

انتظام علی ــــ "اچھا میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

بیوی ــــ (ہنستے ہوئے) خدا تمھیں بخشے، نماز سے توبہ کراتے ہو، جس نے تم سے شاعری کی لت چھڑوائی۔

انتظام علی ــــ "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو، جس نے تمھیں نماز کی عادت ڈلوائی۔

نیاز

فراست الید - مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بہ آسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسروں کے مستقبل، سیرت عروج و زوال نیز حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا - جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے علاوہ محصول ۱۲ر

شاعر کا انجام - جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ قیمت ۱۰ر

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے قیمت صرف عـہ ر

گہوارۂ تمدن - (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکہ آرا کتاب جس میں تاریخ اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے۔ اور دنیا، تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

شہاب کی سرگزشت - حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اسکی زبان اس کی تخئیل اس کی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ ر

تذکرۂ خندۂ گل مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۲۰۰ سے زاید اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ اُن کے لطائف و ظرایف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول عـہ

مثنوی لالہ رخ - طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ، ادبی شاہکار کا بہترین نمونہ قیمت معہ محصول ۱۲ر

منیجر نگار

باب الاستفسار

بالشویک حکومت کی رعایا نوازیاں

(جناب ڈاکٹر علم الدین صاحب ٹیکم گڈہ)

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں حکومت روس نے بچوں کی پرورش و تعلیم کے لئے کیا قوانین نافذ کئے ہیں، اور عورتوں کے کیا اصول زندگی وہاں مقرر ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں بڑی توجہ کی جاتی ہے۔

(نگار) بالشویک حکومت نے جو جدید تنظیم شروع کی ہے۔ اس کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ قوم کے ہر بچہ کا نشو و نما بالکل طبیعی طور پر ہونا چاہیئے۔ اور اس کے لئے تمام ضروری سہولتیں بہم پہونچانا حکومت کا فرض اولین ہے، عورتوں اور بچوں کی صحت کو ترقی دینا۔ صغر سنی کی اموات کو روکنا۔ رعایا کے لئے عمدہ شفاخانے جاری کرنا۔ بچوں کی پرورش عقلی اصول پر ہونا۔ اور عورت کو جدید تعمیر عمرانی کا سنگ بنیاد سمجھنا۔ یہ ہیں وہ اصول جن پر ملک کی آیندہ ترقی کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے جتنے قوانین وضع ہوئے ہیں۔ وہ عام و خاص دو تقسیموں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ قسم اول میں تمام وہ قوانین داخل ہیں جنکا تعلق مسئلہ نکاح، وراثت، ولایت وغیرہ سے ہے۔ اور جن پر اس وقت گفتگو کرنا ہے۔ ان قوانین کی رو سے جب تک بچہ پرورش پاکر خود کسب معاش کے قابل نہ ہو، اس کو منجانب حکومت معقول امداد دی جاتی ہے۔ روسی قانون جائز اور ناجائز اولادین کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اور حکومت کی نگاہ میں دونوں قسم کے بچے ایک درجہ رکھتے ہیں حال ۱۶ سال سے کم عمر کی کسی عورت کو کسی شعبہ میں نوکر نہیں رکھا جا سکتا۔ اور بعض حرفتیں ایسی بھی ہیں جن میں کوئی عورت داخل ہو ہی نہیں سکتی۔ کارخانوں میں عورتیں صرف آٹھ گھنٹہ اور بعض صورتوں میں صرف سات گھنٹہ کام کر سکتی ہیں۔ اور سال میں دو ہفتہ کی رخصت پوری تنخواہ کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اسی طرح وضع حمل سے دو ماہ قبل اور دو ماہ بعد تک پوری تنخواہ کے ساتھ ان کو رخصت ملتی ہے۔ بچہ پیدا ہونے پر ہر ماں کو بچہ کے کپڑوں کے لئے کم از کم ۲۰ روبل (روسی سکہ) ملتے ہیں۔ اور آیندہ نو ماہ تک نو روبل ماہوار اس کی پرورش کے لئے ملتے رہتے ہیں۔ یہ تمام رقمیں اس کارخانہ کے مالک سے وصول

کی جاتی ہیں جہاں وہ عورت کام کرتی ہے۔ کوئی عورت اپنے بچہ کو ساتھ لیکر کارخانہ میں کام کرتی ہے تو اسے ہر تین گھنٹہ کے بعد نصف گھنٹہ کی چھٹی ملتی ہے۔ کارخانوں میں بچوں سے کام لینے کے متعلق نہایت سخت قوانین نافذ ہیں۔ کسی بچہ سے جس کی عمر ۱۴ سال سے کم ہو کسی کارخانہ کے اندر کسی حیثیت سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا۔ چودہ اور سولہ سال کے درمیان بھی صرف اس صورت میں ان سے کام لیا جا سکتا ہے کہ وہ یتیم ہوں اور خاندان میں کوئی شخص انکی کفالت کرنے والا نہ ہو بچلا سے صرف چھ گھنٹہ اور بعض حالتوں میں صرف چار گھنٹہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اور ہفتہ میں بیالیس گھنٹہ کی چھٹی دینا پڑتی ہے۔ رات کے وقت کام لینا قطعاً ممنوع ہے۔ بچوں کو دو ہفتہ کے بجائے سال بھر میں ایک ماہ کی رخصت ملتی ہے۔ بچوں کے جرائم کے متعلق نہایت غور و خوض کے بعد قوانین مرتب کئے گئے ہیں۔ اور ایسے مقدمات کا فیصلہ ان عدالتوں میں ہوتا ہے جہاں محکمہ تعلیم، حفظان صحت اور محکمہ عالیہ کے تین رکن مقررہ کمیٹی سے مشورہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔

یہ عدالت اور کمیٹی بچوں کے جرائم کی صرف تحقیق رکھتی ہے لیکن سزا نہیں تجویز کر سکتی۔ عدالت اور کمیٹی کا یہ ذہن ہے کہ وہ بچوں کو سزا دینے کے بجائے ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں ایسے صغیر سن مجرموں میں سے ۲۷ فیصدی خاص تعلیمی اداروں میں بھیجے گئے، ۱۶ فی صدی والدین کے حوالہ کئے گئے۔ ۱۶ فیصدی کو خاص استادوں کے ماتحت رکھا گیا، آٹھ فیصدی ان اداروں میں بھیجے گئے جو "شریر بچوں" کے لئے مخصوص ہیں، دس فیصدی بغرض علاج اسپتالوں میں داخل کئے گئے، اور دس فیصدی "قومی عدالت" کے حوالہ کئے گئے کیونکہ صرف یہی عدالت سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے۔

پھر چونکہ محض قانون سازی سے کسی جماعت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے تعلیم بھی نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ عوام کو حفاظت صحت کے اصول بتائے جائیں۔ چنانچہ مختلف انجمنوں کے ذریعہ سے رعایا کو بتایا گیا کہ صحت کا قیام، نسل کی حفاظت، اور ترقی تمدن کے لئے باہمی تعاون کس قدر ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو بھی بتایا گیا کہ ان پر، سلطنت اور سوسائٹی کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

صحت کے متعلق پروپیگنڈا کبھی لکچروں کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے، کبھی نمائشیں منعقد کی جاتی ہیں کبھی مظاہرے کئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے جاتے ہیں۔ اشتہار تقسیم ہوتے ہیں۔ ضبط تولید، پرورش بچگان وغیرہ پر تعلیم و ہدایات دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں محکمہ حفظان صحت کی طرف سے ۲۲۱ کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں ۱۱۵ عوام کے لئے مخصوص تھیں۔ صحت کے متعلق جسقدر ادارات ہیں ان کے عملہ کو خاص طور پر طبی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس تعلیم گاہ کے بڑے بڑے مرکز ماسکو۔ لینن گراڈ۔ خارقف۔ کیف۔ اوڈیسہ۔ سامرہ و تاشقند میں موجود ہیں۔ پانچ سال ہوئے۔ جب سب سے پہلے ماسکو میں نمونتاً ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اب پنجسالہ نقشہ عمل کے مطابق ایسے ہی جدید انسٹی ٹیوٹ، شمالی قفقاز، دوجرز ڈیٹروک، سائبریا، اور قزاقستان میں قائم ہو چکے ہیں۔ ان مقامات

میں سند یافتہ ڈاکٹروں، دائیوں اور استادوں کو بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب ۱۹۲۱ء میں انقلاب اور قحط کے بعد بہت سے لاوارث بچے پائے گئے تو حکومت نے بچوں کی پرورش گاہیں قائم کیں۔ اور روسی معلمین کی ہدایت اور مشورہ کے مطابق ان "پرورشگاہوں" میں کثرت سے بچے داخل کئے گئے۔ زار کے عہد میں ملک کے اندر صرف دو قسم کے مدارس نظر آتے تھے۔ ایک طبقۂ امراء و رؤساء کے بچوں کے لئے جن میں صرف "تعلیم فرعونیت" دی جاتی تھی۔ اور دوسرے طبقۂ غرباء کے مدارس جو امراء کی خیرات سے چلتے تھے۔ مگر اب تمام پرانے اسکول توڑ کر جدید مدارس قائم کئے گئے ہیں جہاں ہر طبقہ کے بچے یکساں طور پر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ان میں جماعتی اور اشتراکی روح پیدا کی جاتی ہے

اسی اصلاح کے سلسلہ میں تین قسم کے "ادارے" حکومت نے قائم کئے ہیں۔ ایک ماؤں کے لئے دوسرا ان بچوں کے لئے جن کی عمر تین سال سے کم ہے۔ اور تیسرا تین سال سے زائد عمر رکھنے والے بچوں کے لئے۔

۱۹۲۶ء میں تمام روس کے اندر ۵۱۷ ادارات ایسے تھے جہاں عورتیں فرائض امومیت، ضبط تولید۔ اور تعلقات زن و شو کے متعلق مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ آلات تولید و تناسل کے امراض کے خلاف بھی انسدادی تدابیر کی گئیں اور وضع حمل کے وقت حاملہ کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں ان کو مدنظر رکھ کر عورتوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اسپتالوں میں جاکر بچے جنیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں شہروں کے اندر ستر فیصدی اور دیہات میں بارہ فیصدی کی نسبت سے سرکاری اسپتالوں میں بچے جنے گئے۔ ان اسپتالوں میں ۱۴۵۱۹ عورتوں کے قیام کا انتظام ہے تمام چھوٹے بچوں کے لئے جو پرورشگاہیں قائم ہیں وہاں تمام بچوں کا بغور معائنہ کیا جاتا ہے۔ اور ان کو معاشرتی امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ان انسدادی تدابیر کے علاوہ گھروں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ اور صحت عامہ کے اصول لوگوں کو بتائے جاتے ہیں۔ یہ معائنہ تین آدمیوں کی ایک جماعت کرتی ہے، جن میں ایک شخص محکمۂ صحت عامہ کا دوسرا مزدوروں کا اور تیسرا محکمۂ عدلیہ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو بچوں کے لئے دودھ اور پرہیزی کھانے کے باورچی خانے بھی قائم کئے جاتے ہیں۔ جدید پنج سالہ نقشۂ عمل کی رو سے جو پرورش گاہیں قائم کی گئی ہیں وہ تین قسم کی ہیں، ایک وہ جو کارخانوں کے اندر ہیں، دوسری وہ جو کارخانوں سے متعلق ہیں تیسری خود مزدوروں اور کاریگروں کی قیامگاہوں میں ۱۹۲۷ء میں اس قسم کی ۲۶۰۱ پرورشگاہیں کام کر رہی تھیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمقابلہ ۱۹۱۳ء کے بچوں کی شرح اموات بجائے ۲۷ء۳ فی صدی کے ۱۹۲۷ء میں صرف ۱۸ء۷ رہ گئی۔

بڑے بچوں کی پرورشگاہوں کا تعلق "سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" واقع ماسکو کے سپرد ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۲۹ء میں کھولا گیا تھا۔ انقلاب سے قبل اس قسم کا کوئی ادارہ روس میں موجود نہ تھا۔ ان ادارات میں سب سے زیادہ اہمیت ورزش جسمانی کو دی جاتی ہے۔ روس میں "ورزش جسمانی" کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کے نوجوان میدان جنگ میں

جانے اور اپنے وطن کی حفاظت کے لئے تیار ہو جائیں"۔ اس میں صرف وہ ورزش جسمانی داخل نہیں ہے ہندوستان کے اندر عرف عام میں "کسرت" کہتے ہیں بلکہ اس میں پورے ۲۴ گھنٹہ کا پروگرام ہوتا ہے۔ جس میں کام، فرصت، تفریح، کھانا پینا، ورزش، کھیل کود اور جمناسٹک سب داخل ہیں۔

انجمن انسداد امراض کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں کوئی جسمانی یا دماغی عارضہ پیدا نہ ہو، اس قسم کے ادارت میں ایک تو وہ ہیں جو معاشرتی تعلیم کے مدارس سے متعلق ہیں۔ اور دوسرے خود کارخانوں کی درسگاہیں ہیں۔ اس کام کے لئے جو طبی امداد کی گاڑیاں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سات الماریاں ہوتی ہیں۔ جن میں سر سے لے کر پیر تک کی تمام بیماریوں کے لئے انسدادی سامان موجود ہوتا ہے۔ بعض گاڑیوں میں "عکس برق" شعاعوں کا سامان بھی ہوتا ہے۔

انھیں اداروں سے متعلق "بچہ خانے" بھی ہیں۔ ایک وہ جو تین سال سے لے کر چھ سال کی عمر کے بچوں کے لئے مخصوص ہیں دوسرے ان بچوں کے لئے جن کی عمریں اسکول جانے کے قابل ہیں یعنی آٹھ سے پندرہ سال تک تیسرے وہ جو جرائم پیشہ آبادی کے بچوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان بچوں کے لئے جو دق وسل میں مبتلا ہوں۔ یا دماغ کی شکایتیں رکھتے ہوں ان کے لئے بالکل علیحدہ انتظام کیا جاتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ حکومت روس نے جن اصول کو سامنے رکھ کر اصلاح شروع کی ہے وہ یہ ہیں کہ

(۱) بلحاظ حکمت عملی نیز بہ لحاظ حمیت انسانی سلطنت کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کی دماغی اور جسمانی فلاح، بہبود کا خیال رکھے۔

(۲) رعایا کے فلاح وبہبود کے لئے کسی ادارہ کا انتظام جس قدر موثر طریقہ پر سلطنت سے ہو سکتا ہے۔ خیراتی انجمنوں سے ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر سلطنت کی پالیسی میں تغیر واقع ہو جائے، تو غیر سرکاری انجمنوں کے انتظامات غیر موثر ہو جاتے ہیں۔

(۳) فلاح وبہبود کا انتظام حتی الامکان "انسدادی" ہونا چاہئے۔ اور اسے بچہ کی ولادت سے قبل شروع ہو جانا چاہئے۔

واقعہ یہ ہے کہ جدید حکومت روس کی داستان سننے سنانے کے قابل ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ وہی ملک جہاں اب سے چند سال قبل رعایا نام تھا صرف ذلیل درجہ کے غلام کا، انسانیت ومساوات کے ان بلند اصول پر کیونکر کاربند ہو سکا۔ جو اس وقت تک مغرب کی بڑی بڑی آزاد ومہذب سلطنتوں کو نہیں معلوم۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ بالشویک حکومت نے "انسان" کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ اور شخصی وانفرادی انسان تو وہاں باقی ہی نہیں رہا۔ دنیا کا ہر شخص اپنی جگہ پہلے اپنی ذات اور اپنی انفرادیت پر غور کرتا ہے، لیکن وہاں یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ انسان نام صرف ایک شخص کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک جماعت، اور پوری سوسائٹی کو "انسان" کہتے ہیں۔ وہاں انسان کا

"مجموعی" مفہوم مٹتا جا رہا ہے۔ اور اس کی جگہ "کلی" مفہوم کو سامنے رکھ کر کام ہو رہا ہے۔

وہاں بچپن ہی سے تعلیم دی جاتی ہے کہ بچہ اپنے آپ کو انفرادی شخص نہ سمجھے بلکہ جماعت کا ایک رکن خیال کرے اس کے اسکول کا نصاب، اس کے کھیل کود اور تمام مشاغل تفریح جماعتی بنیاد پر قائم کئے جاتے ہیں اور اس لئے جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو "منظم رائے عامہ" کے سپرد کر دیتا ہے جسے روسی زبان میں "آبشسٹ فناست" (Obshestvennost) کہتے ہیں۔

جب وہ کسی کارخانہ یا دفتر میں کام کرتا ہے تو اپنی ذات یا اپنی اغراض کو سامنے رکھ کر کام کرتا۔ بلکہ وہ اس اعتقاد و یقین کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ کے ہر جنبش سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچ رہا ہے۔

"ہر کارے و ہر مردے" کا کوئی مفہوم وہاں نہیں ہے، وہاں ہر کام ہر شخص کے لئے ہے۔ اور ہر شخص اگر وہ کسی کارخانہ میں کام کرتا ہے تو اس کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس جماعت میں شامل ہو جائے جسے "شاک برگیڈ" (Shock Brigade) کہتے ہیں۔ یہاں اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ مال تیار کرنے کے لئے وقت سے زیادہ کام کرے اور کوئی مزید اجرت نہ مانگے۔

الغرض روس نے اب دنیا کے سامنے ایک بالکل نئے انسان کو پیش کر دیا ہے۔ جس کا نام "اجتماعی انسان" (Collective man) ہے اور وہ وقت دور نہیں جب عالم کے ہر ہر فرد کو یہی "اجتماعی انسان" بننا پڑے گا، اگر وہ اپنی نجات چاہتا ہے۔

نیاز

اعتبارات

شام کا وقت تھا اور سنسان صحرا سے تھکا ہوا قافلہ اس طرح خاموشی سے گزر رہا تھا گویا کہ اس میں جان نہیں، اور کوئی زبردستی اسے گھسیٹے لیے جاتا ہے۔ منزل دور تھی اور شفق کی سرخی سیاہی میں بدلنا شروع ہو گئی تھی ـــــ میر کارواں نے افق کی طرف نگاہ ڈالی۔ اور خوف مایوسی کی مشترک کیفیت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر اونٹ کی رفتار تیز کر دی ـــــ

پہلو سے دفعتہ ایک مسلح گروہ نمودار ہوا۔ اور قافلہ کا محاصرہ کرکے اونٹوں کی کونچیں کاٹنا شروع کر دیں۔ اسباب معہ سواروں کے اونٹوں کی پیٹھ سے گرنے لگا، عورتیں چیخنے لگیں اور بچے سہم کر اپنی ماؤں کے سینے سے لپٹ گئے۔

قزاقوں کا سردار، جس کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور داڑھی سینہ تک پھیلی ہوئی، جس کے گلے میں تسبیح تھی اور پیشانی پر سجدہ کا سیاہ نشان نمودار، غضبناک ہو کر آگے بڑھا۔ اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ سب کو نیزوں پر رکھ لیا جائے۔ اور خود تلوار لیکر عورتوں کے ہجوم میں گھس گیا۔ یہ بچوں کو ماؤں کے سینے سے زبردستی کھینچ کھینچ کر زیور کھسوٹ رہا تھا، تلوار کی دہار سے کاٹ کاٹ کر اپنے قوی ہات سے توڑ توڑ کر۔ اور جو عورت مزاحمت کرتی تھی۔ اسکے سینہ میں تلوار پیوست کر دیتا تھا یہانتک کہ اسکے ہاتھ پاؤں کی جنبش مفقود ہو جاتی۔ اسنے عبا کی جیبیں زیوروں سے بھر لیں، بڑی بڑی آستینیں زر و سیم کے بوجھ سے لٹک پڑیں ـــــ دفعتہ دور سے اذان کی آواز آئی اور یہ سب کو اسطرح مجروح و خونچکاں حالت میں چھوڑ کر قریب کے چشمہ پر گیا تاکہ وضو کرکے نماز پڑھے وہ اپنے دامن سے خون کے دھبے دھو رہا تھا۔ اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا غارت کرے ان کو، میرے کپڑے بھی خراب کر دیے اور نماز بھی قضا کرا دی"

پیامِ بیداری

چھا رہی ہے، زیرِ گردوں تیرگی سی تیرگی کس قدر صبر آزما ہے رات کی افسردگی
یہ وہی ہے صبح کی دنیا، مگر کتنی عجیب! قبر سے بڑھ کر بھیانک، موت سے زائد مہیب!!
کھا رہا ہے پستیوں میں ٹھوکریں پندارِ اوج رہ گئی ہے مضمحل ہو کر مے ہستی کی موج
سسکیاں سی لے رہی ہے شاہدِ بزمِ حیات یہ ہوائیں ہیں کہ ماتم کر رہی ہے کائنات
ہنس رہا ہے قسمتِ انساں پہ، شیطان بَلا کانپتی ہے قہقہوں کی تلخ شورش میں فضا

موت ہے، اے بے خبر انساں، مآلِ ترک و تاز
آہ، اس دنیا کے چھوٹے سے کرے کا جوشِ ناز

ہو رہی ہے محفلِ گیتی شبیہِ رنج و یاس دیکھ! میرے جھونپڑے کی شمع ہے کتنی اداس
اس اداسی میں بھی ہے، لیکن معارف کا جلال بادہ افشاں ہے مری خلوت میں ہستی کا جمال
سطحِ پر رخشاں نظر آتے ہیں اسرارِ حیات مسکراتی ہے نقاب الٹے، عروسِ کائنات
تیرگی میں گرچہ افسردہ ہے گیتی کی امنگ میرے آگے کر رہی ہے رقص، موجِ بے رنگ
ہو چکی ہے ختم گو ہستی کے ساغر کی کھنک میں ابھی تک سن رہا ہوں نبضِ فطرت کی دھمک

روحِ عالم پر ہے اک خوابِ گراں چھایا ہوا
منظرِ حسنِ حقیقت ہے یہاں چھایا ہوا

ہمنشیں! لیکن اسی نورِ بصیرت کی قسم　　بڑھ چکے ہیں حد سے اب تاریک دنیا کے ستم
خونِ دل کی ناتواں موجوں میں لرزش تا بکے　　میری ہاں ڈوبی ہوئی نبضوں میں جنبش تا بکے
گریہی جوش ہوا ہر، دشمنِ ضبط و فراغ　　تھرتھرا کر بجھنے والی ہے مری شمعِ دماغ
ہے جو یہ دم گھونٹنے والی فضائے صبح و شام　　خود بکھر جائیگا ان کمزور سانسوں کا نظام

سرد مہری ہو یہی گر اہلِ دنیا کا شعار
بجھ کے رہ جائیگا میری زندگانی کا شرار

دیکھ! ہو وہ سامنے اک خوش فضا قصرِ بلند　　کسقدر آراستہ، ظاہر میں کتنا ارجمند
قہقہوں کی گونج سے بیدار ہوتے ہیں دماغ　　زندگی اس قصر میں ہو اک حسیں موجِ فراغ
حسن بھی ہو، نغمہ بھی، مے بھی ہو، مے آشام بھی　　صبح کے مانند روشن ہو یہاں کی شام بھی
اس فضا میں دخل پا سکتے نہیں، حزن و ملال　　زندگی ہے اور شرابِ نکہت و رنگ و جمال
ہے انہیں انوار سے رخشاں زمانے کی جبیں　　وہ یہی جلوے ہیں جن پر ناز کرتی ہے زمیں

لیکن اس عشرتکدے کو غور سے ہمراز! دیکھ　　آ ذرا لے پردۂ بزمِ زندگی کا راز دیکھ
دیکھنا، رشکِ سحر ہو، جن چراغوں کی بہا　　ان کے سائے میں ہیں کتنی سرد روحیں بیقرار
سُن! کہ جن سازوں کی ہر آواز ہو فردوسِ گوش　　کانپتا ہو انکی لے میں کتنے نالوں کا خروش
ہوشیار! اس بزم میں چلتے نہیں جامِ شراب　　یہ دلوں کا خون ہو یا روحِ انسانی کی آب
سوچ! ہو ان قہقہوں کی تہ میں شیطانی ہنسی　　بے نیازی، باطل آرائی، خداوندی، خودی
جا نہ ان چہروں کی شادابی پہ ہیں جو لالہ فام　　آہ یہ تاریک باطن، دولت و زر کے غلام!
ان کی روحیں وقف ہیں بندِ غلامی کیلئے　　ناشناسی، خود فریبی، ناتمامی کے لئے
دیکھ! وہ تھرا رہی ہو چرخ پر برقِ عذاب　　عصمتوں کے خون سے رنگین ہو انکا شباب

بیخودی سی ہستیٔ شاعر پہ تھی چھائی ہوئی اضطراری جنبشیں، آواز تھرائی ہوئی
کہہ رہا تھا یہ حدیث درد و غم دیوانہ وار کس قدر بیتاب ہے محو رنج، کتنا بے قرار
میں نے پوچھا، اے کہ تجھ سے بزم گیتی کی بہار! اے کہ تیری روح پر اسرار ہستی آشکار!
آج یہ کیا ہے کہ تیرا قلب یوں بیتاب ہے گفتگو بے ربط، لب ہیں خشک، رخ بے آب ہے
بھول بیٹھا آج پیغام محبت کس لئے تجھ کو ہے دنیائے کم بیں کی شکایت کس لئے

کچھ بتا تو اے فروغ بزم فطرت، نکتہ سنج!
ہم بھی شاید کر سکیں سعیٔ دوائے درد و رنج

سن کے یہ تیزی سے پلٹا، شاعر درد آشنا میرے چہرے پر جما دی پھر نظر، اور یوں کہا
آہ، دنیا کے عمل سے بیخبر، معصوم روح! تو کہاں اور اے تہی ساغر! کہاں کیف صبوح
کھوکھلے دعووں سے میرے زخم بھر سکتے نہیں اہل دنیا، منہ سے جو کہتے ہیں کر سکتے نہیں
بڑھتے جائیں گے یہ میرے دامن ہستی کے چاک نذر موج باد ہو جائیگی میری مشت خاک
لیکن اب حد سے تجاوز کر چکا صبر و شکیب یاد رکھو، چل سکے گا اب نہ باطل کا فریب
چھا رہا ہے ابر یکرنگی، قریب و دور پر عیش کر سکتے نہیں تم محنت مزدور پر

قصر و بام و سقف و ایوان و مکاں گرنے لگیں
ہوشیار اس وقت سے جب بجلیاں گرنے لگیں

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

عہد گزشتہ کی ایک سیر گاہ

آ نکلے ہو تو دم بھر ٹھہر ٹھہر ذرا عمر لیجو ! — ہم اس زمیں پہ کیا کیا فتنے جگا چکے ہیں
کیسی یہ جلد بازی، دیکھو تو یہ بہاریں — یاں دامنوں کے کیا کیا زنّار اُڑا چکے ہیں
ہاں یہ وہی ندی ہے، جس میں نہا نہا کر — کتنے ہی ساونوں میں طوفاں اٹھا چکے ہیں
ساحل پہ کرم خوردہ، یہ کشتیاں وہی ہیں — جنمیں خم و سبو کے دریا بہا چکے ہیں
یہ سبزہ ہے جہاں ہم سوئے ہوؤں کی منہ پر — صہبا چھڑک چھڑک کر اکثر جگا چکے ہیں
اس سامنے کے بن میں نغمے سنا سنا کر — لب کیسے انکھڑیوں کو مطرب پلا چکے ہیں
ہاں یہ وہی چمن ہے جس میں فروغ مے سے — کلیاں سی، کمسنوں کے رخ پر کھلا چکے ہیں
دیکھو یہ بوستاں ہے، جس بوستاں میں اکثر — کیا کیا جوانیوں کی عیدیں منا چکے ہیں
ہاں اس طرف یہ دیکھو، سرشار وادیاں ہیں — ان وادیوں میں کیا کیا دھومیں مچا چکے ہیں

قائم رہے الٰہی یہ جوشؔ کی نشانی
اس سرزمیں پہ کیا کیا معشوق آ چکے ہیں

طعن بے اثر

اے شیخ شہر، خرقۂ سالوس اتار دے — دل کو بھی کاکلوں کی طرح اب سنوار دے
بنیاد کاروبار ہے جس ماہوش کا نام — اس ماہوش کو خلوتِ جاں میں بھی بار دے
تا چند منعموں کے لئے مژدۂ چمن — خود کو بھی اب پیامِ نسیمِ بہار دے
تا چند اہلِ ذر کے نکھارا کرے گا رنگ — اپنے بھی دل کا رنگ خدارا نکھار دے
ہر دل پہ کندہ کرتا ہے جو نقش دلنشیں — خود اپنی لوحِ دل پہ وہی نقش ابھار دے
جس درس پر مدار ہے تیرے عروج کا — اپنے کو بھی وہ درس تمنائے یار دے
اس ظاہری کلاہ کی تزئین تا بکجا — باطن کے تاج کو بھی درِ شاہوار دے

کیا مسکرا کے جوشؔ دیا شیخ نے جواب
"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"

جوشؔ (ملیح آبادی)

آجا

آجا سکونِ دردِ تمنا لئے ہوئے — پلکوں کی اوٹ قلزمِ صہبا لئے ہوئے!
پھر لوٹ لے خدا کیلئے دولتِ سکوں — گیسو بدوش ساغر و مینا لئے ہوئے!
آ! اے بہارِ باغ کہ پھر منتظر ہے آج — نرگس کی آنکھ ذوقِ تماشا لئے ہوئے!
للہ دو قدم اسی انداز سے خرام — ہر گام پر ہوا کا سہارا لئے ہوئے!
آنگنے میں پھر اسی عنوان سے در آ — صد شکوہ ہائے جورِ اعزا لئے ہوئے!
ہاں پھر وہی تبسمِ محجوب زیرِ لب — عارض کی سرخیوں میں فسانہ لئے ہوئے!
پھر پھیر لے خدا کیلئے یک بیک نگاہ — دل میں غبارِ رنجشِ بیجا لئے ہوئے!

ہاں ابتدائے پھر وہی طالبِ حدیثِ شوق
"آجا سکونِ دردِ تمنا لئے ہوئے!"

طالب باغپتی

وجدانیات

سحر کا عالم ہے بارشِ نور سے فضا جگمگا رہی ہے — کوئی حسینہ تجلیوں کے خموش دریا بہا رہی ہے
چمن کی رنگین وسعتوں میں ستارۂ ہستی لرز رہا ہے — بہار کی زرنگاریوں سے کلی کلی مسکرا رہی ہے

نگاہ میں روح کیف بھر دے دلوں کو مست خمار کر دے — حریمِ ہستی کے ذرے ذرے کو عرش سے ہمکنار کر دے
اٹھ! اے جنونِ خیز نغمہ گر آتشِ ترنم کو منتشر کر — فضائے عالم کو شعلہ افشاں نوائے دل بیقرار کر دے

باقی صدیقی

معلومات

تبدیل جنس کا عجیب واقعہ

حال ہی کا عجیب و غریب واقعہ ڈنمارک کے ایک مصور کا ظہور میں آیا جس میں دفعۃً علامات نسائی ظاہر ہونے لگیں اور جسم و روح کی سخت تکالیف اٹھانے کے بعد وہ آخرکار عورت بنا اور پھر مرگیا۔

اس کا نام واجنر تھا اور اپنے وطن ڈنمارک سے پیرس میں آیا تھا تاکہ نقاشی کا فن سیکھے یہاں اس کو خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔ اور ایک لڑکی سے جس کا نام گارڈا تھی شادی کرلی۔

ایک زمانہ ان دونوں کو مسرت و لطف کی زندگی بسر کرتے ہوئے گزر گیا۔ اور کوئی بات ایسی ظاہر نہ ہوئی۔ کہ ان کی مسرتوں میں کمی پیدا ہوتی۔ ایک دن اچانک واجنر نے اپنے اندر خاص قسم کا اضمحلال محسوس کیا۔ اور اُسے لوگوں کے پاس بیٹھتے شرم سی آنے لگی۔ اس تغیر روحانی کے چند دن بعد اس کے جسم میں بھی تغیر ہونے لگا یعنی وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا مردانہ عضو، نسائی عضو کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔

اس نے ایک نہایت مشہور ڈاکٹر "وارن کردس" سے مشورہ کیا اور ہفتوں تک معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ "تم آہستہ آہستہ مرد سے عورت بنتے جا رہے ہو، لیکن اگر تم عمل جراحی کے لئے راضی ہوجاؤ تو وہ نتیجہ جو برسوں کے بعد ظاہر ہونے والا ہے جلد ظاہر ہوسکتا ہے۔

یہ راضی ہوگیا اور کامل چھ ماہ کے اعمال جراحی کے بعد وہ مکمل عورت بن گیا۔ اور اس نے اپنا نام لیلا رکھ لیا۔ اس کی بیوی مجبوراً ایک اور اطالوی شخص سے شادی کرکے جس کا نام پورٹا تھا چلی گئی۔

اتفاقاً چند ماہ کے بعد جب واجنر مصر کی سیاحت میں مصروف تھا کہ اس کی بیوی گارڈا اپنے نئے شوہر کے ساتھ نظر آئی اور اس نے اپنے پہلے شوہر کو دیکھ کر بہت افسوس کیا۔ کیونکہ یہ بہت نحیف حالت میں تھا۔ اور اس کی خدمت کرنے لگی چند ماہ تک باہم قیام کرنے کے بعد واجنر یا لیلا کی صحت بہت اچھی ہوگئی۔ اور تمام مظاہر حسن و جمال کے لحاظ سے ایک نہایت ہی دل کش و حسین عورت کی طرح، تمام محافل رقص و سرور میں اس کی پزیرائی ہونے لگی۔

چین کا فن گداگری

دنیا میں صرف چین ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں باقاعدہ گداگری کی تعلیم دیجاتی ہے اور جہاں ان کی منظم باقاعدہ جماعتیں ہیں جو ایک سردار کی ہدایات پر عمل کرتی ہیں۔ ان گداگروں کا بادشاہ الگ ہوتا ہے جو تمام خیرات کی رقموں کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اور حسب ضرورت

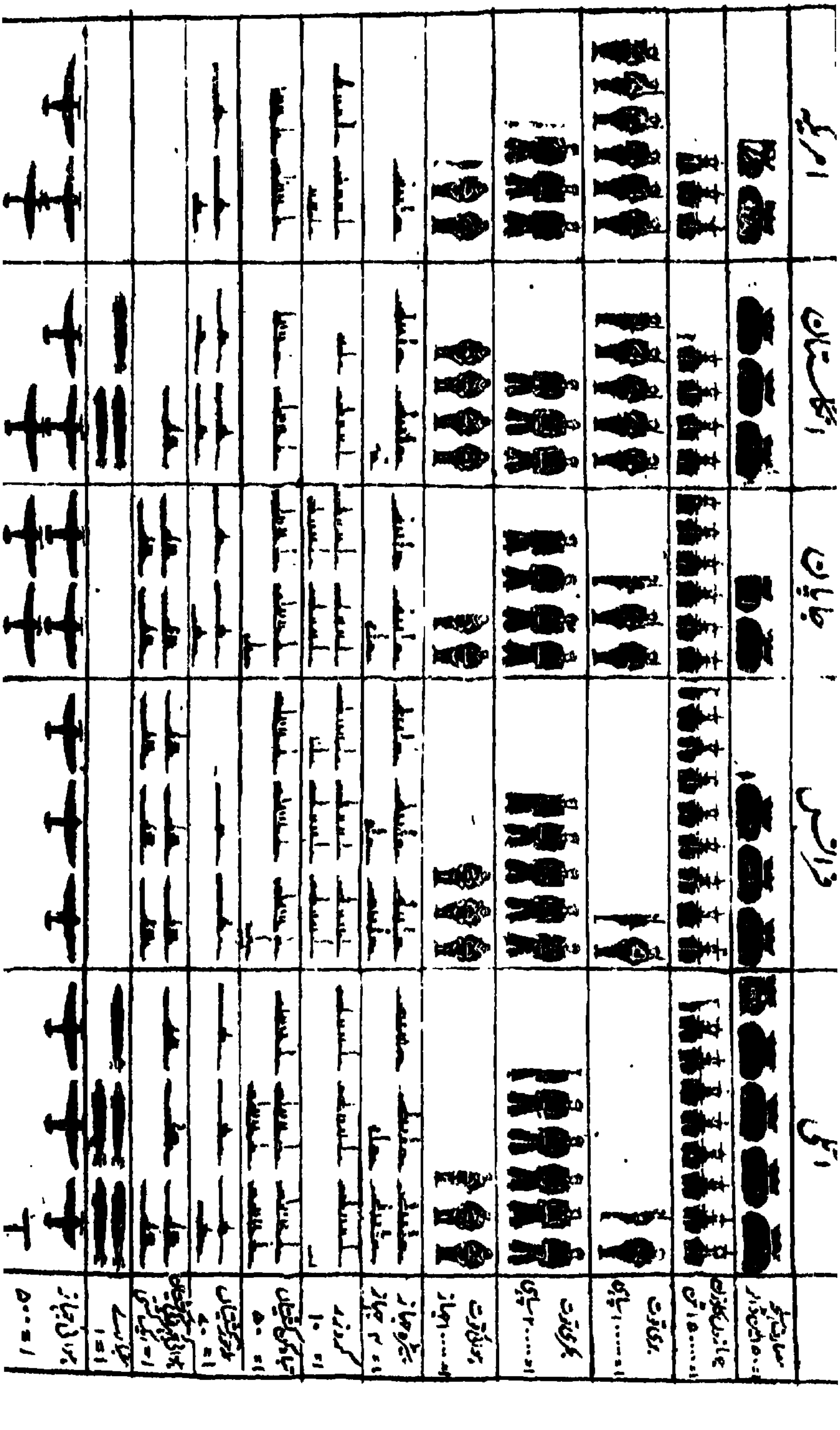
اپنی امت کو تقسیم کرتا رہتا ہے۔

گداگری کے مدرسہ میں طلبہ فیس لے کر داخل کئے جاتے ہیں۔ اور یہاں ان کو اس فن کے تمام رموز و اسرار سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ ان طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو مصنوعی طور پر اندھا یا کوڑھی ثابت کریں، کن الفاظ کے ساتھ سوال کریں کہ دوسرے کو رحم آجائے اور جب کوئی رقم لے تو کس طرح شکریہ ادا کریں۔ اور کیونکر اپنی آواز کو دردناک بنا کر اپنی مصیبت کا یقین لوگوں کو دلائیں۔ اگر کوئی طالب علم اس قدر ذہین نہیں ہوتا کہ ان باتوں کو سیکھ سکے تو حقیقتاً اس کے اعضاء توڑ کے اس کو بیکار و معطل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی صورت کو زخموں سے بگاڑ کر حد درجہ مکروہ بنا دیتے ہیں۔

وہاں تاجروں کا فرض ہے کہ گداگروں کو خیرات دیں۔ اور اس صندوں میں رقم خیرات کی جمع کر دیں۔ جو "شاہ گداگراں" کی طرف سے ان کی دوکانوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی تاجر خلاف ورزی کرتا ہے تو سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں گداگروں کی فوج اس کی دوکان پر دھاوا بول دیتی ہے۔ اور اس کے کاروبار کو بالکل معطل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار مجبور ہوکر اسے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔

نیاز





امریکہ
انگلستان
جاپان
فرانس
اٹلی
مصارف اسلحہ
بری قوت
بحری قوت
ہوائی قوت
بیڑہ جہاز
کروزر
تباہ کن کشتیاں
غوطہ خور کشتیاں
ہوائی جہاز بردار کشتیاں
ہوائی جہاز

انیس۔ باہیں جو گلے میں تھیں تو بند دیدۂ خونبار

اعتراض۔ یہ سب مصرع ناموزوں ہیں ان میں پہلے میں رانڈ۔ کی ڈال دوسرے میں عورات کا عین تیسرے میں بند کی دال تقطیع سے گر گئی۔

جواب۔ یہ سب کاتبوں کی غلطی ہے۔

مولانا شبلی۔ حرفوں کا تقطیع سے گرنا اگرچہ واقعی ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن اساتذہ کے یہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

عزت شیرازی۔ مرا پند خردمنداں بحال خود نمی آرد باہیں فرما نہا مجنوں عشق عاقل نمی گردد

عاقل۔ تا توانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش

علی۔ اے رگ جان بہار این ہمہ بیرحمی چیست خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

غنی۔ تن گل۔ عارض گل۔ بدن گل۔ چہرۂ گل۔ رخسار گل۔

" بدہ ساقی آن آب یاقوت را کہ سازم علاج عقل فرتوت را

(مولف) مولانا شبلی نے عین کے سقوط کی مثالیں بہت سی پیش کردی ہیں۔ مگر میں ہر حرف کے گرنے کی مثال کلام اساتذہ سے دے سکتا ہوں۔ پھر بھی غلط کی مثال غلط ہی کہلائے گی۔

انیس۔ ناگاہ بجا فوج عدو میں طبل جنگ

" ہو مغفرت خلیق کی یارب ذوالکرام

اعتراض نسّاخ۔ طبل متحرک الاوسط صحیح نہیں اور ذوالکرام مہمل لفظ ہے

جواب۔ اصل میں طبل کی بجائے دہل۔ اور ذوالکرام کی بجائے یاخالق الانام تھا۔

(مولف) جواب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کیا سند ہے کہ یوں نہ تھا یوں تھا۔

انیس۔ تھا زیر زرہ گاؤسر اس طرح کا بکتر

اعتراض۔ بکتر گاؤسر نہیں ہوتا

جواب۔ مصرعہ یوں تھا۔ پہنے ہوئے زیر زرہ اس طرح کا بکتر

(مولف) یہ جواب فضول ہے۔

انیس۔ اتر ا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی
اعتراض۔ کونین کا عالی بالکل مہمل ہے
جواب۔ اصل میں عالی کی بجائے والی تھا۔

انیس۔ رنگ رُخ کفار عرب ہو گیا فق سے
اعتراض۔ رنگ فق سے ہو گیا۔ محاورہ نہیں
جواب۔ میر انیس جو کچھ کہدیں وہی محاورہ ہے
(مولف) کیا خوب جواب ہے۔

انیس۔ شرمندہ زمانہ سے گئے وایل وسحبان
اعتراض۔ وایل کوئی فصیح نہیں تھا۔
جواب۔ اصل یہ ہے دعبل وسحبان
(مولف) کیا جواب دیا ہے سبحان اللہ

میر انیس و مولانا شبلی

انیس۔ بت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کس نے
اعتراض مولانا شبلی۔ صاف کر دیا چاہئے
(مولف) دلی کے عوام صفا کر دیا بھی بولتے ہیں۔ اور بعض اساتذہ کے کلام میں بھی دیکھا گیا ہے مگر اب بالکل متروک الاستعمال ہے۔

انیس۔ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی
اعتراض۔ پروانگی غلط ہے
(مولف) پروانگی بمعنی اجازت صحیح ہے۔ چنانچہ صاحب فرہنگ انندراج نے فرہنگ جہانگیری کے حوالے سے یہی معنے لکھے ہیں۔ اور کسی استاد کا یہ مصرع بھی نقل کیا ہے ؎ کہ پروانگی داد پروانہ را

انیس۔ جو حرف قراں کا ہے وہ ہے لائق تعظیم
اعتراض۔ قِرَان بر وزن فعلان ہے
(مولف) اگرچہ قِرآن بمدالف ہی صحیح ہے اور زیادہ تر استعمال اسی طرح کیا گیا ہے۔ مگر فصحائے عجم نے بغیر مدّ الف بر وزن زماں بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ خاقانی کہتا ہے۔

خسرواں چار اند مملکت دو　　　یزداں دو قراں دکعبۂ دو تو

انیس۔ ایسا بھی کوئی بے کس و بے آس نہ ہوگا
اعتراض۔ بے آس کا عطف بیکس پر جائز نہیں۔
(مولف) اعتراض صحیح ہے کیونکہ بے آس ہندی ہے۔ اور اس طرح ہندی فارسی کی اضافت کو معیوب بلکہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض لوگ اس کے جواز کے قایل ہو چلے ہیں۔

انیس۔ گرتے تھے طیوراں ہوا کھوئے ہوئے ہیر
اعتراض۔ طیور خود جمع ہے۔ اور اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہے نہ مستعمل ہے
(مولف) طیور اگرچہ جمع ہے مگر طیوراں اس کی جمع الجمع بھی فصحائے عجم نے استعمال کی ہے۔ غالباً مولانا نے توجہ نہیں فرمائی۔ انیس کے پیش نظر ہو یا نہ ہو مگر اب ان کا شعر صحیح مانا جائے گا۔ مثال کے لئے حکیم حاذق کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔
حکیم حاذق۔ بدام زلف تو نہ آدمی دگاہ ملک　　　گہے وحوش گرفتار و گہ طیور انند

انیس۔ جو خوبیاں کہ چاہئیں وہ سب حصول ہیں۔
اعتراض۔ حصول کے بعد حاصل چاہئے
(مولف) اعتراض صحیح ہے۔

انیس۔ کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباس
اعتراض۔ کمتی انفار اور اراذل کی زبان ہے
(مولف) بالکل صحیح اعتراض ہے۔ کم از کم میر انیس کی زبان سے تو یہ لفظ بہت ہی بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔

انیس۔ کرّار ہے وہ شخص نہ غیرِ فرار ہے
اعتراض۔ کرّار بہ تشدید چاہیئے
(مولف) یہ صیغہ مبالغہ کا ہے یقینی بہ تشدید ہونا چاہیئے

انیس۔ عالم کی تغیری یہ بحالی کی ہے آمد
اعتراض۔ تغیری صحیح نہیں۔
(مولف) اول تو تغیرّ مشدّد الیاء کو بغیر تشدید کہنا ہی ستم ہے۔ اوس پر یائے تحتانی کا اضافہ اور بھی قیامت ہے۔

انیس۔ مت روکنا ہے خاطر مہماں واجبات
اعتراض۔ واجبات سے۔ یا واجب چاہیئے
(مولف) بیشک اس قسم کی تخفیف اور محذوفات نہایت برے ہوتے ہیں۔

انیس۔ اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہوگئی شہر میں
اعتراض۔ خوشی کی بجائے خوش چاہیئے۔
(مولف) بیشک خوش چاہیئے۔ مگر بعض لوگ اس طرح بھی بول جاتے تھے۔ جیسے کہ ایک جگہ آتش نے کہہ دیا ہے؎

بہار گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

میرے خیال میں اس قدر شعر نمونے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ورنہ اہل نظر نے میر صاحب کے کلام پر سستی بندش۔ رعایت ضلع جگت کے بھی اعتراضات کئے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے قادر الکلام استاد پر سرقہ کے الزامات بھی لگائے ہیں اور اگر وہ الزام صرف الزام ہی ہوں تو خیر۔ قیامت تو یہ ہے کہ واقعتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس نے قصداً وہ شعر دوسروں کے یہاں سے لئے ہیں کیونکہ بندش اور الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ جب تک خصوصیت کے ساتھ توجہ نہ کی جائے اس قسم کے مضمون خود بخود نہیں سکتے مثال کے لئے ذیل کے اشعار دیکھئے۔

میر ضمیر؎ پہچانتے ہو کس کی مری سر پہ ہے دستار دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار
باندھا ہے کمر میں جسے یہ کس کی ردا ہے کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اسکو سیا ہے

میر انیس اسی مضمون کو اپنی زباں میں اپنے قلم سے اس طرح بیان کرتے ہیں

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار — یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوئے ہیں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ جامہ آئینہ جوہر دار — کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

میر نصیر۔ — جب تک کہ ذوالفقار نے کاٹے نہ تین پر — ہرگز نہ دم لیا پر روح الامین پر
میر انیس۔ — خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر — کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر
لاعلم۔ — کوتاہ ہے کہ بود زعمر دراز بود
انیس۔ — اے عمر دراز تیری کوتاہی ہے
بوعلی سینا — کردم ہمہ مشکلات عالم را حل — ہر بند کشودہ شد مگر بند اجل
میر انیس۔ — عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس — یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا
کاتبی۔ — بودیم ہمچو نافہ ہمہ عمر در خطا — موئے سفید بین و درون سیاہ ما
انیس۔ — نافہ کی طرح عمر خطا میں گزری — بالوں میں سفیدی ہے سیاہی دل میں
نظامی۔ — سناں بر سناں رستہ چوں نوک خار — سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار
انیس — ہر سمت تھی سناں پہ سناں مثل خارزار — ہر صف میں تھی سپر پہ سپر مثل لالہ زار
لاعلم — چو نفی و اثبات است از مرون ہمی ترسم — بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من
میر انیس۔ — خود پیام زندگی لائی قضا میرے لئے — شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

بساطی[1] سمرقندی و آزاد

[1] بساطی کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ سلطان خلیل بن میران شاہ گورگانی کے عہد میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ اور وہیں نشو و نما اور عروج پایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان کی محفل میں گانے والوں نے اس کا یہ مطلع گایا۔

دل شیفتہ و حیرانِ تو ہر گوشہ بر بندش — مستند مبادا کہ بناگہ شکنندش

بادشاہ کو یہ مطلع اتنا پسند آیا کہ بساطی کو فوراً بلایا اور بے انتہا تعریف کے بعد ہزار۔۔۔ دینار انعام دیئے اسی مطلع پر مولانا آزاد نے اعتراض کیا ہے

آزاد - جو لوگ کہ عیوب قوافی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس مطلع میں شائیگاں کا عیب ہے مگر لسباطی کے لئے مبارک ہوگیا کہ اسی شائیگاں کی بدولت گنج شائیگاں پایا۔

(مولف) چونکہ قافیے برند - اور شکنند ہیں - اور ان کا مصدر بردن اور شکستن ہے جو ہمقافیہ نہیں لہذا اس کو شائگاں کہا گیا۔ اعتراض صحیح ہے کیونکہ شائیگاں کی مختصر تعریف یہ ہے کہ قافیہ اگر فعل ہو تو اس سے زوایدکو دور کرنے کے بعد امر ہیے بامعنی رہے ہم قافیہ نہو - چنانچہ برند - اور شکنند میں سے جب زوایدیعنی نون اور دال کو نکال ڈالیں گے تو - بر - اور شکن رہجائے گا - اور ظاہر ہے کہ بر اور شکن ہم قافیہ نہیں ہیں اس واسطے اس کو شائیگاں اور ایطا، شمار کیا جائے گا - حاصل کلام ایطا، وہی ہے کہ قافیہ میں معنی واحد پر حرف زوایدکی تکرار بغیر موافقت روی کے پائی جائے - اس کی دو قسمیں ہیں - خفی اور جلی - خفی وہ ہے کہ تکرار حرف زاید بہت ظاہر نہو - جیسے دانا و بینا کہ ان میں الف زاید جزو کلمہ معلوم ہوتاہے - اور جلی وہ ہے کہ اس میں تکرار زواید خوب ظاہر ہو - جیسے گلزار - اور لالہ زار -

مرزا غالب کا ایطا کے متعلق یہ فیصلہ ہے . کہ ایطا اس کو کہتے ہیں کہ دو کلمے ایک صورت کے ہوں جیسے الف گویا اور بنیا - اور شنوا کا - اور ایسا ہی الف و نون جمع مثل چراغاں و جوانان کے اور ایسا ہی الف و نون مانند گریاں و خنداں کے پس اگر یہ مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے اور اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ آئے تو ایطائے خفی ہے -

---

بیدل و معترضین

بیدل یعنی فخر ہندوستان خلاق المعانی مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی - جن کے کمال کا ہر شخص معترف اور مُقر ہے - چونکہ ایسے ایسے ملبند مضامین ان کے یہاں پائے جاتے ہیں جو مشکل سے دوسروں کے یہاں پائے جاتے ہیں اسی وجہ سے اُن کو ضرورت پڑی ہے کہ کہیں کہیں خود ساختہ ترکیبیں استعمال کی ہیں - اسپر بعض مدعیوں نے اعتراض کیاہے - اور کہاہے کہ قرآن شریف جو خالق السنہ کا کلام ماناگیا ہے . وہ بھی عرب کی زبان ہی کی مطابق اور موافق ہے اگر اس میں بھی خلاف زبان کوئی اختراع ہوتا تو اہل عرب قبول نہ کرتے - اسی طرح ایک غیر فارسی جو فارسی زبان کا مقلد ہو اس کی کوئی بات بغیر موافقت اصل کے کیونکر مقبول ہوگی - مثلاً مرزا عبدالقادر نے اپنے بچے کے مرثیہ میں یہ شعر کہاہے ؎

ہر گہ دو قدم خرام مے کاشت　　　　از انگشتم عصا بہ کف داشت

معترض۔ یہ خرام کاشتن عجیب چیز ہے۔
جواب خان آرزو۔ مرزا نے اپنے قادر الکلام ہونے کی وجہ سے چونکہ تصرفات نمایاں فارسی میں کئے ہیں اس لئے اہل فارس اور کاسہ لیسان فارس ہندی نژاد مرزا کے کلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر مجھے ہندوستان کے قادر الکلاموں کے تصرفات پر ذرا بھی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ رسالہ داد سخن میں طرح طرح کے دلائل سے میں نے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ اگرچہ میں خود احتیاطاً تصرف نہیں کرتا ہوں۔

(مولف) یہ وہی ملکی اور غیر ملکی۔ شہری اور قصباتی کا جھگڑا ہے جو آج دہلی و لکھنؤ اور باہر کے شعراء میں ہوا کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ شعراء جو قادر الکلام ہیں انکا تصرف ہر صورت میں مقبول ہوگا خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں۔ کیا سبب ہے کہ اہل ایران، اہل عرب کی زبان میں اور اہل عرب اہل فارس کی زبان میں ہزاروں تصرفات گوناگوں کریں اور وہ مقبول ہوں۔ اور اہل ہند اگر خود اپنی زبان میں یا اہل فارس کی زبان میں کوئی تصرف کریں وہ مطرود و مردود ہو۔ ایک غیر ملکی عرب میں بارہ برس رہنے کے بعد اپنے مواظبت و مداومت کی وجہ سے مستند تسلیم کر لیا جائے اور ایک ہندی باوجود فارسی پر کامل عبور کے بھی قابل استناد نہ ٹھہرے تعجب ہے اور سخت تعجب ہے۔ ذرا اہل فارس کے اپنی زبان میں چند تصرفات ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا روم۔ برگماں چوں شاخہا بہ شگافتند تا بہ بالائے درخت اشتافتند

باز گو کز ظلم آن استم نما صد ہزاران زخم دارد جان ما

دونوں شعروں میں تصرف ہے ایک جگہ شتافتن کو اشتافتن بنا دیا۔ ایک جگہ ستم کو استم بنا دیا۔

اندام کو ایک عضو کے معنی میں استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو۔

فردوسی۔ تنش نقرۂ پاک و رخ چوں بہشت بر و بر نہ بینی یک اندام زشت

ماضی استمراری کے صیغہ کی جگہ ماضی تمنائی کا صیغہ۔

فردوسی۔ ہمی بوئے مہر آمد از باد او بدل راحت آوردمے یاد او

اختیار بمعنی برگزیدہ۔ نظامی ۔ از انجملہ در حضرت شہریار بلیناس فرزانہ بود اختیار

آفتاب کو باتباع اہل عرب مونث فرمایا گیا ہے۔ حکیم سنائی

مردی چنان شد از تو کہ در خویشتن ندید جز سادگی مشابہت دختر آفتاب

امشب۔ بمعنی شب گزشتہ۔ نظیری۔

تا روز مکیدم سر انگشت حلاوت زان قند کہ امشب زشکر خند شکستم

برگاشت۔ بمعنی برگشت۔ فردوسی

عناں را بہ پیچید و برگاشت روئے　　　　بر آمد ز لشکر یکے ہائے و ہوئے

غرضکہ اسی قسم کے ہزاروں تصرفات اور بیشمار زبردستیاں اہل فارس کے کلام میں پائی جاتی ہیں مگر جہاں کسی ہندی نے کوئی تصرف کیا اسپر اعتراضوں کی بوچھار کردی گئی ہے۔

بیخود دہلوی[۵] و عشرت رام پوری

بیخود۔　　پہلے دل کو گدگدایا ہے نظر کے تیر نے　　چٹکیاں تو بعد میں لیں شوخی تقریر نے

اعتراض۔　　مصرع اولیٰ میں " ہے " بھرتی ہے جو فصاحت کے خلاف ہے۔ اس طرح لکھتے اور بولتے ہیں:۔ پہلے ہم وہاں گئے پھر واپس آئے۔

(مولف) غالباً معترض نے غور نہیں فرمایا۔ مصرع اولیٰ میں " ہے " بھرتی کا نہیں۔ بلکہ اسطرح بولا جاتا ہے

بیخود۔　　جب بیاں کی ہے تمنا عاشق دلگیر نے　　کن بُری نظروں سے دیکھا ہے تری شمشیر نے

اعتراض۔　　دونوں مصرعوں میں " ہے " بھرتی ہے۔

(مولف) اس کا جواب اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ کہ دہلی اور لکھنؤ میں اس طرح بولا جاتا ہے۔

بیخود۔　　مجھکو الجھایا ہے کیا کیا وصل کی تدبیر نے　　کروٹیں سی کروٹیں لی ہیں تری تقدیر نے

اعتراض۔　　الجھایا ہے تدبیر نے یعنی چہ۔

---

[۵] وحید الدین صاحب بیخود دہلوی داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ کلام میں شگفتگی، روزمرہ۔ اور اُستاد کا صحیح تتبع۔ بندش کی خوبیاں طرز بیاں کی دلچسپیاں غرضکہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔

بیخود صاحب نہایت خوددار باوضع۔ نیک مزاج انسان ہیں یہاں تک کہ آپ کو قدیم شرفائے دہلی کی حقیقی یادگار کہا جا سکتا ہے۔ آپ کا دیوان موسوم بہ گفتار بیخود طبع ہو چکا ہے۔ اس کی ایک کاپی مصنف نے خود مجھکو عنایت فرمائی تھی۔ شرح دیوان غالب اردو بھی آپ نے لکھی ہے جو لاہور کے کسی مطبع میں طبع ہوئی ہے۔ عمر تخمیناً ساٹھ سال کی ہوگی

جناب عشرت رحمانی صاحب سے مجھے واقفیت نہیں۔ لہٰذا مجمل یا مفصل کچھ بھی نہیں لکھ سکتا آپ نے مرقع اگست ۱۹۲۸ء میں جناب بیخود کی ایک غزل پر اعتراضات فرمائے تھے ان کو پیش کرکے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

(مولف) الجھایا ہے کے معنے غالباً یہاں اپنی طرف متوجہ کرنے کے ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ تو کہئے کہ تدبیر نے مجھے اپنی طرف الجھائے رکھا۔ مگر یہ معنے دور از قیاس ہیں۔ اس لئے سیدھے سادے یہ معنی ہیں کہ میں جو وصل کی تدبیریں کرنے لگا تو بہت اُلجھا۔ اور بے انتہا پریشان ہوا۔ ان تدبیروں نے مجھے مار ڈالا۔ کیونکہ تقدیر نے ایسی ایسی کروٹیں بدلیں کہ عاجز ہو گیا۔

بیخود۔ ہائے وہ ترچھی نظر غصہ کے تیور سُرخ آنکھ دل کو زخمی کر دیا بانکی ادا کے تیر نے

اعتراض۔ مصرع اولیٰ میں فرماتے ہیں۔ "ہائے وہ ترچھی نظر۔ غصہ کے تیور۔ سُرخ آنکھ"۔ اور مصرع ثانی میں دل کو زخمی کر دیا بانکی ادا کے تیر نے۔ بانکی ادا کا تیر تو (ترچھی نظر) ہے لیکن یہ غصہ کے تیور اور سُرخ آنکھ برائے بیت۔ اگر یہ کہا جائے کہ غصہ کے تیور اور سرخ آنکھ سے بھی وہی بانکی ادا کا تیر مُراد ہے تو کیونکر غصہ کا تیور بانکی ادا کا تیر ہو سکتا ہے۔ اور سُرخ آنکھ کیا ہو گی۔

اس کے علاوہ سُرخ آنکھ یا تو کوئی مخصوص محاورہ ہے کہ ہر انسان کے لئے مخصوص انداز میں کہہ سکتے ہیں یا یہاں مخصوص انداز میں کہا گیا ہے۔ یعنی جس کی شان میں کہا گیا ہے اس کی صرف ایک آنکھ ہے ورنہ غصہ کے سبب آنکھیں سُرخ ہوتی ہیں۔ اور جو کسی کی آنکھ ایک ہی ہے تو سُرخ آنکھ میں کلام نہیں۔ یا کسی خاص سبب سے موصوف کی صرف ایک ہی آنکھ سُرخ ہو گی۔

(مولف) ترچھی، غصہ کے تیور، اور سرخ آنکھ ان سب کا نام ہی ادا ہے جس کے تیر نے زخمی کر دیا۔ سُرخ آنکھ یقینی قابل اعتراض ہے۔ مگر تعجب ہے کہ معترض کو ترچھی نظر پر کیوں نہ اعتراض ہوا۔

بیخود۔ یادِ گیسو اور وحشت کچھ اسی میں خیر تھی بھر لیا آغوش میں مجھکو مری زنجیر نے

اعتراض۔ آغوش بھرنا۔ آغوش میں بھرنا محاورہ غیر فصیح ہے۔ جس سے شعر کی خوبی اور سلاست میں فرق آگیا۔ آغوش میں بھرنا آج تک استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔

(مولف) آغوش میں بھرنا نہ فصیح محاورہ ہے۔ نہ غیر فصیح، بلکہ کولی بھرنا۔ کولی میں بھرنا ایک محاورہ ہے۔ جس کو شاید فارسی بنا کر استعمال کیا گیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ تصرف فی المحاورہ کی حد میں آتا ہے۔

بیخود۔ راہ کا سب حال مجھ کمبخت سے کیوں کہدیا آپ کی نیچی نظر اُلجھی ہوئی تحریر نے

اعتراض۔ خدا جانے کس راہ کا حال کہدیا۔ نیچی نظر اور اُلجھی ہوئی تقریر نے۔ کیونکر۔ اور کیا کہدیا شعر سے

تو کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔
(مولف) حقیقتاً اعتراض کی بنا صرف نہ سمجھنے پر منحصر ہے۔ ورنہ معنے تو صاف صاف یہ ہیں۔ کہ معشوق عاشق کے پاس باحال پریشان آیا ہے۔ عاشق نے الجھی ہوئی زلفوں۔ اور پریشان چہرے سے سمجھ لیا ہے کہ یہ کسی دوسرے چاہنے والے کے پاس سے۔ آئے ہیں۔ اسی بنا پر شعر کا مضمون ادا کیا ہے۔ انور دہلوی اور داغ کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

انور۔ نہیں سمجھا نہ تم آئے کہیں سے | پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

داغ۔ چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے | گرے ہوتے اُلجھکر آستاں سے

بیخود۔ موجزن رہنے لگی ہے دل میں یاد کوہکن | عیش شیریں کا کیا ہے تلخ جوئے شیر نے

اعتراض۔ شعر خلاف واقعہ ہے۔ شاعر نے شعر حال میں کہا ہے۔ اَب نہ شیریں ہے نہ کوہکن نہ جوئے شیر پھر کوہکن کی یاد کیونکر شیریں کے دل میں موجزن رہنے لگی۔
(مولف) شاعر کے لیئے یہ قید کہ جو واقعہ بیان کرے وہ زمانۂ حال ہی کا ہو ایک نئی اُپچ ہے دیکھئے ذوق اس واقعہ کو اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی زمانۂ حال ہی کا معلوم ہوتا ہے۔

مزا چکھا یا ہے کوہکن کو جو عشق آیا ہے امتحاں پر | کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر

ایک شاعر نے تو غضب ہی کیا ہے۔ اپنے آپ کو مجنوں کا معاصر بنا دیا۔ کہتا ہے۔

قیس کے حال کو سن سن کے جگر بیٹھتا ہے | ساتھ کھیلے کی محبت بھی بُری ہوتی ہے

ایسے ایسے ہزارہا شعر ملیں گے اصل یہ ہے کہ شاعر شاعر ہوتا ہے اُس کو مُورخ کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔

بیخود۔ اُن کے دل کی گلجھڑی مجھ سے سلجھ سکتی نہیں | کہدیا فرسودہ ہو کر ناخن تدبیر نے

اعتراض۔ گلجھڑی۔ نرالی اختراع ہے۔ گتھی تو سنا ہے۔ لیکن اس جدید لفظ سے آج ہی کان آشنا ہوئے۔ سند درکار ہے۔ نفظ گلجھڑی کے سلجھنے سے شعر کا مطلب بھی سلجھ جائے گا۔
(مولف) گلجھڑی۔ گلجھٹ۔ گلجھٹی سب صحیح ہیں۔

تسلیم و حسن [1]

---

[1] میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ضیا کے بیان میں تسلیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ سلام اللہ خان نام لکھتے ہیں باقی حال معلوم نہیں

تسلیم۔ دوش رفتم بر مزار کشتۂ تسلیم خویش ۔۔۔ مے نمود از دور صد شمع و چراغ حسرتے
چوں قدم نزدیک دیدم از تکلف ہا بسے ۔۔۔ یکدلے میسوخت باد و چند داغ حسرتے

اعتراض۔ یہ مضمون میر ضیا رسلہ اللہ کا ہے۔ سلام اللہ خان تسلیم نے فارسی میں ترجمہ کرکے اپنے نام سے شہرت دیدی ہے۔ اور یہ نہ سمجھا کہ صورت شناساں ملتا اور فرزند کو پہچان لیتے ہیں۔ وہی بات ہے۔ کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔

میر ضیا کے اردو کے شعر یہ ہیں۔

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دور سے میں ۔۔۔ آئی نظر مجھے واں شمع و چراغ کتنے
جاکر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص ۔۔۔ اک دل جلے ہے اسمیں حسرت کے داغ کتنے

(مولف) اس میں تو شک نہیں کہ یہ ترجمہ ہے۔ مگر میرے نزدیک ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ اردو میں فارسی سے۔ اور فارسی میں عربی سے بے شمار مضامین لئے گئے ہیں۔ یہ زبان کو وسیع کرنا ہے نہ کہ کوئی عیب۔ مثالوں سے آپ خود سمجھ لیں گے۔

انوری ؎ اے دریغا نیست ممدوحی سزاوار مدیح ۔۔۔ وے دریغا نیست معشوقی سزاوار غزل

یہ شعر بہت مشہور ہے مگر اصل شعر عربی میں ہے جو ابو اسحٰق ابراہیم بن یحییٰ بن عثمان بن محمد الکلبی الاشہبی کی طرف منسوب ہے۔

قَالُوا هَجَرْتَ الشِّعْرَ قُلْتُ ضَرُورَةٌ ۔۔۔ بَابُ الدَّوَاعِي وَالْبَوَاعِثِ مُغْلَقُ
خَلَتِ الدِّيَارُ فَلَا كَرِيمٌ يُرْتَجَى ۔۔۔ مِنْهُ النَّوَالُ وَلَا مَلِيحٌ يُعْشَقُ

نظامی ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالعم ہست ۔۔۔ ولد الزنا کش آمد چو ستارہ یمانی

ابو نواس فتنکر موتھم وانا سہیل ۔۔۔ طلعت لموت اولاد الزناء

اسی کا ترجمہ خاقانی کے یہاں بھی موجود ہے۔

گر مرا دشمن شدند این قوم معذورند از آنکہ ۔۔۔ من سہیلم کامدم بر موت اولاد الزنا

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰) میر حسن سے ایک دنیا واقف ہے۔ میر حسن میر ضاحک کے بیٹے تھے ان سے ایک ضخیم دیوان کئی مثنویاں۔ اور ایک تذکرہ اردو کے شعراء کا یادگار ہے۔

تذکرہ لکھتے لکھتے جابجا اعتراضات بھی کئے ہیں چنانچہ اپنے استاد میر ضیا کا حال لکھتے ہوئے تسلیم کے دو شعر لکھکر ان پر سرقہ کا الزام لگایا ہے۔

اردو میں فارسی کے اتنے ترجمے ہیں کہ لکھنے کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

منشی امیر اللہ تسلیم۔ آسمان گردش میں ہیں میری ستانے کیلئے چکیاں تو چل رہی ہیں ایک دانے کیلئے

فارسی آسمانہا در شکست من کمر ہا بستہ اند چل گہ دارم من ار نہ آسیا یکدانہ را

ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر کوئی مترجم اصل شعر میں کچھ تصرف کرکے اپنا بنانے کی نیت سے مضمون میں کچھ ردوبدل کرے تو اس میں سرقہ کا گمان کیا جا سکتا ہے۔

مرزا ثاقب[۱] و سراج

ثاقب۔ دل کے چھوٹے تھم نہیں سکتی بسیط خاک پر جو گرا آنسو وہ تارا ہو گیا افلاک پر

اعتراض۔ پہلے مصرع کا پہلا ٹکڑا غلط ہے۔ دل کے چھوٹے کے بجائے "دل سے چھوٹے" ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس فقرہ کا مطلب مفارقت اور جدائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو دل سے چھوٹے یا جو دل چھوٹ کر بجائے بسیط خاک پر اسکا ٹھہرنا غیر ممکن ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں میرے آنسو کو دیکھو کہ وہ دل سے چھوٹ کر یعنی جدا ہو کر آنکھ سے گرا تو ضرور مگر اس نے خاک پر قیام نہیں کیا۔ بلکہ فلک کا تارا ہو گیا۔

۲۔ آنسو دل سے چھوٹے یا جدا ہوئے یہ ایک خلاف حقیقت بات ہے نہ تو دل آنسوؤں کا وطن ہے اور نہ انکا جائے قیام۔

۳۔ بسیط کا لفظ پہلے مصرع میں بیکار ہے۔ اور شعر میں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ وہی مفہوم صرف لفظ خاک سے ادا ہوتا ہے جو دل سے چھوٹے وہ خاک پر تھم نہیں سکتے۔ آنکھ سے گرنے کے بعد ایک بے بضاعت اور کم مایہ آنسو کے لئے ایک انچ زمین کی بالائی سطح بھی کافی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عاشق کا ایک ایک آنسو طوفان نوح کا درجہ رکھتا

---

۱ مرزا ثاقب صاحب کا نام ذاکر حسین ہے آپ فرقۂ قزلباش سے ہیں۔ اکبر آباد کے رہنے والے ہیں عرصہ سے لکھنؤ میں بود و باش ہے اور راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار کے متوسلین و متعلقین میں ہیں۔ مرزا صاحب لکھنؤ کے مشہور بلکہ کامیاب شعرا میں سے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ اکثر شعر آپ نے ایسے کہے ہیں جن کو زمانہ موجودہ میں غیر فانی کے لقب سے یاد کرنا غالباً درست ہوگا۔ نہایت نیک مزاج اور صاف دل انسان ہیں۔

جناب سراج کا ذکر آپ سے پہلے آسی و سراج میں آچکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے جس مضمون کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ ان اعتراض پر مبنی ہے جو جناب سراج نے مرزا ثاقب صاحب کی ایک غزل پر کئے ہیں۔ چونکہ اعتراضات کی عبارت طویل ہو گئی ہے اس لئے جناب سراج ہی کی اجازت سے میں اعتراضات کو چنکر یہاں لکھے دیتا ہوں۔ یہ اعتراضات رسالہ بصر مطبوعہ ماہ نومبر و دسمبر ۲۹ء میں شائع ہوئے ہیں

ہے۔ اور اس کے سمانے کے لئے ہفت اقلیم کی وسعت درکار ہے اس لئے بسیط کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تو میں عرض کروں گا کہ اس شعر میں ایک آنسو سے طوفان نوح برپا کرنے کا کوئی قرینہ اور محل نہیں۔ کیونکہ آنسو اپنا چولا بدل کر اجرام فلکی کا ایک رکن بنا دیا گیا۔ اور خاکی یا آبی ہونے کے بجائے اب وہ فلک کا تارا ہوگیا اس لئے لفظ بسیط بہر طور مصرع کا وزن پورا کرنے کے لئے ہے۔

۴ - مصرع ثانی ظاہر کرتا ہے کہ جو آنسو گرا وہ تارا ہوگیا۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں مگر آنسو جو آنکھ سے گرنے کے بعد تارا بنا ہے بصیغہ واحد استعمال ہوا ہے اس لئے وہ فلک کا تارا تو ہو سکتا ہے مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک آنسو افلاک کا تارا بنے۔ جب تک اس کے کئی حصے نہ کر دئے جائیں افلاک فلک کی جمع ہے اور اس شعر میں محض قافئے کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

۵ - ردیف بھی کمزور ہے آنسو فلک کا تارا ہوگیا یا بن گیا کہنا چاہئے۔ فلک پہ تارا ہوگیا غیر فصیح ہے۔

۶ - اعتراضات سے قطع نظر کرنے کے بعد شعر کا ماحصل کچھ نہیں لغو ہے۔

(مولف) سراج صاحب کا پہلا اعتراض اس صورت میں بالکل صحیح ہے کہ مرزا ثاقب کا یہی مطلب ہو جو جناب سراج نے بیان کیا ہے۔ مگر کاش مرزا صاحب نے یہ مطلب رکھا ہو کہ جو لوگ چھوٹے ہوئے ہیں اور چھوٹے ہوئے بھی ایسے کہ دل سے چھوٹے ہیں یعنی اُن سے دلی قطع تعلق ہو گیا ہو۔ تو پھر ان لوگوں کا اتنی چوڑی چکلی زمین پر کہیں ٹھکانا نہیں۔ اس کے ثبوت میں دیکھو آنسوؤں کو یا آنسو کو کہ وہ دل سے چھوٹا ہوا ہے یعنی وہ ایک اجزء ہے جو دل سے اُٹھ کر آنکھوں کی طرف آیا اور اس میں ایک سیالی کیفیت پیدا ہوئی جس سے وہاں آنسو کے نام سے موسوم ہو کر گرا۔ اور گر کر آسمان کا تارا بن گیا۔ اس صورت میں سراج صاحب کے دو اعتراض ختم ہو جاتے ہیں۔ رہا تیسرا اعتراض بسیط والا وہ بھی ختم ہوتا ہے۔ یعنی اتنی بڑی زمین اس کے لئے کوئی امن و آسائش کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتی "جو از دل دور" کی زد میں آجائے۔ چوتھا اعتراض کہ ایک تارا کسی فلک کا تارا ہو سکتا ہے مگر افلاک کا تارا ہونا بعید از قیاس ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ پانچواں اعتراض کمزوری ردیف کا نہ بہت زوردار ہے اور نہ بالکل فضول چھٹے اعتراض کا کچھ حاصل نہیں۔

ثاقب۔ دلپہ اُبھریں نقش پا جب پاؤں رکھے خاک پر ... دل سے کہتا ہوں کہ آ نا لیو ہی بے باک پر

اعتراض (۱) لفظ دل مکرر استعمال ہوا ہے اور اس طرح کہ عیب میں داخل ہے دلپہ ابھریں اور دل سے کہتا ہوں۔

(۲) بے باکی ثابت نہیں ہوئی۔ معشوق پاؤں خاک پر رکھے اور اس کے نقش دل پہ ابھریں یہ تو کرامت ہوئی

(۳) دل کا آنا مشروط ہے۔ اگر اس شرط کا تعلق دل کی ذات تک محدود رہے تو خیر کوئی مضائقہ نہیں مگر کسی پر دل

کا آقا قائل کے حکم کی پابندی کا نتیجہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ کے حکم اور آپ کے مشورے سے اگر کسی پر دل آیا تو وہ دل کا آنا تو نہ ہوا۔ بلکہ کبوتروں کا پالنا ہوا۔ کبوتر باز نے کہا آؤ۔ اور وہ فوراً اتر آئے واہ رے دل اور واہ ری عاشقی

(مولف) پہلا اعتراض بالکل صحیح ہے۔ دوسرا اعتراض اگرچہ بعض دور از قیاس تاویلوں کی گنجائش رکھتا ہے مگر وہ بھی صحیح ہے۔ زیادہ سے زیادہ میرے خیال میں آتا ہے کہ وہ ایسا بے باک ہو کر پاؤں رکھنے کی جگہ دل بچھے ہوئے ہوں اور وہ خاک پر قدم رکھے تو دلوں پر پاؤں پڑے۔ مگر یہاں دل کی بجائے دلوں چاہئے مگر اس میں حسب خیال معترض کوئی بات بیباکی کی نہیں ہے کیونکہ یہ معشوق کے لئے فعل اختیاری نہیں ہے۔ تیسرا اعتراض بھی ایک حد تک صحیح ہے اگرچہ اس میں تاویل کی زیادہ گنجائش ہے۔

ثاقب۔ صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دل صد چاک پر

اعتراض (۱) صبر کو اگر قبا کہا جائے تو اس ایک عدد قبا کو وحدت سے گزر کر کثرت تک نہ پہونچنا چاہئے مگر مجبوری یہ ہے کہ دل صد چاک ہے اس لئے جناب ثاقب نے صبر کی ہزاروں قبائیں تیار کرالیں۔ اول تو یہ قبائیں ٹھیک نہیں اترتیں۔ اور اگر ٹھیک اتریں بھی تو ہر چاک کو ایک قبا پہنا دینے کے بعد کئی ہزار نو سے بچ رہیں گی۔ اور یہ سب بیکار جائیں گی شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ دل صبر نہیں کر سکتا مگر انداز بیان اور کتر بیونت نے خدا جانے اسے کیا بنا دیا۔ پہلے مصرع میں سالم کا لفظ بھی غیر ضروری ہے اگر یہ کہا جائے کہ صبر کی ہزاروں قبائیں ہیں تو اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ پھٹی ہوئی اور بوسیدہ ہیں جب تک ان میں پھٹی ہوئی اور غیر سالم نہ کہا جائے لہذا لفظ سالم کا زائد ہونا مسلم۔

ثاقب۔ دم نہیں لیتا دھواں دل کا نظر آئے تو کیا سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

اعتراض۔ دم نہیں لیتا دھواں۔ اس کے دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ دھواں ٹھہر جائے اور حرکت نہ کرے اور دم لینے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دھوئیں کا نکلنا بند ہو جائے۔ اگر پہلے معنے لئے گئے ہیں تو دھواں ٹھہر کر اور زیادہ گھٹے گا اور تاریکی بڑھ جائیگی اور اگر دوسرے معنے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ مطلع صاف ہو تو کچھ نظر آئے۔ بہر طور اعتراض یہ ہے کہ دیدۂ ادراک کی رویت کے لئے دل کا حجاب کوئی چیز نہیں اس لئے کہ دیدۂ ادراک کنایہ ہے ادراک سے اور نگاہ عقل کو دھواں روک نہیں سکتا۔ چاہے وہ دل کا دھواں ہو چاہے گھر کے چولھے کا۔

(مولف) میرے نزدیک شاعر کا مقصد یہ ہے کہ دل تاریک ہو رہا ہے اور اس وجہ سے میرا ادراک باطل ہے۔ دل کے دھوئیں سے مراد دل کی سیاہی ہے۔ دل تاریک ہے اور دل میں دھواں ہے تو دیدۂ ادراک کا بیکار ہونا لازمی

بہرصورت میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔

ثاقب ۔ اہلِ محشر کی نگاہوں میں پسند آتی نہیں — رہ گیا شاید کوئی دھبہ تری پوشاک پر

اعتراض ۔(۱) نگاہوں میں کی بجائے "نگاہوں کو" چاہئے ۔(۲) دوسرے مصرع میں جو لفظ دھبہ ہے ہمارا ابھی یہی خیال ہے کہ اس کا ازالہ ہو جاتا تو بہتر تھا۔ یہ دھبا تشریح طلب ہے ذہن تشویش میں ہے کہ یہ عاشق کے خون کا دھبہ ہے جو ان کی پوشاک پر داغ دے رہا ہے یا خود ان کا کوئی عارضہ ہے۔ ایسے لغو شعر دامن ادب کے لئے ایک نجس داغ ہیں۔

(مولف) میرے نزدیک اعتراض بالکل صحیح ہے ۔ دھبہ کی تشریح ہونا چاہئے تھی کہ عاشق کا خون ہے یا معشوق کا

ثاقب ۔ عشق نے باندھا ہے پل مابین ہستی و عدم — راستہ ہے گردنوں کا خنجر سفاک پر

اعتراض (۱) گردن خود خنجر پر نہیں چلتی ۔ اس کے برعکس خنجر گردن پر چلتا ہے ۔ لہذا یہ کہنا کہ گردنوں کا راستہ خنجر پر ہے غلط ہے ۔ (۲) اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو مفہوم شعر کے مطابق عشق رہبر ہے۔ گردن رہرو خنجر پل اور سفاک معشوق رہبر۔ خنجر پل اور سفاک معشوق جس کے ہاتھ میں خنجر ہے لہذا پل جس نے باندھا نہ کہ عشق نے ۔

(مولف) اعتراض دونوں صحیح ہیں۔ اگرچہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ گردن خود خنجر پر چلی جائے جیسا کہ بیان یزدانی کا یہ شعر ؎

کبھی رُکا ہے اگر دستِ نازنیں اسکا — تڑپ کے ہم نے گلا رکھ دیا ہے خنجر پہ

ثاقب ۔ جامہ منعم سے اچھا ہے یہ بوسیدہ لباس — چاک دھبہ ہو نہیں سکتا کسی پوشاک پر

اعتراض ۔ دوسرے مصرع میں کسی ۔ کا لفظ غلط ہے اس لئے کہ چاک پوشاک منعم کے لئے عیب ہے لہذا یوں کہنا چاہئے کہ ؎ چاک دھبہ ہو نہیں سکتا ہے اس پوشاک پر۔

(مولف) اعتراض اور اصلاح دونوں درست ہیں۔ اور میرے نزدیک ان دونوں میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ثاقب۔ بے نشانوں کے نشاں ہوں یا کوئی تعویذِ غم ۔ کچھ گھروندے سے بنا دیں آج ل بے خاک پر

اعتراض۔ بے نشانوں کے نشاں۔ اور تعویذِ غم دونوں مرادف ہیں لہذا تشقیق بیکار ہے

(مولف) میں اس شعر کو کچھ نہیں سمجھا۔ نہ بے نشان کا کوئی نشان ہوتا ہے۔ اور نہ تعویذِ غم قبر کو کہتے ہیں صرف تعویذ صحیح ہے تعویذِ غم بالکل بیکار ہے۔ نشان بے نشان اور تعویذِ غم خدا جانے ایک ہیں یا دو اور شق کرنا صحیح ہیں یا نہیں خدا جانے۔

ثاقب۔ مل گیا دل خاک میں ثاقب تو سناٹا سا ہے ۔ اک اداسی چھا رہی ہے دشت دہشتناک پر

اعتراض (۱) سا حرفِ تشبیہ بیکار ہے دشت دہشت ناک کی صفت سے متصف ہے اور دہشتناکی خود اداسی ہے اس پر اداسی چھانا کیسا۔

(مولف) تینوں اعتراضات صحیح ہیں۔

تذکرۂ معرکۂ سخن میں ایک سخت غلطی

افسوس ہے کہ جناب اقبال کے ذکر میں.......... دو بڑی سخت غلطیاں ہو گئی ہیں ایک یہ کہ انھیں بجائے سیالکوٹ کے امرتسر کا باشندہ بتایا گیا اور دوسرے یہ کہ اُن کی عمر بھی بجائے ۵۶ سال کے ۴۵-۴۶ لکھی گئی۔ اسی طرح ان کے حالات بھی نہایت ہی نامکمل و غیر مرتب طور پر درج ہوئے۔ افسوس ہے کہ تذکرۂ معرکۂ سخن کی کاپیاں نوح ناروی کی نگاہ سے نہیں گزریں، ورنہ اس قسم کی غلطیاں نظر نہ آتیں

"آسی"

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول — ۴/
- ״ دوم — ۴/
- ״ سوم — ۴/
- الفاروق — عہ
- سیرۃ النعمان — ۴/
- الغزالی — ۴/
- المامون — ۴/
- سوانح مولانا روم — ۴/
- موازنۂ انیس و دبیر — عہ
- شعر العجم جلد اول — عہ
- ״ دوم — عہ
- ״ سوم — عہ
- ״ چہارم — عہ
- ״ پنجم — عہ
- علم الکلام — عہ
- الکلام — عہ
- رسائل شبلی — ۴/
- مقالات شبلی — عہ
- مضامین عالمگیر — عہ
- آغاز اسلام — ۱۲/
- کلیات فارسی شبلی — عہ
- تمام شبلی اردو — عہ
- سیر کہسار
- ضدالی و جمادہ
- جام سرشار — عہ
- الف لیلہ بطرز ناول — عہ
- کامنی — ۴/

منشی سجاد حسین مرحوم

- سیارِ حمزہ دھیار — ۴/
- احمق الذی — ۸/
- حاجی بغلول — ۸/
- پیاری دنیا — ۸/
- کایا پلٹ — ۸/
- میٹھی چھری — ۶/
- طرحدار لونڈی — عہ
- طلسمی فانوس — ۴/

جوالا پرشاد برق

- مرزالنی — ۱۰/
- ماہ آتشین — ۱۰/
- بنگالی دولہن — ۱۲/
- معشوقۂ فرنگ — ۸/
- پرتاپ — ۱۲/
- رہبی — ۱۰/

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی — عہ
- ملکۂ زنوبیہ — ۱۲/
- قرۃ العین — ۱۲/
- محذرات — ۴/
- جویائے حق — عہ
- لعبت چین — عہ
- فاتح و مفتوح — ۴/
- بابک خرمی — ۴/
- الفانسو — ۱۲/
- ایام عرب — ۴/
- قیس و لبنیٰ — ۴/
- یوسف و نجمہ — ۴/
- زوال بغداد — ۴/

مرزا شوق و دریابادی

- مینا بازار — عہ
- مقدس نازنین — ۴/
- ملکۃ الکبریٰ — ۴/
- فلپانا — ۴/
- خونین لکہ — ۴/
- منصور موہنا — ۸/
- حسن انجلینا — ۸/
- ملک العزیز ورجنا — ۱۲/
- فردوس بریں — ۸/
- حسن کا ڈاکو — ۴/
- دربار حرام پور — ۱۰/
- غیب دان دلہن — عہ
- بدر النساء کی مصیبت — ۴/
- میوۂ تلخ — ۸/
- نیکی کا پھل — عہ

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق — ۴/
- قاسم و زہرہ — ۱۲/
- نیرنگ جمال — ۴/

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب — ۹/
- نیلی چھتری — ۴/
- بہرام کی گرفتاری — عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

- شعلۂ رنگین — ۸/
- محاصرۂ پیرس — عہ
- شیخ چلی — عہ
- بہرام کی واپسی — ۴/
- انقلاب فرانس — ۴/
- حسن بنارس — ۸/

ترکی و دیگر ناول

- نوری جاسوس — ۴/
- ترکی حرم سرا — ۸/
- جنگ طرابلس — ۸/
- بہرام چور — ۴/
- زر پرست — ۴/
- گنجی کا بانا — ۴/
- عبدالرحمٰن ناصر — عہ
- عروس مصر — عہ
- سیلاب خون — ۴/
- سیاحت زمین — ۴/
- سیاحت ہوا — عہ
- نازنین مراکش — ۸/
- سمندر کی سیر — عہ
- اسرار باشوزیم — ۴/
- روح لیلیٰ — عہ
- آہنی بک — عہ
- حجاج بن یوسف — ۴/
- یوسف پاشا — ۴/
- انقلاب عثمانی — ۴/
- بہرام کی رہائی — ۴/
- بہرام کی آزادی — ۱۲/
- بہرام کی سرگزشت — ۴/
- لال کنور — ۴/
- پراسرار قتل — عہ

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب — عہ
- بزم خیال — عہ
- مشاطۂ سخن — عہ
- انشائے نسواں — ۶/
- مکاتیب محسن الملک — ۴/

- لیلیٰ مجنوں ڈرامہ — ۸/

مراثی

- مراثی دبیر — عہ
- مراثی انیس — عہ
- مراثی ضمیر — عہ
- مراثی مونس — ۱۲/
- مراثی دلگیر — ۱۲/

تذکرۃ الشعراء

- تذکرہ حسینی — ۱۱/
- گلشن — ۱۰/
- سراپائے سخن — عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی — عہ

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز — ۱۲/
- کلیات عراقی — ۱۰/
- دیوان حافظ — ۴/
- دیوان بیدل — ۴/
- دیوان عرفی — ۱۲/
- کلیات جامی — ۴/
- کلیات غالب — ۴/
- کلیات صائب — ۱۲/
- دیوان ناصر علی — ۶/
- کلیات سعدی — ۴/
- کلیات حزیں — ۱۲/
- دیوان عنصری — ۱۴/
- دیوان غنی کشمیری — ۶/
- دیوان ہلالی — ۶/

دواوین اردو

- کلیات ظفر — ۱۲/
- کلیات مومن — عہ
- دیوان ناسخ — ۴/
- کلیات میر — ۴/
- کلیات سودا — ۴/
- کلیات آتش — ۴/
- کلیات نظیر اکبرآبادی — عہ
- گلزار داغ — ۴/
- دیوان رند — ۹/
- دیوان ذوق — ۱۲/
- کلیات اسمٰعیل — عہ
- مرآۃ الغیب — عہ
- صنم کدۂ عشق — ۴/
- فریاد داغ — ۱۲/
- دیوان قاتل — ۸/
- دیوان شہیدی — ۴/

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات — ۴/
- تصویر رنگین
- ״ باتصویر سادہ — عہ
- مجمع الفنون — ۴/
- طلسم فرنگ — عہ
- کارخانۂ عالم — عہ

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

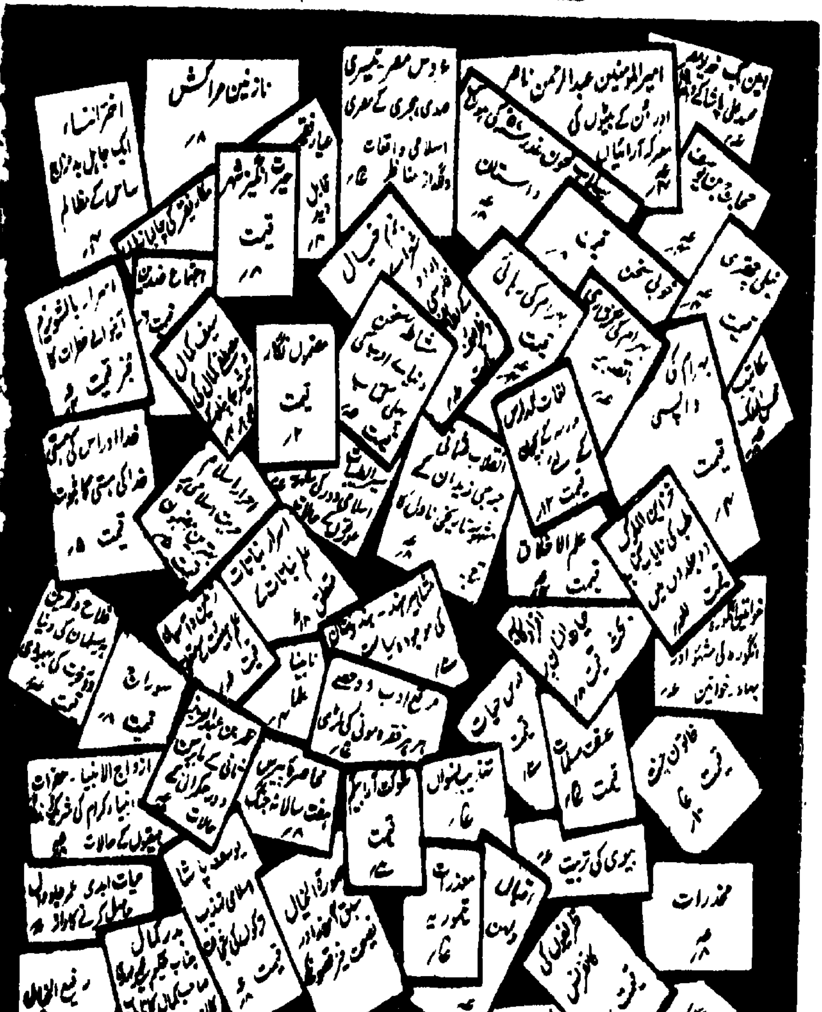
- الہ دین ولیلی — ۱۲/
- فریب حسن — عہ
- سوزن عشق — ۴/
- روزا لیمبرٹ — عہ
- ناول اسرار — عہ
- شام جوانی — ۴/
- طلسمی فانوس — ۱۲/

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰



مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین